اِسلام کا سفیر

''1946ء کے انتخابات کے دوران اور بعدازاں قائداعظم نے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں مسلم اکثریتی علاقوں اورصوبوں پرمشتمل ایک مسلم سٹیٹ کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ 1935ء سے 1947ء تک قائداعظم نے کسی پبلک جلسے، اخباری بیان یا پریس کانفرنس میں یہ نہیں کہا کہ وہ پاکستان کے روپ میں ایک سیکولرسٹیٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگرکوئی محقق ایسا کوئی ایک مطبوعہ حوالہ پرنٹ میڈیا سے ڈھونڈ لائے تو راقم الحروف اسے اس کے وزن کے برابر سونا انعام میں دینے کے لیے تیار ہے۔ قائداعظم سیکولر ہوتے تو مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بجائے کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی یا کسی نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہونے کو ترجیح دیتے۔ وہ ایک صاف گو اور کھرے آدمی تھے۔ سیکولرازم کی طرف ان کا ذہنی ونفسیاتی جھکاؤ ہوتا تو وہ خود اس پوزیشن میں تھے کہ سیکولر پارٹی کے نام سے ایک الگ جماعت قائم کر لیتے۔ قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کی کوششیں وہ عناصر کر رہے ہیں جن کا فکری تشخص اور نظریاتی شجرہ نسب عوام کے نزدیک مشکوک ہے یا جن کے آبا و اجداد نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔''

بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کے اسلامی سیرت وکردار کے عکاس
ایمان افروز حقائق اور دینی غیرت وحمیت کے آئینہ دار واقعات پر مبنی مستند دستاویز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
37223584، 37232336، 37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers@hotmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

نام کتاب	اسلام کا سفیر
مصنف	محمد متین خالد
ناشر	علم و عرفان پبلشرز
مطبع	آر۔آر پرنٹرز، لاہور
قانونی مشیر	محمد نوید شاہین ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
سرورق	محمد طیب محبوب
کمپوزنگ	طاہر علی، ظفر اقبال
سنِ اشاعت	2020ء
قیمت	-/2000 روپے

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

37223584' 37232336' 37352332

www.ilmoirfanpublishers.com

ilmoirfanpublishers@hotmail.com

www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

ترتیبِ عنوانات

منظومات

اِنتساب

اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ سے بے پایاں محبت کرنے والے

- جناب ڈاکٹر صفدر محمود
- جناب اوریا مقبول جان
- جناب محمد آصف بھلی
- جناب حافظ شفیق الرحمن
- جناب محمد احمد ترازی

کے نام

؎ چن لیا میں نے تجھے سارا جہاں رہنے دیا

اسلام کی برگزیدہ شخصیت

قائداعظمؒ کا شمار عالم اسلام کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے کارنامے اپنی انفرادیت اور تنوع کے باعث دنیا بھر میں رشک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کہنے کو تو قائداعظم محض ایک سیاست دان تھے لیکن وہ خالی خولی سیاست دان نہیں تھے بلکہ ایک ایسی بااصول کراماتی شخصیت تھے جنھوں نے غیرمتزلزل اصولوں اور مواقف کے چراغوں کو اپنے خون جگر اور خون تمنا کے نایاب روغن سے روشن رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست اور اصول، یہ دو متضاد چیزیں ہیں، یہ آپس میں لگا نہیں کھاتے، ان کا کوئی تال میل نہیں۔ قائداعظم کی باکرامت شخصیت کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے سیاست کو بھی اصولوں کے تابع بنانے کے نادرالوقوع کرشمے سے دنیا کو متعارف کروایا۔ ان کی شخصیت کا خمیر سنہرے اصولوں کی روشن مٹی سے اٹھا تھا۔ ان کی پوری زندگی ایک زندہ کرامت تھی۔

کراچی کے ایک درمیانے درجے کے تاجر کے ہاں جنم لینے والا ایک دبلا پتلا اور چھریرا سا بچہ، کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ آنے والے دنوں میں ناممکن کو ممکن کا روپ دے گا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قائداعظم روایتی نوابزادوں اور رئیس زادوں کی طرح منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی کہ جہاں زندگی کے تعیّشات، مراعات اور سہولیات بافراط موجود نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے کراچی ہی کے سندھ مدرسہ میں حاصل کی۔ کراچی کے گلی کوچوں میں اپنے ہم سن بچوں کے ساتھ، بچوں ہی کی طرح کھیل کود میں مصروف رہے۔ سکول میں ان کا شمار حاضر دماغ اور طباع طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد جناب پونجا

کا کاروبار نشیب و فراز کی وادیاں قطع کرتا رہا۔ انھوں نے اپنے لڑکپن میں ناخوشگوار حالات کا بھی سامنا کیا۔ اس کے باوجود پونجا جناح کو اپنے ہونہار فرزند کی پیشانی کے اُفق پر روشن مستقبل کا ایک ستارا ہی نہیں بلکہ پوری کہکشاں دمکتی چمکتی اور جگمگاتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کا وجدان انھیں بتا رہا تھا کہ بظاہر غیر معمولی صلاحیتیں اور ذہانتیں رکھنے والے ان کے اس بیٹے سے قدرت نے تاریخ کے ایک اہم موڑ پر آنے والی صدی میں ایک اہم ترین اور منفرد ترین کام لینا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لیل و نہار کی تلخیوں کے باوجود انھوں نے محمد علی کو بیرون ملک تعلیم دلانے کا عزم کیا۔

قائداعظم لندن پہنچے۔ کراچی بھی گو کہ ایک بڑا شہر تھا لیکن لندن کی چکا چوند اور جگمگاہٹیں اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک ایسے نوجوان کے لیے جس نے جوانی کی دہلیز پر نیا نیا قدم رکھا تھا، لندن ایک مجسمۂ رعنائی تھا جس کے انگ انگ سے پھوٹنے والی تحیر خیز کشش، قدم قدم اور سانس سانس اسے بھٹکانے اور ٹھٹھکانے کے لیے کافی تھیں۔ قائداعظم کی سوانح کے اوراق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ لندن شہر کی رعنائیاں بھی انھیں اپنے نصب العین سے دور کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ وہ یہاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آئے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول ہی ان کا نصب العین تھا۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اس شہر میں قائداعظم کس کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لیں۔ وہ لندن کے طول و عرض میں واقع تعلیمی اداروں کی تعارفی سیاحت میں مصروف ہو گئے۔ وہ بہت سے تاریخی، تہذیبی اور علمی اہمیت اور شہرت رکھنے والے آستانوں پر پہنچے لیکن وہ ذہنی طور پر ان میں سے کسی ایک میں بھی داخلے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر پائے۔ آخر کار **1892**ء میں ایک دن وہ لندن کی مشہور قانونی درسگاہ ''لنکنز اِن'' پہنچے۔ اس یونیورسٹی کے صدر دروازے پر نصب بورڈ ان کی نگاہوں اور توجہات کا مرکز بن گیا۔ یہاں دنیا کے نامور آئین سازوں اور قانون سازوں کے نام بالترتیب درج تھے۔ لیکن قائداعظم کو جس بات نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر آمادہ کیا، وہ یہ تھی کہ مذکورہ بورڈ پر دنیا کے عظیم ترین مقننین کی فہرست میں ان کے محبوب و محترم پیغمبر حضور نبی اکرم

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا اسم مبارک بھی نمایاں آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

قائداعظم کی شخصیت عین جوانی میں بھی عشق رسالت مآب ﷺ میں کس حد تک گندھی ہوئی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں قائداعظم محمد علی جناح اس شہر رنگ و بو میں برسوں مقیم رہے۔ آج کے لندن کی طرح اس دور کے لندن کو بھی رقص و سرور کی پرورش گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ نگر نگر مے خانے آباد تھے، بستی بستی قحبہ خانے موجود تھے، قریہ قریہ رقص گاہیں دعوت تماشا دے رہی تھیں، گلی گلی ''حسن بے نقاب'' کے ''جلوے'' دامن دل کو اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم معصیت کے خارزار دامن شباب کو تار تار کرنے کے لیے موجود تھے، قائداعظم نے کسی بھی طرح دار کانٹے کی تواضع اپنے دامن حیات کے ادنیٰ سے تار سے بھی نہ کی۔ بلاشبہ وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوتے ۔

میں تھا کہ مہ وشوں سے سلامت گزر گیا
یہ تجربہ کرو نہ کسی پاک باز پر

قائداعظم کے تمام سوانح نگار بلاامتیاز اس پر متفق ہیں کہ قیام لندن کے دوران قائداعظم نے رقص و سرور کے کسی بھی پروگرام میں کبھی شرکت نہ کی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قائداعظم کوئی صوفی باصفا اور زاہد مرتاض تھے۔ وہ زندگی کی تہذیبی رنگا رنگی سے استفادے کا گُر جانتے تھے لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مشرق سے آیا ہوا نوجوان کیا ہوتا ہے؟ مغربی تہذیب کے کیچڑ میں جب قدم رکھتا ہے تو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ضرور پھسل جاتا ہے۔ صوفی باصفا نہ ہونے کے باوجود قائداعظم کے پائے استقامت میں ایک لمحہ کے لیے بھی لغزش نہ آئی۔ وہ استقلال و استقامت اور صلابت و پامردی کے ساتھ اپنے نصب العین کی شاہراہ سے ایک لحظہ کے لیے بھی ''ڈی ٹریک'' نہ ہوئے۔ مغربی تہذیب و تمدن اپنے تمام تر حسن و جمال اور سحر و کشش کے باوجود انھیں ''ٹریپ'' نہ کر سکا۔ لندن میں قیام کے دوران ہی انھیں اس امر کا کامل ادراک ہو چکا

تھا کہ وہ ایک ایسے دین سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی اقدار و روایات اپنے حدود و دوائر میں مغربی تہذیب سے یکسر مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حتی المقدور وہ ایسی مخلوط تقاریب اور محافل میں شرکت سے گریزاں رہے جن میں روشن خیالی کے نام پر آداب و اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر طوفانِ بدتمیزی بپا کیا جاتا ہے......

قائداعظم کی پوری زندگی ایسے ہی روشن حوالوں سے بھری ہوئی ہے۔ زیرنظر کتاب ''اسلام کا سفیر'' اپنے دور کی دنیا کی سب سے بڑی جدید اسلامی مملکت کے بانی حضرت قائداعظمؒ کی اسلامی زندگی کو اُجاگر کرتی ہے۔ قائد کی سیرت کے وہ اسلامی گوشے جو اکثر لوگوں کی نظر سے پوشیدہ تھے، دوبارہ منظرعام پر آئے ہیں۔

عزیزی محمد متین خالد کا شمار عصر حاضر کے ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جن کا نام اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ تحفظ ناموس رسالت ﷺ اور تحفظ ختم نبوت ان کی پہچان کے خصوصی حوالے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کی کتابوں نے مسلمانوں میں عشق رسول ﷺ کی نئی لہر دوڑا دی ہے۔ ''اسلام کا سفیر'' ان کی نئی کتاب ہے جو انھوں نے قائداعظم کی اسلامی سیرت و کردار پر شائع ہونے والے بے شمار مضامین کو انتہائی محنت سے کھنگال کر مرتب کی ہے۔ حضرت قائداعظم پر بے شمار کتابوں میں سے یہ ایک منفرد، اہم اور قابل توجہ کتاب ہے۔ تمام مضامین انتہائی علمی، دلچسپ اور چشم کشا ہیں۔ یہ کتاب قائد کی زندگی پر مزید کام کرنے والوں کے لیے بنیادی حوالے کا کام دے گی۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر عزیزی خالد کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مجید نظامی

مدیر روزنامہ نوائے وقت

۞......۞......۞
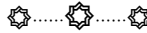
دلیل کی فراہمی

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کی مختلف جہات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مصنفین نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے قائداعظم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، ان کے رجحانات اور تحریک آزادی کے دوران ان کی ترجیحات کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ممتاز محقق جناب محمد متین خالد کی کتاب ''اسلام کا سفیر'' تاریخی حقائق اور شواہد کے ساتھ قائداعظم کی زندگی کے عملی اور نظریاتی رجحانات کو ایسے مدلل انداز سے بیان کرتی ہے کہ یہ کتاب سوانح سے بڑھ کر ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہی پاکستان کے قیام کے مقاصد اور پاکستان کے مستقبل کے آئین کے خدوخال کے حوالے سے ایسی بحث شروع ہوگئی جس کا مقصد پاکستان کے تشخص اور آئین کے خدوخال کے بارے میں التباسات اور غلط فہمیاں پیدا کرنا تھا۔ اس ساری منفی مہم کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح کے فرامین اور تعلیمات کی غلط تعبیر پر رکھی گئی۔ یعنی اس نقطہ نظر کے حامیوں نے یہ طے کرلیا، اگر قائداعظم کی شخصیت، ان کی تعلیمات اور افکار وفرامین کو ان کی بنیادی روح سے ہٹا کر سیکولر ثابت کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے تو ان کے لیے پاکستان کو اپنے مقاصد سے منحرف کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔ قائداعظم نے زندگی بھر پاکستان کے لیے سیکولر کا لفظ ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ قائداعظم کی قانونی بصیرت اور مومنانہ فراست تھی کہ انہوں نے سینکڑوں مواقع پر اس امر کی وضاحت تو کی کہ پاکستان کی نوزائیدہ ریاست اسلام کے بتائے ہوئے آفاقی اصولوں کے مطابق بنائی جائے گی مگر اس طرف ایک مرتبہ بھی اشارہ نہیں کیا کہ پاکستان کسی حوالے سے سیکولر ریاست ہوگا۔

قائداعظم کی سیاسی جدوجہد میں پاکستان کے حصول کو ہدف بنانا بھی بنیادی طور پر ان کے علامہ اقبال کے ساتھ تعلق اور تبادلہ خیال کا نتیجہ تھا۔ 1936ء سے 1938ء تک دونوں راہنماؤں کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا ہی نتیجہ تھا کہ قائداعظم اس امر کے قائل ہوگئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی بقا صرف اس بات میں مضمر ہے کہ یہاں مسلمانوں کے لیے ایک الگ آزاد مسلم ریاست قائم کی جائے۔ان خطوط میں 28 مئی 1937ء کا علامہ اقبال کا لکھا گیا قائداعظم کے نام خط بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس خط میں علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام لکھا کہ اسلامی قوانین کے گہرے اور دقت نظر سے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلام کا قانون معاش مکمل طور پر نافذ کردیا جائے تو ہر شخص کا حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔لیکن جب تک اس ملک میں ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہیں آتیں، اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔ سالہا سال سے میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور اب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے معاشی مسائل اور ہندوستان کے امن و امان کا بہترین حل یہی ہے۔ بصورت دیگر دوسرا راستہ صرف خانہ جنگی ہے ۔کیا آپ کے خیال میں مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے مطالبے کا وقت نہیں آ پہنچا؟ علامہ اقبال کے افکار اور قائداعظم کے ساتھ ان کی خط و کتابت کا ہی اثر تھا کہ بالآخر قائداعظم نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد وطن کے قیام کو اپنی منزل بنالیا۔علامہ اقبال کے قائداعظم پر انہیں اثرات کا اظہار قائداعظم کے ان خیالات سے ہوتا ہے جن کا اظہار انہوں نے علامہ اقبال کی وفات پر کیا۔ 25 مارچ 1940ء کو لاہور میں یوم اقبال کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا: ’’گو میرے پاس سلطنت تو نہیں ہے لیکن اگر مجھے سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا‘‘۔ 2 مارچ 1941ء کو یوم اقبال کی ایک اور مجلس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا اقبال دور حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبال سے بہتر

اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ مجھے ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا''۔

قائداعظم کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اسلامی تعلیمات پر ان کا یقین ان کے شرح صدر اور پوری فکری واضحیت پر مبنی تھا۔ بطور قانون دان وہ اسلام کی عظمت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اسلام کی تہذیبی، قانونی اور عالمگیر ابدیت سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ 9 ستمبر 1937ء کو ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں جمعیت علما ہند کے ایک رکن حافظ محمد عبداللہ نے شریعت بل پیش کیا جو مسلم پرسنل لا سے متعلق تھا۔ اس موقع پر شریعت بل پر بحث کرنے کے لیے تمام مسلم اکابرین نے جن میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، مولوی عبدالغنی، شیخ فضل الحق پراچہ اور قاضی محمد احمد کاظمی جیسی شخصیات شامل تھیں، قائداعظم سے درخواست کی۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اسمبلی میں موجود مسلمان جاگیرداروں نے اس بل کی مخالفت کی۔ مخالفت کرنے والوں میں سر محمد یامین خان، نواب سر احمد نواز خان اور سردار شیر محمد خان جیسے مسلمان جاگیردار بھی شامل تھے۔ قائداعظم نے اس بل پر اتنی دقت نظری اور قانونی مہارت کے ساتھ بحث کی کہ 16 ستمبر کو یہ بل کامیابی سے منظور کروا لیا۔ اس شریعت بل کی منظوری کے بعد انتقال جائیداد کے مقدمات کا فیصلہ اسلامی قانون کے تحت کرنا اور عورتوں کو جائیداد سے حصہ دینا لازمی ہو گیا۔

مغربی قانون کے مقابلے میں اسلامی قانون کی عظمت سے قائداعظم کی شناسائی کا تذکرہ کرتے ہوئے نواب بہادر یار جنگ نے 1934ء میں ہونے والے میلادالنبی ﷺ کے ایک جلسہ میں قائداعظم کی تقریر کی تفصیل بیان کی ہے۔ یہ جلسہ بمبئی کے سر کاوس جی جہانگیر ہال میں منعقد ہوا۔ نواب بہادر یار جنگ نے لکھا کہ اس موقع پر قائداعظم کی تقریر گو مختصر تھی مگر یہ قانون محمدی کے دنیا کے دوسرے مشہور قوانین خصوصا رومن لا سے تقابلی مطالعہ پر مشتمل تھی۔ انہوں نے موجودہ قوانین کے ایک متبحر عالم کی

حیثیت سے جس کی زندگی رومن لا کی ذریات کی اپنی آغوش میں پرورش کرتے ہوئے گزری، جب قانون محمدی کے گوشے کھولے تو تعلیم مغرب کے شیدائیوں کی حسن محمدی کے جلوؤں سے نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ مولانا غلام مرشد نے قائداعظم سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ جب میں نے اس ملاقات کے دوران قائداعظم سے اسلامی نظام حیات کے بارے میں استفسار کیا تو قائداعظم نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ سامنے رکھ کر فرمایا: ''اس کتاب میں فوجی انتظامی معاشی اخلاقی غرض کہ ہر شعبہ زندگی کے متعلق قوانین موجود ہیں۔ یہ ایسا آئین ہے جو مکمل اور جامع ہے اور اسے دوام حاصل ہے۔ اس کی ابدیت کی میں ایک مثال دیتا ہوں کہ اس میں کئی مقامات پر ارشاد خداوندی ہے کہ ہر جرم کی سزا اس کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ کس قدر عالمی اور ابدی اصول ہے''۔

قائداعظم کی شخصیت کو مسخ کرنے اور انہیں سیکولر ثابت کرنے کے لئے سب سے زیادہ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس تقریر کی تفصیلات کو پس منظر سے ہٹا کر من پسند توجیہات مسلط کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا قائداعظم کے نزدیک قیام پاکستان کا واحد مقصد ایک لادین ریاست کی تشکیل تھا۔ اس تقریر میں قائداعظم نے فرمایا: آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں اور پاکستان میں کہیں بھی اپنی عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب ذات یا نسل سے ہو، ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اسی تقریر میں قائداعظم نے فرمایا ہندو ہندو نہ رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہ رہیں گے لیکن مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ سیاسی حوالے سے کیونکہ ریاست کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر قائداعظم کے اس فرمان پر غور کیا جائے تو یہ بھی انہی اسلامی تعلیمات کا نتیجہ تھا جن پر قائداعظم عملاً کاربند تھے۔ جس مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے تحفظ کا قائداعظم نے اپنی 11 اگست کی تقریر میں تذکرہ کیا یہ اسلامی تعلیمات کا عین تقاضا تھا۔ حضور اکرم ﷺ

نے ارشاد فرمایا اگر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کا حق غصب کرے تو قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف میں خود غیر مسلم کا وکیل ہوں گا۔ قائداعظم نے سیاسی مفہوم میں جس وحدت کو بیان کیا، یہ دراصل انہوں نے پہلی اسلامی ریاست، ریاست مدینہ کے دستور میثاق مدینہ کی ایک شق کو ہی اپنے الفاظ میں بیان کیا جس میں یہ قرار دیا گیا کہ **انھم امة واحد من دون الناس**، مدینہ میں رہنے والے تمام لوگ دنیا کے دیگر لوگوں کے بالمقابل ایک علیحدہ سیاسی وحدت ہوں گے۔ 23 مارچ 1940ء کو قرارداد پاکستان کی منظوری کے موقع پر مرکزیہ مجلس اقبال نے 24 اور 25 مارچ کو یوم اقبال منعقد کیا۔ قائداعظم نے 25 مارچ 1940ء کو یوم اقبال کی صدارت کی۔ اس موقع پر نوجوان پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ قائداعظم نے فرمایا: مجھے اس نام پر کوئی اعتراض نہیں، اگر آپ لوگوں کو پاکستان کا نام پسند ہے۔ صرف اس میں I کا اضافہ کرلیں جو Islam کا مخفف ہے اور تمام صوبوں کے اتحاد کا ضامن ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے چودھری رحمت علی کے لکھے پمفلٹ میں لفظ Pakstan میں I نہیں تھا۔

جدوجہد آزادی کے دوران کا ہر مرحلہ اور قائداعظم کی ہر حکمت عملی ان کی اسلام کے ساتھ وابستگی کو ثابت کرتی ہے۔ 7 اپریل 1946 کی شام کو دہلی کے اینگلو عربک کالج میں مسلم لیگ لیجسلیٹرز کا پہلا کنونشن قائداعظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ پاکستان کی پہلی منتخب پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس تھا جس میں انتخابات میں کامیاب ہونے والے تقریباً ساڑھے چار سو مسلم لیگی نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کنونشن میں شریک مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی تمام اراکین نے حصول پاکستان کے لیے ایک حلف نامے پر دستخط کیے حتیٰ کہ بعض اراکین نے حلف نامے پر اپنی خون سے دستخط کیے۔ پاکستان کی پہلی منتخب پارلیمنٹ کا پہلا حلف نامہ قرآن مجید کی آیت سے شروع ہوتا ہے اور قرآن حکیم کی آیت پر ختم ہوتا ہے۔ حلف نامے کا آغاز اس آیت سے کیا گیا:

- **قل ان صلاتی ونسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین**

(الانعام: 162)

ترجمہ: کہہ دو میری نماز میری قربانی میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

اس کا اختتام اس قرآنی دعا پر کیا گیا:

- **ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین (البقرہ:250)**

ترجمہ: اے ہمارے رب ہمیں صبر واستقامت عطا فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کفار پر فتح ونصرت عطا فرما۔

اس حلف نامے پر قائداعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان اور تمام منتخب اراکین نے دستخط کیے۔ یہ حلف اخبارات کے ذریعے پورے ہندوستان میں پہنچ گیا۔ گویا یہ حلف نامہ عہد تھا جو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے خدا کے ساتھ، ایک دوسرے کے ساتھ اور خطے کے عوام کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد جب مطالبہ پاکستان کے راستے میں انگریز حکمرانوں اور کانگریسی ہندو قیادت نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو 16 اگست 1946ء کو قائداعظم نے یوم راست اقدام منانے کا فیصلہ کیا اور یہ دن رمضان المبارک کا یوم فرقان تھا جو کفار مکہ کے مقابلے میں مسلمانان ریاست مدینہ کی فتح کا نشان تھا۔

قائداعظم کے نزدیک مطالبہ پاکستان صرف مسلمانان ہند کے مستقبل کے تحفظ کے لیے نہیں تھا بلکہ یہ ہندوستان اور دنیا بھر میں اسلام کے مستقبل کا معاملہ تھا۔ 19 دسمبر 1946ء کو قاہرہ میں ایک نشست سے گفتگو کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا: ''اگر ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوگئی تو اس کا مطلب نہ صرف بھارت بلکہ دنیا بھر میں اسلام کا خاتمہ ہوگا''۔ 10 مارچ 1941ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی یونین سے گفتگو کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا: ''پاکستان نہ صرف ہمارے لیے قابل حصول منزل ہے بلکہ یہ اس ملک میں اسلام کو مکمل طور پر فنا ہوجانے سے بچانے کے لیے واحد منزل ہے''۔ یکم جنوری 1938ء کو گیا کے مسلمانوں کی طرف سے دیے گئے ایک استقبالیہ میں گفتگو کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا: ''آج اس عظیم اجتماع میں

آپ لوگوں نے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے کہ میں یہاں مسلم لیگ کے پرچم جو کہ اسلام کا پرچم ہے، کی نقاب کشائی کرسکوں۔ کیونکہ آپ مسلم لیگ اور اسلام کو الگ نہیں کر سکتے۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو ہمارے بہت سے ہندو دوستوں کو اس سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کا پرچم اسلام کا پرچم ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں ہم سیاست میں مذہب کو داخل کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کہنا ہمارا سرمایہ افتخار ہے۔ اسلام ہمیں مکمل ضابطہ حیات دیتا ہے۔ یہ صرف مذہب نہیں بلکہ یہ قانون، فلسفہ حیات اور سیاست سب کچھ ہے۔ یہ وہ سب کچھ ہے جو ایک انسان کے لئے صبح سے شام تک ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد ہمارے نزدیک یہ پوری زندگی ہوتی ہے۔ اس سے ہم کوئی بد نیتی مراد نہیں لے رہے ہوتے۔ اسلام کے ضابطہ حیات کا مطلب حریت، مساوات اور اخوت ہے۔

پاکستان کو ریاست مدینہ کے نمونے پر ڈھالنے کے لیے پہلا ناگزیر اقدام بانیان پاکستان خصوصا قائداعظم اور علامہ محمد اقبال کی تعلیمات سے نسل نو کو روشناس کرانا ہے۔نسل نو ہی نہیں اس ملک کے سیاسی، انتظامی، معاشی، سماجی اقتدار اور اختیار پر فائز ہر شخص کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کی فکر تصور پاکستان اور اس مملکت میں رائج نظام حکومت و آئین کے حوالے سے ان کے افکار سے آگاہ ہو۔ ممتاز محقق، مصنف اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے انتھک محافظ جناب محمد متین خالد نے ''اسلام کا سفیر'' لکھ کر ہمیں ایسی مستند تاریخی دستاویز فراہم کر دی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ قائداعظم کا تصور پاکستان کیا تھا۔ قائداعظم کی پوری زندگی اسلامی قانون آئین تہذیب وثقافت اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی وجود کی خدمت اور حفاظت میں صرف ہوئی اور قائداعظم ہی کے راستے کو اختیار کرنے میں پاکستان کا استحکام اور ہماری اجتماعی بقا ہے۔

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

لاہور

۞……۞……۞
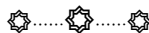
کتابوں کی کتاب

محترم محمد متین خالد صاحب پاکستان کے قومی وملی حلقوں کی ایک معروف اور مقبول شخصیت ہیں۔ وہ حال ہی میں اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ نوکری سب کرتے ہیں مگر انھوں نے نوکری کو قوت لایموت سے زیادہ حیثیت نہیں دی اور ہمیشہ اپنی زندگی کو دین اور وطن کی بے لوث محبت اور خدمت میں صرف کیا ہے۔ راقم کو وہ دن بھی یاد ہیں جب ان کی جوانی تھی اور وہ دفتری اوقات کے بعد اپنا وقت ختم نبوت کے حوالے سے علما و اولیا کے ساتھ گزارنا پسند کرتے تھے۔ موصوف کا یہ دور فی الحقیقت اپنے دین اور وطن سے والہانہ وابستگی اور دیوانگی کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو استقامت عطا کی اور اللہ تعالیٰ یہ استقامت تادم آخر قائم رکھے۔ ''اسلام کا سفیر'' (قائد اعظم) اسی محبت وخدمت کے سفر کی تصویر ہے۔

راقم نے پہلی بار محترم محمد متین خالد کو استاد گرامی اور ماہر اقبالیات پروفیسر محمد منور صاحب کی محفل میں دیکھا تھا۔ موصوف کی زندگی سادگی کا مرقع اور شخصیت مخلصانہ انکساری کا پیکر تھی۔ الحمدللہ! آج موصوف دینی حلقوں بالخصوص تحفظ ختم نبوت کے مخلص سفیر کے طور پر ساری دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ مخلصین اور محسنین کے عمل اور اجر کو کبھی ضائع یا زائل نہیں کرتا۔ **ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین**۔ یہاں یہ امر قابل تحسین ہے کہ انہوں نے دین اور وطن کی وابستگی کو ذریعہ آمدنی نہیں بنایا بلکہ دینی محافل میں شرکت کے لیے معاوضہ کے خواہاں بھی نہیں رہے بلکہ اپنی جیب سے خرچ کرنا پسند کرتے ہیں اور اس راہ میں آنے والی رکاوٹوں اور مشکلوں کو خوشدلی سے برداشت کیا اور کسی کے حضور سر بسجود ہو کر راہ نہیں بدلی۔ آفرین

ہیں وہ لوگ جو دین و وطن کی راہ میں استقامت کا پیکر ہیں اور بلاخوف و خطر اپنے ہموطنوں کو دشمنان دین و وطن کے مذموم عزائم سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

ان کی شخصیت اور خدمات کا محور تحریک پاکستان کے نظریاتی مقاصد اور اہداف کا حصول ہے۔اس ضمن میں ان کی محبوب شخصیتیں علامہ اقبال اور قائداعظم ہیں۔علامہ اقبال کا پیغام ہے کہ اپنی صلاحیت واہلیت بالفاظ دیگر اپنی خودی کو پہچانو جبکہ قائداعظم کا پیغام ہے کہ اپنے دشمن کو جانو اور پہچانو۔دونوں بزرگوں کی پالیسی دوست اور دشمن کی شناخت ہے۔

Know thy Self and know thy enemy.

کامیابی اور ہماری قومی وملی فلاح و بہبود کا راز دوست اور دشمن شناسی میں مضمر ہے۔علامہ اقبال عشق رسولؐ کو اسلامی تعلیمات کا مرکزی نکتہ قرار دیتے ہیں۔

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ہمارے قومی شاعر اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے ختم نبوت کو قرآن وسنت کی جان کہا ہے اور منکرین بلکہ باغیان ختم نبوت کو دین اور وطن یعنی اسلام اور پاکستان دونوں کا غدار قرار دیا ہے۔

Qadyanis are traitors both to Islam and India.

محترم زیڈ اے سلہری صاحب (ظہیر احمد سلہری) کو علامہ اقبال اور قائداعظم کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔آپ انگریزی اور اُردو زبان کی صحافت سے منسلک رہے۔آپ تحریک پاکستان کے مخلص اور سرگرم کارکن تھے۔آپ نے قیام پاکستان سے قبل کچھ عرصہ بحیثیت صحافی برطانیہ میں گزارا۔اور غالباً **1945**ء میں ''میرا لیڈر'' بزبان انگریزی **My Leader** کتاب لکھی جس کا دیباچہ قائداعظم نے تحریر کیا۔کتاب کا دوسرا ایڈیشن جولائی **1992**ء میں شائع ہوا جس میں سلہری صاحب نے آخر میں ایک باب کا اضافہ کیا اور جس میں دشمنان دین و وطن بالخصوص قادیانی اور سرحدی گاندھی عبدالغفار خان وغیرہ کی پاکستان کے خلاف سازشوں اور سرگرمیوں کا تذکرہ کیا اور لکھا

ہے کہ پاکستان کے خلاف ہر سازش اور نقصان کے پیچھے قادیانی ضرور ہوگا۔ نیز قادیانی اکابرین برطانیہ کی کاشت اور آلہ کار ہیں جنھوں نے اپنے مذموم عزائم کے تحت پاکستان کے خلاف بولنا اور لکھنا شروع کر رکھا ہے۔ قادیانیوں نے موقف اختیار کر رکھا ہے کہ پاکستان قادیانیوں نے بنایا جس میں برطانیہ سرکار اور چودھری ظفر اللہ خان کا بنیادی کردار ہے اور قائد اعظم مسلمانوں کو متحرک کرنے کا برطانوی ذریعہ یعنی محض آلۂ کار تھے۔ سلہری صاحب اپنی کتاب **My Leader** کے صفحہ **277** (اشاعت دوم، جولائی **1992**ء پبلشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور) پر چودھری ظفر اللہ خان اور ولی خان (عبدالغفار خان عرف باچا خان اور سرحدی گاندھی کے بیٹے اور اے این پی **ANP** کے سربراہ) کے نام نہاد ''ارشادات'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

This is the most sinister move yet made to destroy Pakistan's genesis. It aims at killing two birds with one stone - attributing the authorship of partition to the British and identifying a Qadyani as their prime instruments for its consummation. It is most provocatine statement and indeed calculated to arouse the feelings of anger among the general body of Muslims. In effect, what the Muslim public has been told is that Pakistan, they so love, is not only the gift of the alien ruler but their agent was no other than the despised Qadyani. And this, the whole struggle for which millions sacrified their lives has been debunked. The implied hint in the "authoritative piece of information" vouched to the nation that the scheme of partition was prepared by Zafrullah and implemented by the British of which the Quaid was merely a tool - which amounts to

character assasination - could not but consitute a despicable attempt at denigrating Pakistan."

محترم زیڈ۔ اے۔ سلہری استاد گرامی پروفیسر محمد منور صاحب کے محبوب دوست تھے۔ دونوں دوستوں کی باہم ملاقات رہتی تھی۔ ان ملاقاتوں میں راقم اور بعض اوقات مولانا ابوبکر غزنوی صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب سید جنید غزنوی بھی شامل ہوتے تھے۔ زیڈ۔ اے سلہری صاحب نے اپنے گھر واقع کیولری گراؤنڈ نزد خالد مسجد میں ہونے والی ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ ایک قادیانی والدین کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مگر علامہ اقبال اور قائداعظم کی صحبت اور محبت نے انہیں مسلمان کر دیا۔ ان کی ترک قادیانیت اور قبول اسلام کی کہانی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی قادیانی والدہ کی نام نہاد نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی اور کہا کہ حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان ہے کہ کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا، جب تک اسے اللہ و رسول ﷺ اپنے مال، آل اور مآل Career سے زیادہ مقدم نہیں ہوں گے۔ زیڈ۔ اے سلہری صاحب فرماتے تھے کہ میں نے نور ایمان علامہ اقبال اور قائداعظم سے سیکھا ہے جن کو دنیا میں اللہ، رسول ﷺ اور امت مسلمہ سے زیادہ مقدم کوئی چیز نہیں تھی۔ قادیانیت اور مرتد قادیانی افراد کے بارے میں قائد اعظم کا رویہ کیا تھا؟ اس کا اندازہ کتاب میں شامل نیر زیدی کا مضمون ''قائداعظم اور قادیانیت'' خاصا چشم کشا ہے اور زیڈ اے سلہری کا بیان بھی ایک گواہی سے کم نہیں۔

قائداعظم ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ یہ اسلام کے مختلف مراحل اور مراتب سے بڑھ کر فقط اور فقط قرآن وسنت کے مقاصد کے محافظ بنے اور یہی وہ سبب ہے کہ ان کے مقام کی بلندی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں ایک غلام کو آزاد کرانے کا عظیم اجر رکھا گیا ہے تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کروڑوں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو صلیبی انگریز اور اسلام دشمن ''ہندوا تا'' کے ظالم ہندوؤں سے آزادی دلوانے کی قیادت عطا فرمائی۔ اس فردِ فرید کا مقام کیا ہوگا؟ فی الحقیقت تحریک

پاکستان اور قائد اعظم کا فکر وعمل برطانوی حکومت اور متحدہ ہندوستان کی ہندو قیادت بشمول گاندھی، نہرو، پٹیل وغیرہ کی واضح شکست ہے۔ جبکہ دشمن نے شکست کھائی مگر تسلیم نہیں کی اور تا حال پاکستان، قائد اعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان سے وابستہ جملہ قیادت مثلاً سر سید احمد خان، حفیظ جالندھری وغیرہ کے خلاف مسلسل مہم شروع کر رکھی ہے۔ بھارت میں سردار پٹیل نے سرکاری سرپرستی میں نام نہاد مسلمان، ہندو، سکھ وغیرہ کو شامل کر کے ایک منظّم مہم کا آغاز کیا جس میں مذکورہ ملحدین، مرتدین اور نام نہاد کانگریسی نیشنلسٹ (بھارت پرست) مسلمان اکابرین واصاغرین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جبکہ RSS کی سماجی عالمی تنظیم ''سنگھ پریوار'' نے پاکستانی اشرافیہ نیز صلیبی و یہودی اکابرین کو بھی اسلام اور پاکستان کے خلاف نام نہاد ''عالمی شہری'' عالمی مذہب اور انسانیت وغیرہ کے دام میں لا کر متحد اور منظّم کر دیا ہے۔ دشمن کی مذکورہ مذموم مہم نے قیام پاکستان کے بعد آنے والی اور موجودہ نئی نسل کو قائد اعظم، علامہ اقبال اور تحریک پاکستان کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔ دشمن کے مذموم مہم کے تین پہلو ہیں۔ قائد اعظم سیکولر تھے۔ پاکستان انگریز اور اسلام کے ملحد اور مرتد مذاہب کی پیداوار ہے۔ پاکستان کا مقصود قرآن وسنت پر مبنی اسلامی نظام کا نفاذ نہیں تھا۔ دشمن کا مقصود ہے کہ اہل پاکستان کو بانیانِ پاکستان کا مخالف نہیں تو کم از کم دور کر دیا جائے اور اس ضمن میں دشمن کافی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اسی تناظر میں لائی گئی جبکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی مشرقی پاکستان کے نواب سلیم اللہ خان تھے جنھوں نے مذکورہ مسلم لیگ کو انتظامی بنیاد پر کی جانے والی تقسیم بنگال 1905ء کے کامیاب نفاذ کے پس منظر میں بنایا تھا۔ واضح رہے کہ تقسیم بنگال کے بعد نئے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی زیادہ تھی اور یہ مسلم اکثریتی صوبہ بن گیا تھا۔ تقسیم تنسیخ بنگال (غالباً 1911ء) ہندواتا کی پہلی جیت تھی اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہندو بھارت کی پہلی سرکاری کامیابی تھی۔ ہندو مہاسبھا، RSS اور اس سے پہلے اُردو ہندی جھگڑا اسی مسلم کش ہندواتا کا شاخسانہ تھا۔ اس کے باوجود تحریک پاکستان اس دور کی مخلص

مسلمان قیادت اور امت مسلمہ کے شعور سے معمور ہندی مسلمانوں کی متحدہ کوشش تھی جو کامیاب ہوئی مگر قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کے لیے اہل پاکستان نے نظریاتی کوتاہی برتی جس کے بارے میں استادگرامی پروفیسر محمد منور صاحب نے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے مسلم فکر وعمل کو بایں اشعار بیان کیا ہے:

ہم وہ تھے جن کو خندۂ گل نے جگا دیا
ہم وہ ہیں جو خروشِ سلاسل میں سو گئے
وہ رہ گئے غبارِ رہِ کارواں کے ساتھ
ہم بڑھ کے سایۂ درِ منزل پہ سو گئے

پاکستان کے قومی شاعر اور مفکر علامہ اقبال نے ''ہندو مسلم کشمکش'' کے بارے میں بالخصوص ہندی مسلمانوں اور بالعموم عالم اسلام کو بایں طور تنبیہ کی ہے کہ ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی، لہٰذا ہتھیار مت اتارو بلکہ ہتھیار بند رکھو کیونکہ دشمن تا حال مسلح اور تیار ہے۔

لالۂ ایں چمن، آلودۂ رنگ است ہنوز
سپر از دست میانداز کہ جنگ است ہنوز

پاکستان کی سلامتی اور استحکام نظریاتی آگہی میں ہے۔ محترم محمد متین خالد صاحب کی کتاب ''اسلام کا سفیر (قائد اعظم)'' اسی نظریاتی سفر کا تذکرہ ہے جسے موصوف نے نہایت محنت اور محبت سے مرتب کیا ہے۔ کتاب انتہائی وقیع ہے جو تاریخی اعتبار سے مستندترین حوالوں سے مزین مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین کا گلدستہ پاکستان کے معروف اور علمی اعتبار سے بلند مقام مؤرخین کی تحریروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم فقط اور فقط مسلمان تھے، جیسا کہ کسی عرب شاعر نے کہا تھا کہ

شرفی ما عشت انی مسلم
نسبی ھذا و ھذا مذھبی

میں جب تک زندہ رہا، بحیثیت مسلمان زندہ رہا اور یہی میرا حسب، نسب اور مذہب تھا یعنی میری شخصیت اور فکر وعمل قرآن وسنت کی تعلیمات کا مرقع ہے۔

قائداعظم نے 17 اپریل 1948ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں جرگہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''جو کچھ میں نے کیا، وہ اسلام کے ایک خادم کی حیثیت سے کیا اور میں نے فقط اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے نیز اپنی قوت و استطاعت کے مطابق اپنی قوم کی حتی المقدور مدد کی ہے''۔

پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ برطانوی سرکار کی Divide and Rule (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کا نتیجہ ہے تو اس ضمن میں تقسیم ہندو اور پاکستان کے قیام کے بارے میں اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی اپنی ''یادداشت'' میں لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے جس چیز پر ہمیں اتفاق کرنا پڑ گیا اور جو ہرگز ہماری خواہش نہ تھی۔ وہ تھی تقسیم ہند۔ ہم مسلمانوں کے لیے ہر طرح کے ممکن تحفظات کی یقین دہانی کرانے پر تیار تھے۔ مگر وہ سراسر اڑ گئے تھے کہ ایک علیحدہ مسلم مملکت...... پاکستان...... لے کر رہیں گے اور ہمیں یہ مطالبہ مجبوراً ماننا پڑا۔'' (تحریک پاکستان۔ تاریخی خدوخال ص 52)

پروفیسر محمد منور اپنی کتاب دیوار برہمن ص 391 پر لکھتے ہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتا تھا کہ ''کوئی بھی شخص، بالخصوص میں، ہندوستان کی تقسیم کا خواہشمند نہیں تھا''۔ بھارت کی ہندو قیادت نے تقسیم ہند اس امید پر قبول کی تھی کہ ''دوبارہ اتحاد کے لیے تقسیم کرو''۔ گاندھی، نہرو، پٹیل، راجندر پرشاد وغیرہ کی عملی کوشش رہی ہے کہ پاکستان کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے اور اس ضمن میں پہلا قدم یہ ہے کہ پاکستانی قیادت کا اسلامی نظریاتی تشخص ختم کر دیا جائے۔ اس مذموم مہم کے پس منظر میں دشمنانِ دین و وطن اکثر قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں کہ قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان میں ہر فرد اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر سکتا ہے اور اس کی عبادت میں ریاست دخل اندازی نہیں کرے گی''۔ کیا قائداعظم کا مذکورہ ذکر اور حوالہ قائداعظم اور پاکستان کو سیکولر بنا دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ قائداعظم نے اپنی ساری زندگی (قبل اور بعد از پاکستان) پاکستان کے حوالے سے لفظ سیکولر استعمال نہیں کیا۔ کتاب میں شامل استاد

گرامی پروفیسر محمد منور کے مضامین، بزرگوارم اور پاکستان کے مایہ ناز مؤرخ ڈاکٹر صفدر محمود صاحب، قدرت اللہ شہاب، سید شریف الدین پیرزادہ، سید ابوالاعلیٰ مودودی، میاں عزیز الحق قریشی، محمد حنیف شاہد وغیرہ کے مضامین قائداعظم کی اسلام، قرآن اور مسلمانوں سے محبت کے آئینہ دار ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ معروف اور معتمد مؤرخین کی نثری تحریروں اور دوسرا حصہ نامور اور نایاب قومی و ملی نغموں پر مشتمل ہے جن میں قائداعظم پر اُردو کی پہلی نظم از سید سلیمان ندوی اور پاکستان کا مطلب کیا از اصغر سودائی وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب میں نایاب نظمیں اور نامور اکابرین کے تقریباً 45 مضامین شامل ہیں جس نے کتاب کو اہم نایاب اور منفرد تحریروں کا حسین گلدستہ بنا دیا ہے۔

قائداعظم نے پاکستان اور اسلام کے ضمن میں واضح طور پر کہا کہ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔'' (25 جنوری 1948ء)

محترم محمد متین خالد صاحب کی مذکورہ کتاب قائداعظم کی شخصیت کے دینی و روحانی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اور ان کی سیاسی مساعی اور جدوجہد، اسلامی نظام سیاست و معیشت جو غلامی کے باعث متروک تھا، روایت کو ازسرِنو زندہ کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش ہے۔ دشمنانِ دین و وطن کا ایک بہتان یہ بھی ہے کہ قائداعظم اگر سیکولر نہیں تھے

تو انھوں نے چودھری ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ اور جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون کیوں بنایا؟ قادیانی وزیر خارجہ کے حوالے سے قائد اعظم کے فکر وعمل اور نیت کے بارے میں کتاب میں شامل نیر زیدی کا مضمون ''قائد اعظم اور قادیانیت'' کافی مسکت جواب ہے۔ نیز چوہدری ظفر اللہ خاں انگریز صلیبی سرکار کا ''جبری تحفہ'' یا ''دین'' تھا جبکہ جوگندر ناتھ منڈل، معروف اور بھارت کے پہلے قانون ساز دلت وزیر قانون ڈاکٹر امبید کر کی دلت پارٹی Scheduled Castes Federation کی سیٹ پر مشرقی پاکستان سے منتخب ہو کر مرکزی اسمبلی کے رکن بنے۔ گو یہ پاکستان کے پہلے وزیر قانون تھے مگر قائد اعظم نے آئین ساز کمیٹی کا سربراہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو مقرر کیا تھا۔ جنھوں نے قائد اعظم کی وفات 11 ستمبر 1948ء کے بعد قائد اعظم کے دست راست اور شہید ملت وزیر اعظم لیاقت علی خان کی سرپرستی میں آئین سازی کے راہنما اصولوں کی بنیاد پر ''قرار داد مقاصد'' منظور کرائی جس کو شہید صدر جنرل محمد ضیا الحق نے آئین پاکستان کا باضابطہ حصہ بنایا۔ یاد رہے کہ آئین سازی میں وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل کا کوئی انتظامی اور آئینی عمل دخل نہیں تھا جبکہ ڈاکٹر امبید کر بھارت کے پہلے وزیر قانون اور آئین ساز کمیٹی کے بھی سربراہ تھے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قائد اعظم نے جنوبی بھارت کے دلت لیڈر ڈاکٹر امبید کر اور تامل لیڈر سوامی پیری یار Periyar کے ساتھ 1945ء بمقام مدراس ایک متحدہ سیاسی محاذ بنایا۔ جس کا مقصد تھا کہ ہندو برہمن کے ظالمانہ رویوں بلکہ غیر انسانی پالیسی سے نجات حاصل کرنے کے لیے متحد اور منظّم جدوجہد کی جائے۔

یہ سیاسی محاذ آل انڈیا مسلم لیگ کے مدراس سیشن میں کیا گیا تھا۔ جس کی تفصیل ہمارے دوست اور بھارت کے دلت سول افسر ایس۔ کے۔ بسواس (Swapan Kuwar Biswas-S.K.Biswas) نے اپنی کتاب بھارتی آئین کا بانی Father of the Constitution of India میں دی گئی ہے۔ ایس۔ کے۔ بسواس لکھتے ہیں:

"The Untouchables were not a subsection of

the Hindus, but a distinct element in the national life of India, as seperate and distinct as Muslims .... a seat for the Depressed Classes in the Executive Council was death blow to Brahmanism ... M.A. Jinah Periyar and Ambedkar made an effort to form a united political party. so that the Brahminical autocacy comes to an end. They assembled togather in the 1945 Madras session of the Muslim League, the Muslim League of Bengal made Jogindra Nath Mandal, an untouchable Chandal of Bengal and an MLA of the Scheduled Caste Federation a cabinet minister .. (i.e., a dalit was honoured to become first law minister of independent Muslim State of Pakistan). Again J.N. Mandal was elevated by Muhammad Ali Jinnah to the central cabinet as Law Minister of the undivided India in the Interim Government. This was a glaring example of the strength and result of the cooperation between the Untouchables and Muslims in India. It became thererfore, inevitable for India to be partitoned."

(بحوالہ ڈاکٹر بی۔آر۔امبید کر۔سیکولر جمہوری انڈیا کا بانی از پروفیسر یوسف عرفان (راقم) ص 274 پبلشر: سر گنگا رام ہیریٹیج فاؤنڈیشن لاہور کتاب بزبان انگریزی)

حقیقت یہ ہے کہ دلت، تامل اور دیگر اچھوت اقوام اور قبائل قدیم ہندوستان کے حکمران تھے۔مگر جب آریائی برہمن تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل وسطی ایشیا سے ہندوستان آئے تو انہوں نے ان دراوڑی اقوام Dravidians کو بے رحمی سے مارا اور بھگایا جنھوں نے بالآخر ہندوستان کی سرحدوں اور پہاڑوں میں پناہ لی۔ برہمن نے

اپنی غیر انسانی حکمرانی کو طول دینے کے لیے ہندو دھرم میں نام نہاد ذات پات کا نظام رائج کیا اور ان دراوڑی اقوام کی شاندار تہذیب، تمدن اور تاریخ کو مسخ کر کے ان کو اپنے ماضی سے کاٹ دیا اور باقی ماندہ دراوڑی اقوام کو سارے ہندوستان میں بکھیر دیا تا کہ یہ کبھی متحد، منظّم اور موثر قوت نہ بن سکیں۔ دلت اور تامل قیادت نے اپنی آزادی کے لیے قائداعظم، علامہ اقبال اور آل انڈیا مسلم لیگ سے کئی بار رابطہ کیا۔ معاہدے کیے مگر ان کی قیادت ہندو اور انگریز کی ''نام نہاد نوازشات'' اور دھمکیوں سے مرعوب ہو کر بروقت جرأت مندانہ فیصلہ نہ کر سکی۔ اس کے باوجود قائداعظم، مسلم قیادت اور آل انڈیا مسلم لیگ نے اچھوت اقوام کے ساتھ وفا کی۔ انگریز سرکار نے تقسیم سے قبل ڈاکٹر امبیدکر کو متحدہ ہندوستان کی کابینہ میں شامل کر لیا۔ آزاد بھارت میں انہیں پہلا وزیر قانون بنا دیا گیا۔ اس معمولی اور عارضی ترقی نے جوگندر ناتھ منڈل کو بھی آزادی اور خود مختاری کے لیے استقامت سے محروم رکھا۔ مگر اس سب کا یہ مطلب نہیں کہ آنے والے دور میں ان کے مسائل نابود اور معدوم ہو جائیں گے۔ ان اچھوت اقوام نے ہندو بھارت کا مزہ چکھ لیا۔ لہٰذا مسلم ہند تک یہ مسائل موجود رہیں گے اور اہل پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ اور تحریک کو عوام الناس میں زندہ رکھیں۔

قائداعظم کا ہندی یعنی موجودہ بھارتی مظلوم اور محروم اچھوت نسلوں، قوموں اور قبیلوں کے ساتھ تعاون قرآن کے حکم کے عین مطابق ہے۔

- **وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللّٰہ والمستضعفین من الرجال و النساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم أھلھا. و اجعل لنا من لدنک ولیاء، واجعل لنا من لدنک نصیراً. (النسا:75)**

اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کمزور مظلوم، محروم مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے اللہ کی خاطر یعنی اللہ کی رضا کے لیے جہاد نہیں کرتے۔ یہ مظلوم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے رب العالمین ہمیں اس بستی سے باہر نکال جس کے حاکم ظالم ہیں اور

ہمارے لیے غیب سے کوئی دوست اور مددگار بنا''۔ قائداعظم ان مظلوم ومحروم اقوام کے دوست اور ہمدرد تھے۔ علامہ اقبال نے ان مظلوم اور محروم اقوام کی ترجمانی بانگ درا کی نظم ''نانک'' کے شعر ذیل میں بیان کی ہے۔

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

نیز مسلم قیادت کی پاک و ہند کے مسلمانوں یعنی امت کے اجتماعی مفاد کو مقدم رکھنے کی کوشش جاری رہنی چاہیے اور چاہیے کہ قائداعظم، علامہ اقبال، سرسید احمد خان، مولانا اکبرالٰہ آبادی، مولانا ظفر علی خان اور خالق ترانۂ پاکستان ابوالاثر حفیظ جالندھری وغیرہم کی مخلصانہ اور جرأتمندانہ قیادت اور استقامت کی داستان کو بار بار اجاگر کریں۔

محترم محمد متین خالد صاحب کی کتاب ''قائداعظم، اسلام کا سفیر'' اسی تحریک کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب مختلف مستند اور مایہ ناز مؤرخین اور مفکرین کی نادر اور نایاب تحریروں کا مجموعہ ہے۔ محترم مؤلف نے کوشش کی ہے کہ نئے ایڈیشن کو پہلے ایڈیشن سے بہتر بنائیں اور اس ایڈیشن میں بعض تحریروں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جس نے کتاب کی اہمیت اور افادیت کو دہ چند کر دیا ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جسے ملک بھر کی لائبریریوں کے علاوہ گھروں کی زینت بھی بننا چاہیے۔ خطے میں دین و وطن کے استحکام اور سلامتی کے لیے تحریک پاکستان کی قیادت کے روز و شب کو بار بار بیان کیا جائے تاکہ نئی نسل کے دل و دماغ میں یہ نقش جگہ بنائے۔ مؤلف محترم محمد متین خالد صاحب نے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ کتاب میں شامل مضامین کے ذریعے قائداعظم کی حضور اکرم ﷺ سے محبت، قرآن کی تلاوت، قائداعظم کی سیاسی و معاشی نظام سے آشنائی قارئین کے لیے واشگاف انداز سے بیان کی ہے اور محترم محمد متین خالد صاحب کی یہ کاوش کامیاب ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تالیف کو قبول فرمائے اور عوام میں مقبول بنائے۔ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے کیونکہ قائداعظم نے قیام پاکستان کو اسلام کی شاندار روایت کو توانا کرنے کا ذریعہ سمجھا تھا۔ قائداعظم نے

(14اپریل 1946ء مسلم لیگ کنونشن، دہلی) میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ’’اگر (بھارت) ہماری اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دیتا ہے اور ان کو ستاتا ہے تو پاکستان ایک خاموش تماشائی نہیں رہے گا۔ اگر گلیڈسٹون کے زمانے میں برطانیہ اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر امریکہ میں مداخلت کر سکتا تھا تو اگر ہندوستان (بھارت) میں ہماری (مسلم) اقلیتوں پر مظالم کیے گئے تو ہمارا (پاکستان کا) مداخلت کرنا کیونکر حق بجانب نہ ہوگا‘‘۔ خطے میں ہندو مسلم کشمکش جاری ہے۔ پاکستان منزل کی جانب پہلا قدم ہے۔ دوسرا قدم اور منزل کا تعین قائداعظم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان ملاقات بمقام کلکتہ کے دوران بیان کیا گیا تھا جب مولانا نے قائداعظم سے گلہ کیا کہ آپ نے ہندی مسلمانوں کو تین حصوں میں بانٹ کر کمزور کر دیا ہے تو قائداعظم نے جواب دیا کہ اس وقت میں نے ایک قلعہ مسلمانوں کو لے دیا ہے، جہاں وہ قوتیں جمع کریں اور اپنی اہلیتوں سے کام لے کر اپنے شاندار ماضی کا احیا کریں۔ مجھے جو کام کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔ جب مولانا آزاد نے قائداعظم کے یہ الفاظ سنے تو اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں گلے لگا لیا۔ مولانا کا رویہ بدل گیا اور انہوں نے ازاں بعد مرکزی حکومت کے ہر ملازم کو مشورہ دیا کہ وہ بھارت میں رہنے کے بجائے پاکستان جائیں اور پاکستان کو مضبوط بنائیں۔

(بحوالہ پاکستان: حصار اسلام از پروفیسر محمد منور، ص 218)

محترم محمد متین خالد صاحب کی زیرِ نظر کتاب پاکستان کو مضبوط بنانے کی ایک کامیاب کاوش ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پروفیسر یوسف عرفان

لاہور
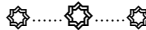
دل کی بات

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، تب کہیں جا کر قوموں کی زندگی میں قائداعظم محمد علی جناحؒ ایسے دیدہ ور پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ہماری قومی تاریخ کی ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت ہیں جنھوں نے اپنی خداداد فہم و فراست، جہدِ مسلسل اور توکل علی اللہ سے برصغیر کے کروڑوں مجبور و محکوم مسلمانوں کو انتہائی بے سروسامانی اور مخالفت کی تندوتیز آندھیوں کے باوجود دس سال کی قلیل مدت میں انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی سازشوں سے نجات دلائی اور مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ اسلامی نظریاتی مملکت کی اساس رکھی۔ بقول مولانا شبیر احمد عثمانیؒ: ''شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان لیڈر پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ مسلمانوں کی پامالیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا ہو''۔ ''جناح آف پاکستان'' کے مصنف اسٹینلے والپرٹ (Stanley Wolpert) اپنی کتاب "Jinnah of Pakistan" میں لکھتے ہیں کہ ''بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کا دھارا بدل دیتے ہیں اور ایسے لوگ تو اور بھی کم ہوتے ہیں جو دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیتے ہیں اور ایسا تو کوئی کوئی ہوتا ہے جو ایک نئی مملکت قائم کر دے۔ محمد علی جناح ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے بیک وقت تینوں کارنامے کر دکھائے''۔

زمیں کی روح تری عظمتوں سے گونج اُٹھی
فلک کے دل میں ترے عزم کا ٹھکانہ بنا
اُفق سے تا بہ اُفق اُبھر آئی
ترے خلوص کے ہاتھوں نیا زمانہ بنا

قائداعظم محمد علی جناحؒ کا شمار ان نابغہ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے جن کی کوئی

نظیر صدیوں میں پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ان کی عظمتوں کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے دور میں ایک سیاسی سورج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اقوال و افعال کی یگانت، حق گوئی و بے باکی، ذہانت و فطانت، فہم و ادراک، ایمان و ایقان، امانت و دیانت، عزم و استقلال، تدبر و تفکر، تبحر علمی، قوت ارادی، پابندی وقت، اصول پسندی، انتھک محنت اور انصاف پسندی ایسی خصوصیات ہیں جو بیک وقت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں لیکن کمال ہے کہ اس معجز نما شخصیت میں یہ تمام خوبیاں حیرت انگیز حد تک کماحقہ موجود تھیں اور یہی خصوصیتیں قائد اعظم کو ان کے دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ کی گونا گوں قابلیتوں اور صلاحیتوں کا یہ کوئی کم اعتراف نہیں ہے کہ ان کے مخالف ان سے بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتے تھے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نہایت سریع الفکر، صحیح النظر اور صائب الرائے شخصیت کے مالک تھے۔ آپ وہ مردِ مومن تھے جو صرف طوفان ہی نہیں جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں بلکہ وہ شبنم بھی تھے جس سے گل لالہ میں ٹھنڈک ہوتی ہے۔ وہ رزم حق و باطل میں فولاد ضرور تھے مگر حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم بھی تھے۔ بقول شخصے: ''قائداعظمؒ کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف بددیانتی یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا۔ انہیں کوئی شخص، کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی وہ مرغ باد نما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا رخ کردار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔ وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین عزت نفس و حمیت کے پیکر تھے۔''

قائداعظم محمد علی جناح ہندوستان بھر کی ایسی عبقری شخصیت تھے جو انگریزوں اور ہندوؤں کی مسلمانوں کے خلاف پراسرار اور خطرناک سازشوں اور سیاسی چالوں کو نہ صرف بخوبی جانتے تھے بلکہ اپنے خداداد سیاسی تدبر اور قوت ایمانی سے ان چالوں کو انہی پر لوٹا دیتے۔

نہ تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

قائداعظم ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔اس لحاظ سے بھی کہ انھوں نے اپنے فکر و تدبر سے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں وہ نام اور مقام پایا جس میں کوئی ان کا مثیل و مقابل نہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ اکہرے بدن کے اس حساس اور بے داغ کردار کے انسان کو دشمنوں کے علاوہ اپنوں کی دشنام طرازی کے جو تیر برداشت کرنا پڑے، سیاسی تاریخ میں کم ہی کوئی اور ان کا ہدف بنا ہوگا...... قائداعظمؒ کی سیاسی زندگی کا وہ باب بے حد اہم ہے، جو ان کے سیاسی حریفوں کے بوقلموں شخصیتوں اور متضاد کردار سے عبارت ہے۔ان میں جبہ و دستار کے مالک بھی نظر آتے ہیں، خدائی خدمت کے دعویدار بھی، محدود صوبائی مفادات کے نام لیوا بھی اور وہ بھی جن کی سیادت و قیادت کا چراغ قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز عوامی تحریک کے طوفان کی زد میں تھا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تقریریں اکثر انگریزی میں ہوتیں، لیکن ان کی تقریر سن کر یوں محسوس ہوتا کہ گویا یہ ہر شخص کے دل کی آواز ہے۔ نہ سمجھ آنے والی تقریر بھی سننے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔لوگ ان کے ہر لفظ پر لبیک کہتے۔ ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی محکومی کی زنجیروں کو کاٹنا تھا۔زندگی اور محکومی ان کے نزدیک ایک دوسرے کی ضد تھے۔ان کی تقریر میں الفاظ کی بناوٹ اور تشبیہات کا تصنع نہیں بلکہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والی حقیقت پر مبنی پرسوز، پراثر اور امید افزا باتیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کروڑوں مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور آج وہ ایک اسلامی نظریاتی مملکت کی آزادانہ فضا میں رہ رہے ہیں۔الحمدللہ!

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ایک ایسی خوبی جو ان کی باقی خوبیوں سے ممیّز ہے، وہ ہے اُن کی اسلام، قرآن اور حضور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ سے بے پناہ محبت و عقیدت و احترام۔ قائداعظم بذات خود اسلامی افکار و نظریات کے حامل شخص تھے اور اپنی قوم میں بھی یہی اوصاف دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلام اور پاکستان سے الرجک گروہ مسلمانوں کو قائداعظم محمد علی جناح سے بدظن کرنے کے لیے اکثر ان کی کردار کشی کرتا رہتا ہے اور مسلسل یہ ژاژ خائی کرتا ہے کہ (نعوذباللہ) وہ دین سے بیگانہ اور سیکولر تھے۔

قائداعظم پر یہ الزام نہ صرف سفید جھوٹ بلکہ تاریخ سے لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قائد اعظم کی تقاریر و بیانات کا مکمل ریکارڈ موجود ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے جس علیحدہ مملکت کے حصول کے لیے کوشش کر رہے تھے، وہ مکمل اسلامی، فلاحی اور جمہوری ریاست تھی۔ وہ پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے۔ انہیں جب بھی پوچھا گیا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا؟ تو وہ بغیر توقف کے پورے اعتماد کے ساتھ کہتے کہ ہمارا آئین تو تیرہ سو سال پہلے ہی بن گیا تھا جو قرآن کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

1946ء کے انتخابات کے دوران اور بعدازاں قائداعظم نے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں مسلم اکثریتی علاقوں اور صوبوں پر مشتمل ایک مسلم سٹیٹ کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ قائداعظم نے زندگی بھر کبھی لفظ بھارت یا انڈیا استعمال نہیں کیا۔ آپ نے دوقومی نظریے کو اجاگر کرنے کے لیے ہمیشہ لفظ ''ہندوستان'' ہی استعمال کیا، چاہے تقریر انگلش میں ہو یا اردو میں۔ **1935**ء سے **1947**ء تک قائداعظم نے کسی پبلک جلسے، اخباری بیان یا پریس کانفرنس میں یہ نہیں کہا کہ وہ پاکستان کے روپ میں ایک سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی محقق ایسا کوئی ایک مطبوعہ حوالہ پرنٹ میڈیا سے ڈھونڈ لائے تو راقم الحروف اسے اس کے وزن کے برابر سونا انعام میں دینے کے لیے تیار ہے۔ قائداعظم سیکولر ہوتے تو مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بجائے کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی یا کسی نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہونے کو ترجیح دیتے۔ وہ ایک صاف گو اور کھرے آدمی تھے۔ سیکولرازم کی طرف ان کا ذہنی ونفسیاتی جھکاؤ ہوتا تو وہ خود اس پوزیشن میں تھے کہ سیکولر پارٹی کے نام سے ایک الگ جماعت قائم کر لیتے۔ قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کی کوششیں وہ عناصر کر رہے ہیں جن کا فکری تشخص اور نظریاتی شجرہ نسب عوام کے نزدیک مشکوک ہے یا جن کے آباواجداد نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔

یہ انتہائی تکلیف دہ امر ہے کہ تحریک قیام پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے والے اکابر نے تو قیام پاکستان کے بعد اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا لیکن بدقسمتی سے ان کے بعض کج فہم پیروکاروں کا پرنالہ آج بھی وہیں ہے۔ نیشنلسٹ علما

کی اکثریت نے تو واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ درست ہے کہ ہم نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، اب پاکستان بن چکا ہے تو اس کی حفاظت اور استحکام کے لیے سرگرم ہونا تمام مسلمانوں کا فرض اولین ہے۔ اختلاف صرف اتنا تھا کہ مسجد کا حدود اربعہ کیا ہوگا؟ اب جب کہ مسجد بن چکی ہے تو اس کی مخالفت کسی بھی طور قرین انصاف نہیں۔ اس موقع پر میری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ پاکستان میں موجود صوبائی گاندھیوں کے صاحبزادگان اور ان کے راتب خور آج بھی علانیہ استحکام پاکستان کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی منافقت کا عالم یہ ہے کہ وہ قائداعظم کے بنائے ہوئے پاکستان میں ہر آزادی سے مستفید ہونے اور ہر نعمت سے لطف اٹھانے کے باوجود مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، یعنی جس تھالی میں کھاتے ہیں، اُسی میں چھید کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی لغویات اور خرافات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں جو مسیلمہ پنجاب کے اندھے مقلدین قیام پاکستان کے اوائل سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ دونوں اس ناپاک عقیدے پر متفق و متحد ہیں کہ (نعوذباللہ) پاکستان جلد یا بدیر اکھنڈ بھارت بنے گا۔ یوں وہ ریاست پاکستان اور آئین پاکستان کی کھلم کھلا خلاف ورزی کے ناقابل معافی اور سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ عام پاکستانی جاننا چاہتا ہے کہ ریاست پاکستان کے خلاف سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرنے والے ان دریدہ دہنوں کے خلاف قانون حرکت میں کیوں نہیں آتا؟ کیا یہ آئین و قانون سے بالاتر کوئی غیر مرئی مخلوق ہے؟

زیر نظر کتاب قائداعظم محمد علی جناح کے دینی افکار اور اسلامی زندگی کے روشن گوشوں کو نمایاں کرتی ہے۔ اسلام، قرآن اور حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کی بے پایاں محبت و عقیدت اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ نہ صرف پکے اور سچے مسلمان تھے بلکہ ان کا دل ملت اسلامیہ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ وہ ایمانی بلندیوں کی اعلیٰ معراج پر فائز تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ساری زندگی مغرب میں رہنے کے باوجود مغربی طرز فکر سے متاثر نہ تھے بلکہ انھوں نے تحریک پاکستان کے دوران اپنے خطابات اور پریس کانفرنسوں میں دلائل و براہین سے اسلام کی برتری اور فوقیت ثابت کی۔ انھوں نے

مسلمانوں میں جو ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہندوؤں کے زیر اثر تھے، ایک نیا ولولہ، اُمنگ اور اعتماد بحال کیا۔ اللہ تعالیٰ اگر انھیں مزید زندگی عطا فرماتا تو ان کی خواہش کے عین مطابق پاکستان میں اسلامی دستور کی حکمرانی ہوتی۔ اس کتاب میں موجود تمام تحریریں انھی ناقابل تردید حقائق و واقعات کے ثبوت میں ہیں۔ یہ کتاب ماضی قریب کی وہ تاریخ ہے جسے قائداعظمؒ کے پاکستان میں مجرم ضمیر مذہبی اور سیاسی عناصر مسخ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اگر کوئی کھلی آنکھوں کے ساتھ ان تحریروں کا بنظر غائر مطالعہ کر لے تو وہ خود اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ قائداعظم محمد علی جناح واقعتاً ''اسلام کے سفیر'' تھے۔ یہ کتاب

- ایک ایسے بطل جلیل کی ہمت و عزیمت کی حیرت انگیز کہانی ہے جس کے غیر متزلزل استقلال اور عہد طراز جدوجہد نے قیام پاکستان کے ناممکن کو ممکن بنا کر چشم ارباب عالم کو خیرہ کر دیا۔
- ایک ایسے مجاہد کا اعجاز آفریں بیانیہ ہے جس نے ہزار رکاوٹوں اور جانگسل مشکلات کے باوجود ایک عظیم اسلامی و نظریاتی مملکت کے خدوخال کو اجاگر کیا۔
- ایک ایسے مرد میدان کی ولولہ انگیز داستان شجاعت ہے جس کا زاد سفر بے سروسامانی تھا لیکن اس نے محض اپنے بے پایاں ایمان و ایقان کی بدولت مجبور و محکوم اسلامیان برصغیر کو انگریز کے دوسو سالہ جبر اور مہاسبھا ہندوؤں کے طوق مکر و سازش سے نجات دلا کر آزادی کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز کیا۔
- ایک ایسے سچے اور پاکباز قائد کی خوبصورت سرگذشت حیات ہے جس کا سرمایہ متحدہ ہندوستان کے تمام جید علما و مشائخ کی مکمل تائید و حمایت، سرپرستی و اعتماد، آہ صبح گاہی کا نیاز اور نالہ نیم شبی کا گداز تھا۔
- ایک ایسی یگانہ روزگار ہستی کا ذکر عطر بیز ہے جو اصول و ضوابط کے سانچے میں ڈھلی اور آغوش صداقت و امانت کے گہوارے میں پلی تھی۔
- ایک ایسے پاسبان ملت کی مستند سوانح عمری ہے جس کے کردار و گفتار، افکار و افعال، تہذیب و شرافت، فہم و فراست اور دانش و بینش کو ان کے جارح ترین ناقدین نے بھی تسلیم کیا۔

- ایک ایسے مخلص میر کارواں کا دلنشیں تذکرہ ہے جس نے معرکہ حق و باطل میں لا الہ الا اللہ کی ضرب سے طاغوتی قوتوں کی ہر چال اور حربے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔
- ایک ایسی برگزیدہ ہستی کا ایمان افروز احوال ہے جس کے راست باز دل کی دھرتی کو اللہ تعالیٰ اور حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نگاہ لطف وعنایت کی نورانی بارش اور خصوصی توجہات کے ترشح نے ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھا۔

کبھی وہ مردِ حق چوکا نہ سچی بات کہنے سے
نہ تھی پروا کہ ہوں گے اہل باطل کس قدر برہم
وہ راہِ حق میں چلتی ہوئی تلوار تھی گویا
وہی تابش، وہی بُرّش، وہی جوہر، وہی دم خم
مخالف اُس کے استقلال ہی کو ضد سمجھتے تھے
بہ الفاظِ دگر ایمان تھا اُس کا بہت محکم
سیاست اُس کی اسلامی صداقت کا نمونہ تھی
نہ تدبیروں میں ٹیڑھا پن نہ تقریروں میں پیچ وخم
تری تصویر تھی اقبالؔ کے اس ایک مصرع میں
''یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم''

محمد متین خالد
لاہور
mateenkh@gmail.com

۞......۞......۞
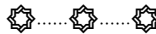
شکریہ!!!

- سب سے پہلے میں اپنے مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوں کہ اگر اس کی بے پایاں رحمت و عنایت نہ ہوتی تو یہ کتاب نہ وجود میں آتی اور نہ زیور طبع سے آراستہ ہوتی۔
- اس کے بعد میں شکرگزار ہوں، آسمان صحافت کے ماہتاب بابائے پاکستان جناب مجید نظامی، ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، معروف دانشور جناب پروفیسر یوسف عرفان کا جنھوں نے گرانقدر اور ایمان افروز تقاریظ لکھ کر کتاب کو چار چاند اور پانچ سورج لگا دیے۔
- علمی و ادبی حلقوں میں نہایت معتبر شخصیات جناب محمد احمد ترازی (کراچی)، جناب پروفیسر جمیل احمد عدیل (لاہور)، جناب محمد فرقان (لاہور)، محترمہ ڈاکٹر ریحانہ تنویر شہزاد (لاہور)، جناب سلیم منصور خالد (لاہور)، جناب محبوب الرحمٰن (اسلام آباد) اور جناب محمد عقیل (پنجاب پبلک لائبریری لاہور) کا جنھوں نے کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کئی مفید تجاویز دیں۔
- اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر مضبوط دسترس رکھنے والے جناب عبدالرؤف (اسلام آباد) کا جنھوں نے نہایت محنت اور باریک بینی سے اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی اور متعدد قیمتی تجاویز سے نوازا۔
- علم و عرفان پبلشرز کے مہتمم جناب گل فراز کا جنھوں نے اس کتاب کو باذوق رنگ دیا۔

محمد متین خالد

اِسلام کا سفیر
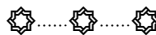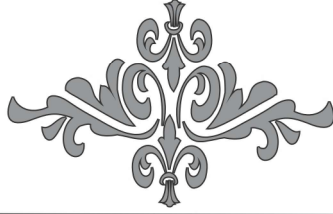
قدرت اللہ شہاب

پاکستان کا مطلب کیا؟

3 جون 1947ء کو قائدِ اعظمؒ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے پارٹیشن پلان پر آل انڈیا ریڈیو سے اپنے اپنے بیانات نشر کیے۔ میں نے یہ تاریخی براڈ کاسٹ کٹک کی 18 سول لائنز میں محلّہ کماری والے ڈائننگ روم میں بیٹھ کر سنا۔ میرا خانساماں رمضان کشمیری اور ڈرائیور روز محمد بنگالی بھی ریڈیو کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ جب قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا اعلان ہوا تو رمضان نے بڑی عقیدت اور پیار سے ریڈیو سیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ تقریریں ختم ہوئیں تو رمضان نے بڑی سادگی سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ایسے بڑے بڑے مسلمان، انگریز، ہندو اور سکھ ''صاحب لوگ'' مل کر مسلمانوں کے لیے پاکستان بنا رہے ہیں۔''

میں نے کہا رمضان تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟

''ہاں صاحب'' بالکل مالوم ہے۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ''**لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ**۔'' رمضان نے لہک لہک کر ترنم کے لہجے میں کہا۔

''تمھیں معلوم ہے یہ کیسے بنا ہے؟'' میں نے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی

''ہاں صاحب! مالوم ہے، بالکل مالوم ہے۔ بس **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ**۔''

رمضان کے پاس ایمان کی دولت تھی، اس لیے اس کے لیے اتنا یقین ہی کافی تھا۔ میرے پاس اخباری تراشوں کی بھاری سکریپ بُک تھی۔ میں نے کاغذ پنسل سنبھالی اور اپنی دانشوری کا بھرم رکھنے کے لیے تاریخی حوالوں کو کھنگال کر پاکستان کا مطلب نکالنے بیٹھ گیا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

1857ء کی جنگِ آزادی کی تکمیل کی طرف ایک مثبت قدم

پاکستان کا مطلب کیا؟

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر جو انھوں نے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں پیش کیا تھا۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

دینی، سماجی، معاشی، ثقافتی، تمدّنی اور سیاسی بنیادوں پر مسلمانوں کا ایک الگ قوم کی صورت میں ابھرتا ہوا تشخّص

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندوؤں کی گاؤ رکھشا، مسلمانوں کا ذبیحہ، ہندو کی چٹیا، مسلمانوں کا ختنہ، ہندو کے مندر کا ناقوس، مسلمانوں کی مسجد کی اذان، ہندو کی چھوت چھات، مسلمانوں کی اخوت اور مساوات......ان اختلافات کی وجہ سے مستقل اور مسلسل خون ریز تصادمات اور فسادات سے بچاؤ کا راستہ

پاکستان کا مطلب کیا؟

قومیت کی اجارہ داری پر ہندوؤں کی ضد اور ہٹ دھرمی، آزاد اور متحدہ ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنے کا کانگریسی جنون، آزاد اور متحدہ ہندوستان کی حکومت میں مسلمانوں کو کوئی موثر کردار دینے کے خلاف ہندو سرمایہ داروں کی زبردست مخالفت اور مزاحمت

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلم اکثریتی علاقوں کو بھارت ماتا کے پاک بدن پر گندے پھوڑے سمجھ کر انھیں کاٹ کر الگ کر دینے کا شدھ کانگریسی آپریشن

پاکستان کا مطلب کیا؟

بھارت کو برٹش کامن ویلتھ میں شامل رکھنے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور

کانگریس کی سودا بازی۔ اقتدار کو پندرہ ماہ کے بجائے دو ماہ میں منتقل کرنے کی سازش تا کہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو وجود میں آتے ہی ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

پاکستان کا مطلب کیا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھارت اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے کی کوشش تا کہ شروع ہی سے اس نئی مملکت کو بھارت کی حاشیہ نشینی کی عادت ڈال دی جائے اور اس کی پالیسیاں بھارت کی پالیسیوں کے ہم رنگ اور تابع ہوں

پاکستان کا مطلب کیا؟

کٹے پھٹے پاکستان کی پیشکش کے مقابلے میں دست برداری/ استعفیٰ کے منصوبے (DEMISSION PLAN) کی ننگی تلوار

پاکستان کا مطلب کیا؟

ہندوؤں کی جارحیت اور انگریزوں کی منافقت کے گٹھ جوڑ کے مقابلے میں قائدِ اعظمؒ کی بے لوث، بے لاگ، بے بدل، بے خوف، ایماندارانہ اور مدبّرانہ قیادت

پاکستان کا مطلب کیا؟

مسلمانوں کا قائدِ اعظمؒ کی راہنمائی پر مکمل اعتماد

پاکستان کا مطلب کیا؟

تحریک پاکستان کے دوران مسلمان قوم کا اتحاد، ایمان اور تنظیم

پاکستان کا مطلب کیا؟

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی

قائدِ اعظمؒ اور اسلامی ریاست

قائدِ اعظمؒ نے ہندوستان کی مسلمان ملت کے ملی تشخص کے لیے جو سیاسی جدوجہد کی، اس کی بنیاد اور دلیل یہی تھی کہ وہ مسلم ملت کے لیے ایک اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم ہونے کی حیثیت سے اپنی جداگانہ ریاست حق خودارادیت کی بنا پر قائم کرنے کا حق حاصل تھا۔

لیکن قائدِ اعظمؒ جب سے ہندوستانی سیاست میں داخل ہوئے تھے اور جس لگن سے وہ اس مقصد کے لیے کوشش بسیار کرتے رہے تھے، وہ بتدریج مطالعہ اور تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ جدید علوم کے آدمی اور جدید دور کی وطنی سیاست سے آگاہ انسان تھے لیکن ان کے مطالعہ نے انھیں اس بات پر مطمئن کرایا تھا کہ مسلمان ملت کے لیے ایسی جداگانہ تہذیب وتمدن کا مظاہرہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ زندگی کے تمام امور میں اپنے سیاہ وسفید کے خود مالک اور کامل آزادی سے بہرہ ور نہ ہوں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے وہاں کی اقوام میں وطن پرستی اور وطن پرستی پر مبنی جمہوریت رائج کی۔ یہ جمہوریت سیکولرازم یعنی دینی تصورات سے بے نیاز طرزِ زندگی پر مبنی تھی۔ سیکولرازم اور سیکولر جمہوریت پروگراموں کی روشنی میں عام آبادی کی رائے تبدیل کر کے اکثریت کو اقلیت اور اقلیت کو اکثریت بناتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس تصور مغربی جمہوریت کو بنیاد بنا کر انگریزوں نے ہندوستان میں بھی سیاست کو جاری کیا اور اس کی روشنی میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی جو خود بخود ملک کے حریت پسند سیاست دانوں کا پلیٹ فارم بن گئی۔ چنانچہ قائدِ اعظمؒ بھی اپنی تربیت، تعلیم

اور ہندوستان کی آزادی کے چیمپئن اور جمہوریت پسند ہونے کی حیثیت سے ابتدا میں کانگریس سے ہی وابستہ تھے لیکن کانگریس میں ہندو اکثریت کے طرزِ عمل نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے محسوس کرلیا کہ ہندوستان میں یورپ کی فضا نہیں ہے۔ یہ معاشرہ تصورات و پروگراموں کی بنا پر رائے بدل کر اکثریت کو اقلیت اور اقلیت کو اکثریت بنانے کی صلاحیت سے قاصر ہے۔ یہاں مغربی سیکولر جمہوریت کا تجربہ ایک ناکام تجربہ ہوگا۔ یہ طرزِ حکومت اکثریت کو ہمیشہ کے لیے اکثریت اور غلبہ عطا نہیں کرے گا جس میں اقلیت ہمیشہ اقلیت، محکوم اور تباہ حال ہوگی۔ اس احساس سے مجبور ہو کر وہ ہندوستان چھوڑ گئے اور اسی سیاست سے بد دل ہو کر انگلستان چلے گئے۔ ان کے سامنے اس وقت تک دوسرا کوئی متبادل راستہ نہ تھا۔ وہاں انھوں نے اسلام اور اس کے تصور سیاست کا مطالعہ کیا تو انھوں نے اندازہ کیا کہ رسول اکرم ﷺ کا دیا ہوا تصورِ قانون کس درجہ منصفانہ، بے خوف اور عدل پر مبنی ہے۔ انھوں نے سیرتِ رسول ﷺ کا مطالعہ کیا اور انھیں محسوس ہوا کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان حضرت محمد ﷺ ایک اسلامی ریاست کے بانی تھے۔ چنانچہ اس مطالعہ کے بعد ان کے خیالات اسلامی تصور مملکت اور اسلامی تصور قانون کے بارے میں واضح تر ہوتے چلے گئے۔

اسی دوران ان سے علامہ اقبالؒ نے خط و کتابت کا آغاز کیا اور ان کے سامنے اسلام کا تصور ریاست رکھا۔ ہندوستان میں مسلم ملت کا واحد حل اسلامی ریاست قرار دیا اور ساتھ ہی انھیں مجبور کیا کہ وہ ہندوستان واپس آ کر اس مظلوم اور بے سہارا ملت کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔ چنانچہ جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو وہ ایک بدلے ہوئے انسان تھے جن کا نصب العین مکمل طور پر واضح تھا یعنی ایک اسلامی ریاست کا قیام......اس مقصد کے لیے ہندوستان میں مسلم ملت کی اکثریت کے علاقے اس کا بہترین رقبہ تھے اور یہاں ان علاقوں میں اس اسلامی ریاست کی بنیاد پہلے سے موجود تھی۔ مسلمانوں کے قبضے میں شمال مغربی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان میں علاقہ (Territory) پہلے سے موجود تھا۔ آبادی موجود تھی اور اس طرح فطری طور پر ایک

جمہوری حکومت مسلمانوں کی ہی تشکیل پا سکتی تھی۔ بس ایک آزادی یعنی حاکمیت (Sovereignty) کی ضرورت تھی اور اس کے لیے جدوجہد درکار تھی۔ چنانچہ انھوں نے انگلستان سے واپسی کے بعد ایک اسلامی ریاست (جسے وہ پاکستان کہتے تھے) کے قیام کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ وہ سیکولر جمہوریت کے تصورات کے تحت ہندو مسلم گروپوں کو ایک ہی قوم کے دو گروہ تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ ان دونوں گروپوں کے جداگانہ قومیں ہونے کے مدعی تھے۔ وہ فرماتے ہیں۔

❑ ''ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہندو اور مسلم دو بڑی قومیں ہیں جو قوم کی ہر تعریف اور معیار پر پورا اترتی ہیں۔ ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ مزید برآں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ، فن تعمیر، احساس و اقدار و تناسب، قانونی احکام و اخلاقی ضوابط، رسم و رواج، تقویم (کیلنڈر)، تاریخ اور روایات، رجحانات اور عزائم کی مالک ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک امتیازی زاویہ نگاہ ہے اور قانون بین الاقوامی کی ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں۔''

(''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' بزبان انگریزی، مرتبہ جمیل الدین احمد، ص 181)

پھر جب پاکستان کی جدوجہد کی ایک تحریک چل پڑی تو انھوں نے اس تحریک کے مختلف مراحل میں اپنے ان تصورات کا اظہار کیا۔

❑ ''ہم مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں ہم صرف اپنے ضابطہ حیات، اپنے تہذیبی ارتقا، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔''

(''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' بزبان انگریزی، مرتبہ جمیل الدین احمد، ص 437)

24 نومبر کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''ہمارا دین، ہماری تہذیب اور ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔''

(''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' بزبان انگریزی، مرتبہ جمیل الدین احمد، ص 422)

ایک اور موقع پر اسلامیہ کالج پشاور میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''مسلم لیگ ہندوستان کے ان حصوں کی آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تا کہ وہاں وہ اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔''

(''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' بزبان انگریزی، مرتبہ جمیل الدین احمد ص 446)

29 جون 1947ء کو سرحد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے بیان دیا۔

❑ ''خان برادران نے اپنے بیانات اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شوشہ چھوڑا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی، یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔''

کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے دی گئی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔''

(پاکستان ٹائمز 27 جنوری 1948ء)

غرض یہ کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کے اسلامی ریاست ہونے کے بارے میں بہت واضح اور پرعزم تھے۔ انھوں نے ساری تحریک پاکستان، اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ہی چلائی اور ہندوستان کی مسلم ملت نے اس خیال سے تحریک پاکستان کا ساتھ

دیا کہ یہ ملک ایک اسلامی ریاست بنایا جائے گا۔ وہ مارچ 1940ء میں یہ کہتے کہ پاکستان ہم لادینی نظریات کے فروغ کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پاکستان سے مراد اسلامی ریاست نہیں ہے تو قطعاً ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اتنی یکسوئی کے ساتھ ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتے اور اتنی قربانیاں دینے پر آمادہ ہوتے۔ اسلامی ریاست اور اس میں اسلامی نظام کا خواب مسلمان ملت کا صدیوں کا خواب ہے اور جس جگہ اور جس خطہ میں بھی نمودار ہو، مسلمانوں کی محبت وعقیدت کا مرکز وہی خطہ بن جاتا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد

پاکستان: اسلامی یا سیکولر ریاست؟

قائداعظم کے ساتھ اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہوسکتا کہ ان کی تقریر کے چند جملوں کو توڑ مروڑ کر سیکولر ریاست کی تشکیل اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے کی بنیاد بنایا جائے۔ قائداعظم، مسلم لیگ کی پوری قیادت اور سب سے بڑھ کر برعظیم کی ملّت اسلامیہ نے اپنی منزل اور مقصود کا اظہار بالکل واشگاف الفاظ میں کیا تھا۔ یہی وہ آدرش تھے جن کے حصول کے لیے ساری جدوجہد کی گئی اور بیش بہا قربانیاں دی گئیں۔ سیکولر قوانین کی بات کرنے والے کیا اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے 1930ء کے خطبے میں جو استدلال پیش کیا تھا، اس کی بنیاد ہی دین و دنیا کی وحدت پر ہے۔ ان کا دعویٰ ہی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا اپنا اجتماعی نظام ہے، اس اجتماعی نظام کے بغیر وہ دین نامکمل اور مسلمان اس کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔ قائداعظم کے نام 28 مئی 1937ء کے خط میں علامہ اقبال نے صاف لفظوں میں لکھا تھا:

❑ ”اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور ترقی ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر ناممکن ہے۔ مجھے اس پر دیانتداری سے کئی برسوں سے مکمل یقین رہا ہے اور میں اب بھی یہی یقین رکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے روٹی کا مسئلہ حل کرنے اور ایک پُرامن انڈیا کی خدمت کرنے کے لیے یہی ایک واحد راستہ ہے“۔

گویا کہ امن اور روٹی دونوں کے لیے آزاد مسلم ملک کا قیام اور شریعت کا نفاذ ضروری ہے۔ یہی اصل ایشو تھا اور قائداعظم نے اسے بار بار واضح کیا:

❑ ”پاکستان کا مطلب صرف آزادی اور خودمختاری نہیں ہے بلکہ مسلم نظریے کا

تحفظ بھی ہے جو ایک قیمتی تحفے اور خزانے کے طور پر ہمیں ملا ہے، اور ہمیں اُمید ہے کہ دوسرے اس میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے‘‘۔

دیکھیے بات صرف مسلم نظریے ہی کی نہیں، اس کے تحفظ و ترقی کی بھی ہے۔ مقصد اس کی تبلیغ اور دوسروں تک اس کو پہنچانا ہے۔ قائداعظم جس کا اعلان کررہے ہیں۔ غیر مسلم اکثریت اور غیر اسلامی نظریہ اگر مسلمانوں پر مسلط کیا جائے تو یہ کیسی جمہوریت ہوگی، خود قائداعظم کے الفاظ سن لیجیے:

- ’’جہاں تک میں نے اسلام کو سمجھا ہے، اسلام ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ غیر مسلموں کی اکثریت کے ہاتھ دیدے۔ ہم ایک ایسا نظام حکومت قبول نہیں کر سکتے جس میں غیر مسلم محض اپنی عددی اکثریت کی بنا پر ہم پر غالب ہوں اور حکمرانی کریں‘‘۔ (تقریر علی گڑھ یونیورسٹی، 6 مارچ 1940ء)

لیکن سیکولر لابی کا تو دعویٰ یہ ہے کہ مسلمان ملک میں مسلمانوں کی اکثریت کے عقائد اور تصورات کو ترک کر کے، محض غیر مسلم اقلیت کی خاطر ان پر سیکولرازم مسلط کر دیا جائے۔ یہ ہے جمہوریت کی تازہ ترین تعبیر!

قائداعظم نے بار بار فرمایا کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے، مسلمان ایک عقیدے اور دین پر مبنی قوم ہیں، قرآن ان کا قانون حیات ہے، نبی کریم ﷺ ان کے حقیقی قائد اور قانون دینے والے ہیں، قرآن وسنت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرنے والی قوت ہیں۔ سیکولرازم اور یہ تصور حکمرانی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قائداعظم کے نام پر ان کے تمام عہد و پیمان اور خطبات و ارشادات کو نظرانداز کر کے سیکولرازم کی بات کرنا، نرم سے نرم لفظوں میں ایسی کھلی بددیانتی ہے جس کا ارتکاب بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

تحریک پاکستان کے قائدین نے 12 مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد پوری یکسوئی کے ساتھ منظور کی جو پاکستان کے دستور نظام حکمرانی اور اجتماعی پالیسی کی بنیاد ہے۔ اسے پوری قوم کی تائید حاصل ہے۔ قائداعظم نے بہت صاف الفاظ میں یہ اصول

بیان کر دیا تھا کہ پاکستان کا دستور کسی ایک شخص کی مرضی کا مظہر نہیں ہوگا، پوری ملت اسلامیہ پاکستان اپنی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے اسے طے کرے گی۔ کوئی فرد نہ دستور سے بالا ہے اور نہ دستور کو اپنی آواز کی بازگشت تصور کر سکتا ہے۔ دیکھیے قائداعظم نے قوم سے کیا عہد کیا تھا:

- ''جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ جبکہ ہم نے تیرہ سو سال پہلے جمہوریت سیکھ لی تھی۔ آپ پاکستان کے طرز حکومت کے بارے میں میری ذاتی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتا ہوں کہ دستور ساز اسمبلی جیسے بااختیار ادارے کے فیصلے سے پہلے کوئی ذمہ دار شخص اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہیے۔ پاکستان کے لیے دستور بنانا، دستور ساز اسمبلی کا کام ہے۔'' (پریس کانفرنس 14 جولائی 1947ء)

یہی وہ دستور ساز اسمبلی ہے جس نے 12 مارچ کو قرارداد مقاصد منظور کر کے ریاست کے کردار کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا اور قانون کی زبان میں بات ادا کر دی جس کا عہد قائداعظم نے مسلمانان پاک و ہند سے کیا تھا۔

- ''مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد صرف کلمہ توحید ہے، نہ وطن، نہ نسل۔ جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا تھا، وہ ایک الگ قوم کا فرد بن گیا تھا۔ آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرک کیا تھا؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی نہ انگریزوں کی چال...... یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا''۔

(مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، خطاب 8 مارچ 1946ء)

قائداعظم نے کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے 25 جنوری 1948ء کو (اگست 1947ء والی تقریر کے پانچ مہینے بعد) یہ فرمایا تھا:

- ''اسلام محض رسوم و روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں، اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے، جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی، اپنے افعال و اعمال حتیٰ کہ سیاست اور معاشیات اور دوسرے شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا

ہے۔ اسلام سب انسانوں کے لیے انصاف، رواداری، شرافت، دیانت اور عزت کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ صرف ایک خدا کا تصور اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسلام میں انسان، انسان میں کوئی فرق نہیں۔ مساوات، آزادی اور اخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں''۔

1948ء ہی کی ایک تقریر میں انھوں نے اسلامی حکومت کے تصور کو بھی ان الفاظ میں بیان کر دیا تھا:

❑ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس میں تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص کی، یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت (پاکستان) کی ضرورت ہے''۔

اگر قائداعظم نے یہ سب صاف لفظوں میں کہا تو پھر بتایا جائے کہ ان کے وژن میں سیکولرازم کہاں سے آ گیا؟ جس تصور کو سیکولر حضرات ''خلاف جناح تصور'' کہہ رہے ہیں۔ قائداعظم تو چیخ چیخ کر اس کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ تصور ہی قرارداد پاکستان کی سطر سطر سے عیاں اور نمایاں ہے اور پورا دستور اس کا آئینہ دار ہے۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ عوام کی مرضی، تحریری دستور کے واضح احکام اور قوم کی تاریخی روایات تو ایک ''متشدد اقلیت'' اور ''خلاف جناح وژن'' قرار پائیں اور ایک غیر ملکی اور چند سیکولر دانشوروں کی یاوہ گوئی جناح کا تصور پاکستان بن جائے۔

قائداعظم یا اقبال کے تصور پاکستان کو اپنے من پسند مفہوم میں پیش کرنے والے سیکولر حضرات جو بھی استدلال برتتے ہیں، وہ اپنے داخلی تضاد کی وجہ سے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ ایک جانب تو وہ جمہوریت کے اصول کا علم بلند کرتے ہیں، مگر دوسری

جانب ایک تقریر یا کسی ایک اقتباس کی بنیاد پر پوری قوم کے عزم اور **will** کو مسترد کرنے کا شاہانہ اختیار استعمال کرنے کی دُہائی دیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ حلقے جمہوریت کے ساتھ مخلص ہیں یا کسی ایک قول کی بنیاد پر پوری قوم کی جدوجہد اور عزائم کو اپنی من پسند تعبیر کی سولی پر لٹکانے کے طرفدار۔ اس مسئلے پر بات کرنے سے پیشتر یہ اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک مسلمان کے لیے بنیادی سرچشمۂ ہدایت اور آخری معیارِ حق، قرآن اور سنت رسول ﷺ ہے۔ دیگر محترم سے محترم اور فاضل سے فاضل شخصیات کا مقام نہ صرف لازمی طور پر ان کے بعد میں آتا ہے بلکہ ان کی آرا، افکار اور فیصلوں کو قرآن وسنت ہی کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔

مفتیانِ مغرب نے اسلامی احیائی تحریک کے بارے میں سب سے پہلے تو ''بنیاد پرست'' کی اصطلاح وضع کر کے مغالطہ پیدا کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے، جو فرد ترقی کا دشمن ہو، دور حاضر کے تقاضوں کو نظرانداز کرنے والا ہو یا اسلام کی کسی ایسی تعبیر سے چپکا ہو، جس کی بنا پر اسلام وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے، وہ بنیاد پرست ہے۔'' امر واقعہ کے اعتبار سے یہ انتہائی غلط، یک رُخا، بدنیتی پر مبنی اور مبالغہ آمیز پروپیگنڈا ہے۔ البتہ اب سے تین عشرے پہلے مغرب کے مستشرقین (orientalists) نے ایسے لوگوں کے لیے ''مسلمان بنیاد پرست'' کی اصطلاح استعمال کی تھی: ''جو یہ چاہتے ہیں کہ اسلام جیسا کہ وہ ہے جیسا کہ مسلمان اس کو سمجھتے ہیں، اسے اس کی بنیادی روح کے مطابق نافذ کر دیا جائے۔''

مغرب یہ چاہتا ہے کہ اسلام کا نام تو چاہے رہے، جس طرح کہ عیسائیت کا نام باقی ہے لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ کی کتاب، الہامی ہدایت اور اسوۂ رسولِ آخرالزماں ﷺ کو حاصل نہ ہو، بلکہ انسان اپنی ذاتی مرضی، بدلتے ہوئے اغراض و مقاصد کی روشنی میں ان معاملات کو مغربی پیمانۂ فکر کے مطابق طے کرے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اہل مغرب پسند کرتے ہیں، بس آنکھیں بند کر کے وہ قبول کی جائے۔ اسی کے اندر مسلمان ڈھل جائے تو یہ ''ترقی پسندی، تعمیر پسندی، دانشمندی اور میانہ روی ہے۔

اور اگر قرآن وسنت کی بنیاد پر مسلمان اپنے اصول، اپنے نظریے، اپنی روایات، اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب پر عمل کرنا چاہے تو یہ ''بنیاد پرستی'' ہے۔ یہ بات مغربی دانشوروں کی اُن تمام تحریروں میں نمایاں ہے جو آج مغرب سے آ رہی ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ نے حال ہی میں بہت کھل کے یہ بات کی ہے۔ ''دراصل جو لوگ اسلام کے اس روایتی تصور کو غالب کرنا چاہتے ہیں، جو قرآن اور نبی پاک ﷺ نے پیش کیا ہے، وہی لوگ بنیاد پرست ہیں۔ اور جو لوگ اسلام کو مغرب کے معیار پر بدلنے اور ڈھالنے کے لیے تیار ہیں، وہ لبرل ہیں اور وہی ہمارے اصل دوست ہیں۔''

اب یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کا موقف اس ذیل میں کیا تھا؟ علامہ اقبال نے جدید اور قدیم دونوں علوم کے مآخذ سے استفادہ کیا اور پوری قوت ایمانی کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام حق ہے اور مغرب جس بنیاد پر قائم ہے، یعنی سیکولرازم، نیشنلزم، ریشنلزم، سائنس پرستی...... یہ بنیاد، بنیادِ خام ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اسلام کو ایک انقلابی تصور کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں اگر آپ اقبال کی شاعری کو جو ان کے فکر کے اظہار کا اصل ذریعہ ہے، نظر انداز بھی کر دیں، تب بھی ان کا یکم جنوری 1938ء کا سال نو کا پیغام دیکھ لیجیے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے:

- ''اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے، جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر کی حُریت اور شرف انسانیت کی اقدار کی اس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے **الخلق عیال اللّٰہ** کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا

جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور یہ تصور اسلام کا تصور ہے۔''

علامہ محمد اقبال نے اپنی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے آخری خطبے میں جدید قانون سازی اور قانون ساز اسمبلیوں پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے آخری حصے میں انھوں نے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر برملا کہا ہے:

❑ ''انسانیت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مغرب ہے۔ یورپ کے دیئے ہوئے تصورِ حیات سے جب تک انسان نجات نہیں پاتا، انسانی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق کائنات کی نئی اخلاقی تعبیر، صاحب ایمان فرد کی دریافت اور اجتماعی عدل پر معاشرے کی تعمیر، یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر دنیا کو قائم کرنا چاہیئے''۔

یہی علامہ اقبال کا مشن تھا۔ اسی طرح بلاشبہ قائداعظم کا ایک دور وہ بھی تھا جب وہ نہ صرف انڈین نیشنل کانگریس میں سرگرم عمل تھے، بلکہ اس کے مرکزی قائدین میں سے تھے۔ تب وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر تھے۔ گاندھی جی اور مدن موہن مالویہ کے رفیق خاص تھے۔ لیکن اس کے بعد جب قائداعظم نے برہمنی ذہنیت کا قریب سے مشاہدہ کر لینے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو کی اور **1936**ء سے **1940**ء تک مسلم انڈیا کے حالات کا بے لاگ تجزیہ کیا، تب وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیاد پر اپنے اخلاق، اپنے عقیدے، اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب و تمدن کی بنیاد پر ایک الگ قوم ہیں، محض ایک اقلیت نہیں ہیں اور فکر اقبال کی روشنی میں ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلے کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، وہاں ان کی آزاد اسلامی ریاست قائم ہو اور مسلمان اس ریاست کو اسلام کی بنیادوں پر اور اسلام کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق قائم کریں۔ میں اس سلسلے میں قائداعظم کی آخری پانچ برس کی تقریروں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ قائداعظم کا اس معاملے میں کیا مؤقف تھا؟

جہاں تک جدید اسلامی جمہوری ملک کا تعلق ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال اور قائداعظم جس بات کے حامی اور علمبردار تھے اور جس بات کے لیے انھوں نے بھرپور جدوجہد کی، وہ قرآن وسنت کی لاثانی اور ابدی ہدایات کی روشنی میں ایک مسلمان معاشرے اور ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا۔ ایسا معاشرہ جو عمرانی عدل (social justice) کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جس میں اسلام کا قانون جاری و ساری ہو جس میں مسلمان مغربی اقوام کی غلامی اور ان کی نقالی کے بجائے اسلام کو بطور دین ہدایت اور مستقل کلچر کی حیثیت سے پیش کریں۔ یہ تھا بانیان پاکستان کا تصور...... وہ لوگ جو اس سے ہٹ کر چل رہے تھے، ان پر علامہ اقبال اور قائداعظم نے گرفت کی اور خصوصیت سے ترکی پر، جو اپنے آپ کو یورپ کے سانچے میں ڈھالنے میں مصروف تھا۔

قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تقریر قائداعظم نے بہت ہی مخصوص حالات میں کی تھی۔ پوزیشن یہ تھی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا دوسرا اجلاس تھا، جس میں قائداعظم کو صدر منتخب کیا گیا اور اس انتخاب پر اظہار تشکر کرتے ہوئے قائداعظم نے یہ تقریر کی تھی۔

انھوں نے اپنے دل کے زخم قوم کے سامنے رکھے کہ آج برعظیم میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، انسان، انسان کو قتل کر رہا ہے، بے گناہ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، حقوق پامال ہو رہے ہیں اور اس صورتحال میں ہم جو ریاست حاصل کر رہے ہیں، اس میں کسی کا کوئی بھی مذہب ہو، خواہ وہ اسلام ہو، خواہ وہ ہندو مذہب ہو، ان سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس تقریر میں مسئلہ ریاست کی نوعیت کا نہیں بلکہ مسئلہ شہریوں کے حقوق اور جان و مال کے تحفظ کا ہے۔ شہریت اور جان و مال کے تحفظ کے باب میں اسلام، مسلمانوں اور غیر مسلموں کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ یہ روایت سیکولرازم کی نہیں، بلکہ اسلام کی ہے۔ اسی طرح قائداعظم کے الفاظ Business of the State بہت اُچھالا جاتا ہے۔ یہ بھی علمی خیانت ہے کیونکہ بزنس آف دی سٹیٹ کا مقصود ومطلوب Nature of the State نہیں

ہوتا۔ بزنس آف دی سٹیٹ سے مراد صرف انتظام و انصرام ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور تعبیر نہیں کی جا سکتی۔

جو لوگ اس تقریر کو سیکولرازم کے جواز کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قائداعظم نے اس تقریر سے پہلے اور اس تقریر کے بعد بھی پاکستان کے اسلامی تشخص اپنانے، اسلامی قانون کو بنیاد بنانے، قرآن وسنت کی روشنی میں یہاں کے نظام کو ترتیب دینے اور اسلامی عدل اجتماعی کی بنیاد پر معاشرے کو استوار کرنے کی ضرورت و اہمیت کو تسلسل کے ساتھ بلا انقطاع بیان فرمایا ہے اور اس سلسلے میں ان کی وہ تقریر حرف آخر ہے جو انھوں نے سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر جولائی 1948ء میں فرمائی ہے۔ اس میں بھی اور اس سال عید کے پیغام میں بھی انھوں نے کہا کہ ''ہم ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں'......سوال یہ ہے کہ قائداعظم کی محض 11 اگست والی تقریر ان کے باقی تمام اقوال کو نظرانداز کر کے کیسے لی جا سکتی ہے اور وہ ان کے پہلے اور بعد والی تمام تقاریر و بیانات کو منسوخ کر دینے والی تقریر کیسے بنائی جا سکتی ہے؟ کیا فقط یہی ایک تقریر معتبر ہے اور ان کی باقی تمام تقاریر غیر معتبر اور غیر متعلق ہیں؟ کسی شخص کے فکر اور تصور کو سمجھنے کے لیے کیا کسی ایک چیز کو اس کے سیاق وسباق سے نکال کر دیکھا جاتا ہے یا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے؟ اور اگر ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے اور رکھنا چاہیے تو قائداعظم کا تصور اسلامی ریاست بھی بالکل واضح ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کی نگاہ میں قائداعظم اتنے بے اصول انسان تھے کہ قوم سے وعدہ تو انھوں نے اسلامی نظام کا کیا اور کہا میں تمھیں پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کی اس لیے دعوت دے رہا ہوں کہ تم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے، اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کی علمبردار قوم کی حیثیت سے جدوجہد کرو۔ لیکن ابھی آزادی ملنے میں تین دن باقی ہیں کہ وہ اپنے سارے کیے کرائے کے اوپر پانی پھیر دیں، اس سے ایک دم پیچھے ہٹنے کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ میں تو ایک لادینی اور سیکولر سٹیٹ کے لیے کام کرتا رہا

ہوں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ ایسی تضاد بیانی کا شکار ہوں کہ ستمبر 1947ء سے لے کر جولائی 1948ء تک جتنی تقاریر کریں، ان میں پھر وہ اسلام ہی کا اعادہ کریں اور پاکستان کو اسلامی تجربہ گاہ بنانے کے دعوے کریں؟

لیکن معاف کیجیے قائداعظم تضاد بیانی کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح وہ کوئی بے اصول انسان بھی نہ تھے، نہ قائداعظم پر کسی قسم کی ژولیدہ فکری کا الزام لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان پر نفاق کی تہمت لگائی جا سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ جرأت کے ساتھ اپنے مؤقف پر قائم رہے، جس بات کو درست سمجھا ہے اس کو برملا کہا ہے۔ انھوں نے کبھی متضاد باتیں نہیں کیں۔ قائداعظم کی اس تقریر کو ان کی باقی تقاریر کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا اور اسی کے مطابق تطبیق اور اس کی تعبیر کرنا ہوگی۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام میں تھیوکریسی نہیں ہے اور اسلام میں شہریوں کے حقوق برابر ہیں۔ یہ بات اسلام کے مطابق ہے جس میں مسلمان، غیر مسلم سب شہری یکساں حقوق کے مالک ہیں بشرطیکہ وہ اپنی شہریت کے تقاضے پورے کریں۔ اس کے ساتھ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پاکستان ایک سیکولر سٹیٹ ہوگا یا پاکستان ایک ایسی سٹیٹ ہوگا جس کا مذہب اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو یا اسلامی قوانین جاری نہ ہوں...... یہ اس تقریر کی غلط تعبیر ہوگی۔

قائداعظم پر میری نگاہ میں یہ الزام اور بہتان ہے۔ ان تمام الزامات سے بڑا الزام اور بہتان ہے جو قائداعظم کے بڑے سے بڑے ناقد اور مخالف بھی ان پر لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جو لوگ قائداعظم کی فکر کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں، وہی دراصل قائداعظم کے کردار کو گھنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم قائداعظم کے خیالات کی جو تعبیر کر رہے ہیں، یہ وہی تعبیر ہے جو ان کے پورے کردار سے اور ان کے تمام ارشادات سے ہم آہنگ ہے اور جس میں بجا طور پر قائداعظم کی ایک دیانتدارانہ، منصفانہ اور خود ان کی اُمنگوں کی ترجمان تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

✧......✧......✧
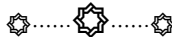
ڈاکٹر صفدر محمود

قائداعظم کا تصور پاکستان

دانشوروں کا ایک منظّم گروہ گزشتہ چند برسوں سے دن رات یہ ڈھنڈورا پیٹنے میں مصروف ہے کہ قائداعظم سیکولر ذہن کے مالک تھے اور وہ پاکستان میں سیکولر نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ یہ حضرات قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو اپنا سیکولر ایجنڈا آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں کیونکہ انھیں قائداعظم کی دیگر ہزاروں تقاریر میں کوئی ایسا موادنہیں ملتا جسے وہ پروپیگنڈا مہم کا ہراول دستہ بنا سکیں۔ قائداعظم نے تقسیم ہند سے قبل تقریباً 101 مرتبہ یہ اعلان کیا کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جائے گی۔ انھوں نے لاتعداد مرتبہ کہا کہ قرآن ہمارا راہنما ہے اور ہمیں قرآن ہی سے راہنمائی کی روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ ان سینکڑوں اعلانات اور وعدوں کے باوجود سیکولر حضرات اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ذہن کے دریچے کسی اختلافی بات پر کھولنے کے لیے تیارنہیں۔

اللہ جانتا ہے کہ میرا کوئی ذاتی ایجنڈا نہیں، میری سوچ کا محور و مرکز صرف پاکستان ہے اور میں خلوص نیت سے سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے نظام کا فیصلہ پاکستان کے عوام نے کرنا ہے جنھوں نے پاکستان کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اگر مجھے قائداعظم کی تقریروں سے کہیں بھی سیکولرازم (لادینیت) کی بُو آتی تو میں اسے نہ صرف تسلیم کرتا بلکہ کھلے ذہن سے اس کا اظہار کرتا کیونکہ میرے نزدیک قائداعظم سے عقیدت اور فکری دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ بابائے قوم کے فرمودات کو کھلے ذہن اور تعصب سے پاک دل کے ساتھ پڑھا جائے۔ 11 اگست کو دستورساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے کے بعد

قائداعظم کی تقریر فی البدیہہ تھی اوراس میں انھوں نے باقی باتوں کے علاوہ جس طرح مذہبی اقلیتوں کو برابری کے درجے کا وعدہ کیا اور مذہبی آزادی کا پیغام دیا، وہ دراصل میثاق مدینہ کی روح کے مطابق ہے جوحضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے مذہبی اقلیتوں سے کیا تھا اورانھیں برابر کے شہری حقوق دیے تھے۔

ایک ریسرچ سکالر کے بقول قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل تقریباً 101 مرتبہ یہ اعلان کیا کہ نئی مملکت کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار کی جائیں گی۔ یوں تو ان کی سینکڑوں تقریریں اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں لیکن آپ کواس کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھانے کے لیے میں قائداعظم کے خط بنام پیر مانکی شریف آف صوبہ سرحد سے چندسطریں پیش کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس خط کا ذکر قائداعظم کی تقاریر اور اکثر کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ ہی لوگ عام طور پر اس سے آگاہ ہیں۔ یاد رہے کہ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان بے پناہ سیاسی اثر رکھتے تھے اور انھیں کانگریس کے ایک ستون کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا صحیح معنوں میں توڑ پیر آف مانکی شریف تھے جن کی مسلم لیگ کے لیے حمایت سیاسی پانسہ پلٹ سکتی تھی۔ 1945ء میں پیر صاحب نے مسلم لیگ کو جوائن کرنے سے قبل قائداعظم سے تصور پاکستان کے حوالے سے وضاحت چاہی تو قائداعظم نے پیر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے وضاحت کی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کبھی شریعت کے منافی قوانین نہیں بنائے گی اور نہ ہی پاکستان کے مسلمان غیراسلامی قوانین کی اجازت دیں گے۔

(حوالہ دستور ساز اسمبلی کارروائی، 9 مارچ 1949ء، جلد 5، نمبر 3، ص 46)

آج یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد نوزائیدہ مملکت کو مسائل کے کوہ ہمالیہ کا سامنا تھا جن میں خاص طور پر لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری، خالی خزانہ، وسائل کا فقدان اور نئی مملکت کے لیے انتظامی ڈھانچے اور مرکزی حکومت کا قیام قابل ذکر ہیں۔ دوسری طرف خود قائداعظم کی صحت روز بروز گر رہی تھی اور کئی دہائیوں کی مسلسل محنت نے انھیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا، چنانچہ قیام پاکستان کے ایک برس

بعد وہ ستمبر 1948ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

قائداعظم زندہ رہتے تو کس طرح اپنے وعدے شرمندہ تعبیر کرتے اور کس طرح نئی مملکت کی تعمیر کرتے، اس کا اندازہ ان کے دستور ساز اسمبلی کے 14 اگست 1947ء کے خطاب سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے نبی کریم ﷺ کو اپنا رول ماڈل قرار دیا اور فروری 1948ء کے امریکی عوام کے نام پیغام سے واضح ہوتا ہے جس میں انھوں نے پاکستان کو پریمئر اسلامی ریاست قرار دیا اور واضح کیا کہ پاکستان کا دستور جمہوری طرز کا ہو گا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اس ارادے کی ایک معمولی سی جھلک پاکستان کے ممتاز جرنیل جنرل محمد اکبر خان (رنگروٹ) کی کتاب ''میری آخری منزل'' کے صفحہ 281 میں ملتی ہے جو بہت سے لوگوں کے لیے اچنبھے کا باعث ہو گی۔ جنرل محمد اکبر (آرمی پی اے نمبر 1) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ 25 جون 1948ء سے تین دن کے لیے علیل قائداعظم کے زیارت میں مہمان رہے۔ قائداعظم سے ملاقات میں جنرل اکبر نے فوجی میسوں میں انگریز حکومت کی شروع کی گئی شراب نوشی کی رسم کو ختم کرنے کی تجویز دی۔ جس کے جواب میں قائداعظم نے اپنے اے ڈی سی کو بلایا اور کانفیڈریشن باکس لانے کو کہا۔ ''قائداعظم نے جیب سے چابی نکالی اور باکس کو کھول کر مراکشی چمڑے سے جلد بند ایک کتاب نکالی، انھوں نے اسے اس مقام سے کھولا جہاں نشانی رکھی ہوئی تھی اور فرمایا، جنرل! یہ قرآن مجید ہے، اس میں لکھا ہے کہ شراب اور منشیات حرام ہیں، لہٰذا میں نے عرض کیا کہ آپ ایک حکم جاری کریں اور افسروں کو متنبہ کریں کہ شراب حرام اور منع ہے۔ قائداعظم مسکرائے اور فرمایا، کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ قائداعظم کا حکم قرآن مجید کے احکامات سے زیادہ مؤثر ہو گا...... سٹینو کو بلایا گیا، قائداعظم نے ایک مسودہ تیار کیا اس میں قرآنی آیات کی جانب توجہ دلا کر فرمایا کہ شراب و منشیات حرام ہیں۔ میں نے اس مسودے کی نقل لگا کر شراب نوشی بند کرنے کا حکم جاری کر دیا جس پر میری ریٹائرمنٹ تک عمل ہوتا رہا۔''

قائداعظم کانفیڈریشن باکس ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے اور اس باکس میں قرآن

مجید کا نسخہ بھی شامل تھا۔ جنرل اکبر کی عینی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم قرآن مجید پڑھتے اور ضروری مقامات پر نشانیاں بھی رکھتے تھے۔ اگر انھیں موقع ملتا تو وہ یقیناً اسلامی اصولوں کے نفاذ کے لیے اقدامات کرتے اور تصور پاکستان کو حقیقت کا جامہ پہناتے، لیکن بدقسمتی سے موت کے بے رحم ہاتھوں نے قائد کو ہم سے چھین لیا اور تکمیل پاکستان کی جدوجہد ادھوری رہ گئی اور پھر ملک پر جاگیردار، گدی نشین، موروثی سیاستدان، امرا اور جرنیل چھا گئے جنھوں نے پاکستان کو پاکستان نہ بننے دیا۔

محمد الطاف قمر

اے قائداعظمؒ! ہم شکرگزار ہیں

اے ہمارے قائداعظم محمد علی جناحؒ! ہمیں وہ دن اچھی طرح یاد ہیں کہ جیسے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی اور باوجود اس کے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی رعایا کے ساتھ ہر معاملے میں حد درجہ رواداری اور عدمِ تعصب کا مظاہرہ کیا، ہر مذہب وملت کے لوگوں کو برابر کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حقوق دیئے اور اپنے دین کو زبردستی ٹھونسنا تو کیا سرکاری طور پر اس کی تبلیغ وفروغ کی سِرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی لیکن پھر بھی ہندوؤں نے مسلمان دشمنی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا۔انھوں نے عمومی طور پر انگریزوں کو خوش آمدید کہا اور صرف مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے اُن کے ہم رکاب ہوگئے۔ انگریزوں کے مشورہ پر ہی انڈین نیشنل کانگریس بنائی اور اس اُمید پر آزادی کی جدوجہد شروع کی کہ انگریز کے جانے کے بعد اکثریتی آبادی ہونے کے ناتے اقتدار اُن کے ہاتھ آئے گا اور پھر وہ مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ محکومی کا بدلہ لیں گے۔اس دوران وہ مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کی دھمکیاں، ہندوستان کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرنے اور مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کے عزائم کا کُھلم کُھلا اظہار کرتے رہے اور موقع بے موقع، بات بے بات، کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے اور اسے ہندو مسلم فسادات کا نام دیتے جس میں نقصان صرف مسلمانوں کا ہی ہوتا۔

اے قائد! ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ آپ بھی شروع دنوں میں کانگریس میں شامل تھے لیکن پھر آپ پر ہندو کا اصل رُوپ کُھل گیا۔آپ پر اُن کی عادات واطوار اور

مسلمانوں کے بارے میں اُن کا بُغض وکینہ اور مکروہ عزائم واضح ہوگئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ ہندو نہ صرف ہندوستان پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتے ہیں بلکہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو برداشت کرنے کو یکسر تیار نہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر آپ اس قدر مایوس ہوئے کہ 1930ء میں نہ صرف آپ نے کانگریس بلکہ مُلک ہی چھوڑ دیا۔ 1934ء میں جب آپ واپس آئے تو آپ کا ذہن بالکل صاف اور واضح تھا کہ آپ کو اب ہندوستان میں کیا کرنا ہے اور پھر مارچ 1940ء میں منٹو پارک لاہور کے تاریخی میدان میں آپ نے یہ تاریخ ساز اعلان کر دیا کہ ''اسلام اور ہندومت محض دو مذہب نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف اور جُداگانہ سماجی نظام ہیں۔ ایک ہزار برس کے قریبی روابط کے باوجود دونوں آج بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی دُور ہیں جتنے پہلے ہوا کرتے تھے''۔ اور پھر آپ نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر صاف صاف کہہ دیا کہ ''ہندو اور مسلمان دو فرقے نہیں، دو قومیں ہیں۔ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ اسی صورت ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کو 'ہندو انڈیا' اور 'مسلم انڈیا' میں تقسیم کر دیا جائے، کیونکہ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں، اس لیے اُنہیں ایک الگ وطن، علاقے اور ریاست کا مالک ہونا چاہیے۔'' اے قائد! آپ کا یہ اعلان اور مطالبہ مسلمانانِ ہند پر آپ کا بہت بڑا احسان تھا جس کا قرض ہم کبھی ادا نہ کر سکیں گے۔ اور پھر آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک نئی سوچ، نئی منزل کا نشان اور نیا عزم و حوصلہ ہی نہیں دیا بلکہ آگے بڑھ کر آپ نے اس قوم کی منزل کی طرف سفر کی قیادت کی اور ایسی قیادت کی کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ آپ نے جس طرح ہندوؤں اور انگریزوں کی مخالفتوں، چالبازیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو اپنے خداداد تدبر، ہمت، جرأت، دانش اور حکمت سے ناکام بنایا اور جس طرح اُن کے خونخوار جبڑوں سے پاکستان کو چھین لیا، وہ صرف اور صرف آپ ہی کر سکتے تھے۔ دنیا آپ کے پائے کا راہنما، آپ جیسی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں ایسی کامیابی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اے قائد! مسلمانانِ ہند کو ایک الگ اور اُن کا اپنا وطن لے کر دینے پر ہماری پُشتیں بھی آپ کی شکر گذار رہیں گی۔

اے قائد! پاکستان بننے کے بعد ہندوؤں نے ہندوستان اور کشمیر میں رہ جانے اور پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا، اُس نے آپ کے اُس خیال اور نظریہ کی تصدیق کر دی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور یہ کہ ہندو، مسلمان کو ہندوستان میں کسی طور برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان بنانے کے جرم میں ہندوؤں اور سکھوں نے اگست **1947**ء کے آس پاس دس لاکھ سے زائد مسلمان عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے دردی سے تہہ تیغ کر دیا۔ فوج کشی کر کے آزاد مسلمان ریاست حیدرآباد دکن کو زبردستی ہندوستان میں شامل کر لیا اور اِس فوج کشی کے دوران مزاحمت اور بغیر مزاحمت کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کشمیر کے عوام پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے تھے، ان پر حملہ کر دیا اور صرف دو ماہ میں جموں اور اس کے گردونواح میں پانچ لاکھ مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو شہید کر دیا اور یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ **1947-48**ء کی خون ریزی کو چھوڑ کر ہندوستانی افواج، بارڈر سکیورٹی فورس اور پولیس نے کشمیر میں **2000**ء تک اسی ہزار سے زائد مسلمان مردوں کو شہید، بیس ہزار سے زائد مسلمان عورتوں کی عصمت دری اور سات ہزار سے زائد مسلمانوں کو نامرد بنایا اور **30** ہزار سے زائد قرآن مجید کے نسخوں اور دیگر اسلامی کتب کو نذرِ آتش کیا۔ خود ہندوستان کے اندر ہندوستان کی وزارتِ داخلہ کے اپنے اعدادوشمار کے مطابق **1947**ء سے **1987**ء تک پینتیس ہزار ہندو مسلم فسادات برپا کیے گئے جن میں دو لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اِن میں نریندر مودی کی وزارتِ اعلیٰ کے دوران احمد آباد گجرات کا **2002**ء والا فساد شامل نہیں جس میں ہندوستان کی پارلیمنٹ کے لیے تین بار منتخب ہونے والے ڈاکٹر احسان جعفری کے ساتھ ساتھ ہزاروں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو انتہائی وحشیانہ طریقہ سے قتل کر کے اُن کی لاشوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ آزادی کے بعد ہندو انتہا پسندوں نے مسلمانوں کی مساجد اور دیگر تاریخی عمارات پر دعوے جمانے شروع کر دیئے کہ یہاں پہلے مندر ہوا

کرتے تھے۔انھوں نے درگاہ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ، قطب مینار، تاج محل اور بابری مسجد سمیت تین سو کے لگ بھگ تاریخی عمارات، مزارات اور مساجد کے بارے میں ایسے دعاوی کیے۔ بابری مسجد کو تو گرا ہی چکے ہیں، اب دیگر کے درپے ہیں۔ اِس کے علاوہ انھوں نے 1991ء تک صرف مشرقی پنجاب میں خود بھارت کے وزیرِ مملکت رام لعل جی کے لوک سبھا میں دیئے گئے بیان کے مطابق 15,340 عام مساجد اور مدارس پر قبضہ کر کے انھیں سرکاری وغیر سرکاری دفاتر بنا لیا، پورے ہندوستان میں یہ تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔

اے قائد! ہم یہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو متحدہ ہندوستان میں ہماری سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی حیثیت وہی ہوتی جو مسلمانوں کی آج ہندوستان میں ہے۔ احمد آباد گجرات کے فسادات کی انکوائری کرنے والے کمیشن کے سربراہ جسٹس راجندر سنگھ ساچر کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں مسلمان کُل آبادی کا 14 فیصد (آج 15 فیصد) ہیں۔ان میں سے دیہاتی علاقوں میں رہنے والے 95 فیصد مسلمان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ 62 فیصد مسلمانوں کے پاس اپنا مکان یا کوئی ذاتی ٹکڑا زمین نہیں ہے۔ دیہاتی علاقوں کے 55 فیصد اور شہری علاقوں کے 60 فیصد مسلمان کبھی سکول نہیں گئے۔ شہری علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں میں سے تین فیصد گریجوایٹ اور ایک فیصد کے قریب پوسٹ گریجوایٹ ہیں۔ مسلمان ہندوستان کی سنٹرل سروسز میں صرف دو فیصد جبکہ مسلح افواج اور پولیس میں دو فیصد سے بھی کم ہیں،اور وہ بھی انتہائی نچلے درجے کی ملازمتوں پر۔ 14 فیصد آبادی رکھنے والے مسلمانوں کی ہندوستان کی لوک سبھا میں نمائندگی صرف پانچ فیصد ہے۔

بھارت میں آج اُسی نریندر مودی کی حکومت ہے جس کی وزارتِ اعلیٰ کے دور میں احمد آباد گجرات کا مندرجہ بالا روح فرسا واقعہ پیش آیا تھا اور آج ایک بار پھر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کیا جا رہا ہے۔گائے کا گوشت کھانے پر مسلمانوں کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔کوئی اس ظلم پر ذرا سی زبان کھولتا ہے تو ہندو انتہا پسند

اُسے ملک دشمن قرار دے کراس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔مسلمانوں کے حق میں ذرا سی لب کشائی پر ملک کے چوٹی کے مسلمان فنکاروں عامر خان اور شاہ رخ خان، جن کی اپنی بیویاں ہندو ہیں اور جن کے بچوں کے نام بھی ہندووانہ ہیں، اور دلیپ کمار کے ساتھ ان کا سلوک اِس کی واضح مثالیں ہیں۔ پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ خورشید محمود قصوری اور پاکستانی گلوگار غلام علی کو دعوت دے کر بلایا گیا اور پھر اُن کی محفلیں اُلٹا دی گئیں اور ان کے میزبانوں کا منہ کالا کیا گیا۔ پاکستانی کرکٹ بورڈ کے چیئرمین شہریار خان کا گھیراؤ کر کے انھیں بھارت کرکٹ کنٹرول بورڈ کے چیئرمین سے مذاکرات کے لیے ہوٹل سے نہ نکلنے دیا گیا۔ بھارت کی کئی ریاستوں اور صوبوں میں گائے ذبح کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔پچھلے ہفتے بھارتی وزیرِتعلیم نے چندی گڑھ میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمان بچوں کو حصولِ تعلیم کا کوئی حق حاصل نہیں۔اُنہوں نے تمام تعلیمی اداروں پر زور دیا کہ وہ مسلمان بچوں کو اپنے سکولوں، کالجوں اور جامعات سے نکال دیں۔غرض بھارت میں مسلمانوں کے خلاف بغیر کسی وجہ کے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہے اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہورہا۔ بھارت میں قیامِ پاکستان سے بہت پہلے سے لے کر آج تک کوئی سال، کوئی ماہ، کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب یہ سب کچھ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی پیمانے پر نہ ہو رہا ہو۔اے ہمارے قائد! یہی سب کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے پچھلے 68سال سے ہمیں بار بار یہ احساس ہوا ہے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کا بیش بہا عطیہ ہے جو اِس خطۂ زمین کے مسلمانوں کو آپ کے تدبر، ذہانت اور جہدِ مسلسل کے نتیجے میں عطا ہوا۔ ہم اللہ اور آپ کے بے حد شکرگزار ہیں۔

اے قائد! بے شک جب پاکستان بنا تو یہ ایک بے سروسامان اور بے یار و مددگار ملک تھا۔سرکاری ملازمین کی تنخواہیں تک ادا کرنے کے لیے فنڈ نہ تھے۔کوئی قابلِ ذکر صنعت و کارخانہ تھا اور نہ کوئی ڈیم۔ضرورت کے مقابلے میں انتہائی کم ذرائع رسل و رسائل، تعلیمی ادارے، سرکاری ملازمین وسرکاری ادارے اور نہ ہونے کے برابر درآمد و

برآمد، لے دے کے صرف ایک زراعت تھی یا پھر جوش وجذبے، بلند اُمنگوں اور ناممکن کو ممکن بنانے کا عزم لیے ہوئے پاکستانی قوم۔ آج اللہ کے فضل وکرم سے پاکستان میں سینکڑوں بڑی بڑی صنعتی، تجارتی، تعمیراتی اور ترقیاتی ایمپائر کھڑی ہیں۔ ذرائع رسل ورسائل میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ شرح خواندگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ تعلیمی ادارے، صحت کے مراکز اور دوسرے ضروری ادارے گو بہت زیادہ نہ سہی، لیکن قیامِ پاکستان کے وقت ملے ہوئے ورثے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہیں۔ آج پاکستان میں پاکستانی خود ہی آجر اور خود ہی اجیر، خود ہی ورکر اور خود ہی مالک، خود ہی کانسٹیبل اور خود ہی آئی جی، خود ہی سپاہی اور خود ہی جرنیل، خود ہی نائب قاصد اور خود ہی سیکرٹری ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں نہ پہلے کبھی ایسا تھا اور نہ آج ایسا ہے۔ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی پاکستان کے برابر ہے۔ اِن میں سے کتنے مسلمان بڑی صنعتوں، کارخانوں اور تجارتی وتعمیراتی اداروں کے مالک ہیں؟ ہندوستان میں تو آج مسلمان اور دِلت ہندوستان کے شہری ہونے کے باوجود شہروں میں اپنی جائیداد نہیں بنا سکتے، نہ کوئی اُنہیں کرایہ پر گھر دیتا ہے۔ آج پاکستان میں 36 لاکھ کے قریب سرکاری ملازم ہیں جن میں سے 95 فیصد مسلمان ہیں۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اِن علاقوں جو آج پاکستان میں شامل ہیں، کے مسلمانوں کو اتنی بڑی تعداد میں اور اس پائے کی سرکاری ملازمتیں حاصل ہوسکتی تھیں؟ تو پھر اے قائد! ہم آپ کے شکرگزار کیوں نہ ہوں! آج پاکستان آبادی کے اعتبار سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے اور اگر مشرقی پاکستان الگ نہ ہوتا تو آج پاکستان چین اور ہندوستان کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہوتا۔ پاکستان کی فوج افرادی قوت کے اعتبار سے دنیا کی ساتویں بڑی فوج ہے، جبکہ پیشہ وارانہ مہارت اور قابلیت کے اعتبار سے پاک فوج اور اس کی انٹیلی جنس ایجنسی دنیا میں نمبر ایک شمار کی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان واحد مسلمان ایٹمی طاقت ہے۔ پاکستان عالمِ اسلام کا اہم ترین ملک ہے۔ آج دنیا میں پاکستان کی اہمیت کو دوست اور دشمن سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی رضامندی و

نارضا مندی کا لحاظ کیے بغیر اس خطے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی جغرافیائی، جنگی اور سٹریٹیجک پوزیشن کے اعتبار سے پاکستان پورے ایشیا کا سب سے اہم ترین ملک ہے، چین اور بھارت سے بھی کہیں زیادہ۔ چشمِ تصور میں ایک لمحہ کے لیے دنیا کے نقشے سے پاکستان کو محوکر کے دیکھیں، جیسا کہ یہ 1947ء سے پہلے تھا۔ دنیا، خصوصاً پورے ایشیا، کی سیاست اور عالمی پالیسیاں ہی بدل جائیں گی۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت! اِسی لیے یہ بہتوں، خصوصاً ہندو بھارت، کی نظر میں بُری طرح کھٹکتا ہے اور کیوں نہ کھٹکے۔ رمضان المبارک کا مہینہ، شب قدر کی رات، جمعتہ الوداع کا دن اور پاکستان کا وجود میں آنا، یہ محض اتفاق نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت اور مشیت پوشیدہ ہے۔ اہلِ کشف ونظر کے مطابق پاکستان کو اس خطہ میں نہایت اہم، کلیدی اور قائدانہ کردار ادا کرنا ہے۔

اے قائد! اس قدر عظیم، اس قدر اہم ترین اور اس قدر قدرتی و انسانی وسائل سے مالا مال ملک پاکستان لے کر دینے پر ہم اور ہماری اگلی پچھلی نسلیں ہمیشہ آپ کی شکر گذار اور احسان مند رہیں گی۔ ایک ایسا پاکستان کہ جہاں چار موسم، بیک وقت سمندر، صحرا، میدان، سطح مرتفع اور بلند و بالا پہاڑ، دنیا کی سب سے گہری بندرگاہ، گوادر، دنیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑ کے ٹو، دنیا کی پانچ بلند ترین چوٹیاں لیے ہوئے شمالی علاقہ جات، گلگت بلتستان، دنیا میں کوئلے کے بڑے بڑے ذخائر میں سے ایک، تھرکول، لوہے، تانبے، سونے، گیس اور تیل سے بھری کانیں اور کنویں، دنیا کا سب سے بڑا مصنوعی آب پاشی کا نظام، دنیا کے بڑے بڑے ڈیموں میں سے ایک ڈیم، تربیلا ڈیم، بڑے بڑے صحراؤں میں سے ایک صحرا، صحرائے تھر اور طویل ترین دریاؤں میں سے ایک دریا، دریائے سندھ، واقع ہیں۔ پاکستان جو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک، وادی سندھ کی تہذیب، اور ہڑپہ، موہنجوداڑو، ٹیکسلا، کوٹ ڈیجی جیسے آثارِ قدیمہ اور عالمی ورثہ جات ہیں۔ کیا کسی دوسرے ملک کو بیک وقت اتنے اعزازات اور امتیازات حاصل ہیں؟

اے قائد! ہم آپ کے اس لیے بھی شکر گذار ہیں کہ آپ نے قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد ایک سو سے زائد بار بالکل صاف اور واضح انداز میں یہ کہہ کر کہ ''پاکستان ایک اسلامی جمہوری ریاست ہوگا جس کا نظامِ حکومت قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں چلایا جائے گا''، پاکستان کی نظریاتی اساس، آئین اور طرزِ حکومت کے خدوخال بھی حتمی طور پر متعین کر دیئے۔ آج کس مائی کے لعل میں جرأت ہے کہ آپ کے اعلان کردہ پاکستان کے اس اسلامی تشخص کو متنازع بنائے اور پاکستان کو اس تشخص اور نصب العین کے خلاف چلانے کی کوشش کرے۔

اے میرے قائد! آپ نے محکم انداز میں کہا کہ ''کون کہتا ہے کہ پاکستان کے آئین کی اساس شریعت پر نہیں ہو گی۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ مفسد ہیں۔ اسلام نے جمہوریت دکھائی ہے۔ مساوات کا سبق دیتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اصولوں پر عمل کرنے سے ہم ہر ایک کے ساتھ انصاف کر سکیں گے''۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک ٹکڑا زمین حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلامی اصولوں کو آزما سکیں''۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا ''اسلام صرف چند رسومات، روایات اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور دیگر مسائل کی راہبری کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے''۔ لیکن اے میرے قائد! آپ کے جاتے ہی یہاں ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس نے آپ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ دے دے کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''قائداعظمؒ سیکولر تھے اور وہ ایک سیکولر پاکستان بنانا چاہتے تھے جہاں مذہب کا امورِ مملکت میں کوئی عمل دخل نہ ہو گا''۔ حالانکہ آپ نے اپنی اس تقریر میں اقلیتوں کی حوصلہ افزائی اور اسلامی مملکت کے نام سے اُن کے دلوں میں بٹھائے جانے والے ایک غیر حقیقی خوف کو دور کرنے کے لیے کہا تھا کہ ''آپ کا تعلق کسی مذہب، کسی عقیدے یا کسی ذات سے ہو، اس کا مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ہم اس بنیادی اصول سے اپنا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری بلکہ مساوی شہری ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ ہندو ہندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہ رہے گا۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ یہ ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے اس مملکت کے ایک شہری کی حیثیت سے'' اور اقلیتوں کے لیے اس سے زیادہ صاف اور شفاف یقین دہانی اور کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن اے قائد! ہم شرمندہ ہیں کہ ہماری صفوں میں موجود کچھ لوگوں نے جنھیں اسلام کے نام سے چڑ ہے، آپ کے خیال و نظریات کا مفہوم و منشا بالکل الٹ دیا۔

اے قائد! آپ ہمارے مسیحا، ہمارے راہنما اور ہمارے روحانی باپ ہیں۔ اللہ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور آپ کو جنت میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے اور آپ کا بنایا ہوا ملک پاکستان ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ آمین

محمد متین خالد

اسلام کا سفیر

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کا آغاز ہوتے ہی ہندوستان میں تحریک آزادی ایک نیا موڑ مُڑ چکی تھی۔ مسلمانوں پر کانگریسی قیادت کی مسلم بیزاری کھل کر واضح ہو چکی تھی۔ وہ پریشان حال تھے۔ انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چار سو تاریکی تھی۔ اس تاریک رات میں ان کی نگاہیں مغرب کے اُفق میں پناہ لینے والے نجات دہندہ سورج پر جمی ہوئی تھیں۔ مقامی سطح پر موجود ''بڑے مسلم راہنما'' کانگریسی مہاتما کے آستانے پر ناصیہ فرسا تھے۔ ان میں سے ایک بھی مسلم قومیت کے الگ تشخص پر اصرار کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان کی اکثریت گاندھی کے پیش کردہ ''متحدہ قومیت'' کے فلسفے کی شارح، ترجمان اور مفسر بنی ہوئی تھی۔ اس فلسفے کی ترجمانی، تشریح اور تفسیر ہی ان کے نزدیک ''دین و دنیا'' کی کامیابی و کامرانی کی ''حتمی ضمانت'' تھی۔ گاندھی کے اس ہمرنگ زمیں جال نے بڑے بڑے مسلم شہ دماغوں کو اپنے حلقوں میں پھانس رکھا تھا۔ گاندھی کے انڈین نیشلزم کے نظریے کو برطانوی حکومت کی مکمل تائید و حمایت حاصل تھی۔ برطانوی حکمران جہاں اقلیتوں کے تحفظات کا ذکر کرتے تھے، وہیں وہ ہندوستان کی بقا کے لیے نیشنلزم کے نظریے کی بھی حمایت کرنا نہ بھولتے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنسیں اختتام کو پہنچ چکی تھیں۔ پہلی گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس 12 نومبر 1930ء کو ہاؤس آف لارڈز کی رائل گیلری میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس 19 جنوری 1931ء تک وقفوں کے ساتھ جاری رہا۔ دوسری گول میز کانفرنس 7 ستمبر سے یکم دسمبر 1931ء تک جاری رہی۔ مسٹر گاندھی نے اس کانفرنس میں ایک معاہدے کے تحت جسے دنیا ''گاندھی

ارون پیکٹ'' کے نام سے جانتی ہے، شرکت کی۔ انھیں یہ زعم بیجا تھا کہ وہ اپنی ذات میں پورا ہندوستان ہیں۔ کانفرنس کے پہلے دن ہی سے ان کے تیور انتہائی جارحانہ تھے۔ وہ برملا یہ کہتے تھے کہ ''میں پورے ہندوستان کا واحد نمائندہ ہوں۔'' اسی پر بس نہیں، وہ تو کئی ہاتھ آگے بڑھے اور یہاں تک بڑ ہانکی کہ ''ہندوستان میں اگر کوئی سیاسی جماعت ہے تو محض کانگریس ہے، باقی تمام جماعتیں ذیلی جماعتیں ہیں۔''

(راہبر مطالعہ پاکستان: پروفیسر محمد رفیق چودھری)

تیسری گول میز کانفرنس 17 نومبر 1932ء کو شروع ہوئی اور 24 دسمبر 1932ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ کانگریس نے تیسری گول میز کانفرنس میں محض اس وجہ سے شرکت نہ کی کہ وہ ''آئینی اصلاحات'' میں انگریز حکمرانوں کے انہاک کے حق میں نہ تھی۔ مزید اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ یہ اصلاحات جلد نافذ ہونے والی ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب قائداعظم لندن میں رہائش پذیر تھے۔ انھوں نے برک ہیمپ سٹیڈ کے علاقے میں ذاتی رہائش گاہ خرید رکھی تھی۔ وہ لندن ہی میں پریکٹس کر رہے تھے۔ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ 1932ء تک قائد اعظم تقسیم ہندوستان کے حق میں نہ تھے۔ البتہ لندن میں مقیم ایک طالب علم چودھری رحمت علی مسلمانوں کے لیے برصغیر میں الگ ریاست کے قیام کے حوالے سے کوشاں تھا۔ وہ تو اس ریاست کا باقاعدہ نام بھی تجویز کر چکا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ لفظ پاکستان کے خالق چودھری رحمت علی ہی تھے۔ چودھری رحمت علی اسلامیہ کالج کے نامور طالب علم تھے۔ وہ مولانا شبلی نعمانی کے زبردست مداح تھے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں لاہور میں ''بزمِ شبلی'' قائم کر رکھی تھی۔ وہ 1915ء سے تقسیم ہندوستان کے نظریے پر کام کر رہے تھے۔ بزمِ شبلی کا افتتاحی اجلاس اسلامیہ کالج ہی میں ہوا۔ یہ اعزاز بھی چودھری رحمت علی ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے اس بزم کے افتتاحی خطبہ میں پہلی مرتبہ ''ایک مسلم ریاست'' کے قیام کا ذکر کیا۔

(اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ 1892ء تا 1992ء: پروفیسر احمد سعید، ص 431)

چودھری رحمت علی نے 28 جنوری 1933ء کو لندن میں صاف صاف اعلان کر دیا تھا ''ہم ہندو قومیت کی سولی نہیں چڑھیں گے''۔ انھوں نے وطن سے دور رہتے ہوئے بھی آنے والے حالات کو بھانپ لیا تھا۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ چودھری رحمت علی نے "Now or Never" نامی ایک کتابچہ شائع کر کے قیام پاکستان کی جانب عملی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ چودھری رحمت علی اپنا یہ کتابچہ جس بھی مسلم راہنما کو ارسال کرتے، اس کے ساتھ ایک عریضہ بھی لف کرتے۔ اس عریضے میں بھی واضح الفاظ میں الگ مسلم ریاست پاکستان کے لیے عملی اقدامات کا مطالبہ مندرج ہوتا۔

بعض نادان افراد کی طرف سے ''اسم پاکستان کے خالق'' چودھری رحمت علی کے کردار پر غلط پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ جس طرح قائداعظم سے یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ یہ ملک اُن کی قیادت میں حاصل کیا گیا ہے، اسی طرح چودھری رحمت علی سے بھی یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا کہ قائداعظم کے پاکستان کے اسم کے خالق چودھری رحمت علی ہیں۔

آج خطے کے غیر جانبدار اور حقیقت شناس تجزیہ نگار بڑی قطعیت اور حتمیت کے ساتھ یہ رائے قائم کر چکے ہیں کہ اکھنڈ بھارت کے پرچارک دانشوروں کے دعوے بے بنیاد تھے۔ یہ خطہ صدیوں سے دو واضح علاقوں ''انڈک ریجن'' اور ''انڈس ریجن'' میں بٹا ہوا ہے۔ انڈک ریجن گنگا کے میدانوں اور جزیرہ نما ہند پر مشتمل ہے جبکہ انڈس ریجن دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج کے علاقوں پر محیط ہے۔ فطری طور پر منقسم ان دونوں علاقوں کی ثقافت، معاشرت اور نظم حکومت صدیوں سے منفرد اور متمیز رہے ہیں۔

یہ تمام مباحث بیسویں صدی کے چوتھے عشرہ میں اسلامیان برصغیر سے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے لیے سنجیدہ اقدامات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی عشرہ کے وسط میں چند دردمند مسلم اکابرین لندن میں قائداعظم سے ملے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان روانہ ہوتے وقت جب مولانا محمد علی جوہر سے سوال کیا گیا کہ

مسلمانوں کی قیادت کی ذمہ داریاں ان کے بعد کون سنبھالنے کا زیادہ حقدار اور اہل ہے، تو انھوں نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑی آہستگی سے فرمایا:

❑ ''مسٹر جناح۔ ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ کاش اللہ تعالیٰ مسٹر جناح کے ذہن میں اس ذمہ داری کو اٹھانے کا خیال پیدا کر دے۔''

(Souvenier to Moulana Muhammad Ali Johar by Begum Rafia Sharif, Page.40)

یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب علامہ اقبال ایسی رجائیت پسند شخصیت بھی ہمیں ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے:

❑ ''ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ اولاً: یہ کہ ان میں اہم شخصیات کا وجود نہیں، یعنی ایسا کوئی راہنما نہیں جس کو اعانت ایزدی اور اپنے وسیع تجربے کی بدولت یہ ادراک ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے؟ ثانیاً: دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے، یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔'' (فیضان اقبال: آغا شورش کاشمیری، ص 277)

اندریں حالات قائداعظم کانگریس کی منافقانہ سیاست اور مسلمانوں کی اجتماعی بے حسی سے مایوس ہو کر لندن میں گوشہ نشین تھے۔ ان اکابرین نے قائداعظم کو بصد اصرار آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان واپس آئیں اور مسلمانوں کے درماندہ قافلے کی امامت، قیادت و سیادت کا فرض منصبی ادا کریں۔ قائداعظم اکابرین کے اصرار پر ہندوستان واپس لوٹے۔ انھوں نے بے حال اور نڈھال مسلم لیگ کے تن لاغر میں روح شباب سمو دی۔ اب قائداعظم ایک نئے انداز سے مسلمانوں کی راہنمائی کے فریضے کو ادا کر رہے تھے۔ ان کی تمام تر کد و کاوش، سعی و کوشش اور جدوجہد کا ایک ہی مقصد تھا۔ وہ عظیم مقصد تھا مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد قومی جماعت بنانا۔ ابتدائی سال ہی میں ان کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ 1936ء کے انتخابات میں مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک نمائندہ سیاسی جماعت کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی۔ برصغیر کے مسلمان مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 1937ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے

جب دہلی میں کانگریسی اراکین پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھاشن دیا:

❑ ”بھارت میں صرف دو جماعتیں ہیں: ایک کانگریس اور دوسرے انگریز، اس لیے اہل ملک کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیے۔“

اس موقع پر برصغیر کے مسلمان کانگریس کے اصل چہرے کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسٹر جناح نے اس اعلان کا فوری نوٹس لیا اور ایک بیان میں کہا:

❑ ”ہندوستان میں ایک تیسری جماعت بھی ہے اور وہ 10 کروڑ مسلمان ہیں، جو نہ کانگریس میں ضم ہو سکتے ہیں نہ برطانیہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق ہے۔“

قائداعظم کے اس اعلان کو مسلمانوں نے اپنے دلوں کی دھڑکنوں کا ترجمان پایا۔ اسی دور میں مسلم عوام جان چکے تھے کہ ہندوستان میں اگر کوئی ایک شخصیت ان کی مکمل راہنمائی کر سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قائداعظم کی ذات والا صفات ہے۔ مسلمان انھیں نجات دہندہ کے رُوپ میں دیکھ رہے تھے۔ عام مسلمانوں کا تو کہنا ہی کیا، یہاں تو عالم یہ تھا کہ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال جیسی شخصیت بھی قائداعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کی مداح و معترف بن چکی تھی۔

انھوں نے اس دور میں قائداعظم کو مختلف مواقع پر مختلف خطوط بھی لکھے۔ 21 جون کو علامہ اقبال نے قائداعظم کو ایک تاریخی خط لکھا:

❑ ”میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا بار بار کا لکھنا آپ کو ناگوار نہ ہوگا۔ جو طوفان بلا شمالی ہندوستان، بلکہ شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے، اس وقت مسلمان صرف آپ ہی سے راہنمائی کی توقع رکھتے ہیں۔“

علامہ تو اسلام کی عالمگیریت کے احیا کے لیے کوشاں تھے۔ انھیں یقین تھا کہ:

❑ ”عالم اسلامی کا ظہور ہو گا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق و تطابق سے بدل دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود

اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کے لیے، اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں۔'' (پانچواں خطبہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص 246)

علامہ اقبال ہندوستان میں کانگریسی پروپیگنڈے کے مضر اثرات کا بنظر غائر جائزہ لے رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کو مختلف پیرایوں میں سمجھا رہے تھے کہ:

- ''اس زمانے میں مسلمانوں اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔'' (انوار اقبال، ص 176)

وہ اس پر خوش تھے کہ برطانوی استعمار کے تمام تر تعاون اور سرپرستی کے باوجود ہندو ایک قوم نہیں بن سکے۔ خطبہ الٰہ آباد ہی میں انھوں نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

- ''ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں، لیکن انھیں وہ یک رنگی حاصل نہیں جو ایک قوم بننے کے لیے ناگزیر ہے اور اسلام نے جمہور المسلمین کو عطا کی ہے۔''

9 مارچ 1938ء کو مولانا حسین احمد مدنی کے خط کے جواب میں فرماتے ہیں:

- ''اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں، تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔'' (فیضان اقبال، مرتبہ آغا شورش کاشمیری، ص 297)

بیسویں صدی کا پانچواں عشرہ شروع ہوا تو حالات یکسر بدل چکے تھے۔ کانگریس کی ہندونوازی مسلمانوں پر آشکار ہو چکی تھی۔ وہ جان چکے تھے کہ مہاتما گاندھی، سیواجی مرہٹہ، پنڈت مدن موہن مالویہ اور سیوک سنگھ ہندو قائدین کی طرح ایک انتہاپسند، جنونی اور متعصب ہندو ہیں۔ وہ سیواجی مرہٹہ کے گرو سمرتھ رام داس سوامی برہمن کی طرح اپنی نجی محافل میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہرافشانی کو ''پرارتھنا'' تصور کرتے تھے۔ کانگریس کے گاندھی اور ہندو مہاسبھا کے راہنما ہندو پیروکاروں کو اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کا وہی پیغام دیتے رہے جن کا اظہار سیواجی

مرہٹہ نے ایک خط میں راجہ جے سنگھ کے نام ان الفاظ میں کیا تھا:

❏ ''میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک اور مہم کے لیے میان سے نکالنی پڑی۔ اسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیے تھا، جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ جنھیں انصاف کرنا آتا ہے...... میری بادلوں کی طرح گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ خونی مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے مسلمان اس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔''

(الجمعیۃ دہلی: 2 جون 1927ء، ص 1)

بعض متشدد ہندو لیڈروں کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لیے ہے، مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ گاندھی، بال گنگا دھر تلک، سوامی شردھانند، رابندرناتھ ٹیگور، کیشپ چندرسین، رام موہن رائے، سوامی ویویک آنند، بنکم چندر چیٹر جی، آروبندو گھوش اور بپن چندر پال نے ایک ایسے فلسفے کی اشاعت شروع کر دی جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

لالہ ہردیال نے 1925ء میں کہا کہ ''اذان اور نماز کے وقت مسجد کے آگے باجا بجانا ہر ہندو کے دھرم کا حصہ ہونا چاہیے۔''

لالہ دہن پت رائے نے کہا کہ ''مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگنے والا اور ان کی عورتوں کو بے حرمت کرنے والا سیدھا سورگ (بہشت) میں جائے گا۔''

(ہندو اور رام راج کے خواب، از: ڈاکٹر شبیر احمد)

مہاشا کرشن نے 1930ء میں کہا کہ ''بھارت ماتا کے مسلمانوں کا ایک ہی مستقبل ہے کہ وہ دوبارہ ہندو ہو جائیں۔ شما کیجیے! ایک اور مستقبل بھی ہے کہ انھیں مٹی میں دبا دیا جائے۔''

نسل نو کے لیے یہ بات یقیناً معلومات آفریں ہو گی کہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ جماعت کے قیام کے ایک سال بعد ہی رام راج قائم کرنے کا خواب دیکھنے والوں

نے مسلمانوں کے کلی، معاشی، سیاسی اور سماجی مقاطعہ کی دعوت دی۔ اس دور کے ایک مشہور ہندو اخبار ''سودھرم'' کے ایڈیٹر نے جو مشہور کانگریسی راہنما تلک جی مہاراج کا چیلہ تھا، ہندوؤں کو درج ذیل ہدایات دیں:

1- مسلمانوں کی مذہبی یا دیگر رسوم میں شرکت نہ کی جائے۔
2- اپنے ہاں کی رسوم میں مسلمان باجا بجانے والوں کو نہ بلایا جائے۔
3- مسلمانوں سے تجارتی لین دین نہ کریں۔
4- اراضی کی کاشت صرف ہندوؤں سے کرائی جائے۔
5- کسی خانگی کام کے لیے مسلمانوں کو ملازم نہ رکھا جائے۔
6- قرضہ کے لین دین میں مسلمان ساہوکاروں یا اسامیوں سے معاملہ نہ کیا جائے۔
7- کوئی وکیل کسی مسلمان کا مقدمہ نہ لے۔
8- مسلمانوں کے ہاتھ کوئی جانور فروخت نہ کیا جائے۔
9- مسجد کی تعمیر یا کسی اور غرض کے لیے زمین فروخت نہ کی جائے۔
10- مسلمان فقیروں کو کسی قسم کی خیرات نہ دی جائے۔
11- مسلمان حکیموں سے ہندو افراد دوا نہ لیں اور ہندو ڈاکٹر مسلمانوں کو دوا نہ دیں۔
12- اگر صرف مسلمان پیشہ ور ہوں تو ان پیشوں کی ہندوؤں کو تعلیم دی جائے۔''

(اخبار ''وکیل'' امرتسر، 6 فروری 1926ء، ص 3)

سوامی ستیہ دیو نے یہ فرمان جاری کیا۔

''مسلمانو! اگر تمھیں برصغیر میں رہنا ہے تو یہ شرائط ہیں:

1- قرآن کو نہ مانو۔
2- محمد ﷺ کو چھوڑ دو۔
3- مکہ سے لاتعلق ہو جاؤ۔
4- کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
5- ہندو تہوار مناؤ۔

6- مسجدوں پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا لہرا کر انھیں مندر بن جانے دو۔
ہندوؤں کے راہنما ہردیال نے بیان دیا:

❑ ''مسلمانوں کو اپنے آپ کو ہندو کہنا چاہیے، ہندی تہواروں کو اپنانا چاہیے اور ہندوؤں کے قدیم مذہبی سورماؤں کا احترام کرنا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ وہ ہندومت کا ایک فرقہ بن جائیں اور اپنے آپ کو محمدی ہندو کہیں''۔

عام ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ یہ رویہ ہوتا کہ اگر ایک مسلمان کا سایہ چوکے پر پڑ جاتا تو وہ چوکا نئے سرے سے پوتا جاتا۔ ریلوے اسٹیشن پر بیمار مسلمان پانی پانی کر کے مر جاتا، مگر ہندو برہمن پانی نہ دیتا۔ اگر کوئی دیتا تو بانس کی لمبی نالی برتی جاتی۔ ہندوؤں کے محلّہ میں مسلمان کو کرایہ پر مکان نہ ملتا۔ سکول میں اگر کوئی مسلمان ٹیچر ہندو طالب علم سے پانی مانگتا تو وہ صاف انکار کر دیتا کہ مسلمان کو پانی دینے سے میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

اسی دور میں سوامی شردھانند نے آریہ سماج اور شدھی کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ یہ تحریک ہندوستان کے طول و عرض میں طوفان بلاخیز کی طرح پھیل گئی۔ اس تحریک کا مقصد بھی ہندوؤں میں دھرتی تعصب پیدا کر کے انھیں مسلمانوں سے دور کرنا تھا۔ اس تحریک کے بانی اور کارکن یہ سب اس لیے کر رہے تھے کہ وہ ہندو راج کے قیام کے ہزار سالہ خواب کو تعبیر آشنا کرنا چاہتے تھے۔ ہندو اخبارات نے اس تحریک کی بھرپور پروجیکشن کی۔

یہ عشرہ بڑا خطرناک عشرہ تھا۔ برصغیر کو ''ہندواستھان'' بنانے کے لیے طرح طرح کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ ان میں گئو رکھشا کا فتنہ بھی نمایاں تھا۔ آریہ سماج تحریک اس فتنے کے شعلوں کو اپنے دامن کی ہوا دینے میں پیش پیش تھی۔ **1927**ء میں صوبہ سندھ کے ایک بڑے شہر سکھر میں پبلک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے اس تحریک کے ایک بڑے راہنما مہاشہ پرتاب سنگھ نے کہا:

❑ ''اگر تم ایک گائے کی خاطر کراچی سے لے کر مکہ تک تمام مسلمانوں کو ختم کر

دو تو بھی تھوڑا ہے۔ ہندو دھرم میں جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے لیکن مسلمانوں کا خون پینا جائز ہے۔ کسی ہندو کو اس کے پینے میں پس وپیش نہ کرنا چاہیے۔''

ہندوستان کی فضائیں ہندو راہنماؤں کی اشتعال انگیزانہ تقریروں کی گھن گرج سے گونج رہی تھیں۔ ہندو مہاسبھا کے ایک بڑے لیڈر ڈاکٹر مونجے نے ایودھیہ میں تیسری ہندو سبھا کے اجلاس میں جوشِ خطابت دکھاتے ہوئے کہا:

- ''جس طرح انگلستان انگریزوں کا، فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں کا ہے، اسی طرح ہندوستان بھی ہندوؤں کا ہے۔'' (زمیندار، لاہور، 24/اپریل 1927ء)

اپنے قیام کے صرف دو چار عشروں بعد انڈین نیشنل کانگریس اپنے اصل رُوپ میں ہندوستان کے شہریوں کے سامنے آئی۔ اخبار شیر پنجاب لاہور کے 19 دسمبر 1926ء کے شمارے کی ایک رپورٹ کے مطابق کانگریس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے کانپور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

- ''یہ ایجی ٹیشن بالکل بے بنیاد ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں ایسا ہی ہندو ہوں، جیسے خود پنڈت مالوی ہیں۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ خود کانگریس ہندو جماعت ہے۔ اس میں 21-1920ء میں تھوڑے مسلمان شامل ہو گئے تھے ورنہ یہ تو ابتدا سے ایک ہندو جماعت ہے۔''

ایک دوسرے ہندو اخبار ''تیج'' کے 24 نومبر 2916ء کے شمارے میں لالہ لاجپت رائے کی ایک تقریر کا حوالہ ہمیں بایں الفاظ ملتا ہے:

- ''وہ دن کسی کو نہیں بھولے، جب کانگریس میں کرایہ کے مسلمان لائے جایا کرتے تھے۔ محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہیں اور کانگریس صحیح معنوں میں نیشنل باڈی ہے۔'' (ص2)

پنڈت موتی لال نہرو کے ''بلند بام'' اور ''بلند نام'' بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''میری کہانی'' میں ڈھول کا پول کھول دیا:

- ''ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے جب تک

ہم (ہندو) صحیح راستہ سے نہ بھٹکیں، چند رجعت پسندوں کی (کانگریس میں) موجودگی سے کیا حرج تھا؟'' (میری کہانی، حصہ اوّل: پنڈت جواہر لال نہرو، ص 29)

آگے جا کر ان تھوڑے سے رجعت پسند کانگریسی مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

- ''انفرادی حیثیت سے اب بھی قوم پرست مسلمان کانگریس میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں لیکن جماعتی حیثیت سے ان کی تباہی کی داستان بڑی دردناک ہے۔''

(میری کہانی، حصہ اوّل: ص 236)

جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے تو اب یہ بات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے کہ 1881ء میں اس کے قیام کے پس پشت انگریز کی حکمت عملی کا پوشیدہ ہاتھ کارفرما تھا۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیوسی بینرجی کا یہ اعتراف ریکارڈ پر موجود ہے:

- ''کانگریس کی بنیاد لارڈ وفرن کے اشارے پر ہوئی جس نے مسٹر ہیوم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ کانگریس کی تنظیم کے سلسلہ میں جب تک وہ خود ہندوستان میں موجود ہے، اس کا نام کبھی درمیان میں نہ لایا جائے۔ چنانچہ ہیوم نے گورنر جنرل کی اس خواہش کا احترام کیا۔'' (ہندوستانی سیاست کا تعارف، از ڈبلیو بینرجی)

یہ ایک تاریخی سچ ہے کہ آل انڈین نیشنل کانگریس کو برطانوی حکومت نے مکمل سرکاری سرپرستی فراہم کی۔ کانگریس میں شامل ہر ہندو راہنما اور سیاسی کارکن اندرخانہ مضبوطی حاصل کرنے کے بعد بھارت کو مسلمانوں سے پاک کرنے کی منصوبہ بندی کیے ہوئے تھا۔ یہ ہندو راہنما یوں تو رواداری، برداشت اور بین المذاہب ہم آہنگی کے علمبردار تھے لیکن ان کے اعمال و افعال خالص ہندوؤانہ تھے۔ درپردہ وہ آل انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر اس لیے اکٹھے ہوئے تھے تاکہ آنے والے دور میں جب غیرملکی سامراجی حکمرانوں کے اقتدار و اختیار کی گرفت کمزور پڑے تو وہ انڈیا کو ''ہندو استھان'' کا رُوپ دے سکیں۔ وہ اشوک دور کے بھارت کا احیا چاہتے تھے۔ چانکیہ ان کا سیاسی و روحانی قائد تھا۔ اس کی کتاب ''ارتھ شاستر'' ان کے نزدیک ''سیاسی

بائبل'' کی حیثیت رکھتی تھی۔ کانگریس میں شامل اکثر سیاسی کارکنوں اور قائدین کا خمیر مسلم دشمنی کی مٹی سے اٹھا تھا۔ کانگریس کے جلسوں میں کھلے بندوں ''بندے ماترم'' کا ترانہ پڑھا جاتا۔ وہ جلسہ گاہوں میں واشگاف الفاظ میں مسلمانوں کو ''ملیچھ'' کی بدبودار گالی دیتے۔ اسی دور میں جب تقسیم بنگال کی مجوزہ سکیم سامنے آئی تو کانگریس میں شامل ہندو راہنماؤں نے اسے منسوخ کروانے کے لیے جنونی پیرائے میں مسلم دشمن مہم کا آغاز کیا۔ کانگریس میں شامل جملہ ''رائے بہادران'' اور ''سر صاحبان'' مسلمانوں کے خلاف زہرافشانی میں مصروف رہے۔

المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر گاندھی کے فلسفہ ''متحدہ قومیت'' کی خوفناک آندھی میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے مظاہرے ہونے لگے۔ مسلمان مساجد چھوڑ کر مندروں میں جانے لگے، ہندو لیڈروں کو مساجد میں لے جا کر منبروں پر بٹھانے لگے، وید کو الہامی کتاب تسلیم کرنے لگے، مشرکوں کی جے پکارنے لگے، قشقہ لگانے لگے۔ رام لچھمن پر پھول چڑھانے لگے، رامائن کی پوجا میں شریک ہونے لگے، ارتھی کندھوں پر اٹھا کر مرگھٹ جانے لگے، کانگریسی مسلمان مشرک میت کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگے اور وہ بھی مسجد میں۔ مسجدوں میں مشرکوں کی تعزیت کے جلسے منعقد ہونے لگے۔ اللہ کو رام کہا جانے لگا۔ دسہرے میں شریک ہونے لگے، سنکھ بجانے، قربانی گاؤ کو بھینٹ چڑھانے لگے۔ مسلمان اپنا قومی تشخص اپنے ہاتھوں مٹانے لگے۔ سرکاری عمارتوں اور درس گاہوں پر ترنگا پرچم لہرانے کے حکم جاری ہو گئے۔ سرکاری دفاتر میں ہندوؤں کو ترجیح دی جاتی۔ واردھا اسکیم بنائی گئی جس نے مخلوط تعلیم کی سفارش کی، موسیقی کو لازمی مضمون قرار دیا گیا، اسکولوں میں ''ودیا مندر'' تجویز کیا گیا۔ ہر تقریب میں ہندوستان کا ترانہ بندے ماترم گایا جانے لگا۔ ہندی زبان کو رائج کیا گیا اور مدارس میں اس کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔

کانگریسی علما کی مسٹر گاندھی سے نجانے کیا عقیدت و محبت تھی جس کی بنا پر تحریک موالات کے زمانے میں 1921ء میں مولانا آزاد نے ناگپور میں جمعہ کے خطبہ

اولیٰ میں مسٹر گاندھی کی تعریف وتوصیف فرمائی۔ رفاہِ عام (لکھنؤ) کے جلسے میں مولوی ظفرالملک اسحاق علی نے فرمایا:

- ❑ ''اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔''

کانگریسی علما نے مسٹر گاندھی کو جامع مسجد شیخ خیرالدین، امرتسر میں لاکر منبر رسولؐ پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھے اور یہ دعا کی گئی کہ:

- ❑ ''اے اللہ! تو گاندھی کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما۔''

اس مجلس میں گاندھی کو ''امیر المؤمنین'' اور ''مجاہد فی سبیل اللہ'' بھی کہا گیا۔

کانگریس میں شریک بعض جید علما کرام بلاشبہ علم وعرفان، تقویٰ وطہارت، اخلاق ومعالات اور خشیت الٰہی کے مجسمے تھے۔ انھوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے، تاریخ انھیں ہمیشہ فخر واحترام سے یاد رکھے گی۔ لیکن ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' کے مصداق انتہائی معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش ان علما کرام سے زبردست اجتہادی لغزشیں ہوئیں۔ ان لغزشوں کا انھیں شدید احساس بھی ہوا، لیکن ان کا یہ احساس ''بعد از مرگ واویلا'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ضد، انا پرستی اور ہٹ دھرمی نے ان کے تمام تر زہد، تقویٰ، پارسائی، راست فکری اور بصیرت کو دھندلا کر رکھ دیا اور وہ تاریخ کے فیصلہ کن موڑ پر مبنی برانصاف فیصلہ کرنے سے محروم رہے۔

بیگانے تو بیگانے ہوتے ہیں مگر جب اپنے بیگانے بن جائیں تو اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ کے مقابلہ میں ہندو اور سکھ لڑکے یہ نعرہ لگایا کرتے، روپیہ چاندی دا، راج مہاتما گاندھی دا۔ اللہ کی حاکمیت کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی کے راج کے کیا معنی؟ کانگریس کی اکثریت پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ سے بے حد بغض، عناد اور تعصب رکھتی۔ یہ بھی المیہ ہے کہ کانگریس کے بیشتر اراکین شدھی اور سنگھٹن ایسی مسلم کش تحریکوں میں شامل تھے۔ خواجہ حسن نظامی ایسے نادان دوست ہندوؤں سے زیادہ ہندوؤں کے وفادار بنے ہوئے تھے۔ پاکستان

مخالف بعض کانگریسی راہنماؤں کے بیانات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ یہ گزرا ہے کہ متحدہ قومیت کے تصور کو بعض پڑھے لکھے وطن پرست علما نے اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا۔ ان حضرات نے نجانے کس مصلحت کے تحت گاندھی، نہرو اور پٹیل کا ساتھ دیا اور ان متعصب ہندوؤں کے دست و بازو بنے، جو مسلمانوں کے اسلامی تشخص اور پاکستان کے خلاف اکثر زہر اگلتے رہتے تھے۔

پھر مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا:

- ''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔''

(اخبار زمزم، 7 جولائی 1937ء، بحوالہ قیام پاکستان کا تاریخی وتہذیبی پس منظر، از سمیع اللہ قریشی)

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنے ہی چہرے کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

یہ کیسا ستم ظریفانہ حسن اتفاق ہے کہ قوم پرست اور وطن پرست ''کانگریسی علماء'' کی طرح مسیلمہ پنجاب مرزا قادیانی کے پیروکار بھی ''اکھنڈ بھارت'' کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں تھے۔ قادیانیوں نے تو اس سلسلہ میں ''آستین کے سانپ'' کا کردار ادا کیا۔ وائسرائے ہند نے 12 نومبر 1930ء کو انگلستان میں برصغیر کے اہم سیاسی لیڈروں کی کانفرنس طلب کی تاکہ ہندوستان کے داخلی انتشار کا کوئی حل ڈھونڈا جا سکے۔ کانگریسی لیڈروں نے اولاً کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگی اکابرین نے مسلمانوں کو الگ قوم کی حیثیت دیے جانے اور ان کے حق نمائندگی کو تسلیم کر لیے جانے کی وضاحت کی۔ قائداعظم، محمد علی جوہر اور سر محمد شفیع کے علاوہ اس کانفرنس میں ظفر اللہ خان قادیانی نے بھی شرکت کی۔ مگر اس کی شرکت کا مقصد کیا تھا، اس حقیقت سے پردہ ''اقبال کے آخری دو سال'' کے مصنف ڈاکٹر عاشق حسین

بٹالوی نے اٹھایا ہے۔آپ تحریر فرماتے ہیں:

❑ ''سر فضل حسین ممبر وائسرائے کونسل نے یوپی کے گورنر سر میلکم ہیلی کو 10 رمئی 1930ء کو ایک خط کے ذریعے اپنی کارکردگی سے ان الفاظ میں آ گاہ کیا:

''میں نہیں چاہتا کہ کانفرنس میں صرف جناح تقریریں کرے اور اسے کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ ایسا نڈر آدی کانفرنس میں ضرور ہو جو جناح کو دوبدو جواب دے اور یہ کہہ سکے کہ جناح کے خیالات ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات نہیں ہیں۔ بلاشبہ یہ کام مشکل بھی ہے اور ناگوار بھی، بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ اس نمائندے کی جس کے خیالات کی تردید منظور ہے، حیثیت بہت بلند ہو۔ مجھے یقین ہے شفاعت احمد اور ظفر اللہ اس فرض کی بجا آوری میں قطعاً دریغ نہیں کریں گے۔ شفیع کے متعلق مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس نے جناح کی مخالفت میں کچھ کہا تو مبادا اسے ذاتی رقابت پر محمول کیا جائے۔''

(''اقبال کے آخری دو سال۔'' از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، ص 259)

13 اپریل 1947ء کو ظفر اللہ خان قادیانی کے بھتیجے کا نکاح تھا، قادیانی جماعت کا خلیفہ ثانی مرزا محمود نکاح کی تقریب میں شریک ہوا اور اپنا ایک خواب سنایا جو قادیانیوں کے آرگن الفضل میں شائع ہوا۔ اخبار لکھتا ہے:

❑ ''حضور نے اپنا ایک تازہ رویا بیان فرمایا جس میں ذکر تھا کہ گاندھی جی آئے ہیں اور حضور کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر لیٹنا چاہتے ہیں اور ذرا سی دیر لیٹنے پر فوراً اٹھ بیٹھے اور گفتگو شروع کر دی۔ دوران گفتگو میں حضور نے گاندھی جی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ سب سے اچھی زبان اُردو ہے۔ گاندھی جی نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا، دوسرے نمبر پر پنجابی ہے۔ گاندھی جی نے اس پر اظہار تعجب کیا مگر آخر مان گئے۔ اس کے بعد رویا میں نظارہ بدل گیا۔

اس رویا کی تعبیر کرتے ہوئے حضور نے فرمایا: یہ موجودہ فسادات کے متعلق ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات ابھی اس حد تک نہیں پہنچے کہ صلح نہ ہو

سکتی ہو۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جلد کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے، ......حضور نے فرمایا، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان میں ہمیں دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے اور ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ مشارکت رکھنی چاہیے''۔

(روزنامہ الفضل قادیان، 5 اپریل 1947ء)

5 اپریل 1947ء کو قادیانیوں کے ترجمان الفضل نے ایک بار پھر اپنا موقف ان الفاظ میں دہرایا:

- ''بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔''
- ''ہم نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک پاکستان کا بننا اصولاً غلط ہے''۔

(خطبہ مرزا محمود احمد مندرجہ روزنامہ الفضل قادیان، 12-13 اپریل 1947ء)

- ''ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائے''۔

(تقریر مرزا محمود احمد خلیفہ قادیانی مندرجہ الفضل قادیان 16 مئی 1947ء)

- ''ممکن ہے کہ عارضی طور پر کچھ افتراق ہو اور کچھ وقت کے لیے دونوں قومیں (مسلم اور ہندو) الگ الگ رہیں مگر یہ حالت عارضی ہو گی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جلد دور ہو جائے۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے''۔

(روزنامہ الفضل قادیان، 17 مئی 1947ء)

ان حالات میں محمد علی جناح کو مسلمانوں نے جذباتیت میں قائداعظم کا خطاب نہیں دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ پان دھان سی اور نحیف سی ہستی ایک ایسا وجود ہے جس میں قدرت نے ہمالیہ پہاڑ کی تمام صلابتیں سمو دی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی نے قائداعظم محمد علی جناح کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا تھا کہ ''اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی اور دو سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور

ان کے مقابلے میں کانگریس میں صرف ایک جناح ہوتے تو ملک کبھی تقسیم نہ ہوتا''۔
اس نحیف ونزار ہستی کا کمال یہ تھا کہ اس نے ''متحدہ قومیت'' کے طلسم کے بت کو آنے والے چند ہی برسوں میں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کروایا کہ ''متحدہ قومیت'' دراصل ''ہندوقومیت'' ہی کی ایک دلکش ارتقائی شکل ہے۔ وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی مسلمانوں تک یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ کانگریس اور اس کی قیادت کبھی مسلمانوں کی خیرخواہ نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ کہ ہندو اور مسلم تہذیبوں میں اشتراک وامتزاج ناممکنات میں سے ہے۔ قائداعظم فیصلہ کر چکے تھے کہ اب ہندوؤں کی جانب دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا جائے گا۔ قائداعظم یہ فیصلہ کرنے میں یقیناً حق بجانب تھے۔ ان کا یہ فیصلہ محض ایک سیاسی فیصلہ نہیں تھا بلکہ اسے ایمان وقرآن کی مکمل تائید حاصل تھی:

1- ''اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اپنے جگری دوست، تم تو اظہارِ محبت کرتے ہو ان سے، حالانکہ وہ انکار کرتے ہیں اس دینِ حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے...... اور جو ایسا کرے گا تم میں سے تو وہ بھٹک گیا راہ راست سے...... اے ایمان والو! نہ دوست بناؤ ان لوگوں کو غضب فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے جن پر۔'' (الممتحنہ: 1-2، 13)

2- ''اے ایمان والو! نہ بناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انھیں تم میں سے، تو وہ انھی میں سے ہے۔'' (المائدہ: 51)

3- ''اور ہرگز خوش نہ ہوں گے آپ سے یہودی اور عیسائی، یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔'' (البقرہ: 120)

4- ''بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں۔'' (النسا: 101)

5- ''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست، اگر وہ پسند کریں کفر کو ایمان پر اور جو دوست بناتا ہے انھیں تم میں سے تو وہی لوگ ظلم کرنے

والے ہیں۔'' (التوبہ: 23)

6- ''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا رازدار غیروں کو۔ وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمھیں خرابی پہنچانے میں، وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمھیں ضرر دے۔'' (آل عمران: 118)

قائداعظم جب ایمانی اور قرآنی ہدایات اور تعلیمات کو اپنا ہادی بنا چکے تو اسی دور میں انھوں نے مسلم لیگی قائدین کو ہدایت کی کہ وہ ہندوستان کے نامور علما سے رابطے کریں اور مسلم عوام کو یہ باور کروائیں کہ مسلم لیگ برصغیر میں ایک خالص اسلامی ریاست کی تشکیل و تخلیق اور تعمیر و تزئین کے لیے سرگرم جدوجہد ہے۔ اس ضمن میں جی ایم سید نے سپیشل کورٹ نمبرون کراچی کے روبرو ایک عدالتی بیان میں ماضی کے چہرے پر پڑے نقابوں کو سرکاتے ہوئے بتایا:

❑ ''میرے استعفیٰ دینے پر مسلم لیگ کے ممبران نے جناح صاحب پر زور دیا کہ جی ایم سید کے خلاف ''ڈسپلنری ایکشن'' (Disciplinary Action) لیا جائے۔ مگر محمد علی جناح صاحب نے میرے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے مجھ سے گزارش کی کہ آپ نے وزارت چھوڑ دی ہے تو اب آپ مسلم لیگ کو منظّم کریں پھر...... مسلم لیگ آرگنائزیشن کمیٹی بنا کر مجھے اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا...... میں سندھ کا تفصیلی دورہ کر کے عوام میں بیداری پیدا کرنے اور سندھ میں مسلم لیگ کو منظّم کرنے میں مشغول ہو گیا...... تنظیمی پروگرام کے تحت سندھ کے کتنے ہی شہروں میں کانفرنسیں بلانا گاؤں (دیہات) کے دورے، پاکستان مسلم لیگ کے اصولوں پر لٹریچر چھپوانا، پاکستان مسلم لیگ اور محمد علی جناح صاحب کو عوام سے روشناس کرانے کے کام کیے گئے۔ اس طرح تحریک پاکستان میں میرے جذبے اور مسلم عوام کی خدمت کی عکاسی مسلم لیگ کے اس وسیع تنظیمی دورے کے دوران اشاعتی پوسٹر سے بھی ہوسکتی ہے جس کی نقل درج ذیل ہے:

''مسلم لیگ کا مطالبہ ہے پاکستان''

''پاکستان کے معنی ہیں اسلامی حکومت''

1- جس میں قرآن شریف کے اصولوں کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔

2- جس میں سب لوگوں کو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی برابری حاصل ہو گی۔

3- جس میں حکومت چلانے کی باگیں سچے اور پرہیزگار مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوں گی۔

4- جس میں غیر مسلموں کے حقوق کی خصوصی حفاظت کی جائے گی۔

5- جس کی حکومت کا پہلا فرض ملک سے غربت، ظلم اور جہالت کا خاتمہ اور طبقاتی مفاد کی خاطر عوام کو تنگ کرنے کا سلسلہ بند کرانا ہو گا۔

6- جہاں زنا، شراب نوشی اور سودخوری پر قانونی پابندی ہو گی۔

7- جس میں عدل و انصاف دولت کے بدلے فروخت نہیں ہو گا بلکہ ہر ایک کو مفت نصیب ہو گا۔

8- جہاں عزت کا معیار طاقت اور دولت سے نہیں بلکہ اچھے اخلاق پر مقرر کیا جائے گا۔''

''غلام مرتضیٰ''
چیئرمین مسلم لیگ آرگنائزیشن کمیٹی

(سندھ کی آواز، از: جی ایم سید، ص 49 تا 51)

جی ایم سید کا یہ ''اقراری بیان'' ایک ناقابل تردید شہادت ہے کہ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ ایک خالص اسلامی ریاست کے قیام کے لیے رائے عامہ کو بیدار کر رہی تھی۔ (یہ الگ بات ہے کہ آج کی ہر مسلم لیگ اسلام سے بیزار ہے)۔

23 تا 26 اپریل 1943ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے ارکان مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا جس پر لیاقت علی خان کے دستخط تھے۔ اس دعوت نامہ کے الفاظ یہ تھے:

❑ ''آپ اس موقع پر خود دہلی تشریف لا کر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہتر ہو گا۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمائیں اور دعا

فرمائیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہو سکے۔" (خاتمہ السوانح: ص 89)

یاد رہے کہ یہ دعوت نامہ حکیم الامت کو ان کی وفات سے تین ماہ قبل ارسال کیا گیا تھا۔ وہ ان دنوں شدید علیل تھے۔ علالت کی شدت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کا ضعف بھی اجلاس میں شرکت کے راستے میں آڑے آ رہا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ قرارداد لاہور 1940ء یعنی قیام پاکستان کے حق میں اس اجلاس میں تقریر کریں لیکن باوجود صد خواہش کے شدید علالت کی وجہ سے وہ اجلاس میں شرکت تو نہ کر سکے البتہ انھوں نے ارکان مسلم لیگ کو ان کے دعوت نامے کا باقاعدہ تحریری جواب ارسال کیا اور انھیں تلقین کی کہ وہ ان کی دو شہرہ آفاق کتب "حیات المسلمین" اور "صیانت المسلمین" کا مطالعہ کریں۔

جناب ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی لکھتے ہیں:

❑ "حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ (م 1943) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (م 1899ء) کے خلیفہ مجاز اور بیسوی صدی کے نصف اول کے عظیم روحانی پیشوا تھے۔ وہ سلسلہ چشتیہ صابریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں افراد کی روحانی تربیت فرمائی۔ موصوف نے مسلم لیگ کی کھل کر حمایت کی جس سے مسلم لیگ کا دینی حلقوں میں وقار بڑھ گیا۔ حکیم الامت اور اس کے خلفا و مریدین نے قائد اعظمؒ کا بھرپور ساتھ دیا اور بڑھ چڑھ کر تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ کانگریس کے زلہ ربا مولویوں نے انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی، لیکن ان پر بھلا ایسی گیدڑ بھبھکیوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ حکیم الامتؒ نے 1928ء ہی میں مولانا عبدالماجد دریا بادی (م 1977ء) سے فرمایا تھا کہ برعظیم میں "خالص دارالسلام" قائم ہونا چاہیے"۔ (تحریک پاکستان از پروفیسر محمد اسلم) چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دارالعلوم دیوبند کے نامور اساتذہ کرام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ جیسے اجل علما نے تحریک پاکستان کی تائید و حمایت کے لیے 1945ء میں کلکتہ میں علما کا ایک بڑا اجتماع منعقد

کیا۔اس اجتماع کے سب سے بڑے محرک مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے۔
(زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی)
جناب احسان الحق قریشی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

- ''حضرت مولانا مفتی محمد حسن نے راقم الحروف کو بتلایا کہ وفات سے پندرہ روز قبل اپنے ان دو متبعین کو بلایا، یعنی شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی (جو مولانا تھانوی کی ہمشیرہ کے صاحب زادے تھے)۔ان دونوں اجل علما سے فرمایا: ''حق تعالیٰ نے مجھ پر انعام فرمایا ہے۔ مجھے کشفاً معلوم ہوا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کو حق تعالیٰ کامیابی سے نوازیں گے۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی ان شاء اللہ فتح ہوگی۔ میرا یہ مرض الموت ہے۔ میں اس سے جانبر نہیں ہوں گا۔اگر میں مزید زندہ رہتا تو تحریک پاکستان کے لیے خود کام کرتا۔تم دونوں کو میری وصیت ہے کہ جناح صاحب کے پلان کے مطابق کام کرنا،مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطہ زمین بنے۔ قیام پاکستان کے لیے جو کچھ ہو سکے، کر گزرنا۔مخالفین کی ذرہ بھر بھی پروا نہ کرنا۔اپنے مریدوں اور متوسلین کو بھی تحریک کے لیے کام کرنے پر اُبھارتے رہنا۔'' 1947ء کے سلہٹ کے ریفرنڈم میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے بستی بستی قریہ قریہ کا دورہ کیا اور قائداعظم کی ہدایات کے بموجب دن رات ایک کر دیا۔ جب سلہٹ ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں نکلا تو مولانا ظفر احمد عثمانی سجدہ ریز ہو گئے۔فرمایا کرتے تھے کہ: ''میں نے اپنے مرشد شیخ اور ماموں کی وصیت پوری کر دی۔'' مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی تحریک پاکستان کے سلسلہ میں 1947ء سے پہلے ہندوستان میں اور 1947ء کے بعد پاکستان میں جو جو خدمات سرانجام دیں، وہ ہر کسی کو معلوم ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد حسن، مفتی محمد شفیع اور مولانا احتشام الحق تھانوی نے بھی اپنے اپنے حلقہ میں کافی کام کیا۔ 1971ء میں جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہو گیا تو مولانا ظفر احمد عثمانی کو سخت صدمہ ہوا، وہ بیمار رہنے لگے اور اسی صدمہ میں تین سال بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔(''اوج'' کا

قرار داد پاکستان گولڈن جوبلی نمبر [گورنمنٹ کالج راوی روڈ، شاہدرہ، لاہور] مولانا اشرف علی تھانوی اورتحریک پاکستان، از احسان قریشی صابری، ص 159)

مولانا اشرف علی تھانوی نے 1937ء کے الیکشن میں مسلم لیگی امیدواروں کی واشگاف حمایت کی۔ مثال کے طور پر یو پی اسمبلی کی ایک سیٹ سہارن پور مسلم حلقہ کے لیے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی طرف سے چوہدری ظفر احمد امیدوار تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ نے قاضی منفعت علی ایڈووکیٹ کو ٹکٹ دیا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے منفعت علی صاحب کی حمایت میں ذیل کا بیان دیا جو کہ تمام اخبارت میں جلی سرخی کے ساتھ شائع ہوا:

- ''مجھ سے سوالات پوچھے جا رہے ہیں کہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیا جائے یا کانگریس کے امیدواروں کو۔ ایک مسلمان کے لیے کانگریس کے حالات معلوم ہونا اور پھر علما سے استفسار کرنا حیران کن ہے۔ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے ایمان والو! نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو اور وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔ ان کی خوشی تو اس بات میں ہے کہ تمہارے پاؤں پر زیادہ سے زیادہ تکلیف پڑے۔ دشمنی ان کی زبان سے اور جو منافقانہ بغض ان کے سینہ میں چھپا ہے۔'' اس لیے موجودہ حالات میں میری رائے ہے کہ جو کانگریس کی موافقت میں ممبری کا مساعی ہے وہ کبھی بھی مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی موافقت اور اس کے لیے سعی کرنے کو میں اہل اسلام کے لیے مضر سمجھتا ہوں۔ کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ کانگریس کو ووٹ دینا موجب ثواب ہے اور مسلم لیگ کو ووٹ دینا موجب عذاب ہے، محض دعویٰ ہے، بے دلیل بلکہ خلاف دلیل اور سخت جسارت اور بے باکی ہے۔ جس سے توبہ واجب ہے۔''

(اشرف علی تھانوی، 25 رمضان المبارک 1356ھ)

مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد سعید کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

- ''مولانا السلام علیکم......! آپ کا دعوت نامہ برائے اجلاس جمعیت علما ہند آیا۔ میرا عذر تو آپ کو معلوم ہی ہے، حاضری سے قاصر ہوں۔ اب تو واقعات نے مجھ کو

اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں کا (خصوصاً علما حضرات کا) کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ (والسلام احقر اشرف علی) (حوالہ ایضاً)

''روئیداد تبلیغ'' مولانا شبیر احمد عثمانی کی معروف کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تحریک پاکستان کے عروج کے ابتدائی دنوں کے واقعات اور واردات کا بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

- ''واقعہ مئی 1938ء کا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا، جو حضرت حکیم الامت کی سہ دری کے سامنے تھا۔ حضرت حکیم الامت دوپہر کا کھانا نوش فرما کر قیلولہ کے لیے خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنی سہ دری میں پہنچ کر مجھے آواز دی۔ میں فوراً حاضر ہوا اور سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت سر جھکائے ہوئے کچھ متفکر تشریف فرما تھے۔ اس زمانہ تک پاکستان کا مشہور ریزولیوشن لاہور نہیں ہوا تھا، مگر کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت بہت کچھ بے نقاب ہو چکی تھی اور عوام وخواص کی زبان پر یہ آ گیا تھا کہ ہندو کے ساتھ مسلمان کا نباہ ناممکن ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے علیحدہ سلطنت قائم کرنا ضروری ہے۔ غرض حضرت نے دو تین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور جو ارشاد فرمایا، اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور بحمد للہ حافظہ میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''میاں شبیر علی! ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی! جو سلطنت ملے گی، وہ انھی لوگوں کو ملے گی، جن کو آج سب فاسق وفاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں اور بھائی! آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جاوے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا کام ہے۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور

تخت زیب بھی نہیں دیتا۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت انھی کے ہاتھ میں رہی تو 'چشم ما روشن دل ما شاد' کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس! تا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔'' (روئیداد تبلیغ، ص 1، 2)

یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی کوششوں اور کاوشوں سے قائداعظم کے افکار و نظریات کی دنیا میں واضح تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ایک دور تک قائداعظم مذہب اور سیاست کو دیگر دنیادار سیاستدانوں کی طرح الگ الگ اکائیوں میں بانٹتے تھے۔ خانقاہ امدادیہ کے علما کے وفود قائداعظم سے پے در پے ملتے رہے، انھوں نے ان سے ٹیلی فونی رابطہ بھی برقرار رکھا۔ آخر وہ انھیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ''مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدانوں کے جرنیل بھی۔'' 12 فروری 1939ء کی ایک شام علما کا ایک وفد قائداعظم سے ملا، اس وفد کے اراکین میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع اور مولانا شبیر علی تھانوی نمایاں تھے، اڑھائی گھنٹے تک گفتگو جاری رہی۔ آخرکار قائداعظم نے علما کی معروضات سے اتفاق کیا اور فیصلہ کن انداز میں آگاہ کیا کہ ''دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو، میری سمجھ میں اب خوب آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے۔'' (روئیداد تبلیغ: مولانا شبیر علی تھانوی، ص 7)

انھی ایام میں مولانا اشرف علی تھانوی نے قائداعظم کے ساتھ خط و کتابت بھی جاری رکھی۔ قائداعظم ان کے خطوط کو انتہائی اہمیت دیتے تھے اور انھیں ایک فائل میں محفوظ کر لیتے۔ باغپت ضلع میرٹھ کے رئیس اعظم نواب جمشید علی خان، قائداعظم کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے، مرحوم تیس برس تک یوپی کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔ قائداعظم ان کے ایثار و خلوص سے بہت متاثر تھے، سردیوں کے موسم میں وہ اکثر آرام کرنے کے لیے نواب صاحب کے ہاں باغپت تشریف لے جایا

کرتے تھے اور وہاں ہفتوں قیام کرتے۔ نواب صاحب چونکہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ارادت مندوں میں سے تھے، اس لیے وہ اکثر و بیشتر ان کے ملفوظات قائداعظم کے گوش گزار کرتے۔ قائداعظم انھیں بڑی دلچسپی سے سنتے۔ نواب اسماعیل خان جو دہلی کے مشہور رئیس نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ کے پوتے اور یوپی مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کے صدر بھی تھے، ایک مرتبہ قائداعظم کے ایما پر نواب جمشید علی خان کی معیت میں مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب اسماعیل خان اس ملاقات کو اپنے لیے زندگی بھر ایک عظیم سعادت تصور کرتے رہے۔

سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کی روحانی تربیت اس ''مرد غازی'' نے کی جو حضرت غوث الاعظمؒ کے دربار بغداد سے اس غرض کے لیے مامور من اللہ ہو کر آئے تھے۔ وہ درجہ میں ''ابدال'' تھے، بڑے صاحب فراست تھے۔ وہ اپنی روحانیت کی بنا پر قائداعظم کے مقرب و معتمد بن گئے۔ قائداعظم کے لیے ان کا بس اشارہ کافی ہوتا۔ قائداعظم فوراً تعمیل کرتے، انھیں چوٹی کے سب لیگی لیڈر جانتے تھے۔ اس لیے جسے قائداعظم سے بات منوانے کی جرأت نہ ہوتی وہ ان ہی کے ذریعہ اپنا کام نکلواتا۔ روحانی دنیا کے نظام کے مطابق چونکہ عارف کی تدفین ابدال کے ذمہ ہوتی ہے اسی لیے انھوں نے خود اکیلے قائداعظم کو لحد میں اُتارا۔

آخری ایام میں قائداعظم نے مرد غازی کو ایک خاص مشن پر دربار نبوی ﷺ میں بھیجا۔ وہ اپنا زیادہ وقت دربار نبوی ﷺ کے خادم خاص آغا اسحاق علی کے پاس گزارا کرتے تھے جو زیر مزار مبارک آنے جانے کے واحد مجاز تھے۔ آغا صاحب نے اس مرد غازی کو بتایا کہ ''جس روز قائداعظم کا پاکستان میں انتقال ہوا، اس روز مجھے حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ بہت مسرور نظر آتے تھے۔ فرمایا: آج ہمارا دوست آ رہا ہے۔ اس کی آمد کی خوشی مناؤ۔ جب دریافت کیا کہ حضور ﷺ! وہ کون ہے تو فرمایا محمد علی جناح! چنانچہ اس روز ہم نے شیرینی وغیرہ پکائی۔'' اس خواب کی تائید اس خواب سے ہوتی ہے جو پاکستان بننے سے پہلے سرحد ہزارہ کے ایک معمر بزرگ نے

جو قائداعظم کے نام و مقام تک سے ناواقف تھے، روضہ اطہر کے متصل دیکھا کہ ''حضور سرور دو عالم ﷺ بنفس نفیس تشریف فرما ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھ شانہ بشانہ ایک لمبے معمر صاحب سر پر ٹوپی پہنے کھڑے ہیں اور پیچھے لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ کسی نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ حضور ﷺ یہ ٹوپی والے کون ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تم نہیں جانتے؟ یہ محمد علی جناح ہیں اور یہ لوگ سب کے سب مجاہد ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے آب زمزم کی بہت مقدار لے کر جناح اور اس کے ساتھیوں پر چھڑکی۔'' اس خواب کی پوری تفصیل ہزارہ کے محمد افضل خان بی اے کے قلم سے روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 19 جنوری 1942ء میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی کئی ثقہ حضرات نے قائداعظم کو دربار نبویؐ میں دیکھا۔ چونکہ عالم خواب میں حضور ﷺ کے سوا اور کوئی حضور ﷺ کی شکل مبارک میں نہیں آ سکتا، اس لیے ایسے رویائے صادقہ شک وشبہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ (مشاہدات و واردات، ص 149)

قائداعظم نے انگلستان سے واپسی کے بعد مولانا ظفر علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں مندرہ بالا بیان دیا تھا جو ماہنامہ ''منارہ'' کراچی میں شائع ہوا اور جسے روزنامہ ''ندائے ملت'' لاہور نے اپنی 15/اپریل 1970ء کی اشاعت میں نقل کیا: ''میں لندن میں امیرانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر انڈیا اس لیے آیا ہوں کہ لا الہ الا اللہ کی مملکت یعنی پاکستان کے قیام کے لیے کوشش کروں۔ اگر میں لندن میں رہ کر سرمایہ داری کی حمایت کرنا پسند کرتا تو سلطنت برطانیہ جو دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی، مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب اور مراعات سے نوازتی۔ اگر میں روس چلا جاؤں یا کہیں بیٹھ کر سوشلزم، مارکسزم یا کمیونزم کی حمایت شروع کر دوں تو مجھے بڑے سے بڑا اعزاز بھی مل سکتا ہے اور دولت بھی۔ مگر علامہ اقبال کی دعوت پر میں نے دولت اور منصب دونوں کو تج کے انڈیا میں محدود آمدنی کی دشوار زندگی بسر کرنا پسند کیا ہے تا کہ پاکستان وجود میں آئے اور اس میں اسلامی قوانین کا بول بالا ہو کیونکہ دنیا کی نجات اسلامی نظام ہی میں ہے۔ صرف اسلام ہی کے علمی، عملی اور قانونی دائروں میں آپ کو

عدل، مساوات، اخوت، محبت، سکون اور امن دستیاب ہوسکتا ہے۔ برطانیہ، امریکہ اور یورپ کے سارے بڑے بڑے سیاستدان مساوات کا راگ الاپتے ہیں۔ روس کا نعرہ بھی مساوات ہے۔ ہر مزدور اور کاشتکار کے لیے روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنا ہے مگر یورپ کے بڑے بڑے سیاستدان عیش وعشرت کی جو زندگی بسر کرتے ہیں، وہ وہاں کے غریبوں کو نصیب نہیں۔ محمد علی جناح کا لباس اتنا قیمتی نہیں جتنا یورپ کے بڑے بڑے لوگ اور روس کے لیڈر زیب تن کرتے ہیں نہ محمد علی جناح کی خوراک اتنی اعلیٰ ہے جتنی سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈروں اور یورپ کے سرمایہ داروں کی ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ اور خلفائے راشدینؓ نے سارا اختیار ہوتے ہوئے خودغریبانہ زندگی بسر کی مگر رعایا کو خوش اور خوشحال رکھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ انڈین کانگریس حکومت بنانے کے بعد برطانوی ٹھگوں کو تو یہاں سے نکال دے گی مگر پھر ٹھگ خود بن جائے گی۔ یہ لوگ صرف مسلمانوں ہی کی آزادی ختم نہیں کریں گے بلکہ اپنے لوگوں کی آزادی بھی ختم کر دیں گے۔ اس لیے ہم سب کو پاکستان کے قیام کے لیے زبردست کوشش کرنی چاہیے۔ ذرا خیال فرمائیے کہ اگر لا الہ الا اللہ پر مبنی حکومت قائم ہو جائے تو افغانستان، ایران، ترکی، اردن، بحرین، کویت، حجاز، عراق، فلسطین، شام، تیونس، مراکش، الجزائر اور مصر کے ساتھ مل کر یہ کتنا عظیم الشان ''اسلامی بلاک'' بن سکتا ہے۔ علامہ اقبال کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان نہیں ہوسکتا خواہ وہ پیر یا مولانا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ سوشلزم اور کمیونزم کے سارے بانی یہودی تھے۔ آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ سوشلزم اور کمیونزم مسلمانوں کے لیے ایسا زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں، آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہودی، انگریز، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور ہندو سب مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔'' (اسلام اور انقلاب، ص 237، مولف منشی عبدالرحمٰن خان)

''حکیم الامت مولانا تھانوی نے نہ صرف مسلم لیگ کی تائید کی بلکہ 1938ء میں قیام پاکستان کے متعلق پیشین گوئی بھی فرما دی تھی۔ حضرت تھانوی کے برادر نسبتی

سعید احمد صاحب عثمانی سے یہ بات خود حضرت تھانوی نے فرمائی تھی۔ ''رات کو تقریباً اڑھائی بجے حضرت نے مجھ کو بیدار کر کے مجھ سے دریافت کیا کہ تم اس گاڑی سے جاؤ گے جو ساڑھے تین جاتی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا ضرورت سے فارغ ہو کر مجھ سے مل لینا، ضروری بات کرنی ہے۔ میں سخت پریشان ہوا کہ کیا بات ہو گی۔ جلدی جلدی فارغ ہو کر حاضر ہوا، چوکی پر قبلہ رو ہو کر اپنے اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ مجھ کو دیکھ کر اپنے سامنے بٹھایا اور فرمایا ''مجھے تمہارے خیالات کا علم ہوا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے بہت سے مجذوبوں نے بتلایا اور فرمایا ''اسلامی سلطنت 1947ء میں قائم ہو جائے گی۔''

(پروفیسر احمد سعید ''جدوجہد آزادی اور مولانا اشرف علی تھانوی''، ص 148)

''قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل مولانا حسین احمد مدنی سلہٹ پہنچے، جن بزرگ کے یہاں قیام تھا، ایک رات تہجد کے وقت حضرت مدنی نے ان سے فرمایا کہ آج عالم بالا میں ہند کی تقسیم کا فیصلہ ہو کر پاکستان کے وجود میں آنے کا بھی فیصلہ ہو گیا ہے۔'' (''زیارت النبیؐ بحالت بیداری'' ص 151، مولفہ محمد عبدالمجید صدیقی ایڈووکیٹ)

''1946ء کا طوفانی دور گزر چکا تھا اور پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا تھا۔ صبح کا وقت تھا بہت سے حضرات ملاقات کو آ گئے۔ کسی نے کہا ''حضرت (مولانا حسین احمد مدنی) بازار میں پانچ آنے کا ایک خواب بک رہا ہے کہ سرکار ابد قرار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے محمد علی جناح (قائداعظم) کو ایک جھنڈا دیا ہے، یہ کہاں تک درست ہے؟'' کسی نے تیز ہو کر کہا یہ سب جھوٹ ہے مگر حضرت مدنی نے فرمایا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہر شخص کے خواب میں آ سکتے ہیں ممکن ہے محمد علی جناح نے بھی آپ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہو۔''

(سیرت النبیؐ بعد از وصال النبی ﷺ، ص 343، مولفہ محمد عبدالمجید صدیقی)

جون 1944ء میں حضرت سیّد پیر جماعت علی شاہ، سری نگر (کشمیر) میں جلوہ افروز تھے کہ آپ کے مرید خاص قائد ملت چوہدری غلام عباس، قائداعظم کو ساتھ لے کر

آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے قائداعظم کی پُر تکلف دعوت کی اور انواع و اقسام کے 45 کھانے دسترخوان پر چنے گئے۔ دعوت کے اختتام پر حضرت امیر ملت (سید پیر جماعت علی شاہ) نے قائداعظم کو تحائف مرحمت فرمائے اور کامیابی و کامرانی کی دعا فرمائی اور حاضرین سے فرمایا کہ سب لوگ مسلم لیگ کے لیے وقف ہو جاؤ اور ہر طرح سے مدد کر کے تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ یاد رہے کہ اس تاریخی اور بے مثل دعوت میں کشمیر اور بیرون کشمیر کے رؤسا و عمائدین بھی شریک تھے۔

اس دعوت کے بعد حضرت امیر ملت نے قد آور اشتہارات کے ذریعے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان فرمایا اور قائداعظم کی کامیابی کی پیش گوئی کی۔ چنانچہ اس پیش گوئی پر کامل یقین کرتے ہوئے قائداعظم نے لاہور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں کہا:

❑ ’’میرا ایمان ہے کہ پاکستان ضرور بنے گا، کیونکہ امیر ملت مجھ سے فرما چکے ہیں کہ پاکستان ضرور بنے گا اور مجھے یقین واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کو ضرور سچا کرے گا۔‘‘

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے قائداعظم کی قیادت میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے کہ ان انتخابات میں خالصہ سکھوں، قادیانیوں، پارسیوں کے علاوہ نیشنلسٹ راہنماؤں اور جماعتوں نے اپنا وزن کانگریس کے پلڑے میں ڈالا۔ اس کے باوجود مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلم لیگ نے کانگریس اور اس کے ہم نواؤں کو عبرتناک شکست دی۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ برصغیر کے مسلم عوام کی اکثریت قائداعظم محمد علی جناح کے موقف کی غیر مشروط حامی ہے۔ نتیجتاً قیام پاکستان کی راہ ہموار ہوئی۔

یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ جناح انگریزی انداز فکر سے متاثر ہیں اور ایسے شخص ہیں جو نہ صرف اُردو زبان اور تعلیمات اسلامی سے نابلد ہیں بلکہ انھیں ان اداروں سے بھی ذرہ برابر دلچسپی نہیں، وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ مذہب، تحریک آزادی میں ایک اہم عامل ثابت ہو سکتا ہے مگر یہ ادعا بھی قائداعظم کی ذات پر ایک تہمت سے کم نہیں۔

معروف برطانوی مصنف لیونارڈ موسلے نے اپنی کتاب میں قائداعظم کی حمیت اسلامی کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

❑ ''ہندوستان اور پاکستان کے جھنڈوں کے ڈیزائن بھی لارڈ مونٹ بیٹن نے خود تیار کر لیے تھے۔ انھیں ڈیزائن کرنے کا بے حد شوق تھا۔ انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے جھنڈوں کا جو ڈیزائن بنا کر نہرو اور جناح کو بھیجا تھا، ان کے گوشوں میں برطانوی یونین جیک بھی بنا ہوا تھا۔ نہرو نے جواباً لکھا کہ اس ڈیزائن کو گاندھی اور پٹیل نے بڑی حد تک منظور کر لیا ہے لیکن میرے خیال میں ہندوستانی عوام اسے پسند نہ کریں گے۔ لیکن جناح نے پاکستان کے لیے ڈیزائن کردہ پرچم کو یہ لکھ کر نامنظور کر دیا کہ اسلام کے ہلال کے اوپر عیسائی صلیب کا نشان مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کر دینے کا باعث ہوگا، اس لیے میں یہ ڈیزائن نامنظور کرتا ہوں۔''

(The Last Day of British Raj by Leunard Mosley)

قائداعظم کی اعجاز آفریں قیادت کا فیض عام ہے کہ آج ہم ایک آزاد وطن میں سانس لے رہے ہیں۔ نسل نو کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کے اس آزاد ملک کا بانی اس آزاد ملک کو تہذیب اسلامی اور تمدن اسلامی کے احیا کا ایک عظیم مرکز بنانا چاہتا تھا۔ احیائے تہذیب اسلامی کے خواب کی دلکشا تعبیر یہ آزاد پاکستان ہے۔ ہمیں اس وطن کی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے کبھی یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری آزادی محض کسی قلم کی ایک جنبش یا ریڈیو کے چند نشریوں کی مرہون منت نہیں۔ اس آزادی کے لیے برصغیر کے چپے چپے کو ہمارے آبا واجداد نے خون تمنا سے گلزار بنایا۔

حقیقت کا کمال یہی ہے کہ ''حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی'' اس کے مصداق آیئے تحریک پاکستان کی ایک بڑی مخالف شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا اعتراف ملاحظہ فرمائیں:

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی فرماتے ہیں:

❑ ''مجھے یہ بات نہایت ہی وثوق اور کلی اعتماد کے ساتھ یاد ہے کہ **1948**ء

میں جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے ایک سال گزر رہا تھا، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (بمبئی) تشریف لائے۔ میں اس وقت جامعہ اسلامیہ میں مدرس تھا۔ ایک مجلس میں بعض حضرات نے (اس بنا پر کہ حضرت مدنیؒ کا تعلق کانگریس سے تھا اور کانگریس کی سیاست پاکستان کی حامی نہ تھی اور تحریک پاکستان کی مخالف تھی) حضرت مدنی سے پاکستان کے متعلق سوال کیا کہ اب حضرت کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت اقدسؒ نے اس سوال کے جواب میں جو کلمات فرمائے، وہ مجھے آج تک یاد ہیں۔ فرمایا: ''بھائی! یہ ممکن ہے کہ اگر کسی جگہ مسجد تعمیر کرنے کی گفتگو ہو تو اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اس جگہ مسجد تعمیر کی جائے یا نہ کی جائے لیکن جب مسجد بن گئی تو اب کوئی گنجائش اس اختلاف کی نہیں رہ سکتی کہ اس مسجد کو باقی رکھا جائے یا منہدم کیا جائے۔'' (ماہنامہ حکمت القرآن، لاہور، مئی جون 1986ء)

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ یہ کسی بھی شخصیت کی عظمت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سابقہ نظریات کی پروا کیے بغیر زمینی حقائق کو فراخدلی سے تسلیم کر لے۔ حضرت مدنی کے پیروکاروں کو بھی چاہیے کہ وہ ''مسجد'' اور ''بانی مسجد'' کے حوالے سے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے احتیاط اور توازن سے کام لیا کریں۔

ڈاکٹر انیس احمد

قائدِاعظمؒ کا تصورِ پاکستان

قائدِاعظمؒ نے پاکستان کس مقصد اور کس عہد و پیمان پر قائم کیا تھا، وہ بار بار سامنے لانا ضروری ہے۔ ہم قائداعظم ہی کے چند زریں اقوال پیش کرتے ہیں تاکہ ناموسِ رسول ﷺ کی حفاظت کے قانون پر ان تازہ حملوں کے لیے قائداعظم کے نام کو استعمال کرنے والوں کی بدباطنی سب پر آشکار ہو جائے۔ کاش! وہ خود بھی اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیں اور قائداعظم کا سہارا لے کر اپنے اس شیطانی کھیل سے اجتناب کریں۔

قائداعظم نے 11 اگست 1947ء کی تقریر کے بعد 11 اکتوبر 1947ء میں ان تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا تھا جو مخالفین پیدا کر رہے تھے بلکہ واضح الفاظ میں پاکستان کے قیام کے مقاصد اور اس عمرانی معاہدے کا برملا اعلان کیا تھا جو انھوں نے ملّت اسلامیہ پاک و ہند سے کیا تھا:

- ''پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم 10 سال سے کوشاں تھے، بفضلہٖ تعالیٰ اب ایک زندہ حقیقت ہے لیکن خود اپنی آزاد مملکت کا قیام ہمارے اصل مقصد کا صرف ایک ذریعہ تھا، اصل مقصد نہ تھا۔ ہمارا اصل منشا و مقصود یہ تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم ہو جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہیں، جس کو ہم اپنے مخصوص مزاج اور اپنی ثقافت کے مطابق ترقی دیں اور جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اصول آزادی کی ساتھ برتے جائیں۔''

(قائداعظم: تقاریر و بیانات جلد چہارم، صفحہ 374 از اقبال احمد صدیقی)

قائداعظم اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام محض عقائد اور عبادات کا نام نہیں بلکہ نظامِ حیات ہے جو تطہیر افکار اور تعمیر اخلاق کے ساتھ اجتماعی زندگی کی نئی صورت گری کا

تقاضا کرتا ہے اور جس میں قانون، معاشرت اور معیشت سب کی تشکیل کو قرآن وسنت کے مطابق ہونا ہی اصل مطلوب ہے۔ معاملہ حدود وقوانین کا ہو یا تحفظ ناموسِ رسالت ﷺ کے قانون کا، زکوٰۃ وعشر کے قوانین ہوں یا اسلام کا قانونِ شہادت، یہ سب پاکستان کے مقصدِ وجود کا تقاضا ہیں اور قائداعظم کو اس بارے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ ان کا ارشاد ہے:

❑ ''ان لوگوں کو چھوڑ کر جو بالکل ہی ناواقف ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی، معاشرتی، دیوانی، معاشی، عدالتی، غرض یہ کہ ہماری مذہبی رسومات سے لے کر روز مرہ زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے جسم کی صحت تک، اجتماعی حقوق سے انفرادی حقوق تک، اخلاقیات سے جرائم تک، دنیاوی سزاؤں سے لے کر آنے والی زندگی کی جزا وسزا تک کے تمام معاملات پر اس کی عمل داری ہے اور ہمارے پیغمبر ﷺ نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہر شخص اپنے پاس قرآن رکھے اور خود راہنمائی حاصل کرے۔ اس لیے اسلام صرف روحانی احکام اور تعلیمات اور مراسم تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ ایک کامل ضابطہ ہے جو مسلم معاشرے کو مرتب کرتا ہے۔''

(1945ء میں عید کے موقع پر مسلمانوں کے نام ایک پیغام)

11 اگست 1947ء کی تقریر سے قبل دہلی میں پاکستان کے لیے روانہ ہونے سے پہلے قائداعظم نے بہت صاف الفاظ میں اس وقت کے صوبہ سرحد میں استصواب کے موقع پر جو عہد و پیمان قوم سے کیا تھا، خود اس کو بھی ذہن میں تازہ کرلیں۔ یہ کوئی عام تقریر نہیں بلکہ سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ ایک عہد (covenant) ہے جس کے مطابق انھوں نے خان عبدالغفار خان کے موقف کو رد کیا اور قائداعظم کے موقف پر اعتماد کر کے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا:

❑ ''خان برادران نے اخبارات میں ایک اور زہریلا نعرہ بلند کیا ہے کہ مجلس دستور ساز پاکستان، شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین کو نظر انداز کر دے گی۔ یہ بھی ایک بالکل نا درست بات ہے۔ 13 سے زیادہ صدیاں بیت گئیں، اچھے اور بُرے موسموں کا سامنا کرنے کے باوجود ہم مسلمان نہ صرف اپنی عظیم اور مقدس کتاب

قرآن کریم پر فخر کرتے رہے، بلکہ ان تمام ادوار میں جملہ مبادیات کو حرزِ جاں بنائے رکھا......معلوم نہیں کہ خان برادران کو اچانک اسلام اور قرآنی قوانین کی علم برداری کا دورہ کیسے پڑا ہے، اور انھیں اس ہند مجلس دستور ساز پر اعتبار ہے کہ جس میں ہندوؤں کی ظالمانہ اکثریت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبہ سرحد کے مسلمان واضح طور پر یہ سمجھ لیں کہ وہ پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں پٹھان۔'' (قائداعظم تقاریر و بیانات، ج 4، ترجمہ اقبال احمد صدیقی، بزمِ اقبال، لاہور، ص 346-347)

دیکھیے بات بہت واضح ہے، پاکستان کے قیام کا مقصد قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی اور زندگی کے پورے نظام کو ان اصولوں اور ہدایات کے مطابق منظّم اور مرتب کرنا تھا۔ اس لیے آج ایشو یہ ہے کہ کیا ناموسِ رسالت ﷺ کی حفاظت اور توہینِ رسالت ﷺ کے خلاف قانون قرآن وسنت کا حکم اور اِقتضا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو پھر اس سلسلے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ قانون کی تنسیخ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف بغاوت ہو گی اور قانون میں ایسی ترمیم جس سے وہ محض ایک نمائشی چیز بن کر رہ جائے، قرآن وسنت سے مذاق اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے بے وفائی ہو گی۔ بلاشبہ قانون کا نفاذ اس طرح ہونا چاہیے کہ کوئی شاتمِ رسول ﷺ اپنے جرم کی سزا سے بچ نہ سکے اور کوئی معصوم فرد ذاتی، گروہی، معاشی مفادات کے تنازعے کی وجہ سے اس کی زد میں نہ آ سکے۔ انصاف سب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ ضروری ہے اور وہ یہ کہ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک کے بارے میں کسی کو بھی تضحیک اور توہین کی جرات نہ ہو۔ پھر انصاف معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ ضروری ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ کہ مجرم اور صرف مجرم قانون کے شکنجے میں آئے۔ نہ عام انسان قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں اور نہ کسی کو قانون کی گرفت سے نکلوانے کے لیے سیاسی وڈیروں، دولت مند مفاد پرستوں، سیکولر دہشت گردوں یا بین الاقوامی شاطروں کو اپنا کھیل کھیلنے کا موقع مل سکے۔ اس سلسلے میں جن انتظامی اصلاحات یا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جن تدابیر کی ضرورت ہے،

ان کے بارے میں نہ ماضی میں کوئی مشکل حائل تھی اور نہ آج ہونی چاہیے۔لیکن ترمیم کے نام سے قانون کو بے اثر کرنے اور امریکا و یورپ اور عالمی سیکولر لابی اور سامراج کے کارندوں کو کھل کھیلنے کا موقع دینا ہمارے ایمان، آزادی،عزت اور حمیت کے خلاف ہے اور اس کی یہ قوم کبھی اور کسی کو بھی اجازت نہیں دے گی۔اس لیے کہ

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں
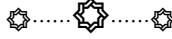
طارق جان

قائداعظم اور اسلامی طرز حکومت

اردشیر کاؤس جی کے آرٹیکل "Not the Business of the State" جس نے لادین عناصر کو خاصی شہہ دی ہے، اُس میں انھوں نے خودساختہ حالات و واقعات کو باہم جوڑ توڑ کر قارئین کے ذہنوں پر ایک منفی اثر مرتب کیا ہے۔

افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ موصوف نے اپنے دعوے کے لیے دو حوالے پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک جناح کی 11 اگست 1947ء کی تقریر اور دوسرا 1947ء میں چھاگلہ کا انھیں پُرجوش نیشنلسٹ قرار دینا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ 1947ء میں اس وقت چھاگلہ کے بیان پر پانی پڑ گیا جبکہ بقول ان کے نیشنلسٹ قائداعظم ہی اسلام کے نام پر ایک مسلم ریاست کو معرض وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کاؤس جی کا جناح کے آسٹریلوی عوام سے خطاب کا حوالہ دینا قطعی بے جواز ہے کیونکہ کاؤس جی غلطی سے اسلامی حکومت کو مطلق العنانی سے مشابہ سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں میں بنیادی فرق موجود ہے۔

کاؤس جی کا مسئلہ کیا ہے، شاید ان کا اقلیت میں سے ہونے کا احساس انھیں تحریک پاکستان کے اسلامی پہلوؤں سے ہمدردی نہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی طرح وہ حقائق کے انتخاب میں بھی اپنی پسند کو دخل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو ان کی دیگر تقاریر کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے وہ ان کی ایک ہی تقریر کو اپنا موضوع بنا کر اس کے ذریعے محمد علی جناح کو سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کاؤس جی کا نقطہ نظر مان لیا جائے تو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ قائداعظم کی اسلامی ریاست کو وجود میں لانے سے متعلق بے شمار تقاریر کو بھی ان کے

سیکولر طرز حکومت کے نظریے کے مطابق بنانا پڑتا ہے جیسا کہ خود کاؤس جی نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ایسی صورت میں تو چار صورتیں ہی سامنے آتی ہیں کہ خدانخواستہ:

-1 پاکستان کے جناح نے اسلامی حکومت کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔

-2 جناح نے اپنی قوم سے دوغلی پالیسی اختیار کر کے اسے دھوکہ دیا۔

-3 جناح کا حافظہ کمزور تھا، اسی لیے وہ 1947ء سے پہلے کی اپنی ہر بات بھول گئے۔

-4 جناح سیکولر ذہن کے مالک تھے۔

جانچنے کا پیمانہ

کسی ایسے شخص کے کردار کی جانچ پرکھ جو کسی مقصد کی طرف بلاتا ہو، اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ اس کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ اسی طرح اس کی کسی ایک بات کو اس کی دیگر تمام باتوں کے سیاق کے ساتھ ملا کر نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ اس کی مجموعی سوچ کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اگر کسی شخص کی سوچ میں دو متضاد جہتیں موجود ہیں تو ان پر بارے دیگر مصالحانہ انداز میں غور کر لینا چاہیے تا کہ تضاد دُور ہو سکے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر اس شخص کے ذہنی میلانات کو بڑے اور چھوٹے دو اقسام میں تقسیم کر لینا چاہیے اور ایسی صورت میں جس طرف بڑا میلان پایا جائے، اسی کو غالب اور قابل قبول سمجھا جائے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ شخصیت کا کسی خاص طرف زیادہ جھکاؤ مسلسل ہے یا نہیں۔ اگر اس میں تسلسل نہ ہو تو اس کے ذریعے اس کے دوسرے بیانات کے مفہوم کا تعین بھی کیا جانا چاہیے۔

یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کوئی سیکولرسٹ کیسے بنتا ہے اور اس کے لیے درج ذیل باتوں کی ضرورت ہے۔

الف: ایک حقیقی سیکولرسٹ کسی ایسے خدا پر یقین نہیں رکھتا جو خالق، پالنہار اور مطلق العنان ہو۔

ب: وہ تخلیق کے ماورائی یا مذہبی تصور کا قائل نہیں ہوتا، اس کے مطابق کائنات ازخود وجود میں آئی اور ہمیشہ کے لیے برقرار رہے گی اور نہ ہی وہ پیغمبری اور

وحی کو تسلیم کرتا ہے۔

ج: جب ایک سیکولرسٹ خود کو، خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کا قائل بھی کر لیتا ہے تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس مادی دنیا سے ماورا کچھ بھی نہیں جانتا اور خدا جو ایک ہستی ہے لیکن وہ انسانوں کی سمجھ اور ادراک سے باہر ہے۔

د: سیکولرسٹ کے مطابق مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مذہب کسی کی پہچان، سیاست اور قانون سازی کا اختیار رکھتا ہے۔

محمد علی جناح کی لگ بھگ ستر (70) سالہ زندگی میں درج بالا شقوں میں سے کسی ایک کا بھی کوئی دخل نہیں رہا۔ انھوں نے ساری دنیا کے سامنے اپنی پوری زندگی، تاریخ میں ایک نئی ریاست تشکیل دینے میں صرف کر دی، لاکھوں افراد نے انھیں سنا اور پڑھا۔ ریکارڈ درست رکھنے کے لیے ہم عرض کر دیں کہ اسلام ان کی زندگی کے اواخر میں داخل نہیں ہوا بلکہ جب وہ بمشکل سولہ برس کے تھے تو ان میں احساس مسلمانی بیدار ہو چکا تھا۔ ان کی مسلمانیت کی روح کی رازداران کی ہمشیرہ فاطمہ تھیں۔ انھوں نے اپنی بہن کو بتایا کہ "لنکنز اِن" کو اپنی قانونی تعلیم کے حصول کے لیے اسی لیے منتخب کیا کہ اس کے صدر دروازے پر دنیا کے شہرۂ آفاق مقننین کے اسما میں رسول اکرم ﷺ کا نام گرامی سرفہرست کندہ تھا۔ اس مشاہداتی تجربے نے ضرور ان کو اسلام کا دانش ورانہ احساس دیا ہو گا کہ شریعت اسلامیہ رسمی لحاظ سے ہٹ کر براہِ راست زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔

1911ء میں نہ صرف یہ کہ انھوں نے عوام الناس کے اسلامی جذبات کا ادراک کر لیا تھا بلکہ انھوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ کس طرح وہ اسلامی قوانین کے ذریعے قوم کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ امپریل پریوی کونسل سے خطاب کے دوران انھوں نے برطانیہ کی وقف لاز کو بدلنے پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

- "بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ برطانوی حکومت نے وقف سے متعلق اسلامی قوانین بدل کر اسلامی فقہ کے ایک اہم عضو کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔"

قائداعظم کے نزدیک وقف ایک وسیع تصور ہے جو مذہبی اور سماجی زندگی کے

ساتھ جُڑا ہوا ہونے کے ساتھ کمیونٹی کی اکانومی کے اصولوں سے بھی متعلق ہے اوراس قانون میں تبدیلی لانے سے مسلمان گھرانوں کو نقصان ہوگا۔ سیکولرازم کی مخالفت ان کے اس مؤقف سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے سپیشل میرج امینڈمنٹ بل (1912ء) کی بابت اختیار کیا تھا کیونکہ اس کے بموجب اسلامی قانون میں اس حد تک ترمیم کرانا مقصود تھی کہ وہ وقت کے مطابق ہو سکے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے قرآنی فیصلوں کو ''میڈیول'' یا رجعت پسندانہ قرار نہیں دیا جیسا کہ اکثر و بیشتر سیکولرسٹ استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ انھیں نا قابل تغیر سمجھتے تھے۔

قائداعظم قرآنی تعلیمات کی ماورائیت اور نا قابل تغیر ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ مذکورہ صدر بل میں ترکِ اسلام کرنے والے کو وراثت میں شریک بنایا گیا تھا، حالانکہ قرآن کریم میں نص صریح موجود ہے کہ جو ترک اسلام کرے گا، وہ وراثت کا حقدار نہ ہوگا۔ 1930ء میں جب قائداعظم نے خود کو جلاوطن کر کے انگلینڈ کا رُخ کرلیا تھا اور بعد میں وہ سیاست میں دوبارہ شامل ہو گئے تھے تو اس کا سبب بھی اسلامی تھا۔

کیا یہ عظیم خطرہ وہ معاشی مسائل تھے جنھیں انھوں نے اشتراکی اور کمیونسٹ نظریات قرار دیتے ہوئے رَد کر دیا تھا یا مجلس قانون ساز میں چند اور مسلم نشستیں حاصل کرنے سے متعلق تھا؟ پریشانی کے اسی عالم میں انھوں نے مسلمانوں کے ثقافتی وجود کو زیر بار محسوس کیا اور اسے تحفظ دینے کی کوشش کی کیونکہ اسی میں ان کے نزدیک مسلمانوں کی طاقت اور ان کا استحکام پوشیدہ تھا۔ مارچ 1939ء میں انھوں نے قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ہندوؤں کو سناتے ہوئے کہا:

❑ ''تمہاری تعداد زیادہ ہوسکتی ہے، تم بہت زیادہ ترقی یافتہ، معاشی طور پر بہت زیادہ مضبوط ہو سکتے ہو لیکن میں واضح کر دوں کہ تم اس اسلامی تہذیب و ثقافت کو تباہ نہیں کر سکتے جو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہماری تہذیب وتمدن کی روح زندہ تھی، زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ ممکن ہے تم ہمیں نہتا کر دو، ہمیں مجبور کر دو اور اس سے بھی بڑھ کر ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہو لیکن ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہم ہرگز سر نہیں جھکائیں

گے، چاہے اس کے لیے ہمیں جنگ ہی لڑنا پڑے۔''

سیکولر عناصر کے اس نظریے کے برعکس کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، قائداعظم یہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام ایک تہذیبی قوت ہے جو برطانوی نوآبادیاتی نظام کی مختلف النوع گرفت کے باوجود خود کو اس برٹش انڈیا میں برقرار رکھ سکتی ہے جہاں 1857ء کے بعد مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور انھیں ہر طرح سے محدود رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ علامہ اقبال بھی جانتے تھے کہ محمد علی جناح ایک ایسے راست باز مسلمان ہیں جن کی طرف مسلمان امید کی نظروں سے دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا:

- ''آج پورے ہندوستان میں جناح واحد ایسے مسلمان ہیں جن کی بے لوث قیادت سے امید رکھنے کا ہندوستان کے مسلمانوں کو حق حاصل ہے۔''

آگے چل کر انہوں نے قائداعظم کے مؤقف میں شامل ہوتے ہوئے فرمایا:

- ''اس ملک میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور اس کی ترویج و اشاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہاں الگ مسلم ریاست یا ریاستیں قائم نہیں ہو جاتیں۔''

قائداعظم کے اسلامی کردار کا یہ مشاہدہ اس رائے سے کہیں بڑھ کر لائق اعتبار ہے جو کسی نے ان کے بارے میں قائم کر لی ہے۔ ان کے اسلامی کردار کی پہلی گواہی ان کی ہمشیرہ نے دی، دوسری گواہی اس شخصیت (علامہ اقبالؒ) کی ہے جو ان کے دوست اور صلاح کار تھے اور تیسری گواہی ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ان کے خواب پر یقین کرتے ہوئے اسے سچ کر دکھانے کے لیے ان کا ساتھ دیا۔ سیکولر خیال لوگوں کے برخلاف وہ کسی ایسی جمہوریت پر یقین نہیں رکھتے تھے جو قطعی اور حتمی ہو اور نہ ہی وہ جمہوری عمل کی انجام دہی کو ہی کوئی مقصد گردانتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ جمہوری نہ تھے وگرنہ وہ برطانوی انڈیا کے نقشے کو نہ بدلتے۔ وہ اعداد و شمار اور گنتی کے اس کھیل کو سمجھ چکے تھے جو مسلمانوں کے خلاف خاصا وزنی ثابت ہوا۔ قائداعظم کے نزدیک پاکستان کو ہر قیمت پر اپنے روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی تصورات کے مطابق ترقی کرنی چاہیے۔ 1940ء اور 1947ء کے درمیانی عرصے میں انھوں نے نوے (90) تقریریں ایسی کیں جن میں

انھوں نے سامعین کو یقین دلایا کہ جو پاکستان وجود میں آئے گا، وہ اسلامی ہوگا۔

11 اگست 1947ء کی تقریر

11 اگست کی تقریر میں کیا ہوا؟ کیا انھوں نے کوئی ایسی انہونی کہہ دی تھی؟ بہرحال یہ کہنا کہ وہ ایک سیکولرسٹ تھے، قائد کی کردارکشی کے مترادف ہوگا۔ اگر وہ لبرل بھی تھے تو مغربی طرز کے نہیں بلکہ اسلامی اندازِ فکر میں، جدید اپروچ کے حامل تھے کیونکہ وہ کٹ حجت ملّا نہ تھے بلکہ روشن خیال مسلمان تھے۔ آخر وہ کیا بات تھی جو وہ 11 اگست 1947ء کی تقریر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کی اس تقریر کو دیانتداری سے جانچنے کے لیے تین چیزیں اہم ہیں:

1- کیا انھوں نے 1947ء سے پہلے کے برسوں میں کوئی ایسی بات اس سیاق وسباق میں کہی تھی؟

2- کیا 11 اگست کی تقریر سے پہلے کوئی ایسی پیشگی بات موجود تھی جس نے انھیں ایسا کہنے پر مجبور کیا؟

3- کیا انھوں نے ایسا پیرایہ دہرایا جس کی رُو سے وہ سیکولر ظاہر ہوتے ہوں؟

اقلیتوں کو تحفظ دینے کے سلسلے میں قائداعظم کا پہلا بیان 1941ء میں سامنے آیا جس میں انھوں نے کہا:

- ''اسلام اقلیتوں کو انصاف، مساوات، صاف عملی، برداشت اور فیاضانہ سلوک کی ضمانت دیتا ہے اور وہ بلاشبہ ہماری حفاظت میں رہیں گے۔''

1942ء میں اپنے دوسرے بیان میں انھوں نے کہا:

- ''غیر مسلموں کے حقوق کو پورا تحفظ دیا جائے گا اور یہ بالخصوص قرآن کی ہدایات کے مطابق ہوگا۔''

1943ء میں ایک ہندو وفد سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے پھر یہ کہا:

- ''ہم آپ کی اقلیتوں کو نہ صرف ایک مہذب حکومت کی طرح رکھیں گے بلکہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ان سے بہتر سلوک روا رکھیں گے۔''

ظاہر ہے کہ اقلیتوں کو تحفظ دینے کے معاملے میں ان کا حوالہ اسلام ہی تھا۔ **14** جولائی **1947**ء کی پریس کانفرنس میں جبکہ وہ ہنوز دہلی میں مقیم تھے، ان سے اقلیتوں کے مسائل پر مختصر بیان دینے کو کہا گیا تو انھوں نے یہ جواب دیا:

❑ ''فی الحال میں صرف ایک نامزد گورنر جنرل ہوں، اس بنیاد پر کہ **15** اگست کو میں واقعتاً پاکستان کا گورنر جنرل ہوں گا تو میں آپ کو یہ ابھی سے یقین دلاتا ہوں کہ میں اقلیتوں کے بارے میں اس مؤقف سے ہرگز نہیں ہٹوں گا جس کا میں نے کئی بار ذکر کیا ہے۔ اقلیتوں کو پاکستان میں باقاعدہ شہری حقوق حاصل ہوں گے اور وہ تمام مراعات و رعایات ان کو ملیں گی جن کا میں نے وعدہ کیا ہے۔''

یہی وہ زمانہ تھا جب اقلیتوں کا مسئلہ تیزی سے سر اٹھا رہا تھا۔ وسطی ہندوستان اور مشرقی پنجاب سے مہاجرین پاکستان آنا شروع ہو گئے تھے۔ مسلمانوں نے اس سے پہلے اس طرح کی افراتفری نہیں دیکھی تھی۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا نقصان نہ ہوا ہو، لوگ مرنے والوں کے غم میں ڈوبے ہوئے، بیماریوں سے لاچار اور بنیادی ضرورتوں کے محتاج تھے اور اس کے ساتھ نئی ریاست کو اقتصادی وسائل کی کمی کا بھی سامنا تھا۔ ماحول میں آگ بھی بھڑک رہی تھی۔ چونکہ یہ حالات قائد کے نوزائیدہ پاکستان کے لیے ضرب شدید کا درجہ رکھتے تھے، اسی لیے انھوں نے صورتحال کو نارمل بنانے کے لیے دوطرفہ تحریکیں شروع کیں۔ ایک طرف تو وہ اقلیتوں کو مساویانہ حیثیت دینے کی یقین دہانی کرانے لگے تو دوسری طرف مسلمانوں کو اعلیٰ ظرفی اور برداشت کا سبق دینے لگے۔ انھوں نے اعلان کیا:

❑ ''تمہارا تعلق کسی مذہب، ذات یا فرقے سے ہو، ریاست کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔''

وہ امید رکھتے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ سیاسی اور ایک ریاست کے باشندے ہونے کے اعتبار سے ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔

انصاف کی نظر میں حقوق اور مراعات کا حصول مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ بلاتمیز

مذہب وعقیدہ ایک ہی ریاست کے شہری ہونے کے ناتے ممکن ہو گا۔ چونکہ پاکستان مسلمانوں کی جدوجہد کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا، لہٰذا اس بنیاد پر انھیں یہ سوچ نہیں اپنانی چاہیے کہ وہ زیادہ حقدار ہوں گے بلکہ سیاسی لحاظ سے ریاست کے تمام باشندے مذہب کے امتیاز کے بغیر مساویانہ انداز میں ریاستی مفادات حاصل کرسکیں گے۔ یہاں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ اندازفکر ''میثاق مدینہ'' سے متاثر تھا۔ قائد کی 14 اگست کی تقریر جوانھوں نے دستورساز اسمبلی میں کی تھی اور جس میں انھوں نے یہ کہا کہ اقلیتوں کے ساتھ سنت پیغمبر ﷺ کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اِس بات کی تائید کرتی ہے، انھوں نے کہا تھا:

- ''تیرہ صدیاں پہلے ہمارے پیغمبر ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ عملاً حسن سلوک کیا، ان کے مذہب اور عقیدے کا احترام کیا، حالانکہ وہ ان کو فتح کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ حکمرانی گواہ ہے کہ وہ اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ اپنے دین کے مطابق مثالی حسن سلوک سے پیش آئے۔''

قائداعظم نے کئی اور مواقع پر بھی اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ رائٹر کے نمائندے کو پاکستان اور بھارت کے درمیان ممکنہ امن سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا:

- ''میں کئی بار وضاحت کر چکا ہوں کہ پاکستان میں اقلیتوں کو ہم اپنے شہریوں کی حیثیت دیں گے، وہ تمام حقوق اور مراعات اسی طرح حاصل کریں گے جیسا کہ دوسرے شہری۔''

قائداعظم ابتدا ہی سے آگاہ تھے کہ بھارت، پاکستان کو توڑنے کے لیے طبقاتی خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا:

- ''اب یہ باقاعدہ ثابت ہوکر سامنے آ چکا ہے کہ پاکستان کی نئی ریاست کوختم کرنے کے لیے منظّم سازش کی جا رہی ہے۔''

لیکن اس کے باوجود انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کریں۔ انھوں نے کہا:

- ''یہ ہر باوقار مسلمان کا فرض ہے کہ وہ کسی طرح کے انتقامی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ ہمیں اپنی اقلیتوں کو ایک دیانتدارانہ معاہدے کے تحت یہ اطمینان بخشنا ہے کہ وہ ہمارے معزز شہری ہیں۔''

20 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں اپنی مشہور تقریر میں انھوں نے کہا:

- ''ہم ایک منظّم اور مربوط سازش کا شکار رہے ہیں جس کا بہادری، دیانت داری اور عزت واحترام کے ادنیٰ ترین اصولوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔''

انھوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ:

- ''وہ قرآن حکیم سے ہدایت اور روشنی حاصل کریں، آخری فتح ہماری ہوگی۔''

تقریر کے آخر میں انھوں نے یاد دلایا کہ:

- ''اسلام ہر مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کو تحفظ دے اور اس سلسلے میں مذہب وعقیدے کا امتیاز روانہ رکھے۔''

سیکولرسٹ ممکن ہے اسے پسند نہ کریں کہ جب ولی خان نے قائداعظم کی تقریر سے سیکولرازم کا مفہوم اخذ کیا تو بھٹو کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے سپریم کورٹ میں اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا تھا:

- ''مذہب کو جس طرح عام طور پر غیر مسلم سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ مقدس حقوق اور مخصوص رسوم پر عمل کیا جائے۔ قائداعظم نے لفظ ''مذہب'' دین کے مفہوم یا ضابطۂ حیات کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ جب انھوں نے یہ کہا کہ مذہب کا ریاست کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تو بلاشبہ اس کا وہی مطلب تھا جو اوّل الذکر بیان ہو چکا ہے''۔

بعض اوقات جب میں سیکولرازم کی بابت شور سنتا ہوں تو مجھے حیرانگی ہوتی ہے کہ قائداعظم نے سیکولرسٹوں کے پاکستان کو اس کی اسلامی منزل سے ہٹانے کی بابت کیا کہا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے وہی الفاظ اسی جذبے کے ساتھ کہے ہوں گے جو

ان کی کراچی بار سے 25 جنوری 1948ء میں خطاب کے دوران یوں کہے گئے تھے:

- ''میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ لوگوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو شورش برپا کرنا چاہتا ہے اور یہ پروپیگنڈا کرنے کے درپے ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر تیار نہیں کیا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی زندگی پر اسی طرح لاگو ہو سکتے ہیں جیسے تیرہ سو برس پہلے ہوتے تھے۔''

ایک مرتبہ پھر انھوں نے سٹیٹ بینک کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

- ''میں پوری توجہ سے مشاہدہ کرتا رہوں گا کہ تمہاری ریسرچ آرگنائزیشن کہاں تک بینکنگ کے نظام کو اسلام کے سماجی اور معاشی تصورات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے نا قابل حل مسائل کو جنم دیا ہے۔ مغربی اقتصادی نظریے اور عمل کو قبول کرنے سے ہم اپنے لوگوں کو خوشحال نہیں بنا سکیں گے۔ ہمیں اپنی منزل تک خود اپنے طریقے سے پہنچنا ہوگا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا جو اسلام کے انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اصولوں پر قائم ہوگا۔''

ہم اس مضمون کا اختتام یحییٰ بختیار کے سپریم کورٹ میں کہے گئے ان الفاظ پر کرتے ہیں:

- ''نہ صرف ولی خان بلکہ چند نام نہاد ترقی پسند دانشور وقتاً فوقتاً کوشش کرتے رہے ہیں کہ قائد کے جملوں کا ایسا مفہوم نکالیں جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اگرچہ پاکستان کو دوقومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کر چکے تھے لیکن جونہی یہ ریاست قائم ہو گئی، انھوں نے دوقومی نظریے کو ترک کر کے سیکولرازم اختیار کر لیا''۔

چونکہ یحییٰ بختیار پر اسلام پسند ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا لیکن وہ ایک دانشورانہ سوچ کے حامل انسان ہیں، اس لیے انھوں نے قائد کے الفاظ میں ملاوٹ نہیں کی ہوگی۔

❁......❁......❁

محمد حنیف شاہد

قائداعظمؒ اور اسلام

عشق رسول (ﷺ) اور قائداعظم

1892ء میں نوعمر محمد علی جناح قانون کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان پہنچے، اس سے پیشتر کہ وہ کسی ادارے میں داخل ہوتے، انھوں نے بیرسٹری (وکالت) کے چار مشہور و معروف تعلیمی اداروں کا مطالعہ اور معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے راہنما کے ساتھ تین تعلیمی اداروں ''انرٹمپل اِن'' **(Inner Temple Inn)**، ''مڈل ٹمپل'' **(Middle Temple)** اور ''گریز اِن'' **(Gray's Inn)** کو دیکھ چکے تھے کہ...... ''لنکنز اِن'' **(Loncoln's Inn)** میں داخل ہوئے تو انھوں نے اس تعلیمی ادارے کی دیوار پر خوبصورت تحریر دیکھی۔ اس پر انھوں نے گائیڈ سے پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' گائیڈ نے جواب دیا ''دنیا میں جتنے بھی مقنّن (قانون دینے والے) گزرے ہیں، ان کے نام اس پر کندہ ہیں۔''

اس نوعمر طالب علم نے فوراً دریافت کیا ''سب سے اوپر یعنی سرفہرست کس کا نام درج ہے؟''

گائیڈ نے کہا ''مقنّن اعظم (قانون دینے والوں میں سب سے بڑے) ''محمدؐ'' (ﷺ) کا نام ہے۔'' یہ سنتے ہی محمد علی جناح وہیں رُک گئے۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھے بلکہ وہیں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس ادارے میں قانون کی تعلیم حاصل کریں گے۔

ان کا یہ فیصلہ...... ''اسلام'' اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بے پناہ محبت اور گہری عقیدت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔

1947ء میں قائداعظم نے کراچی میں وکیلوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ''لنکنز اِن'' میں اپنے داخلہ لینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

❑ ''ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول کریم ﷺ کی، جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مدبروں میں ہوتا ہے، بہت عزت ہے۔ ایک دن اتفاقاً میں ''لنکنز اِن'' گیا اور میں نے دروازے پر ''پیغمبر اسلام (ﷺ)'' کا نام مبارک کھدا دیکھا۔ میں نے ''لنکنز اِن'' میں داخلہ لے لیا، کیونکہ اس کے دروازے پر حضور نبی کریم ﷺ کا نام مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرفہرست لکھا تھا۔''

کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے 25 جنوری 1948ء کو محمد علی جناح نے رسول کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں یوں نذرانۂ عقیدت پیش کیا:

❑ ''آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی رسول کریم ﷺ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کی عزت و تکریم کروڑوں عام انسان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام شخصیات آپ ﷺ کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز اتنی عظیم، عظیموں کی بھی عظیم ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ عظیم مصلح تھے، عظیم راہنما تھے، عظیم واضع قانون تھے، عظیم سیاست دان تھے، عظیم حکمران تھے۔''

به مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

قائداعظم ملت اسلامیہ کے تمام دکھوں کا مداوا اور تمام مشکلات کا حل حضور نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات کے اسوۂ حسنہ میں سمجھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے سے ہمارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ 14 فروری 1948ء کو شاہی دربار سبی (بلوچستان) میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

❑ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم

اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔‘‘

مذہبی مسلک

عملی اعتبار سے قائداعظم کا ’’اسلام‘‘ ممکن ہے، ضعیف ہو لیکن ہندوستان و پاکستان کے پچیس کروڑ مسلمانوں میں کتنے ہیں جو عملی اعتبار سے اسلام کی ہر تعلیم کا مکمل نمونہ ہوں؟ یقیناً یہ کوتاہی بھی افسوسناک ہے اور اس کا استیصال بھی ضروری ہے۔ قائداعظم کی ذات اعتقادی نقطۂ نظر سے ’’پختہ‘‘ مسلمان ہی ہے۔ ان کا دل اسلام کی عظمت سے مالا مال تھا۔ ان کا دماغ ایک مسلم ہونے کے فخر سے معمور تھا، علمی و عملی تاریخ بھی ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے دوسرے مذاہب پر بھی ایک نظر ڈالی، ایک قانون دان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر مذہب سے واقف ہو۔ اپنے ذاتی عقائد کو انھوں نے مختلف مقامات اور بیانات پر کئی بار واضح کیا تھا۔ 2 مارچ 1941ء کو وفاق مسلم طلبا پنجاب سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

- ’’جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔‘‘ (حیات قائداعظم، ص 427)

قائداعظم نے اس امر کا اعتراف فرمایا ہے کہ انھوں نے مولانا شوکت علی

سے خاصا اثر قبول کیا لیکن منشی عبدالرحمٰن کا کہنا ہے کہ علما میں جس شخص نے سب سے پہلے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائداعظم میں تدین پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ مولانا اشرف علی تھانوی تھے۔ چونکہ قائداعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی، اس لیے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیرالمؤمنین کے لیے ضروری ہیں۔

دسمبر **1938**ء میں ایک تبلیغی وفد نے جو مولانا شبیر علی تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالغنی پھولپوری اور مولانا معظم حسین امروہوی پر مشتمل تھا، قائداعظم سے ملاقات کی۔ مولانا مرتضیٰ حسین چاند پوری اس وفد کے سربراہ تھے، اس ملاقات میں بہت سے مذہبی امور زیر بحث آئے جنھوں نے قائداعظم کے حالات و خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا شبیر علی تھانوی اس ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

❑ ''دوران گفتگو میں نے جناح صاحب سے یہ سوال کیا کہ ''آپ ہزاروں روپے خرچ کرا کے پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں، اس میں کیا نفع ہے؟'' جناح صاحب نے فرمایا کہ ''اس سے غیر اقوام پر رعب پڑتا ہے۔'' میں نے کہا کہ ''میں ایک اور تدبیر بتا دوں جس سے رعب زیادہ ہو گا۔'' فرمایا ''وہ کیا؟'' میں نے کہا کہ ''جب دوران جلسہ میں نماز کا وقت آ جائے تو اس سوا ڈیڑھ لاکھ کے مجمع کو لے کر باجماعت نماز ادا کریں۔ پھر آپ خود دیکھیں گے کہ کتنا رعب پڑتا ہے۔'' اس پر جناح صاحب نے فوراً فرمایا ''آپ فرماتے تو صحیح ہیں مگر میں اس وقت اس پر عمل کرنے سے معذور ہوں۔'' میں نے کہا کہ ''آپ کو کیا عذر ہے؟'' فرمایا ''آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں تو امام کس کو بناؤں؟ ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں، سب لوگ نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز پڑھ لے مگر میں امامت کے قابل نہیں، مجھ میں اس کی اہلیت نہیں۔ اس لیے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیوبندی ہو گا تو بریلوی اس کے پیچھے نماز نہ

پڑھیں گے۔ اگر بریلوی ہوگا تو دیوبندی نہ پڑھیں گے اور الگ جماعتوں سے بجائے رعب پڑنے کے اقوام غیر کو مسلمانوں کا اختلاف نمایاں ہوگا۔ اب تو اپنی اپنی مسجدوں میں نماز پڑھتے ہیں اور یہاں آ کر کئی جماعتیں ہوں تو یہ زیادہ نمایاں ہوگا، اس لیے میں اس وقت معذور ہوں، آگے چل کر دیکھا جائے گا۔'' میں نے فوراً کہا ''اب دوسری بات عرض کرتا ہوں کہ خود آپ پر تو نماز فرض ہے، آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ جلسوں میں اپنا معمول رکھیں کہ جب نماز کا وقت آ جائے، مصلیٰ بچھا کر آپ نیت باندھ لیں۔ اور کوئی پڑھے نہ پڑھے''...... میری بات سن کر وہ آگے جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجے میں یہ الفاظ فرمائے:

- ''میں گناہ گار ہوں، خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔''

ان الفاظ کا اظہار قائداعظم نے ارکان وفد کے علاوہ بارہ تیرہ حضرات کی موجودگی میں کیا۔ مولانا شبیر علی تھانوی کا بیان ہے کہ ان سب کے سامنے ان الفاظ سے بغیر کسی تاویل کے اظہار ندامت اور اقرار اصلاح نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اس قسم کا اظہار کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ عظمت اور بزرگی کی زندہ مثال ہے جو قائداعظم کے عظیم کردار پر دلیل ہے اور قائداعظم کے خطبات و بیانات اور تقاریر اس بات کا زندہ جاوید ثبوت ہیں۔

منشی عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

- ''اس کے بعد حضرت تھانوی نے قائداعظم کے قول و کردار کا گہری نظر سے مطالعہ شروع کر دیا۔ آپ ان میں جب بھی کوئی بات خلاف شریعت دیکھتے، اس کی اصلاح کے لیے قائداعظم کے پاس فوراً وفد یا خط بھیجتے۔ دسمبر 1938ء کے بعد قائداعظم نے جو تقاریر کیں، ان سے مذہب اور سیاست کے متعلق ان کا نظریہ واضح ہو گیا کہ وہ اہل مغرب کی طرح مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے الگ سمجھتے ہیں اور الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی کو بلایا اور فرمایا:

❑ ”جناح صاحب کی تقریروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں، ان کی بابت ان کو سمجھانا ہے۔“

12 فروری 1939ء کو مولانا شبیر علی تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان، دہلی پہنچے اور مذہب و سیاست پر قائداعظم سے گفت و شنید کی۔ اس سلسلے میں مولانا ظفر احد عثمانی کا بیان ہے:

❑ ”وفد نے قائداعظم سے کہا مسلمان تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں۔ اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکام اسلام کا نمونہ نہ بنائیں اور ان کے پیرو شعائر اسلام کی پابندی نہ کریں، جب یہ سب خود کو احکام دین کا پابند بنا لیں گے تو اس کی برکت سے نصرت و کامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہو گی۔“

قائداعظم نے فرمایا:

”میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہیے۔“

وفد نے کہا:

”پھر اس طرح کامیابی کی توقع نہیں۔“

غرض کہ اس موضوع پر پورے اڑھائی گھنٹے گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر یہ خانقاہ نشیں علما دنیا کے اس بہت بڑے کامیاب سیاست دان کی سیاست کو مذہب کی حدود کے اندر لانے میں کامیاب ہو گئے اور قائداعظم نے وفد کی معروضات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنے اس تاریخی فیصلہ سے آگاہ فرمایا کہ:

❑ ”دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو، میری سمجھ میں اب خوب آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے۔“

قائداعظم فرقہ وارانہ امتیاز کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے، اس لیے انھوں نے اینگلو عربک کالج ہال دہلی میں مسلم خواتین و طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں فرمایا تھا:

❑ ”اب مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں اور شیعہ، سُنّی اور وہابی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیں۔“

24 دسمبر 1945ء کو ای وارڈ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے چند کارکن قائداعظم کے دولت خانہ پر ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت دینے گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے مصافحہ کرتے ہوئے جوشِ عقیدت سے مجبور ہو کر آپ کے ہاتھ کو چوم لیا۔ یہ حرکت دیکھ کر قائداعظم نے فرمایا:

❑ ”لوگوں کو چاہیے کہ وہ مجھے معمولی آدمی تصور کریں، پیر و مرشد نہ سمجھ لیں۔ اس طرح لوگوں میں غلط اور تباہ کن طریقوں پر سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے جسے عرفِ عام میں شخصیت پرستی کہتے ہیں اور یہ مرض نقصان دہ اور مضرت رساں ہے اور اسلام میں ناروا اور ناجائز ہے۔“

بعض کوتاہ بین اور تنگ نظر و متعصب لوگ قائداعظم کے مسلمان ہونے پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ نکتہ چینی کرنے اور دوسروں کی ذات میں کیڑے نکالنے سے پہلے اپنی ذات کا بغور مشاہدہ کریں اور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ”وہ خود کیا ہیں؟“ کیا وہ قائداعظم سے بہتر مسلمان ہیں؟ قائداعظم نے تو اپنی پوری زندگی ملت اسلامیہ کے مفاد کی خاطر قربان کر دی۔ ان کی شبانہ روز کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان عالم وجود میں آ گیا۔ قائداعظم نے اپنا ذاتی مفاد قومی مفاد پر قربان کر دیا۔ یہ حضرات اتنا تو بتائیں کہ انھوں نے ملت اسلامیہ کو کیا دیا؟ یقیناً ان کا جواب نفی میں ہوگا۔ ایسے لوگوں کو جتانے کے لیے قائداعظم نے ”نیویارک ٹائمز“ کے نامہ نگار مقیم ہندوستان کو 13 فروری 1946ء کو جو بیان دیا، اس میں فرمایا:

❑ ”اگر برطانیہ نے پاکستان کے قیام کے سلسلہ میں انحراف سے کام لیا تو مسلمان جنگ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سارے ہندوستان میں مسلمان بغاوت کر دیں گے۔ برطانیہ کا فرض ہے کہ صحیح قدم اٹھائے۔ میں اوّل بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں اور مسلم ہونے کی حیثیت سے میں کسی دوسری چیز پر غور نہیں کر سکتا۔“

کردارِ مومن

قائداعظم حسن کردار، اخلاقی جرأت، محنت اور استقلال کے ذریعے مسلمانوں کے قائد بنے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ ”یہی چاروں ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی عمارت کھڑی ہے۔ ناکامی ایک ایسا لفظ ہے جس سے میں آشنا نہیں ہوا۔“

قائداعظم کے حسن سیرت، دیانت داری اور پختگی کردار کے بارے میں محترمہ فاطمہ جناح رقم طراز ہیں:

- ”ان کا خلوص، اعلیٰ صلاحیت، دیانت داری، کردار کی پختگی، انسانی حقوق اور انسانی سرشت کے وقار پر ان کا حقیقی اعتقاد، ان کا عظیم شعورِ انصاف، کمزوریوں اور محرومیوں کا شکار بنائے جانے والے لوگوں سے ان کی دل سوزی، ان کی میانہ روی اور توازن ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو اپنے عوام کا مثالی قائد بنا دیا۔ یقینِ محکم اور ناقابلِ تسخیر جرأت دو ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے پاکستان کے خواب کو تعبیر آشنا بنانے کے لیے ناقابلِ عبور رکاوٹوں کو سر کرنے میں قائداعظم کی مدد کی۔ سالہا سال کے تجربات اور غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ اس برصغیر کو تقسیم کیا جائے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے فیصلہ سے متزلزل نہیں ہوئے۔ انھیں اللہ پاک، اخلاقی قوت اور اسلام کی شیرازہ بند قوت پر بے پناہ بھروسا تھا۔ انھیں اپنے عوام پر بھی اعتماد تھا۔“

کیا یہی کردار ایک سچے مومن کا نہیں ہوتا؟ کیا اسی کردار کو کردارِ مومن نہیں کہا جاتا؟ قائداعظم میں اگر یہ صفات تھیں تو وہ کردارِ مومن کا عظیم نمونہ تھے۔ مومن کی شان ہے کہ جس بات کو درست سمجھے، اس پر ثابت قدم رہے۔ اس کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئے بلکہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار اور چٹان کی طرح ڈٹ جائے۔ اگر وہ اسلام کا سپاہی ہے تو اسلام کی خدمت میں صادق، مخلص اور وفادار رہے، دنیا کی کوئی طاقت اسے خرید نہ سکے۔ قائداعظم کی ذات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ خوبی انھوں نے مولانا شوکت علی سے حاصل کی، یا

یوں کہہ لیجئے کہ قائداعظم مولانا موصوف کی اس خصوصیت سے متاثر ہوئے۔ اس کا اعتراف انھوں نے یکم اکتوبر 1939ء کو اینگلو عربک کالج دہلی میں مولانا موصوف کی تصویر کی نقاب کشائی کرتے وقت فرمایا:

❑ ''مولانا شوکت علی نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ مسلمانوں کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ مجھ پر مولانا کا اثر اس حیثیت سے بہت پڑا کہ وہ جس راستے کو صحیح سمجھ لیتے تھے پھر پرکاہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ وہ اسلام کی خدمت میں صادق، مخلص اور وفادار تھے۔ جو راہ ان کی نظر میں ٹھیک تھی، اس پر سے انھیں کوئی لالچ نہیں ہٹا سکتا تھا۔''

پاکستان کے اوّلین یوم استقلال کے موقع پر سکھوں نے قائداعظم کو بم سے اُڑا دینے کی سازش کر رکھی تھی، جس سے ہندوستان کے آخری انگریز لارڈ مونٹ بیٹن بخوبی آگاہ تھے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹنے کے لیے چونکہ قائداعظم نے حسن تدبیر سے مجبور کیا تھا، اس لیے انگریز درپردہ انھیں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے پہلے تو قائداعظم کو اس امر سے آگاہ نہ کیا، لیکن جب قائداعظم نے انھیں یوم استقلال کے موقع پر کراچی آنے کی دعوت دی تو تب انہوں نے اپنی جان کی حفاظت کی خاطر کراچی نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے لکھا:

❑ ''اس موقع پر سکھوں نے آپ کو بم سے اُڑا دینے کا منصوبہ مکمل کر رکھا ہے۔ ایسے حالات میں نہ آپ کے لیے جلوس نکالنا مناسب ہے اور نہ میرے لیے اس میں شرکت۔'' (مشن وِد مونٹ بیٹن)

مگر اس صاحب ایمان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کو تسلی دی کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ تب کہیں لارڈ مونٹ بیٹن کراچی آئے اور قائداعظم انھیں کھلی کار میں اپنے ساتھ بٹھا کر لاکھوں انسانوں کے ہجوم سے گزرے اور بخیر و عافیت گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ کر لارڈ مونٹ بیٹن کو بالارادہ محسوس کرایا کہ وہ خیریت سے منزل مقصود تک پہنچ گئے ہیں جس پر لارڈ مونٹ بیٹن نے دھڑکتے ہوئے دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور قائداعظم کی خوداعتمادی کی تعریف کی۔

آج ہر کس و ناکس حصول پاکستان کو قائداعظم کا تاریخی کارنامہ اور ملت پر ان کا احسان عظیم بتلاتا ہے مگر قائداعظم اسے اپنا کارنامہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ آخری وقت فرماتے تھے کہ:

❑ ''یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس سفید سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت ہے، اپنا سکہ ہے، اپنا آئین ہے اور اپنا دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر اللہ کا کوئی اور انعام ہوسکتا ہے۔ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ اللہ نے رسول اکرم ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری اُمت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ اللہ کے اس انعام عظیم کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن، بچے، بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لانے کے لیے فرط انبساط سے جھک جاتا ہے۔'' (آخری لمحات)

اتنے بڑے انعام اور اتنی عظیم کامیابی پر فخر و غرور کے بجائے عجز و نیاز کا اظہار کرنے اور سجدۂ شکر بجا لانے کی ایک غیر مومن سے کب توقع ہوسکتی ہے۔

مسلمان کی خوبی ہے کہ وہ دوسروں پر بھروسا نہیں کرتا بلکہ توکل علی اللہ کرتا ہے۔ قائداعظم میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنا محافظ، محافظ حقیقی کو جانتے تھے۔

30 اگست 1946ء کو صوبہ بمبئ کے مسلم نیشنل گارڈز نے قائداعظم محمد علی جناح کے درِ دولت پر سنتری متعین کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر انھوں نے یہ کہہ کر اس پیش کش کو مسترد کر دیا کہ:

❑ ''مجھے محافظ حقیقی کی ذات پر بھروسا ہے۔ جب تک ملتِ اسلامیہ کے لیے میرا زندہ رہنا مقدر ہو چکا ہے، وہ مجھے یقیناً زندہ رکھے گا۔''

آخرت کی سرفرازیوں کی پہلی منزل حُسنِ خاتمہ ہے جو ایک مومن کی آخری نشانی ہے، زندگی کے بالکل آخری لمحات میں جب قائداعظم پر بے ہوشی طاری ہوگئی،

کمزوری انتہا کو پہنچ گئی، نبض کی دھڑکنیں غیر مسلسل ہو گئیں، آنکھیں پتھرا گئیں، سانس رُک رُک کر آنے لگا تو اس بے ہوشی کے عالم میں قائداعظم کے منہ سے جو دو آخری لفظ نکلے وہ ''اللہ...... پاکستان'' تھے، حالانکہ ان کے پاس کوئی تلقین کرنے والا موجود نہ تھا۔ زندگی کے اس آخری نازک ترین گھڑی میں ......اللہ...... کا لفظ نوکِ زبان پر ہونا اور انتقال کے بعد تمام عالم اسلام میں ایصال ثواب کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا بلاتحریک وتحریص اور بلاترغیب وترہیب ختم قرآن کریم کرنا ایک قابل رشک سعادت ہے جو آج تک کسی عوامی راہنما کو حاصل نہیں ہوئی۔

اسلامی تہذیب کے داعی

قائداعظم ''اسلامی تہذیب'' کو عظیم ورثہ تصور کرتے تھے اور زندگی بھر اس کے احیا اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ اگر انھیں مہلت ملتی تو وہ یقیناً اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت کو پاکستان میں رائج کرتے۔

3 جنوری 1941ء کو انجمن ترقی مسلمین اور مجلس مسلم نوجوانانِ بمبئی کے ایک مشترکہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

- ''میں سارے ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوں اور نہ ہی ہندوؤں پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے کوئی سازش کر رہا ہوں۔ میں ایسے منصوبے ہرگز نہیں رکھتا۔ مسلم لیگ جو کچھ چاہتی ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ اسے دو منطقوں میں جسے وہ اپنا وطن سمجھتی ہے، اپنی حکومت قائم کرنے اور ''اپنی تہذیب و تمدن'' کو ترقی دینے کا موقع ملے۔''

اسلام اخوت، مساوات، مواخات اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ انبیائے کرام، اولیائے عظام اور مصلحین اسلام کے انھی سنہری اصولوں کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ قائداعظم بھی پاکستان میں اسلامی تعلیمات نافذ کرنا چاہتے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے جواب میں مجلس دستور ساز میں 14 اگست 1947ء کو آپ نے فرمایا:

- ''شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جو خیرسگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا،

وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسول کریم ﷺ نے کر دی تھی۔ انھوں نے زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا، ان کے ساتھ رواداری برتی اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے، ایسے ہی رہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے۔''

قائداعظم کو اسلامی تہذیب و ثقافت سے بہت پیار تھا اور وہ اس کی ترویج و اشاعت چاہتے تھے۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ''قرارداد پاکستان'' منظور ہوئی۔ بانی پاکستان حضرت قائداعظم نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیب وثقافت، مذہبی معتقدات اور معاشرتی اطوار کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

- ''یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور یہ بھی اصرار کے ساتھ کہیے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔''

آپ نے 14 فروری 1948ء کو سبی کے شاہی دربار میں فرمایا:

- ''میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہماری نجات پیغمبر اسلام ﷺ کے بیان کردہ سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں ہی مضمر ہے۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی عمارت حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں کی بنیاد پر استوار کریں۔''

قائداعظم کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان میں عہد فاروقیؓ کی تصویر عملی طور پر کھنچ جائے۔ 21 مارچ 1948ء کو آپ نے اپنے خطاب میں فرمایا:

- ''پاکستان قائم ہو چکا ہے اور یہ مسلمانوں کی قربانیوں سے بنا ہے۔ پاکستان کے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں مکمل اتحاد و اتفاق ہو۔ ہمارا رب، رسول ﷺ، کلمہ اور قرآن ایک ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک ہو کر

اپنے ملک اور اپنے مذہب کی اشاعت اور ترقی کے لیے انتھک جدوجہد نہ کریں۔ اگر آپ نے مکمل اتحاد و تعاون اور صحیح اسلامی جوش وخروش سے کام کیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان جلد ہی دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شمار ہونے لگے گا۔ تعمیر پاکستان کے لیے مسلمانوں کے تمام عناصر اور طبقوں میں یکجہتی اور اتحاد ضروری ہے۔

میں نے مسلمانوں اور پاکستان کی جو خدمت کی ہے، وہ اسلام کے ایک ادنیٰ سپاہی اور خدمت گزار کی حیثیت سے کی ہے۔ اب پاکستان کو دنیا کی عظیم قوم اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے آپ میرے ساتھ مل کر جدوجہد کریں۔ میری آرزو ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک ایسی مملکت بن جائے کہ ایک بار پھر دنیا کے سامنے فاروق اعظمؓ کے سنہری دور کی تصویر عملی طور پر کھنچ جائے۔ اللہ میری اس آرزو کو پورا کرے۔

پاکستان میں کسی ایک طبقے کو لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کی اجازت نہیں ہو گی۔ پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کو ترقی کے برابر کے مواقع میسر ہوں گے۔ پاکستان امیروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوابوں کی لوٹ کھسوٹ کے لیے نہیں بنایا گیا، پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے بنا ہے۔ پاکستان غریبوں کا ملک ہے اور اس پر غریبوں ہی کو حکومت کا حق حاصل ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیار زندگی اتنا بلند کر دیا جائے گا کہ غریب اور امیر میں کوئی تفاوت باقی نہ رہے گا۔ پاکستان کا اقتصادی نظام اسلام کے غیر فانی اصولوں پر ترتیب دیا جائے گا یعنی ان اصولوں پر جنھوں نے غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔''

غازی علم الدین شہیدؒ کا مقدمہ

تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے بے نظیر مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کا یہ مصنوعی باب جلد ہی اپنے انجام کو پہنچا اور ہندوؤں نے تحریک کے ختم ہوتے ہی اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس سلسلے میں ہندو مہاسبھا اور آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور سیاسی تاریخ کو مسخ کرنے میں بہت

اہم کردار ادا کیا۔ آریہ سماجیوں کی سرگرمیوں کے مرکز ویسے تو تمام ہندوستان میں موجود تھے لیکن لاہوران کی سرگرمیوں کا خاص مرکز تھا۔ اسی سلسلے میں 1923ء میں لاہور کے ایک پبلشر راج پال نے پروفیسر چمپوپتی لال کی کتاب شائع کی جس میں حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ناروا حملے کیے گئے تھے۔ اس کتاب کے چھپتے ہی مسلمانوں میں غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ اس کتاب کے پبلشر راج پال پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلا۔ ماتحت عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے بعد ملزم کو 6 ماہ قید سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی لیکن عدالت عالیہ کے چیف جسٹس سر شادی لعل نے (جو مسلمانوں کے لیے اپنے روایتی تعصب کے لیے بہت مشہور تھا) راج پال کو بری کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا اور 26 ستمبر 1927ء کو ایک مسلمان خدا بخش نے راج پال پر حملہ کیا لیکن وہ بدبخت بچ گیا۔ 9 اکتوبر 1927ء کو ایک اور نوجوان عبدالعزیز نے دوبارہ راج پال پر حملہ کیا لیکن اس بار بھی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا۔

اس کے بعد لاہور کے سریاں والا بازار کے غازی علم الدین نے 6 اپریل 1929ء کو راج پال پر حملہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ غازی علم الدین کو گرفتار کر کے اس پر سیشن عدالت میں مقدمہ چلا۔ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں کام کرنے والے ہندوؤں کی اکثریت نے اس مقدمے کا چالان حیرت انگیز برق رفتاری سے تیار کرا کے عدالت میں بھیج دیا اور عدالت نے استغاثہ کے چند گواہوں کے بیان لیے اور ملزم پر فردِ جرم عائد کر دی اور صفائی لیے بغیر 10 اپریل کو مقدمہ سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا...... سیشن کورٹ میں بھی ہندو ملازمین کی بھرپور مدد سے سیشن جج مسٹر ٹیپ نے علم الدین پر زیرِ دفعہ 302 تعزیرات ہند فردِ جرم عائد کر دی اور 22 مئی 1929ء کو پھانسی کا حکم سنایا۔ اس کے ساتھ ہی مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 376 کی رُو سے اپنے فیصلے کی توثیق کرانے کے لیے مقدمہ کی مکمل مسل ہائی کورٹ بھیج دی۔

غازی علم الدین شہید نے سزائے موت کا حکم سنا تو بہت خوش ہوئے اور اللہ

تعالیٰ کا شکر بجا لائے کہ انھیں مردود راج پال کو جہنم رسید کرنے کے سلسلے میں شہادت نصیب ہو رہی ہے۔علم الدین 3 دسمبر 1908ء کو بروز جمعرات لاہور شہر کے بازار سریاں والا میں پیدا ہوا تھا۔متوسط گھرانے کے اس بچے کے والد کا نام شیخ طالع محمد تھا۔

6 اپریل 1929ء کو غازی علم الدین، راج پال کے خلاف منعقدہ ایک احتجاجی جلسے میں حضرت شاہ محمد غوث کے مزار مبارک کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی آواز سنی جو کہہ رہے تھے:

- ''اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آپ سے دست سوال دراز کر رہی ہیں کہ ناموس رسالت ﷺ کی حفاظت کون کرے گا؟''

اس آواز نے غازی علم الدین کے دل میں عشق رسول ﷺ کی آگ روشن کر دی اور اس نے ایک دوکاندار سے خنجر خریدا اور ہسپتال روڈ پر واقع راجپال کی دوکان میں داخل ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔

مسٹر ٹیپ سیشن جج نے اپنے فیصلے کی توثیق کرانے کے لیے مسل ہائی کورٹ بھیجی تو اس کے فیصلے سے مسلمانوں کو سخت رنج ہوا اور انھوں نے علم الدین کی جان بچانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔لاہور کے ایک جلسے میں فیصلہ ہوا کہ علم الدین کی جان بچانے کے لیے ہائی کورٹ میں اپیل کی جائے گی۔علم الدین کے والدین مقدمے کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ تھے، اس لیے مسلمانوں نے رقم اکٹھی کرنے کے لیے چندہ جمع کر لیا۔

قائداعظم محمد علی جناح ان ایام میں بمبئی میں پریکٹس کر رہے تھے اور صرف محمد علی جناح کے نام سے جانے جاتے تھے۔علم الدین کے بعض عزیزوں کی خواہش تھی کہ مقدمہ کی پیروی کے لیے کسی بہت بڑے وکیل خصوصاً سر تیج بہادر سپرو کی خدمات حاصل کی جائیں۔علامہ اقبال کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے ذاتی رائے یہ دی کہ اس مقدمہ کی پیروی کے لیے محمد علی جناح کی خدمات حاصل کی جائیں تو زیادہ

مناسب ہوگا۔ اس طرح قائداعظم کو بمبئی سے لاہور بلوانے کے محرک و موئید علامہ اقبال بنے۔ لاہور کے مشہور وکیل فرخ حسین بیرسٹر ایٹ لا نے قائداعظم کی معاونت کی۔ مقتول کی طرف سے جے لال کپور اور سرکار کی طرف سے دیوان لال مقرر ہوئے۔ 15 جولائی 1949ء کو ہائی کورٹ پنجاب کے ججوں مسٹر براڈوے اور مسٹر جانسن نے اپیل کی سماعت کی۔

چونکہ ایک ہائی کورٹ کا وکیل دوسرے ہائی کورٹ میں پریکٹس نہیں کرسکتا تھا، اس لیے بمبئی ہائی کورٹ کے مسٹر جناح نے جب پنجاب ہائی کورٹ سے علم الدین کے مقدمہ میں پیش ہونے کی اجازت مانگی تو پنجاب ہائی کورٹ کے جج مسٹر براڈوے نے اجازت دینے کی مخالفت کی لیکن چیف جسٹس سر شادی لعل نے قائداعظم کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ روزنامہ انقلاب (لاہور) نے چیف جسٹس کے اس فیصلہ کو ان کا ہوش مندانہ فعل قرار دیا اور لکھا کہ اگر وہ مسٹر محمد علی جناح کو مقدمہ میں پیش ہونے کی اجازت نہ دیتے تو مسلمانوں میں بے حد اشتعال پھیل جاتا۔

15 جولائی 1929ء کو جسٹس براڈوے اور جسٹس جانسن کے روبرو مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ قائداعظمؒ محمد علی جناح نے مقدمہ کے واقعات کو سامنے رکھ کر انتہائی قابلیت کے ساتھ غازی علم الدین کی بے گناہی ثابت کی۔ سب سے پہلے قائداعظم نے عینی گواہوں کے بیانات پر جرح کی۔ قائداعظم نے عدالت کو بتلایا کہ عینی گواہ کدار ناتھ مقتول کا ملازم ہے۔ اس لیے اس کی گواہی تامل اور غور کے بعد قبول کرنی چاہیے۔ دوسرے، کدار ناتھ نے اپنے ابتدائی بیان میں بھگت رام گواہ کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی مقتول کی دکان کے ہی ایک حصے میں کام کر رہا تھا اور کدار ناتھ کی طرح بھگت رام نے بھی بیان کردہ قاتل غازی علم الدین پر کتابیں پھینکیں اور اس کا تعاقب کیا۔ کدار ناتھ نے ابتدائی بیان میں ملزم کے متعلق یہ نہیں کہا کہ اس نے گرفتاری کے بعد اقبال جرم کیا۔ سیشن عدالت میں وہ بیان دیتا ہے کہ ملزم نے کہا ہے کہ میں نے رسول کریم ﷺ کی توہین کا بدلہ لیا ہے۔ ان حقائق سے قائداعظم نے یہ ثابت کیا کہ عینی

گواہ نمبر 1 کدارناتھ جھوٹا ہے۔ اسی طرح قائداعظم نے دوسرے عینی گواہ یعنی بھگت رام کی شہادت کو لے کراس کی کمزوریاں واضح کیں۔ اس کے بعد انھوں نے وزیر چند، نانک چند اور پرمانند وغیرہ کے بیانات پر نقادانہ بحث کر کے ثابت کیا کہ کوئی بیان بھی اصلاً قابل اعتماد نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص بیان وضع کر کے مختلف آدمیوں کو طوطے کی طرح رٹا دیا گیا۔ قائداعظم نے اپنی جرح سے سب سے اہم نکتہ یہ نکالا کہ عام بیانات کے مطابق واقعہ کے وقت مقتول کے آٹھ زخم لگے یعنی اٹھارہ انیس سال کے ایک معمولی نوجوان نے دن دہاڑے تین مردوں میں گھس کر ایک کے جسم میں آٹھ دفعہ چھری گھونپی اور نکالی اور تین آدمی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس کو عقلِ انسانی صحیح تسلیم نہیں کرسکتی۔ اس کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے آتمارام کباڑی کی شہادت پر جرح کی اور اس کی شہادت کا تار و پود بکھیرا اور اس کے خلاف کئی دلائل قائم کیے۔

(1) پہلی بات آپ نے یہ ثابت کی کہ کوئی دکان دار اتنا باریک بین نہیں ہوسکتا کہ اپنے ہر گاہک کو یاد رکھے جو کہ اس کی دکان پر صرف ایک ہی مرتبہ آیا ہو۔ اس کباڑی نے ملزم کو شناخت پریڈ کے دوران ملزم کے چہرے کے ایک نشان کو دیکھ کر پہچانا ہے۔ ظاہر ہے کہ پولیس نے اسے یہ نشان بتلا دیا ہوگا جس کی بنا پر اس نے ملزم کو شناخت کرلیا۔

(2) گواہ آتمارام کا دعویٰ تھا کہ وہ چاقو کو پہچان سکتا ہے لیکن جب چاقو اس کے روبرو پیش کیے گئے تو وہ پہچان نہ سکا۔

گواہ آتمارام کباڑی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کی نظر کمزور ہے۔

لہٰذا ان حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آتمارام سکھایا پڑھایا ہوا گواہ ہے۔ استغاثہ کے یہی تین مبانی تھے۔ اوّل عینی گواہ، دوئم ملزم کو گرفتار کرنے یا کرانے والے، سوئم چاقو فروخت کرنے والا کباڑیا۔ ان مبانی کی انتہائی کمزوری ثابت کرنے کے ساتھ ہی استغاثہ کو قائداعظم محمد علی جناح نے بالکل بے حقیقت کر دیا۔

اس کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اس امر پر بھی سیر حاصل بحث کی کہ

اگر علم دین قاتل نہیں تھا تو اس کے کپڑوں پر انسانی خون کے دھبے کس طرح لگے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کا یہ بیان پیش کیا کہ مقتول کا خون فوارے کی طرح نہیں اچھلا اور جب حالت یہ ہے تو بیان کردہ قاتل کے جسم پر دھبے نہیں پڑ سکتے لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ بیان کردہ قاتل کے کپڑے مقتول کی لاش سے چھو گئے ہوں گے۔ قائداعظم نے کہا کہ ڈاکٹر کی شہادت کا یہ حصہ بالکل لغو ہے۔ اسے قیاس آرائی کا کوئی حق نہیں تھا۔ سیشن جج اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مقتول کا خون فوارے کی طرح نہیں اُچھلا اور اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ ملزم کے کپڑے مقتول کی لاش سے چھوئے نہیں لیکن لکھتا ہے کہ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق یہ خون انسانی ہے اس لیے مقتول کا خون ہے اور چھری سے ٹپک کر ملزم کے کپڑوں پر گرا ہے۔ قائداعظم نے کہا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جس خون کے دھبے ملزم کے کپڑوں پر ہیں، وہ واقعی مقتول کا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ خود ملزم کا خون ہے۔ ملزم کا بیان ہے کہ اسے گرفتار کرنے کے بعد ہندوؤں نے مارا پیٹا اور اس مار پیٹ سے اس کی انگلی اور ران پر زخم آئے۔

قائداعظمؒ نے ایک اہم بات یہ کہی کہ سیشن جج نے مسلم اسیسروں کی رائے کے سلسلے میں خواہ مخواہ ہندو مسلم سوال پیدا کیا۔ اس مقدمے میں چار اسیسر تھے۔ دو مسلمان اور دو غیر مسلم۔ مسلمان اسیسروں نے ملزم کو بے گناہ بتلایا، غیر مسلم اسیسروں نے جرم کا اثبات کیا۔ سیشن جج نے لکھا ہے کہ مسلم اسیسروں کے فیصلے بالکل ایماندارانہ ہوں، ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ وجہ بتلا دیں کہ فلاں فیصلے پر یقین نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں فرقہ وار تعصب موجود ہو۔ قائداعظمؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمان اسیسروں کے متعلق یہ کیوں کہا گیا، دوسرے اسیسروں کے متعلق کیوں نہیں کہا گیا۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ جج نے مسلمان اسیسروں کے متعلق تعصب کا اظہار کیا۔ ملزم کے حق میں جو شہادت تھی، سیشن نے اسے نا قابل قبول قرار دیا اور اس کے خلاف جو شہادت تھی، اسے درست سمجھا۔ اس پر جسٹس براڈوے نے کہا کہ جج کو اختیار ہے کہ وہ جس شہادت کو چاہے قبول کرے جس کو چاہے مسترد کرے۔ قائداعظمؒ

نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے مگر قبول وعدم قبول کے لیے دلیل بھی ہونی چاہیے۔

علم دین کو بے گناہ ثابت کرنے کے بعد قائداعظمؒ نے مقدمہ کے دوسرے پہلو پرنظر ڈالی اور کہا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ملزم واقعی قاتل ہے تو بھی اس کی سزا پھانسی نہیں بلکہ عمر قید ہونی چاہیے۔اس کے لیے قائداعظم نے مندرجہ ذیل دلائل پیش کیے۔

1- ملزم کی عمر اٹھارہ انیس سال کی ہے۔

2- راج پال نے ایسی کتاب چھاپی جسے عدالت عالیہ نے بھی نفاق انگیز اور شر انگیز قرار دیا۔ملزم نے اسے پڑھا اور بھڑک اٹھا۔

3- ملزم نے کسی لغو اور ذلیل خواہش سے یہ ارتکاب نہیں کیا بلکہ ایک کتاب سے غیرت کھا کر ایسا کیا۔

قائداعظمؒ محمد علی جناح نے عدالت عالیہ کے سامنے مندرجہ ذیل تقریر کی جس میں عدالت عالیہ سے درخواست کی کہ وہ ملزم کو اس الزام سے بری کر دے۔قائداعظمؒ نے فرمایا: ''سب سے پہلے میں اس پولیس افسر کی شہادت کی طرف عدالت عالیہ کی توجہ مبذول کراتا ہوں جس نے بیان کیا کہ ہم ملزم سے یہ اطلاع پاتے ہی کہ میں نے آتما رام کباڑی سے یہ چھری خریدی ہے، فوراً اس کی دکان پر پہنچے۔ پولیس نے بذات خود کوئی تفتیش نہیں کی اور صرف ملزم کے بیان پر اکتفا کیا لیکن دفعہ 27 قانونِ شہادت کی رو سے ملزم کا بیان بطور شہادت پیش نہیں ہوسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ جج صاحبان اس کا فیصلہ صادر کریں۔مسٹر جسٹس براڈوے نے کہا کہ شہادت کے قابلِ قبول یا ناقابل قبول ہونے کے سوال کا فیصلہ کرنا عدالتِ ماتحت کا کام ہے۔قائداعظمؒ نے کہا: کہ آپ اس نکتہ پر اب نہیں تو آخر میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔

سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا کہ ''اب غور طلب امر یہ ہے کہ ملزم کو اس مقدمہ میں ماخوذ کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں یا نہیں۔ 6/اپریل کو راج پال قتل کیا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ جس نے راج پال کو قتل کیا، وہ کون تھا۔ استغاثہ کی شہادتوں میں دو عینی گواہوں کے بیانات ہیں۔ یہ دونوں گواہ کدار ناتھ اور بھگت رام ہیں۔

ان عینی گواہوں کے قابل اعتماد ہونے کو پرکھنے کے لیے میں فاضل ججوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں گواہ راج پال کے ملازم تھے۔ ان شہادتوں کے پرکھنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کے بیانات کے اختلافات کو دیکھا جائے۔"

قائداعظمؒ نے کدارناتھ گواہ کا بیان پڑھ کر سنایا اور کہا سخت تعجب کی بات ہے کہ اس بیان میں گواہ بھگت رام کا کہیں نام تک نہیں آیا حالانکہ وہ اس وقت دکان پر موجود تھا۔ برخلاف اس کے گواہ بھگت رام کا کہنا ہے کہ اس نے ملزم کا تعاقب کیا اور کدارناتھ کے ساتھ مل کر ملزم پر کتابیں پھینکیں۔ جرح کے موقع پر بھی کدارناتھ نے بھگت رام کا نام نہیں لیا حالانکہ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کدارناتھ کو بھگت رام کا نام سب سے پہلے لینا چاہیے تھا۔ یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور عینی شہادت کا جزو اعظم ہے۔

کدارناتھ نے ارتکابِ جرم کا جس قدر وقت بتلایا ہے، طبی شہادت اس کی تردید کرتی ہے۔ طبی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ کے بیان کردہ وقت سے دو چند وقت صرف ہوا۔

قائداعظمؒ نے فرمایا کہ گواہ کا بیان ہے کہ جب ملزم پکڑا گیا تو اس نے کہا میں نے کوئی چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں مارا، میں نے صرف اپنے پیغمبر ﷺ کا بدلہ لیا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ملزم بھاگتا جاتا تھا اور اس کا تعاقب بھی کیا گیا لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص گرفتار ہوتے ہی فوراً اس طرح اقبال جرم کر لے۔ یہ شہادت بھی پیش کی گئی ہے کہ وہ متواتر اقبال جرم کرتا رہا۔ پولیس کا ایسے موقع پر فرض تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے روبرو ملزم کے بیانات قلم بند کراتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ہر ایک تجربہ کار پولیس افسر کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ملزم نے راج پال کی دکان پر آ کر بھی اقبال جرم کیا۔ ایسا غیر ممکن ہے۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ یہ سب کہانی اس قدر غیر قدرتی ہے کہ اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

قائداعظمؒ نے کہا کہ یہ سب کہانی غلط ہے۔ گواہ نے نہ صرف بھگت رام کا نام ہی ترک کر دیا ہے بلکہ وزیر چند کا نام بھی چھوڑ دیا حالانکہ وزیر چند نے ملزم کا تعاقب کیا

تھا۔ جرح پر گواہ نے کہا کہ میں وزیر چند کے نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میں اس شہادت پر صرف یہی کہوں گا کہ اگر گواہ سچ بولتا تو وہ بھگت رام کا نام ضرور لیتا۔ اس کے علاوہ وہ پولیس کے سامنے بھی وہ الفاظ بتاتا جو اس نے بعد میں ملزم کی طرف منسوب کیے لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اس لیے یہ کہانی فرضی ہے۔

دیوان وزیر چند کی شہادت پڑھ کر سناتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا کہ آیا فاضل جج صاحبان اس بات پر یقین کر سکتے ہیں کہ کدار ناتھ، وزیر چند کو نہیں جانتا تھا۔ اگر اسے نام نہیں آتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ کوئی آدمی وہاں موجود تھا۔ اس کے بعد گواہ بھگت سنگھ بھی ایسی کہانی سناتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ملزم کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ ہر ایک گواہ ان الفاظ کے متعلق جو ملزم نے کہے، مختلف بیانات دیتا ہے۔ چنانچہ بھگت سنگھ نے کہا کہ ملزم نے کہا تھا کہ ''ہتھکڑیاں سونے کے کڑے ہیں'' نانک چند گواہ کا بیان ہے کہ ملزم نے کہا تھا کہ ''راج پال میرا دشمن نہیں بلکہ رسول اکرم (ﷺ) کا دشمن ہے'' گواہ سچا نند نے کم وبیش وہی الفاظ کہے جو نانک چند نے کہے۔ لیکن گواہ ودیا رتن جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس نے ملزم کو گرفتار کیا، بالکل مختلف الفاظ بیان کرتا ہے۔ گواہ نے پہلے کہہ دیا ہے کہ وہ ملزم کے صحیح الفاظ بیان نہیں کر سکتا مگر اس کا ملخص بتا سکتا ہوں۔

میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آتما رام کباڑی ایک سکھایا ہوا گواہ ہے۔ اسے اسی روز معلوم ہو گیا تھا کہ راج پال مارا گیا ہے۔ پھر شناخت کی پریڈ ہوئی جس میں تین مرتبہ گھومنے کے بعد اس نے ملزم کو شناخت کیا۔ گو اس گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم کی ناک کے قریب ایک نشان ہے۔ کیا چھری بیچنے والا اس قدر باریک بین ہو سکتا ہے کہ وہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ خریدار کی ناک کے پاس نشان بھی ہے۔ گواہ کا اپنا بیان ہے کہ ملزم کے کان میں دھاگہ پڑا ہوا تھا حالانکہ اس کی بینائی بھی اچھی نہیں۔

اس گواہ کا بیان ہے کہ میں فروخت کی ہوئی چھریوں کو پہچان سکتا ہوں لیکن بعد ازاں اس نے غلط چھری کو شناخت کیا۔ چھریاں عدالت میں پیش کی گئیں۔ قائداعظمؒ

نے ٹوٹی ہوئی نوک دار چھری کی طرف جج صاحبان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ خود ان چھریوں کو دیکھ کر بتلائیں کہ ان میں کیا تمیز ہوسکتی ہے کہ آتمارام بتلانے کے قابل ہو گیا کہ فلاں چھری ہے۔

قائداعظم نے فرمایا کہ سب انسپکٹر کی شہادت ہے کہ ملزم کی شلوار اور قمیض پر خون کے نشانات تھے۔ ملزم کے دیگر حصوں پر بھی معمولی نشانات تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کو بھی ضربات آئیں۔ ملزم کا بیان ہے کہ میرے ساتھ تشدد کیا گیا تھا۔ استغاثہ نے کہیں بھی یقینی طور پر بیان نہیں کیا کہ ملزم کے کپڑوں پر خون کے جو نشانات تھے، وہ اسی قتل کی وجہ سے تھے۔ طبی شہادت ہے کہ یہ نشانات شاید مقتول کے قریب آنے سے لگ گئے۔ یہ امر واضح ہے کہ ملزم مقتول کے نزدیک نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ خون کے نشانات کسی انسان کے خون کے ہیں لیکن یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ یہ مقتول کے خون کے نشانات ہیں۔ اگر میری انگلی زخمی ہو جائے تو اس کے اندر سے بھی کافی خون نکل آتا ہے جس سے میرے کپڑوں پر بڑے بڑے نشانات لگ سکتے ہیں۔ اس کے بعد قائداعظم نے کہا کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ فاضل جج نے فیصلے میں غلطی کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دو ہندو اسیسر ملزم کو مجرم بتاتے ہیں لیکن دو مسلمان اسیسر اسے بے قصور ٹھہراتے ہیں۔ اگر اس وقت ہندو مسلم فرقوں میں کشیدگی تھی تو فاضل جج کا فرض تھا کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرتا۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہندو اسیسروں کی رائے فرقہ پرستانہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ فاضل جج نے شہادتوں سے بھی غلط نتیجہ مرتب کیا۔

آخر میں قائداعظمؒ نے کہا کہ ملزم نوجوان ہے۔ راجپال نے بدنام کتاب شائع کر کے مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا تھا۔ اس لیے سزائے موت سخت سزا ہے۔ ملزم پر رحم کیا جائے۔ لنچ کے بعد عدالت نے سرکاری وکیل کا جواب سنے بغیر حاضرین کو باہر نکال دیا اور فیصلہ محفوظ رکھا۔ سرکاری وکیل کی جوابی تقریر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اپیل خارج کر دی گئی۔ چار بجے کے قریب عدالت نے فیصلہ سنایا اور اپیل نامنظور کر دی۔

یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب عدالت عالیہ نے غازی علم

الدین کیس میں سیشن کے فیصلہ کو برقرار رکھا اور غازی علم الدین کی سزائے موت برقرار رکھی تو ہندو اخبارات نے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف زبردست زہر اگلنا شروع کر دیا۔ مشہور متعصب ہندو اخبار پرتاب نے اس مسئلہ پر کئی نوٹ لکھے۔ گپ شپ اور چلنت کے نام سے دو کالم چھپتے تھے۔ ان میں قائداعظم کو رگیدا گیا۔ ایک جگہ لکھا کہ: ''مسٹر محمد علی جناح کی قابلیت علم دین کو موت کے منہ سے نہ چھڑا سکی'' ایک جگہ لکھا کہ: ''مسٹر محمد علی جناح کو ایسا مطلقاً کمزور مقدمہ لینا ہی نہیں چاہیے تھا کیوں کہ ہندوؤں کو ان کے خلاف ناواجب شکایات پیدا ہو گئی ہیں۔''

قائداعظمؒ محمد علی جناح نے جس قابلیت سے مقدمہ کی پیروی کی، اس پر روزنامہ الجمیعۃ دہلی نے اپنی اشاعت مورخہ 20/ جولائی 1929ء کو ''مسٹر جناح کی باطل شکن تقریر'' کے زیرِ عنوان انھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا۔

❏ ''لاہور ہائی کورٹ سے بھی میاں علم الدین کی اپیل کا فیصلہ صادر ہو گیا اور پھانسی کا جو حکم سیشن عدالت سے ہوا تھا، وہی بحال رہا۔ قائداعظمؒ کی مدلل اور مؤثر تقریر کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دلائل کس قدر وزنی تھے اور انھوں نے ماتحت عدالت کی شہادتوں میں جن نقائص کا ذکر کیا تھا، ان سے مقدمہ کس درجہ کمزور ہو گیا تھا مگر ہائی کورٹ کے ججوں نے خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر ان دلائل کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس وقت ہائی کورٹ کا فیصلہ موجود نہیں ہے اس لیے ہم اس پر مفصل تنقید نہیں کریں گے۔ جب تک ہمارے سامنے اصل فیصلہ کے دلائل نہ آ جائیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ قائداعظمؒ کی تقریر کے بعد پھانسی کی سزا کس طرح بحال رہ سکتی تھی۔''

(الجمیعۃ 20 جولائی 1929ء ص4)

مسلمانوں نے ہائی کورٹ میں اپیل خارج ہونے کے بعد پریوی کونسل لندن میں اپیل دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپیل کا مسودہ قائداعظم محمد علی جناح کی زیرِ نگرانی تیار کیا گیا۔ اس میں واقعات اور قانونی ضابطوں کی تفصیل درج کرنے کے بعد اس بات پر زور دیا گیا کہ پریوی کونسل کو یہ صداقت مان لینی چاہیے کہ مسلمانوں کو پیغمبر آخرالزماں ﷺ

کی ذات مقدس سے اس قدر پُرخلوص محبت ہے کہ وہ ناموس رسالت ﷺ پر ہر لمحہ جان دینے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں، اس لیے حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے شخص کو موت کی سزا اور شاتم کو موت کی نیند سلانے والے عاشق رسول ﷺ کو غازی کے خطاب سے نوازا جانا چاہیے۔

لیکن پریوی کونسل نے اس اپیل کو نہ صرف نامنظور ہی کیا بلکہ دفعہ **153-1**، اور دفعہ **304** کے جزو اشتعال انگیز قتل کے معاملے کی وضاحت بھی نہ کی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ انگریز مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو کو اپنا سمجھتا ہے اور اس کی ناجائز طرف داری کر رہا ہے۔

31 اکتوبر **1929**ء بمطابق **26** جمادی الاوّل **1348**ھ کی صبح دو رکعت نماز شکرانہ پڑھتے ہوئے غازی علم الدین ناموس رسول ﷺ پر قربان ہو گئے۔ آپ کا مزار مبارک قبرستان میانی صاحب لاہور میں ہے۔

اس تاریخ ساز واقعہ سے قائداعظم آخر تک متعلق رہے۔ علامہ اقبال کی رائے میں قائداعظم نے بڑی قابلیت سے اس مقدمہ کی پیروی کی تھی لیکن انگریز حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے بغض و عناد کے تحت قائداعظم ایسے ذہین ترین وکیل کے دلائل کو نظرانداز کر دیا اور محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے قانون و انصاف کو پیش نظر نہ رکھا۔

پروفیسر مرزا محمد منور

قائداعظمؒ ......اہل اسلام کا مرکز اعتماد

میں نے اپنے مرحوم کرم فرما جسٹس محبوب مرشد صاحب سے ایک بار پوچھا کہ حضرت اس بات سے قطع نظر کہ آپ کے خاندان کے بزرگ اے کے فضل الحق اور قائداعظم کے مابین شدید اختلافات رہے، ازراہِ کرم آپ مجھے قائداعظم کے بارے میں اپنی ذاتی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ اس پر وہ بے ساختہ بولے: ''بھئی اللہ نے اس دھان پان وجود میں سات ولیوں کی روحانی طاقت ودیعت کر رکھی تھی، ورنہ کیا یہ کام ہونے والا تھا جو انہوں نے کر دکھایا؟'' میں یہ سن کر لرز گیا۔ **ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء.**

1945-46ء کے انتخابات سے قبل حضرت قائد اعظمؒ صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے، مانکی شریف بھی گئے۔ پیر صاحب مانکی شریف اور پیر صاحب زکوڑی شریف کے علاوہ بھی جملہ پیران سرحد نے سارے برعظیم کے پیران عظام کی طرح قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس ضمن میں چند سطور آغا مسعود حسین کی مؤلفہ سوانح سردار عبدالرب نشتر سے درج کی جاتی ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر فرماتے ہیں:

- ''جب ہم مانکی شریف سے رخصت ہو رہے تھے تو قائداعظم آگے تھے اور پیر صاحب مانکی شریف سمیت تمام پیر، ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب قائداعظم موٹر میں بیٹھ گئے تو میں بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ موٹر روانہ ہوگئی تو میں نے کہا: ''قائداعظم! مجھے ہنسی آئی تھی لیکن میں نے ضبط کر لی۔'' پوچھا ''کیوں؟'' میں نے کہا ''جب ہم ان پیروں کے پاس جاتے ہیں تو بہت عزت و احترام سے ان کے سامنے

بیٹھ جاتے ہیں لیکن آج تمام پیر آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے تو مجھے ہنسی آ رہی تھی۔‘‘ فرمانے لگے ’’تمھیں معلوم ہے اور ان کو بھی معلوم ہے، میں متقی، پرہیز گار اور زاہد نہیں ہوں۔ میری شکل وصورت زاہدوں کی سی نہیں ہے۔ مغربی لباس پہنتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق میرے ہاتھ میں محفوظ ہیں اور میں اپنی قوم کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرسکتا......‘‘ اس کے بعد میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے ’’برخوردار! اگر تم بڑا آدمی بننا چاہتے ہو تو اپنے اندر یہ خصلت پیدا کرو۔‘‘ (آزادی کی کہانی، میری زبانی، صفحہ 79، 80)

قائداعظم نے فرمایا:

- ’’ہر مسلمان کو یقین ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق میرے ہاتھ میں محفوظ ہیں۔‘‘

یہ اعتماد آخر آناً فاناً تو پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ عیاں ہے کہ قائداعظم کی پوری زندگی ہندی مسلمانوں کے سامنے آئینے کی طرح واضح اور شفاف تھی۔ اس بھرپور اعتماد کی سب سے بڑی آزمائش وہ لمحے تھے جب تین جون 1947ء کے منصوبے کے بعد ملک بھر کے مسلمان اکابر کو اس پر اظہار رائے کا موقع دیا گیا۔ قائداعظم نے 3 جون کی نشری تقریر میں فرمایا تھا:

’’یہ تجویز مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش کی جائے گی اور آخری فیصلہ کونسل کا ہی ہوگا۔‘‘

قائداعظم نے اپنے رفقا کو آزادی سے اظہار رائے کی دعوت دی۔

اس ضمن میں میرے سامنے جناب سید انصار ناصری صاحب کی کتاب ’’پاکستان زندہ باد‘‘ ہے، میں اس کے حوالے سے عرض کرتا ہوں کہ مولانا حسرت موہانی نے پُر جوش لب ولہجہ میں وضاحت کی کہ ہم کٹا پھٹا پاکستان قبول نہیں کریں گے۔ اس پر بعض دیگر بزرگوں نے ان کو ٹوکنا چاہا۔ قائداعظم نے فرمایا ’’مولانا کو بات مکمل کرنے دی جائے۔‘‘ جب مولانا اپنی بات مکمل کر چکے تو قائداعظم نے ارشاد کیا کہ ’’سکیم یا کاملاً

رد ہو گی یا کاملاً قبول۔ اس کو جزواً رَد یا قبول نہیں کیا جا سکتا۔'' اس پر مولانا حسرت موہانی کے منہ سے نکلا ''یہ تو صلح نامۂ حدیبیہ ہوا۔'' قائداعظم نے جواب دیا ''آپ اسے صلح نامہ حدیبیہ کہتے ہیں تو یہی سمجھ لیجیے۔ رسول کریم ﷺ نے بھی حدیبیہ کے صلح نامہ کو منظور کرلیا تھا۔ اس پر عبدالحامد صاحب نے لقمہ دیا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے قرآن پاک میں فتح مبین فرمایا۔''

- **"انا فتحنالک فتحا مبینا" (الفتح:1)**

قائداعظم نے کہا:

- ''بے شک یہ منصوبہ آگے چل کر مسلمانوں کے لیے فتح مبین ثابت ہو گا۔''

قائداعظم نے یہ بھی وضاحت کر دی کہ یہ منصوبہ انگریز نے مسلم قوم کے متحدہ دباؤ کے تحت مجبوراً قبول کیا ہے۔ اگر ہم نے اب اس منصوبے کو منظور نہ کیا تو پھر پاکستان خواب وخیال ہو کر رہ جائے گا۔ برطانوی حاکموں کے ساتھ ساتھ کانگریس والے بھی طوعاً وکرہاً آمادہ ہو چکے ہیں۔ گاندھی جی سمیت جو کہتے تھے کہ ''بھارت کی تقسیم بھارت ماتا کی تقسیم ہے اور وہ مرن برت رکھ لیں گے مگر تقسیم قبول نہیں کریں گے۔'' آج وہ بھی اسے قبول کر رہے ہیں اور برطانیہ کو اس کی دانش مندی پر داد دے رہے ہیں''۔ (انصار ناصری، صفحہ 116)

آگے چل کر قائداعظم نے یہ بھی وضاحت فرمائی کہ اگر ہم نے اس وقت اس تجویز کو نہ مانا تو مونٹ بیٹن کی دھمکی موجود ہے اور اس دھمکی میں مسٹر ایٹلی (وزیراعظم برطانیہ) کی تائید میسر ہے کہ مرکز میں موجود ہند حکومت کو جملہ اختیار تفویض کر دیئے جائیں گے۔ (صفحہ 118) حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ نہایت سنگین تھا، کٹا پھٹا پاکستان قبول کرلیا جائے یا پھر متحدہ ہندوستان میں رہنا قبول کر کے کسی لمبی خانہ جنگی کی راہ ہموار کی جائے، وہ خانہ جنگی جس کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ اس موقع پر اعتراض مولانا حسرت موہانی ہی کا سب سے زبردست تھا لیکن انھوں نے بھی اس مصالحت کو صلح نامۂ حدیبیہ کے طور پر قبول کرلیا۔ باقی حضرات نے قائداعظم پر بھرپور اعتماد کا بلا چون و چرا اظہار کیا۔ یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ جناب انصار ناصری صاحب کے درج کردہ

وہ کلمات اعتماد نقل کر دوں جو حضرت پیر صاحب مانکی شریف نے اس موقع پر ارشاد کیے تھے۔ پیر صاحب کے ہر جملے سے قائداعظم کی شان قیادت جلوہ ریز ہے:

❑ ''برادران اسلام! اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ہند کے درماندہ مسلمانوں پر بے پناہ کرم اور احسان عظیم ہے کہ اس نے ہماری نجات اور فلاح کے لیے حضرت قائداعظم محمد علی جناح جیسا حق پرست، حق گو اور حق شناس راہبر عطا فرمایا جس نے اپنے کردار کی عظمت سے مسلمانان ہند میں اتحاد، تنظیم اور یقین کی روح پھونکی اور اپنی فراست اور آئین پرستی سے انگریز اور ہندو کی سازشوں اور تمام تر عیاریوں کو شکست فاش دے کر حصول پاکستان کی منزل سے ہمکنار کر دیا ہے۔ میں آپ سب حضرات سے پُرزور درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے مخلص اور حقیقی بہی خواہ کی دردمندانہ نصیحت پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کی تجویز کو بلاپس و پیش منظور کر لینا چاہیے۔ اسی سے ہماری قومی اور دینی فلاح وابستہ ہے۔ کلمہ گویان رسول کریم ﷺ کی ایک علیحدہ مملکت کے قائم ہو جانے سے قرآن اور حدیث کی تعلیمات اور اسلامی اقدار و روایات کا احیا ہو گا۔ پاکستان میں نشاۃ ثانیہ کا آفتاب طلوع ہو گا جس سے سارا عالم اسلام روشن اور منور ہو جائے گا۔ آپ لوگ خوش نصیب ہیں کہ آج آپ لوگ ایک نئی عظیم اور وسیع اسلامی مملکت کے قیام کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ اس تجویز کو بلاخوف فوراً منظور کر کے اپنے عظیم راہبر قائداعظم کی کوششوں کو کامیاب بنائیں۔'' (صفحہ 117)

اتنا نازک مسئلہ، اتنا بڑا فیصلہ، کروڑوں انسانوں کی تقدیر کا معاملہ، ایک برعظیم کی تقسیم کا عقدہ، جو سراسر ہندی مسلمانوں کی اکثریت سے متعلق تھا، فقط ایک شخص کی بے لوث قیادت اور اخلاص مندانہ کوشش کے پیدا کردہ اعتماد پر منحصر ہو کر رہ گیا تھا۔ پیر صاحب زکوڑی شریف نے بھی اسی طرح کا بیان دیا۔ وہ بڑا پُرزور تھا جس میں سرحد کے قوم فروشوں پر شدید طنز تھا۔ یہ برعظیم کا سب سے اوپر کا شمالی حصہ تھا جس کے روحانی سربراہ اتنا بڑا سیاسی فیصلہ کر رہے تھے جس فیصلے کو صلح نامۂ حدیبیہ کہہ کر قبول کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف محمد اسماعیل صاحب مدراس والے تھے جو فرما رہے تھے کہ ''محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام

پر ایک سلطنت وجود میں آ رہی ہے۔ہم اس کے لیے دعا گو ہیں، ہم اس سلطنت کی حدود سے دُور ہوں گے مگر ایک اسلامی سلطنت کا ظہور الحمدللہ کہ ہماری بے پایاں خوشی کا باعث ہے، وغیرہ۔'' (انصار ناصری، صفحہ 109)

سندھی سربراہ غلام حسین ہدایت اللہ کی تقریر میں قائداعظم کو جو ہدیۂ تبریک و توصیف پیش کیا گیا، اس میں قائداعظم کی ان کوششوں کا خصوصی ذکر تھا جن کی بنا پر سندھ کو بمبئی سے جدا کرا کے ایک مسلم اکثریت کا الگ صوبہ بنوایا گیا جو اب بفضلِ خدا اسلامی مملکت کا حصہ بن رہا تھا۔

یہ لوگ اور ان کے رفقا اپنی اپنی جگہ بلند شخصیتوں اور عظمتوں کے مالک تھے جن کے پیروؤں اور دعا گوؤں کی تعداد بے پناہ تھی مگر کس عجز و اخلاص کا پیکر بن کر یہ حضرات قائداعظم کی عظمت کا اقرار کر رہے تھے۔ یہ مسئلہ کہ اس صلح نامۂ حدیبیہ کو آگے کی فتوحات کا عملی پیش خیمہ بننے میں کیوں دیر ہوگئی، جدا بات ہے مگر قائداعظم سمیت سب بزرگان اکابر نے اس فیصلے کو تشبیہ صلح نامۂ حدیبیہ سے دی۔ اللہ کرے کہ پاکستان کو کوئی مخلص جانباز روحانی اور صاحب ایمان قیادت میسر آئے تا کہ اس عظیم فیصلے کے اگلے حصے بھی جلوہ گر ہوں اور اس سے پورا عالم اسلام بلکہ پوری دنیائے آدمیت بقعۂ انوار اور خوشبوزار بن جائے۔

کیا قائداعظم اچانک 46-1945ء کے انتخابات جیت لینے کے باعث اس اعتماد کا محور و مرکز قرار پائے تھے کہ ان کے اشارہ ابرو پر مسلمان برعظیم کی تقدیرات کا فیصلہ منحصر ہو کر رہ گیا تھا؟ ایسا ہرگز نہیں تھا، قائداعظم کی پوری عملی زندگی اسی کش مکش میں بسر ہوئی کہ وہ مسلمانوں کی کوئی خدمت کر سکیں۔ بعض حضرات جن کے دل اپنی کسی سست رو قیادت کے باعث قائداعظم سے حسد کرتے رہے، وہ آج بھی کہے جا رہے ہیں کہ مسٹر جناح تو فقط نیشنلسٹ تھے اور پکے نیشنلسٹ تھے، بس آخری سالوں میں انھیں کچھ ہو گیا تھا کہ مسلم قوم اور دو قومی نظریے کی رٹ لگانے لگے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر کسی کا انجام بخیر ہے تو بخیر ہے۔ یہ بھی اللہ کی دین ہے لیکن یہاں تو مسئلہ یہ نہیں ہے۔

ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ قائداعظم کے اپنے بقول انھوں نے لندن کے تعلیمی ادارے لنکنز اِن میں داخلہ اس لیے لیا تھا کہ اس ادارے کی قوس الباب پر بعض بزرگوں کے اسمائے گرامی درج تھے۔ ان اسمائے گرامی میں چونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کا نام مبارک بھی شامل تھا، لہٰذا قائداعظم نے اس ادارے کو منتخب فرمایا اور یہ یاد رہے کہ یہ فیصلہ جب قائداعظم نے کیا، اس وقت ان کی عمر 16 سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نوخیزی میں اتنی پکی نسبت محمد ﷺ!

یہاں میں حال ہی میں چھپ کر آنے والی اپنے دوست اور ایم اے کے ساتھی ہمایوں ادیب کی کتاب کا ذکر بالکل مناسب سمجھتا ہوں۔ کتاب کا نام ہے ''قائداعظم ماہ و سال کے آئینے میں'' اس کتاب میں ہمایوں ادیب صاحب نے بڑی محنت اور نہ جانے کہاں کہاں کے اخبارات، جرائد اور گزٹ کھنگال کے حیاتِ قائداعظم کی ڈائری مرتب کر دی ہے جو ان کے سال پیدائش سے شروع ہو کر ان کے دم آخر تک کے پورے دور پر محیط ہے۔ اس کتاب کی سرسری ورق گردانی کی جائے تب بھی دل پر رعب طاری ہو جاتا ہے کہ ہمارے پروانہ منش اور عاشق اُمت مسلمہ کا دل کس طرح ہر دم، ہر موقع اور ہر پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے مسائل کے ضمن میں دھڑکتا رہتا تھا۔

وہ ابھی بمشکل تیس (30) برس کے تھے جب انھوں نے پہلی تقریر کسی بڑے جلسے میں کی۔ یہ دسمبر 1906ء کے اجلاس کانگریس بمقام کلکتہ کی بات ہے۔ یہ تقریر حسن اتفاق سے مسلمانوں کے وقف کی کسی شق کے بارے میں تھی۔ اسی جلسے کی ایک نشست میں قائداعظم نے ایک سیاسی تقریر بھی کی مگر جیسا کہ عیاں ہے کہ پہلی تقریر اسلامی موضوع پر تھی اور دوسری سیاسی موضوع پر۔ بس یہی قائداعظم کی حیات کا لائحہ قرار پا گیا۔ اسلام پہلے، سیاست بعد میں۔

ہمارے قائداعظم نے ظاہری صاحب بہادری کے باوصف دل کا رشتہ اسلام سے جوڑے رکھا۔ ہمارے بہت سے دینی اعلام خام اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ فیصلہ دل

کا ہوتا ہے، ظاہری پوشش کا نہیں۔ بقول مرزا غالب ؎

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

31 برس کی عمر میں قائداعظم نے بمبئی کی مجلس ضیا الاسلام کی رُکنیت اور عہدہ قبول کیا، اسی عرصے میں انڈین مسلم ایسوسی ایشن کلکتہ کی رُکنیت اختیار کی تا کہ مسلمان نوجوانوں کا حوصلہ بڑھے۔

قائداعظم 1910ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پہنچے اور پھر 1947ء تک کونسل پر چھائے رہے۔ وہ مسلمانوں کے مسئلہ اوقاف پر مسلسل کئی سال سے کام کر رہے تھے۔ لہٰذا وائسرائے نے اپنی کونسل میں یہی کام ان کے سپرد کر دیا جو آخر کار 1911ء میں ایکٹ کی صورت میں تکمیل پذیر ہوا۔ جیسا کہ عیاں ہے، قائداعظم کانگریس پارٹی کے بڑے معتمد رُکن تھے تاہم کوئی بھی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا تعلق مسلمانوں سے ہو اور قائداعظم نے اس میں مسلمانوں کی بہتری کی خاطر بھرپور دلچسپی نہ لی ہو، تعلیمی مسئلہ تھا، خواہ شرعی، سندھ بلوچستان کا مسئلہ تھا یا سرحد کا۔ وہ کانگریس میں بیٹھے ہوئے مسلمانوں کی منتشر قوت کو مجتمع کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ ان پر عیاں تھا کہ اگر مسلمانوں کو کسی ایک بڑی جماعت کی صورت میں متحد نہ کیا گیا تو ان کی ہر بات صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ وہ گویا کانگریس کی ''نیشنلسٹ'' حیثیت کو اس وقت بھی جانتے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق مسلمانوں ہی کی متحدہ قیادت کے ہاتھ میں محفوظ ہو سکتے ہیں۔

قائداعظم نے 1913ء میں مسلم لیگ کی رُکنیت بھی اختیار کر لی۔ اب وہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رُکن تھے۔ اس زمانے میں یہ اجازت تھی، کوئی شخص ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کا رُکن بن سکتا تھا۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں کو اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کو تقویت دینے کی عملی صورت پیدا کر لی۔ ہمایوں ادیب صاحب کی ڈائری کے مطابق قائداعظم نے 1915ء میں ہندوستان کے مسلمانوں اور مسلم زعما سے اپیل کی کہ وہ ایک متحدہ محاذ قائم کرنے اور ہندو دوستوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے

کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ نیز مسلم لیگ اور کانگریس کے باہم ادغام کا خیال ترک کر دیں۔ بالکل واضح ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے اجتماعی مفاد کا بھی اہتمام کر رہے تھے اور مسلمانوں کا ایک الگ حیثیت سے استحکام بھی بروئے کار لا رہے تھے۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ ملکی معاملات میں تعاون کے خواہاں تھے، قدم ملا کر چلنا چاہتے تھے مگر یہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کانگریس میں مدغم ہو کر مسلمانوں کی الگ حیثیت کو مشکوک کر دے اور ان کی اپنی مسلم متحدہ قوت کو کمزور کر کے انھیں سیاسی بلکہ ہر اعتبار سے غیر محفوظ بنا کر رکھ دے۔

مسلم لیگ کی یہ متحدہ قوت ہی تھی جس کا سہارا لے کر قائداعظم نے 1916ء کے دسمبر میں کانگریس سے جداگانہ انتخابات کا اصول منوا لیا۔ چیمسفورڈ سکیم کے تحت تو یہ حق انگریز سے منوایا گیا تھا مگر اصل فتح یہ تھی کہ خود ہندو قوم کے لیڈروں سے یہ بات منوا لی گئی۔ گاندھی جی بھی دسمبر 1916ء والے اجلاس میں موجود تھے، وہ اس فیصلے کے مخالف تھے مگر آخری صفوں میں تھے۔ اس وقت تک ابھی ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے سربلند قائد تو محمد علی جناح تھے۔ یہ میثاق لکھنؤ واحد میثاق تھا جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین برضا و رغبت طے پایا، ورنہ ہندو اور مسلمان کسی بھی امر میں کبھی رضامند نہ ہوئے اور ان کے مابین کچھ بھی کبھی طے نہ پایا۔

میثاق لکھنؤ کی رُو سے گویا قائداعظم نے ثابت کر دیا کہ بھارت میں دو سیاسی جماعتیں ہیں جو دو قوموں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آگے چل کر جب کانگریس اپنے اقتدار کے نشے میں بہنے لگی اور اس نے مسلمانوں کو سرے سے ساقط الحقوق قرار دے دیا تو میثاق لکھنؤ کا فیصلہ ان کے گلے کا طوق بن گیا۔ پھر نہ یہ گاندھی جی سے اُتارا جا سکا، نہ پنڈت نہرو سے نہ راجندر اپرشاد سے اور نہ کسی وائسرائے سے۔

جب 1937ء کے انتخابات کے بعد سات صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں جن میں سے چھ ہندو اکثریتی صوبوں میں تھیں تو کانگریس کو نشہ سا ہو گیا۔ بقول قائداعظم کانگریس نے وقت سے پہلے ہی بتا دیا کہ وہ ہندو جماعت ہے اور ہندوؤں ہی

کی نمائندہ ہے اور انھی کے حقوق کی پاسبان۔ قائداعظم نے 1937ء اور 1938ء کے مسلم لیگی اجتماعات میں بتایا کہ ابھی معمولی سے اختیارات حاصل ہوئے ہیں اور کانگریس مسلم کش پارٹی کے طور پر سامنے آ گئی ہے۔ حالانکہ ابھی پورا اقتدار نہیں ملا تاہم شکر گزار ہیں ہم کہ کانگریس والوں نے ہمیں خبردار کر دیا کہ جب ان لوگوں کو پورے اختیارات حاصل ہوں گے تو یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظم مسلمانوں کے ان اکابر میں سے تھے جو ہندوؤں سے بہت دیر میں مایوس ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق مسلمانوں کی طرح محفوظ رہیں اور ہندوستانی قوم کے اجتماعی حقوق اس قومی (نیشنلسٹ) اعتبار سے بھی مامون رہیں۔

ہندوؤں نے سائمن کمیشن کے بعد نہرو رپوٹ میں مسلمانوں کی شدید دل شکنی کی اور اس طرح بقول قائداعظم ان کا راستہ اور ہمارا راستہ جدا جدا ہو گیا۔ رہی سہی کسر کانگریسی وزارتوں کے رویے نے نکال دی۔ پھر مسلمانوں کو حضرت حافظ شیرازی کے الفاظ میں یہ پوچھنا پڑا:

''چیست یارانِ طریقت بعد از این تدبیر ما''

اس طرح بظاہر ایک پکے کانگریسی اور مضبوط نیشنلسٹ لیڈر نے جو خودشناس بھی تھا اور دشمن شناس بھی، مسلمانوں کی منتشر قوت کو یکجا کر کے ان کو ہم صف اور ہم آواز بنانے کا فریضہ بخوبی انجام دے دیا اور ہوتے ہوتے مسلمانوں کو ایک جماعت مسلم لیگ کا حامی بنا کے کانگریس کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ پھر مسلم لیگ نے 1945-46ء کے انتخابات میں ثابت کر دیا کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندہ ہرگز نہیں۔ ان کی نمائندہ فقط مسلم لیگ ہے اور مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح کے دست حق پرست میں ہے اور وہ، وہ شخص ہے جس کا کردار مسلمانوں کے لیے آئینہ ہے۔ وہ، وہ شخص ہے جو قومی مفاد کو کسی قیمت پر بیچ نہیں سکتا۔ یہی تھے وہ کلمات جو قائداعظم نے سردار عبدالرب نشتر صاحب سے کہے تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر وہ تعریفی کلمات تھے جو

حضرت پیر صاحب مانکی شریف نے مولانا حسرت موہانی صاحب کی تقریر کے بعد تین جون کے فیصلہ کن منصوبے کو مان لینے کی ترغیب دیتے وقت ارشاد فرمائے تھے...... قائداعظم نے اپنے کردار پر اعتماد نصف صدی کی بے لوث خدمت کے بعد حاصل کیا تھا۔

جن لوگوں نے قائداعظم پر اس قدر اعتماد کیا، انھوں نے قائداعظم کو اسلامی مملکت کی نہاد و بنیاد استوار کرنے والا اور مسلمانوں کے حقوق کا پاسبان جان کر یہ اعتماد کیا تھا، بھلا اس قائداعظم کو ''سیکولر'' کہا جا سکتا ہے؟ قائداعظم نے جس تقریر میں یہ فرمایا کہ ''ہماری مملکت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں انصاف کا سلوک ہو گا اور کسی کو یہ احساس نہ ہو گا کہ اس کے ساتھ مذہب کی بنا پر زیادتی ہوئی ہے، اس کے لیے ہندو ہونا سنگ راہ ہوا یا مسلمان کا مسلمان ہونا ناجائز مفاد کا باعث ہوا۔ یہ بات نہ ہندو کے ذہن میں آئے گی نہ مسلمان کے خیال میں جاگزیں ہو گی۔ یہ 11 اگست 1947ء کی تقریر ہے۔ کیا پھر قائداعظم نے کوئی تقریر نہیں کی؟ درجنوں تقریریں اس سے قبل اور درجنوں تقریریں اس کے بعد ارشاد فرمائیں...... بعد میں کی جانے والی تقریروں میں تقریباً بیس (20) بار پاکستان کو مسلم مملکت پاکستان کہہ کر یاد کیا اور ایک تقریر میں تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔'' وہ

لوگ جو ازراہِ شرارت ان دنوں یعنی قائداعظم کی زندگی میں اس کجی میں مبتلا تھے، آج اور بھی زیادہ تیز ہیں۔ قائداعظم کے دور میں اُلٹی بات کرنے والے وہ دینی لوگ تھے جو تحریک پاکستان میں شامل نہ تھے اور باہر کھڑے مضحکہ اُڑا رہے تھے۔ آج زیادہ تر وہ لوگ اس بات کے درپے ہیں جن کا نقطۂ نظر جماعتی سے زیادہ گروہی ہے یا وہ سرے سے ازروئے خاطر اسلام سے دلچسپی ہی نہیں رکھتے...... سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا 11 اگست 1947ء والی تقریر لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے نہیں سنی تھی؟ وہ تو اس تقریر سے بدظن نہ ہوئے۔ یہ آج کے متعقل اور ماہرین علم کلام قائداعظم کے ان رفقا سے بڑھ کر قائداعظم کی بات کا مفہوم سمجھنے والے کہاں سے پھوٹ پڑے؟

محمد شفیع صابر

قائداعظم اور علمائے اسلام

نظریہ پاکستان، اسلامی نظریے ہی کا دوسرا نام ہے۔ انسان کی سیاسی زندگی کی جڑ اس کے مذہب میں ہے اور پھر اسلام تو وہ دین ہے جس میں دین، سیاست سے جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ تحریک پاکستان کی کامیابی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یہ تحریک اسلام ہی کے مقدس نام پر شروع ہوئی تھی، اس لیے اسے حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ خلافت راشدہ کے مبارک دور کے بعد تیرہ سو سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کے تمام مسالک ایک مقصد اور ایک نصب العین پر اس طرح متفق ہوئے کہ پاکستان سب کا مقصودِ حیات بن گیا اور اس کے حصول کے لیے سب کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے۔

اسی حقیقت کو مولانا علم الدین سالک ایسے صاحب نظر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

- ''نظریہ پاکستان کے متعلق کوئی کہتا ہے کہ قائداعظم اور علامہ اقبال کا نظریہ ہے، کوئی اسے چوہدری رحمت علی سے منسوب کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ نظریہ کسی نہ کسی شکل میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پیش نظر تھا اور انہی کی تحریک کی روشنی میں قیام پاکستان کو راستہ ملا۔ انہوں نے پاکستان کی خشت اول اس طرح رکھی کہ مسلمانوں کی انفرادیت اور قومی تشخص بہرحال قائم رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ رام اور رحیم ایک نہیں، کعبہ اور بت خانہ ایک سے نہیں''۔

جو لوگ ہندوستانی سیاست میں متحدہ قومیت کے علمبردار ہیں، اگر وہ اپنی تاریخ اٹھا کر پڑھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ تجربہ کیا کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی بہت کوشش کی مگر انہوں نے ہمیں عزت کے ساتھ کبھی

قبول ہی نہیں کیا۔ سرسید شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ اکبر الہ آبادی کی گاندھی سے عقیدت ڈھکی چھپی بات نہیں، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کانگریس کے آگے آگے چل کر کام کرنے والے لوگ تھے۔ مولانا حسرت موہانی تو ہندو لیڈروں سے بڑھ کر آزادیٔ کامل کے خواہاں تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہاں تک کوشش کی تھی کہ **1916**ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کو یک جان کر دیا تھا۔ مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال تک ابتدا میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی رہے تھے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ سب لوگ جلد یا بدیر کانگریس کی سیاست سے بیزار ہو کر دو قومی نظریے کو اپنانے پر مجبور ہوئے؟ اسی سوال کے جواب میں قیام پاکستان کا حقیقی سبب پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت تھی، ہندوؤں کے مفادات کے لیے کام کرتی تھی مگر اس نے ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کا بہروپ بھر رکھا تھا۔ جتنا کوئی مسلمان لیڈر کانگریس کے زیادہ قریب جاتا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی۔ اسے صوبہ سرحد کی بدقسمتی سمجھیے کہ خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان یا کسی دوسرے سرحدی کانگریسی کو ہندوستان گیر معاملات میں ہندو راہنماؤں کے زیادہ قریب رہنے اور مل کر کام کرنے کا موقع نہ ملا، اس لیے دور کے ڈھول انہیں سہانے معلوم ہوتے رہے۔ بنگال اور بہار میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہزاروں مسلمانوں کو ہندو اکثریت نے نہایت بیدردی سے قتل کر دیا تو گاندھی جی ''امن مشن'' پر نکلے اور کچھ مسلمان رضا کار بھی اپنے بھائی بندوں کی حمایت کے لیے سرحد اور پنجاب سے بہار گئے۔ میرے ایک عزیز جو پشاور سے بہار گئے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ہم گاندھی جی کے دورے میں ان کے ہمراہ تھے۔ وہ جہاں جاتے ''امن امن اور شانتی شانتی'' کا درس دیتے لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ جہاں دورہ کر کے آتے، دوسرے تیسرے دن وہیں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جاتا۔ اس پر ہم رضا کاروں نے اپنے ایک دوست کو ہندوانہ بھیس اختیار کرنے اور رات دن گاندھی جی کے کیمپ میں رہنے پر مامور کیا۔ اس دوست نے آخر حقیقت کی ٹوہ لگائی اور بتایا کہ عام جلسوں میں تو گاندھی جی واقعی سب کو امن کی تلقین کرتے تھے لیکن صبح سویرے پرارتھنا کے موقع پر، جس میں صرف ہندو ہی شریک ہو سکتے

تھے، صاف اشارہ کر جاتے تھے کہ ''میں تو شانتی شانتی کہتا ہی ہوں لیکن تم اپنا کام کرتے جاؤ''۔ یہ تھی گاندھی جی کی سیاست!

سرحدی کانگریسیوں پر گاندھی جی اور ہندو کانگریسیوں کی ذہنیت اس لیے بھی واضح ہونے نہ پائی کہ صوبہ سرحد میں اس جماعت کی بنیاد اسلام ہی کے نام پر اور اصلاح معاشرہ کی غرض سے ایک مسلمان راہنما خان عبدالغفار خاں کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس کے نام 'اصلاح افاغنہ'' اور ''خدائی خدمتگار'' بھی اسلامی نوعیت کے نام تھے، اس لیے عوام نے اس کا کھل کر ساتھ دیا۔ اس جماعت کے ممبر خان عبدالغفار خان ہی کو اپنا راہنما مانتے تھے۔ اگر شروع ہی سے گاندھی جی یا کانگریس کے نام پر جماعت کھڑی کی جاتی تو شاید اسے اتنی مقبولیت یہاں حاصل نہ ہوتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ خاکسار تحریک علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے شروع کی تھی۔ وہی اس جماعت کے امیر یا مرکزی کردار تھے۔ بعد میں جب انہوں نے کسی مصلحت کے تحت اس جماعت کا نام ''اسلام لیگ'' رکھ دیا تو وہ لوگ جنہیں علامہ مشرقی پر اعتماد تھا، نئی جماعت میں کام کرنے لگے اور انہیں اعتراض کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

1935ء میں لندن سے واپسی پر قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے امکان سے بالکل مایوس ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم پر دی اور مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، جلد ہی ان پر واضح ہو گیا کہ مسلمان صرف اسلامی نظریہ حیات ہی کو اپنی منزل قرار دے سکتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور نصب العین پر اکٹھا نہیں ہوسکتا، چنانچہ یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ علمائے اسلام کو ساتھ لیے بغیر مسلمانوں کو منظّم کرنے کی مہم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ 1943ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں نواب محمد اسمٰعیل کی قیادت میں ایک کمیٹی علما سے رابطہ قائم کرنے کے لیے قائم کی گئی۔ کمیٹی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دی، وہ خود تو علالت کی بنا پر نہ آ سکے لیکن انہوں نے مولانا ظفر احمد تھانوی کو اپنی جگہ نمائندگی کے لیے بھیجا۔ مولانا ظفر احمد تھانوی نے قائداعظم سے بات چیت کی، قائداعظم ان کی گفتگو سے متاثر ہوئے اور اگلے روز کے

اجلاس میں یہ بات کھلم کھلا کہی کہ مذہب اور سیاست جدا نہیں ہو سکتے۔ اس وقت سے قائداعظم کی تقریروں کا رنگ بدل گیا۔

جولائی 1944ء میں مولانا تھانوی کی تجویز پر جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت العلما اسلام کے قیام کا اعلان ہوا جس کے صدر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور نائب صدر مولانا ظفر احمد تھانوی تھے۔ انہی دنوں ایک بار دہلی کے ایک تاجر نے قائداعظم سے کہا ''کانگریس کے ساتھ بہت سے علما ہیں، آپ کے ساتھ بہت تھوڑے ہیں''۔ اس پر قائداعظم نے بے ساختہ کہا ''مسلم لیگ کے پاس ایک ہی اتنے بڑے عالم ہیں جن کا علم اور تقدس اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور کانگریس کے تمام علما کا تقویٰ، تقدس اور علم دوسرے پلڑے میں تو اول الذکر ہی کا پلڑا بھاری رہے گا''۔ قائد اعظم کی مراد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے تھی۔

اکتوبر 1945ء میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک واضح اعلان میں مسلم لیگ کے متعلق فرمایا:

- ''آج ہندوستان میں مسلم لیگ کلمہ گو مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں ہزار عیب سہی تاہم غیر مسلم جماعتوں کی نسبت وہ ہم سے زیادہ قریب اور ہمارے لیے زیادہ مفید ہے۔ اس وقت وہ جس اصول پر الیکشن لڑ رہی ہے، وہ عقلی اور شرعی حیثیت سے بالکل واضح ہے۔ اگر (خدانخواستہ) مسلم لیگ ہار گئی تو قوی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول شاید ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے اور مسلمانوں کے سیاسی اور قومی استقلال کا مطالبہ ہندوستان میں پھر سنائی نہ دے۔ اس لیے وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے ہاتھ مضبوط کریں''۔

قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق آپ نے کہا:

- ''جہاں تک اپنی بساط کے مطابق اندازہ کر سکا ہوں، مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح آج کل کی سیاست کے داؤ پیچ سے سب مسلمانوں سے زیادہ واقف ہے۔ پھر نہ وہ کسی قیمت پر خریدا نہ جا سکتا ہے اور نہ کسی دباؤ کے آگے سر جھکا سکتا ہے''۔

7 دسمبر 1945ء کو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد

سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے کانگریسی علما مولانا شبیر احمد عثمانی سے ان کے مکان پر جا کر ملے۔ مولانا عثمانی نے ان کے سوالات بغور سنے اور جواب دیا۔

- ''میں نے جو رائے پاکستان کے متعلق قائم کی ہے، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے مفید ہے''۔

اس اعتراض پر کہ مسلم لیگ میں سرکاری آدمی ہیں، علامہ عثمانی نے فرمایا:

- ''مسٹر جناح کے متعلق میرا گمان نہیں کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا کسی دباؤ یا لالچ میں آسکتے ہیں یا کسی قیمت پر خریدے جاسکتے ہیں''۔

نومبر 1945 میں علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام مرشد خطیب جامع عالمگیری لاہور اور دوسرے علما نے کلکتہ میں ایک عظیم الشان علما کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں متفقہ طور پر مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا اور ایک قرارداد کے ذریعے مسلم ووٹروں سے اپیل کی کہ مسلم لیگ کے نمائندے کے سوا کسی دوسری جماعت کے نمائندے کو ووٹ دینا اتحاد ملت، مفاد ملت، استقلال اسلام اور شان اسلام کے خلاف ہے کیونکہ پاکستان کے سوال کا فیصلہ بڑی حد تک ان انتخابات کے نتائج پر مبنی ہے۔

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے۔ یہاں پر مسلم لیگ کی ابتدا ہی علما کے ہاتھ سے ہوئی تھی۔ 1937ء میں پشاور کے مولانا فضل صمدانی، سید سلطان احمد خادم کعبہ، نوشہرہ کے مولانا شاکر اللہ، مردان کے مولانا محمد شعیب اور دوسرے کئی علما نے مسلم لیگ کی تنظیم نو میں بھرپور حصہ لیا تھا، ہزارہ میں مولانا محمد اسحٰق، مولانا غلام ربانی لودھی، حکیم عبدالسلام اور اسی طرح باقی مقامات کے کئی علما مسلم لیگ کی حمایت میں میدان میں اُتر آئے تھے۔ تاہم مسلم لیگ کو اگر صحیح معنوں میں صوبہ سرحد میں تقویت ملی تو وہ شیخ الفاضل پیر محمد امین الحسنات آف مانکی شریف کی شمولیت سے ملی۔ پیر امین الحسنات دربار مانکی شریف کے چوتھے گدی نشین تھے، ان کے جد امجد (پہلے پیر صاحب) کا نام

حضرت عبدالوہاب علیہ الرحمۃ تھا، ان کے فرزند حضرت عبدالحقؒ دوم پیر اور ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمۃ تیسرے پیر تھے، حضرت امین الحسنات علیہ الرحمۃ نے فروری 1922ء میں ولادت پائی اور دس سال ہی کی عمر سے گدی نشین ہو گئے۔ بے حد صاحبِ فراست انسان تھے۔ ان کے ہزاروں مرید سارے صوبے میں پھیلے ہوئے تھے اور مرید بھی ایسے جو مرشد پر جان تک چھڑکنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ جب پیر صاحبؒ نے مسلم لیگ کا اعلان کیا تو سب مریدوں نے بھی ان کا ساتھ دیا، انہی لوگوں کی بدولت مسلم لیگ کا پیغام گاؤں گاؤں پہنچا اور انہی کی وجہ سے مسلم لیگ نے صوبہ سرحد میں اتنی تقویت پائی کہ کانگریسیوں کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا یارا نہ رہا۔

9 اکتوبر 1945ء کو صوبہ سرحد اور پنجاب کے پیروں، سجادہ نشینوں، صوفیوں اور روحانی پیشواؤں کا اہم اجلاس پشاور میں ہوا۔ تمام علما اور صلحا نے جو اجلاس میں شریک تھے، متفقہ طور پر مسلم لیگ سے وفاداری اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر کامل اعتماد کا اظہار کیا۔ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے سجادہ نشین مانکی شریف جناب پیر محمد امین الحسناتؒ نے کہا:

- ''اس وقت مسلمانوں کو باہمی اتحاد اور اعتماد کی سخت ضرورت ہے۔ ہر مسلمان کو حصول پاکستان کے لیے پوری جدوجہد کرنی چاہیے جہاں وہ عزت اور آزادی سے رہ سکیں گے۔ حصول پاکستان کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا کہ ہر مسلمان مسلم لیگ میں شریک ہو۔ کیوں کہ صرف مسلم لیگ ہی ایسی جماعت ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے کوشاں ہے''۔

پیر صاحب مانکی شریف کے اتباع میں صوبہ سرحد کے علما و مشائخ کی کافی تعداد مسلم لیگ کی حامی اور نظریہ پاکستان کی موئید ہوگئی۔ یہاں تک کہ قبائلی علاقہ کے سرکردہ علما نے بھی اکھنڈ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کی حمایت کی۔ انہی دنوں تحصیل صوابی مردان کے معززین اور علما کے ایک منظّم گروہ کی مسلم لیگ میں شمولیت سے سارے علاقے میں فضا پلٹ گئی۔ نواں کلی صوابی کے خان روشن خان نے پہلے پہل کانگریس تحریک میں نمایاں حصہ لیا تھا لیکن بعد میں

جب گاندھی جی نے براہ راست صوبہ سرحد کے خدائی خدمتگاروں کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تو روشن خان نے کانگریس سے تعلق توڑ کر ''انجمن بیداری پختون'' یا ''ویخ بہ پختون انجمن'' بنالی۔ اس جماعت کے راہنما خان عبدالغفار خاں سے مطالبہ کرتے تھے کہ کانگریسی حکومت اسلامی احکام پر عملدرآمد کرے، زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کا اہتمام کرے۔ غیر اسلامی رسم و رواج پر پابندی لگائے اور اسلامی حقوق کی حفاظت کا اہتمام کرے۔ سرحدی کانگریس اس تنقید کو برداشت نہ کرتی تھی۔ بالآخر جب لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی جس میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا تاکہ وہاں مسلمان اپنی مذہبی، تمدنی اور تہذیبی روایات کے مطابق زندگی گزار سکیں، تو خان روشن خان اور اُن کے دردمند ساتھیوں مولانا بخت جمال خان، مولانا محمد اسرائیل خان، میاں سخاوت شاہ، مولانا محمد ارشاد ترلاندی، یعقوب خان اور مولانا عمر خان گوجر گڑھی نے اجتماعی طور پر مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا، جہاں خان روشن خان نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی فروغ و اشاعت کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ وہیں ان کے عالم و فاضل ساتھیوں نے دن رات تحریر و تقریر سے مسلم لیگ کو اپنے علاقے کی مقبول ترین جماعت بنا دیا۔ یہ سب کارکن اپنے زورِ عمل سے مطلع سیاست پر چھا گئے بلکہ خان بخت جمال خان تو صوبائی مسلم لیگ کے صدر تک منتخب ہو گئے۔

1945ء کے آخر میں قائداعظم محمد علی جناح نے بنفس نفیس صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو صوبے میں مسلم لیگ اور بھی مستحکم ہو گئی۔ علما کے وفد آتے اور قائداعظم سے مل کر اپنی تسلی کراتے۔ بات یہ تھی کہ کانگریس اور اس کا ساتھ دینے والے علما نے قائداعظم کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بہت شکوک و شبہات پیدا کر رکھے تھے۔ ایک بار قائداعظم سرحد کے ایک شہر کا دورہ کر رہے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر بھی ان کے ساتھ تھے۔ علمائے سرحد کا ایک وفد قائداعظم سے ملنے آیا، انہوں نے طرح طرح کے سوال پوچھے۔ ایک صاحب نے کہا، ''قائداعظم! آپ علمائے کرام کے معیارِ قیادت پر پورا نہیں اترتے۔ پھر آخر اتنے بہت علما آپ کا کس لیے ساتھ دے رہے ہیں؟''

قائداعظم مسکرائے اور جواب دیا:

''ٹھیک ہے بعض علما اپنا معیار قیادت جن اصولوں کی بنا پر متعین کرتے ہیں، میں اس پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن سبھی علمائے دین اس بات پر متفق ہیں کہ میں قوم کو کسی قیمت پر بیچوں گا نہیں''۔

قائداعظم کی یہ صاف گوئی اور ان کے کردار کی پختگی واقعی ہر صاحب نظر مسلمان کو متاثر ضرور کرتی تھی۔ تعجب کی بات اور خدا کی دین ہے کہ اس سے قبل مسلمانانِ ہند کے جتنے بھی راہنما تھے، وہ متشرع اور باریش بزرگ تھے، یہاں تک کہ محمد علی جوہر اور علامہ عنایت اللہ خان جیسے اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور سالہا سال انگلستان میں رہ کر آنے والے زعیم بھی جب عوامی سیاست کے میدان میں آئے تو مولانا بن کر ہی آئے۔ یہی حال مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی اور مولانا شوکت علی خان کا تھا، سبھی یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ تھے لیکن مسلمانوں کی سیاست میں آئے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر درویش صفت بن کر آئے۔ تاہم ان راہنماؤں کو قبولیت عامہ کی وہ سند نہ مل سکی جو قائداعظم کو ملی اور کامیابی کا جو تاج قائداعظم محمد علی جناح کے سر پر رکھا جانے والا تھا، وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہو سکا۔

3 جون **1947**ء کے اعلان کے مطابق صوبہ سرحد کو اختیار دیا گیا تھا کہ یہاں کے عوام چاہیں تو پاکستان کا ساتھ دیں اور چاہیں تو اکھنڈ بھارت کا ...... بڑا پریشان کن مسئلہ تھا، صوبہ سرحد میں اس وقت کانگریسی حکومت برسراقتدار تھی جو ہر طرح ریفرنڈم پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ خدائی خدمتگار تحریک اسی صوبے میں پیدا ہوئی اور پھلی پھولی تھی۔ اس کے بانی خان عبدالغفار خاں تیس سال سے براہ راست عوام سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسی صوبے کے فرزند تھے اور دیہاتی عوام سے انہی کی زبان میں بات چیت کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس قائداعظم محمد علی جناح اگرچہ بین الاقوامی شہرت کے پارلیمنٹرین اور سیاست دان تھے لیکن انہیں صوبہ سرحد میں کام کرنے کا موقع نہ ملا تھا، یہ درست ہے کہ انہوں نے صوبہ سرحد کو آئینی حقوق دلانے کے لیے طویل جنگ کی تھی اور ہر موقع پر صوبہ سرحد کی پسماندگی کو دور

کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے ان احسانات کی قدر صرف پڑھے لکھے اور اخبار بین طبقے کو تھی، عوام ان کی خدمات سے نا آشنا تھے۔ اس لیے استصواب رائے عامہ (ریفرنڈم) میں کامیابی کچھ آسان کام نہ تھا اور قائداعظم کو صورتِ حال کا پورا علم تھا۔

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کی تیاری کے سلسلے میں علمائے اسلام کی کوششوں کی بہت ضرورت تھی۔ اس امر کے پیش نظر قائداعظم نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو مشورے کے لیے بلایا۔ 11 جون 1947ء کو مولانا عثمانی نے قائد اعظم سے ملاقات کی، ملاقات میں قائداعظم نے سرحد اور سلہٹ میں ہونے والے ریفرنڈم کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اس پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے قائداعظم کو فرمایا ''اگر آپ اعلان کر دیں کہ ملک کا قانون اسلامی ہوگا تو یہ دونوں علاقے یقیناً پاکستان میں شامل ہو جائیں گے''۔ قائداعظم نے فرمایا۔ ''میں تو کئی بار اس کا اعلان کر چکا ہوں کہ پاکستان کا دستور قرآن وسنت کے مطابق ہوگا''۔ اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے وعدہ کیا کہ میں صوبہ سرحد کا دورہ کروں گا اور پاکستان کے حق میں فضا ہموار کروں گا۔ قربان جائیے علمائے حق کی شان کے۔ علامہ عثمانی نے برملا قائداعظم سے وعدہ لیا کہ وہ اسلامی دستور کو اپنائیں گے اور کوئی شرط قطعاً نہ رکھی۔ اس کے مقابلے میں کانگریس کا ساتھ دینے والے جید سے جید علما میں سے کیا کوئی ایسا تھا جو پنڈت نہرو سے یا کم سے کم ڈاکٹر خان صاحب سے یہ مطالبہ کرتا کہ مسلمانوں کے لیے آپ جو دستور بنائیں، وہ شریعت محمدی کے مطابق ہونا لازم ہے۔ کانگریس اعلانیہ کہتی تھی کہ ہماری سیاست لادینی یا سیکولرازم پر مبنی ہوگی۔ اس کے باوجود یہ صاحبان مسند وارشاد کانگریس کا ساتھ دیتے تھے، حالانکہ آزادئ وطن کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ کانگریس کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے تمام وعدے غلط تھے اور کانگریس نے محض متحدہ قومیت کا بہروپ بھرنے کے لیے مسلمانوں کو ساتھ ملا رکھا تھا، آزادی کے بعد مطلب نکل گیا تو نام نہاد قوم پرست علما کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیسے کانگریس پرست، جنھوں نے پاکستان کے بجائے ہندوستان ہی کو اپنا مستقل وطن بنانے کا فیصلہ کیا، اپنی خودنوشت میں اپنی بے بسی کی داستان سناتے ہیں:

❑ ''میرے چچا مولانا مفتی محمد نعیم نے سٹی کانگریس (لدھیانہ) کے صدر کی حیثیت سے غازی عبدالرحمٰن عرف مانا، مسٹر مظہر جمیل اور کانگریس کے رضا کاروں کے ساتھ شاہی مسجد متصل کمیٹی باغ لدھیانہ میں ہزاروں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سامنے حلف وفاداری پڑھا اور میں نے مسجد پر کانگریسی جھنڈا لہرایا مگر افسوس کہ اس شاہی مسجد کو، جو 26 جنوری 1929ء کے یوم آزادی کی یادگار تھی، 1947ء میں گرا کر اس پر گوردوارہ تعمیر کر دیا گیا''۔

یہ صلہ تھا متحدہ قومیت کے مبلغ مسلمانوں کی خدمات کا، سارے بھارتی پنجاب میں چند ہزار مسلمان رہ گئے ہیں لیکن کانگریسی حکومت انہیں بھی برداشت نہیں کر سکتی، اگر سارے ہندوستان پر ہندو اقتدار قائم ہو جاتا تو پھر کروڑوں مسلمانوں کا حشر کیا ہوتا؟ مولانا حبیب الرحمٰن کی خودنوشت سوانح حیات کانگریس کی قوم پرستی کے دعوؤں پر ایک تازیانہ اور ہندو سکھوں کے وحشیانہ مظالم کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے، کتاب میں ایک جگہ رونا رویا گیا ہے کہ:

❑ ''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، علی محمد پاسلوی، شاعر فضل حق نے 15 اگست ہندوستان کے جشن آزادی پر دلی خوشیاں منائیں لیکن ان کا حشر کیا ہوا؟ ہندو سکھ ان کے قتل کے لیے مارے مارے پھرتے رہے۔ کئی ایک کو تہ تیغ کیا۔ کئی پاکستان جانے پر مجبور ہوگئے۔ یہ لوگ (کانگریسی مسلمان لیڈر) مشرقی پنجاب کے کانگریسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر گوپی چند سے ملاقات کو گئے تو انہوں نے ملاقات کے لیے وقت تک نہ دیا''۔

اور تو اور علمائے دیوبند نے ہمیشہ متحدہ ہندوستانی قومیت کی حمایت کی تھی، مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے ممتاز اساتذہ دیوبند نے عملاً میدان میں نکل کر کانگریس کے لیے کام کیا تھا لیکن جب ہندو کو حکومت ملی تو اسی دارالعلوم دیوبند کی تلاشی لی گئی اور الزام لگایا گیا کہ یہ مدرسہ بھارتی حکومت کے خلاف سازشوں اور جاسوسی کا اڈہ ہے، اس پر کانگریس کے حامی علما کو پسینہ ہی تو آ گیا ہوگا؟ خیر دیوبند والوں نے کوئی احتجاج کیا ہو یا نہ، جوش ملیح آبادی کی اسلامی حمیت اس بے عزتی کو گوارا نہ کر سکی اور

انہوں نے ہندو اکثریت کو برملا للکارا:

ہم ہیں غدار تو پابند وفا تم بھی نہیں
اپنی کثرت پہ نہ اتراؤ خدا تم بھی نہیں

ہندو تو خیر ہندو تھے، صوبہ سرحد میں بھی یہ تماشا دیکھنے میں آیا کہ یہاں کی کانگریس، جمعیت العلما ہند اور مجلس احرار سے تعلق رکھنے والے علما سے اپنا پروپیگنڈا کراتے نہ تھکتی لیکن جب یہ علما اپنے حقوق مانگتے تو کانگریس ان کی بیخ کنی پر تیار ہو جاتی۔ 1938ء میں پشاور میں چودھری افضل حق کی صدارت میں کل ہند احرار کانفرنس منعقد ہوئی تھی جسے ناکام بنانے کے لیے سرخ پوشوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اسمبلی کے انتخاب میں کانگریسی امیدواروں نے بڑے سے بڑے احرار لیڈروں کا مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ مولانا غلام غوث ہزاروی اور حکیم عبدالسلام کے مقابلے میں کانگریس کے معمولی کارکنوں کو ٹکٹ دیئے گئے، حالانکہ ان دنوں مولانا غلام غوث ہزاروی اور ان کے ساتھی علما نے سرحدی کانگریس کی اعلانیہ حمایت کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر خان صاحب نے کانگریسی وزیر اعلیٰ کے طور مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی تک کو جیل میں ڈال دیا۔ حالانکہ مفتی سرحد اور ان کے خاندان نے ہمیشہ متحدہ قومیت کے علمبردار کانگریسیوں کا ساتھ دیا تھا۔

بہرحال یہ قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے ہندو کانگریس کے عزائم کو بھانپ کر مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم پر زور دیا اور بتا دیا کہ ہندو ہندو ہے اور مسلمان مسلمان۔ دونوں کبھی ایک قومیت میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو مسلمانوں نے اعلانیہ اپنے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا، اس قرارداد نے جہاں مسلمان عوام کو ایک نیا جوش اور جذبہ عطا کیا، وہیں علمائے اسلام بھی تحریک پاکستان کے سلسلے میں میدان عمل میں اتر پڑے۔ فرنگی محل اور بدایوں کے نامور علما آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ ممتاز عالم دین مولانا عبدالحامد بدایونی نے اپنے ساتھیوں کو لے کر صوبہ سرحد کا دورہ کیا، اس دورے کا حال انہوں نے یوں بیان کیا ہے:

❑ ''قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت نے اس قدر زور پکڑا کہ برصغیر کے ہر شہر، قصبے، گاؤں حتیٰ کہ گلی کوچے تک میں سیاسی جلسے

ہونے لگے۔ انگریز اور ہندو تو مخالف تھے ہی خود مسلمانوں کے کئی طبقے اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان مخالفین میں پنجاب کی مجلس احرار، سرحد کی سرخپوش تنظیم اور جمعیت العلمائے ہند سے تعلق رکھنے والے کانگریسی علما قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا گٹھ جوڑ ہو گیا، اور کانگریس انہیں لے کر مسلم لیگ کے مقابلے پر اتر آتی اور سارے برصغیر میں کھلی جنگ شروع ہو گئی''۔

❑ ''ان علما اور مشائخ نے جو مسلم لیگ کے ساتھ تھے، اس یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور آگے چل کر جب عام انتخابات کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ہمیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ہماری کسی حد تک مخالفت کی گئی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں صوبہ سرحد میں کانگریس (ڈاکٹر خان صاحب) کی وزارت تھی اور سرخپوشوں نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ مسلم لیگی کارکنوں کے قافلے جب تحریک پاکستان کی تبلیغ کے لیے وہاں پہنچتے تو ان پر مسجدوں تک کے دروازے بند کر دیئے جاتے، بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے بھوکا پیاسا پھرنا اور کام کرنا پڑتا۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ جب میں علما اور کارکنوں کے ساتھ ٹوپی (ضلع مردان) کے مقام پر پہنچا تو مسجد میں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ سرخ پوش قائدین اور ان کے رضاکاروں کے ہجوم نے ہم سے پوچھا کہ ہم سرحد کیوں آتے ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ مسجد کا دروازہ ہمارے لیے کھولیں اور چند افراد مقرر کر لیں جو پاکستان کے بارے میں جتنے سوال بھی پوچھیں گے، ہم ان کا جواب دیں گے۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل ہوا۔ مسجد میں بہت بڑا اجتماع تھا۔ سرخ پوشوں نے جو جو سوال اٹھائے، میں نے ان کے اطمینان بخش جواب دیئے بلکہ اور بھی بہت سے سوال قائم کر کے جواب دیے۔ اس اجتماع نے کتنا فائدہ پہنچایا، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عام انتخابات میں ٹوپی سے مسلم لیگ کو ستر فیصد ووٹ ملے۔ یہی حال صوبہ سرحد کے دوسرے حصوں کا تھا''۔

کانگریس اور کانگریسی علما کے پاس لے دے کے ایک حربہ تھا کہ جو کوئی ان کے نظریہ ہندوستانی قومیت کی مخالفت کرتا یا مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتا، اسے فرقہ پرست ہونے کا طعنہ دیا جاتا، لیکن اہل حق ایسے طعنوں سے آج تک ڈرے

ہیں نہ ڈریں گے۔ چنانچہ جب علامہ شبیر احمد عثمانی پر فرقہ پرستی کا الزام عائد ہوا تو انہوں نے اس کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا:

- ''میں اپنے لیے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کرسکتا''۔

اس موقع پر انہوں نے شاعر اسلام اکبر الہ آبادی کے یہ شعر پڑھے:

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی
لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں، اہل حرم، اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی
پختہ ہو کر اپنی شاخ و بن سے ہوتا ہے جدا
اے ثمر! چشم محبت میں تری خامی بھلی

چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی اور ان کے دوسرے مخلص ساتھیوں نے کسی مخالفت اور دشمنی کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا ملی فرض ادا کیا بلکہ علامہ عثمانیؒ نے دوسرے علمائے اسلام کو بھی دعوت حق دیتے ہوئے کہا:

- ''تمام علما و مشائخ اب حجروں سے باہر نکل آئیں۔ عملی طور پر مسلمانوں کی راہنمائی کریں اور انہیں حصول پاکستان کے قابل بنائیں''۔

قائداعظم کی خواہش کی تعمیل میں علامہ شبیر احمد عثمانی بہت سے دوسرے علما کو ساتھ لے کر ریفرنڈم سے پہلے پشاور پہنچے اور انہوں نے صوبہ سرحد کے ایک ایک مقام پر جا کر لوگوں کی راہنمائی کا فرض انجام دیا۔ ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمان طاقت پکڑیں اور ایک ایسا خطہ ارض حاصل کرسکیں جس پر اسلامی پرچم لہراتا ہو اور جہاں اسلامی اقدار پر عمل درآمد ہو۔ ان کا مقصد صرف خوشنودی خدا اور غلبہ دین تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے ایک سالانہ اجلاس میں انہوں نے مسلم لیگیوں کو نصیحت کی کہ:

''مسلم لیگ خدا کا لشکر بن جائے''۔

اس خدائی لشکر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے جب یہ علمائے کرام پشاور

پہنچے تو ان کی بڑی عزت وتوقیر کی گئی۔ 30 جون 1947ء کو ایک بہت بڑا اور یادگار جلسہ عام چوک یادگار پر پشاور مسلم لیگ کی طرف سے خان فدا محمد خان کی صدارت میں ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صدر جمعیت العلمائے اسلام نے فرمایا:

❑ ''مسلمان قوم اس وقت تک زندہ و پائندہ رہے گی جب تک یہ نظام دنیا برقرار ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو بہار اور گڑھ مکتیشر کے واقعات (جس میں ہزاروں بے گناہ مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوئے) سے ختم کیا جا سکتا ہے تو وہ بیوقوف اور احمق ہے۔ مسلمان اس سے بھی زیادہ طوفان انگیز انقلابوں سے گزر چکی ہے اور اس قسم کی بیسیوں خون آشام آزمائشوں میں کامیاب اور سرخرو رہی ہے۔ اس قوم کو جس قدر کچلا گیا، یہ اتنی ہی طاقتور ہوتی گئی''۔

علامہ عثمانی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

❑ ''وقت آئے گا جب اسلام چار دانگ عالم میں پھیل جائے گا اور تمام ذی ہوش انسان حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے''۔

انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی صفوں کو مضبوط بنائیں اور خود کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں منسلک کریں۔

خان عبدالغفار خان اور ان کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ عثمانی نے فرمایا:

❑ ''اگر خان عبدالغفار خان اپنے عقیدے کے ساتھ مخلص ہیں اور صوبہ سرحد میں اسلامی شریعت کے مطابق جمہوری حکومت کا قیام چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ اس طرح وہ پاکستان کو زیادہ مضبوط اور طاقتور بنا سکتے ہیں''۔

ان علمائے حق نے بار بار مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ مشرکوں کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوں بلکہ انہیں اسلامی جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ ان علما کا علم و فضل، زہد و تقدس اور دیانت و امانت مسلمہ تھی، اس لیے صوبہ سرحد کے علما بھی ان کی باتوں سے متاثر ہوئے اور وہ جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہوتے گئے اور جو شامل نہ بھی ہوئے، وہ نظریہ پاکستان کے مبلغ ضرور بن گئے۔ پیر صاحب مانکی شریف، پیر

صاحب زکوڑی شریف اور دوسری سرکردہ ہستیوں کے ساتھ مل کر ان علما نے پاکستان کی جو خدمت کی، اللہ نے اسے قبول کیا اور بالآخر دنیا کی یہ اسلامی سلطنت قائم ہو کر رہی۔

قائداعظمؒ ان علمائے حق کی خدمات کے دلی قدردان تھے۔ چنانچہ جب صوبہ سرحد میں مسلم لیگ نے ریفرنڈم میں شاندار فتح پائی تو علامہ عثمانی نے، جو اس وقت تک صوبہ سرحد ہی میں قیام فرما تھے، قائداعظم کو مبارک کا تار ارسال کیا جس کے جواب میں قائداعظم نے لکھا:

- ''مولانا! اس مبارکباد کے اصل مستحق تو آپ ہی ہیں''۔

قائداعظم محمد علی جناح کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت بھی مولانا شبیر احمد عثمانی ہی کے حصے میں آئی اور بعد میں ''قرارداد مقاصد'' منظور کرا کر انہوں نے یہ ضمانت حاصل کی کہ اس ملک کا دستور قرآن وسنت ہی پر مبنی ہوگا۔

میاں محمد افضل

قائداعظم کا اسلامی تشخص

کیا قائداعظم ایک مذہب بیزار اور سیکولر لبرل شخصیت تھے؟ کیا عقائد کے حوالے سے وہ ایک معما یا چیستان تھے؟ یہ باتیں ہمیں عام طور پر ہندوستانی مصنفین یا بعض بزعم خود لبرل پاکستانی مصنفین کے ہاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ بعض حضرات، قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی، سیاق وسباق اور قائداعظم کی اپنی وضاحت سے ہٹ کر اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ گویا قائداعظم تو صرف پاکستان حاصل کرنے کے لیے دوقومی نظریے اور علیحدہ مسلم شناخت کی بات کر رہے تھے، ورنہ وہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق کے کبھی قائل نہ تھے۔ شاید، ہر عظیم شخصیت کی طرح قائداعظم بھی ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں ہر شخص کو وہی صورت نظر آتی ہے جو دراصل اس کی اپنی ہوتی ہے۔

قائداعظم نجی محفلوں اور عام جلسوں میں اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے انھیں خاص شغف تھا، اکثر پکتھال کا انگریزی ترجمہ زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ مختلف مواقع پر انھیں تحفے میں قرآن حکیم کے نسخے پیش کیے جاتے تھے جنھیں وہ شوق سے قبول کرتے۔ سیرتِ نبویﷺ اور چاروں خلفائے راشدین کی سوانح عمریاں (انگریزی میں) بھی اُن کی لائبریری میں موجود تھیں اور ان کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ قائداعظم اور ان کی روزمرہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے والے اُن کے آرمی اے ڈی سی گل حسن خان نے لکھا ہے: ''انھوں (قائد اعظم) نے قرآن کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، وہ نہ تو تنگ نظر تھے اور نہ ہی کٹر قسم کے متعصب انسان، انھوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ ایک مذہبی مسلمان ہیں۔ یہ کسی کو

بتانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جناح ایک قابل رشک اور بلند اصولوں کے حامل انسان تھے۔ وہ سراپا ایمان تھے''۔مشہور صحافی انعام عزیز نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے جب وہ دہلی کے اینگلو عربیک کالج میں پڑھتے تھے، قائداعظم ،مسلمان کھلاڑیوں کی دو ٹیموں کے درمیان فٹ بال میچ کا افتتاح کرنے فیروز کوٹلہ گراؤنڈ تشریف لائے۔ وہ بھی اُن کا استقبال کرنے والے نوجوانوں میں شامل تھے۔ انعام عزیز کی خوش قسمتی کہ قائداعظم نے اُن سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا کہ وہ شامیانے میں اُن کے ساتھ صوفے پر بیٹھیں۔قائداعظم کو نوجوانوں سے گفتگو کرنا ہمیشہ پسند تھا۔ قائداعظم نے انعام عزیز سے پوچھا: ''کیا تم ابھی سکول میں پڑھتے ہو؟'' انعام عزیز نے کہا: ''سر، میں کالج میں ہوں''۔ پھر پوچھا: ''کون سے کالج میں؟'' اس سوال کے جواب میں انعام عزیز نے جھوٹ بول دیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ قائداعظم اعلیٰ انگلش میڈیم ادارے کو پسند کرتے ہوں گے، انھوں نے کہا: ''سر، میں سینٹ سٹیفنز کالج میں پڑھتا ہوں''۔ان دنوں یہ دہلی کا سب سے اعلیٰ پرائیویٹ کالج تھا جس میں زیادہ تر غیر مسلم امیروں کے بچے پڑھتے تھے۔ انعام عزیز کی توقع کے برعکس قائداعظم کو اس جواب سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے کہا کہ مسلمان بچوں کو اس کالج میں نہیں پڑھنا چاہیے: ''یہ تو ایک افسوسناک بات ہوئی، کیا تم مسلمان نہیں ہو؟'' انعام عزیز نے جواب دیا: ''سر، میں مسلمان ہوں''۔ قائداعظم نے کہا: ''اگر تم مسلمان ہو تو پھر کسی اسلامی تعلیمی ادارے میں کیوں نہیں چلے جاتے ہو، یہاں مسلمانوں کے اینگلو عربیک کالج جیسے ادارے بھی تو ہیں؟'' اب انعام عزیز کے لیے یہ وعدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ تھا ورنہ قائداعظم نے مزید جرح کرنا تھی: ''سر، میں جلد ہی اپنا کالج بدل لوں گا''۔ بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ ہے مگر اس مکالمہ سے قائداعظم کی اسلامی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ جس انداز میں انھوں نے ایک مسلمان نوجوان کی اس بات پر سرزنش کی کہ اس نے ایک غیر مسلم مشنری ادارے میں داخلہ لے رکھا ہے، اس سے تو اُن کی اسلامی سوچ، بنیاد پرستی کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کیسے ''سیکولر''

لیڈر تھے جو ایک مسلمان طالب علم سے کہہ رہے تھے کہ اُسے غیر مسلموں کا تعلیمی ادارہ چھوڑ کر خالص مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اینگلو عربیک کالج وغیرہ میں داخل ہونا چاہیے۔

پروفیسر ضیاء الدین احمد نے اپنی کتاب The Architect of Pakistan کے دیباچے میں قائد اعظم پر سیکولر لبرل ہونے کے بے بنیاد اور جھوٹے الزام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اپریل 1942ء میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن کے موقع پر انھوں نے قائد اعظم سے دو تین گھنٹے کی ملاقات کی تھی اور موضوع بحث ایک مسلم ریاست میں اسلام کا عملی نفاذ تھا۔ قائد نے اس ملاقات میں اسلام، قرآن، حضرت محمد ﷺ کی قائم کردہ ابتدائی اسلامی ریاستِ مدینہ اور ریاست کے جمہوری نظام پر زور دیا جو انسانی حقوق، عدل و انصاف، رواداری، آزادی، مساوات اور بھائی چارہ کے اصول پر مبنی ہو۔ ''انھوں نے اپنی گفتگو میں سیکولرازم کے متعلق ایک لفظ تک نہیں بولا، اُن کی (اسلامی) شخصیت اور فکر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی تمام تقریروں اور بیانات کا مطالعہ کیا جائے جو انھوں نے مختلف مواقع پر دیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی بہت سی تقریروں اور تحریروں میں اسلام نمایاں نظر آتا ہے''۔ (ص xi) قائد اعظم کی نجی زندگی کے کئی واقعات سے اُن کی اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس سے شیفتگی اور محبت کا واضح اظہار ہوتا ہے۔ لندن کے لا سکول لنکنز ان میں انھوں نے داخلے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس کے بڑے دروازے پر پیغمبر اعظم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا پاکیزہ نام عظیم مقننوں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ انھی دنوں وہ لندن میں قائم مسلم سوسائٹی کے رکن بھی بنے۔ رتی سے وہ سول میرج بھی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ان کے اسلام قبول کرنے اور اسلامی طریقے سے عقد پر اصرار کیا۔ جب بیٹی دینا نے ایک غیر مسلم سے شادی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اس کو اس سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور مولانا شوکت علی کے ذریعے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دینا نے شادی کر لی تو کئی سال تک قائد اعظم نے اس سے رابطہ نہیں کیا اور ہمیشہ انھیں مسز واڈیا کے نام سے مخاطب کیا۔ بستر مرگ پر بھی بیٹی کو یاد

نہیں کیا۔ لندن میں گول میز کانفرنس کے دوران بادشاہ جارج ششم نے ہندوستانی لیڈروں کو دوپہر کے کھانے (لنچ) کی دعوت دی۔ ''قصر بکنگھم میں کسی ایرے غیرے کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ ہم نے نہیں سنا کہ کسی مہمان نے شرکت سے معذرت کی ہو، لیکن ہمارے راہنما (قائداعظم) یہ کہہ کر عذر خواہ ہوئے کہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے جس میں مسلمان روزے رکھتے ہیں''۔ انھوں نے رمضان کے احترام میں اور بظاہر روزے کی وجہ سے بادشاہی دعوت میں جانے سے انکار کر دیا۔

قائداعظم کو تمام مسلمانوں کی طرح 786 کا عدد بڑا پسند تھا کیونکہ یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا عدد کہلاتا ہے۔ اُن کی ایک کار کا نمبر 786 تھا۔ انھوں نے یہ کار بیچنے کا ارادہ کیا تو یہ نمبر کار کے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ کہ کار کے بیچنے میں دشواری اور تاخیر کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ بسم اللہ کا یہ اہم نمبر گاڑی کے ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ قائداعظم کو بے شمار لوگ اپنی کتابوں پر اظہارِ رائے اور فلیپ کے لیے چند جملے لکھ بھیجنے کے لیے درخواستیں کرتے تھے مگر قائداعظم احتراز کرتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک استاد محمد اعظم نے کارلائل کی مشہور تصنیف ''ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ'' کا اُردو میں ترجمہ کیا تو قائداعظم سے اس کے لیے چند الفاظ (بطور پیش لفظ) لکھنے کی درخواست کی۔ قائداعظم نے اپنے معمول کے خلاف اس کی یہ درخواست قبول کی۔ 26 اگست 1944ء کو اس کی طرف خط میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا کہ انھیں کارلائل اس لیے پسند ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں ''ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی زندگی کے حالات اور آپ ﷺ کے کارناموں کی سچی تصویر کھینچ کر نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری دنیا کی عظیم خدمت انجام دی ہے''۔ عطا ربانی نے بطور اے ڈی سی ٹو قائداعظم، اپنی یاد داشتوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پہلی عید الفطر 18 اگست 1947ء کو آئی تو قائداعظم عیدگاہ جانے اور نماز عید ادا کرنے کے لیے صبح سویرے ہی تیار ہو گئے۔ اب تک انھوں (عطا ربانی) نے قائداعظم کو بحیثیت ایک لیڈر، سیاستدان، مقنن، قانون دان اور ایک بڑے رکھ رکھاؤ والی شخصیت، دیکھا اور جانا تھا، اُس روز

انھیں ایک مذہبی انسان کے طور پر رمضان کے روزوں کی اہمیت اور حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے سنا تو ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ عید گاہ جاتے ہوئے انھوں نے عطا ربانی سے پوچھا کہ کتنے روزے رکھے تھے؟ ربانی نے بتایا کہ قریباً آدھا مہینہ روزے رکھے۔ اس پر قائداعظم نے ناخوشی کا اظہار کیا اور فرمایا: ''صرف آدھا مہینہ کیوں، پورا رمضان کیوں نہیں؟ تم جوان ہو اور صحت مند ہو! اب جبکہ تم ایک جگہ مقیم ہو چکے ہو تو تمھیں ان روزوں کے بدلے قضا روزے رکھنا چاہئیں جو رمضان میں نہیں رکھ سکے''۔ اس کے بعد قائداعظم نے روزوں کے روحانی اور جسمانی فوائد اور حکمت پر روشنی ڈالی۔ عطا ربانی کہتے ہیں کہ انھوں نے زندگی میں بڑے بڑے علما کی روزوں کے بارے میں تقریریں سنی ہیں مگر جس خوبصورت، مؤثر اور جامع انداز میں قائداعظم نے روزوں کے روحانی اور جسمانی فوائد اور فلسفے کی وضاحت کی، وہ اپنی مثال آپ تھی۔ آج اگر ہم کسی مسلمان نوجوان سے پوچھیں کہ کون سا اسلامی قمری سال جا رہا ہے تو وہ شاید ہی بتا سکے، بلکہ محرم، ربیع الاوّل اور رمضان کے سوا دیگر اسلامی مہینوں کے نام بھی بہت کم مسلمانوں کو آتے ہوں گے، لیکن روانی سے انگریزی بولنے والے اور بظاہر فرنگی رنگ میں رنگے قائداعظم کو اسلامی کیلنڈر کی پوری تفصیل اور ہر اسلامی مہینے سے منسوب اہم اسلامی تاریخی واقعات یاد ہوتے تھے۔ اسی لیے گاندھی کو کہا تھا کہ 21 رمضان کو مذاکرات نہیں ہوں گے۔

منشی عبدالرحمٰن خان نے ناقابل تردید ثبوتوں کے ساتھ لکھا ہے کہ جب مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے بزرگوں کو قدرت کی طرف سے یہ واضح اشارہ مل گیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ مملکت قائم ہوگی جس کی تحریک کی قیادت کوئی عبا پوش مولوی یا خانقاہ نشین صوفی نہیں بلکہ ایک انگریزی بولنے اور انگریزی لباس پہننے والے لیڈر (مسٹر جناح) کریں گے تو انھوں نے قائداعظم کی دینی تربیت کے لیے اپنے خاص لوگ اُن کی طرف بھیجنا شروع کیے، قائداعظم نے مولانا تھانویؒ کے ان وفدوں کی بخوبی پذیرائی کی۔ اسی طرح قائداعظم کی روحانی تربیت کے لیے بھی ایک شخصیت ''حضرت غازی'' کو مامور کیا گیا جو بظاہر ایک مقامی لیگی سیاست دان تھے۔ ممکن ہے کہ اس دینی

اور روحانی تربیت کا بھی اثر ہو کہ قائداعظم کی تحریک پاکستان کے دور میں تقریروں اور بیانات میں دعائیہ اور منکسرانہ انداز بہت نمایاں ہے۔ وہ بار بار ''ان شاء اللہ، الحمدللہ'' جیسے الفاظ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں کو ہمیشہ اللہ پر بھروسا کرنے اور اللہ ہی سے مدد طلب کرنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ ''آپ پر مذہبی رنگ اتنا غالب تھا کہ آپ کی ہر تقریر اور تحریر اسلام کے پیغام کی حامل ہوتی تھی۔ امارت و وجاہت، عزت و عظمت، محبوبیت و مقبولیت اور اختیار و اقتدار کے باوجود آپ ہمیشہ اپنی نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب پر رکھتے تھے، اسی لیے ہر میدان اور ہر محاذ پر مولا کریم کی دستگیری آپ کے شامل حال رہتی تھی''۔ (منشی عبدالرحمٰن خاں، ص113)۔ ستمبر 1939ء میں ایک بیان میں، جنگ عظیم دوم کے آغاز سے پیدا شدہ سنگین اور غیر یقینی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا: ''آیئے، ہم دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ، اس سنگین لمحے میں ہماری راہنمائی فرمائے تاکہ ہم درست فیصلے کرسکیں جو مسلم ہند کے بہترین مفاد میں ہوں''۔ اس سے پہلے جنوری 1938ء میں کلکتہ میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ لندن میں اپنی آسان اور آسودہ زندگی چھوڑ کر اس لیے واپس آئے ہیں کہ انھیں محسوس ہوا ہے کہ برصغیر کے مسلمان انتشار اور تباہی کے سنگین خطرے سے دوچار ہو چکے ہیں، انھیں اسلام اور مسلمان قوم سے اپنے تعلق پر فخر ہے۔ 6 اگست 1939ء کو بمبئی میں جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر مسلمانوں کے حقوق کا دفاع کرنے پر کوئی مجھے فرقہ پرور قرار دیتا ہے تو مجھے یہ بات منظور ہے، میں مسلمان پیدا ہوا، مسلمان ہوں اور مسلمان ہی مروں گا''۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظم سے پیغام کے لیے درخواست کی تھی۔ 4 اپریل 1943ء کو ان کے نام پیغام میں فرمایا: ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ میں آپ کو پیغام ارسال کروں۔ میں آپ کے لیے کیا پیغام دے سکتا ہوں؟ ہمارے لیے، ہماری راہنمائی اور ہماری تعلیم کے لیے، سب سے بڑا پیغام قرآن مجید میں موجود ہے۔ ان شاء اللہ اس جنگ میں فتح ہماری ہوگی''۔ مارچ 1944ء میں لاہور میں اسلامیہ کالج

برائے خواتین کی طالبات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''مسلم تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو ایسی تعلیم دیں جس سے وہ اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل ہوسکیں''۔ قائداعظم ہر عید پر مسلمانوں کے نام باقاعدگی سے پیغام جاری کرتے تھے۔ ان پیغاموں میں وہ روزوں یا قربانی کی حکمت اور مسلمانوں کی زندگی میں تقویٰ، ڈسپلن، اتحاد اور ایثار جیسی خوبیوں کے حوالے سے کسی عالم باعمل کی طرح مسلمانوں پر ان ایام، فرض روزوں اور قربانی کی سنت کی اہمیت واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید کے گہرے مطالعہ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف سے دینی تربیت کے نتیجے میں انھوں نے اپنے اس نظریے میں بھی تبدیلی کر لی تھی کہ اسلام ایک پرائیویٹ معاملہ یا چند عقائد اور عبادات کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے برملا کہنا شروع کیا: ''اسلام صرف چند عقائد و عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ سیاسیات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کا مجموعہ ہے، ہمیں ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا''۔ آہستہ آہستہ انھوں نے ہر وقت انگریزی لباس پہننے کی عادت بھی ترک کر دی اور مختلف تقریبات اور جلسوں میں قومی لباس میں نظر آنے لگے۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ دکھائی دی کہ قائداعظم نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے وفد سے کیے گئے وعدہ کے مطابق (وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرتے تھے) فرض نمازیں بھی پڑھنا شروع کر دیں، جمعہ اور عیدین کی نمازیں تو وہ پہلے بھی اکثر پڑھتے تھے، اب معمول کی پنج وقتہ نمازوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں متعدد معتبر شہادتیں ایسی موجود ہیں جن پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ منشی عبدالرحمٰن خاں نے مولانا حسرت موہانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''قائداعظم نہ صرف نماز پنجگانہ باقاعدگی سے پڑھنے لگے تھے بلکہ ''آپ کافی کافی دیر بند کمرے میں سربسجود رہتے تھے اور بلک بلک کر آہ و زاری کے ساتھ دعا کرتے تھے۔ میرے تصور میں ہر وقت قائداعظم کی وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے''۔ ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ منیر احمد منیر نے اپنی کتاب دی گریٹ لیڈر جلد اوّل میں بیان کیا ہے۔ منیر احمد منیر **1976**ء میں اپنے زیر ادارت میگزین ''آتش فشاں'' کا قائداعظم نمبر نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھیں کئی معتبر لوگوں نے بتایا کہ جب قائد

اعظم بطور گورنر جنرل، پشاور کے دورے پر آئے تھے تو ایک بٹلر نے انھیں رات گئے قرآن مجید کے سامنے سر جھکائے دعا مانگتے اور آنسو بہاتے دیکھا تھا۔منیر احمد چاہتے تھے کہ اس واقعہ کی تصدیق براہ راست خود اُسی بٹلر سے کر لیں جس کے حوالے سے یہ واقعہ گردش میں تھا۔ یہ شخص تھا گورنر ہاؤس پشاور کا سابق بٹلر عبدالرشید جو اُس وقت سوات میں اپنے چھوٹے سے گھر میں بستر علالت پر مفلوج حالت میں لیٹا تھا۔حقائق جاننے کی طلب منیر احمد منیر کو سوات لے گئی۔ پہلے تو وہ یہ معلوم کر کے مایوس ہوئے کہ عبدالرشید کی زبان بوجہ فالج بند ہو چکی تھی۔تاہم وہ سر کی جنبش سے سوالات کا ہاں یا ناں میں جواب دے سکتا تھا۔اس پر منیر صاحب کی ناامیدی اُمید میں بدل گئی۔اب ایک عجیب اور کراماتی واقعہ رونما ہوا جس کی وضاحت بڑا مشکل کام ہے۔عبدالرشید کی یادداشت چیک کرنے کے لیے انھوں نے پہلا سوال (اس کے بیٹے خوش دل خاں کے ذریعے) یہ پوچھا:''جب قائداعظم قرآن پڑھ رہے تھے تو وہ سلیپنگ سوٹ میں تھے نا؟'' سب لوگ اس کے سر کی جنبش کے منتظر تھے۔مگر یہ کیا؟ عبدالرشید، جن کی قوتِ گویائی فالج سے ختم ہو چکی تھی، قدرتِ خداوندی سے بول پڑا اور پوری قوت سے کہا ''نہیں''۔اس کے بعد اپنی زبان سے منیر احمد کے سوالات کے جواب میں پورا واقعہ اس طرح بیان کیا:''قائداعظم، پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرحد تشریف لائے تو میں گورنر ہاؤس پشاور میں بٹلر تھا، رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔میری ڈیوٹی اُن کے کمرے میں تھی اور جب وہ گھنٹی بجائیں اور انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فوراً پہنچ جاؤں۔اس اثنا میں دو تین دفعہ انھوں نے کبھی پانی اور کبھی چائے مانگی۔اس دوران میں، میں نے دیکھا وہ بیٹھے خوب کام کر رہے ہیں۔جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کمرے میں اِدھر اُدھر جاتے، میں نے خود دیکھا کہ انگیٹھی میں رحل میں قرآن پڑا ہے، اس پر ماتھا رکھ کر رو پڑتے ہیں، وہ شلوار اور اچکن میں ملبوس تھے، پھر اُسی رات، آدھی رات کا وقت تھا، ہر کوئی گہری نیند سو رہا تھا، ڈیوٹی پر موجود پولیس اپنا فرض ادا کر رہی تھی کہ اچانک ٹھک ٹھک کی آواز

گورنمنٹ ہاؤس کا سناٹا چیرنے لگی۔ آواز میں تسلسل اور ٹھہراؤ تھا، میں فوراً چوکس ہوا، یہ آواز قائد اعظم کے کمرے سے آ رہی تھی۔ ہمیں خیال آیا کہ اندر شاید کوئی چور گھس گیا ہے، ڈیوٹی پر موجود افسر ادھر آ گئے کہ اندر کسی طرح جھانکا جائے۔ ایک ہلکی سی درز سے اندر کی موومنٹ دیکھی جا سکتی تھی، ہم کیا دیکھتے ہیں کہ قائد اعظم انگیٹھی پر رکھے ہوئے قرآن مجید پر سر جھکائے کھڑے ہیں، چہرہ آنسوؤں سے تر ہے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں، اس کی کسی آیت کا مطالعہ کرنے کے بعد پھر چلنے لگتے ہیں، جب اُن کے پاؤں لکڑی کے فرش پر پڑتے ہیں تو وہ آواز پیدا ہوتی ہے جس نے ہم سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران وہ کوئی دعا بھی مانگ رہے تھے۔ عبدالرشید نے یہ بھی کہا کہ قائد اعظم کے دورے کے دوران میں، انھیں یہ واقعہ مشاہدہ کرنے کا اتفاق صرف ایک رات ہوا۔

سید صابر حسین بخاری نے اپنی کتاب (قائداعظم کا مسلک) میں مختلف شواہد اور حوالوں سے یہ بات لکھی ہے کہ قائداعظم خلوت میں عبادت اور مطالعہ قرآن کے عادی تھے، مساجد میں جاتے تھے تو عام لوگوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوتے۔ دسمبر 1946ء میں لندن گئے تو نماز جمعہ کے لیے لندن کے علاقے میں ایک ایسی مسجد ڈھونڈی جہاں عام طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان نمازیں پڑھتے تھے۔ ''قائداعظم، نہ صرف جلوت بلکہ خلوت میں بھی اپنی نمازیں باقاعدگی سے پڑھتے تھے، یہی نہیں بلکہ اپنے ملازمین کی نمازوں کا خیال رکھتے تھے۔ جب مسجد میں نماز پڑھتے تو اپنے ڈرائیور کو اپنے ساتھ کھڑا کرتے۔ ایک بار (اگست 1946ء) انھوں نے حاتم علوی (میئر کراچی) سے پوچھا: کیا تم روزے سے ہو؟ حاتم علوی نے جواب دیا: جی ہاں، سر۔ فرمایا: میں بھی سن شعور سے روزے رکھتا رہا ہوں لیکن اب صحت کمزور ہے، اس وجہ سے نہیں رکھ سکتا''۔

(قائداعظم کا مسلک از سید صابر حسین بخاری)

نماز ہو یا روزہ، یہ ظاہری عبادات ہیں، کسی شخص کی بطور مسلمان شناخت کے لیے ان کی بھی اہمیت ہے، تاہم ان کی حیثیت بیرونی پوست کی ہے، اسلام کا مغز ایمان

راسخ ہے اور اِس خوبی میں اُس دور کا کوئی اور مسلمان لیڈر شاید ہی قائد اعظم کا ہمسر ہو۔ ایمان راسخ و صادق ہی اُن کے مختلف اور عالیشان اعمال کی بنیاد تھا، اُن کے تصورات، سوچ اور نظریات کے پس پردہ بھی اُن کا یہی ایمان راسخ کار فرما تھا۔ گاندھی جی ایک طرف اپنے آپ کو مذہبی کہتے اور انسانوں کے اعمال کا سب سے بڑا محرک مذہب کو قرار دیتے اور دوسری طرف ہندوستان میں متحدہ قومیت پر اصرار کرتے۔ قائد اعظم نے خط و کتاب اور مذاکرات میں گاندھی جی کی فکر کے اس تضاد کی نشاندہی کی جس کا گاندھی جی کے پاس کوئی معقول جواب یا جواز موجود نہ تھا۔ قائد اعظم نے جب دو قومی نظریے کی بات کی اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا تو اس نظریے کے پیچھے اُن کا یہی اعتقاد تھا کہ مسلمانوں کی قومیت اور اتحاد کی واحد مضبوط بنیاد اسلام ہے۔ انھوں نے سیکولر ازم، کمیونزم، علاقائی ثقافت و زبان کی بنیاد پر کسی قسم کے ''ازم'' کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ فروری **1948**ء میں آسٹریلیا کے عوام کو پاکستان سے متعارف کرانے کے لیے انھوں نے ریڈیو آسٹریلیا پر ایک خوبصورت نشری تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ بظاہر پاکستان کے دونوں حصے ایک دوسرے سے طویل جغرافیائی فاصلے پر ہیں لیکن اس میں حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ دونوں حصوں کو متحد رکھنے کے لیے اسلام اور ایمان کی طاقت موجود ہے (جب اسلام اور ایمان کی حرارت ختم ہوئی اور شراب میں دھت رہنے والے حکمران پاکستان پر مسلط ہو گئے تو اغیار کی سازشیں کامیاب ہوگئیں اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا، اس سے قائد اعظم کے نظریہ کی نفی نہیں ہوتی، علاوہ ازیں بنگلہ دیش کون سا بھارت میں ضم ہو گیا ہے!) قائد اعظم کا سیاسی اور آئینی نظریہ یہ تھا کہ اسلام کے اصولوں کا عملی اطلاق ہونا چاہیے۔ **21** فروری **1948**ء کو ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگرچہ آئین بنانا آئین ساز اسمبلی کا کام ہے لیکن انھیں یقین ہے کہ اس میں جو جمہوری نظام بھی تجویز کیا جائے گا، اس میں ''اسلام کے ضروری اصولوں'' کو شامل کیا جائے گا۔ تاہم پاکستان ایسی ریاست نہیں ہو گا جسے چلانے والا صرف مذہبی پیشواؤں کا کوئی ٹولا ہو

(یعنی تھیوکریٹک سٹیٹ نہ ہوگا)۔ قائداعظم نے بار بار اپنی تقاریر میں کہا کہ اُن کے نزدیک اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور سیاست، معاشرت، معیشت سمیت زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ فروری 1943ء میں اسماعیل کالج بمبئی میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے، ''مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ، خواہ وہ سماجی ہو یا تہذیبی، سیاسی یا معاشی، احکام اسلامی کے تابع ہے۔ ہماری پاکستانی ریاست میں سماجی، ثقافتی اور معاشی نظام اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا، غیر مسلموں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام اپنے پیروکاروں کو انتہائی رواداری اور عدل کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کے ثقافتی، مذہبی، سیاسی اور معاشی حقوق کی بہتر اور مکمل حفاظت کی جائے گی''۔ کیا یہ اُن کے راسخ الایمان ہونے کی طرف اشارہ نہ تھا کہ انہوں نے اپنی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو اپنی وصیت میں نامزد کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ تاریخ کے جس نظریے کو مانتے تھے، وہ خاصیت کے اعتبار سے اسلامی تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کے بارے میں برطانوی اور ہندو مؤرخین کی رائے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ جب وہ انڈین نیشنل کانگریس میں تھے تب بھی اُن کا یہی نظریہ تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ 1913ء میں مسلم لیگ کی اضافی رکنیت قبول نہ کرتے، لکھنؤ پیکٹ نہ کراتے، سائمن کمیشن کی مخالفت نہ کرتے۔ انھیں اُس زمانے میں بھی مسلم ثقافتی حقائق کا مکمل ادراک تھا جب وہ سیاسی نقطہ نظر سے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ تاریخ کے اسی اسلامی شعور کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے مسلم اکثریت کے علاقے میں سندھ کی صوبہ بمبئی سے علیحدگی، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے علاقے میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح سیاسی اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا جبکہ خود کو ترقی پسند اور لبرل کہلانے والے کانگریسی لیڈر اور نہرو وغیرہ ان مطالبات اور سندھ کی بطور صوبہ الگ حیثیت کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ یہ مطالبات قائداعظم، تحریک پاکستان سے بہت پہلے کر رہے تھے۔ اگر سندھ الگ نہ ہوتا تو صوبہ بمبئی سے صرف پاکستان کے لیے اس کو بعد میں علیحدہ کرنا بہت

دشوار ہوتا کیونکہ برطانوی حکومت کو تو ہر حال میں کانگریس کی خوشنودی مطلوب تھی۔ تاریخ کے اسلامی نظریہ کے مطابق قائداعظم کا رُخ ہمیشہ عالم اسلام کی طرف رہا۔ قراردادِ پاکستان (مارچ 1940ء) منظور کراتے ہوئے وہ فلسطین کے معاملے پر قرارداد منظور کرانا نہیں بھولے تھے اور مسلم لیگ کو ہدایت جاری کی تھی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں یوم فلسطین منایا کرے۔ قاہرہ کانگریس برائے فلسطین کے لیے مسلم لیگ کی کمیٹی قائم کی، برطانیہ کی فلسطین پالیسی پر ہمیشہ شدید تنقید کرتے رہے۔ مفتی اعظم فلسطین قائداعظم کو فلسطینی مسلمانوں کا سب سے بڑا حامی اور خیر خواہ سمجھتے تھے، دونوں کے درمیان خط و کتابت رہتی تھی جو ریکارڈ پر موجود ہے۔ دسمبر 1946ء میں لندن جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے قائداعظم قاہرہ میں کئی دن رہے، عرب دنیا، خصوصاً مصر اور فلسطین کی سرکردہ سیاسی شخصیات اور لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں قائداعظم نے عرب دنیا کے معاملات اور مسائل کو بہت نزدیک اور گہری توجہ سے دیکھا۔ ایک خط میں مفتی اعظم فلسطین، جناب امین الحسینی نے قائداعظم کو لکھا کہ ''فلسطین سمیت پورے عالم اسلام کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اُن کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی''۔ اگست 1940ء میں مسلم لیگ نے (قائد کی ہدایت پر) ایک قرارداد میں ایران پر برطانوی اور روسی قبضہ کی شدید مذمت کی اور یہ مطالبہ بھی کیا کہ فرانس، مراکش، الجزائر اور تیونس پر سے اپنا استعماری قبضہ ختم کر دے۔ قائداعظم نے فرانس سے مطالبہ کیا کہ وہ شام اور لبنان پر قبضہ سے باز رہے۔ انھوں نے مشرق بعید، انڈونیشیا اور ملایا (ملائیشیا) میں جاری آزادی کی تحریکوں کی حمایت میں قراردادیں منظور کرائیں۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کے راہنما ڈاکٹر سوئیکارنو کے ساتھ قائداعظم کی خط و کتابت ریکارڈ پر موجود ہے۔ نیدرلینڈز نے دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد انڈونیشیا کے جزائر پر دوبارہ قبضے کی کوشش کی تو قائداعظم نے اس کارروائی کی مذمت کی اور انڈونیشیائی مسلمانوں کی جنگ آزادی کی مکمل حمایت کی۔

کہا جاتا ہے کہ روحانیت کا مذہب سے اور مذہب کا روحانیت سے گہرا تعلق

ہوتا ہے، یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ مغربی لباس پہننے اور مغربی زبان بولنے والے قائد اعظم، بظاہر روحانیت یا روحانی معاملات سے لاتعلق نظر آتے تھے، لیکن ہم اس کا کیا کریں کہ بعض ایسی روحانی، پراسرار اور نا قابل توجیہہ باتیں ہیں جو انھی کی زندگی، ذات، شخصیت اور واقعات سے جڑی ہیں۔ 1919ء کا سال قائد اعظم کے لیے ذاتی خوشیوں اور خوبصورت تمناؤں کا سال تھا۔ اُس سال اُن کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ اُسی سال کی بات ہے کہ ہوٹل تاج محل بمبئی میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ ایک فرانسیسی خاتون ٹھہری ہوئی تھی جو روحانی کشف و کرامت کی قدرتی صلاحیت کی مالک تھی۔ اُس نے قائد اعظم کو ایک نظر ہوٹل میں دیکھا تو سروجنی سے کہا کہ "یہ شخص ایک دن ایک مملکت کی تخلیق کرے گا"۔ سروجنی نے یہ بات قائد اعظم کو بتائی۔ جب تقسیم اور قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تو ایک پارٹی میں سروجنی نائیڈو کی قائد اعظم سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے قائد کو اُس فرانسیسی خاتون کی یہ بات یاد دلائی تھی۔ یہ بھی ایک پراسرار معاملہ ہے کہ قائد اعظم نے، جو لندن میں مستقل آباد ہونے کا فیصلہ کرنے کے بعد نہایت اعلیٰ اور پرآسائش زندگی گزار رہے تھے، اچانک ہندوستان کے خارزارِ سیاست میں واپس آنے کا فیصلہ کیوں کیا یا کس طرح کیا (بعض لیڈروں کی طرف سے واپسی کی ترغیب اُن جیسے لیڈر کے لیے کافی وجہ نہیں ہوسکتی تھی، اگرچہ اس کی بھی اہمیت تھی) اور پھر وہ آناً فاناً مقبولیت اور محبوبیت کی معراج تک کیسے پہنچ گئے؟ کیا اس میں کوئی کرامت کارفرما تھی؟ مغربی محققین اور دانشور جو عام طور پر ظاہری اسباب کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھتے، بھی اس معاملے میں حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید احمد نے دی نیشنز وائس کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھا ہے کہ 1967ء میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر سی ایچ فلپس نے "تقسیم ہند" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا جس میں برطانیہ اور برصغیر کے کئی ایسے سیاستدان، منتظمین اور اہل تحقیق شریک ہوئے تھے جو تقسیم کے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ سیمینار میں قائد اعظم کے کردار اور شخصیت پر بھی کافی بحث ہوئی، سیمینار کے بعد کیمبرج یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک لیکچر میں پروفیسر فلپس نے کہا

کہ 1935ء تک قائداعظم کے پیروکاروں کی تعداد بہت کم تھی لیکن کسی پراسرار سبب کے تحت دو تین سالوں میں وہ ہندوستان کے سیاسی منظر پر چھا گئے اور اُن کے پیروکاروں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ آخر وہ پراسرار سبب کیا تھا؟ اُن کی مقبولیت ایک عالمگیر وائرس کی طرح تھی۔ بولیتھو نے لکھا ہے کہ لکھنؤ اجلاس (1937ء) سے قبل مسلم لیگ کے اراکین کی تعداد محض چند ہزار تھی لیکن اپریل 1938ء تک وہ تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی اور کسی طوفان کی طرح اُن کی قیادت میں مسلم لیگ راس کماری سے لے کر پشاور تک تمام منظر پر چھا گئی۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ نام نہاد روشن خیال دانشور اس پر کیا کہیں گے، لیکن ہم کسی حقیقی واقعے کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کر سکتے کہ وہ عجیب اور فوق الفطرت معلوم ہوتا ہے۔ سید صابر حسین بخاری نے جہلم کے ایک بزرگ محمد اشرف بیگ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ قائداعظم کے ایک قریبی ساتھی نے ایک باراُن کے سکول کی بزم ادب میں انکشاف کیا تھا کہ جب قائداعظم خوداختیار کردہ جلاوطنی سے ہندوستان واپس آ گئے تو وہ انھیں ملنے بمبئی گئے اور اُن کی ہندوستان واپسی کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ قائداعظم نے کہا کہ یہ اطلاعات درست ہیں کہ علامہ اقبال سمیت کئی اہم شخصیات نے انھیں واپسی کے لیے کہا تھا مگر انھوں نے حتمی فیصلہ ایک واقعہ کی بنا پر کیا تھا۔ انھوں نے یہ واقعہ اس شرط پر سنایا کہ اُن کی زندگی میں اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ واقعہ مختصراً یہ تھا کہ قائداعظم لندن میں اپنے گھر میں سوئے ہوئے تھے کہ کسی غیر مرئی وجود نے تین باراُن کے بستر کو ہلایا، وہ اٹھے تو کمرے کو خوشبو سے معطر پایا۔ قائداعظم نے محسوس کیا کہ کوئی غیر معمولی شخصیت کمرے میں موجود ہے حالانکہ کمرہ بند تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ کمرے میں کون ہے؟ جواب آیا: ''میں ہوں، تمہارا پیغمبر محمد (ﷺ)''۔ قائداعظم نے ادب سے سلام پیش کیا تو انھوں نے فرمایا: ''برصغیر کے مسلمانوں کو تمہاری فوری ضرورت ہے اور تم ان کی آزادی کی تحریک کی قیادت کرنے کے لیے واپس ہندوستان جاؤ، تم ہی کامیاب رہو گے''۔ قائد اعظم نے کہا کہ یہ عجیب واقعہ ہی اُن کی واپسی کا اصل سبب ہے۔ اس سے ملتے جلتے یا

غالبًا اسی واقعہ کا ذکر ڈاکٹر صفدر محمود نے اخبار جنگ میں اپنے کالم (مورخہ 29 ستمبر 2011ء) میں کیا تھا۔ اُن کے مطابق سابق آئی جی پولیس چودھری فضل حق (جو اخبارات میں کالم بھی لکھتے تھے) کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہاں خاص نیاز مندی حاصل تھی، قائداعظم کی وفات کے بعد علامہ عثمانی نے انھیں اس راز سے آگاہ کیا جو بہت پہلے قائداعظم نے انھیں اس شرط پر بتایا تھا کہ اُن کی زندگی میں اس سے پردہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ قائداعظم نے بتایا کہ وہ لندن میں رہتے تھے اور ہندوستان واپسی کا ارادہ نہیں تھا۔ ایک رات خواب میں ان کو حضور سرور کائنات ﷺ کی زیارت ہوئی اور حضور ﷺ نے واضح اور دوٹوک حکم دیا تھا: ''محمد علی واپس ہندوستان جاؤ اور وہاں کے مسلمانوں کی قیادت کرو''۔ یہی وہ حقیقی معجزہ تھا جو قائداعظم اور مسلم لیگ کی صرف دو تین سال کے اندر ملک گیر مقبولیت اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے گرد کروڑوں مسلمانوں کے جمع ہو جانے کا باعث بنا۔ جس مقام پر کانگریس جیسی بڑی اور طاقتور جماعت کو پہنچنے میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ لگا، وہ مقام مسلم لیگ نے قائداعظم کی قیادت میں صرف دو تین سال کے اندر حاصل کر لیا۔

کئی کتابوں میں تفصیلات کے معمولی اختلاف کے ساتھ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خواب کا ذکر ملتا ہے، ان تفصیلات کا مشترکہ نکتہ خواب میں حضور ﷺ کی مولانا تھانویؒ کو یہ ہدایت تھی کہ وہ اس شخص (قائداعظم) کے ظاہری لباس اور شکل و شباہت کو نہ دیکھیں بلکہ اُن کے دل میں موجزن ملت اسلامیہ کے لیے بے پناہ جذبے اور تڑپ کو دیکھیں اور اُن کی حمایت کریں۔ انھی دنوں ''اس خواب کی تفصیل کے پوسٹرز شائع ہوئے تو برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجود عقیدت و محبت کو چار چاند لگ گئے''۔ اگر خواب میں زیارت رسول ﷺ اور قائد کی حمایت کے بارے میں اشتہارات اور پوسٹرز خلافِ واقعہ تھے تو مولانا اشرف علی تھانویؒ ان کی یقیناً تردید کرتے۔ بہرحال، یہ ایک روایت ہے جو کافی مشہور ہے۔ باقی، واللہ اعلم بالصواب۔ محمد حنیف شاہد نے پروفیسر ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی کے بیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی

حیدر آباد دکن میں حدیث نبوی ﷺ پر کام کر رہے تھے۔ قائد اعظم نے ملاقات کے لیے انھیں کئی خط اور پیغامات بھیجے مگر وہ ان کے مغربی رہن سہن اور انگریزی لباس کی وجہ سے اُن سے ملنے سے گریزاں رہے۔ پھر یہ ہوا کہ ایک رات انھوں نے خواب میں حضور ﷺ کو دیکھا جو انھیں حکم دے رہے تھے کہ بمبئی جا کر محمد علی جناح سے ملیں'' اور ان کی راہنمائی کریں''۔ اس خواب کے فوراً بعد مولانا عثمانی قائد اعظم سے ملاقات کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔ جب دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی تو قائد اعظم نے مولانا عثمانی کو بتایا کہ اُسی شب اُن کو بھی خواب میں حضور ﷺ نے ''شرفِ ملاقات'' بخشا تھا۔ اس دن کے بعد مولانا عثمانی نے خود کو قائد اعظم اور مسلم لیگ کی حمایت کے لیے وقف کر دیا اور پیروکاروں کو بھی یہی تلقین کی۔ قائد اعظم نے قیام پاکستان کے بعد اپنی ایک تقریر میں، پاکستان بن جانے اور مسلمانوں کے ایک آزاد مملکت کے مالک بن جانے کو ''مشیت ایزدی اور محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان'' قرار دیا تھا۔ جب ہم قائد اعظم کی زندگی اور مشن میں انسانی کوششوں کے ساتھ ساتھ روحانی قوتوں کے جلی یا خفی کردار کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قائد اعظم کی تقریر کے اس جملے کا صحیح مطلب بھی سمجھ آنے لگتا ہے۔ (قائد اعظم اور قرآن فہمی از محمد حنیف شاہد) پیر صاحب گولڑہ شریف حضرت محی الدین گیلانی کے حوالے سے روایت بیان کی جاتی ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں وہ ایک بار اجمیر شریف گئے۔ وہاں اُن کے ایک ارادت مند نے اپنا یہ خواب سنایا کہ ''آپ حضور ﷺ کرسی پر تشریف فرما ہیں، سامنے میز پر ایک فائل پڑی ہوئی ہے، چند لمحے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپ ﷺ وہ فائل اس کو تھما کر فرماتے ہیں: یہ پاکستان کی فائل ہے''۔ وہ شخص خواب سنا چکا تو تھوڑی دیر بعد اخبار آ گیا جس کے صفحہ اول پر ایک شخص کی تصویر دیکھ کر اس نے کہا کہ یہی وہ آدمی ہے جسے اس نے رات خواب میں سرکار دوعالم ﷺ سے فائل لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ قائد اعظم کی تصویر تھی جسے اس سے پہلے دیکھنے کا اُس شخص کو اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد پیر صاحب نے علی الاعلان قائد اعظم اور اُن کے مشن کی

حمایت شروع کر دی۔ (قائداعظم بارگاہ رسالت ﷺ میں از سید صابر حسین بخاری)
درحقیقت بہت سے ایسے روحانی واقعات ہیں جو مختلف کتابوں میں مذکور ہوئے ہیں اور جن سے واضح ہوتا ہے کہ قائداعظم اور اُن کے مشن کے پیچھے دربارِ نبوت ﷺ کی خاص تائید وحمایت بھی کارفرما تھی۔ ملتان کے منشی عبدالرحمٰن خاں نے لکھا ہے کہ بظاہر ایک تاجر اور مسلم لیگ کونسل کے رکن حضرت غازی (اصل نام ظاہر نہیں کیا گیا، یہ ان کا لقب تھا) کو ''قائداعظم کی روحانی اصلاح وتربیت کے لیے دربارِ بغداد سے بھیجا گیا تھا'' اور وہ بڑے امیر کبیر شخص تھے، سواری کے لیے رولز رائس کار اُن کے پاس تھی۔ ''یہ قائد اعظم کے بہت بڑے معتمد اور مقرب تھے۔ غازی صاحب جب بھی ضرورت سمجھتے، قائد اعظم سے اپنے تاثرات بیان کر دیتے اور وہ جس طرح موزوں سمجھتے اس پر عمل کرتے۔ ان (غازی صاحب) ہی کی زبانی مجھے قائداعظم کے ایسے حالات معلوم ہوتے رہے جن تک دوسروں کی رسائی ممکن نہ تھی۔ غازی صاحب نے ہی (تدفین کے موقع پر) طویل القامت قائداعظم کو اکیلے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھا کر قبر میں اتارا''۔ (قائد اعظم کا مذہب وعقیدہ از منشی عبدالرحمٰن خاں) منشی صاحب نے اُس زمانے میں مزارِ اقدس (مدینہ منورہ) کے خادم خاص آغا اسحٰق علی کا یہ خواب بھی نقل کیا ہے کہ جس روز قائداعظم کا انتقال ہوا، اُس روز انھیں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ بہت خوش نظر آئے اور فرمایا: ''آج ہمارا دوست آرہا ہے، اُس کی آمد کی آپ بھی خوشی مناؤ''۔ جب دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! وہ کون خوش نصیب ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''محمد علی جناح''۔

قائداعظم کی زندگی اور جدوجہد میں بعض اعداد کی پراسرار اہمیت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سب سے اہم 5 کا عدد ہے۔ انھوں نے 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی، 1940ء میں قرار داد پاکستان، 23 مارچ کو پیش ہوئی، 14 اگست (1919ء) کو اُن کے ہاں بیٹی دینا اور 14 اگست (1947ء) کو پاکستان کی ولادت ہوئی۔ فرداً فرداً ان سب کا مجموعی عدد 5 بنتا ہے۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ

ہے کہ 14 اگست 1919ء (بیٹی کی پیدائش) کو جمعرات کا دن تھا اور 14 اگست 1947ء (پاکستان کی ولادت) کو بھی جمعرات کا دن تھا۔ جیسا کہ نوابزادہ محمود علی خان نے لکھا ہے کہ ایک تقویمی کرامت یا پراسرار اتفاق یہ ہے کہ ہر سال قائد اعظم کا یوم پیدائش (25 دسمبر)، یوم آزادی (14 اگست)، اُن کا یوم وفات (11 ستمبر) اور اُن کی بیٹی کا یوم پیدائش (14 اگست) ایک ہی دن پڑتے ہیں۔ مثلاً اگر 14 اگست کو اتوار ہو تو اس سال 11 ستمبر اور 25 دسمبر کو بھی اتوار ہی ہوگا۔ حکیم محمد سعید شہید پاکستان کے عوام اور حکمرانوں سے کہا کرتے تھے یوم آزادی 14 اگست کے بجائے 27 رمضان المبارک (بوجہ لیلۃ القدر) کو منایا جائے۔ یہ ایک پراسرار اتفاق ہے کہ ہندو جوتشیوں کے کہنے پر پنڈت نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے یوم آزادی کے لیے 15 اگست 1947ء کی تاریخ منتخب کی، چنانچہ ایک دن پہلے (14 اگست) پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا اعلان کرنا پڑا۔ بیشتر معاصر تحریروں کے مطابق 27ویں رمضان 1366ء 14 اگست اور 15 اگست کی درمیانی شب تھی۔ البتہ اس کا بھی امکان ہے کہ بعض علاقوں میں رویت ہلال کے فرق کے سبب یہ تاریخ آگے پیچھے پڑی ہو۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس کے اگلے روز (15 اگست) جمعۃ الوداع تھا، گویا قمری حساب سے بھی آزادی کے موقع پر مسلمانوں کے لیے کئی اہم خوشیاں اور خاص دن ایک عجیب اتفاق سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ قائد اعظم کی زندگی میں دسمبر، اگست اور مارچ کے مہینوں کی خاص اہمیت دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں بھی ان تین مہینوں (مختلف واقعات کے حوالے سے) کی اہمیت تمام اصحاب علم و دانش پر اظہر من الشّمس ہے۔ تاہم آخری بات یہ ہے کہ تمام زمانے، تمام تاریخیں اور تمام ایام اللہ تعالیٰ کے ہیں اور ہر چیز اسی ذاتِ پاک، اعلیٰ وارفع کی طرف رجوع کرنے والی ہے!

✿......✿......✿

ایس منصور حسن

قائداعظم اور فلسطین

ارض فلسطین ساری دنیا میں وہ واحد مقام ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں یکساں طور پر مقدس اور محترم ہے۔ اسی ارض مقدس پر مسلمانوں کا بیت المقدس اور قبلہ اول ہے۔ یہیں سے حضور اکرم ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہودی ہیکل سلیمانی کی بازیابی کے لیے گریہ وزاری کرتے تھے اور یہی سرزمین حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیھم السلام کا گہوارہ ہے اور اس نسبت سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے بھی محترم ہے۔ مسلمانوں نے جب حضرت عمرؓ کے دور میں فلسطین کو فتح کیا اور یہاں اسلامی پرچم لہرایا تو اس کے دروازے ہر اس قوم اور مذہب کے پیروکاروں کے لیے وا رکھے جو اس سرزمین کی تقدیس وتکریم کے دعویدار ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی اس وسیع النظری، وسعت قلبی اور مذہبی رواداری کے باوجود عیسائی فلسطین کو مسلمانوں سے چھیننے کے لیے صلیبی جنگیں کرتے رہے اور مسلسل شکست کے نتیجہ میں حقیقت کا اعتراف کرنے کے بجائے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کدورتوں میں اضافہ ہوتا گیا حالانکہ اس دوران بھی مسلمان اپنی روایتی مذہبی رواداری کا ثبوت دیتے رہے۔ تاہم عیسائی موقع کی تاک میں رہے۔

برطانیہ کے صنعتی انقلاب نے ساری دنیا کی معاشرت، معیشت، سیاست اور انداز حکمرانی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور دنیا صنعتی اور غیر صنعتی دنیاؤں میں تقسیم ہوگئی۔ اس صنعتی انقلاب نے مغرب کی صنعتی دنیا کو غیر صنعتی دنیا کی بھی حکمرانی عطا کر دی۔ عالم اسلام بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکا کیونکہ مغربی افکار نے قومیت کا

ایک نیا تصور پیش کیا جس کو مسلمانوں نے بھی قبول کر لیا۔ چنانچہ 1916ء میں جب برطانیہ نے فلسطین پر فوج کشی کی جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کے تحت تھا تو عرب افواج نے مغربی تصور کے زیر اثر عرب قوم پرستی کا نعرہ لگا کر ترک افواج کی مدد کرنے کے بجائے انگریزی افواج کا ساتھ دیا اور متعدد معرکوں میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف نمایاں حصہ لیا، اس طرح فلسطین برطانوی تسلط میں آ گیا۔

جب جنرل ایلن بی کی زیر کمان برطانوی فوج بیت المقدس میں فتح سے ہمکنار ہوئی تو لندن کے پریس نے نہ صرف اسے نئ صلیبی جنگ قرار دیتے ہوئے اس کی تعریف کی بلکہ ''ٹائمز'' نے اسے بیت المقدس کی ''نجات'' اور ''عیسائیت کی تاریخ میں انتہائی یادگار واقعہ قرار دیا'' اور لکھا ''ایلن بی کی زیر کمان فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی افواج کے بین الاقوامی کردار نے صلیبی جنگوں کے دوران مغربی اتحاد کی یاد تازہ کر دی''۔ ایلن بی جب بیت المقدس کے دروازہ پر پہنچا تو مغربی تاریخ دانوں نے فخریہ طور پر کہا ''آج صلیبی جنگ کا خاتمہ ہو گیا''۔ تاہم یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایلن بی کی یورپی افواج کو تحفظ اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے دوران امداد پہنچانے والی ہاشمیوں اور امیر فضل کی زیر قیادت عرب متحدہ افواج پر ان اعلانات اور بیانات کا کیا اثر ہوا۔

اس دوران صیہونیت نے برطانیہ اور امریکہ میں اپنے قدم اس قدر مضبوطی سے جما لیے تھے کہ برطانیہ اور امریکہ کے بڑے بڑے سیاست دان اور حکمراں طبقہ کے افراد ان کے زیر اثر آ چکے تھے، نہ صرف یہ بلکہ ان میں سے بعض خود بھی صیہونی ہونے کے دعویدار تھے۔ صیہونیت کے زیر اثر منظّم یہودیوں نے فلسطین سے اپنے دیرینہ تعلق کی بنیاد پر اپنے لیے ایک مستقل وطن کے حصول کے اس موقع کو مناسب ترین سمجھا اور امریکی صدر ولسن اور برطانوی حکمرانوں کی مدد سے برطانیہ کی کابینہ میں یہ منصوبہ پیش کیا کہ فلسطین میں یہودیوں کا وطن فوری طور پر قائم کیا جائے۔ یہ منصوبہ 1914ء میں برطانوی کابینہ کی ایک اہم شخصیت ہربرٹ سیموئل نے پیش کیا۔ اس کے بعد ہی سے فلسطین میں یہودیوں کا وطن قائم کرنے کے لیے صیہونی لابی سرگرم عمل ہو گئی۔ 1917ء میں لارڈ رچرڈ جیمز بالفور نے امریکی صدر ولسن کی منظوری سے برطانوی

کابینہ کے اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ ملکۂ معظّمہ کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے منصوبہ کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتی ہے تو ساری دنیا کے یہودیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس اعلان کے بعد ہی سے جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہوا، ساری دنیا سے یہودی ترک وطن کر کے فلسطین پہنچنا شروع ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی مہم شروع ہو گئی تھی اور مسلمانانِ برصغیر آزادی کی تحریک کے زیر اثر انگریزوں کے خلاف اور خلافت عثمانیہ کی حمایت میں تحریک خلافت چلا رہے تھے اور مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اس وقت تحریک خلافت کے زور کے باعث مسئلہ فلسطین برصغیر کے مسلمانوں کی اس توجہ سے محروم ہو گیا جو اس کا حق تھا۔ تاہم مسلم لیگ مسئلہ فلسطین سے بالکل غافل نہ تھی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ نے 1918ء سے ہی اپنے سالانہ اجلاسوں میں برطانیہ اور امریکہ کے اس منصوبہ کی پرزور الفاظ میں مذمت کی کہ فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنایا جائے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے 1934ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد جب مسلم لیگ میں نئی روح پھونکی اور مسلم لیگ کا احیا کیا تو اسلامیانِ ہند کے لیے علیحدہ وطن پاکستان کی صبر آزما جدوجہد کے ساتھ ہی فلسطین کے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی آواز بلند کی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں سمیت مختلف مواقع پر حکومت برطانیہ سے پرزور الفاظ میں مطالبہ کیا کہ برطانیہ عربوں سے کیے گئے وعدوں پر عمل کرے اور فلسطین میں یہودیوں کی غیر قانونی آبادکاری کا سلسلہ بند کر کے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے منصوبہ کو ترک کر دے۔ کیونکہ اس بنیاد پر فلسطین کو یہودیوں کا وطن نہیں بنایا جا سکتا کہ وہاں کبھی یہودی آباد تھے، یہ جواز قطعی بے بنیاد ہے۔ قائداعظم نے بڑے سخت الفاظ میں یہ استفسار بھی کیا کہ آخر کسی دوسرے ملک میں یہودیوں کو جگہ کیوں نہیں دی گئی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے 12 اکتوبر 1936ء کو مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے برطانیہ کی اس پالیسی کی مذمت میں ایک قرارداد

منظور کی جو اس نے فلسطین کے بارے میں اختیار کر رکھی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے 65ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں 15 اکتوبر 1937ء کو اپنے خطبہ صدارت میں مسئلہ فلسطین پر اپنی دوٹوک رائے کا اظہار کرتے ہوئے برطانوی پالیسی کو عربوں کے ساتھ غداری قرار دیا اور عربوں سے یکجہتی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانانِ ہند عربوں کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ہیں۔

قائداعظم نے فرمایا:

❑ ''سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس مسئلہ نے جذباتی بنا دیا ہے۔ برطانوی حکومت کی تمام تر پالیسی اپنے بالکل آغاز سے عربوں کے ساتھ غداری کے مترادف ہے۔ ان کے اعتماد کرنے کی فطرت سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ نے جنگ عظیم کے دباؤ کے دوران عربوں کے لیے جو اعلان جاری کیا تھا، اس سے انحراف کیا ہے۔ اس اعلان میں عرب سرزمین کے لیے مکمل آزادی اور ایک عرب کنفیڈریشن کی ضمانت دی گئی ہے۔ تاہم جھوٹے وعدوں کے ذریعہ انہیں استعمال کرنے کے بعد انتدابی اختیارات کے ساتھ وہ خود مسند حکومت پر بیٹھ گئے اور بدنام ''بالفور اعلانیہ'' جاری کر دیا جو نہ صرف ناقابل عمل بلکہ بیک وقت تضادات کا شکار ہے۔ بعد ازاں یہودیوں کے لیے ایک وطن کی تلاش کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے برطانیہ عظمیٰ نے اب فلسطین کی تقسیم کی تجویز پیش کر دی اور رائل کمیشن کی سفارشات نے اس المیہ کو بالکل مکمل کر دیا۔ اگر اس پر عمل درآمد کیا گیا تو عربوں کے اپنے وطن میں ان کی ہر جائز خواہش کی مکمل تباہی و بربادی کا باعث بنے گا اور اب ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ ہم حقائق پر نظر کریں! تاہم یہ صورتحال کس نے پیدا کی؟ یہ کام برطانوی مدبرین کے ہاتھوں ہوا ہے اور انہوں نے دانستہ یہ صورتحال پیدا کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لیگ آف نیشنس نے رائل کمیٹیوں کی اس اسکیم کو منظور نہیں کیا ہے اور ہمیں ایسی ہی توقع کرنی چاہیے، اس کا ازسرنو جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ تاہم کیا یہ عربوں کو ان کے حقوق دینے کی صحیح کوشش ہے؟''

قائداعظم نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

❑ ”میں برطانیہ عظمیٰ کو بتانا چاہوں گا کہ فلسطین کے اس سوال کو اگر منصفانہ اور مساویانہ طور پر حل نہیں کیا گیا، ہمت اور حوصلہ سے اس کا فیصلہ نہیں کیا گیا تو ایسا موڑ ثابت ہوگا جس سے برطانیہ کی تاریخ بدل جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے بول رہا ہوں اور ہر مکتبہ فکر کے منصف مزاج افراد میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ برطانیہ عظمیٰ جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد عربوں کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے کیے جانے والے اعلان، وعدوں اور ارادوں پر عمل درآمد کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو گویا وہ اپنی قبر کھود رہا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک انتہائی کشیدہ اور شدید جذباتی فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ برطانوی حکومت شدید مایوسی کی حالت میں ظالمانہ اقدامات کر رہی ہے اور فلسطین میں عربوں کی رائے سے انتہائی بے رحمی سے نمٹ رہی ہے۔ عرب تمام مخالف حالات کے خلاف جو دلیرانہ اور بامقصد جدوجہد کر رہے ہیں، مسلمانانِ ہند اس جدوجہد میں ہر طرح سے عربوں کی تائید اور حمایت کریں گے“۔

اس کے بعد قائد اعظم نے اس یقین کا اظہار کرتے ہوئے کہ عرب اس جدوجہد میں فتحیاب ہوں گے۔ مسلم لیگ کے اجلاس سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا:

❑ ”کیا میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے عربوں کی اس صحیح، بامقصد اور مبنی برانصاف جدوجہد میں خوشی، حوصلہ اور عزم کا پیغام بھیج سکتا ہوں“۔

قبل ازیں صدر استقبالیہ کمیٹی راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں فلسطین کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

❑ ”چشم اسلام اپنے قبلہ اول کو دیکھ رہی ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی شدید تشویش کے ساتھ ان واقعات پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ فلسطین کے عربوں کے حقوق کی مزید پامالی سے ایک ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں“۔

17 اکتوبر 1937ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت مختلف قراردادیں منظور کر کے اس ضمن میں اسلامیان ہند کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا گیا۔ ایک قرارداد منظور کر کے کہا گیا کہ ”آل انڈیا مسلم

لیگ مسلمانانِ ہند کے نام پر یہ اعلان کرتی ہے کہ رائل فلسطین کمیشن کی سفارشات اور وزیر خارجہ برائے نو آبادیات نے اس کے بعد جو بیانات دیئے، وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے متصادم ہیں‘‘۔

دوسری قرارداد کے ذریعہ مسلم ممالک کے حکمرانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے طاقتور اثرات اور بہترین کوششوں کو جاری رکھیں تاکہ فلسطین کے مقامات مقدسہ کی تقدیس کو غیر مسلم تسلط کے ہاتھوں پامال ہونے سے محفوظ رکھا جا سکے اور یہودی سرمایہ سے شروع کی جانے والی برطانوی سامراج کی غلامی سے ارض مقدس کے عربوں کو بچایا جا سکے۔

تیسری قرارداد کے ذریعہ آل انڈیا مسلم لیگ نے عزت مآب مفتی اعظم فلسطین کی زیر قیادت عرب اعلیٰ کمیٹی اور سپریم کونسل پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور فلسطین کی مقامی انتظامیہ کو متنبہ کیا کہ وہ اس اشتعال میں مزید اضافہ نہ کرے جو اس ملک کے عوام کے خلاف متشدد پالیسی سے عالم اسلام میں پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔ اجلاس نے برطانوی حکومت کو بھی متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ ’’اگر یہ فلسطین میں یہودی نواز پالیسی کو تبدیل کرنے میں ناکام رہی تو مسلمانان ہند بقیہ اسلامی دنیا کے ساتھ مل کر برطانیہ کو اسلام دشمن سمجھیں گے اور اپنے عقائد کے مطابق تمام ضروری اقدامات کرنے پر مجبور ہوں گے‘‘۔

قائداعظم نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کی پامالی، عربوں کے ساتھ برطانوی حکومت کی وعدہ خلافی اور فلسطین میں عربوں کی مرضی و منشا کے خلاف ان پر یہودیوں کو مسلط کر کے وہاں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کے خلاف جس موثر انداز میں آواز بلند کی تھی، اس سے فلسطینی حقوق کے علمبردار دیگر عرب باشندے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مجلس مدافعت فلسطین، مصر کے صدر محمود علی علویہ پاشا نے جون 1938ء کو قائداعظم کو مکتوب کر کے انہیں مطلع کیا کہ صیہونیوں کے مقابلے اور فلسطین اور فلسطینی حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے مصر کی پارلیمنٹ کے ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ انہوں نے اس کمیٹی کی کانفرنس میں قائداعظم کو شرکت کی دعوت دی۔ محمود علی علویہ پاشا نے قائداعظم کو تحریر کیا۔

❑ ڈیئر سر! میں آپ کو مطلع کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں کہ صیہونیوں کے

مقابلے میں مسئلہ فلسطین اور وہاں کے حقوق و مفادات کی مدافعت و تحفظ کی غرض سے مصر کی پارلیمنٹ اور مجلس اعلیٰ کے ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کا میں صدر ہوں۔ چونکہ کمیٹی کی خواہش ہے کہ تمام عالم اسلام کی اسمبلیوں اور مجالس قانون ساز کے مسلم ارکان کا تعاون اس کام میں حاصل کیا جائے۔ لہٰذا میں آپ کی خدمت میں یہ مکتوب تحریر کر رہا ہوں اور اطلاع دیتا ہوں کہ ہماری کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی ہے کہ آئندہ ستمبر میں بلودان (شام) میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے تا کہ تمام مسلم نقطہ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ فلسطین پر غور کیا جا سکے۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس امر پر پوری توجہ صرف کریں گے اور ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور ہندوستانی مجلس قانون ساز کا ایک وفد اس کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوں گے اور جلد ہی ہمیں اپنی رائے سے مطلع و ممنون فرمائیں گے"۔

26 تا 29 دسمبر 1938ء پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا 26واں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کے پہلے روز 26 دسمبر کو قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا۔

❑ "فوری مسائل جن سے ہمیں نمٹنا ہے اور جو سبجیکٹ کمیٹی کے سامنے زیر غور آ سکتے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ فلسطین ہے۔ مجھے علم ہے کہ مسئلہ فلسطین پر مسلمانوں کے جذبات میں کس قدر زبردست طلاطم پیدا ہوا ہے۔ مجھے علم ہے کہ اپنی قومی آزادی کی جنگ میں مصروف عربوں کو اگر ضرورت پیش آئی تو مسلمان کوئی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربوں سے انتہائی شرمناک سلوک کیا جا رہا ہے۔ مردوں کو جو اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں، غنڈہ قرار دیا جاتا ہے اور انہیں ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انہیں اپنے ملک کا دفاع کرنے کے جرم میں مارشل لا کی مدد سے سنگینوں کی نوک پر رکھا جاتا ہے۔ تاہم کوئی بھی قوم یا افراد جو بحیثیت ایک قوم رہنے کے خواہشمند ہوں، وہ عظیم قربانیاں پیش کیے بغیر اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے جس طرح کہ فلسطین کے عرب پیش کر رہے ہیں۔ ہماری تمام ہمدردیاں ان بہادر

مجاہدوں کے ساتھ ہیں جو غاصبوں کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہے ہیں اور انہیں انتہائی شدید ناانصافیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے‘‘۔

سالانہ اجلاس کے دوسرے روز 27 دسمبر کو قائداعظم کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کی سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کر کے ’’بالفور اعلانیہ فلسطین‘‘ (Balfour Declaration Palestine) میں برطانوی حکومت کی ظالمانہ پالیسی اور یہودیوں کی ہمدردی کو غیر منصفانہ اور اس اقدام کو فلسطین کو برطانوی سلطنت کا ایک حصہ بنانے کی کوشش قرار دیا گیا تا کہ برطانوی سامراج مستحکم ہو اور عرب ممالک کے وفاق کے نظریہ اور دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ ان کے ممکنہ اتحاد کو ناکام بنایا جائے۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ برطانوی حکومت فلسطین کے مقدس مقامات میں اپنی آئندہ فوجی کارروائیوں کے لیے فضائی اور بحری اڈے بنانا چاہتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے عربوں پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا ہے، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس ان عربوں کو جنہیں ہر قسم کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور جو ارض مقدس کی حفاظت، اپنے قومی حقوق کے تحفظ اور اپنے وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں پیش کر رہے ہیں، ہیرو اور شہدا سمجھتا ہے اور ان کی بہادری اور شجاعت پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔ نیز برطانوی حکومت کو یہ انتباہ کرتا ہے کہ اگر اس نے فلسطین میں یہودیوں کے داخلہ کو فوری طور پر نہیں روکا اور مجوزہ کانفرنس میں عربوں کے حقیقی راہنما اور ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندہ مفتی اعظم کو شامل نہ کیا تو کانفرنس ایک مذاق کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ مسئلہ فلسطین ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور اگر برطانوی حکومت عربوں کے مطالبات پورے کرنے میں ناکام ہوگئی تو ہندوستانی مسلمان کوئی بھی پروگرام بنا سکتے ہیں اور کسی بھی قربانی کے لیے تیار رہیں گے جس کا فیصلہ مسلم بین الاقوامی کانفرنس کرے گی تا کہ عربوں کو برطانوی استحصال اور یہودی تسلط سے محفوظ رکھا جا سکے۔ نیز یہ کہ اس کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی مناسب نمائندگی ہوگی۔ لیگ کا یہ اجلاس برطانوی حکومت کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر اس نے برطانوی اور امریکی باشندوں کے بعض حلقوں میں پائے جانے والے اس

تاثر کو کہ فلسطین کو یہودیوں کو قومی وطن بنا دیا جائے، عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو اس سے مستقل بدامنی اور تصادم کی راہ ہموار ہوگی"۔

28 دسمبر 1938ء کو تیسرے روز کے اجلاس میں جو قائد اعظم کی زیر صدارت ہوا۔ 27 دسمبر کی رات کو سبجیکٹ کمیٹی کی منظور کردہ قرارداد کو دو گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد منظور کر لیا گیا۔ مولانا مظہر الدین نے قرارداد فلسطین پیش کرتے ہوئے بالفور اعلانیہ پر شدید تنقید کی اور کہا کہ فلسطین کے یہودیوں کے لیے برطانوی ہمدردی کو سامراجی مقاصد کے لیے ابھارا جا رہا ہے۔ انہوں نے برطانیہ پر الزام لگایا کہ وہ عربوں کو اپنے ہی لوگوں کے خلاف اکسا رہا ہے۔ فلسطین میں برطانوی پالیسی اسلامی عقائد کے لیے براہ راست چیلنج ہے کیونکہ فلسطین میں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں۔ انہیں دھوکہ دے کر یہ یقین نہیں دلایا جا سکتا کہ برطانیہ نے مسئلہ فلسطین حل کرنے کے لیے جو کانفرنس طلب کی ہے، اس میں فلسطینی عربوں کو مکمل نمائندگی حاصل ہوگی۔ سر رضا علی سمیت تقریباً تمام صوبوں کے مندوبین نے اس موضوع پر خطاب کیا۔ سر رضا علی نے کہا کہ "دنیا برطانیہ کے اس موقف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ چونکہ جرمنی، یہودیوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا رہا ہے، اس لیے انہیں عربوں پر مسلط کر دیا جائے"۔ انہوں نے کہا کہ عربوں پر برطانوی ظلم وتشدد اس ظلم وتشدد سے بہت زیادہ ہے جو جرمنی نے یہودیوں پر کیا، ایک طرف تو معاہدہ ورسائی کو صرف اس کی خلاف ورزی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، دوسری طرف برطانیہ فلسطین میں اپنی پالیسی کی حمایت میں بالفور اعلانیہ کو اپنانے پر مصر ہے۔ مسئلہ فلسطین پر آئندہ ہونے والی کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بے شمار ناانصافیاں اس مسئلہ کی بنیاد ہیں۔ پروفیسر عبدالستار خیری نے قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ انگریز اور ہندو دونوں مسلمانوں کے لیے یہودیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھارت میں گاندھی ہندو یہودیوں کا لیڈر ہے۔ ابوسعید انور نے کہا کہ ہندوستان کے 9 کروڑ مسلمان فلسطینی عربوں کی جدوجہد میں ساتھ دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایک اور مندوب عبدالخالق نے فلسطین میں برطانوی پالیسی کے بارے میں کہا کہ اس کا واحد مقصد یہ

ہے کہ سفید فاموں کی آڑ میں سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے۔ دیگر مندوبین نے بھی قرارداد پر بحث میں حصہ لیا۔ بحث کے خاتمہ کے بعد صدر اجلاس قائداعظم محمد علی جناح نے قرارداد رائے شماری کے لیے پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔

حکومت برطانیہ نے فلسطینی عربوں اور یہودیوں میں مصالحت اور مفاہمت کرانے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی جو 7 فروری 1939ء سے 17 فروری 1939ء تک لندن میں جاری رہی۔ مصر سے علی مہر پاشا، عراق سے نور السعید اور سعودی عرب سے امیر فضل نے اس کانفرنس میں عربوں کی نمائندگی کی۔ فلسطینی عربوں نے جن کی نمائندگی جمال حسینی کر رہے تھے، مذاکرات میں صیہونیوں کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ یہودی ایجنسی نے عالمی یہودی برادری کی طرف سے کانفرنس میں نمائندگی کی۔ تاہم انتہائی کوششوں کے باوجود یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔

قائداعظم نے اس کانفرنس میں مسلم لیگ کی نمائندگی کے لیے چوہدری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی پر مشتمل مسلم لیگ کا ایک وفد تشکیل دیا۔

قائداعظم نے وزیراعظم برطانیہ، وزیر ہند چیمبرلین اور وزیر نوآبادیات میلکم میکڈانلڈ کو تار روانہ کر کے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ فلسطین کانفرنس میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو شرکت کی اجازت دی جائے۔ قائداعظم نے اپنے تار میں انتباہ کیا کہ کانفرنس کی ناکامی بہت تباہ کن ثابت ہوگی اور سارے عالم اسلام میں اس کے تشویشناک نتائج پیدا ہوں گے۔

قائداعظم نے یہ اعلان بھی کیا کہ فلسطین کانفرنس لندن میں 7 فروری یا اس کے قریب شروع ہوگی۔ چنانچہ مسلمانان ہند 8 فروری کو پورے ہندوستان میں کل ہند یوم فلسطین منائیں۔ 6 فروری کو قائداعظم نے ایک بیان میں فلسطین سے مسلمانوں کی مذہبی و جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”فلسطین مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اور مقامات مقدسہ سے مسلمانوں کا گہرا تعلق ہے“۔

مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کے طول وعرض میں یوم فلسطین منایا۔ مسلمانانِ ہند نے مختلف شہروں، قصبات، دیہات غرض گلی

کوچوں میں 8 فروری کو یوم فلسطین کے سلسلہ میں جلسے منعقد کیے اور متعلقہ شہروں، قصبات، دیہات کی سڑکوں اور گلیوں میں گشت کیا۔ کلکتہ میں یوم فلسطین کے سلسلہ میں منعقد عظیم الشان جلسے سے فلسطین کے لیے مسلمانان ہند کے والہانہ جذبات اور مذہبی وابستگی کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جلسہ میں 60 ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔

فلسطین کانفرنس میں مسلم لیگ کی نمائندگی کے لیے قائداعظم کی ان کوششوں کے باوجود حکومت ہند، برطانوی حکومت سے فلسطین کانفرنس میں مسلم لیگ وفد کی شرکت کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ چنانچہ 7 فروری 1939ء کو جب لندن میں فلسطین کانفرنس شروع ہو چکی تھی، ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں عبدالرشید چوہدری نے تحریک التوا پیش کر کے مطالبہ کیا کہ فلسطین کانفرنس میں مسلم لیگ کے وفد کو شرکت کی اجازت اور مسلمانان ہند کی نمائندگی دلانے میں حکومت ہند کی ناکامی پر بحث کی جائے۔ ہوم ممبر میکسویل نے تحریک تاخیر سے پیش کیے جانے پر اعتراض کیا۔ قائد اعظم نے تحریک التوا کی حمایت میں انتہائی جامع تقریر کی اور تحریک التوا بروقت ہونے کی تائید میں استدلال پیش کیے، تاہم تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت نہیں ملی۔

مسلم لیگ کی مرکزی اسمبلی پارٹی نے 8 فروری 1939ء کو نئی دہلی میں ایک اجلاس منعقد کر کے تحریک التوا پیش کرنے کی اجازت نہ دینے پر اظہار افسوس کیا۔ اجلاس میں وزیر ہند کے اس برقیہ پر بھی غور کیا گیا جو انہوں نے فلسطین کانفرنس میں مسلم لیگ کے وفد کی شرکت کے لیے قائداعظم کے ارسال کردہ برقیہ کے جواب میں بھیجا تھا۔

حکومت برطانیہ نے گو کہ مسلم لیگ وفد کو فلسطین کانفرنس میں شرکت کی اجازت نہیں دی تاہم مسلم لیگ کے وفد نے 23 مارچ 1939ء کو لندن میں وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ اور مسٹر اے آر بٹلر سے ملاقات کی اور انہیں فلسطین کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے آگاہ کیا۔ وفد کے ارکان چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی نے حالات کے تازہ تغیرات پر تعجب کا اظہار کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ حکومت مسلمانان ہند کے نقطہ نظر کا لحاظ کرتے ہوئے نیز فلسطین کے عربوں کے ساتھ انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسی کو شائع کرنے سے پہلے

نظرثانی اور دوبارہ غور کرے گی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے 8 اپریل 1939ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کونسل کو مشورہ دیا کہ جب تک برطانوی حکومت کی تجاویز شائع نہ ہو جائیں اور لیگ کے نمائندے لندن سے واپس نہ آ جائیں، اس سلسلہ میں کارروائی کو ملتوی رکھا جائے۔

دوسرے روز یعنی 9 اپریل کو نئی دہلی صوبہ مسلم لیگ پولیٹیکل کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے دوسرے کھلے اجلاس میں قائداعظم نے اپنی تقریر کے دوران مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال کرتے ہوئے برطانوی حکومت سے دریافت کیا کہ ''فلسطین کانفرنس میں ہمارے نمائندوں کو شریک ہونے کا حق کیوں نہ ملا''۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''حیدرآباد ہو، فلسطین ہو یا دنیا میں کسی جگہ کے مسلمان کا سوال ہو، ہماری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں''۔

دریں اثنا مسلم لیگ کا وفد 11 مئی 1939ء کو لندن سے واپس آ گیا اور اسی روز ارکانِ وفد چوہدری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی نے اخبار نویسوں کو بیان دیا کہ جب وہ لندن سے روانہ ہوئے تو فلسطین کانفرنس کسی تصفیہ کے بغیر ختم ہو چکی تھی۔

2 جولائی 1939ء کو قائداعظم کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں فلسطین کانفرنس میں شرکت کے لیے مسلم لیگ کے تشکیل کردہ وفد کے ارکان چوہدری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی نے بھی شرکت کی۔ اسی اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ فلسطین کے عربوں کو مالی امداد کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے قائداعظم کی زیر صدارت ایک عرب فنڈ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اسی طرح جب 27 اور 28 اگست 1939ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس قائداعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا تو دو روزہ اجلاس کے آخری روز یعنی 28 اگست کو قائداعظم کی زیر صدارت اختتامی اجلاس نے پھر مسئلہ فلسطین پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ 27 رجب المرجب کو پورے ہندوستان میں یوم فلسطین منایا جائے۔

اس دوران برصغیر کے مسلمان انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے

اور ہندوؤں کی بالادستی، فرقہ وارانہ منافرت اور معاندانہ رویہ سے اپنے مذہب، ثقافت، تہذیب وتمدن، معاشرت اور معیشت کو محفوظ رکھنے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کی غیر متزلزل، پرعزم اور ناقابل شکست قیادت میں قیام پاکستان کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ایسے وقت میں جب قرارداد پاکستان پیش کی جانے والی تھی، اس وقت بھی قائد اعظم نے فلسطین کے مسلمانوں اور ان کے مسائل کو فراموش نہ کیا اور اسلامیان ہند کے لیے قرارداد پاکستان کی شکل میں مطالبہ پاکستان پیش کرنے سے ایک روز قبل 22 مارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے 25ویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کا پرزور مطالبہ کیا اور برطانوی حکومت کے کھوکھلے وعدوں پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

- ''ہم سے کہا گیا کہ عربوں کے مناسب قومی مطالبات پورے کرنے کے لیے کوششیں اور پرخلوص کوششیں کی جا رہی ہیں، تاہم ہم صرف پرخلوص کوششوں، بہترین کوششوں اور سنجیدہ کوششوں سے مطمئن نہیں ہو سکتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ فلسطین میں عربوں کے قومی مطالبات کو فوری طور پر پورا کیا جائے''۔

23 مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور پیش کی گئی جو بعد ازاں قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی اور قیام پاکستان کی اساس بنی اور 24 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اختتامی اجلاس ہوا تو اجلاس نے قائداعظم کی زیر صدارت ملکی امور پر غور کرنے کے بعد مسئلہ فلسطین حل کرنے میں غیر معمولی تاخیر پر تشویش کا اظہار کیا۔ یہ تشویش ایک قرارداد کی صورت میں ظاہر کی گئی جسے عبدالرحمان صدیقی نے پیش کیا اور سر رضا علی صدیقی نے اس کی تائید کی۔

قرارداد میں کہا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ فلسطین میں عربوں کے ساتھ مصالحت کرنے میں حکومت برطانیہ کی حد سے زیادہ تاخیر پر شدید تشویش کا اظہار کرتی ہے اور صاف اور دوٹوک زبان میں اپنی سوچی سمجھی یہ رائے ریکارڈ کراتی ہے کہ ''فلسطین میں ایسے انتظامات باعث امن نہیں ہو سکتے جو عالم اسلام اور بالخصوص مسلمانانِ ہند سے کیے گئے ان وعدوں اور جذبوں کے خلاف ہوں، جو 1914ء۔ 1918ء کی جنگ میں

مسلمانوں کی فعال امداد حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔ مزید برآں لیگ حکومت برطانیہ کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ ارض مقدس میں عربوں کو کچلنے اور انہیں زیرنگیں کرنے کے لیے اپنی فوج کی بڑی تعداد کا فائدہ اٹھانے کا خطرہ مول نہ لے"۔

اس وقت تک صیہونیت نے امریکہ میں بھی اپنے پاؤں اس قدر مضبوطی سے جما لیے تھے کہ امریکی سیاستدان اور حکومت بھی ان کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہوگئی تھی بلکہ ان میں صیہونیت کے ہمدرد اور علمبردار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ امریکیوں نے اعلان بالفور میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور فلسطین کے یہودیوں کو بھاری مالی امداد بہم پہنچائی تھی۔ مئی 1942ء میں صیہونیوں کی مشہور بالیٹمور کانفرنس بھی نیویارک میں ہوئی تھی۔ بالیٹمور کانفرنس میں صیہونیوں نے جو پروگرام مرتب کیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین میں ایک آزاد اور خودمختار یہودی ریاست قائم کی جائے۔ جس کا اپنا پرچم، اپنی فوج اور اپنا نظم ونسق ہوا اور جس پر برطانیہ کی انتدابی حکومت کا کوئی اختیار نہ ہو۔ اس اجلاس کی صدارت بن گورین نے کی۔ بالٹیمور کانفرنس کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تحریک کی باگ ڈور امریکیوں کے ہاتھ میں آ گئی جنھوں نے اس ضمن میں بڑے زور وشور سے کارروائیاں شروع کیں۔ ان کی ان کوششوں اور اثر و رسوخ کے باعث 1943ء۔ 1944ء میں امریکی کانگریس اور سینٹ میں بالٹیمور پروگرام کے حق میں قراردادیں پیش کی گئیں۔ امریکہ میں صیہونی اس قدر منظّم اور موثر قوت بن چکے تھے کہ نیویارک اور الینوئے ریاستوں میں ان کے ووٹ صدارتی انتخاب میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے تھے۔ امریکہ کے بیشتر ذرائع ابلاغ کی ملکیت اسی وقت یہودیوں نے حاصل کر لی تھی اور وہ حکومت پر دباؤ ڈالنے اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی قوت وصلاحیت کے حامل ہو چکے تھے۔ یہودیوں نے اپنے اس اثر و رسوخ کو صیہونی ریاست کے قیام کے لیے خوب خوب استعمال کیا۔ حتیٰ کہ 1944ء تک صورتحال یہ ہوگئی کہ روز ویلٹ نے امریکہ کی صیہونی تنظیم کے نام ایک پیغام میں اپنی اعانت اور تعاون کا یقین دلایا۔ اگست 1945ء میں امریکی صدر ٹرومین نے برطانوی وزیراعظم ایٹلی کو یہ تجویز پیش کی کہ یورپی یہودیوں کی آبادکاری کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک لاکھ یہودیوں کو

فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ 17 دسمبر 1945ء میں امریکی سینٹ نے ایک قرارداد منظور کر کے حکومت امریکہ سے کہا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کے لامحدود داخلہ اور آبادکاری کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے۔ اپریل 1946ء میں اینگلو امریکی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر کے ٹرومین کی نہ صرف حمایت کی بلکہ یہ سفارش کی کہ اس امر کی اجازت فوری طور پر دی جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا 30واں سالانہ اجلاس نئی دہلی میں جب 24 تا 26 اپریل 1943ء منعقد ہوا تو 26 اپریل کے اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت ایک قرارداد منظور کر کے ان حالات اور واقعات پر شدید تشویش اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہوئے ان اقدامات کی مذمت کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا۔

- ''آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس امریکہ میں کیے جانے والے نئے صیہونی پروپیگنڈے کو تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے جس کے ذریعہ امریکی حکومت پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ برطانوی حکومت کو اس امر پر راضی کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے کہ فلسطین میں یہودیوں کے ترک وطن کر کے آنے پر تمام موجودہ پابندیوں کو ختم کرے اور فلسطین کو یہودی ریاست بنانے کی پالیسی اختیار کرے۔

اس اجلاس کی رائے میں اس نئے صیہونی اقدام کا مقصد یہ ہے کہ جنگ کے ہنگامی حالات اور یورپ میں یہودیوں پر کیے جانے والے ظلم وتشدد کے پیش نظر جنگ کے یہودی مہاجرین کے لیے نئے فلسطین کا دروازہ کھول کر فلسطین میں یہودی اکثریت کو ناقابل تبدیل اٹل حقیقت بنا دیا جائے''۔

اجلاس میں اس اقدام کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا۔

- ''یہ اجلاس اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کرتا ہے کہ فلسطین اور شام میں عرب آزادی کے عرب مطالبات کو پورا کیا جائے اور برطانوی حکومت کے کسی ایسے اقدام یا حرکت کے خلاف انتباہ کرتا ہے جو عرب قومی مفادات کے لیے ضرررساں ہو اور اعلان کرتا ہے کہ کسی ایسی پالیسی کو تمام عالم اسلام، جمہوریت، انصاف اور عربوں کے اپنے وطن عزیز میں ان کے حقوق کی پامالی قرار دیتے ہوئے اس کی شدید مزاحمت کرے گا''۔

قائداعظم نے فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کے لیے امریکی صدر ٹرومین کی تجویز پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے برطانوی وزیراعظم ایٹلی کو ایک تار ارسال کیا جس میں انہوں نے کہا:

❑ ''صدر ٹرومین کی فلسطین میں یہودیوں کے داخلہ کی مبینہ تجویز ایک دوسرے ملک میں دست اندازی ناپسندیدہ اور قطعی طور پر غیر منصفانہ ہے۔ قرطاس ابیض اور برطانیہ کے وعدوں کی خلاف ورزی نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی ہوگی، بلکہ برطانیہ کے وقار اور عزت کی آزمائش بھی ہو جائے گی۔ آپ کو اس بات کی اطلاع دینا میرا فرض ہے کہ عربوں کی قربانیوں پر یہودیوں کو راضی رکھنے کی کسی بھی کوشش کے خلاف مسلمانانِ عالم دلی نفرت و بیزاری کا اظہار کریں گے اور مسلمانان ہند سمیت ساری دنیا کے مسلمان اس کی پوری مزاحمت کریں گے جس کا نتیجہ نہایت تباہ کن ہوگا''۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اکتوبر **1945**ء میں جب کوئٹہ کا دورہ کیا تو **16** اکتوبر **1945**ء کو کوئٹہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''دنیائے اسلام کا ہر مرد اور عورت کٹ مرے تب یہودی بیت المقدس پر قبضہ کر سکیں گے''۔

مزید فرمایا:

❑ ''میں امید کرتا ہوں کہ یہودی اپنے ناپاک منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوں گے اور برطانیہ عظمٰی اور امریکہ وہاں سے ہاتھ اٹھالیں تب میں دیکھوں گا کہ یہودی کس طرح القدس کو فتح کرتے ہیں، اگرچہ ہم محکوم ہیں۔ تاہم ہمارے دل اور ہمارے روح ان لوگوں کی ہمدردی سے لبریز ہیں جو اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ اہل فلسطین اور اہل جاوا اس آزمائش میں کامیاب ہوں گے''۔

قائداعظم نے مزید کہا:

❑ ''**5** لاکھ سے زائد یہودیوں کو اہل فلسطین کی مرضی کے بالکل خلاف القدس میں جگہ دی جا چکی ہے۔ کیا مجھے یہ بتایا جائے گا کہ کسی اور ملک نے انہیں اپنے یہاں جگہ دی؟ مجھے ان سے بہت ہمدردی ہے اور یہودیوں کے خلاف میرے دل میں کوئی

دشمنی یا عناد نہیں ہے۔ مگر یہودی فلسطین میں یہ مقصد سامنے رکھ کر داخل ہوئے ہیں کہ اس القدس کو جسے وہ دو ہزار سال پہلے کھو چکے تھے پھر فتح کریں وہ اس پر برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے پھر قابض ہونا چاہتے ہیں''۔

قائداعظم نے 8 نومبر 1945ء کو بمبئی میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانان عرب کو یقین دلایا کہ برطانوی سامراج اور فلسطین میں یہودیوں کے غیر آئینی داخلہ کے خلاف وہ جدوجہد کر رہے ہیں، مسلمانانِ فلسطین صرف اس کا تماشا دیکھتے رہنے پر اکتفا نہیں کریں گے۔ قائداعظم نے فرمایا:

❑ ''ہم مسلمانان ہند اس سوال پر عالم عرب اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ قطعی طور پر متفق ہیں۔ سوال صرف فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کا نہیں بلکہ درحقیقت یہ سوال برطانوی سنگینوں اور امریکی روپے کی مدد سے فلسطین کو دوبارہ فتح کرنے کا ہے جسے دو ہزار سال قبل وہ ہاتھ سے کھو چکے ہیں۔ مجھے یہودیوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ مہذب یورپ کے بعض حصوں میں ان کے ساتھ نہایت نازیبا سلوک کیا گیا ہے لیکن فلسطین کو یہودیوں کی اس قدر کثیر تعداد سے آخر کیوں بھرا جا رہا ہے؟ عربوں کو ایسی دھمکی کیوں دی جا رہی ہے جو انہیں فلسطین میں نیست و نابود کر کے رکھ دے؟ اگر یہودی فلسطین کو دوبارہ فتح کرنے کے خواہشمند ہیں تو وہ برطانیہ اور امریکہ کا سہارا لیے بغیر عربوں کا مقابلہ کریں''۔

اس کے بعد قائداعظم نے پہلی جنگ عظیم (1914ء) کے چھڑنے سے لے کر فلسطین کے تازہ واقعات تک بیان کیے اور کہا کہ برطانوی انتداب کے وقت سے فلسطین کی تاریخ سیاہ ہو گئی۔ برطانوی حکومت نے فلسطین کے عربوں کو زبان دی تھی کہ انہیں فلسطین میں کامل خود مختاری اور آزادی دے دی جائے گی۔ چنانچہ اس زبانی قرارداد کے سلسلہ میں برطانیہ نے پہلی عالمگیر جنگ میں فلسطین کے عربوں کی خدمات اور خون کا اچھی طرح استعمال کیا۔ کرنل لارنس آف عرب نے برطانیہ کے اس عہد کا واسطہ دے کر عربوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ برطانوی حکومت اپنے عہد کے ایفا میں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے اور اپنے عہد کے خلاف

فلسطین میں انتداب قائم کرنا چاہتی ہے تو اس نے عربوں کو دوبارہ منہ نہیں دکھایا۔ ایک مسلمان ہمیشہ اپنی زبان کا سچا اور صادق القول ہوتا ہے اور جب فریق ثانی اپنا عہد توڑ دیتا ہے تو پھر صورتحال کو گوارہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ برطانیہ وعدہ کرنے میں بہت مشاق ہے اور پھر ان وعدوں کو پورا نہ کرنے کے لیے بہانے تراشنے کا بھی ماہر ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس نے عربوں سے وعدہ کیا کہ انہیں فلسطین میں کامل آزادی اور خود مختاری دی جائے گی اور دوسری طرف اعلان بالفور میں یہودیوں سے ان کے قومی وطن کے قیام کا وعدہ کرلیا۔ اس طرح یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی اور عربوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

جلسہ میں ایک قرارداد منظور کر کے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ بند کر دے۔

قائد اعظم نے نئی دہلی میں 24 جنوری 1946ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے اس موقف کا اعادہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر حکومت برطانیہ اپنے وعدوں سے منحرف ہو جائے گی تو مسلمانانِ ہند اپنے مشرق کے عرب بھائیوں کو ہر طرح کی امداد پہنچانے پر آمادہ ہیں۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کے نامہ نگار نے جب قائد اعظم سے یہ سوال کیا کہ کیا بمبئی کے اخبار وطن کی یہ خبر سچ ہے کہ آگرہ کے مسلمان دوکاندار یہودی مال کا بائیکاٹ کر رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اس قسم کے اقدامات فوری ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ قائد اعظم نے مزید فرمایا:

❑ ''مسلمانان ہند کے دل اپنے عرب بھائیوں کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک مسلم لیگ نے انہیں باقاعدہ طور پر کوئی حکم نہیں دیا ہے تاہم اگر برطانیہ قرطاس ابیض میں کیے گئے وعدوں سے منحرف ہو گیا تو پھر ہم مسلمان عرب بھائیوں کی امداد کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں''۔

اسی طرح 10 اپریل 1946 کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک قرارداد منظور کر کے اینگلو امریکی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر

شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔

قائد اعظم نے 5 جون 1946ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اپنے خطبہ صدارت میں مسئلہ فلسطین پر اینگلو امریکی کمیشن کی رپورٹ کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا:

- ''اینگلو امریکی کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جائے، میں اس سفارش کی قطعی طور پر مذمت کرتا ہوں۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اس کے سوا کسی دوسرے نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس سفارش میں دیانت کو بالکل ملحوظ نہیں رکھا گیا اور حق و انصاف کے تمام اصول پس پشت ڈال دیئے گئے ہیں۔ میں عربوں سے یہ کہوں گا کہ وہ اس سفارش کی مزاحمت کریں اور ایک یہودی کو بھی فلسطین میں داخل نہ ہونے دیں۔ مسلمانانِ ہند عربوں کی مدد کریں گے''۔

منشی عبدالرحمٰن خاں

قائداعظم کی اسلام سے غیر معمولی محبت

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب انسان کسی بہت اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ عُجب و تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کو بھول جاتا ہے اور اپنی سرفرازی و سربلندی کو اپنی تدابیر اور زور بازو کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے، مگر ایک صاحب ایمان ایک ثانیہ کے لیے بھی اپنے خالق و مالک کو نہیں بھول سکتا خواہ وہ دنیوی لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے مقام پر کیوں نہ پہنچ جائے۔ ایک دفعہ جید علما کرام کے ایک وفد نے جب قائداعظم سے سوال کیا کہ:

''آپ پر بھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے ؟''

تو اس وقت وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والے قائداعظم پر فرض کے لفظ سے اپنے مالک و خالق کا اتنا رعب اور خوف طاری ہوا کہ وہ آگے کو جھک گئے اور اپنی کوتاہی کی ہماری طرح کوئی تاویل کرنے کے بجائے ایک خاصے مجمع کے سامنے نہایت ندامت کے لہجے میں فرمایا:

- ''میں گناہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔''

اور جب نماز شروع کی تو اُن پر بحالت نماز خشوع و خضوع کی کیفیت طاری رہنے لگی اور وہ اکثر خلوت میں احکم الحاکمین کے دربار میں سربسجدہ آہ و زاری کرتے دیکھے گئے۔ اللہ اللہ کیا مقام تھا۔ ہمارے زعما تو اپنی تعریف کے سوا کچھ سننا گوارا نہیں کرتے مگر انھوں نے اپنے اوپر تنقید کو نہ صرف فراخدلی سے سنا۔ بلکہ اپنی کمزوری کے اعتراف کرنے میں بھی ذرا نہ جھجکے۔ جب نماز شروع کی تو مسنون طریقہ سے اور شروع سے وصال تک جلوت دخلوت میں ہمیشہ مسنون طریق سے نماز پڑھتے رہے اور جب

کبھی باجماعت نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو سوادِاعظم کی مسجد میں ہی پڑھی۔ان کی دیکھا دیکھی بعض بے نمازی بھی نماز کے عادی بن گئے۔اس واقعہ کو جب مولا کریم کے اس فرمان کی روشنی میں دیکھا جائے:

- ترجمہ: صرف وہی سچے ایماندار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں (اور) جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو، نیز اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔'' (الانفال:2۔3)

تو قائداعظم کے مومن کامل ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔آپ کی نماز جنازہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مسنون طریق پر پڑھائی اور ان کی ہمشیرہ محترمہ کی موجودگی میں ان کی تجہیز وتکفین اور تدفین مسنون طریق پر ہوئی اور اس طرح آپ اخیر تک صحیح لفظوں میں مسلمان رہے۔

مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اپنی روئیداد میں لکھتے ہیں:

- ''میرے ایک معتبر دوست نے مجھ سے بیان کیا کہ ان سے مولانا حسرت موہانی صاحب نے بیان کیا کہ میں ایک روز جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم سے میں نے اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا اس وقت ہم کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔آپ تشریف رکھیے۔تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آویں گے۔ چونکہ مجھے نہایت ضروری کام تھا اور میں اس کو جلد سے جلد جناح صاحب سے کہنا چاہتا تھا، اس لیے مجھے ملازم پر غصہ آیا اور میں خود کمرے میں چلا گیا۔ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھر تیسرے کمرہ میں پہنچا تو برابر کے کمرے سے مجھے کسی کے بہت ہی بلک بلک کر رونے اور کچھ کہنے کی آواز آئی۔آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی، اس لیے میں گھبرایا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناح صاحب سجدہ میں پڑے ہیں اور بہت ہی بے قراری کے ساتھ کچھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آ گیا اور اب تو بھائی جب

جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ اندر ہیں تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ میرے تصور میں ہر وقت وہی تصویر اور وہی آواز رہتی ہے۔''

شروع میں قائداعظم سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے متمنی تھے۔ مگر جس روز علما کے وفد نے قائداعظم پر واضح کر دیا کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر دینے سے برکت و کامیابی ممکن نہیں، تو انھوں نے مذہب کو سیاست پر فوقیت دینا شروع کر دی۔ ان کی تقاریر کا موضوع بدل گیا۔ ان میں اسلامیت کا رنگ غالب آنے لگا اور انھوں نے برملا کہنا شروع کر دیا:

''اسلام صرف چند عقائد و عبادات کا نام نہیں بلکہ اسلام سیاسیات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ ہمیں ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔''

قائداعظم کی تعلیم و تربیت چونکہ انگریزی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے وہ انگریزی لباس پہننے کے عادی تھے۔ وفد نے انھیں وضع اسلامی اختیار کرنے کی ترغیب دی تو انھوں نے ہر وقت انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر دی اور اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظر عام پر نظر آنے لگے۔ جس کے بعد جناح کیپ، شیروانی اور شلوار قومی لباس کی حیثیت اختیار کر گئی۔

❑ سرکار دوجہاں ﷺ کی نظر کرم اور اہل اللہ کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت نے قائداعظم کے دل میں کلام ربانی اور ارشادات نبوی ﷺ کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا۔ آپ نے ان کا بغور مطالعہ شروع کر دیا، جس نے آپ کی دینی بصیرت اور اسلامی شعور میں رہی سہی کمی پوری کر دی۔ جب ان سے اگست **1941**ء میں حیدرآباد دکن میں طلبہ نے سوال کیا کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو ان کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے خود اس امر کا انکشاف کیا اور فرمایا:

❑ ''جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا

یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔'' (حیات قائداعظم، ص 427)

یہ قرآن و حدیث کے مطالعہ اور دینی اور روحانی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ قائداعظم میں وہ تمام صفات مومنانہ پیدا ہوتی گئیں، جو قرآن کریم نے ایک ایک کر کے گنوائی ہیں اور جن کی بدولت آپ ہر محاذ پر کامیاب ہوتے چلے گئے اور دنیا کی کوئی طاقت آپ کے لیے سنگ راہ نہ بن سکی۔

آپ کو فرقہ بندی اور فرقہ پرستی سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ نومبر 1946ء میں آپ نے ''اینگلو عربک کالج'' دہلی کے ہال میں خواتین و طالبات سے خطاب کرتے ہوئے بہانگ دہل فرمایا:

- ''اب مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں۔ وہ شیعہ، سنی اور وہابی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیں۔ وہ صوبائی تعصب کو بھی خیرباد کہہ دیں۔ بعض مسلمان کہتے ہیں کہ وہ پنجابی ہیں اور بعض اپنے تئیں بنگالی کہتے ہیں۔ ایسا طریق فکر مسلمانوں کے لیے سخت مصیبت کا باعث بنے گا۔ ہم صرف اسلام کے خادم ہیں۔''

(نوائے وقت لاہور، 7 نومبر 1946)

قائداعظم چونکہ ایک حقیقت پسند انسان تھے اور تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے تھے، اس لیے آپ متعصب، فرقہ پرست اور تفرقہ پسند لوگوں کی طرح تاریخی حقائق کو قطعاً نظرانداز نہیں کرتے تھے، اور نہ چشم پوشی سے کام لیتے تھے بلکہ ہمیشہ یہی

فرماتے رہتے تھے:

❑ ''مسلمانوں کی وحدت کی بنیاد ایک اللہ، ایک کتاب اور ایک رسول ﷺ پر ہے، اس لیے مسلمان بھی فرقہ بندی سے بالاتر ہو کر اتفاق و اتحاد سے رہیں اور دنیا کے سامنے خلافت راشدہ کے دور کا نمونہ پیش کریں، تاکہ پاکستان اسم بامسمّٰی ثابت ہو سکے۔''

قائداعظم قرآن اور اقبال کے مرد مومن تھے۔ آپ میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو قرآن نے ایک مرد مومن کی گنوائی ہیں۔ مطالعہ قرآن و حدیث، اتباع کتاب وسنت اور پابندی صوم وصلوٰۃ آپ کے معمولات میں داخل تھے...... قائداعظم کے ایک سابق اے ڈی سی جناب احمد محی الدین کا بیان ہے:

❑ ''قائداعظم نماز پڑھتے تھے۔ وہ پختہ عقیدہ کے مسلمان تھے اور فرقہ واریت پر یقین نہ رکھتے تھے۔ جن دنوں خاکسار تحریک نے بیلچہ بردار رضا کاروں کو چنے اور گڑ دے کر کلکتہ کی جانب پیدل مارچ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، ان دنوں قائداعظم علی گڑھ تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں یونیورسٹی ٹینس لان کورٹ میں سوئمنگ پول کے نزدیک پارٹی رکھی گئی۔ تقریب کے اختتام پر جیسے ہی اذان دی گئی، قائداعظم فوراً ادھر تشریف لے گئے اور طلبہ کی صف میں کھڑے ہو کر نماز مغرب ادا کی''۔

ان ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں اگر کسی کو قوم کا یہ ناخدا، باخدا نظر نہ آئے تو اسے اس کی شپرہ چشمی کی وجہ سے معذور سمجھنا چاہیے۔ تاریخ عالم اس بات کی شاہد عادل ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی سے دین اسلام کی خدمت لینا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے دین و دانش بخشتا ہے۔ پھر فہم وفراست سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت، اس کے قلب میں خشیت، اس کے نطق میں اثر و تاثیر اور عوام وخواص میں اس کے لیے محبت وعزت، عظمت ومقبولیت پیدا کر دیتا ہے۔ دشمنوں اور مخالفوں کے دلوں میں اس کی ہیبت بٹھا دیتا ہے۔ حاسدین ومعاندین و ناقدین کے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ اسی لیے جب ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالنے اور اس میں نظام دین رائج کرنے کے لیے مغرب زدہ طبقہ سے قائداعظم کو منتخب کیا گیا تو ان

میں مذکورہ بالا تمام صفات پیدا کر دی گئیں اور انھی کی بنا پر آپ نے پاکستان کی تاریخی جنگ بلا تیغ و تفنگ لڑ کر جیتی۔

ارباب من دون اللہ کی پرستش ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ انگریزوں کے پجاریوں میں سر، نواب، خان بہادر اور خان صاحب ایسے خطاب یافتگان اور جاگیردار ان سب سے پیش پیش رہتے اور انگریز افسروں کی چشم التفات کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اگر کسی کو گورنر، گورنر جنرل، وزیر ہند یا وزیراعظم برطانیہ کے دربار میں حاضری نصیب ہوتی تو وہ اسے ''معراج'' سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ پھر شاہی دربار کی حاضری تو حکام پرستوں کے لیے نور علیٰ نور ہوتی تھی اور کئی اس کے لیے مدتوں ترستے ترستے زیر زمین اُتر جاتے تھے۔

شاہ انگلستان جارج ششم کے زمانے میں ہندوستان کو کچھ اصلاحات دینے کی گفت و شنید کے لیے جن زعمائے ہند کو دعوت دی گئی، ان میں قائداعظم بھی شامل تھے۔ اس گفت و شنید کے دوران قائداعظم کو بھی بکنگھم پیلس سے شاہی ظہرانہ کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ دوسرے مدعوئین تو یہ دعوت نامہ پا کر پھولے نہ سمائے، کیونکہ شاہی محل میں شہنشاہ معظم، شاہی خاندان کے معزز افراد اور بین الاقوامی شہرت کے حامل چوٹی کے راہنماؤں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کام و دہن کی تواضع کرنے کا شرف ان کو خواب میں بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اس لیے تمام مدعوئین ظہرانے کے وقت کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ مگر قائداعظم نے یہ شرف حاصل کرنے کے بجائے، آداب شاہی کے خلاف اس دعوت نامہ کے جواب میں یہ معذرت نامہ بھیج دیا کہ:

- ''یہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے، اس میں مسلمان روزے رکھتے ہیں۔''

مگر دوسرے مسلمان راہنماؤں کے دل میں احترام ماہ صیام کا خیال تک پیدا نہ ہوا اور وہ شاہی ضیافت کے مزے اُڑانے کے لیے بروقت قصرِ شاہی میں پہنچ گئے۔

تحریک پاکستان کے دوران اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ پاکستان لاالٰہ الا اللہ کی بنیادوں پر استوار نہ کیا جائے گا؟ اس میں قرآنی نظام یا حکومت الٰہیہ قائم نہ کی جائے گی؟ کیا وہ مغرب زدہ پاکستان ہوگا جس میں اسلام کے نام لیوا کشتنی و لائق گردن زدنی

قرار دیئے جائیں گے؟ اس لیے قائداعظم، علامہ شبیر احمد عثمانی اور نواب زادہ لیاقت علی خان سے بار بار یہ سوال پوچھا جا رہا تھا کہ پاکستان میں کس قسم کا نظام حکومت ہوگا؟ یہ سوال زیادہ تر ان گوشوں سے اٹھایا گیا جو تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ ان سوالات کا مقصد محض مسلمانوں کے دلوں میں پاکستان کے متعلق بدگمانیاں پیدا کر کے ان کو تحریک پاکستان سے دور رکھنے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ قائداعظم کی دُوربین نظروں سے یہ محاذ بھی اوجھل نہ تھا۔ آپ وقتاً فوقتاً اپنی تقاریر اور پیغامات کے ذریعے اس پروپیگنڈا کی تردید کرتے رہتے تھے۔ مثلاً: قائداعظم نے عیدالفطر نومبر **1939**ء کے موقع پر بمبئی میں فرمایا:

❑ ''مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں۔ قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ، مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔''

ان واضح اعلانات کے باوجود مخالفین پاکستان کے نظام حکومت کے متعلق دلوں میں وسوسہ پیدا کرنے کے لیے آپ پر برابر سوال کرتے رہے۔ جن کی بنا پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے **1942**ء میں آپ نے یہ واضح اعلان فرمایا:

❑ ''مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان کا طرز حکومت متعین کرنے والا میں کون؟ یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کے طرز حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا تھا۔''

❑ ایک اور موقع پر آپ نے **1943**ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں فرمایا:

''وہ کون سا رشتہ ہے جن میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے...... ایک اللہ، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب، ایک امت!''

ایک دوسرے موقع پر ان واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا:

❑ ’’قرآن مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی،شہری، فوجی، کاروباری، عدالتی،تعزیری اور قانونی ضابطۂ حیات!...... جو مذہبی تقاریب سے لے کرجسم کی صحت تک تمام افراد سے لے کرایک فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لے کر جرم تک!...... اس دنیا میں جزا وسزا سے لے کر اگلے جہان کی جزا وسزا تک حد بندی کرتا ہے۔‘‘

(پیام عید 1945ء)

11 جولائی 1946ء کو حیدرآباد دکن کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا:

❑ ’’ایک مسلمان کی حیثیت سے میں علی اعلان کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن کو اپنا آخری اور قطعی راہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر قائم ہوں اور اس ارشاد خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کرسکتیں۔‘‘

قائداعظم کے یہ الفاظ اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ قائداعظم کو اس بات کا احساس تھا کہ میں تو صرف پاکستان کا انعام الٰہی مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے آیا ہوں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ممکن ہے میں ان کے درمیان نہ رہوں تو یہ اس وقت کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی۔ پاکستان میں وہ طرز حکومت رائج کریں جو قرآن حکیم نے پیش کر رکھا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے ایک اجلاس میں قائداعظم نے مخالفین، معاندین اور فاسدین کی بہتان طرازیوں اور بدزبانیوں کے سلسلہ میں فرمایا:

❑ ’’مسلمانو! میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے ہیں۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں

آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح! تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح! تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علم اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔" ("انقلاب" لاہور، 22 اکتوبر 1939ء صفحہ آخر کالم 1)

عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ جناح کے منہ سے یہ رقت آمیز الفاظ سن کر حاضرین زار زار رو رہے تھے۔

قائداعظم کا یہ ایمان افروز بیان، ان پر زبان طعن دراز کرنے والوں کے لیے نوشتہ دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔
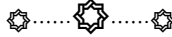
پروفیسر محمد شریف بقا

جناح کا تصورِ قرآن

قرآن مجید، اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہونے کی حیثیت سے ایک مکمل ضابطۂ حیات، مرکزِ نور و ہدایت، معیارِ خیر و شر، ہماری روحانی بیماریوں کا نسخہ شافی اور غیر متبدل اقدار ہدایت کا مجموعہ ہے۔ اس کی ہدایت چونکہ تمام افرادِ انسانیت کے لیے ہے، اس لیے اسے ''ذکر للعالمین'' کہا گیا ہے۔ اس بے نظیر کتاب الٰہی کی تعلیمات میں ہماری انفرادی اور اجتماعی مشکلات اور گوناگوں مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ اسلامی قوانین کا اوّلین سرچشمہ اور ہمارے دین و ایمان کی اساس ہے۔ وہ کون سا بدبخت مسلمان ہے جو اس کو اپنے ایمان کا جزو اور انسانی فلاح و فوز کا ذریعہ نہ سمجھے۔ بانیِ پاکستان نے اس حکمت آموز کتاب کے چیدہ چیدہ پہلوؤں کے ذکر سے اپنی تقاریر، بیانات اور پیغامات کو مزین کر کے اس کے ساتھ اپنی گہری قلبی وابستگی اور ایمانی حرارت کا ثبوت پہنچایا ہے۔ یہاں ہم دورِ جدید کے اس عظیم مسلمان سیاست دان کے تصورِ قرآن کے چند نمایاں ترین گوشوں کی اجمالی طور پر نقاب کشائی کریں گے۔

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

قائداعظم قرآن حکیم کو صرف عقائد ہی کا مجموعہ خیال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اسے عبادات اور معاملات کے حقائق کا بھی آئینہ دار تصور کرنے کے حامی تھے۔ ان کی نظر میں صداقت اور عقائد کی آبیاری کے لیے قرآن کی عقلی تفسیر و تشریح بھی لازمی ہے۔ انھوں نے عید کے دن اپنی ایک نشری تقریر میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

❑ "In the pursuite of truth and the cultivation of beliefs we should be guided by our rational

interpretation of the Quran." (13 November, 1939)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دور حاضر کا انسان ہر بات کو عقلی انداز میں جاننے کا عادی بن گیا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اسلامی دعوت و تبلیغ کے لیے حکیمانہ انداز کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جبر کے ذریعے دوسروں کو اسلام کی حقانیت سے روشناس نہیں کرایا جا سکتا۔ بے شمار قرآنی آیات میں ہمیں عقل، فکر، شعور اور تدبر سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ پہلے ہم اس کی حقانیت کو خود سمجھ لیں اور بعدازاں غیروں کو دلائل سے اس کی صداقت سے آگاہ کیا جائے۔

محمد علی جناح کے تصور قرآن کا ایک اور اہم پہلو قرآنی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانا اور دوسروں کے ساتھ عمدہ سلوک اور انسانی محبت و خدمت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ انھوں نے **1939**ء میں مسلم یوتھ آف انڈیا (علی گڑھ) کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا:

- ''قرآن میں انسان کو خدا کا نائب کہا گیا ہے...... یہ چیز ہمارے اوپر اتباع قرآن کی ذمہ داری ڈالتی ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کریں جو خدا انسانوں کے ساتھ کرتا ہے...... گویا یہ محبت اور بردباری کا فرض ہے۔''

قرآنی تعلیمات نے انسان کو جو بلند مرتبہ عطا کیا ہے، اس کے پیش نظر اس پر اس کتاب ہدیٰ کی پیروی ناگزیر ہے وگرنہ وہ احسن تقویم کا سزاوار نہیں ہوسکتا۔ اسلام پُرامن بقائے باہمی کے فروغ پر زور دیتا ہے اور ہر قسم کے فتنہ و فساد کی بیخ کنی کو انسانیت کی نجات، معاشرتی ترقی اور خوشگوار تعلقات کا موجب گردانتا ہے۔ بنی نوع انسان کی محبت و خدمت کو بہت زیادہ اجر وثواب کا ذریعہ خیال کرتے ہوئے مسلمانوں کو اخوت، عدل گستری، سلامتی اور نیکی کو پروان چڑھانے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔

''**لا اکراہ فی الدین**'' کہہ کر قرآن نے تمام جبری ہتھکنڈوں کو مسترد کر دیا ہے۔ باہمی محبت اور رواداری کا درس دیا گیا ہے۔ قائداعظم نے اسی قرآنی حکم کو سامنے رکھتے ہوئے دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، محبت اور رواداری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قائداعظم کی رائے میں قرآن حکیم ہماری ہدایت، ذہنی جِلا اور روحانی پاکیزگی

کے علاوہ ہماری خداداد مخفی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما اور انسانی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ انھوں نے 4 اپریل 1943ء کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام اپنے ایک حقیقت کشا پیغام میں قرآنی تعلیمات کے چند گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

- ''ہماری راہنمائی اور اخلاقی روشنی کے لیے قرآن نے ہمیں عظیم ترین پیغام دیا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ذات اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں، نیکیوں اور طاقتوں کو پہچانیں اور انھیں صحیح سمت میں استعمال کریں۔''

اس پیغام میں بانی پاکستان نے مسلمان نوجوانوں کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفادات پر اجتماعی مفادات اور فلاح عامہ کو ترجیح دیں۔ خودشناسی اور عرفان ذات کے بغیر دوسروں کی درست شناخت کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟ بجا کہا جاتا ہے:

- **''من عرف نفسه فقد عرف ربه''**

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے خدا کی معرفت کو حاصل کرلیا۔

قائداعظم کے اس درس خودی میں ہمیں علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اب ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قائداعظم کو مطالعہ قرآن سے رغبت نہیں تھی؟ اگر انھوں نے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو وہ کیونکر قرآنی تعلیمات کے ایسے گہرہائے تابدار کا سراغ لگا سکتے تھے؟

جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

بانی پاکستان کے مختلف بیانات اور تقریری وتحریری پیغامات میں اکثر مقامات پر ہمیں قرآنی تعلیمات اور اسلامی نظریات وعقائد کا عکس جمیل نظر آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں قرآن کے مطالعہ کا کتنا شوق تھا۔ قائداعظم کا یہ قرآنی تمسک ان کی اسلام دوستی، پختہ ایمان اور عظمت فکر کی دلیل ہے۔ امید ہے متلاشیان حقیقت کو ان کے اس مسلک میں یقیناً مزید کشش نظر آئے گی۔

۞......۞......۞
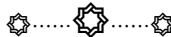
ڈاکٹر صفدر محمود

قائداعظم کی قرآن فہمی

اکثر محفلوں میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ قائداعظم کی تقاریر میں جابجا قرآن حکیم سے راہنمائی کا ذکر ملتا ہے۔ کیا انھوں نے قرآن مجید پڑھا تھا، اور کیا وہ قرآن مجید سے راہنمائی لیتے تھے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو اس کے شواہد یا ثبوت دیجیے۔ رضوان احمد مرحوم نے گہری تحقیق اور محنت سے قائداعظم کی زندگی کے ابتدائی سالوں پر کتاب لکھی۔ اس تحقیق کے دوران انھوں نے قائداعظم کے قریبی رشتے داروں کے انٹرویو بھی کیے۔ رضوان احمد کی تحقیق کے مطابق قائداعظم کو بچپن میں قرآن مجید پڑھایا گیا جس طرح سارے مسلمان بچوں کو اس دور میں پڑھایا جاتا تھا۔ وزیرآباد کے طوسی صاحب کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا اور وہ اعلیٰ درجے کی انگریزی لکھتے تھے۔ قیام پاکستان سے چند برس قبل انھوں نے بڑے جوش وخروش سے پاکستان کے حق میں نہایت مدلل مضامین لکھے جو انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ملازمت کے سبب طوسی صاحب نے یہ مضامین قلمی نام سے لکھے تھے۔ قائداعظم ان کے مضامین سے متاثر ہوئے اور انھیں ڈھونڈ کر بمبئی بلایا۔ قائداعظم ان سے کچھ کام لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ طوسی صاحب چند ماہ ان کے مہمان رہے جہاں وہ دن بھر قائداعظم کی لائبریری میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ قائداعظم کی لائبریری میں قرآن حکیم کے کئی انگریزی تراجم، اسلامی شرعی قوانین، اسلامی تاریخ اور خلفائے راشدینؓ پر اعلیٰ درجے کی کتابیں موجود تھیں اور وہ اکثر سید امیر علی کا قرآن حکیم کا ترجمہ شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ انھیں مولانا شبلی نعمانی کی الفاروق کا انگریزی ترجمہ بھی بہت پسند تھا۔ جس پر کئی

مقامات پر قائداعظم نے نشانات لگا رکھے تھے۔ کئی دہائیاں قبل طوسی صاحب کے مضامین لاہور کے ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا گیا یا نہیں۔

اس حوالے سے عینی شاہدین کی یادیں ہی بہترین شہادت ہوسکتی ہیں۔ ایک روز میں جنرل محمد اکبر خان، آرمی پی اے نمبر1 کی سوانح عمری ''میری آخری منزل'' پڑھ رہا تھا تو اس میں ایک دلچسپ اور چشم کشا واقعہ نظر سے گزرا۔ جنرل اکبر نہایت سینئر جرنیل تھے اور قیام پاکستان کے وقت بحیثیت میجر جنرل کمانڈر فرسٹ کور تعینات ہوئے۔ جن دنوں قائداعظم زیارت میں بیماری سے برسرِ پیکار تھے، انھوں نے جنرل اکبر اور ان کی بیگم کو تین دن کے لیے زیارت میں بطور مہمان بلایا اور اپنے پاس ٹھہرایا۔ جنرل اکبر 25 جون 1948ء کو وہاں پہنچے۔ ان کی قائداعظم سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک ملاقات کا ذکر ان کی زبانی سنیے:

❑ ''ہمارے افسروں کے سکولوں میں ضیافتوں کے وقت شراب سے جام صحت پیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ افواج کی قدیم روایت ہے۔ میں نے قائداعظم سے کہا کہ شراب کے استعمال کو ممنوع کرنے کا اعلان فرمائیں۔ قائداعظم نے خاموشی سے اپنے اے ڈی سی کو بلوایا اور حکم دیا کہ ''میرا کانفیڈریشن باکس لے آؤ۔'' جب بکس آ گیا تو قائداعظم نے چابیوں کا گچھا اپنی جیب سے نکال کر بکس کو کھول کر سیاہ مراکشی چمڑے سے جلد بند ایک کتاب نکالی اور اسے اس مقام سے کھولا جہاں انھوں نے نشانی رکھی ہوئی تھی اور فرمایا، جنرل! یہ قرآن مجید ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ ''شراب و منشیات حرام ہیں''۔ کچھ تبادلہ خیال کے بعد سٹینو کو بلایا گیا۔ قائداعظم نے ایک مسودہ تیار کیا، قرآنی آیات کا حوالہ دے کر فرمایا ''شراب منشیات حرام ہیں۔'' میں نے اس مسودے کی نقل لگا کر اپنے ایریا کے تمام یونٹ میں شراب نوشی بند کرنے کا حکم جاری کیا جو میری ریٹائرمنٹ تک مؤثر رہا۔ میں نے قائداعظم سے عرض کیا کہ ہم نے بنیادی طور پر آپ کی تقریروں سے راہنمائی حاصل کی۔ آپ نے فرمایا ہے کہ ہم مسلمانوں کو

زندگی کے ہر شعبے میں قرآن مجید سے راہنمائی لینی چاہیے۔ ہم نے دفاعی نقطہ نظر پر ریسرچ شروع کر دی ہے اور کچھ مواد بھی جمع کر لیا ہے۔ قائداعظم نے اس تحریک کو پسند فرمایا۔ ہماری ہمت افزائی ہوگئی۔ (صفحہ 281، 282)

اس حوالے سے ایک عینی شاہد کا اہم انٹرویو منیر احمد منیر کی کتاب ''دی گریٹ لیڈر'' حصہ اوّل میں شامل ہے۔ یہ انٹرویو ہے عبدالرشید بٹلر کا جو ان دنوں گورنر ہاؤس پشاور میں بٹلر تھا، جب قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے سرحد کے دورے پر گئے اور گورنر ہاؤس پشاور میں قیام کیا۔ انٹرویو کے وقت عبدالرشید بٹلر بوڑھا ہو کر کئی امراض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس عینی شاہد کا بیان پڑھیے اور غور کیجیے:

❑ ''میری ڈیوٹی ان کے کمرے پر تھی اور قائداعظم کے سونے کے کمرے کے سامنے میرا کمرہ تھا۔ اس لیے کہ جب وہ گھنٹی بجائیں اور انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فوراً پہنچ جاؤں۔''

سوال: انھوں نے کوئی چیز طلب کی؟

جواب: اس اثنا میں انھوں نے کبھی پانی اور کبھی چائے مانگی۔

سوال: جب آپ ان کے لیے پانی چائے لے کر گئے، وہ کیا کر رہے تھے؟

جواب: وہ بیٹھے خوب کام کر رہے تھے۔ دن بھر کی مصروفیات کے باوجود انھوں نے آرام نہیں کیا۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کمرے میں ادھر اُدھر جاتے۔ میں نے خود دیکھا کہ انگیٹھی (مینٹل پیس) پر رحل میں قرآن پڑا ہے، اس پر ماتھا رکھ کر رو پڑتے ہیں۔

سوال: قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، رو پڑتے ہیں، اس دوران کوئی دعا بھی مانگتے تھے؟

جواب: میری موجودگی میں نہیں۔

سوال: اس موقع پر ان کا لباس؟

جواب: شلوار اچکن۔

سوال: لیکن میں نے جو سنا ہے کہ رات گئے ان کے کمرے سے ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔ شبہ ہوا کوئی سرخ پوش نہ کمرے میں گھس آیا ہو؟

جواب: اسی رات آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر کوئی گہری نیند سو رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس اپنا فرض ادا کر رہی تھی کہ اچانک ٹھک ٹھک کی آواز گورنمنٹ ہاؤس کا سناٹا چیرنے لگی۔ آواز میں تسلسل اور ٹھہراؤ تھا۔ میں فوراً چوکس ہوا۔ یہ آواز قائداعظم کے کمرے سے آ رہی تھی۔ ہمیں خیال آیا، اندر شاید کوئی چور گھس گیا ہے۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر بھی ادھر آ گئے۔ پولیس ادھر اُدھر گھوم رہی تھی کہ اندر کس طرح جھانکا جائے؟ ایک ہلکی سی درز شیشے پر سے پردہ سرکنے سے پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے اندر کی موومنٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ قائداعظم انگیٹھی پر رکھے ہوئے قرآن حکیم پر سر جھکائے کھڑے ہیں، چہرہ آنسوؤں سے تر ہے، تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں، اس کی کسی آیت کا مطالعہ کرنے کے بعد پھر چلنے لگتے ہیں۔ جب ان کے پاؤں لکڑی کے فرش پر پڑتے ہیں تو وہ آواز پیدا ہوتی ہے جس نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا، آیت پڑھ کر ٹہلنا، یعنی وہ غور کر رہے تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ اس دوران میں وہ کوئی دعا بھی مانگ رہے تھے۔'' (صفحہ 239، 240)

غور کیجیے جنرل اکبر سے گفتگو کے دوران بکس منگوانا اور اس سے قرآن مجید نکالنے کا مطلب ہے قائداعظم قرآن مجید اپنے ساتھ رکھتے تھے اور پھر فوراً نشان زدہ صفحہ نکالنے کا مطلب ہے وہ قرآن حکیم پڑھتے، غور کرتے اور نشانیاں بھی رکھتے تھے۔ یہی باتیں عبدالرشید بٹلر نے بھی بتائیں۔ جہاں تک شراب پر پابندی کا تعلق ہے، قائداعظم نے 28 جولائی 1944ء کو ہی راولپنڈی کی ایک تقریب میں ایک سوال کے جواب میں اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں شراب پر یقیناً پابندی ہو گی۔''

(بحوالہ: قائداعظم کے شب و روز، خورشید احمد خان، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، صفحہ 10)

یہی وہ بات ہے جس سے روشن خیال بدکتے اور پریشان ہو کر سیکولرازم کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔ قائداعظم ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ وہ وہی کہتے جو خلوص نیت سے محسوس کرتے اور جس پر یقین رکھتے تھے۔ 19 اگست 1941ء کو ایک انٹرویو میں قائداعظم نے کہا:

- ”جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔“ (حیات قائداعظم، ص 427)

قائداعظم نے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات اور قرآن حکیم پر غور کا ذکر سینکڑوں مرتبہ کیا اور اگر وہ قرآن مجید کا مطالعہ اور اس پر غور کرنے کے عادی نہ ہوتے تو کبھی ایسی بات نہ کرتے۔ 12 جون 1938ء کو انھوں نے جو کہا، اسے وہ مرتے دم تک مختلف انداز سے دہراتے رہے۔ ان کے الفاظ پر غور کیجیے:

- ”مسلمانوں کے لیے پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے پاس تیرہ سو برس سے ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے۔ قرآن پاک میں ہماری اقتصادی تمدنی و معاشرتی اصلاح و ترقی کا سیاسی پروگرام بھی موجود ہے۔ میرا اسی قانون الٰہیہ پر ایمان ہے اور جو میں آزادی کا طالب ہوں، وہ اسی کلام الٰہی کی تعمیل ہے۔“

(ہفت روزہ ”انقلاب“، 12 جون 1938ء، بحوالہ احمد سعید، صفحہ 216)

قرآن فہمی کا فیض ہوتا ہے روشن باطن، جوابدہی کا خوف اور زندہ ضمیر۔ قائداعظم نے ایک بار اپنے باطن کو تھوڑا سا آشکارہ کیا۔ ان الفاظ میں اس کی جھلک دیکھیے اور محمد علی جناح قائداعظم کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو

خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ’’مسلمانو! میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے ہیں۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح! تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح! تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علم اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔‘‘ (’’انقلاب‘‘ لاہور، 22 اکتوبر 1939ء صفحہ آخر کالم 1)

قائداعظم کے الفاظ کو غور سے پڑھیں تو محسوس ہو گا کہ یہ روشن باطن، زندہ ضمیر، اسلام اور مسلمانوں سے محبت اور خوف الٰہی قرآن فہمی ہی کا اعجاز تھا اور مسلمانانِ ہند و پاکستان کتنے خوش قسمت تھے جنھیں ایسا راہنما ملا۔ اسی لیے تو اقبال جیسا عظیم مسلمان فلسفی، مفسر قرآن اور زندہ کلام کا شاعر قائداعظم کو اپنا لیڈر مانتا تھا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ قائداعظم انگریزی لباس پہنتے، انگریزی بولتے اور برٹش انداز کی زندگی گزارتے تھے، اس لیے ان کے بارے میں یہ تاثر پھیل گیا ہے کہ انھیں مذہب اور قرآن مجید سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اسی تاثر کا فائدہ اٹھا کر روشن خیال، سیکولر دانشور یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ محض لوگوں کو مسلم لیگ میں آنے کی ترغیب دینے کے لیے بار بار اسلام اور قرآن حکیم کا ذکر کرتے تھے۔ یہ ان حضرات کا سطحی نقطہ نظر ہے کیونکہ انھوں نے قائداعظم کو سمجھنے کی خلوص نیت سے کوشش ہی نہیں کی، نہ ہی انھیں اصلی قائداعظم ’’سوٹ‘‘ کرتا ہے۔ بظاہر انگریزی لباس پہننے والے محمد علی جناح کا باطن حب رسول ﷺ اور قرآن فہمی سے منور تھا جس کی واضح علامات بلکہ ثبوت

ان کے فرمودات میں ملتے ہیں۔قول وفعل کے تضاد کا الزام تو قائداعظم کے بدترین دشمن بھی نہ لگا سکے، اس لیے یقین رکھیے کہ وہ سچا اور کھرا انسان جو کہتا تھا اس پر قلبی یقین رکھتا تھا۔قائداعظم کا نہ کوئی ذاتی مفاد تھا نہ کوئی ذاتی ایجنڈا، انھوں نے زندگی کا ہر قیمتی لمحہ مسلمان قوم کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔مثلاً جب وہ گاندھی کے نام خط و کتابت (10 ستمبر سے لے کر 30 ستمبر 1944ء) میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔اس میں مذہبی، مجلسی، دیوانی، فوجداری، عسکری، تعزیری، معاشی اور سیاسی، غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں، تو یہ ان کی قرآن فہمی کا اعجاز ہے۔اسی طرح جب قائداعظم 4 مارچ 1946ء کو شیلانگ میں خواتین کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

❑ ''ہندو بت پرستی کے قائل ہیں، ہم نہیں ہیں۔ہم مساوات، حریت اور بھائی چارے کے قائل ہیں۔جبکہ ہندو ذات پات کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم صرف ایک ہی بکس میں اکٹھے ہو جائیں۔آیئے اپنی کتاب مقدس قرآن حکیم اور حدیث نبوی ﷺ اور اسلام کی عظیم روایات کی طرف رجوع کریں جن میں ہماری راہنمائی کے لیے ہر چیز موجود ہے۔ہم خلوص نیت سے ان کی پیروی کریں اور اپنی عظیم کتاب قرآن کریم کا اتباع کریں۔''

تو یہ الفاظ ان کے قلب کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے اور اسی جذبے کے ساتھ قائداعظم نے مشورہ دیا:

❑ ''ہر مسلمان کے پاس قرآن کریم کا ایک نسخہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی راہنمائی خود کر سکے کیونکہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات (Complete Code) ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔''

(قائداعظم کی تقاریر، مرتبہ خورشید یوسفی، جلد سوم، ص205، عید پیغام، 8 ستمبر 1945ء)

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، قرآن ایک مکمل کوڈ ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں راہنمائی کرتا ہے، قرآن اور اسوۂ حسنہ ﷺ کا اتباع ہماری نجات کی ضمانت دیتا

ہے۔ 'یہ الفاظ' یہ مفہوم اور پیغام قائداعظم نے اتنی بار دیا کہ اس کی گنتی کرنی ممکن نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی سچا کھرا اور صاحب کردار یہ بات لگاتار کئی برس تک اور موت تک کہتا رہے تو یہ اس کے سچے عشق اور گہری لگن کی علامت ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں مذہبی شعور کے احیا اور اسلامی تعلیمات میں گہری دلچسپی کا ہی نتیجہ تھا کہ قائداعظم وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے ملے اور اس سے اجازت لے کر عید کے موقع پر **13** نومبر **1939**ء کو آل انڈیا ریڈیو سے مسلمانان ہندو پاکستان سے خطاب کیا۔ یہ خطاب پڑھنے کے لائق ہے کیونکہ اس میں فلسفہ رمضان ونماز اور تعلیمات رسول کریم ﷺ پر جس طرح قائداعظم نے روشنی ڈالی ہے، یہ ان کی قرآن فہمی کا زندہ ثبوت ہے۔ اقتباسات دینے ممکن نہیں، صرف ان چند الفاظ پر غور کیجیے تو آپ پر اسلام کی روح کے دروازے کھلتے جائیں گے۔ قائداعظم کے الفاظ تھے:

❑ **"Man has indeed been called God's caliph in the Quran.... it imposes upon us duty to follow the Quran and to behave towards others as God behaves towards his mankind. (Speeches of Quaid-e-Azam, Khurshid Yousafi, Vol.II, p.1060-62)**

وزیرآباد کے معلم طوسی صاحب قائداعظم کی دعوت پر ان کی لائبریری میں چند ماہ کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ قائداعظم کی لائبریری میں قرآن حکیم کے کئی تراجم موجود تھے جنھیں وہ پڑھتے رہتے تھے۔ جناب شریف الدین پیرزادہ کئی برس قائداعظم کے سیکرٹری رہے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا:

❑ ''قائداعظم کے پاس قرآن حکیم کے چند ایک عمدہ نسخے تھے۔ ان میں کچھ قلمی بھی تھے۔ ایک بہترین نسخہ احتراماً جزدان میں ان کے بیڈروم میں اونچی جگہ رکھا رہتا تھا۔ میں نے انھیں محمد مارماڈیوک پکتھال کا قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ پڑھتے دیکھا۔ پکتھال انگریز تھا جو بعدازاں مسلمان ہوگیا۔'' (بحوالہ قائداعظم اور قرآن فہمی، محمد حنیف شاہد، صفحہ **73**)

۞......۞......۞

مولانا غلام مرشد

قائداعظم کی قرآن سے محبت

قائداعظمؒ کا قرآن مجید کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق تھا اور وہ اس بات میں کس قدر مخلص تھے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن میں اس میں ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں، جسے میں نے اپنی شہادت کہہ کر پکارا ہے۔ 1945ء کے آخری ثلث کی بات ہے کہ قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کے ساتھ ''ممدوٹ وِلا'' لاہور میں قیام پذیر تھے۔ ایک نمائندے کے ذریعے مجھے یاد فرمایا۔ میں فوراً تیار ہو گیا، لیکن خیال آیا کہ ...... زبان یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم...... میں انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتا اور قائداعظم شاید میری زبان کو پوری طرح سمجھ نہ پائیں تو باہمی گفتگو کا نقشہ کیا ہو گا؟ اتفاق سے اس وقت میرے پاس مسٹر ایم مسعود کھدر پوش (جو اس زمانے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر تھے) بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو ساتھ چلنے کے لیے کہا کہ وہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہم ممدوٹ وِلا پہنچے تو قائداعظم ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس کا دروازہ بڑے ہال کی طرف بھی کھلتا تھا، میرے منتظر بیٹھے تھے، سلام مسنون کے بعد انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمھیں ایک بڑے اہم دینی مقصد کے لیے بلایا ہے۔

جمعیت العلمائے ہند (دہلی) جس کے سرپرست مفتی کفایت اللہ (مرحوم)، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسے نیشنلسٹ علماء، برسوں سے تحریک پاکستان کی مخالفت میں سرگرم عمل ہیں۔ بہت سے علما ہمارے ہمنوا بھی ہیں، لیکن ان کی کوئی تنظیم نہیں، کچھ عرصہ سے یہ کوشش جاری تھی کہ ان علما پر مشتمل

ایک متوازی جمعیت قائم کی جائے، اس کا مرکز کلکتہ تجویز پایا اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کر دی گئیں۔ اس کا افتتاحی اجلاس چند دنوں کے بعد کلکتہ میں ہونا قرار پایا۔ اس سلسلے میں ملک بھر میں دعوت نامے بھی جاری کر دیئے اور مولانا راغب احسن (مرحوم) کے زیر سرکردگی جملہ انتظامات بھی مکمل کر لیے گئے، اس جمعیت کے نامزد صدر، مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کا افتتاح کرنا تھا کہ سوءِ اتفاق سے وہ دیوبند میں علیل ہو گئے ہیں۔ جمعیت کے اجلاس میں چند روز باقی ہیں، وہ اس میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد قائداعظم نے اپنے مخصوص ''جرنیلی'' انداز میں فرمایا کہ تم جلد از جلد خطبہ افتتاحیہ تیار کرو اور 24۔25 اکتوبر تک کلکتہ پہنچ جاؤ۔ وہ ضابطہ کے اس قدر پابند تھے کہ انھوں نے کہا کہ تم ''شعبۂ عمومی سیاست'' میں میرے نائب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرو اور ضروری دینی خدمت کو سرانجام دو۔ خاکسار نے ان کی اس سرفرازی پر شکریہ ادا کیا اور اس ضرورت کو اپنا اہم ترین فریضہ سمجھ کر رخصت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو، جس شخص کے نائب بن کر تم وہاں جا رہے ہو، اس کی پوزیشن کے متعلق چند بنیادی نکتے ذہن میں رکھ کر وہاں جاؤ۔ ان کے سامنے میز پر قران کریم کا انگریزی ترجمہ رکھا تھا، اسے ہاتھ میں لے کر فرمایا، میرا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ اس کتاب عظیم میں دنیا اور آخرت کی زندگیوں کے متعلق مکمل ضابطے اور آئین موجود ہیں۔ تمدنی، معاشی اور اخلاقی، انمٹ اور دائمی قواعد موجود ہیں۔ عسکری تنظیم اور مملکت کے داخلی اور خارجی استحکام کے انمٹ قوانین موجود ہیں۔ لوگوں کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے ابدی ضوابط موجود ہیں، لیکن یہ قواعد اور ضوابط بالعموم اصولی حیثیت سے دیئے گئے ہیں، ان پر عمل پیرا اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ہوا جائے گا۔

اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے قواعد وضوابط مرتب کرے اور نافذ کرے۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے

کہ جرم کی سزا جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس پر میں نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے ذہن میں غالباً قرآن کریم کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے:

❑ ''وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ'' (الشوریٰ:40)

''اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔''

اس پر انھوں نے قرآن حکیم کھولا اور اس آیت کو دیکھ کر فرمایا، بے شک یہی آیت میرے ذہن میں تھی۔ اس کے بعد کہا، دیکھو یہ ایک اصولی حکم ہے اور ابدی۔ یہ دیکھنا اسلامی مملکت کا کام ہوگا کہ معاشرہ کے عام حالات کی روشنی میں کس جرم کی سزا کتنی ہونی چاہیے جو قرآن کریم کے اصولوں کے مطابق ہو۔ سب سے پہلے رسول کریم ﷺ نے یہ ضمنی قوانین مرتب فرمائے۔ اس پر میں نے سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے عرض کیا، حضور نبی کریم ﷺ نے ایسا خود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کیا تھا جس کی رُو سے کہا گیا تھا:

❑ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ (آل عمران:159)

''اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔''

انھوں نے پھر قرآن مجید کھولا اور اس آیت کو نکال کر کہا کہ یہ بات بالکل واضح ہے۔ اگر قرآن مجید کے اصولی احکام کے جزئی قوانین مرتب کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو مشاورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد اُمت کو بھی اسی طرح تدوین قوانین کرنی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے لیے بھی اللہ کا حکم موجود ہے جس میں کہا گیا ہے:

❑ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۖ (الشوریٰ:38)

''اور وہ اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔''

انھوں نے پھر قرآن حکیم سے یہ آیت نکالی اور کہا اللہ کی یہ ہدایت ہماری راہنمائی کے لیے کس قدر واضح ہے۔ اسلامی مملکت جس کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آئین کی بنیاد یہی ہوگی۔

قائداعظم ان باتوں میں مصروف تھے اور کمرے کا دروازہ باہر سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا، کیونکہ مسلم لیگ کے اراکین ضروری کارروائی کے لیے مضطرب تھے۔ اس پر میں نے اٹھنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں تمھیں کچھ نظائر معلوم ہوں تو مثال کے طور پر مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ سورۂ انفال کی پہلی آیت میں جنگ میں حاصل شدہ مال کے متعلق ایک اصولی حکم ہے کہ وہ مال ''اللہ اور رسول ﷺ'' کا ہوگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مختلف جنگوں میں حاصل شدہ مال غنیمت کی تقسیم مختلف انداز سے ہوئی۔ جنگ بدر کے خاتمہ پر ایک انداز سے، خیبر کی فتح کے بعد دوسرے انداز سے، جنگ حنین اور ہوازن میں جو بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے وہ سارے کا سارا مال ان مجاہدین میں تقسیم کر دیا جو ابھی کچھ عرصہ سے فتح مکہ کے وقت حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ اس پر بعض گوشوں میں کچھ باتیں بھی ہونے لگیں، لیکن جب حضور ﷺ نے اس کی مصلحت سمجھائی تو وہ بیک زبان پکار اٹھے کہ **رَضِینَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ**، حضور ﷺ ہم مطمئن ہیں۔

وہ ان تفصیلات کو بڑے جذب وانہماک سے سن رہے تھے۔ وہ اس گفتگو کے لیے زیادہ وقت دینا چاہتے تھے، لیکن مسلم لیگ کی کارروائی کے اصرار پر انھیں اسے مختصر کرنا پڑا۔ میں اٹھا تو فرمایا کہ جاتے جاتے ایک بنیادی نکتہ بھی ذہن میں لے کر جاؤ۔ کہا کہ میری نظر میں قرآن مجید کے فیصلے کے مطابق دو بدترین اور ناقابل معافی جرم ہیں۔ ایک شرک اور دوسرا تفرقہ۔ تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر، خواہ سیاسی راہنماؤں کے نام پر ہو۔ وطنیت کے نام پر ہو، رنگ ونسل اور خون کے نام پر، بہرحال جرم عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی، لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت وخواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک مومن اور دوسرے کافر۔ اسی کا نام دوقومی نظریہ ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابل معافی جرم قرار پائے گا۔ اس نکتے

کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا، جاؤ خدا حافظ!

میں رخصت ہو کر آیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ یہ شخص جسے عام طور پر صرف ایک بیرسٹر سمجھا جاتا ہے، اس کی اسلام کے بنیادی اصولوں پر کتنی گہری نگاہ ہے اور اس شخص کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ذہن میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی، کتنا بڑا کذب و افترا ہے۔

میں نے حسب الارشاد خطبہ تیار کیا اور کلکتہ چلا گیا۔ ہم چار دن وہاں رہے لیکن کیفیت یہ تھی کہ قائداعظم جہاں بھی تھے، ہم سے رابطہ قائم کیے رہے اور تفصیلات معلوم کرتے رہے۔ آخری اجلاس ختم ہونے سے پہلے ان کی طرف سے تنظیم کے متعلق بھی ضروری ہدایات موصول ہو گئیں اور قراردادوں کے سلسلے میں بھی۔ ان قراردادوں میں یہ کہا گیا تھا کہ:

1- تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر ہے جو قرآن مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل اصول ہے۔

2- اگر خدا نے تحریک پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبیین ﷺ کی طرز پر حکومت قائم ہو گی، جس کا نام خلافت علیٰ منہاج نبوتؐ ہو گا۔ بالفاظ دیگر اس حکومت کے ہر دائرے میں قرآن حکیم کی حکمرانی ہو گی۔

3- اکھنڈ بھارت کی اسکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ (اور ان کے علاوہ کچھ تنظیمی قراردادیں) اس مرد مومن کی ہدایات کے مطابق مرتب اور منظور کی گئیں جسے ایک گوشے سے ''کافر اعظم'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اور دوسرے گوشے سے یہ آواز بلند کی جاتی تھی کہ اس اسکیم کے مطابق جو مملکت قائم ہو گی اس میں حکومت ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہو گی۔

تشکیل پاکستان کے بعد قائداعظم کے پیش نظر سب سے پہلے اور سب سے اہم مقصد اس سرزمین کی سرحدوں کا تحفظ تھا اور جن لوگوں کی آنکھوں پر حسد اور تعصب

نے پٹی نہیں باندھ دی، انھیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ایسا کرنا خود قرآن مجید ہی کے ارشاد کی تعمیل میں تھا، وہ تشکیل پاکستان کے بعد ایک سال تک زندہ رہے۔ زندہ کیا، یوں کہیے کہ صرف سانس لیتے رہے اور جس مہلک مرض کا وہ شکار ہو گئے تھے، اسے ایک راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصہ میں انھوں نے اندرون ملک کی تنظیم اور بیرونی خطرات کی مدافعت کے سلسلے میں جو کچھ کیا، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر نحیف و نزار مریض شخص محض قوت ایمانی کے بل بوتے پر کیا کچھ کر سکتا ہے۔

میں مختلف مکتبوں اور دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بڑی بڑی نامور ہستیوں سے شرف تلمذ اور تعارف حاصل رہا۔ میں نے سیاسی لیڈروں کو بھی دیکھا اور مذہبی راہنماؤں کو بھی، لیکن مجھے پوری زندگی میں قائداعظم سے بڑھ کر کوئی شخصیت متاثر نہ کر سکی، میں نے ہر ایک کو ان سے کمتر پایا۔ بلندیٔ کردار کے اعتبار سے بھی اور قرآنی بصیرت کے نہج سے بھی۔ اس قسم کے انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان کے خلاف ہذیان بک رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ چاند پر تھوکا خود اپنے منہ پر آیا کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک تو کجا، سب مل کر بھی اس بطلِ جلیل کے غبارِ راہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اللہ اسے اپنے سحاب کرم کے سائے میں رکھے۔ آمین!

منیر احمد منیر

قائداعظم اور تلاوت قرآن کریم

پبلک میٹنگوں اور نجی محفلوں میں پروفیسر ڈاکٹر مہدی حسن کا زور بیان ان دنوں اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ ''قائداعظم کی صدارت میں جتنے اجلاس ہوئے، ان میں تلاوت قرآن کریم نہیں ہوئی تھی۔'' (روزنامہ جنگ، لاہور 22 دسمبر 1997ء)

یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بے سروپا اظہار سے وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی اس دلیل کو پیش نظر رکھا جائے کہ قائداعظم کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں اس لیے تلاوت قرآن کریم نہیں ہوتی تھی کہ قائداعظم کے ذہن میں مذہبی نہیں، سیکولر سٹیٹ کا نقشہ تھا تو بھی بات نہیں بنتی، کیونکہ پروفیسر صاحب کی اس دلیل سے نہ تو مذہبی ریاست کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور نہ لادینی ریاست کا۔ یہ ایک الگ بحث ہے، اس وقت زیر بحث موضوع ''قائداعظم کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں تلاوت قرآن کریم'' ہے۔

جہاں تک کسی تقریب سے قبل تلاوت قرآن کریم کا تعلق ہے تو ہم آئے روز دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ راگ رنگ کی محفلوں کا آغاز بھی تلاوت سے کرتے ہیں۔ اس طرح کیا عیش ونشاط کی وہ تقریب روحانی یا اسلامی ہو جاتی ہے؟ دوسری طرف اگر کوئی کام یا منصوبہ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے شروع کیا جا رہا ہو، اگر وہاں تلاوت قرآن کریم نہ کی جائے تو کیا اس منصوبے یا کام کے پیچھے کارفرما اچھے جذبات برائی میں بدل جائیں گے؟

اصل چیز نیت ہے، آپ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز کھولتے ہیں، اس کا افتتاح

تلاوت قرآن کریم سے کرتے ہیں لیکن منافع خوری، چور بازاری، ٹیکس چوری اور سمگلنگ کے مال کی خرید وفروخت آپ کا چلن ٹھہرتی ہے تو آپ کی اس تلاوت کا کیا فائدہ؟ آپ نے اپنے کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے محروم رکھا۔ آپ نے قرآن کریم سے کوئی راہنمائی لینے کے بجائے محض ایک رسم نبھا کر اپنے آپ کو دھوکے کی ٹٹّی میں غرق کر لیا جبکہ قرآن کہتا ہے ''تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں ہو؟'' جبکہ قائداعظم کی ساری سیاسی زندگی اس قرآنی فرمان کے مطابق تھی۔ وہ جو بات کہتے تھے، وہی کرتے تھے۔ جو کرتے تھے، وہی کہتے تھے اور ببانگ دہل۔ ان کی زندگی لاگ لپیٹ سے مبرا تھی، نیت اُجلی تھی، طریق کار پُرخلوص اور انداز بے لوث تھا۔ ان کا اور ان کے زیرِ صدارت ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ کے اجلاسوں کا مقصد بہت بلند ہوتا تھا۔

شاید پروفیسر مہدی حسن بھی ان لوگوں کی صف میں آنا چاہتے ہیں یا آ چکے ہیں جو تاریخی حقائق مسخ کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں یا خوامخواہ کے لایعنی اور بے مقصد مباحث کو ہوا دے کر عوام میں کنفیوژن پیدا کرنے کا وطیرہ اپنا چکے ہیں۔ میرے لیے پروفیسر صاحب کے حوالے سے یہ بڑی ہی مایوس کن بات ہے کہ وہ بھی بلاتحقیق اور انٹ شنٹ بیان بازوں کے اتباع میں ایک ایسی بات کہے چلے جا رہے ہیں جس کی کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں۔

یہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ جس چیز پر معترض ہوتے ہیں، وہ خود بھی اس کے حق میں نہیں ہوتے۔ لیکن معاشرے میں ذہنی افراتفری پیدا کرنے کے لیے کہہ دیں گے کہ فلاں شخص نے یہ چیز کیوں نہ کی؟ افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ پروفیسر مہدی حسن جیسے شخص بھی بغیر کسی پرچول اور ٹٹول کے مذکورہ بیان داغے چلے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے ان کی عمر اتنی نہیں کہ انھیں قائداعظم کی صدارت میں ہونے والے بعض اجلاسوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا ہو لیکن وہ لوگوں کے اذہان میں زہر گھولنے سے پہلے مطبوعہ مواد سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں مسلمان تبرک کے طور پر تقریبات کا آغاز بالعموم تلاوت قرآن کریم سے

کرتے ہیں اور یہ بابرکت اور مسعود روایت قائداعظم کے اجلاسوں میں بھی تھی۔ یہاں ہر جلسے کے متعلق ایسا مواد دینا تو ممکن نہیں، بطور نمونہ چیدہ چیدہ اجلاسوں کا ذکر کر رہا ہوں:

19 اکتوبر 1936ء کو قائداعظم پشاور کے شاہی باغ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کے لیے آتے ہیں۔ عزیز جاوید اپنی کتاب ''قائداعظم اور سرحد'' کے صفحہ 61 پر لکھتے ہیں:

- ''قائداعظم اپنا وہی سفید ہیٹ اور سفید سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے پشاور کے غلام محمد نے نعت رسول مقبول ﷺ پڑھی۔ اس کے بعد پیر بخش خان نے آغا لعل بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ کرسی صدارت پر تشریف لائیں۔ آغا لعل بادشاہ کی صدارت میں جلسے کی ابتدا تلاوت قرآن کریم سے ہوئی۔ پہلوان حافظ فضل محمود نے تلاوت ختم کی تو پیر بخش خان نے حاضرین کو قائداعظم سے متعارف کرانے کے لیے مختصر تقریر کی...... قائداعظم نے تقریباً تیس (30) منٹ تک تقریر کی۔''

21 اکتوبر 1936ء کو قائداعظم اسلامیہ کالج کی خیبر یونین کی دعوت پر اسلامیہ کالج تشریف لے گئے...... محمد یوسف کی صدارت میں روس کیبل ہال میں جلسہ ہوا۔ سب سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت ہوئی۔ تلاوت کے بعد پشاور کے پروفیسر امداد حسین بیگ نے قائداعظم کی شان میں یہ نظم پڑھی......

(''قائداعظم اور سرحد''، صفحہ 66، پبلشر ادارۂ تحقیق و تالیف، پشاور)

مارچ 1941ء کو لاہور میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام پاکستان سیشن ہوا۔ اس میں شرکت کے لیے قائداعظم یکم مارچ کو لاہور پہنچے۔ اسی روز انھوں نے فیڈریشن کے پنڈال میں پرچم کشائی کی۔ خواجہ اشرف احمد راوی ہیں ''قرآن حکیم کی آیات سے جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا''

(بحوالہ پندرہ روزہ ''آتش فشاں'' قائداعظم نمبر، دسمبر 1976ء، صفحہ 76)

1941ء میں قائداعظم نے راولپنڈی مسلم لیگ کے زیر اہتمام اسلامیہ سکول کے میدان میں خطاب کیا۔ بقول میاں حیات بخش ''قائداعظم کی صدارت میں جلسہ

شروع ہوا، مولوی مولا بخش نے تلاوت کی'' (بحوالہ ''آتش فشاں''، صفحہ 260)

28 اپریل 1944ء کو قائداعظم پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے سیالکوٹ جاتے ہیں، یکم مئی کو وہ واپس لاہور آتے ہیں۔ اس سیشن کی استقبالیہ کمیٹی کے سیکرٹری جنرل مرحوم سید مرید حسین تھے، وہی سٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نوٹس میرے پاس محفوظ ہیں جن کے مطابق 28 اپریل کو قائداعظم نے سیشن کی افتتاحی نشست سے خطاب کیا۔ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ان نوٹس میں درج ہے تلاوت کلام: نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب آنرری سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ، نعت شریف، شیخ نصیر صاحب، راولپنڈی۔

29 اپریل کو قائداعظم نے تالاب شیخ مولا بخش میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ عزیز جاوید رقم طراز ہیں:

❑ ''جلسے کے آغاز میں تلاوت کلام پاک کے بعد قائداعظم کی تقریر سے پہلے پیرزادہ احمد گل نے پشتو میں اور سید چن شاہ حیدری قلندر نے اُردو میں استقبالیہ ترانہ پڑھا۔'' (بحوالہ ''قائداعظم اور سرحد''، صفحہ 119)

25 نومبر 1945ء کو قائداعظم نے سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب کیا۔ عزیز جاوید ''قائداعظم اور سرحد'' کے صفحہ 132 پر لکھتے ہیں:

❑ ''......جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ایک طالب علم جب قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا تو قائداعظم نے سردار عبدالرب نشتر سے آہستہ سے کہا "Give him a chair." (اسے کرسی دو) سردار عبدالرب نشتر نے ادھر اُدھر دیکھا، کرسی کوئی نہ تھی۔ قائداعظم نے دوبارہ سردار صاحب سے کہا ''اسے کرسی دو'' اب سردار صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کرسی قاری کو دی گئی۔ قاری نے کرسی پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کی۔''

بطور گورنر جنرل قائداعظم 11 اپریل 1948ء کو سرحد کے دورے پر گئے۔

عزیز جاوید رقمطراز ہیں:

❑ ’’15 اپریل 1948ء کو پشاور کے فضائی مستقر پر گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے 2/15 پنجاب مشین گن رجمنٹ کے نامور نوجوانوں کو ان کی بہادری اور اولوالعزمی کے کارناموں پر انعامات تقسیم کیے۔ تمغات کی تقسیم سے قبل لیفٹیننٹ جنرل سی اے ایل ڈیوس نے رجمنٹ کی طرف سے ایک عالم دین سے درخواست کی کہ وہ تلاوت قرآن پاک سے تمغات تقسیم کرنے کی رسم کا افتتاح فرمائیں۔ اس طرح پاکستانی فوج کی تاریخ میں پہلی بار قرون اولیٰ کے عہد رفتہ کی یاد تازہ ہوگئی۔‘‘ (بحوالہ ’’قائداعظم اور سرحد‘‘، صفحہ 224)

مصنف اسی کتاب کے صفحہ 235 پر لکھتا ہے:

❑ ’’17 پریل 1948ء کو پشاور کے گورنمنٹ ہاؤس میں سرحد کے آزاد قبائل کا ایک عظیم الشان جرگہ منعقد ہوا۔ اس جرگے میں سرحد کے تمام قبیلوں کے سردار موجود تھے۔ یہ جرگہ اپنی نوعیت میں ایک پہلا جرگہ تھا جس میں سرحد کے تمام قبائل کے سرداروں نے شرکت کی۔ جرگہ کے شروع میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد سرحد کے قبائلیوں کی طرف سے قائداعظم کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔‘‘

20 اپریل 1948ء کو قائداعظم نے پشاور کے کننگھم پارک (اب جناح پارک) میں ایک بے مثال جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ کتاب ’’قائداعظم اور سرحد‘‘ کے صفحہ 249 کے مطابق:

❑ ’’سب سے پہلے تلاوت کلام پاک ہوئی اور اس کے بعد حضرت سید فضل اکبر بادشاہ صاحب نے قائداعظم کی خدمت میں پشاور کے شہریوں کی طرف سے یہ سپاسنامہ پیش کیا۔‘‘ اس کے بعد قائداعظم نے تقریر کی۔

چند روز ہوئے مجھے پروفیسر افضل حق قرشی صاحب نے بتایا کہ ایک نجی محفل میں پروفیسر مہدی حسن نے ان سے یہ بات چھیڑی جس کی بقول قریشی صاحب کے، انھوں نے تردید کی۔ اس پر مہدی حسن صاحب نے انھیں کہا کہ سید شریف الدین

پیرزادہ نے بھی قائداعظم کے جلسوں میں تلاوت قرآن کریم کا ذکر نہیں کیا۔ تو لیجیے اب ہم سید شریف الدین پیرزادہ کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ سید صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں اور کونسل کی میٹنگوں پر مبنی ریکارڈ سے ''فاؤنڈیشنز آف پاکستان'' کے عنوان سے انگریزی میں تین جلدیں مرتب کی ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا غیر معمولی اجلاس کلکتہ میں 7 ستمبر 1920ء کو قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اوّل، صفحہ 541 کے مطابق ''سیشن کی کارروائی کا آغاز قرآن کریم کی تلاوت سے ہوا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کا پندرہواں سیشن لکھنؤ میں 31 مارچ 1923ء کو شروع ہوا۔ غلام محمد بھرگڑی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ یکم اپریل کو کورم ٹوٹنے کی وجہ سے سیشن غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی ہو گیا۔ اس دوران 9 مارچ 1924ء کو غلام محمد بھرگڑی انتقال کر گئے۔ ملتوی شدہ پندرہواں اجلاس لاہور میں 24-25 مئی 1924ء کو گلوب تھیٹر میں ہوا۔ یہ سینما میکلوڈ روڈ پر اب بھی موجود ہے۔ اب اس کا نام صنوبر سینما ہے۔ اس سیشن کی صدارت قائداعظم نے کی۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد اوّل کے صفحہ 575 پر درج ہے:

❑ ''قرآن پاک کی تلاوت کے بعد ریسیپشن کمیٹی کے چیئرمین آغا محمد صفدر نے اُردو میں استقبالیہ تقریر کی۔''

اس کے بعد قائداعظم نے صدارتی تقریر کی۔

22 تا 24 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس لاہور میں ہوا، وہی تاریخی اجلاس جس میں قرارداد لاہور منظور ہوئی تھی۔ قائداعظم دو بج کر پچیس منٹ پر پنڈال میں پہنچتے ہیں، ان کا پُر جوش استقبال کیا جاتا ہے۔ قائداعظم نے اجلاس کی صدارت کی۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان، جلد دوم، مطبوعہ 1970ء پبلشر نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی، صفحہ 326 پر درج ہے:

❑ ''قرآن کریم کی تلاوت کے بعد نظمیں پڑھی گئیں جن میں میاں بشیر احمد کی

''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' بھی شامل تھی۔ اس کے بعد چیئرمین استقبالیہ کمیٹی نواب سر شاہنواز خان آف ممدوٹ نے استقبالیہ پڑھا، اس کے بعد قائداعظم نے تقریر کی۔''

12 سے 15 اپریل 1941ء آل انڈیا مسلم لیگ کا اٹھائیسواں اجلاس مدراس میں قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ 350 کے مطابق:

- ''اجلاس کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کا انتیسواں اجلاس 3 تا 6 اپریل 1942ء کو الہ آباد میں قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ 378 پر درج ہے:

- ''سیشن کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا۔''

24 تا 26 اپریل 1943ء آل انڈیا مسلم لیگ کا تیسواں سیشن منعقدہ دہلی، زیر صدارت قائداعظم محمد علی جناح۔ سید شریف الدین پیرزادہ کی مرتبہ مذکورہ کتاب کے صفحہ 399 پر لکھا ہے:

- ''قرآن کریم کی تلاوت کے بعد چیئرمین استقبالیہ کمیٹی مسٹر حسین ملک نے اپنا ایڈریس پڑھا۔ اس کے بعد قائداعظم نے اپنا صدارتی خطبہ دیا۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کا اکتیسواں اجلاس کراچی میں 24 تا 26 دسمبر 1943ء کو ہوا۔ قائداعظم کی صدارت میں سیشن کی کارروائی شروع ہوئی۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ 442 کے مطابق'' کارروائی کا آغاز قرآن کریم کی تلاوت سے ہوا۔''

30 جولائی 1944ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ششماہی اجلاس لاہور کے برکت علی اسلامیہ ہال میں قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ مذکرہ کتاب کے صفحہ 489 پر لکھا ہے:

- ''کارروائی کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا، اس کے بعد مسٹر جناح، راج گوپال اچاریہ کے فارمولا پر اظہار رائے کے لیے اٹھے......''

7 تا 9 اپریل 1946ء کو اینگلو عربک ہال دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ لیجسلیچرز کنونشن ہوا۔ اجلاس کی صدارت کے لیے نواب صدیق علی خان نے قائداعظم کا

نام تجویز کیا۔نواب ممدوٹ نے اس کی تائید کی۔تحسین و آفرین کے پُرجوش نعروں کی گونج میں قائداعظم کرسی صدارت پرتشریف فرما ہوئے......تلاوت کلام پاک کے بعد قائداعظم ٹھیک 6 بج کر 3 منٹ پرتقریر کے لیے اٹھے۔'' (ایضاً صفحہ 506)

ایک اور بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ عام طور پر اخباری رپورٹنگ کرتے وقت رپورٹر حضرات صرف مقررین کی تقریریں دیتے ہیں، تلاوت کلام پاک اورنظموں وغیرہ کا ذکرنہیں کیا جاتا، کیونکہ اسے ایک طے شدہ امر سمجھا جاتا ہے کہ تقریب کی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔میں 1968ء سے 1978ء تک روزنامہ ''نوائے وقت''، روزنامہ ''جاوداں'' اور ہفت روزہ ''زندگی'' وغیرہ سے منسلک رہا ہوں۔ یہ میرے اپنے تجربے کی بات بھی ہے اور خود پروفیسر مہدی حسن بھی یونیورسٹی جوائن کرنے سے قبل کارکن صحافی تھے۔ یقیناً انھیں بھی اس کا علم ہوگا۔اسی طرح کتابیں مرتب کرنے والے حضرات بالعموم تلاوت کلام پاک کا ذکرنہیں کرتے بلکہ جب کسی شخصیت کی تقریریں مرتب کی جاتی ہیں تو کتاب میں اس کی تقریروں کے علاوہ کوئی تفصیل نہیں دی جاتی۔یہی حال قائداعظم کی تقاریر اور بیانات وغیرہ پر مشتمل کتب کا ہے۔

بہرحال میں نے مضمون کومختصر رکھتے ہوئے حوالوں کے ساتھ ان کے اس مؤقف کا جواب دیا ہے جس کا اظہار انھوں نے 21 دسمبر 1997ء کو لاہور میں کرسچیئن لبریشن فرنٹ کے زیر اہتمام قومی اتحاد و یکجہتی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کیا کہ:

❑ ''قائداعظم کی صدارت میں جتنے اجلاس ہوتے تھے،ان میں تلاوت قرآن کریم نہیں ہوتی تھی۔'' (روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 22 دسمبر 1997ء)

پروفیسر صاحب تیس برس تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں ماس کمیونی کیشن (ابلاغ عامہ) پڑھاتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے اُردو میں کتاب بھی لکھی۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی طرف سے یقیناً ٹھوس وار کرنے کی کوشش کی ہے کہ عوام کی دُکھتی رگ کو چھیڑا جائے، لیکن انھیں ماس کمیونی کیشن کا یہ اصول بھی یاد رکھنا چاہیے تھا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اگر غیر تحقیقی بیان سے وقتی

طور پر عوام کو کسی خاص مسئلے یا معاملے یا شخصیت کے بارے میں ذہنی الجھن میں مبتلا کر بھی دیا جائے تو ریکارڈ کے حوالے سے جب جواب آئے گا تو اس سے نہ صرف اس بیان کا کذب واضح ہو جائے گا بلکہ بیان دینے والے کی صداقت، اعتبار اور وقار کو بھی ایسا نا قابل یقین دھچکا لگے گا کہ آئندہ وہ سچی بات بھی کرے گا تو کون اس کا اعتبار کرے گا۔ اسی لیے زبان کو احتیاط سے استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

قائداعظم کے اسلامی نظریات

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیام پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان میں مسلمان انگریزوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے بدترین معاشی استحصال کا شکار تھے اور وہ ان دونوں سے رہائی چاہتے تھے مگر قیام پاکستان کا اصل محرک اسلامی نظام کا نفاذ تھا کہ اسلامی نظام ہی دراصل ہر طرح کے استحصال اور ناانصافی سے نجات دلا کر عدل وانصاف اور مساوات کی ضمانت دے سکتا ہے۔ چنانچہ بنگال سے لے کر خیبر تک اور مدراس سے کشمیر تک ہندوستان بھر کے سارے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں جس جوش و جذبے سے شرکت کی، اس کا اوّل و آخر مقصد پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا تھا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان کے دین بیزار مقتدر طبقے نے نہ برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کیا، نہ ان کی بے مثال قربانیوں کی قدر کی اور یوں ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی نوبت نہ آنے پائی۔ یہ عہد حاضر کی تاریخ کا وہ غیر معمولی المیہ ہے کہ جس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔ ''قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے!'' حالانکہ دلائل اور تاریخی شواہد کی دنیا میں اس دعوے کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں ہے اور قائداعظم کا عمل اور ان کے فرمودات اس کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ قائداعظم نے تحریک پاکستان کے دوران ہر مکتب فکر کے علما کا تعاون حاصل کیا اور اپنی تقریروں میں بار بار اس امر کا اعادہ فرمایا کہ پاکستان کا نظام اسلامی شریعت اور تعلیمات کے عین مطابق استوار ہوگا۔

اب میں زمانی ترتیب سے قائداعظم کے چند فرمودات کو مستند حوالے کے

ساتھ پیش کر رہا ہوں جس سے بڑی وضاحت کے ساتھ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر قائداعظم نے لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک انداز میں اسلامی نظام کی وکالت فرمائی۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم پاکستان کو قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ خوف طوالت سے چند حوالوں پر اکتفا کر رہا ہوں، ورنہ اس سلسلے کے فرمودات بہت زیادہ ہیں۔

قیام پاکستان سے چار سال قبل **1943**ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

❑ ''وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا...... ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب، ایک اُمت۔''

8 مارچ **1944**ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اجتماع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال...... یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''

1945ء میں عید کے موقع پر مسلمانوں کے نام ایک پیغام جاری کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی احکام مذہبی اور اخلاقی فرائض تک محدود نہیں۔ جیسا کہ گبن نے کہا تھا ''اوقیانوس سے گنگا تک قرآن کو دینیات ہی نہیں بلکہ سول اور تعزیری قوانین کی بھی بنیاد سمجھا جاتا ہے اور وہ قوانین جن سے بنی نوع انسان کے اعمال

اور حقوق کی حد بندی ہوتی ہے، وہ بھی خدا کے غیر متبدل احکام متعین ہوتے ہیں۔

جاہلوں کی بات الگ ہے، ورنہ ہر کوئی جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی، شہری، کاروباری، فوجی، عدالتی، تعزیری اور قانونی ضابطۂ حیات...... جو مذہبی تقریبات سے لے کر روزمرہ زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، اس دنیا میں جزا و سزا سے لے کر اگلے جہان کی سزا و جزا تک کی حد بندی کرتا ہے۔''

11 جولائی 1946ء کو حیدرآباد دکن کے ایک جلسۂ عام میں قرآن پاک پر اپنے ایمان و یقین کو یوں بیان فرمایا:

❑ ''اس وقت میدان سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے، لوگ پوچھتے ہیں کون فتح یاب ہو گا؟ علم غیب خدا کو ہے لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی راہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشاد خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ہم تعداد میں کم ہونے کے باوجود فتح یاب ہوں گے اور اسی طرح فتح یاب ہوں گے جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران اور روم کی سلطنتوں کے تخت اُلٹ دیئے تھے۔''

14 فروری 1947ء کو شاہی دربار سبّی (بلوچستان) میں دوٹوک انداز میں فرمایا:

❑ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات و اصولوں پر رکھیں۔''

11 اکتوبر 1947ء کو حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب کرتے ہوئے آزادی، جمہوریت اور اسلامی نظام پر اپنے اعتماد کا یوں اظہار فرمایا:

❑ ''جس پاکستان کے قیام کے لیے ہم نے گزشتہ دس برس جدوجہد کی ہے، آج بفضل تعالیٰ ایک مسلمہ حقیقت بن چکا ہے۔ مگر کسی قومی ریاست کو معرض وجود میں

لانا مقصود بالذات نہیں ہوسکتا بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعے کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب وتمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔''

14 اکتوبر 47ء کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنے پیغام میں فرمایا:

❑ ''چاروں طرف سے تاریک بادلوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے، مگر ہم ان کے خوف سے رُک نہیں سکتے کیونکہ مجھے یقین ہے اگر ہم نے قربانی کا وہی جذبہ پیش کیا جیسا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا تو مصیبتوں کے بادل چھٹ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہم پر بھی اپنی رحمتوں کی بارش کرے گا۔ آیئے! آج عیدالاضحیٰ کے دن جو اسلام کے اس جذبۂ ایثار اور قربانی کا مظہر ہے، جس کی اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے، یہ عہد کریں کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق اس نئی مملکت کی تعمیر میں بڑی سے بڑی قربانی دینے اور آزمائشوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں پیچھے نہ رہیں گے۔''

13 جنوری 1948ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

❑ ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔''

25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

❑ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں

ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔"

فروری 1948ء میں ایک امریکی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا:

❑ "پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل وہیئت کیا ہوگی لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل۔ ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ اسلام نے ہمیں انسانی مساوات، انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا درس دیا ہے۔ ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث اور امین ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کے معمار اور بانی کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں۔"

14 فروری 1948ء کو سبّی دربار بلوچستان کے نام پیغام میں فرمایا:

❑ "میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطۂ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم واضع قانون پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے قائم کر رکھا ہے۔ ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں۔ اسلام کا سبق یہ ہے "مملکت کے امور وسائل کے بارے میں فیصلے باہمی بحث وتمحیص اور مشوروں سے کیا کرو۔"

21 فروری 1948ء کو افواج پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم نے فرمایا:

❑ "ہم نے پاکستان کی جنگ جیت لی ہے مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط و مستحکم

بنیادوں پر قائم کرنے کی جنگ ابھی جاری ہے اور اگر ہمیں ایک بڑی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنا ہوگا۔ فطرت کا اٹل اور سفاک قانون ہے ''بقائے اصلح''۔ چنانچہ ہمیں خود کو اس نئی آزادی کا اہل ثابت کرنا ہے۔ فاشزم کے خطرات سے دنیا کو بچانے اور اسے جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کی خاطر کرۂ ارض کے دُور دراز حصوں میں جا کر آپ نے میدان جنگ میں دادِ شجاعت دی ہے مگر اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی نظام عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔ آپ کو ان کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا۔ ہمہ تن ہوشیار۔ سستانے کا موقع ابھی نہیں آیا۔ یقین محکم، ضبط و نظم اور ادائیگی فرض کی دُھن ایسے اصول ہیں کہ اگر آپ ان پر کاربند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کر سکیں۔''

یکم جولائی **1948**ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے قائداعظم نے کراچی میں فرمایا:

- ''میں اشتیاق اور دلچسپی سے معلوم کرتا رہوں گا آپ کی ''مجلس تحقیق'' بینک کاری کے ایسے طریقے کیونکر وضع و اختیار کرتی ہے جو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات کے مطابق ہوں۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے جو مغرب کی وجہ سے دنیا کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ مغربی نظام افراد انسانی کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دُور کرنے میں ناکام رہا ہے بلکہ گزشتہ نصف صدی میں دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور نظام اختیار کیا تو عوام کی پُرسکون خوشحالی حاصل کرنے کے لیے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہ ملے گی۔

اپنی تقدیر ہمیں اپنے منفرد انداز میں بنانی پڑے گی، ہمیں دنیا کے سامنے ایک

مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی تصورات پر قائم ہو۔ ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمانوں کی حیثیت میں اپنا فرض انجام دیں گے۔ انسانیت کو سچے اور صحیح امن کا پیغام دیں گے کہ صرف ایسا امن ہی انسانیت کو جنگ کی ہولنا کی سے بچا سکتا ہے۔ صرف ایسا امن ہی بنی نوع انسان کی خوشی اور خوشحالی کا امین ومحافظ ہوسکتا ہے۔''

14 اگست 1948ء کو پاکستان کی پہلی سالگرہ پر قوم کو پیغام دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

❑ ''یاد رکھیے پاکستان کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اور اگر ہم نے دیانت داری، تندہی اور بے غرضی کے ساتھ کام کیا تو یہ بھی سال بہ سال شاندار ترقی کرتی رہے گی۔ مجھے اپنے عوام پر کامل بھروسا ہے اور یقین ہے کہ ہر موقع پر وہ اسلام کی تاریخ، شان و شوکت اور روایات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے۔''

قائداعظم محمد علی جناح کے افکار اس بات کے مظہر ہیں کہ وہ ایک الگ اسلامی مملکت کا قیام چاہتے تھے، جہاں مسلمان اپنے دین کے مطابق عمل پیرا ہوسکیں جیسا کہ ان کی تقاریر سے ظاہر ہے۔ وہ قرآن حکیم کو ایک ایسا محکم رشتہ قرار دیتے تھے جس نے تمام مسلمانوں کو جسد واحد بنا رکھا ہے۔ کراچی کے مسلم لیگ سیشن میں انھوں نے اس امر کی مزید وضاحت فرمائی کہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے؟ انھوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا ہے؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی عمارت ملّی کی بنیاد قائم ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے؟ پھر خود ہی انھوں نے اس کے جواب میں اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا کہ ''ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ، یہ سنگین چٹان، یہ آہنی لنگر خدا کی عظیم کتاب قرآن مجید ہے۔''

یورپی دانشور بیورلی نکلسن نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ورڈکٹ آن انڈیا'' میں ایک بطلِ عظیم سے مکالمہ کے عنوان سے متعلقہ باب میں قائداعظم سے اپنی (1943ء کی) ایک ملاقات کی تفصیل پیش کی ہے۔اس ملاقات کے دوران مصنف دیگر اہم سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ آپ کن وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک مذہبی اعتبار سے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور پھر اسی شہرۂ آفاق صحافی اور انشاپرداز کی زبانی قائداعظم کا جواب سنیے۔انھوں نے فرمایا:

❑ ''یاد رکھیے اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں بلکہ ایک عملی نظام حیات ہے۔ میں زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں اور پورے نظام حیات (مکمل دین) کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم سمجھتا ہوں۔ زندگی کے ہر اہم شعبے اور ہر عنصر کے لحاظ سے، ہمارے قوانین اور اصول قوانین کے اعتبار سے، ہمارے آرٹ اور فن تعمیر کے لحاظ سے، الغرض ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک ممتاز اور علیحدہ قوم ہیں۔ ان تمام امور میں ہمارا زاویہ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے بلکہ اکثر شعبوں میں کلیتاً متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے۔ زندگی میں ہمیں ان سے مربوط کرنے والی کوئی چیز بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس، یہ سب ان سے مختلف ہے۔ ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، حیوانات کے ساتھ طرزِ عمل، ہر نقطہ پرکار پر ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔''

تحریک پاکستان کا یہی وہ اساسی تصور تھا جس کے خلاف گاندھی نے بڑے غیظ وغضب کے عالم میں کہا تھا:

❑ ''میری روح اس تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریات حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریے کا تسلیم کرنا میرے نزدیک خدا سے انکار کے مترادف ہے کیونکہ میرا دلی عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے۔''

مسٹر گاندھی ایک اور قدم آگے بڑھے اور یہ کہا:

❑ ''میں ایک تنگ نظر ہندومت اور تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب ہونا شروع ہو گئی ہیں لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہوسکتیں۔''

لیکن غیظ و غضب کا یہ طوفان قائداعظم کو مرعوب نہ کر سکا۔ وہ ان اثرات سے بہت بلند واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یکم جنوری **1941**ء کو گاندھی کے نام ایک خط میں کہا:

❑ ''آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؟ اور وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہے جو انسان کو کسی مقصد کے لیے آمادۂ عمل کرتا ہے؟ کیا وہ سیاست ہے، معاشرت ہے یا مذہب؟ تو آپ کا جواب ہوتا تھا کہ وہ مذہب اور خالص مذہب ہے۔ کل تک آپ یہ کہتے تھے اور آج آپ مجھ سے یہ فرما رہے ہیں کہ ''تم مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہو......'' سن لیجیے کہ میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی معیار عطا کرتا ہے۔''

آزاد بن حیدر

قائداعظم کی زندگی کے اہم روحانی واقعات

مولانا شبیر احمد عثمانی

محترم ڈاکٹر محمد مرتضیٰ صدیقی، سابق پروفیسر علوم اسلامیہ، جامعہ ملک سعود، ریاض، سعودی عرب، اپنے جدامجد مولانا نصراللہ شاہ صدیقی سابق انسپکٹر آف اسکولز، علی گڑھ (جو علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے) سے روایت کرتے ہیں کہ انھیں ان کے جدامجد نے بتایا (اور مولانا نصراللہ شاہ صدیقی کو علامہ شبیر احمد عثمانی نے بتایا) کہ جن دنوں وہ (علامہ شبیر احمد عثمانی) حیدرآباد دکن میں حدیث نبوی ﷺ پر کام کر رہے تھے تو متعدد بار قائداعظم نے ان سے پیغامات اور خط و کتابت کے ذریعے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی ان کو مغربی تعلیم یافتہ تصور کرتے ہوئے نظرانداز کرتے رہے اور نہ تو پیغام اور خطوط کا جواب بھیجا اور نہ ہی ان کی ملاقات کی خواہش کا کوئی خاطرخواہ جواب دیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر قائداعظم نے اللہ رب العزت کی بارگاہ اور سرور کائنات حضور اکرم ﷺ کے حضور علامہ صاحب کی اس بے رُخی کو سامنے رکھتے ہوئے گڑگڑا کر دعا کی ہوگی۔ چنانچہ ان کی یہ ''دعا'' مستجاب ہوئی۔ کس قدر خوش قسمت ہیں ہمارے قائداعظم کہ ایک رات خواب میں آقائے نامدار، تاجدار دوعالم، حضور اکرم ﷺ سے ''شرف ملاقات'' حاصل کرتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ ان کو تسلی و تشفی دیتے ہیں اور بالکل اسی رات حضور اکرم ﷺ، علامہ شبیر احمد عثمانی کو (جو حیدرآباد دکن میں مقیم تھے) خواب میں شرف ملاقات بخشتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ ''ہمارا ایک اُمتی آپ سے ملنا اور راہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے،

آپ بمبئی جائیں اوران سے ملاقات کریں اوران کی راہنمائی کریں۔"

حضور نبی اکرم ﷺ کا حکم ہو اور انسان پس و پیش کرے، ایک مومن اور مسلمان تو کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا اور پھر علامہ شبیر احمد عثمانی جیسے "عاشقان رسولؐ" تو سمجھتے تھے کہ انھیں دونوں جہان کی دولت مل گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا "دیدار" اور نبی آخر الزماں ﷺ کی "بشارت" انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ان کی خوش قسمتی کا کوئی حساب نہ تھا۔ شاداں و فرحاں مولانا شبیر احمد عثمانی سب کچھ چھوڑ کر اپنی پہلی فرصت میں بمبئی پہنچتے ہیں اور جب قائداعظم کے درِ دولت پر پہنچتے اور ملازم کو اپنی آمد اور قائداعظم سے ملاقات کی خبر دیتے ہیں تو قائداعظم سراپا آنکھیں بچھائے ان کے انتظار میں اپنے "لان" میں منتظر ہوتے ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اندر تشریف لاتے ہیں تو قائداعظم کو "سراپا انتظار" دیکھتے ہیں اور پھر دونوں "عاشقان رسولؐ" کے درمیان مندرجہ ذیل "مکالمہ" ہوتا ہے:

قائداعظم: حضور والا! میں مسلسل آپ کو پیغامات اور خطوط ارسال کرتا رہا اور آپ سے ملاقات اور راہنمائی کا متمنی رہا تو آپ نے توجہ نہیں فرمائی، لیکن جب "اُن" (حضور اکرم ﷺ) کا حکم ہوا تو تشریف لائے ہیں۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی: کیا آپ کو بھی حضور سرورِ دوعالم ﷺ کی "بشارت" ہوئی ہے؟"

قائداعظم: "میں تو آپ (حضور اکرم ﷺ) کے "ارشاد" کے مطابق ہی آپ سے ملاقات کے لیے کوشش کرتا رہا ہوں۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی: کیا یہ سچ ہے؟"

قائداعظم: "یہ حقیقت ہے۔"

اس "مکالمے" کے بعد دونوں "عاشقان رسولؐ" تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ مختلف اُمور زیر بحث آتے ہیں لیکن سب سے اہم مسئلہ "سفید بنیا" اور "سیاہ بنیا" (یعنی انگریز اور ہندو، قائداعظم انھیں ایسے ہی پکارتے تھے) سے آزادی حاصل کرنا اور مملکت خداداد پاکستان کا قیام تھا۔ چنانچہ تفصیلی ملاقات اور تبادلۂ خیالات کے بعد علامہ

شبیر احمد عثمانی نے قائداعظم کو ہر ممکن تعاون اور راہنمائی کا یقین دلایا۔ اس کے بعد آزادی کے حصول کے لیے یہ ''کارواں'' قدم بہ قدم منزل کی طرف بڑھتا گیا اور بالآخر مملکت خداداد پاکستان عالم وجود میں آ گئی۔

اگر ہم قائداعظم کی مندرجہ ذیل تقریر کو اس تاریخ ساز واقعہ کے ساتھ منسلک کریں اور سیاق وسباق کی روشنی میں مندرجہ ذیل الفاظ پر غور کریں:

''یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے۔''

تو معاملہ بالکل صاف اور واضح ہو جاتا ہے۔ تقریر حسب ذیل ہے:

❑ ''اور جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے تو میرا سر عجز و نیاز کے جذبات کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدہ تشکر بجالانے کے لیے فرط انبساط سے جھک جاتا ہے۔ یہ مشیت ایزدی ہے، یہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس ہند سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد و خودمختار ہے، اس کا اپنا ایک ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت اور سکہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہوسکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اکرم ﷺ سے کیا تھا کہ تیری اُمت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔ پاکستان خداوندی تحفہ ہے اور اس تحفے کی حفاظت ہر پاکستانی مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔ اگر مسلمان نیک نیتی، دیانتداری، خلوص، نظم وضبط اور اچھے اعمال سے دن رات کام کرتے رہے اور ان میں بدی، نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد کا جذبہ پیدا نہ ہوا تو ان شاء اللہ وہ چند سالوں میں ہی دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب وتمدن اور ثقافت وشرافت کا مرکز ہو گا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں پھیل کر سارے ایشیا کی راہنمائی اور راہبری کریں گی۔ (قائداعظم اور قرآن فہمی از محمد حنیف شاہد)

خواجہ قمرالدین سیالوی

حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی نے بیان کیا: ''میں اپنے حجرے میں محوِ خواب تھا کہ میں نے دیکھا کہ ہندوستان بھر کے علما و مشائخ اور عوام میدان عرفات میں ایک بڑے اسٹیج کے سامنے بیٹھے کسی کے منتظر ہیں کہ آقائے کائنات حضرت محمد ﷺ اپنے چاروں خلفائے راشدینؓ کے ہمراہ تشریف لاتے ہیں اور سب سے آگے جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ آپ ﷺ سے تھوڑا پیچھے چاروں خلفائے راشدینؓ تشریف رکھتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں سبز ہلالی پرچم ہے، حضور سرور کائنات ﷺ پکارتے ہیں کہ ''محمد علی جناح کہاں ہیں؟'' محمد علی جناح مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں اور نبی پاک ﷺ کے سامنے نگاہیں نیچی کر کے باادب کھڑے ہو جاتے ہیں، حضور سرور کائنات ﷺ، حضرت علیؓ سے سبز ہلالی پرچم لے کر محمد علی جناح کو عطا فرماتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور صبح میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔

(روایت: حضرت فخرالدین سیالوی حوالہ: ماہنامہ ''نظریہ'' اسلام آباد، اگست 2015ء)

سنّی کانفرنس بنارس 1946ء

آل انڈیا سنّی کانفرنس کا تاسیسی اجلاس 1925ء میں مرادآباد میں صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور مولانا قاضی محمد داغ حسین رئیس مرادآبادی کی کاوشوں سے منعقد ہوا اور وقت کے ساتھ یہ تنظیم مقبول ہوتی چلی گئی۔ تحریک پاکستان کے دوران آل انڈیا سنّی کانفرنس کا ایک اجلاس 27 اپریل سے 30 اپریل 1946ء تک بنارس میں منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا سید محدث کچھوچھوی نے کی۔ اس کانفرنس میں پندرہ ہزار علما و مشائخ کے علاوہ ایک لاکھ سنّی مسلمانوں نے شرکت کی۔

بعدازاں ہندوستان کے تمام صوبوں اور اضلاع میں نہ صرف اس کی شاخیں قائم ہوئیں بلکہ ہر ضلع میں سنّی کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔

سنّی کانفرنس بنارس میں شریک ہندوستان بھر کے ہزارہا علما و مشائخ نے تحریک پاکستان کی حمایت میں انقلابی قراردادیں منظور کیں جس سے پاکستان کی تحریک

کو ہزاروں مساجد کے علما و خطیبوں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا سید محمد کچھوچھوی تھے۔ ان کا خطبہ استقبالیہ ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے مخالفین کے لیے بجلی بن کر گرا۔

پاکستان کی تحریک کے لیے مندرجہ ذیل علما و مشائخ کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی:

1۔ حضرت مولانا شاہ ابوالحامد سید محمد صاحب محدث اعظم ہند کچھوچھوی۔
2۔ حضرت صدرالافاضل استاذ العلما مولانا مولوی محمد نعیم الدین صاحب
3۔ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مولوی شاہ مصطفیٰ رضا خان صاحب
4۔ حضرت صدرالشریعہ مولانا مولوی محمد امجد علی صاحب
5۔ حضرت مبلغ اعظم مولوی عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی
6۔ حضرت مولانا مولوی عبدالحامد صاحب قادری بدایونی
7۔ حضرت مولانا مولوی سید شاہ دیوان آل رسول علی خاں سجادہ نشین اجمیر شریف
8۔ حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد صاحب لاہور
9۔ حضرت مولانا شاہ قمرالدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف
10۔ حضرت پیر سید شاہ عبدالرحمان صاحب بھرچونڈی شریف (سندھ)
11۔ حضرت مولانا شاہ سید زین الحسنات صاحب مانکی شریف
12۔ خان بہادر حاجی بخش مصطفیٰ علی صاحب (مدراس)
13۔ حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب (لاہور)

اس کانفرنس میں دارالمبلغین کے لیے مندرجہ ذیل علما پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی:

1۔ حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب صدیقی میرٹھی
2۔ حضرت علامہ صبغت اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلی
3۔ حضرت مولانا عبدالحامد صاحب قادری بدایونی

اسی کانفرنس میں امیر ملت پیر سید جماعت علی محدث علی پوری علیہ الرحمہ نے مسلم لیگ پر اور قائداعظم پر اظہار اعتماد کیا۔ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب

امیر ملت علی پوری نے لارڈ ویول (وائسرائے ہند) کو ایک تار ارسال کیا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

❑ ''مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ اور قائداعظم محمد علی جناح ان کے واحد لیڈر ہیں اور ایگزیکٹو کونسل کے مسلم ارکان نامزد کرنا مسلم لیگ اور قائداعظم کا کام ہے۔طول وعرض ہندوستان میں میرے لاکھوں مرید مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔''

پنجاب کے دیگر تمام صوفیائے کرام اور سجادہ نشینوں نے اسی قسم کے خطوط اور تاریں وائسرائے اور قائداعظم کے نام ارسال کیے۔ اس کانفرنس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی جماعت ہے۔ احرار، خاکسار، مسلم بورڈ، نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعتیں ہیں اور یہ دراصل کانگریس کی بنائی ہوئی ہیں۔

پیر جماعت علی شاہ

1936ء میں جب قائداعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا بیڑا اٹھایا اور ہندو مسلم دو جداگانہ قوموں کی آواز بلند کی تو برصغیر میں سب سے پہلے امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ نے ہی قائداعظم کو اپنے مکمل اور بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔آپ اس وقت حیدرآباد دکن (حالیہ انڈیا) میں مقیم تھے۔امیر ملت نے اپنے صاحبزادگان، خلفا اور مریدین کو حکم دیا کہ وہ دل و جان سے مسلم لیگ کی حمایت کریں، رکنیت اختیار کریں اور قائداعظم کے سپاہی بن کر مسلم لیگ کو ہر دل کی دھڑکن بنا دیں۔ 22 اپریل 1938ء کو آپ نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''مسلمانو! آج ایک جھنڈا اسلامی ہے، دوسرا کفر کا۔تم کس جھنڈے کے سائے میں رہو گے؟'' سب حاضرین نے متفقہ آواز سے کہا: ''اسلام کے جھنڈے کے سائے میں۔''

20 اکتوبر 1938ء کو آپ نے صوبہ سرحد کے مریدین کو ایک خصوصی پیغام بھیجا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آزادی کی منزل حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں۔

1939ء میں برصغیر میں پاکستان کی آواز تو بلند ہو رہی تھی لیکن کوئی اس کی

علمی وعملی صورت اوراس کی فلسفیانہ اور منطقی بنیاد کو واضح اور معین شکل میں اب تک پیش نہ کر سکا تھا۔ امیر ملت نے اپنے مرید خاص پروفیسر ڈاکٹر سید ظفرالحسن، صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ف۔1949ء) کو اس کام پر مامور کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھی ڈاکٹر افضال حسین قادری کے تعاون سے ستمبر 1939ء میں ایک اسکیم مع چارٹ ونقشہ جات اور مقدمہ بعنوان ''ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اور اس کا حل'' مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی، جس نے ''علی گڑھ پاکستان اسکیم'' کے نام سے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام اساتذہ اور پروفیسران کا زبردست بیان اسکیم کی تائید وحمایت میں شائع ہوا اور جلد ہی یہ اسکیم پورے برصغیر میں ہر دل کی دھڑکن بن گئی۔ چنانچہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں ''علی گڑھ اسکیم'' ایک نشان اعظم کا حکم رکھتی ہے۔

23 مارچ 1940ء کو اقبال پارک لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ''اجلاس قرارداد لاہور'' منعقد ہوا تو حضرت امیر ملت نے آل انڈیا سنّی کانفرنس کی نمائندگی کے لیے پیر صاحب مانکی شریف، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالغفور ہزاروی ثم وزیرآبادی، پیر عبداللطیف زکوڑی شریف کو بھیجا، جبکہ مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازی اس وقت نوجوان طلبا کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ سب حضرات مسلم لیگ کے باقاعدہ مبلغ اور جاں نثار تھے۔

26 جولائی 1943ء کو ظہر کے وقت خاکسار کارکن رفیق صابر آف مزنگ لاہور نے بمبئی میں قائداعظم پر قاتلانہ حملہ کیا اور حملہ کی خبر اسی شام ریڈیو بمبئی نے نشر کی تو حضرت امیر ملت ان دنوں حیدرآباد دکن میں جلوہ افروز تھے۔ رات کو دس بجے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ صدر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ وصدر مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن، عجیب پریشانی کے عالم میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ روح فرسا خبر سنائی۔ آپ کو اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ آپ نے فوراً روبقبلہ ہو کر حضرت قائداعظم کی صحت وسلامتی اور درازئ عمر وکامیابی مقاصد کے لیے دعا مانگی۔ دوسرے دن

آپ نے بقلم خاص قائداعظم کے نام ہمدردی و مزاج پُرسی کے طور پر ایک مکتوب تحریر فرمایا اور ایک نادر قلمی نسخہ قرآن مجید، ایک مخملی جائے نماز، ایک تسبیح، ایک شال، ایک زمزمی آب زمزم اور دیگر اشیا اپنے محبوب خلیفہ حضرت بخشی مصطفیٰ علی خاں کے ہاتھ قائداعظم کو روانہ فرمائیں۔

اپنے مکتوب گرامی میں آپ نے سلام و دعا کے بعد تحریر فرمایا تھا:

❑ ''قوم نے مجھے امیر ملت مقرر کیا ہے اور پاکستان کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے ہیں، وہ میرا کام ہے، لیکن میں اب سو سال سے زیادہ عمر کا ضعیف و ناتواں شخص ہوں۔ میرا بوجھ جو آپ پر پڑا ہے، اس میں امداد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں، نمرود کی دشمنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی، فرعون کی دشمنی حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کے دین کی، ابوجہل کی دشمنی ہمارے نبی اکرم ﷺ کے دین کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔

اب جو یہ حملہ آپ پر ہوا ہے، آپ کی کامیابی کے لیے فال نیک ہے۔ آپ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ آپ کو حصول مقصد میں خواہ کتنی ہی دشواریوں کا سامنا ہو، آپ بالکل پروا نہ کریں اور پیچھے نہ ہٹیں۔ جس شخص کو اللہ کامیاب فرمانا چاہتا ہے اس کے دشمن پیدا کر دیتا ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے۔ میں اور میرے تمام یارانِ طریقت آپ کے معاون و مددگار رہیں گے۔ آپ بھی عہد کریں کہ اپنے مقصد سے ذرہ بھر نہیں ہٹیں گے۔''

بخشی صاحب جب یہ مکتوب اور تحائف لے کر قائداعظم کی فرودگاہ مالا بارہل بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے ملاقات پر قدغن لگا رکھی ہے۔ وہ محترمہ فاطمہ جناح سے مل کر خط اور تحائف ان کے سپرد کر آئے اور واپس آ کر تفصیل اور خیریت مزاج سے حضرت امیر ملت کو مطلع کیا۔ چند روز بعد (11 اگست 1943ء کا لکھا ہوا) قائداعظم کا خط آیا جس میں انھوں نے سلام و دعا کے بعد لکھا تھا:

❑ ''جب آپ جیسے بزرگوں کی دعا میرے شامل حال ہے تو میں اپنے مقصد میں ابھی سے کامیاب ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری راہ میں کتنی ہی تکلیفیں کیوں نہ آئیں، میں اپنے مقصد سے کبھی پیچھے نہ ہٹوں گا۔ آپ نے قرآن شریف اس لیے عنایت فرمایا ہے کہ میں مسلمانوں کا لیڈر رہوں، جب تک قرآن شریف اور دین کا علم نہ ہو، کیا لیڈری کر سکتا ہوں! میں وعدہ کرتا ہوں کہ قرآن شریف پڑھوں گا، انگریزی ترجمے میں نے منگوا لیے ہیں، ایسے عالم کی تلاش میں ہوں جو مجھے انگریزی میں قرآن کی تعلیم دے سکے۔ جانماز آپ نے اس لیے عطا کی ہے کہ جب میں اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانتا تو مخلوق میرا حکم کیونکر مانے گی؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نماز پڑھوں گا۔ تسبیح آپ نے اس لیے ارسال کی ہے کہ میں اس پر درُود شریف پڑھا کروں، جو شخص اپنے پیغمبر ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت طلب نہیں کرتا، اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہو سکتی ہے، میں اس ارشاد کی تعمیل بھی کروں گا۔''

جون 1944ء میں حضرت امیر ملت، سری نگر (کشمیر) میں جلوہ افروز تھے کہ آپ کے مرید خاص قائد ملت چوہدری غلام عباس، قائداعظم کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے قائداعظم کی پُر تکلف دعوت کی اور انواع واقسام کے 45 کھانے دستر خوان پر چنے گئے۔ دعوت کے اختتام پر حضرت امیر ملت نے قائداعظم کو تحائف مرحمت فرمائے اور کامیابی و کامرانی کی دعا فرمائی اور حاضرین سے فرمایا کہ سب لوگ مسلم لیگ کے لیے وقف ہو جاؤ اور ہر طرح سے مدد کر کے تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کریں۔ یاد رہے کہ اس تاریخی اور بے مثل دعوت میں کشمیر اور بیرون کشمیر کے رؤسا و عمائدین بھی شریک تھے۔

اس دعوت کے بعد حضرت امیر ملت نے قد آور اشتہارات کے ذریعے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان فرمایا اور قائداعظم کی کامیابی کی پیش گوئی کی۔ چنانچہ اس پیش گوئی پر کامل یقین کرتے ہوئے قائداعظم نے لاہور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں کہا:

❑ ''میرا ایمان ہے کہ پاکستان ضرور بنے گا، کیونکہ امیر ملت مجھ سے فرما چکے

ہیں کہ پاکستان ضرور بنے گا اور مجھے یقین واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کو ضرور سچا کرے گا۔"

1945ء میں آپ نے پنجاب مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ لاہور کی صدارت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

❑ "دو قومی نظریہ سب سے پہلے سرسیدؒ نے پیش کیا تھا اور اقبالؒ نے اپنے کلام کے ذریعے قوم کو متاثر کیا، اب قائداعظم نے اسی دو قومی نظریے کے بارآور ہونے کے لیے مسلمانوں کا علیحدہ وطن قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے قابل و تجربہ کار وکیل تیار کرتا ہے، بلاتمیز غیرے کہ وہ وکیل ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ اب ہمارا مقدمہ انگریز اور ہندو کے ساتھ ہے، مسلمانوں نے قائداعظم کو اس مقدمے کا وکیل بنا لیا ہے اور پھر ان کی ذات پر کیچڑ اچھالنا اور رکیک و سوقیانہ حملے کرنا کیا معنی! ماسوائے ذاتی کدورت وحسد کے۔ یہ تو ایک اصول کی بات تھی، اب رہی میری عقیدت، اگر میں چراغ لے کر ڈھونڈوں تو مجھے ہندوستان میں ایک بھی جناح صاحب ایسا ایمان والا مسلمان نظر نہیں آتا جو ایسی اسلام کی خدمت بجا لا رہا ہو۔"

24 نومبر 1945ء کو پیر صاحب مانکی شریف نے مانکی شریف ضلع پشاور میں قائداعظم کی ایک شاندار دعوت کی اور ایک عظیم الشان جلسہ کا انعقاد بھی فرمایا۔ حضرت امیر ملت کو جلسہ کی صدارت کے لیے دعوت دی، مگر آپ ناسازیٔ طبع کے باعث تشریف نہ لے جا سکے اور اپنی جگہ اپنے فرزند اکبر سراج الملت پیر سید محمد حسین کو قائداعظم کے لیے سونے کا ایک تمغہ، تین سو روپے کی تھیلی اور کئی دوسرے تحائف دے کر بھیجا۔

پیر صاحب مانکی شریف نے حضرت سراج الملت کی بڑی عزت افزائی کی اور جلسہ کی صدارت انھی کے سپرد کی۔ جب قائداعظم جلسے میں آئے تو حضرت سراج الملت نے آگے بڑھ کر سونے کا تمغہ (جس پر کلمہ طیبہ کندہ تھا) قائداعظم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ "حضرت امیر ملت نے آپ کی کامیابی کا طلائی تمغہ بھیجا ہے۔" یہ سن کر قائداعظم بہت خوش ہوئے، کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سینہ تان کر کہا: "پھر تو میں

کامیاب ہوں، آپ تمغہ میرے سینہ پر آویزاں کیجیے۔'' اس پر مسلم لیگی کارکن ملک شاد محمد نے آگے بڑھ کر حضرت سراج الملت کے ہاتھ سے تمغہ لیا اور قائداعظم کی شیروانی کی بائیں طرف سینے پر ٹانک دیا۔ قائداعظم نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گئے۔

27 اپریل 1946ء کو آل انڈیا سنّی کانفرنس کا بنارس (بھارت) میں فقیدالمثال اور تاریخ ساز اجلاس شروع ہوا تو کانگریسی علما نے اپنے ایجنٹ بھیج کر اجلاس کو درہم برہم کرنے کی سازش کی۔ ایک قرارداد مرتب کی جس میں قائداعظم کو کافر، ملعون اور مرتد قرار دیا اور مطالبہ کیا گیا کہ حضرت امیر ملت نے قائداعظم کے بارے میں جو تعریفی کلمات فرمائے ہیں وہ واپس لیں ورنہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں۔

جب آپ صدرالافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (ف۔1948ء) مرکزی ناظم اعلیٰ آل انڈیا سنّی کانفرنس کے ساتھ اسٹیج پر تشریف لا رہے تھے تو کسی نے آپ کو راستے میں اس سازش کی خبر دے دی۔ پیر جماعت علی شاہ جلسہ گاہ میں پہنچے تو آپ کو کرسی پر بٹھا کر اسٹیج پر لایا گیا۔ آپ کی صدارت کے اعلان کے بعد جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ تلاوت کلام مجید کے بعد آپ یک لخت پورے جوش و جذبہ کے ساتھ جلسے سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

- ''جناح کو کوئی کافر کہتا ہے، کوئی مرتد بناتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ولی اللہ ہے! آپ لوگ اپنی رائے سے کہتے ہیں، لیکن میں قرآن و حدیث کی رُو سے کہتا ہوں۔ سنو اور غور سے سنو! اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے:
- ''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دے گا۔'' (مریم:96)

اس کے بعد آپ نے لاکھوں کے اجتماع سے سوال کیا کہ:

''تم بتلاؤ، ہے کوئی مائی کا لال مسلمان جس کے ساتھ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان قائداعظم ایسی والہانہ محبت رکھتے ہوں؟ یہ تو قرآن کا فیصلہ ہے، اب رہی میری عقیدت، تم اس کو کافر کہو، میں اس کو ولی اللہ کہتا ہوں۔''

مولانا اشرف علی تھانوی

اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے:

1- صرف وہی سچے ایماندار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا، تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسا رکھتے ہیں۔ (اور) جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔ نیز اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے، خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں، انہی کے لیے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور بخشش ہے اور باعزت روزی۔ (الانفال: 2 تا 4)

2- پیدا فرما دے گا خدائے مہربان ان کے لیے (دلوں میں) محبت۔ (مریم: 96)

3- اللہ حامی و مددگار ہے متقیوں کا۔ (جاثیہ: 19)

بفضلہٖ تعالیٰ قائداعظم کو عنداللہ، عندالرسولؐ اور عندالناس یہ مقامات عالیہ حاصل تھے اور مذکورہ بالا صفات کی بنا پر قرآن کریم کی روشنی میں قائداعظم مومن تھے۔ جنھیں کانگریس کے ایجنٹ کافر اعظم کہتے نہ تھکتے تھے، لیکن مولا کریم تو ہر معاملے میں اتمام حجت کرنے کا عادی ہے۔ یہ بات شروع سے علم الٰہی میں تھی کہ کفار کے دوست انھیں کافر اعظم کہیں گے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس دور کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو عالم خواب میں حضرت قائداعظم کو اولیا اللہ کی صفوں میں بیٹھا دکھا دیا کہ وہ کافر اعظم نہیں بلکہ مومن اعظم ہیں۔

مفتی محمد شفیع

مفتی محمد شفیع کا شمار برصغیر پاک و ہند کے جید علما میں ہوتا ہے۔ آپ کی تمام زندگی برصغیر کی عظیم دینی یونیورسٹی دیوبند میں درس و تدریس میں گزری۔ آپ نے خود کو سیاست کی وادی سے ہمیشہ دور رکھا۔ لیکن ایک موقع پر آپ نے میدان سیاست میں آنے سے دریغ نہ کیا اور یہ وہ موقع تھا اُمت مسلمہ ایک اہم اور نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مفتی صاحب نے تحریک پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ آپ نے جمعیت العلمائے اسلام کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کی۔ مخالفین لیگ کے عائد کردہ الزامات کے جواب دیئے۔ اس دور میں عام

طور پر مخالفین قائداعظم کی قیادت پر شرعی اعتراضات قائم کرتے تھے اور پُر لطف بات یہ تھی کہ انھیں قائداعظم کی قیادت پر تو اعتراض تھا مگر خود گاندھی، نہرو اور پٹیل کی زیرِقیادت کام کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے 1946ء میں حیدرآباد سندھ میں جمعیت العلمائے اسلام کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

❑ ”مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائداعظم قرار دیا ہے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ وہ مفتی ہیں اور ان سے حلال و حرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا یا اس حیثیت سے کہ وہ شیخ اور مرشد ہیں کہ ان سے اصلاح کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک بھی مسلمان ان کو اس خیال سے قائداعظم نہیں کہتا۔ ان کی قیادت ہند کی مسلم جمہور نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز خود اس وقت بین الاقوامی تقاضوں یا اندرونی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر جس طرح بھی آزادی برصغیر کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی طاقت، مستحکم تنظیم اور سرمایہ کے بل بوتے پر اس کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس لیے اس وقت ایک جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی جنگ نہیں بلکہ محض قانون اور آئین کی جنگ ہے اور بالاتفاق موافق و مخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لیے مسٹر جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دوسری قوموں میں بھی نہیں ہے۔ کس قدر بدنصیبی ہے کہ یہ قوم اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے بھی اس کو میدان میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لیے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ طہارت نہیں پاتی۔ ریل، جہاز اور موٹر میں سوار ہوتے وقت بڑے سے بڑا متقی، دین دار اور دانش مند صرف اس بات کا اطمینان ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیور، ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں۔ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال و افعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔“

۞......۞......۞

محمد معظم ملک

قائداعظمؒ کی روحانی عظمت

میں بابائے قوم محمد علی جناحؒ کی روحانی عظمت کا ایک ایسا واقعہ قلم بند کر رہا ہوں جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ شاید یہ پہلے بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔ میں سیال شریف میں حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالویؒ کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ میرے ہمدم دیرینہ ممتاز عارف اور علامہ سید احمد سعید کاظمی بھی موجود تھے۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالویؒ نے اپنی گفتگو کا رخ تحریک پاکستان کی طرف کیا تو مجھے موقع مل گیا کہ میں کئی سالوں سے اپنے دل میں کلبلاتے ہوئے ایک سوال کا جواب حاصل کر سکوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور خانوادۂ سیال شریف کی تحریک پاکستان کے لیے خدمات اظہر من الشمس ہیں اور شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالویؒ نے قیام پاکستان کے لیے عملی جہاد فرمایا۔ آپ نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے طول و عرض کے طوفانی دورے فرمائے۔ اپنے لاکھوں عقیدت مندوں کو قیام پاکستان کے لیے متحرک فرمایا۔ حتیٰ کہ سلہٹ کے ریفرنڈم میں قیام پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ مسلم لیگ ضلع سرگودھا کے صدر رہے۔ لیکن جب حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالویؒ کی قیام پاکستان کے دوران تقاریر اور محمد علی جناحؒ کے نام آپ کی خط و کتابت پڑھتا اور دیکھتا ہوں تو آپ نے کہیں بھی محمد علی جناحؒ کو قائداعظم نہیں لکھا۔ خواجہ غلام فخر الدین سیالویؒ میرے اس سوال پر قدرے تبسم آویز ہوئے تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالویؒ نے فرمایا کہ چلو تمھیں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے اور محمد علی جناحؒ کی روحانی عظمت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور شیخ الاسلام دن رات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر

سرگرم عمل تھے تو اس وقت ضلع سرگودھا، خوشاب اور سرگودھا پر مشتمل تھا اور یہاں سیال شریف کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ خاص طور پر موجودہ تحصیل شاہ پور ہمارے مریدوں کا گڑھ تھی اور یہاں سے یونینسٹ پارٹی کا سربراہ اور متحدہ پنجاب کا وزیراعظم ملک خضر حیات ٹوانہ 1946ء کے انتخابات میں حصہ لے رہا تھا۔ شیخ الاسلام صاحب کی مسلم لیگ کی قیادت و حمایت کرنے پر اسے اپنی شکست اور مسلم لیگ کی جیت یقینی نظر آ رہی تھی۔ ملک خضر حیات ٹوانہ نے اس سے قبل بھی حضرت صاحب کو مسلم لیگ کی حمایت سے روکنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن آپ قیام پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت کے فیصلے پر چٹان بن کر ڈٹے رہے۔ ٹوانہ خاندان کی اکثریت سیال شریف کے مریدین پر مشتمل تھی۔ اسی طرح ملک خضر حیات ٹوانہ کو اپنی برادری کے اندر سے بھی مخالفت کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس نے آخری حربے کے طور پر اپنے خاندان کی خواتین کو میلہ کی صورت سیال شریف بھیجا۔ (پنجاب کی ایک روایت ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی بات منوانی ہو یا اس کی ناراضی دور کرنی ہو تو بہنوں اور بیٹیوں کو بھیجا جاتا ہے جسے بہنوں، بیٹیوں کا میلہ کہا جاتا ہے) ملک خضر حیات ٹوانہ کی طرف سے بھجوائے گئے اس میلہ میں شریک خواتین ننگے پاؤں سیال شریف آئیں اور حضرت صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ ہم سب آپ کی مرید ہیں، بیٹیاں اور بہنیں ہیں، آپ مہربانی فرمائیں اور ملک خضر حیات ٹوانہ کی الیکشن میں حمایت کا اعلان کریں یا حمایت کا وعدہ فرمائیں یا پھر آپ مسلم لیگ کی حمایت نہ کریں اور قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ نہ لیں اور خاموشی فرما لیں۔ اس پر حضرت صاحب کی آنکھیں بھر آئیں اور آپ نے ان خواتین سے فرمایا کہ پیر سیال کی بارگاہ میں آنے والا کبھی خالی نہیں گیا، کبھی کوئی نامراد نہیں لوٹا، اپنی چادریں سروں پر لے لو، میں مجبور ہوں کہ تمھیں آج خالی جھولی اور خالی ہاتھ ہی جانا ہوگا۔ تم میری بچیاں ہو، بہنیں ہو، میں تمھیں کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹاتا لیکن آج تمھیں خالی ہاتھ بھیجنے کی وجہ بھی بتا دیتا ہوں تاکہ تمھیں تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لیے میری حمایت کے اٹل فیصلہ کی اصل وجہ بھی معلوم ہو سکے۔ حضرت خواجہ قمر الدین

سیالویؒ نے فرمایا کہ میں رات کو سیال شریف میں اپنے حجرے میں محوخواب تھا کہ میں نے دیکھا کہ میں اور ہندوستان کے تمام زعما، علما، فضلا، اولیا اور لاکھوں عوام کا اجتماع میدان عرفات میں ہے اور ہم سب ایک اونچے بنے ہوئے سٹیج کی طرف دیکھ رہے ہیں جیسے ہم سب کو کسی کی آمد کا انتظار ہے۔ پھر اس سٹیج پر آقائے دوجہاں، سرور کائنات، محبوب خدا نبی پاک ﷺ اپنے چاروں خلفائے راشدینؓ کے ہمراہ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ سب سے آگے آپ ﷺ قیام فرما ہیں اور آپ ﷺ سے پیچھے ہٹ کر دائیں جانب خلفائے راشدینؓ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک میں ایک جھنڈا ہے۔ چند لمحوں کے بعد حضور نبی کریم صاحب لولاک ﷺ فرماتے ہیں کہ محمد علی جناحؒ کہاں ہیں؟ ہم سب مجمع میں دیکھنے لگ جاتے ہیں جیسے ہمیں معلوم ہو کہ محمد علی جناحؒ ہم میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دفعتاً محمد علی جناحؒ مجمع کو چیرتے ہوئے اس اونچے بنے ہوئے سٹیج کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہم سب ان کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ نبی پاک ﷺ کے سامنے نگاہیں نیچی کر کے باادب کھڑے ہو جاتے ہیں اور سرکار دوعالم ﷺ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرماتے ہیں کہ جھنڈا لاؤ۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ وہ سبز ہلالی پرچم محمد علی جناحؒ کو عطا فرماتے ہیں۔ میری آنکھ کھل گئی اور اگلی صبح میں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ہم پہلے ہی تحریک آزادی کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے اور اب ہم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے وہی جھنڈا لے کر قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لیے تم مجھے معاف رکھنا، میں مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

پھر حضرت خواجہ فخر الدین سیالویؒ نے فرمایا کہ خواجہ محمد قمر الدین سیالویؒ نے محمد علی جناحؒ صاحب کے نام سے ہی لکھا اور پکارا ہے کیونکہ آپ نے حضور ﷺ کی زبان حق سے محمد علی جناح ہی سنا تھا۔ اس لیے آپ جناح صاحب کی عزت، عظمت وتوقیر کے لیے ہمیشہ لکھا کرتے تھے کہ ''محمد علی جناحؒ صاحب فرماتے ہیں''۔

۞......۞......۞

محمد آصف بھلی

جناح، اسلام اور پاکستان

پاکستان میں ایک مختصر دانشور طبقہ ہمیشہ سے یہ اصرار اور تکرار کرتا چلا آ رہا ہے کہ قائد اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ قائد اعظمؒ پاکستان میں سیاست اور مملکت کے امور کو مذہب سے بالکل الگ رکھنے کے حق میں تھے۔ جب کہ حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ تحریک پاکستان کی بنیاد ہی مسلمانوں کے اپنے دین اسلام کی وجہ سے الگ قوم ہونے کے نظریے پر رکھی گئی تھی۔ قائد اعظمؒ کا جو تصور پاکستان تھا، وہ انھوں نے بار بار اپنی تقاریر میں دہرایا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد بھی قائد اعظمؒ نے یہ وضاحت غیر مبہم انداز میں فرما دی تھی کہ پاکستان کے مطالبے کا طاقتور ترین محرک اسلام ہے۔ قیامِ پاکستان کے دو ماہ بعد قائد اعظمؒ نے 11 اکتوبر 1947ء کو اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا:

❑ ''پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہم ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں لانا چاہتے تھے جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور سانس لے سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق ترقی کر سکیں اور جہاں ہم اسلام کے معاشرتی عدل کے اصولوں کو رُو بہ عمل لا سکیں''۔

قائد اعظمؒ نے 13 جنوری 1948ء کو پشاور میں تقریر کرتے ہوئے بھی تقریباً ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا:

❑ ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا،

بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں''۔

جو لوگ قائداعظمؒ پر یہ بے بنیاد الزام عائد کرتے ہیں کہ قائداعظم پاکستان کے ریاستی ڈھانچے کو سیکولر بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتے تھے، کیا ان سے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جب بانئ پاکستان محمد علی جناح پاکستان میں عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں کو آزمانے اور پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کی بات کر رہے تھے تو سیکولر نظامِ فکر کو قائداعظم کے ساتھ کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔ ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ سیکولر ریاست وہ ہوتی ہے جہاں مذہب کو ہر شخص کا ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے اور سیاسی نظام کو مذہب یا دین سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے۔ لیکن قائداعظم کا سیکولرازم کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

یہاں مَیں قائداعظم کے 18 نومبر 1945ء کے ایک خط کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ جو انھوں نے محمد امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف کو لکھا تھا۔ قائداعظمؒ نے اپنے اس تاریخی خط میں پاکستان کے مستقبل کے آئین کے بارے میں وضاحت کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں:

- ''پاکستان کا آئین مسلم لیگ نہیں بنائے گی بلکہ یہ آئین پاکستان کے باشندگان (عوام) نے بنانا ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد 75 فیصد ہو گی۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت ہو گی اور یہ خوف ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ آئین ساز ادارہ جس میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہو گی وہ ادارہ (آئین ساز اسمبلی) اسلامی تصورات سے متصادم کوئی آئین بنا سکتا ہے۔ نہ ہی پاکستان کی حکومت اسلامی اصولوں اور تصورات کے برعکس کوئی اِقدام کر سکتی ہے''۔

قائداعظمؒ نے اپنے اس خط میں پاکستان کے حوالے سے سیکولر نظام کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ جب انھوں نے یہ فرما دیا کہ عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہو گی، وہ اسلامی اصولوں سے متصادم کوئی دستور بنا ہی نہیں سکتی اور نہ ہی پاکستان کی حکومت اسلام کے اصولوں کے برخلاف کوئی عمل کر سکتی

ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں آئین وسیاست کی بنیاد اسلام کے اصولوں پر استوار ہوگی۔ یہاں سیکولر نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

اوپر کی سطور میں قائداعظمؒ کے جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ خط اگرچہ تحریک پاکستان کے عروج کے دور میں لکھا گیا تھا لیکن یہ خط تقریباً قیامِ پاکستان سے دو سال پہلے کا ہے۔ اب مَیں قائداعظمؒ کے ایک ایسے پیغام کا حوالہ دے رہا ہوں جو اہل امریکہ کے نام قائداعظمؒ نے فروری **1948**ء میں براڈ کاسٹ کیا تھا۔ قائداعظمؒ صرف اپنی قوم کو ہی نہیں بلکہ بیرون پاکستان کے عوام پر بھی واضح کر رہے تھے کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا؟ قائداعظمؒ کا ارشاد تھا:

❑ ''پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی حتمی شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار اور جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر قابلِ اطلاق ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ اسلام نے ہمیں انسانی مساوات، انصاف اور ہر ایک کے ساتھ رواداری کا درس دیا ہے۔ ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث اور امین ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کے معمار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ ہیں''۔

میرا سیکولر حضرات سے سوال ہے کہ کیا پاکستان کے آئین کے حوالے سے قائداعظمؒ کے ان خیالات کے بعد بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ قائداعظمؒ کی سوچ اور فکر کا منبع اسلام تھا، سیکولرازم نہیں تھا۔ اگر قائداعظمؒ سیکولرازم کے علمبردار ہوتے تو وہ یہ کیوں ارشاد فرماتے کہ پاکستان کا دستور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ وہ اصول جن کا عملی زندگی پر آج بھی ویسے ہی اطلاق ہوسکتا ہے جیسے تیرہ سو سال پہلے تھا۔ جس ملک کا آئین ہی اسلام کے اساسی اصولوں پر مشتمل ہو وہ سیکولر کیسے ہوسکتا ہے؟

اب ہم آتے ہیں قائداعظمؒ کی **11** اگست **1947**ء کی اُس تقریر کی طرف

جس میں قائداعظمؒ نے پاکستان کے تمام شہریوں کو بلاامتیازِ مذہب وذات مساوی حقوق دینے کی بات کی تھی۔ قائداعظمؒ نے غیر مسلم اقلیتوں کو مساوی شہری حقوق دینے کا جو اعلان اپنی اس تقریر میں فرمایا تھا، وہ اسلام کی تعلیمات ہی کے عین مطابق تھا۔ اس سے لادین ریاست کا مطلب نکالنا بدنیتی اور شرانگیزی ہے۔ سیکولر طبقے کی نیت میں اگر فتور نہ ہو تو وہ قائداعظمؒ کی ایک سو سے زیادہ ان تقاریر کا حوالہ کیوں نہیں دیتے جن میں اُنھوں نے بار بار پاکستان کے حوالے سے اسلام کے نظریۂ حیات اور اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ قائداعظمؒ جب معاشرتی عدل کے اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کی بات کرتے ہیں، جب اسلامی قوانین کا تذکرہ کرتے ہیں، جب پاکستان کے لیے اسلام کی تجربہ گاہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جب پاکستان کے آئین کے حوالے سے اسلام کے بنیادی اصولوں اور اسلام کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں، جب 14 فروری 1947ء کو بلوچستان کے سبّی دربار سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

- ''ہماری نجات اُس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے وضع کیا ہے''۔

تو پھر سیکولرازم درمیان میں کہاں سے آ گیا۔

قائداعظمؒ نے 27 نومبر 1945ء کو ایڈورڈز کالج پشاور میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

- ''ہم دونوں قوموں (ہندو اور مسلمان) میں صرف مذہب کا ہی فرق نہیں، ہماری تہذیبیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہمارا دین صرف مذہبی اصولوں تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی پوری زندگی اس ضابطۂ حیات کے مطابق بسر کرنا چاہتے ہیں اور یہی مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے''۔

جب قائداعظمؒ یہ فرما رہے تھے کہ ہمارا دین صرف مذہبی اصولوں تک محدود نہیں بلکہ یہ دین زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے تو اس کا مطلب ظاہر تھا

کہ قائد اعظمؒ مذہب کو اور بالخصوص اسلام کو بندے اور خدا کے درمیان ذاتی معاملہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور مسلمان تو وہی شخص ہوسکتا ہے جو اسلام کو صرف اپنی ذاتی زندگی تک محدود نہ سمجھے بلکہ اسلام کو اپنی اجتماعی زندگی کے لیے بھی اپنا راہنما سمجھے۔

قائد اعظمؒ نے یکم جنوری 1938ء کو ایک تقریب میں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کرتے ہوئے اسے اسلام کا جھنڈا قرار دیا تھا اور فرمایا تھا:

❏ ''جب ہم مسلم لیگ کے پرچم کو اسلام کا پرچم کہتے ہیں تو کچھ لوگوں بالخصوص ہمارے ہندو دوستوں کا یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہم سیاست میں مذہب کو داخل کر رہے ہیں۔ اِس حقیقت پر ہمیں فخر ہے کہ اسلام ہمارے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ صرف مذہب ہی نہیں بلکہ اس میں قوانین بھی ہیں، فلسفہ بھی ہے اور سیاست بھی۔ درحقیقت اس میں وہ سب کچھ ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ صبح سے لے کر رات تک ہوتا ہے۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے ایک لفظ جو ہمارے کُل پر محیط ہے۔ اسلام نے ہمیں آزادی، مساوات اور اخوت کا درس دیا ہے''۔

جو لوگ پاکستان کی نظریاتی اور فکری بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ پاکستان اسلام کی اساس پر اور اسلام کی خاطر حاصل نہیں کیا گیا تھا، ان کے پاس اس سوال کا جواب کیا ہے کہ بانیٔ پاکستان تو مسلم لیگ کے جھنڈے کو اسلام کا جھنڈا قرار دیتے تھے۔ قائد اعظمؒ اسلام اور سیاست کو الگ الگ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ سیاست کو اسلام کا ایک جزو سمجھتے تھے۔ جب وہ اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات قرار دیتے تھے تو ان کے نزدیک اسلام میں سیاست بھی شامل تھی، معاشرت بھی شامل تھی اور معیشت بھی۔ قائد اعظمؒ نے پاکستان کا مطالبہ ہی اس بنیاد پر کیا تھا کہ ہم یہاں اپنے عقیدے، فلسفے اور تمدن کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ انفرادی زندگی کی بات ہوتی تو وہ متحدہ ہندوستان میں بھی بسر ہوسکتی تھی لیکن یہ اجتماعی طرز زندگی اور نظام حیات کی بات تھی جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

اگر ہمارے عظیم لیڈر محمد علی جناح بھی سیکولر حضرات کی طرح مذہب کو ایک ذاتی معاملہ سمجھتے اور ان کے نزدیک بھی اسلام صرف عقیدے، روایتوں اور روحانی تصورات کا مجموعہ ہوتا اور قائداعظمؒ کے خیال میں بھی اسلام ایک ضابطۂ حیات نہ ہوتا جو سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ فکر پر مشتمل نہ ہوتا تو قائد اعظمؒ کبھی بھی پاکستان کا مطالبہ نہ کر سکتے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ قائداعظمؒ کے نزدیک اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں تھا بلکہ وہ اسلام کو ایک عملی نظام حیات سمجھتے تھے اور اسلام کو ایک مکمل نظامِ حیات کے طور پر قبول کرنے کے بعد ہی وہ مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم قرار دیتے تھے۔ قائداعظمؒ تاریخ کے اعتبار سے، مسلمانوں کے ہیروز کے اعتبار سے، آرٹ اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے، قوانین اور اصولوں کے لحاظ سے حتیٰ کہ غذا، لباس، معاشی زندگی، تعلیمی تصورات اور حیوانات کے ساتھ ہندوؤں کے مقابلے میں ہمارے مختلف طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے تھے۔ مسلمان قوم کا ہندو قوم سے سب کچھ مختلف کیوں تھا، اس کی بنیاد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ بنیاد اسلام ہے۔

قائداعظمؒ مذہب کو انسانی زندگی میں کتنی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کا اندازہ آپ اس خط سے بھی کر سکتے ہیں جو قائداعظمؒ نے 21 جنوری 1940ء کو مسٹر گاندھی کے نام لکھا تھا:

- ''آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے۔ وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم ہی نہیں کر سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، مَیں اس کو مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لیے

اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے“۔

قائداعظمؒ کے اس فرمان کے بعد کہ انسان کی تمدنی، سیاسی، معاشی اور مذہبی زندگی کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ قومیت کی تشکیل میں سب سے بڑا عنصر مذہب ہے۔ کیا سیکولرازم کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ گاندھی، نہرو اور ہندوؤں کی سیاسی جماعت کانگریس کے دوسرے راہنما مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں سے مسلمانوں کے الگ قوم ہونے کے نظریے کو قبول نہیں کرتے تھے۔ لیکن قائداعظمؒ کی سیاسی اور نظریاتی سوچ ان سے مختلف تھی۔ وہ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد اور اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کی اساس پر ایک الگ قوم قرار دیتے تھے اور یہی ان کے نزدیک پاکستان کے مطالبہ کی سب سے مضبوط بنیاد تھی۔ علامہ اقبالؒ نے بھی مسلمان قومیت کی بنیاد اسلام کو قرار دیا تھا۔ جب ہم دامنِ اسلام سے وابستہ ہو گئے تو ہم ایک الگ قوم بن گئے۔

بقول اقبالؒ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی ﷺ

علامہ اقبال کے اس شعر کی تشریح قائداعظمؒ کے اس پیغام میں بہت خوبصورت انداز میں کی گئی۔ ہمارے عظیم قائد نے فرمایا تھا:

- ”پاکستان اسی دن معرضِ وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی نہیں تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل“۔

جب قائداعظمؒ کے بقول صرف ایک شخص کے مسلمان ہونے سے پاکستان کی بنیاد رکھی جا چکی کیوں کہ وہ کلمۂ توحید پر ایمان لانے کے بعد ایک جداگانہ قوم کا فرد بن چکا تھا، تو پھر سیکولرازم کو پاکستان کی بنیاد کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ یہ نقطۂ نظر انتہائی مضحکہ خیز اور خلافِ عقل ہے کہ پاکستان قائم تو کلمۂ توحید اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہوا لیکن جب

پاکستان بن گیا تو ہم اسلام کو سیاست بدر اور ریاست بدر کر دیں۔

جس تقریر میں قائداعظمؒ نے یہ فرمایا تھا کہ پاکستان کا آغاز اسی دن ہو گیا تھا جس دن ہندوستان میں پہلا غیر مسلم اسلام پر ایمان لا کر مسلمان ہو گیا تھا۔ اسی تقریر میں قائداعظمؒ نے یہ بھی فرمایا تھا:

❑ ''آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیمِ ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا''۔

میرے سیکولر دوستو! آپ کا اپنا ذاتی نقطۂ نظر کچھ بھی ہے، وہ آپ کو مبارک ہو۔ لیکن قائداعظمؒ کے بارے میں آپ کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ قائداعظمؒ تو دوٹوک اور واضح الفاظ میں یہ فرما چکے ہیں کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ، مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کی وجہ اور جواز اور تقسیم ہند کی مانگ کی بنیاد اسلام ہے بلکہ پاکستان خود اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ اب جس پاکستان کی تلاش اور طلب خود اسلام کو تھی، کیا وہ سیکولر ازم کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ یہ فرماتے کہ مسلمان قوم ایک سیکولر ریاست بنانے کے لیے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کیا قائداعظمؒ کے اس مطالبے کا کوئی جواز سمجھ میں آ سکتا تھا۔ سیکولر ازم تو ان کانگریسی لیڈروں کا ایجنڈا تھا جو مذہب کو ایک ذاتی معاملہ قرار دیتے تھے۔ جو لوگ مذہب اور حکومت کے امور کو الگ الگ سمجھتے تھے، وہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک قوم قرار دیتے تھے۔ مذہب کو سیاست سے الگ قرار دینے والے ہی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے سخت ترین مخالف تھے۔ آج بھی پاکستان میں جن لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ مذہب کا کاروبار مملکت سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے، دراصل وہ مذہب کی بنیاد پر پاکستان کے قیام ہی کو غلط قرار دے رہے ہیں۔

جس پروگرام، منشور اور نظریے پر قوم متحد ہو کر تحریک پاکستان کے لیے سرگرم عمل ہوئی تھی، اب وہ بھی قائداعظمؒ کی زبان ہی سے سن لیں۔ 26 دسمبر 1943ء

کراچی میں قائداعظمؒ کے خطاب کے الفاظ یہ تھے:

- ''وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب، ایک اُمّت''۔

ایک سادہ سا سوال ہے کہ کیا ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب یعنی قرآنِ کریم کو چھوڑ کر قائداعظمؒ سیکولرازم کی بنیاد پر مسلمان قوم کو قیامِ پاکستان کے مطالبہ کی حمایت میں متحد کر سکتے تھے؟ اور کیا اگر اسلامی نظریے کو بنیاد نہ بنایا جاتا تو ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ جس سیکولر فلسفے کا تعلق ہی پاکستان کی بنیاد سے نہیں بلکہ جس سیکولرازم کی نفی کرنے ہی سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا تھا، اس سیکولرازم سے پاکستان کا اور مسلمانوں کا بحیثیت قوم رشتہ ہی کیا بنتا ہے۔ ہمارا رشتہ قرآنِ مجید سے ہو سکتا ہے یا سیکولرازم کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ حق اور باطل دونوں کے ساتھ ہم تعلق استوار نہیں رکھ سکتے۔ ہم ایک ہی نظریے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اسلام کا یا سیکولرازم کا۔

کوئی شخص جو اللہ، حضور نبی کریم ﷺ اور اللہ کی آخری کتاب پر ایمان رکھتا ہو، وہ اسلام کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی طور پر اطلاق کا منکر ہو ہی نہیں سکتا اور جو کوئی اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات اور قرآن کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے راہنما تسلیم نہ کرے، وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ سیکولر طبقہ یہی چاہتا ہے کہ ہم صرف برائے نام مسلمان ہوں۔ ہماری عملی زندگی خاص طور پر سیاست اور معاشرت سے اسلام کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسلام کی جو اخلاقیات ہیں، اُن سے بھی ہم آزاد ہو جائیں اور قانون سازی میں قرآن اور سنتِ رسول ﷺ کو بالادستی حاصل نہ رہے۔ دراصل قرآن اور سنتِ رسول ﷺ یعنی اسلام کو ریاستی معاملات اور اقتصادی امور میں راہنمائی کے لیے نامکمل، ناقص، ناکافی اور ناقابل عمل سمجھنے کا نام سیکولرازم ہے۔ اگرچہ پاکستان میں اب

بھی ہم اسلامی نظام حیات پر عمل نہیں کر رہے لیکن سیکولر ازم سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو باضابطہ طور پر پاکستان سے نکال دیا جائے اور دستورِ پاکستان میں سے بھی یہ الفاظ ختم کر دیئے جائیں کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت سے متصادم نہیں بنایا جا سکتا۔

ظاہر ہے یہ لادینی سوچ قائداعظمؒ کے نظریات کی ترجمان نہیں۔ قائداعظمؒ تو قرآنِ مجید کی عظمت اور جامعیت پر پختہ ایمان رکھتے تھے اور ظاہر ہے یہ عقیدہ وایمان ہر مسلمان کا ہے کہ قرآنِ مجید اللہ کی عظیم اور جامع کتاب ہے۔ یہاں مَیں قائداعظمؒ کے ایک اور ایمان افروز پیغام کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو انھوں نے 1945ء میں عید کے موقع پر دیا تھا:

❑ ''اس حقیقت سے سوائے جُہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرّہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی ذمہ داریوں کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لیے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح آپ اپنا مذہبی پیشوا بن جائے''۔

قائداعظمؒ کا درج بالا پیغامِ عید بار بار پڑھنے کے لائق ہے اور جس طبقے یا عناصر کو قائداعظمؒ نے جُہلا قرار دیا ہے، یہ پیغام ان کو بھی پیغامِ فکر دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کی جامعیت کو بیان کرنے سے قائداعظمؒ کا مقصود ہماری انفرادی زندگی نہیں بلکہ وہ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں قرآنِ حکیم سے راہنمائی لینے کی تلقین کر رہے ہیں اور ہمیں رسولِ کریم ﷺ کے اس حکم سے بھی آگاہ فرما رہے ہیں کہ ہر مسلمان اپنی راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لیے عظیم کتاب قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے۔

سیکولر طبقہ سبق سیکھنے، عبرت پکڑنے اور اپنی اصلاح کرنے پر آمادہ تو نہیں ہو

گا اور قائداعظمؒ کے حوالے سے جھوٹ بولنے سے باز تو نہیں آئے گا لیکن پھر بھی قائد اعظمؒ کا ایک اور ارشاد اُن کے مطالعہ کے لیے مَیں یہاں درج کر رہا ہوں:

❑ ''جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔'' (حیات قائداعظم، ص 427)

قائداعظمؒ کا درج بالا ارشاد حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا سے گفتگو کا ایک حصہ ہے، جو 8 فروری 1942ء کے روزنامہ انقلاب، لاہور میں شائع ہوا تھا۔ قائداعظمؒ نے اسی موقع پر طلبا سے گفتگو میں اسلامی حکومت کا تعارف بھی بڑے جامع انداز میں بیان کیا تھا۔ قائداعظمؒ کا یہ فرمان پڑھ لینے کے بعد ان سازشی اور منافق عناصر کا منہ بند ہو جائے گا جو قائداعظمؒ کو سیکولر ریاست کا حامی قرار دیتے ہیں۔ قائداعظمؒ اگر سیکولر ریاست کے علمبردار تھے تو وہ ایک اسلامی حکومت کے خدوخال کو بڑی وضاحت کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے کیوں بیان کر رہے تھے۔ قائداعظمؒ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

❑ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید

کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہت کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے''۔

قائداعظمؒ کے اس فرمان کو پڑھ لینے کے بعد کیا مزید کسی وضاحت اور دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ قائداعظمؒ جس مملکت اور ریاست کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ وہاں وہ قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی چاہتے تھے کہ یہی ایک اسلامی حکومت کا سیکولر حکومت کے مقابلے میں امتیاز ہے۔

آخر میں قائداعظمؒ کی بطور گورنر جنرل 25 جنوری 1948ء کی اس تقریر کا حوالہ جو عید میلادالنبی ﷺ کے موقع پر انھوں نے کراچی بار ایسوسی ایشن میں فرمائی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے سیکولر عناصر کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا تھا:

- ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔''

اسلام، قرآنِ حکیم، شریعت اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے قائداعظمؒ کی یہ تمام تقاریر پڑھ لینے کے بعد بھی اگر کسی کا ضمیر اور احساس بیدار نہیں ہوتا

اور وہ پھر بھی قائد اعظمؒ کی عظیم شخصیت پر یہ بے بنیاد الزام عائد کرنے سے باز نہیں آتا کہ قائد اعظمؒ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔تو پھر ایسے عناصر کے لیے قرآنِ مجید کے اس فرمان ہی کا سہارا لینا پڑے گا:

- ترجمہ: ''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے''۔(البقرہ:7)

پروفیسر مرزا محمد منور

قائداعظمؒ پر سیکولر ہونے کا الزام

قائداعظم تقریباً سولہ برس کے تھے کہ جب انگلینڈ بیرسٹری کرنے کی خاطر تشریف لے گئے۔ خود بتاتے ہیں کہ میں نے لنکنز اِن نامی ادارے میں داخلہ لیا، ادارے اور بھی تھے مگر اس ادارے کی ایک قوس پر ان عالی قدر اشخاص کے اسمائے گرامی مکتوب تھے، جنھوں نے عالم انسانیت کو آئین عطا فرمائے۔ ان اسمائے گرامی میں حضور نبی اکرم ﷺ کا نام نامی بھی شامل تھا۔ گوابھی بھرپور جوان بھی نہ ہو پائے تھے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قلبی نسبت مربوط تھی۔ یہ نسبت محمدیؐ ہی تھی کہ جس نے مسٹر جناح کو رفتہ رفتہ قائداعظم محمد علی جناح بنایا اور پھر جس کے ہاتھوں بیسویں صدی کی سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آئی۔

حضرت قائداعظم نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت وہی ہندوستان گیر سیاسی پارٹی تھی اور بھی کئی مسلمان اکابر اس میں پہلے سے شامل تھے۔ اب حسن اتفاق دیکھیے کہ قائداعظم نے جو پہلی سیاسی تقریر کی، اس میں ان کے ذمے اسلامی اوقاف کے باب میں ایک شق کی آئینی وضاحت تھی۔ اس وقت عمر تیس برس تھی، لوگوں پر واضح ہوگیا کہ نوجوان بیرسٹر اسلامی فقہ سے آگاہ ہے۔ یہ دسمبر 1906ء کی بات ہے، پھر جب 1909ء میں منٹو مارلے سکیم کے تحت مرکزی حکومت وجود میں آئی تو قائداعظم بمبئی کے حلقے سے منتخب ہوتے رہے حتیٰ کہ پاکستان بن گیا۔ شاید ہی کوئی ہندو، مسلمان یا سکھ اتنی مدت یعنی 38 سال تک اپنے ووٹروں کا اعتماد بحال رکھ سکا ہو۔ اس اسمبلی کی عملی کارروائی 1910ء میں شروع ہوئی۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے

اوقاف کے ضمن میں پائی جانے والی مسلمانوں کی پریشانی کو دُور کرنے کے لیے تجاویز طلب کیں۔ قائداعظم نے ایک ریزولیوشن پیش کیا اور پھر یہ ''مسلم اوقاف ویلڈ ڈیٹنگ ریزولیوشن'' **1913**ء میں ایکٹ بن گیا۔ **1906**ء میں پہلی تقریر مسلم اوقاف کے بارے میں اور ان کا پہلا ریزولیوشن جو ایکٹ بنا، وہ بھی مسلم اوقاف کے بارے میں اور پھر ایک بڑے مسلم وقف کا مطالبہ **1940**ء میں اور اس عظیم وقف کا حصول **1947**ء میں...... **ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء.**

مولانا محمد علی جوہر بھی کانگریس میں تھے۔ انھوں نے **1913**ء میں جب قائداعظم لندن میں تعطیلات منا رہے تھے، قائداعظم کو ترغیب دے کر مسلم لیگ کا رکن بھی بنوا دیا۔ اس دور میں ایک شخص دو سیاسی پارٹیوں کا رُکن ہو سکتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کو بھی مولانا محمد علی جوہر ہی نے دسمبر **1907**ء میں مسلم لیگ کی لندن برانچ کا رُکن بنایا تھا۔ اس وقت علامہ اقبال انگلستان میں زیرِ تعلیم تھے۔ گویا علامہ اقبال نے قائداعظم سے چھ برس قبل مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی دونوں اسلام کے مجاہد اور اللہ کے شیر تھے۔ ان کی ملی خدمات بے پایاں ہیں۔ ان کے ایثار و قربانی کا عوض مولائے قدیر و کریم ہی دے سکتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کو محمد علی جناح میں کیا نظر آیا تھا کہ ترغیب دے کر مسلم لیگ میں لے آئے، پھر قائداعظم نے دس برس بعد **1923**ء میں کانگریس کو ترک کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے **1928**ء میں کانگریس سے پنڈ چھڑا لیا۔ مولانا محمد علی جوہر یوں تو مہاتما گاندھی کی بے حد عزت کرتے تھے، اس کے باوجود **1923**ء میں ایک بھرے جلسے میں کہہ دیا کہ گاندھی جی کی میں جتنی عزت کرتا ہوں، کسی اور کی اتنی عزت نہیں کرتا مگر جہاں تک دین کی نسبت کا تعلق ہے، اُمت مسلمہ کا ایک گیا گزرا بدمعاش بھی میرے لیے گاندھی جی سے عظیم تر ہے...... یہ اسلام اور اُمت مسلمہ سے نسبت کی بات ہے۔

یہی مولانا محمد علی جوہر جب پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شمولیت کی خاطر لندن روانہ ہونے لگے تو شدید طور پر بیمار تھے۔ انھیں سٹریچر پر ڈال کر جہاز پر پہنچا دیا

گیا۔ اس عالم میں کسی نیازمند نے پوچھ لیا: ''آپ جس حالت میں ہیں، وہ تشویش ناک ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی انہونی ہو جائے تو آپ یہاں کس کو چھوڑے جا رہے ہیں؟'' انھوں نے فرمایا ''محمد علی جناح، دوسرا کوئی نہیں، بشرطیکہ جناح یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہو جائے۔'' مولانا محمد علی جوہر نے سر آغا خان، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، حتیٰ کہ مولانا شوکت علی کا بھی نام نہ لیا۔ پھر مولانا شوکت علی نے بہ دل و جاں قائداعظم کا مسلم لیگ میں ساتھ دیا اور جب وہ فوت ہوئے تو قائداعظم پھوٹ پھوٹ کر روئے اور جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر گھنٹوں کھڑے رہے تاکہ مولانا شوکت علی کے جنازے میں شامل ہو سکیں۔ جب 1935ء کا ایکٹ آیا اور ہندوستان بھر میں نئی سیاسی لہریں اٹھنا شروع ہوئیں تو کانگریس کے لیڈروں نے بڑھکیں مارنا شروع کر دیں اور برطانیہ کے بعد فقط کانگریس کو دوسری قوت قرار دینے لگے۔ نیز مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کے لیے مسلم عوامی رابطہ مہم شروع کر دی۔ اس پر قائداعظم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ''تیسری قوت بھی ہے، وہ قوت مسلمان قوم کی قوت ہے۔'' اسی دور میں حضرت علامہ اقبال نے قائداعظم کی خدمت میں خط تحریر کیا کہ آپ اگرچہ بہت مصروف ہیں مگر میں وقتاً فوقتاً عرض ماجرا بیان کرتا رہوں گا۔ اس وقت ہندوستان میں کوئی دوسرا مسلمان نہیں جو مسلمانوں کو اس طوفان سے نکال کر عافیت میں پہنچا سکے جو فقط شمالی ہند ہی کو نہیں بلکہ برعظیم کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔

سید نذیر نیازی مرحوم نے اپنی کتاب ''علامہ اقبال کے حضور'' میں ذکر کیا کہ ''احباب جمع تھے، برعظیم میں مسلمانوں کی حالت زیر تبصرہ تھی، عام لب و لہجہ ذرا مایوسی کا سا تھا۔ حضرت علامہ اقبال نے فرمایا کہ ایک صورت بچاؤ کی ہے، وہ یہ کہ محمد علی جناح کے ہاتھ مضبوط کیجیے۔ اگر جناح کی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمانان ہند جمع ہو جائیں تو اس میں نہ صرف ہندی مسلمانوں کی نجات مضمر ہے بلکہ سارے مشرق وسطی کے مسلمانوں کی بھی نجات پوشیدہ ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے یہ الفاظ وفات سے دو تین ماہ قبل کہے۔ حضرت علامہ اقبال کو یقین تھا اور انھوں نے ایک آدھ خط میں ذکر کیا

ہے کہ شمالی ہند اور افغانستان کے ذمے کوئی بڑا کام لگنے والا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قائداعظم کا اپنا رویہ کیا بتاتا تھا؟ کیا وہ سیکولر تھے؟ پھر مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور علامہ اقبال جیسے عاشقان رسول ﷺ نے ان پر اس قدر بھروسا کیوں کیا؟

مولانا غلام مرشد صاحب مرحوم و مغفور بڑے دبنگ، بہادر مسلمان اور سیدھا چلنے والے عالم دین تھے۔ وہ جمعیت علمائے اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔ کلکتہ میں اس جمعیت کے عظیم الشان پہلے جلسے کی صدارت آپ ہی نے فرمائی تھی۔ بے لاگ بات کرنے والے بزرگ تھے۔ اس نیازمند کو ان سے دو تین بار ملنے اور ان کی گفتگو سننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ انھوں نے اجلاس کلکتہ کے ضمن میں حضرت قائداعظم سے ملاقات کی، آگے یہ ان کا اپنا بیان ہے، ملاحظہ فرمائیے:

❑ ''اسی ملاقات کے دوران اسلامی نظام حیات کا ذکر آیا تو قائداعظم نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ شدہ نسخہ نکال کر فرمایا: ''اس کتاب میں فوجی، انتظامی، معاشی، اخلاقی غرض کہ ہر شعبہ زندگی کے متعلق قوانین موجود ہیں۔ یہ ایسا آئین ہے جو مکمل اور جامع ہے اور اسے دوام حاصل ہے۔ اس کی ابدیت کی میں ایک مثال دیتا ہوں کہ اس میں کئی مقامات پر ارشاد خداوندی ہے کہ ہر جرم کی سزا اس کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہ کس قدر عالمی اور ابدی اصول ہے۔'' آگے پھر مولانا مرشد کا ارشاد ہے، کہتے ہیں ''قائداعظم کی اسلامی ذہنیت اور اسلام کے ساتھ ان کے عشق کا میں پہلے ہی معترف تھا، میں ان کی قرآن فہمی پر حیرت زدہ رہ گیا اور ان کی دینی بصیرت مجھ پر واضح ہوگئی۔'' (آتش فشاں، قائداعظم نمبر، ص 267، مرتبہ منیر احمد)

آپ شروع میں مذہبی معاملات میں نواب بہادر یار جنگ سے، بعد میں مولانا شبیر احمد عثمانی سے مشورہ لیا کرتے۔ انھوں نے علامہ شبیر احمد عثمانی کو دستور ساز اسمبلی کا ممبر بھی اسی لیے منتخب کرایا تھا۔

ہمارے کرم فرما دوست ایم اے حارث مرحوم بمبئی کے رہنے والے تھے۔ وہ یوسف کالج جوگیشوری بمبئی میں پڑھتے تھے۔ تقسیم برعظیم کے بعد کراچی میں بس گئے

تھے۔ انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب تصنیف کی تھی ''قائداعظم'' جو 1976ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ ''ہمارے ہاسٹل میں قائداعظم تشریف لائے۔ یہ یکم فروری 1943ء کی بات ہے، دوران تقریر فرمایا کہ ''اسلام محض مذہب نہیں، یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مسلم ملت کی ساری زندگی کے معاملات خواہ وہ مجلسی ہوں، خواہ تمدنی، خواہ سیاسی اور خواہ اقتصادی، اس کی روشنی میں طے پاتے اور حل ہوتے ہیں۔ ہم پاکستان میں جملہ امور اسلامی اصولوں کی ہی روشنی میں حل کریں گے خواہ وہ کسی بھی شعبۂ حیات سے متعلق ہوں۔''

قائداعظم نے پاکستان عظیم الشان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بارہا پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کا تہیہ ظاہر کیا اور اس بات میں کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ جب پاکستان وجود میں آ گیا تو انھوں نے بارہا پاکستان کو ''مسلم سٹیٹ آف پاکستان'' کہا۔ ایک بار بھی سیکولر ریاست ڈیموکریسی یا ایسے ہی کسی اور مہمل کلمے کو ہرگز استعمال نہیں کیا۔ اگر حکومت پاکستان کی شائع کردہ کتاب ''قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے'' دیکھی جائے تو بات قطعاً واضح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ظہور پاکستان کے بعد باؤنڈری کمیشن کے غیر عادلانہ اور محض ''سیاسی فیصلے'' کے خلاف بیان دیا تو اس میں بھی پاکستان کو مسلم سٹیٹ آف پاکستان کہا۔ لاہوریوں کو خطاب کیا تو فرمایا ''پاکستان حصار اسلام ہے، یعنی فقط مسلمانان پاکستان ہی کا حصار نہیں، پورے عالم اسلام کا ہے۔'' اسی کتاب ''خطبات قائداعظم'' کے صفحہ 32 (پہلا ایڈیشن) میں کہا کہ ''اب ہمیں پاکستان کی تعمیر میں جت جانا چاہیے۔ پاکستان فقط سب سے بڑی اسلامی مملکت ہی نہیں، دنیا بھر میں پانچویں بڑی مملکت ہے۔'' سبی دربار میں، پشاور میں، رسال پور میں، چٹاگانگ میں اور 14 اگست 1948ء کے پیغام بنام ملت میں بھی، غرض ہر جگہ انھوں نے پاکستان کو مسلم مملکت پاکستان کہا اور عیاں ہے کہ قائداعظمؒ جو کہتے تھے، وہی ان کا مقصود بھی ہوتا تھا۔ وہ محض سیاستدان نہ تھے، مرد میدان بھی تھے، مرد ایمان بھی تھے۔

اسی انداز میں انھوں نے کھل کر بلکہ زیادہ کھل کر اس تقریر میں پاکستان کو مسلم

مملکت قرار دیا جو 25 جنوری 1948ء کو یوم میلادالنبیؐ کے موقع پر کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ارشاد فرمائی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے بالصراحت کہا:

❑ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔''

ہم نے دیکھ لیا کہ قائداعظم نے ان لوگوں کی نیت کو مبنی بر شرارت قرار دیا ہے جو پروپیگنڈا کیے جا رہے تھے کہ پاکستان کا آئین اسلامی شریعت کے اصولوں پر مبنی نہیں ہو گا۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں قائداعظم کی زندگی میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو قائداعظم کی سیدھی اور صحیح بات کو مرادی معنی پہنا رہے تھے اور یہ تاثر دے رہے تھے کہ اصل میں قائداعظم کی نیت کو وہی سمجھتے تھے۔ گویا قائداعظم کے دل میں کچھ اور تھا اور زبان پر کچھ اور تھا۔ یہ وہ الزام تھا جو قائداعظم پر قائداعظم کا کوئی بدترین دشمن بھی عائد نہ کر سکا۔

جن لوگوں نے قرارداد مقاصد پیش کی اور پھر منظور کرائی، ان میں وہ لوگ شامل تھے جن کو قائداعظم کے تابعین کی حیثیت سے قائداعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ خصوصاً لیاقت علی خان اور علامہ شبیر احمد عثمانی۔ کیا یہ لوگ قائداعظم کی نیت کو نہیں جانتے تھے، کیا انھیں معلوم نہیں تھا کہ قائداعظم پاکستان کا آئین کیسا چاہتے تھے۔ عیاں ہے کہ ان سب افراد ملت پر قائداعظم کی مرضی واضح تھی اور وہ اسی کے

مطابق کام کر رہے تھے اور اس کام میں رکاوٹ کچھ باہر والے لوگ ڈال رہے تھے۔

یہ باہر والے لوگ کون تھے؟

1- بنگال کا ہندو طبقہ تھا جو قدم قدم پر اڑچن ڈال رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی جو قرارداد مقاصد پیش کر رہی ہے، اس میں شامل اسلامی روح کے حامل جملے اور کلمات زیادہ سے زیادہ خارج کرائے جائیں تاکہ وہ قرارداد مقاصد اسلامی روح کی حامل دستاویز نظر نہ آئے۔

2- ہندوؤں کے بعد وہ دہریئے لوگ تھے جو اسلامی رنگ اور روح کی حامل کسی شے کو بھی پسند نہ کرتے تھے، وہ ابھی سرخ سویرے اور مطلوبہ سحر کے منتظر تھے۔

3- کچھ تعداد صاحب بہادروں کی تھی جو مغربی تہذیب کے پروردہ تھے اور انگریزوں کے ظاہری عادات کے میمونی نقال، میمونی شاید بندر کو کہتے ہیں، انھیں اسلام کا نام سن کر بے آرامی محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ مئے شبانہ کی محفلیں سجانے والے لوگ تھے۔

4- اور مزید بلکہ ثم مزید برآں قادیانی حضرات تھے، جن کو پتہ تھا کہ جب بھی اسلامی دستور بنا، انھیں پریشانی لاحق ہوگی۔ جس جعلی نبوت کے ساتھ وہ وابستہ ہیں، اس کا کیا بنے گا؟ یہ لوگ بقول زیڈ اے سلہری (**My Leader**، صفحہ **279**، ایڈیشن **1992**ء) قادیان کی فرقت کا زخم مندمل کرنے کو تیار نہ تھے اور نہ ہیں۔

آج یہ قادیانی افراد بڑے مقدس، بڑے مدبرانہ ادب اور مشینی انکسار کے باسلیقہ اظہار کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ''قائداعظم نے چونکہ جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر بنا لیا تھا لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ اسلامی آئین نہیں چاہتے تھے۔'' سیدھی سی بات ہے کہ قائداعظم اقلیتوں کو بھی پاکستان کی خدمت کا موقع عطا فرمانا چاہتے تھے۔ اگر خالصہ حضرات پاکستان کو چھوڑ کر چلے نہ جاتے تو کوئی چھبیل سنگھ بھی سکھوں کے نمائندے کے طور پر کابینہ میں نمائندگی کر رہا ہوتا۔ چھبیل سنگھ ہی کی طرح چودھری ظفر اللہ خان کو بھی لیا گیا تھا۔ گویا وہ قادیانیوں کے نمائندہ تھے، قائداعظم اس امر کے قائل تھے کہ سب پاکستانیوں کو پاکستان میں عدل میسر آنا چاہیے تاآنکہ وہ لوگ پاکستان سے اتنی زیادہ

محبت کریں گے کہ انھیں احساس تک نہ ہو کہ ہندو یا غیر مسلم ہونے کے باعث ان سے کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ گویا وہ وقت بھی آئے کہ وہ پاکستانی کہلا کر فخر محسوس کریں مگر جس طرح جوگندر ناتھ منڈل نے وفا نہ کی، اسی طرح ظفراللہ خان نے بھی پاکستان کی خدمت پر بنومسیلمہ کی خدمت وتقویت کو ترجیح دی۔ مراد یہ کہ قائداعظم نے ہندوؤں اور قادیانیوں سے جو امید وابستہ کی تھی، وہ غلط ثابت ہوئی۔ ہندو، ہندو ہی رہا اور آج بھی اسی طرح دشمن اسلام اور دشمن پاکستان ہے اور یہی حال بنومسیلمہ کا ہے، وہ آج بھی قادیان میں براجمان ہونے کی خاطر متحدہ ہندوستان کے منتظر ہیں۔

قائداعظم نے جن لوگوں کو شرارت پرداز قرار دیا تھا، ان کا قادیانی شعبہ آج سب سے زیادہ سرگرم ہے۔ یہ بنومسیلمہ آج اس امر پر تلے ہوئے ہیں کہ یا تو پاکستان کو سیکولر بنا دیا جائے یا ڈھا دیا جائے۔ چنانچہ وہ ہر اس بات کی مخالفت کر رہے ہیں جو قائداعظم اور علامہ اقبال نے تعمیر ملت کے ضمن میں ارشاد فرمائی تھی۔ خواہ وہ دستور کی بات ہو، خواہ اُردو زبان کا مسئلہ ہو، یہ لوگ کبھی روشن خیال بن کر، کبھی سوشلسٹ واسکٹ پہن کر، کبھی پرانے مسلم لیگی ورکر کے رُوپ میں، دن رات انتقامی جذبے کے ساتھ کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اب ایک طرف اُمت مسلمہ ہے اور دوسری طرف بنومسیلمہ اور یہ تصادم فقط پاکستان ہی میں نہیں، یہ ساری دنیا میں جہاں جہاں محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام لیوا موجود ہیں، جاری ہے۔

بہر حال ایک امر واضح ہے کہ اسلام اس بات پر مبنی ہرگز نہیں کہ قائداعظم یا علامہ اقبال سیکولر تھے یا پکے مسلمان، وہ الحمدللہ پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، مگر اسلام ان دو پر مبنی نہیں اسلام قائداعظم کا نہیں، اسلام اقبال کا نہیں، اسلام مولانا مودودی کا نہیں، اسلام اولیا کا نہیں، تابعین و تبع تابعین کا نہیں بلکہ اسلام فقط اور فقط رسول کریم ﷺ کا اسلام ہے۔ آفتاب آپ ﷺ ہیں، باقی آپ ﷺ کے سارے نام لیوا کرنیں ہیں۔ اصحاب رضوان اللہ اجمعین سے لے کر قائداعظم اور علامہ اقبال تک سب کرنیں ہیں۔ آفتاب رسالت ﷺ کی کرنیں کوئی کم چمکدار کوئی بہت زیادہ چمکدار......

یہ پاکستان ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے آفاقی آوازے اور افلاکی للکار پر بنا ہے، اس کی بنیاد مضبوط ہے، یہ اسلام کا قلعہ ہے خواہ یہ بات منافقوں، مرتدوں، قادیانیوں، دہریوں اور مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار گزرے......!

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ڈاکٹر صفدر محمود

کیا قائداعظم سیکولر تھے؟

سوال یہ ہے کہ کیا بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سیکولر تھے؟ سیکولر کے لغاتی معانی ہیں لادین، لامذہب، دنیاوی۔ لیکن عام مفہوم کے مطابق سیکولر ایسے شخص کو سمجھا جاتا ہے جو دین اور دنیا کو الگ الگ تصور کرتا ہو یعنی مذہب کو محض ذاتی معاملہ سمجھتا ہو اور قومی سیاست کو اپنے مذہب یا دین سے بالکل پاک اور علیحدہ رکھنے کا قائل ہو۔ اس ضمن میں مغربی ممالک کی مثال دی جاتی ہے جہاں چرچ اور ریاست جدا جدا ہیں اور سیاست پر مذہب کی پرچھائیں نہیں پڑتی۔ پاکستان میں ایک عرصے سے یہ بحث جاری ہے کہ کیا قائداعظم پاکستان میں سیکولر نظام قائم کرنا چاہتے تھے؟ ایک اقلیتی دانش ور حلقہ یہ ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے کہ قائداعظم پاکستان کے سیاسی ڈھانچے کو اسلام سے بالکل پاک اور صاف رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قیام پاکستان کا مقصد ایک سیکولر جمہوری ریاست کا قیام تھا۔ یہاں اقلیتی حلقہ سے مراد چھوٹا گروہ ہے۔ دوسری طرف اکثریتی حلقے کا اصرار ہے کہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ مذہب ہی پاکستان کے مطالبے کا طاقت ور ترین محرک تھا، اس لیے پاکستان کے ریاستی ڈھانچے اور آئین و سیاست کی بنیاد، اسلامی اصولوں پر استوار کر کے ہی تصور پاکستان کو شرمندہ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نظریاتی حلقے کے دانش وروں کا خیال ہے کہ اگرچہ تحریک پاکستان کے محرکات میں معاشی، سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل وغیرہ نے اہم کردار سرانجام دیا لیکن ان میں سب سے زیادہ مؤثر فیکٹر مذہب کا تھا جس کے سبب عوام نے بے پناہ قربانیاں دیں، صعوبتیں برداشت کیں، آگ اور خون کے سمندر سے گزر کر

پاکستان پہنچے۔ اس سے قطع نظر اگر پاک و ہند کے مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ احساس پوری طرح جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کی صحیح معنوں میں بقا کے لیے ایک اسلامی ریاست کا قیام ضروری ہے۔ دراصل یہ احساس ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کے تجربات کا نتیجہ تھا۔ خود قائداعظم نے بھی اپنی تقریروں میں یہ بات کئی بار کہی۔

کسی بھی شخصیت کے نظریات اور تصورات کو سمجھنے کے لیے اس کی ذاتی زندگی میں جھانکنا اور اس کی عوامی زندگی کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے اور عوامی زندگی کو سمجھنے کے لیے تقریریں، تحریریں، رجحانات اور سرگرمیاں مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ مثلاً ہم نے قائداعظم کی ہر سوانح عمری میں یہ واقعہ پڑھا ہے کہ جب وہ لندن میں بیرسٹری کے لیے داخلہ لینا چاہتے تھے تو انھوں نے لنکنز اِن کو اپنی درس گاہ کے طور پر اس لیے منتخب کیا کہ لنکنز اِن میں دنیا کے عظیم ترین آئین یا نظام قانون دینے والوں (Greatest Law Givers) کی فہرست میں ہمارے نبی آخر الزماں ﷺ کا نام گرامی بھی شامل تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے اس سے متاثر ہو کر لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ اس واقعہ کا انکشاف خود قائداعظم نے کراچی میں عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر کیا تھا، اس لیے یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے۔ اسی حوالے سے میں خود بھی لندن میں خاص طور پر لنکنز اِن دیکھنے گیا۔

میں نے بھی جب یہ واقعہ پڑھا تو اسے اس کے صحیح تناظر میں نہ سمجھ سکا کیونکہ بظاہر قائداعظم مغربی طرز حیات کا نمونہ نظر آتے تھے، وہی مغربی لباس، وہی انگریزی زبان، وہی اطوار...... اس کے برعکس اس بنیاد پر لنکنز اِن کو منتخب کرنے کا فیصلہ صرف وہی شخص کر سکتا تھا جس کا دل حب رسول ﷺ سے منور ہو، کیونکہ عام حالات میں ایک 17 سالہ کمسن نوجوان اور پھر لندن کی آزاد فضا میں کون ایسی باتوں کی پرواہ کرتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ قائداعظم کا تعلق ایک تجارت پیشہ خوجہ فیملی سے تھا، نہ کہ علامہ اقبال کی مانند ایک ٹھوس مذہبی گھرانے سے...... بچپن کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ عام طور پر

نوعمری کی تربیت کے شخصیت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے قائداعظم کے لنکنز اِن کے انتخاب کا صحیح پس منظر اور مفہوم اس وقت سمجھ میں آئے جب میں نے سید رضوان احمد کی کتاب ''قائداعظم کی زندگی کے ابتدائی تیس (30) سال'' پڑھی۔ اس کتاب میں مصنف نے گہری تحقیق کے بعد قائداعظم کے بچپن کے بارے میں کچھ ایسی معلومات کا انکشاف کیا ہے جو اس سے قبل منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ قائداعظم کے والد گرامی تجارت کے ساتھ ساتھ مشن ہائی سکول کراچی میں پڑھاتے بھی تھے لیکن انھوں نے اپنے بیٹے کو شروع میں سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کروایا کیونکہ مشن سکول میں عیسائیت کا پرچار بھی کیا جاتا تھا جبکہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں بچوں کی دینی تربیت پر توجہ دی جاتی تھی۔ مدرسۃ الاسلام کے ریکارڈ کے مطابق محمد علی جناح کے نام کے سامنے والے خانے میں حسب رواج خوجہ لکھنے کے بجائے محمڈن لکھایا گیا۔ قائداعظم سندھ مدرسۃ الاسلام چھوڑ کر بمبئ گئے تو وہاں بھی انجمن اسلامیہ کے سکول میں داخل ہوئے۔ بعدازاں لندن جانے سے قبل وہ مختصر سے عرصہ کے لیے کراچی کے مشن سکول میں بھی طالب علم رہے۔ سید رضوان احمد کی تحقیق کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح کے والد جناح بھائی پونجا مذہبی رجحانات رکھتے تھے اور شام کے وقت محلے کے بچوں کو قرآن مجید پڑھایا کرتے تھے جبکہ قائداعظم کی والدہ بچوں کو تاریخی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم کی تربیت قدرے مذہبی ماحول میں ہوئی اور اسی مذہبی تربیت کا اثر تھا کہ قائداعظم نے لندن میں لنکنز اِن کا انتخاب کیا۔

حصول تعلیم کے بعد عملی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے قائداعظم 1896ء میں بمبئ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر بیس (20) برس تھی۔ اسلام اور مسلمانوں سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے بمبئ میں فروکش ہوتے ہی انجمن اسلامیہ بمبئ کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس کی میٹنگوں میں شرکت کرنے لگے۔ انھوں نے انجمن اسلامیہ بمبئ کی میٹنگ میں پہلی بار 8 جولائی 1897ء کو شرکت کی اور

پھر اسی سال **14** اگست کو انجمن اسلامیہ نے عید میلاد النبی ﷺ کے ضمن میں جلسہ کیا تو قائداعظم اس میں بھی شریک ہوئے۔ عید میلاد النبیؐ کی تقریب میں نواب محسن الملک نے صدارت کی اور اس تقریب میں سیرت النبی ﷺ پر تقریروں کے علاوہ نعتیں پڑھی گئیں اور حضور سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ قائداعظم کی حضور نبی کریم ﷺ سے عقیدت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیاسی و قانونی زندگی کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اکثر عید میلاد النبیؐ کی تقریبات میں شرکت کرتے رہے۔

قائداعظم **1910**ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل (اعلیٰ ترین قانون ساز اسمبلی) کے رکن منتخب ہوئے تو انھوں نے مسمانوں کے ایک دیرینہ مسئلے کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ پریوی کونسل کے ایک فیصلے کے نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے روایتی نظام وقف الاولاد پر زد پڑی تھی جس سے نہ صرف مسلمانوں کے مفادات متاثر ہوئے تھے بلکہ ان کا ایک صدیوں پرانا سسٹم بھی غیر مؤثر ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ مسلمان نہایت پریشان تھے اور برطانوی حکومت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ قائداعظم نے کونسل کا رُکن منتخب ہونے کے بعد وقف الاولاد کا بل کونسل میں پیش کیا اور پھر ان کی کئی برس کی محنت اور مسلسل کوششوں سے وہ قانون بن گیا۔ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں یہ پہلا بل تھا جو کسی مسلمان رُکن نے مسلمانوں کے بارے میں پیش کیا اور وہ قانون بنا۔

1918ء میں انھوں نے بمبئی کی ممتاز شخصیت سر ڈنشا کی بیٹی رتی سے شادی کی تو شادی سے قبل قبول اسلام کی شرط رکھی۔ رتی ڈنشا پہلے مسلمان ہوئیں اور پھر ان کا نکاح محمد علی جناح سے ہوا۔ میں نے اس حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ محمد علی جناح، رتی ڈنشا کو مولانا شاہ احمد نورانی کے سگے تایا مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے کر گئے جنھوں نے انھیں مسلمان کیا اور ان کا نکاح قائداعظم سے پڑھوایا۔ مولانا نذیراحمد صدیقی اہل سنت تھے اور مولانا نورانی کے بقول قائداعظم ان سے مذہبی معاملات میں راہنمائی لیا کرتے تھے۔ ان کا انتقال مدینے میں ہوا اور وہ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

قائداعظم نہایت سمجھدار اور محتاط انسان تھے اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق اثنا عشری سے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خاندان کا مذہبی پس منظر یہی تھا تو پھر انھوں نے اپنی ہونے والی بیوی کو قبول اسلام اور اپنے عقد میں لینے کے لیے نکاح پڑھوانے کے لیے کسی ایسی مذہبی شخصیت کا انتخاب کیوں نہ کیا جس کا تعلق اثنا عشری سے ہوتا۔ ظاہر ہے کہ شیعہ علما کی بمبئی میں کوئی کمی نہ تھی۔ اگرچہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم مذہبی فرقہ پرستی سے ماورا تھے اور اس صورتحال کی بہترین وضاحت ان کے ایک جواب میں ملتی ہے۔ ایک دفعہ کسی صاحب نے محض شرارت کرنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے قائداعظم سے یہ سوال پوچھا تھا کہ ''آپ کا تعلق سنی فرقے سے ہے یا شیعہ فرقے سے؟'' تو قائداعظم کا جواب تھا کہ ''ہادی اسلام حضور نبی کریم ﷺ کا مذہب کیا تھا؟'' یہ جواب ان کی سوچ، شخصیت اور مذہبی رجحان کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت اور دلچسپ اتفاق ہے کہ قائداعظم کی واحد اولاد یعنی ان کی بیٹی دینا جناح نے 14 اور 15 اگست 1919ء کی درمیانی شب کو جنم لیا۔ ایک مؤرخ کے بقول ان کی دوسری اولاد صحیح 28 برس بعد 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب کو معرض وجود میں آئی اور اس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم اپنی اولاد کو دل و جان سے چاہتے تھے اور خاص طور پر دینا جناح ان کی زندگی کی پہلی محبت کی آخری نشانی تھی لیکن اس کے باوجود دینا نے کسی مسلمان نوجوان کے بجائے ایک پارسی عیسائی نوجوان نیوائل وادیا سے شادی کا فیصلہ کیا تو قائداعظم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے تعلق توڑ لیا۔ دینا ان کے جگر کا ٹکڑا تھی، اس سے بیٹی کی حیثیت سے تعلقات رکھے جا سکتے تھے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی لاتعداد مثالیں ہیں کہ لبرل قسم کے مسلمان مذہبی رشتہ ٹوٹنے کے باوجود اولاد سے سماجی تعلقات نبھاتے ہیں۔ لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قائداعظم نے بیٹی سے مذہب کا رشتہ منقطع ہونے کے بعد اس سے ہر قسم کے رشتے توڑ لیے۔ دوستوں سے کبھی دینا کا ذکر

تک نہ کیا جیسے ان کی کوئی اولاد ہی نہ تھی اور پھر مرتے دم تک دینا کی شکل نہ دیکھی۔ شادی کے بعد دینا نے چند ایک بار اپنے والد گرامی کو خطوط لکھے۔ قائداعظم نے ایک مہذب انسان کی مانند ان خطوط کے جوابات دیئے لیکن ہمیشہ اپنی بیٹی کو ''ڈیئر دینا'' یا پیاری بیٹی کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے مسز وادیا کے نام سے مختصر جوابات دیئے۔ (بحوالہ سٹینلے والپرٹ، جناح آف پاکستان، صفحہ 370) یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم کی بیٹی مسز وادیا اپنے باپ سے ملنے اور اپنے باپ گورنر جنرل کو دیکھنے کے لیے پاکستان آنا چاہتی تھی، اس نے اجازت چاہی، دوستوں نے قائداعظم سے درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ دینا پہلی اور آخری بار قائداعظم کی وفات کے موقع پر ہی پاکستان آ سکی اور مرحوم باپ کی میّت پر آنسو بہا کر واپس چلی گئی۔ قائداعظم کی نماز جنازہ ممتاز مذہبی شخصیت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی جن کا مسلک اظہر من الشّمس ہے۔ وزیرآباد کے جناب محمد شریف طوسی صاحب عالم و فاضل انسان تھے۔ انھوں نے اس مشکل دور میں ملازمت کی مجبوری کے باوجود انگریزی زبان میں مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں اتنے مدلل مضامین لکھے کہ تہلکہ مچا دیا۔ یہ مضامین قائداعظم کو بہت پسند آئے۔ چنانچہ قائداعظم نے انھیں ڈھونڈا اور بمبئی بلا کر چھ ماہ اپنے پاس رکھا۔ اس طرح طوسی صاحب کو قائداعظم کو نزدیک سے دیکھنے اور ان کی ذاتی لائبریری کو کھنگالنے کا موقع ملا کیونکہ قائداعظم ان سے تحقیق اور لکھنے کا کام لیتے تھے۔ طوسی صاحب کا بیان ہے کہ ''قائداعظم کی لائبریری میں سیرت النبی ﷺ، اسلامی تاریخ و قانون اور خلفائے راشدینؓ پر بہت سی کتابیں موجود تھیں اور قائداعظم اکثر اوقات خلفائے راشدین اور تفسیر پر کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔''

غزوۂ بدر کے بعد کا واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں کو فتح نصیب ہو چکی تو ایک خلیفہ راشد کے بیٹے جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اپنے والد گرامی سے ملے اور کہنے لگے کہ ''غزوۂ بدر کے دوران ایک مقام ایسا آیا کہ آپ کی گردن میری تلوار کی زد میں تھی لیکن مجھے فوراً خیال آیا کہ آپ میرے والد ہیں۔ چنانچہ میں نے

ارادہ بدل لیا۔'' اس کے جواب میں والدؒ نے فرمایا کہ ''خدا کی قسم! اگر تمہاری گردن میری تلوار کی زد میں آ جاتی تو میں ہرگز باز نہ آتا اور تمہاری گردن مار دیتا......'' گویا اسلام میں رشتے خون کے حوالے سے نہیں بلکہ دین کے حوالے سے قائم ہوتے ہیں۔ حضرت قائداعظم نے اپنی اکلوتی بیٹی سے رشتہ توڑ کر اسی اصول کی پیروی کی کیونکہ دینا نے اسلام سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ کچھ حضرات قائداعظم کی بیٹی کی وادیا سے شادی کو محمد علی جناح کی اَنا کا مسئلہ قرار دے کر ''ذاتیات'' کا رنگ دیں گے۔ لیکن اگر سارے واقعے کو اپنے صحیح پس منظر میں پرکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قائداعظم کے لیے یہ اَنا کا نہیں بلکہ دین ہی کا مسئلہ تھا۔ سٹینلے والپرٹ اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' میں لکھتا ہے:

❑ ''دینا نے وادیا سے شادی کا ارادہ کیا تو اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے والد سے کیا جنھوں نے کبھی اس کی بات کو ٹالا نہیں تھا۔ قائداعظم نے اپنی بیٹی کو اس فیصلے سے باز رکھنے کے لیے بہت سمجھایا اور کہا کہ ''ہندوستان بہتر سے بہتر مسلمان نوجوانوں سے بھرا پڑا ہے، تم جس مسلمان نوجوان کو بھی منتخب کرو گی، وہ تم سے شادی کرنا اعزاز سمجھے گا۔ میری خواہش ہے کہ تم کسی بھی مسلمان نوجوان سے شادی کرو۔'' جب دینا اپنی بات پر اڑی رہی تو قائداعظم نے یہ کہہ کر اس سے منہ موڑ لیا کہ ''آج سے میرا اور تمہارا رشتہ ختم ہے، جو چاہو کرو۔'' قائداعظم کا فقط اصرار یہ تھا کہ تم مسلمانوں میں شادی کرو، وہ کسی مخصوص نوجوان یا خاندان میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے کہ یہ ان کے لیے ذاتی اَنا کا مسئلہ ہوتا۔ انھوں نے مسلمان کی شرط لگا کر واضح کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ دین کا ہے، دنیا کا نہیں۔''

مولانا حسرت موہانی نہایت درویش، صالح، حق گو، بے باک اور کھرے انسان تھے۔ وہ شاید مسلم لیگ کے واحد رُکن تھے جو بھری میٹنگوں میں اٹھ کر قائداعظم پر تنقید کر لیتے اور پھر قائداعظم اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دے کر انھیں مطمئن کرتے۔ انھوں نے ساری زندگی مسلم لیگ کے ساتھ رہ کر جدوجہد کرتے گزار دی۔ کئی

بار جیل گئے اور قید بامشقت بھگتی۔ حصول پاکستان ان کا سب سے بڑا خواب تھا لیکن انھوں نے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرنے کے بجائے باقی ماندہ زندگی ہندوستان میں ہی گزار دی کیونکہ ان کی جدوجہد مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لیے تھی نہ کہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے...... مالی تنگی اور عُسرت کے باوجود مولانا حسرت موہانی نے 11 حج کیے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں 12 عمرے نصیب کیے۔ مولانا حسرت موہانی کا کہنا ہے کہ ''ایک بار وہ صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں قائداعظم کے گھر پہنچے کیونکہ انھیں علم تھا کہ قائداعظم سحر خیز ہیں۔ چوکیدار نے انھیں انتظار کے کمرے میں بٹھا دیا کہ ابھی صاحب باہر نہیں نکلے، آپ انتظار کریں۔ مولانا حسرت موہانی قدرے بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ کچھ دیر تو انتظار کرتے رہے پھر سوچا کہ میں خود ہی ان کو تلاش کر لیتا ہوں۔ مولانا حسرت موہانی کا بیان ہے کہ وہ کمرے کے درمیانی دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے اور اس کمرے کا پردہ اٹھا کر اگلے کمرے میں گئے تو انھیں کسی شخص کے رونے اور آہ وزاری کی آواز آئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وہ رونے کی آواز سن کر پریشان ہوئے اور رُک گئے...... پھر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون رو رہا ہے، انھوں نے خاموشی سے اگلے کمرے کا پردہ سرکا کر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ قائداعظم سجدے میں گرے ہوئے تھے اور گڑگڑا کر رو رہے تھے''۔ مولانا حسرت موہانی کا کہنا ہے کہ وہ یہ منظر دیکھ کر دبے پاؤں واپس آ گئے۔ ظاہر ہے سجدے میں گر کر وہی شخص گڑگڑائے گا جس کے دل میں خوف خدا ہو اور جس کا باطن تیقن، یقین کامل، حب الٰہی اور سوزِ دروں کے نور سے مالا مال ہو۔

مولانا حسرت موہانی کا ذکر ہوا تو یاد آیا کہ محترم ظہیرالاسلام فاروقی صاحب نے اپنی کتاب ''مقصد پاکستان'' میں لکھا ہے:

- ''مولانا حسرت 1946ء کے انتخابات کے سلسلے میں ملک بھر کے دورے کر رہے تھے تو ایک بار ریل کے سفر کے دوران مستقبل کے حوالے سے گفتگو چل نکلی اور مولانا نے کہا ''آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ پاکستان بن کر رہے گا، اس سے آگے کی فکر

کریں۔'' پیر علی محمد راشدی صاحب نے پوچھا کہ ''آپ کو اس قدر یقین کیوں ہے کہ پاکستان بہرحال بن کر رہے گا؟ کیونکہ کانگریس اور انگریز حکومت دونوں اس مطالبے کے مخالف ہیں۔'' مولانا نے جواب دیا کہ ''مجھے اس لیے یقین ہے کہ مجھے خواب میں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ نے مجھے قیام پاکستان کی بشارت دی۔'' آپ اس سے اندازہ کیجیے کہ مولانا حسرت موہانی خود کتنی عظیم اور روحانی حوالے سے کتنی بزرگ ہستی تھے جنھیں خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور جنھیں خود حضور ﷺ نے بشارت دی۔''

قائداعظم کے کردار کی عظمت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور زمانہ گواہ ہے کہ وہ ایک سچے، کھرے، بااصول اور باوقار انسان تھے۔ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کی عظمت کے معترف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانان ہند و پاکستان ان پر جان چھڑکتے تھے اور ان پر اندھادھند اعتماد کرتے تھے۔ میرے نزدیک قائداعظم کی راست گوئی اور عظمت کردار، سیرت النبی ﷺ کے گہرے مطالعے کا اعجاز تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ قائداعظم کوئی روحانی بزرگ، صوفی یا مذہبی شخصیت نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی ایسا دعویٰ کیا۔ وہ بار بار کہتے رہے کہ میں ''مولانا'' نہیں ایک عام مسلمان ہوں۔ بشری کمزوریوں سے پاک شخصیات صرف انبیا اور اولیا کی ہوتی ہیں۔ قائداعظم بھی بہرحال ایک بشر ہی تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں، وہ نمود و نمائش، منافقت اور دوہرے معیار سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی تقریریں اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ان کے باطن اور دل کی گہرائیوں کی عکاسی کرتے تھے اور انھوں نے کبھی عوام کو جذبات میں بہلانے، بہکانے یا اپنے بارے میں غلط تاثر دینے کی کوشش نہیں کی۔

قائداعظم کے مزاج کے اس پس منظر میں ان کی تقریریں پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے محبت، اسلام کی بقا اور عظمت، اسوۂ حسنہ، اپنے ضمیر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی جیسے احساسات و تصورات ان کے خون میں شامل تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریریں ان الفاظ اور ترکیبات سے اس قدر معطر ہیں کہ ہر دوسری

تیسری سطر میں مسلمان اور اسلام کے الفاظ سجے ہوئے ہیں۔ ان تقریروں کو پڑھ کر یوں احساس ہوتا ہے کہ جیسے قائداعظم ہمہ وقت مسلمان اور اسلام کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے حقوق، مسلمانوں اور اسلام کے مستقبل کے حوالے سے سینکڑوں تقریریں کیں اور ان میں بار بار کہا کہ ہمیں کہیں سے بھی جمہوریت کا سبق لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے جمہوریت آج سے تیرہ سو برس پہلے سیکھ لی تھی۔ جمہوریت ہمیں اسلامی ورثے میں ملی ہے۔ اسوۂ حسنہ ہمارے لیے نمونہ ہے اور نبی کریم ﷺ نے جس طرح یہودیوں اور دوسری اقلیتوں سے معاہدے کیے، ہم انھی اصولوں سے روشنی حاصل کر کے اقلیتوں کو برابر کے حقوق دیں گے۔ ظاہر ہے کہ قائداعظم بار بار یہ باتیں صرف اس لیے کرتے رہے کہ یہ ان کی سوچ وفکر اور باطنی شخصیت کا پختہ حصہ تھیں اور وہ ان پر مکمل یقین رکھتے تھے ورنہ وہ عوامی داد یا سستی شہرت سے ہمیشہ دور رہے۔

مسلمانوں سے بے لوث محبت، اسلام سے گہرا لگاؤ، ضمیر کی گواہی اور اللہ کے سامنے جوابدہی صرف اور صرف ایک سچے مسلمان کی شخصیت کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں اور میرے نزدیک یوم حساب کا خوف ہی بخشش کا ذریعہ ہے۔ اس حوالے سے قائداعظم کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1939ء میں کی گئی تقریر کے چند فقرے نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں، انھیں پڑھیے اور غور کیجیے۔ ان الفاظ کے باطن میں جھانکیے تو آپ کو اصل جناح کا سراغ ملے گا، وہ جناح جو بظاہر انگریزی بولتا، مغربی لباس پہنتا اور مغربی طور طریقوں پر عمل کرتا تھا لیکن وہ باطنی طور پر اس کے برعکس تھا۔

- ''مسلمانو! میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے ہیں۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا

اپنا دل، میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح! تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح! تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علم اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔" ("انقلاب" لاہور، 22 اکتوبر 1939ء صفحہ آخر کالم 1)

یوم حساب اللہ کے حضور سرخروئی کا خیال، مسلمانوں اور اسلام کی سر بلندی کا علم بلند کیے ہوئے مرنے کی آرزو اور رضائے الٰہی کی تمنا صرف اور صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو سرتا پا سچا مسلمان اور پکا مومن ہو، اور جس کا باطن خوف خدا کے نور سے منور ہو۔ غور کیجیے کہ جب قائداعظم نے یہ تقریر کی، اس وقت ان کی عمر تقریباً 53 سال تھی اور ان کی شہرت اوج ثریا پر تھی۔

اس پس منظر میں جب میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک خواب کا احوال پڑھتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خواب سچا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نہ صرف عالم و فاضل شخصیت اور مفسر قرآن تھے بلکہ ایک بلند روحانی مرتبہ بھی رکھتے تھے اور ان کے لاکھوں معتقدین ہندو پاکستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔ "تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی" کے مصنف منشی عبدالرحمٰن نے صفحہ نمبر 111 پر لکھا ہے:

❑ "مولانا اشرف علی تھانوی کے خواہر زادے مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت تھانوی نے مجھے بلایا اور فرمایا: "میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدان حشر معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیا، علما اور صلحا کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور مسٹر محمد علی جناح بھی عرب لباس پہنے ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے؟ مجھے کہا گیا کہ محمد علی جناح آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔"

یقیناً اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا اتنا صلہ تو ضروری ہو گا۔ انھی مولانا اشرف علی تھانوی نے 4 جولائی 1943ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی

کوطلب کیا اور فرمایا:

❑ ’’1940ء کی قرارداد پاکستان کو کامیابی نصیب ہوگی۔ میرا وقت آخری ہے، میں زندہ رہتا تو ضرور کام کرتا۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن قائم ہو۔ قیام پاکستان کے لیے جو کچھ ہو سکے، کرنا اور اپنے مریدوں کو بھی کام کرنے پر اُبھارنا۔ تم دونوں عثمانیوں میں سے ایک میرا جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا عثمانی جناح صاحب کا جنازہ پڑھائے گا۔‘‘ (بحوالہ ’’قائداعظم کا مذہب و عقیدہ‘‘ از منشی عبدالرحمٰن، صفحہ نمبر 249 اور ’’قائداعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو‘‘ از ملک حبیب اللہ، صفحہ نمبر 58، 59)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قیام پاکستان سے کئی برس قبل اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ پاکستان قائم ہوا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے تھانوی صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی اور سوا پانچ سال قبل کی گئی پیشین گوئی کے مطابق قائداعظم کی نماز جنازہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔

قائداعظم سیاست میں مذہب کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے اور شاید وہ سمجھتے تھے کہ مذہب اور سیاست کے ملاپ سے انتہا پسندی کے دروازے کھلیں گے جس سے مسلمانوں اور بعدازاں پاکستانی قوم کا اتحاد بُری طرح متاثر ہو گا۔ 7 فروری 1935ء کو مرکزی قانون ساز اسمبلی میں آزاد رُکن کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

❑ ’’میں حزب مخالف کے قائد سے پوری طرح متفق ہوں کہ مذہب، نسل اور زبان کی سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مذہب انسان اور خدا کا معاملہ ہے لیکن براہ کرم غور کیجیے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ مذہب کا معاملہ نہیں بلکہ میں تو اقلیتوں کی بات کر رہا ہوں جو ایک سیاسی مسئلہ ہے کیونکہ ہمارے ملک میں اقلیتوں کے مسائل ہیں اور ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہے۔‘‘

(قائداعظم کی تقریریں، جلد اوّل، از خورشید احمد خان یوسفی، صفحہ 67 تا 70)

اسی تقریر میں آگے چل کر اقلیت کی تشریح کرتے ہوئے قائداعظم کہتے ہیں:

❑ ''اقلیت کا مذہب، تمدن، کلچر اور بعض اوقات آرٹ، میوزک بھی اکثریت سے مختلف ہوتا ہے اس لیے اقلیت کو تحفظات کی ضرورت ہوتی ہے۔''

واضح رہے کہ اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز میں محمد علی جناح مسلمانوں کے بحیثیت اقلیت تحفظات کے خلاف تھے۔ محمد علی جناح نے اوّلین بار 28 جولائی 1904ء کو کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ کانگریس کے اجلاس منعقدہ 28 دسمبر 1906ء میں ایک مسلمان ممبر نے ایک قرارداد کے ذریعے مسلمانوں کے لیے کوٹے کا مطالبہ کیا جس کی مخالفت کرتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا کہ:

❑ ''مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابر سمجھا جائے اور ان سے ایک جیسا سلوک کیا جائے کیونکہ کانگریس کی بنیاد ہی برابری کے اصول پر رکھی گئی ہے۔''

(ورکس آف قائداعظم، از ڈاکٹر ریاض احمد، جلد اوّل، صفحہ 81)

یہی محمد علی جناح بعدازاں مسلمانوں کے سب سے بڑے راہنما بن کر اُبھرے اور قیام پاکستان تک مسلمانوں کے لیے نہ صرف حقوق اور تحفظات بلکہ جداگانہ حق رائے دہی کے لیے دن رات جدوجہد کرتے رہے۔ کانگریس اور ہندو اکثریت کے ارادے بھانپنے کے بعد قائداعظم نے مسلمانوں کو اقلیت کے چکر سے نکال کر ایک منفرد قوم ثابت کیا اور اسی قومیت کے حوالے سے ایک علیحدہ خطۂ زمین کے حصول کو اپنی منزل بنا لیا۔

دراصل قائداعظم کو زندگی بھر اقلیتوں کے مسئلے سے واسطہ رہا اور اس سے نپٹنے کی کوششیں کرتے رہے۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت تھے اور اس اقلیت کے سب سے بڑے راہنما محمد علی جناح تھے۔ چنانچہ متحدہ ہندوستان کا خواب ٹوٹنے کے بعد (جس کا نقطہ عروج 1940ء کی نہرو رپورٹ کو قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ قائداعظم نے اسے پارٹنگ آف دی ویز یعنی راستوں کی علیحدگی قرار دیا تھا) قائداعظم پہلے پہل مسلمان اقلیت کے حقوق اور بعدازاں مسلمان قوم کے حقوق کے لیے اس وقت تک مسلسل لڑتے رہے، جدوجہد کرتے رہے جب تک قیام پاکستان کے امکانات

واضح نہیں ہوئے۔ مسلمان اقلیت سے مسلمان قوم کے سفر میں 1940ء کی قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان ایک طرح سے ایک اہم ترین سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بعد قائداعظم اور مسلم لیگ کا موقف یہ رہا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ہر تعریف، معیار اور تصور کے مطابق ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قومیت کی اہم ترین بنیاد مذہب تھی۔ اسی طرح جب قیام پاکستان کا مرحلہ قریب آیا تو قائداعظم کے لیے سب سے اہم سوال اور مسئلہ پھر اقلیتوں کا تھا کیونکہ پاکستان میں بھی کئی مذہبی اقلیتیں آباد تھیں اور ادھر ہندوستان میں بھی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہی تھی جس کے تحفظ کے لیے قائداعظم پریشان رہتے تھے۔ (ملاحظہ ہو قائداعظم کی پریس کانفرنس 14 جولائی، بیانات 15 ستمبر اور 17 ستمبر، 25 اکتوبر 1947ء) چنانچہ قیام پاکستان سے چندماہ قبل اور چندماہ بعد تک ان سے بار بار اقلیتوں کے مستقبل کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے رہے جس کی وہ بار بار وضاحت کرتے رہے۔ اس دور میں قائداعظم نے جو تقاریر کیں یا بیانات دیئے، ان کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ اس مسئلے کے تناظر میں کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں قائداعظم کے خیالات سمجھنے کے لیے ان کی اس پریس کانفرنس کا حوالہ دینا ضروری ہے جو انھوں نے پاکستان کا گورنر جنرل نامزد ہونے کے بعد 14 جولائی 1947ء کو نئی دہلی میں کی۔ اقلیتوں کے ضمن میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

- ”میں اب تک بار بار جو کہتا رہا ہوں، اس پر قائم ہوں۔ ہر اقلیت کو تحفظ دیا جائے گا، ان کی مذہبی رسومات میں دخل نہیں دیا جائے گا اور ان کے مذہب، اعتقاد، جان و مال اور کلچر کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ وہ ہر لحاظ سے پاکستان کے برابر کے شہری ہوں گے۔“

اسی پریس کانفرنس میں جب ان سے پوچھا گیا کہ ”کیا پاکستان ایک مذہبی (Theocratic) ریاست ہوگی؟ تو قائداعظم نے کہا کہ:

- ”آپ مجھ سے ایک فضول سوال پوچھ رہے ہیں۔ گویا میں اب تک جو کچھ کہتا

رہا ہوں، وہ رائیگاں گیا ہے۔ آپ جب جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہم نے جمہوریت تیرہ سو سال قبل سیکھ لی تھی۔'' (بحوالہ ''جناح، تقریریں اور بیانات، ص 48، 1947ء'' از ایس ایم برک، مطبوعہ آکسفورڈ پریس، صفحات 12 تا 16)

سوال یہ ہے کہ تیرہ سو برس قبل مسلمانوں نے کون سی جمہوریت سیکھی تھی؟ کیا وہ سیکولر جمہوریت تھی یا نظریاتی اور اسلامی جمہوریت؟

اس بحث کی ایک اہم کڑی قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہے جو انھوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا صدر منتخب ہونے پر اسمبلی میں کی۔ یہی وہ تقریر ہے جس کی توضیح یا تشریح کر کے کچھ حضرات یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ قائداعظم پاکستان کے لیے سیکولر جمہوری نظام چاہتے تھے جبکہ دوسرا مکتبہ فکر اس توضیح سے اس بنیاد پر اختلاف کرتا ہے کہ اوّل تو قائداعظم کی تقریر سے ہرگز یہ مفہوم نہیں نکلتا اور دوم یہ تاثر غیر منطقی ہے کیونکہ قائداعظم جیسے عظیم لیڈر کی ایک تقریر کو ان کی دوسری لاتعداد تقریروں اور بیانات سے جو انھوں نے اس سے قبل یا بعدازاں دیئے، الگ یا علیحدہ کر کے صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ قائداعظم نے 11 اگست کی تقریر میں کیا کہا جو اس قدر بحث و نزاع کا سبب بن گیا؟ دراصل انھوں نے اس تقریر میں ان بنیادی مسائل کی نشاندہی کی جو پاکستان کو اس وقت درپیش تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بابائے قوم (فادر آف نیشن) ہونے کے ناطے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ اس تقریر کا مکمل ادراک حاصل کرنے کے لیے پوری تقریر کو اس کے سیاق و سباق اور پس منظر میں پڑھنا ضروری ہے۔ قائداعظم نے کہا:

- ''ہم آپ کی مدد سے اس اسمبلی کو مثالی بنائیں گے۔ اس اسمبلی نے بیک وقت دستور سازی اور قانون سازی کے فرائض سرانجام دینے ہیں جس کے سبب ہم پر نہایت اہم ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ حکومت کا پہلا فرض امن عامہ قائم کرنا ہے تاکہ

شہریوں کی جائیداد اور مذہبی اعتقادات کی حفاظت کی جا سکے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رشوت اور کرپشن ہے۔اس اسمبلی کو اس زہر کے خاتمے کے لیے مؤثر اقدامات کرنے ہیں۔ایک اور لعنت بلیک مارکیٹنگ یعنی چور بازاری ہے جس کا تدارک آپ کو کرنا ہے۔ اسی طرح ہمیں اقربا پروری اور ظلم وزیادتی کو بھی کچلنا ہے۔ مجھے علم ہے کہ کچھ لوگوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اگر ہم پاکستان کو خوشحال اور عظیم ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ہمہ وقت عوام کی خوشحالی اور بہتری پر توجہ دینا ہوگی۔ اگر آپ ماضی کی تلخیوں کو دفن کر کے رنگ ونسل اور عقیدے کے اختلافات کو پس پشت ڈال کر تعاون اور برابری کی فضا میں کام کریں گے تو آپ کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ اگر ہم اس جذبے کے ساتھ کام کریں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریت اور اقلیت مسلمان اور ہندو کے درمیان پیچیدگیاں ختم ہو جائیں گی کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے،ان میں بھی پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ ہیں۔اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، وشناویس، کھتری، بنگالی اور مدراسی ہیں۔ یہی تقسیم ہندوستان کی آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے،ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔آپ آزاد ہیں، مندر میں پوجا کریں یا مسجد میں عبادت کریں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق ہے، اس سے حکومت کو سروکار نہیں۔کسی زمانے میں انگلستان کے حالات نہایت خراب تھے اور وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا آغاز ان سے بہت بہتر ہے۔آج انگلستان میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان اختلافات ختم ہو چکے ہیں اور وہ اپنے ملک کے یکساں شہری ہیں۔اگر آپ بھی اپنے سامنے یہی آئیڈیل رکھیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق مٹ جائے گا۔ مذہب کے حوالے سے نہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا مذہب ہوتا ہے بلکہ سیاسی حوالے سے کیونکہ سب ہی ایک ریاست کے شہری ہوں گے۔'' (بحوالہ ''جناح، تقریریں اور بیانات، ص 48، 1947ء'' از ایس ایم برک، مطبوعہ آکسفورڈ پریس، صفحات 25، 26)

اس تقریر کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نفس مضمون اور مدعا اقلیتوں کو احساس تحفظ اور بحیثیت شہری برابری کا پیغام دینا ہے اور قوم کو اتحاد کی تلقین کرنا ہے جس میں پاکستان کی ترقی کا راز مضمر ہے کیونکہ ہندوستان میں یہ پروپیگنڈا جاری تھا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست ہو گی جہاں اقلیتوں کو غلام بنا کر رکھا جائے گا۔ اس تقریر میں قائداعظم نے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کا ذکر کیا جو کہ عیسائیت کے دو فرقے ہیں، وہ اسلام اور ہندومت کی مانند دو مختلف مذاہب نہیں۔ اس تقریر سے قبل اور بعدازاں بھی قائداعظم اقلیتوں کو یقین دہانیاں کراتے رہے اور بار بار یہ کہتے رہے کہ Tolerance اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ قائداعظم نے 14 اگست 1947ء کو دستورساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے بھی اپنے اسی نقطہ نظر کو دہرایا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اقلیتوں کے حوالہ سے مغل بادشاہ اکبر کی فراخدلی کا ذکر کیا تھا جس کے جواب میں قائداعظم نے کہا:

❑ ''شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جو خیرسگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا، وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسول کریم ﷺ نے کر دی تھی۔ انھوں نے زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا، ان کے ساتھ رواداری برتی اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے، ایسے ہی رہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے۔''

میرا تاثر یہ ہے کہ 11 اگست کی قائداعظم کی تقریر کا مقصد اقلیتوں کو احساس تحفظ دینا تھا نہ کہ کسی سیکولر نظام کی بنیاد رکھنا۔ میرے اس تاثر کی تصدیق قائداعظم کے ایک انٹرویو سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے 25 اکتوبر 1947ء کو رائٹر کے نمائندے کو دیا۔ اس انٹرویو میں انھوں نے کہا:

❑ ''میں دستورساز اسمبلی کی افتتاحی تقریر (11 اگست) میں یہ واضح کر چکا ہوں

کہ اقلیتوں سے پاکستان کے شہریوں جیسا سلوک کیا جائے گا اور ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسروں کو ہوں گے۔ پاکستان غیر مسلم اقلیتوں میں احساس تحفظ اور اعتماد پیدا کرنے کے لیے سب کچھ کرے گا۔'' (بحوالہ ''جناح، تقریریں اور بیانات، ص 48، 1947ء'' از ایس ایم برک، مطبوعہ آکسفورڈ پریس، صفحہ 61)

مشکل یہ ہے کہ ہمارے دانش ور حضرات 11 اگست والی تقریر کی تشریح و توضیح پر تو بہت زور صرف کرتے ہیں لیکن 25 اکتوبر والی تقریر کا ذکر نہیں کرتے جس میں خود قائداعظم نے 11 اگست کی تقریر کے حوالے سے اپنے مدعا کی وضاحت کی تھی۔ مختصر یہ کہ ہمارے دانشوروں کا ایک طبقہ قائداعظم کی محض ایک تقریر کے چند فقروں کو اپنے سیاق وسباق سے الگ کر کے اپنا من پسند مفہوم نکال لیتا ہے اور پھر یہ اعلان کر دیتا ہے کہ قائداعظم سیکولر نظام کے حامی تھے۔

یہ بات ثابت ہو چکی بلکہ طے ہو چکی کہ قائداعظم نجی زندگی میں مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی مقدور بھر کوششیں کرتے تھے۔ انھوں نے ذاتی زندگی میں جو اہم فیصلے کیے، ان میں اسلام کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ انھوں نے اسلام، قرآن اور سیرت النبی ﷺ کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور جب وہ بار بار اپنی تقریروں میں یہ کہتے تھے کہ قرآن ہماری سوچ کا منبع ہے، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اسوۂ حسنہ ہمارے لیے ایک نمونہ ہے تو یہ باتیں محض زبان کا کارنامہ نہیں تھیں بلکہ ان کے تیقن اور باطن کا حصہ تھیں اور ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں۔ سیاسی زندگی کے حوالے سے چار دہائیوں پر مشتمل ان کی سینکڑوں تقریریں، بیانات اور انٹرویو اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ انھیں اسلام سے گہرا لگاؤ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہرگز مولوی، صوفی یا مذہبی قسم کے انسان نہیں تھے۔ وہ سچائی، راست گوئی، اصول پرستی، اخلاص، یقین محکم، کردار کی عظمت، اسلام اور مسلمانوں سے بے لوث سچی محبت کی اعلیٰ مثال تھے۔ خاص طور پر قیام پاکستان کے بعد کی تقریروں میں ان کے اقوال و افکار پر مذہب کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور انھی تقریروں کا غور سے مطالعہ کر کے قائداعظم کا تصور پاکستان سمجھا جا

سکتا ہے کہ وہ پاکستان کے لیے کس قسم کا سماجی و سیاسی نظام، دستور اور حکومتی ڈھانچہ چاہتے تھے لیکن زندگی نے انھیں مہلت نہ دی اور وہ اپنے اس خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ یوں تو قائداعظم کی تقاریر میں اس قسم کے بہت سے حوالے ملتے ہیں لیکن میں اس بحث کو سمیٹنے کے لیے فقط چند ایک مطبوعہ بیانات کا ذکر کروں گا جس سے اندازہ ہو گا کہ قائداعظم کے خیالات میں ایک تسلسل تھا اور وہ مسلسل کیا کہتے رہے۔ یہی بیانات اس امر کی شہادت دیں گے کہ کیا قائداعظم سوچ کے حوالے سے سیکولر تھے؟ کیا وہ پاکستان کے لیے ایک سیکولر جمہوری نظام چاہتے تھے؟ نومبر 1945ء میں قائداعظم نے پشاور میں کہا:

❑ ''آپ نے سپاس نامے میں مجھ سے پوچھا ہے کہ ''پاکستان میں کون سا قانون ہو گا؟'' مجھے آپ کے سوال پر سخت افسوس ہے۔ مسلمانوں کا ایک خدا، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب ہے، یہی مسلمانوں کا قانون ہے اور بس...... اسلام پاکستان کے قانون کی بنیاد ہو گا اور پاکستان میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہو گا۔''

(بحوالہ ''جناح، تقریریں اور بیانات، ص 48، 1947ء'' از ایس ایم برک، مطبوعہ آکسفورڈ پریس، صفحہ 123)

14 فروری 1947ء کو شاہی دربار سبی بلوچستان میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

❑ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔''

20 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''اگر ہم قرآن حکیم سے راہنمائی حاصل کریں تو بالآخر فتح ہماری ہو گی...... میرا آپ تمام لوگوں سے یہی مطالبہ ہے کہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔'' (بحوالہ رفیق افضل، قائداعظم کی تقاریر، صفحہ 447، 448)

25 جنوری 1947ء کو عید میلاد النبیؐ کے موقع پر کراچی بار ایسوسی ایشن کے استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے وکلا کے سامنے ان حضرات کو بے نقاب کیا جو اُن کے حوالے سے غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے۔ اس وقت قائداعظم پاکستان کے

گورنر جنرل بھی تھے، اس لیے ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ''پالیسی بیان'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ قائداعظم کے الفاظ پر غور کیجیے اور ان الفاظ کے آئینے میں ان چہروں کو تلاش کیجیے جنھیں قائداعظم نے شرارتی اور منافق کہا۔ قائداعظم نے کہا:

❑ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیرمسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔''

(بحوالہ رفیق افضل، صفحہ 455)

پھر فروری 1948ء میں قائداعظم نے امریکی عوام کے نام ایک ریڈیو پیغام میں واضح الفاظ کہہ کر نہ صرف ہر قسم کے شکوک وشبہات کی دھند صاف کر دی بلکہ اس بحث کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمیٹ دیا۔ قائداعظم نے فرمایا:

❑ ''پاکستان کی دستورساز اسمبلی نے ابھی دستور بنانا ہے، مجھے علم نہیں کہ اس کی حتمی شکل وصورت کیا ہو گی؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا آئین جمہوری قسم کا ہو گا جسے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح لاگو ہوتے ہیں جس طرح تیرہ سو برس قبل ہوتے تھے۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے اور مساوات اور انصاف کا سبق دیا ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے امین اور وارث ہیں اور دستورسازی میں انھی سے راہنمائی حاصل کی جائے گی۔''

بہرحال پاکستان ایک تھوکریٹ (مذہبی) ریاست نہیں ہوگی اور یہاں تمام اقلیتوں ہندو، عیسائی، پارسی کو بحیثیت شہری وہی حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہوں گے۔'' (ایس ایم برک، صفحہ 125)

قائداعظم کی تقریروں کو پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ درمیانی فاصلوں کے باوجود ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں جن میں کہیں بھی جھول یا انحراف موجود نہیں۔ وہ شروع سے آخر تک تسلسل سے یہ کہتے رہے ہیں کہ قرآن ہماری سوچ وفکر کا منبع اور راہنما ہے۔ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ سیرت النبیؐ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ جمہوریت، مساوات اور انصاف ہم نے اسلام سے سیکھا ہے اور اسلام نے جمہوریت کی بنیاد تیرہ سو سال قبل رکھ دی تھی، اس لیے ہمارے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور یہ کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں سے جس فراخدلی کا مظاہرہ کیا تھا، ہم اس پر عمل کریں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی جائے گی، وہ سازشی اور منافق ہیں۔ اور آخر میں یہ کہہ کر تمام شکوک وشبہات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی کہ پاکستان کا آئین جمہوری ہوگا اور اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ کیا قائداعظم ذہنی طور پر سیکولر تھے اور کیا وہ پاکستان کے لیے کسی سیکولر نظام کا خواب دیکھتے تھے؟

احمد سعید

سیکولر جناح

قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے دُنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت قائم کر کے جو کرشمہ کر دکھایا، ان کے مخالفین ابھی تک اس صدمے سے نڈھال ہیں۔ کبھی وہ ابوالکلام آزاد کے اس قول کا سہارا لیتے ہیں کہ: ''پاکستان صرف چند برسوں کے لیے معرضِ وجود میں آیا ہے''، کبھی پاکستان کی بنیادوں پر کلہاڑی چلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والا ملک زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا''۔ معاندین قائداعظم کی ذاتی زندگی پر بے بنیاد الزامات عائد کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان پر ہندستان کی 'وحدت پر کلہاڑی چلانے' کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب کچھ عرصے سے انھیں 'سیکولر' ثابت کرنے کی ناکام سعی میں مصروف ہیں۔

اگر آپ کوئی بھی لغت اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو 'سیکولر' کے پانچ معنی نظر آئیں گے:

1- عمر میں ایک دفعہ آنے والا۔

2- صدیوں رہنے والا دوامی جیسے 'چرچ' اور 'سٹیٹ' کے درمیان مخاصمت۔

3- دنیوی و دنیاوی، غیر مذہبی اور غیر دینی۔

4- متشکک، دینی صداقت میں شک کرنے والا یا دینی تعلیم کا مخالف۔

5- دنیا دار پادری، متاہلِ پادری، گرہست پادری۔

ان معنوں میں سے پہلے دو کا اطلاق تو کسی بھی صورت قائداعظم پر نہیں ہوسکتا۔ یورپ میں چرچ اور سٹیٹ میں مغائرت کا جو تصور ہے، وہ اسلام پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اسلام میں چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔

یورپ میں اس تصور کی ضرورت یوں پیش آئی کہ چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کُل زندگی کا صرف 35 سالہ دور محفوظ ہے، اس لیے ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بطور نمونہ پیش کر سکیں، جب کہ احادیث کے ذریعے حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ایک ایسا بھرپور نقشہ سامنے آتا ہے، جس میں تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت کا پیغام موجود ہے۔ صبح سے شام تک زندگی گزارنے کا عمل، پیدائش سے موت تک کے سفر کے لیے ہدایات، ناخن کاٹنے، بیت الخلا جانے، غسل کرنے، کاروبار کرنے، اولاد کی پرورش، جنگ کرنے، صلح کرنے، معاہدہ کرنے، حکومت کرنے، گھر چلانے، غرض زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کے بارے میں کوئی ہدایت نہ ملتی ہو اور جس پر آپ ﷺ کی راہنمائی نظر نہ آتی ہو، لہٰذا اسلام میں چرچ اور سٹیٹ ایک ہی ہیں اور ان میں مخاصمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے معاندین اور دوست نما دشمن مختلف ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ ایک دور میں یہ کہا جاتا رہا کہ ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، نہ تو انھیں نماز آتی ہے اور نہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ الزام لگانے والوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک نام نہاد 'ستون' سر سکندر حیات بھی شامل تھے۔ ملک برکت علی نے 21 جولائی 1941ء کو قائداعظم کو لکھا تھا کہ سر سکندر حیات نے لائل پور [فیصل آباد] میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: میں گناہ گار ہو سکتا ہوں، لیکن باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں، جب کہ آپ کے قائداعظم دن میں ایک بھی نماز نہیں پڑھتے۔

(رضوان احمد، Quaid-e-Azam Papers 1941، کراچی، 1976ء، ص 64)

قائداعظم کی زندگی کے اس پہلو پر کوئی خاص کام نہیں ہوا، اس لیے اخبارات میں شائع شدہ خبروں سے اس بے بنیاد الزام کا جائزہ لیتے ہیں:

قائداعظم نے 1935ء میں عید الفطر کی نماز بمبئی کی کرکٹ گراؤنڈ میں ادا کی تھی۔ اس موقعے پر ہندستان میں افغانستان کے سفیر مارشل شاہ ولی بھی موجود تھے۔

(رحیم بخش شاہین، نقوشِ قائداعظم، لاہور، 1976، ص 76)

یکم مئی 1936ء کو قائداعظم نے بادشاہی مسجد لاہور میں نمازِ جمعہ ادا کی۔ ہنگری کے مفتیِ اعظم علامہ آفندی نے بھی ان کی ہمراہی میں نماز ادا کی۔ (گفتارِ قائداعظم، (مرتبہ: احمد سعید) 1976ء، ص 151 بحوالہ انقلاب، 3 مئی 1936ء)

3 نومبر 1940ء کو آزاد میدان پارک بمبئی میں نمازِ عید کے بعد مسلمانوں سے خطاب کیا تھا۔ (ایضاً، ص 251)

3 مارچ 1941ء کو آسٹریلیشا مسجد، لاہور میں نمازِ عصر ادا کی تھی۔ اس موقعے پر آپ نے چوڑی دار پاجامہ اور اچکن زیبِ تن کر رکھی تھی۔ چوں کہ مسجد میں تاخیر سے پہنچے تھے، اس لیے صفیں پھلانگ کر آگے جانے کے بجائے پچھلی صف میں آ بیٹھے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد اپنے جوتے خود اُٹھائے تھے۔

29 دسمبر 1941ء کو آپ نے عیدالاضحیٰ ناگ پور میں ادا کی تھی۔ اس موقعے پر خطبے اور دُعا کے بعد لوگ آپ سے مصافحہ کے لیے بے چین تھے۔ آپ مائیک پر تشریف لائے اور سب کو عید مبارک کہہ کر نہایت شگفتہ انداز میں کہا کہ: ''اگر آپ سب لوگ میرے ساتھ ہاتھ ملائیں گے تو میرا ہاتھ یہیں رہ جائے گا''۔

(نواب صدیق علی خان، بے تیغ سپاہی، کراچی، 1971ء، ص 428)

آل انڈیا مسلم لیگ کے کراچی اجلاس (1943ء) کے موقعے پر قائداعظم نے نمازِ جمعہ سندھ مدرستہ الاسلام کی مسجد میں ادا کی تھی۔

(صادق قصوری، تحریک پاکستان اور مشائخِ عظام، لاہور، ص 22، 23)

30 نومبر 1944ء کو نئی دہلی میں نمازِ عید ادا کی اور اس موقعے پر مسلمانوں سے خطاب بھی کیا۔ اسی طرح 5 نومبر 1945ء کو نماز عیدالاضحیٰ کے بعد مسلمانانِ بمبئی سے خطاب کیا تھا۔ دسمبر 1946ء میں قائداعظم لندن تشریف لے گئے تھے۔ اس موقعے پر ممتاز حسن بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ممتاز حسن نے اس سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: لندن میں قائداعظم نے اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جانا پسند کیا جہاں عام مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ چنانچہ آپ نے ایسٹ اینڈ کی مسجد میں، جو غریب

مسلمانوں کی آباد کی ہوئی تھی، نماز ادا کی۔ قائداعظم کی آمد پر خطبہ ہو رہا تھا تو کچھ لوگ کھڑے ہوگئے۔ اس پر آپ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ: 'میں دیر سے آیا ہوں، اس لیے مجھے جہاں جگہ ملی ہے، وہی میرے لیے مناسب ہے'۔

(سہ ماہی صحیفہ، 'قائداعظم نمبر' لاہور، 1976ء، ص 64)

یہاں حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا، جس میں آپ ﷺ نے لوگوں کے سروں کو پھلانگتے ہوئے آگے صف میں جانے سے منع فرمایا تھا۔ زیڈ اے سلہری بھی اس موقعے پر قائداعظم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی روایت ہے کہ قائداعظم آخری صف میں بیٹھے بڑے روایتی انداز میں خطبہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ میں نماز میں ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ایک شخص نے نماز کے بعد ان کے جوتوں کے تسمے باندھنے چاہے مگر آپ نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔

12 جولائی 1946ء کو قائداعظم نے حیدرآباد دکن کی مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی تھی۔

اسلامیہ کالج لاہور میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلسے میں جب قائداعظم نے دن بارہ بجے اذان سنی تو کہا کہ یہ تو نماز کا کوئی وقت نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص نماز نہیں پڑھتا، اس کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ کون سی نماز کس وقت پڑھی جاتی ہے؟

(بیدار ملک، یارانِ مکتب، جلد دوم، پاکستان سٹڈی سنٹر، لاہور، 1992ء، ص 42، 43)

سیکولر کا تیسرا معنی، یعنی دنیوی، دنیاوی، غیر مذہبی اور غیر دینی۔ آیئے اس کو قائداعظم پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر قائداعظم کی ابتدائی زندگی پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاندین کے دعویٰ کے برعکس ایک مذہبی اور دینی ذہن رکھنے والے انسان تھے۔

بمبئی پریذیڈنسی سے شائع ہونے والے ایک اخبار بمبے گزٹ نے اپنی 13 اگست 1897ء کی اشاعت میں شہر کی مشہور و معروف سماجی تنظیم انجمن اسلام کے زیرِ اہتمام 12 اگست 1897ء بروز جمعرات منعقدہ ایک محفل میلاد کی تفصیل دی ہے۔ انجمن اسلام کی عمارت میں محمد جعفری کی تحریک اور نواب محسن الملک کی زیرِ صدارت یہ

جلسہ حضور اکرم ﷺ کا یومِ ولادت منانے کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا اور اس میں ہر طبقے کے مسلمان مغل، عرب، میمن اور بوہرے شریک ہوئے تھے۔ نواب محسن الملک نے اپنی صدارتی تقریر میں اسلام نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کیے، ان کا ذکر کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنی زندگیاں احکامِ اسلام کے مطابق پرہیزگاری، تقویٰ و طہارت اور راست بازی سے بسر کریں۔ صدارتی تقریر سے قبل سامعین نے بھرپور توجہ اور دھیان سے مولود شریف سنا۔ اس مولود شریف میں 21 سالہ 'سیکولر' جناح بھی موجود تھے۔ (ریاض احمد (مرتب): The works of Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah،، جلد 1، اسلام آباد، 1996ء، ص 4)

تقریباً چار سال بعد انجمنِ اسلام نے 30 جون 1901ء بروز اتوار کو اپنے سکول کے ہال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ ولادت منایا جس میں چار سو کے قریب مسلمانوں نے شرکت کی تھی۔ مرزا علی محمد خان نے اپنی صدارتی تقریر میں حضور اکرم ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کا بھرپور احاطہ کیا اور آپ ﷺ کے کردار کی سادگی، عالی حوصلگی، عالی ظرفی، شرافت و نجابت کا ذکر کیا۔ اس تقریب میں بھی 'سیکولر' جناح موجود تھا۔ (ایضاً، ص 67، 68)

32 سال بعد 7 دسمبر 1933ء بروز بدھ لندن کے میٹروپول ہوٹل میں مسلم سوسائٹی برطانیہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے سر اکبر حیدری کی زیرِ صدارت ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب میں علامہ اقبال، عباس علی بیگ، لارڈ ہیڈلے (نومسلم)، ڈاکٹر شفاعت احمد خان، اے ایچ غزنوی اور سردار اقبال علی شاہ کے علاوہ ایران، البانیہ، مصر اور سعودی عرب کے وزرا بھی شامل تھے۔ شرکا میں محمد علی جناح کا نام نمایاں تھا۔ (جمیل الدین احمد، Quaid-e-Azam as seen by his Contemporaries، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، دسمبر 1966ء)

تقریباً 14 سال بعد 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن نے عیدمیلادالنبی ﷺ کی تقریب کا اہتمام کیا۔ قائداعظم نے اس تقریب کی صدارت کی

تھی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا:

- ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک طبقہ دانستہ طور پر یہ پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کے دستور کی اساس شریعت پر استوار نہیں کی جائے گی۔ آج بھی اسلامی اصولوں کا اطلاق زندگی پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح آج سے 13 سو سال پہلے ہوتا تھا۔ جو لوگ گمراہ ہوگئے ہیں یا کچھ لوگ جو اس پروپیگنڈے سے متاثر ہیں، میں انھیں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام اور اس کے اعلیٰ نصب العین نے ہمیں جمہوریت کا سبق سکھایا ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو مساوات، عدل اور انصاف کا درس دیا ہے''۔

حضور نبی کریم ﷺ کو شان دار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے آپ نے کہا:

- ''آج ہم اس عظیم ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جن کے لیے نہ صرف لاکھوں دل احترام سے لبریز ہیں بلکہ جو دنیا کے عظیم ترین لوگوں کی نظر میں بھی محترم ہیں۔ میں ایک حقیر آدمی اس عظیم المرتبت شخصیت کو کیا خراجِ عقیدت پیش کرسکتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ ایک عظیم رہبر تھے۔ آپ ﷺ ایک عظیم قانون عطا کرنے والے تھے، آپ ﷺ ایک عظم مدبر تھے، آپ ﷺ ایک عظیم فرماں روا تھے۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بلاشبہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس بات کو بالکل نہیں سراہتے۔ اسلام نہ صرف رسوم و رواج، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ ہے، بلکہ اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطہ بھی ہے جو اس کی زندگی کے رویے، بلکہ اس کی سیاست و اقتصادیات وغیرہ پر محیط ہے''۔ (وحید احمد (مرتب) **The Nations's Voice**، جلد ہفتم، قائداعظم اکادمی، کراچی، **2003**ء، ص**153**)

گویا ایک شخص **21** سال کی عمر سے لے کر **72** سال کی عمر تک مذہبی مجالس میں شرکت کرتا رہا، عام مسلمانوں کے ساتھ نمازیں ادا کرتا رہا اور مختلف خطابات میں حضور نبی کریم ﷺ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا رہا، لیکن اس کے باوجود اس پر سیکولر ہونے کا الزام ہے۔

یہ بات بھی کیسی عجیب لگتی ہے کہ 1912ء میں اسی سیکولر جناح نے بحیثیتِ رکن امپیریل قانون ساز کونسل میں اسلامی قانون وقف علی الاولاد کا مسودہ پیش کیا اور اسے قانونی حیثیت دلوائی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہندستان کی آئینی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کونسل نے ایک پرائیویٹ ممبر (Private Member) کے بل کو قانونی شکل دی تھی۔

(احمد سعید قائداعظم مسلم پریس کی نظر میں، قائداعظم اکادمی، کراچی، 1981ء ص 197)

قائداعظم کو 'سیکولر' بنانے کے لیے ان کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قائداعظم نے شاید اپنی تمام سیاسی زندگی میں صرف 11 اگست کو ہی تقریر کی تھی، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ آیئے اس تقریر کا جائزہ لیتے ہیں:

سب سے پہلے تو یہ وضاحت کر دی جائے کہ قائداعظم کی تقاریر کے مندرجہ ذیل مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں: ☆ محمد عمر کی مرتبہ: Rare Speeches، 1910ء تا 1918ء (مطبوعہ صفحات: 251)، ☆ جمیل الدین احمد مرحوم کی مرتبہ: Speeches and Writings of Mr. Jinnah (شیخ محمد اشرف، لاہور، 2 جلدیں)، ☆ ڈاکٹر وحید احمد کی مرتب کردہ: The Nation's Voice (چھے جلدیں)، ☆ ڈاکٹر ایم رفیق افضل کی مرتبہ: Speeches in the Legislative Assembly (مطبوعہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، صفحات: 388)، ☆ ڈاکٹر ایم رفیق افضل ہی کی Selected Speeches and Statements of the Quaid-e-Azam، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، مئی 1973ء، صفحات: 475، ☆ قائداعظم کی تقاریر بحیثیت گورنر جنرل 1947ء تا 1948ء، ☆ گفتارِ قائداعظم، 1911ء تا 1947ء، مرتبہ احمد سعید۔

تقاریر کے یہ مجموعے ثابت کرتے ہیں کہ قائداعظم نے 11 اگست 1947ء کی تقریر کے علاوہ بھی تقاریر کی تھیں۔ قائداعظم کی پبلک زندگی کی آخری تقریب سٹیٹ

بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب تھی جس میں آپ نے معاشی ماہرین پر زور دیا تھا کہ چوں کہ سرمایہ داری نظام اور سوشلسٹ نظام انسانی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہے ہیں، اس لیے وہ دنیا کے سامنے اسلامی نظام کی خصوصیات لے کر آئیں۔

11 اگست کی تقریر کے بارے میں بے شمار غلط فہمیاں پیدا ہوچکی ہیں جن کا دُور کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ 2005ء میں اے آر وائی ٹیلی ویژن پر ایک مؤرخ نما دانش ور نے ایک مضحکہ خیز دعویٰ یہ کیا ہے کہ 'حکومت نے قائداعظم کی اس تقریر پر پابندی لگا دی تھی'۔ اور یہی غیر منطقی بات ضمیر نیازی نے بھی لکھی۔

سوال یہ ہے کہ آیا یہ پابندی حکومتِ پاکستان نے عائد کی تھی یا جواہر لال نہرو کی حکومتِ ہند نے یا پھر برطانوی حکومت نے؟ 11 اگست کو حکومتِ پاکستان تو ابھی معرضِ وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ ابھی تک حکومت انگریز کی تھی۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پاکستان بننے سے تین دن پہلے ہی مسلم لیگ کاروبارِ حکومت و ریاست پر کنٹرول حاصل کر لے؟ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر وہ کس طرح یہ پابندی عائد کرسکتی تھی۔ دوسرا یہ کہ پنڈت نہرو کی حکومت کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ قائداعظم کے نظریات میں تبدیلی کے معاملے کو اُچھالتی لیکن مسئلہ یہاں بھی یہی ہے کہ پنڈت جی نے 14 اگست کو اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا تھا۔ رہی برطانوی حکومت تو اس کا بھی مفاد اسی میں تھا کہ وہ اس تقریر پر پابندی لگانے کے بجائے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی، مگر اس کے بھی کوئی مظاہر سامنے نہیں آتے۔

قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو اس کے سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے اس کے اصل مفہوم کو سمجھنا ایک لاحاصل امر ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قائداعظم نے اپنی اس تقریر میں اقلیتوں کے حوالے سے جو کچھ کہا، وہ کوئی اَنہونی یا نئی بات نہیں تھی۔ قائداعظم کی تقاریر میں آپ کو جابجا اقلیتوں کے حوالے سے یہی کچھ نظر آتا ہے، مثلاً 10 نومبر 1946ء کو بنگال کے فرقہ وارانہ فسادات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے آپ نے ہندو اور مسلمانوں دونوں سے اس قتل و غارت کو بند کرنے کی

اپیل کی۔ (احمد سعید (مرتب) گفتارِ قائداعظم، اسلام آباد، 1976ء، ص 303)

26 مارچ 1946ء کو قائداعظم نے گوہاٹی میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ کیا جائے گا اور انھیں تمام جائز مراعات حاصل ہوں گی۔ اس کے متعلق کسی قسم کے خوف یا بدگمانی کی ضرورت نہیں۔ وہ پاکستان کے ایسے ہی آزاد شہری ہوں گے جیسے کسی اور مہذب ملک کے ہوسکتے ہیں"۔ (بحوالہ پیسہ اخبار، 10 مارچ 1946ء، گفتارِ قائداعظم، ص 294)

یکم جولائی 1947ء کو پاکستان اچھوت فیڈریشن کے صدر اور لاہور میونسپل کارپوریشن کے ڈپٹی میئر سکھ لال نے قائداعظم سے دہلی میں ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد ایک بیان میں انھوں نے اس ملاقات کو تسلی بخش قرار دیتے ہوئے کہا:

- "قائداعظم نے مہربانی سے پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں تمام شکوک وشبہات کو دور کردیا ہے اور مسٹر جناح نے یہاں تک کہا ہے کہ ہم رنگ ونسل اور ذات پات کی تمیز کے بغیر بھائیوں کی طرح رہیں گے"۔ (وحید احمد (مرتب)، The Nation's Voice، جلد ششم، قائداعظم اکادمی، کراچی، 2002ء، ص 25)

13 جولائی 1947ء کو قائداعظم نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں اقلیتوں کو یقین دلایا:

- "ان کے مذہب، ثقافت، جان اور جائیداد کی حفاظت کی جائے گی اور وہ پاکستان کے مکمل شہری ہوں گے اور اس سلسلے میں کسی سے کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ (بحوالہ پیسہ اخبار، 24 جولائی 1947ء، گفتارِ قائداعظم، ص 313)

13 جولائی 1947ء کو قائداعظم کی پریس کانفرنس کے بعد آئین ساز اسمبلی کی 11 اگست کی تقریر ایک تسلسل ہے اور اس پس منظر میں کی گئی ہے کہ نہ صرف مشرقی پنجاب بلکہ دہلی، یوپی اور ہندستان کے دیگر صوبوں میں مسلم کش فسادات اپنے عروج پر تھے جس کا ردعمل مغربی پنجاب میں بھی ظاہر ہوا۔ اب ایک طرف تو انسانی جانیں ضائع ہورہی ہیں اور دوسری جانب ہندو اور سکھ صنعت کار اپنا سرمایہ

سمیٹ کر ہندستان منتقل ہو رہے ہیں اور یوں پاکستان کو دہری ضرب لگ رہی ہے۔
اس آگ و خون کے پس منظر میں قائد اقلیتوں کو یقین دلا رہے ہیں نہ کہ وہ اپنے 'سیکولر' ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ہم اس دور کے چند اخبارات کے تراشے پیش کرتے ہیں:

آل انڈیا مسلم لیگ کا ترجمان ڈان ابھی دہلی سے شائع ہو رہا تھا۔ قائد کی یہ تقریر 12 اگست کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ ڈان نے اس تقریر کی جو سرخیاں جمائیں وہ ملاحظہ فرمائیے:

Jinnah Assures Minorities of Full Citizenship and asks for Co-operation

ایک سابق کانگریسی اور اشتراکی خیالات کے طرف دار لیڈر میاں افتخار الدین کے اخبار پاکستان ٹائمز نے اپنی 13 اگست کی اشاعت میں قائداعظم کی مذکورہ تقریر کا مکمل متن جس پر درج ذیل سرخیاں لگائی گئی تھیں، شائع کیا۔ اگر یہ تقریر قائد کے پرانے خیالات سے براءت اور سیکولرازم کی قبولیت کا اظہار ہوتی تو کم از کم میاں افتخار الدین کا اخبار اس طرف تھوڑا بہت اشارہ ضرور کرتا۔ اخبار پاکستان ٹائمز کی سرخیاں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ یہ تقریر اقلیتوں کو یقین دہانیوں کا چارٹر ہے نہ کہ اپنے سیکولر ہونے کا اعلان۔ تین سرخیاں ملاحظہ ہوں:

- **Jinnah calls to concentrate on Mass welfare.**
- **Hope for End of Hindu Muslim distinction in Politics.**
- **Equal rights for all citizens in Pakistan State.**

قائداعظم کے متعلق برطانوی سیاست دانوں اور اخبارات کا معاندانہ رویہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لارڈ لنلتھگو (**Linlithgow**) کی سوانح، پنڈرل مون کی مرتب کردہ لارڈ ویول کی ڈائری اور ماؤنٹ بیٹن کی سوانح اور انٹرویو کا ایک ایک لفظ قائد کے خلاف زہر اُگلتا نظر آتا ہے۔ برطانوی پریس کے معاندانہ رویے کے جائزے

کے لیے ڈاکٹر کے کے عزیز کی کتاب Britain India and Pakistan کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اب اگر قائداعظم اپنی اس تقریر کو سیکولرازم کی قبولیت کا ذریعہ بنا رہے ہیں تو کم ازکم لندن کے اخبار ٹائمز کے پاس سنہری موقع تھا کہ وہ قائداعظم کے کردار کی منافقت کو ظاہر کرتا۔ ٹائمز کے 13 اگست کے شمارے میں ص 6 پر یہ تقریر اس سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی: A Call for Tolerance۔ یاد رہے کہ اخبار نے یہ تقریر کراچی میں اپنے خاص نمائندے کے حوالے سے شائع کی تھی۔

1949ء میں ایس اے آر بلگرامی نے کراچی سے ایک کتاب Pakistan Year book شائع کی تھی، جس میں قائداعظم کی مذکورہ بالا تقریر ص 8 تا 15 پر موجود ہے۔ اس تقریر پر یہ سرخی جمائی گئی ہے:

Jinnah's Charter of Minorities Announced

اقلیتوں ہی کے حوالے سے ایک اور نہایت اہم واقعہ اس تقریر کے ٹھیک تین دن بعد پیش آتا ہے، جو ہمارے اس دعوے کو مزید تقویت بخشتا ہے کہ قائد ہرگز ہرگز اپنے گزشتہ عقائد و نظریات سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ 14 اگست 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے انتقالِ اقتدار کے وقت اپنی تقریر میں یہ اُمید ظاہر کی کہ: 'پاکستان میں اقلیتوں کے سلسلے میں اکبر بادشاہ کی تقلید کی جائے گی'۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے کہا:

- ''شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جو خیر سگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا، وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسول کریم ﷺ نے کر دی تھی۔ انھوں نے زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا، ان کے ساتھ رواداری برتی اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے، ایسے ہی رہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیے۔''

(وحید احمد (مرتب)، The Nation's Voice، جلد ششم، ص 377)

قائداعظم کے سیکولر ہونے والے معاملے کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اگر وہ سیکولر تھے تو ان کی قائم ہونے والی ریاست بھی سیکولر ہونی چاہیے۔ اس بارے میں خود قائداعظم کا کیا موقف تھا؟ سنیے: 13 جولائی 1947ء کو دہلی میں آخری پریس کانفرنس کے دوران آپ نے کہا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے مذہب، عقیدہ، زندگیوں، جائیدادوں اور ثقافت کی مکمل حفاظت کی جائے گی اور وہ تمام معاملات میں پاکستان کے مکمل شہری تصور ہوں گے۔

پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمایندے نے سوال کیا کہ: 'کیا پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگی یا مذہبی (Theocratic)؟' قائداعظم نے اس پر کہا کہ: 'آپ جو سوال پوچھ رہے ہیں، وہ بے معنی اور فضول (absurd) ہے۔ مَیں نہیں جانتا کہ تھیوکریٹک سٹیٹ کا کیا معنی ہے۔ ایک اخباری نمائندے نے کہا کہ: 'تھیوکریٹک سٹیٹ کا مطلب ہے کہ وہ ریاست جہاں مسلمانوں کو تو مکمل شہریت حاصل ہو، جب کہ غیر مسلموں کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو'۔ قائداعظم نے کہا کہ: 'اس کا مطلب ہے کہ اس سے پہلے میں نے جو کچھ کہا، وہ بطخ کی پشت پر پانی ڈالنے کے مترادف ہوا۔ خدا کے لیے اپنے ذہنوں سے اس بکواس (nonsense) کو نکال دو'۔ ایک اور نمائندے نے گرہ لگائی کہ: 'شاید سوال پوچھنے والے کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی ریاست، جسے مولانا حضرات چلائیں گے'۔ اس پر جب قائداعظم نے کہا کہ: 'ہندستان میں پنڈتوں کی حکومت کے متعلق کیا خیال ہے؟' تو سب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

(وحید احمد (مرتب)، The Nation's Voice، جلد ششم، ص 283)

ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر

قائداعظم سیکولر نہیں تھے

قائداعظم محمد علی جناحؒ عالم اسلام کی وہ نابغۂ روزگار اور عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں جدوجہد کرتے ہوئے دنیا کے نقشے پر اسلامی نظریاتی مملکت ''پاکستان'' قائم کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ مگر یہ بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہمارے بعض دانشوروں نے اپنی تحریروں میں قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر اور لادین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو یقیناً قائداعظم جیسی عظیم شخصیت کے ساتھ صریح ظلم و زیادتی ہے۔

ممتاز مؤرخ رئیس احمد جعفری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

- ''قائداعظم کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ ہوتی چلی آ رہی ہے کہ ان پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کو مومنانہ صفات، مذہبی جذبات، دینی تاثرات اور اعلیٰ رجحانات کے آئینے میں پیش نہیں کیا۔ گویا کہ دین و مذہب سے آپ کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو، حالانکہ آپ کا ہر ارشاد، ہر بیان اور ہر تقریر اسلام کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی۔ گو آپ ہر لمحہ ''اسلام اسلام'' کی رَٹ نہیں لگاتے تھے لیکن آپ کی ہر تقریر اور ہر بیان کا دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے تو وہ اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر پورا اُترے گا۔''

سر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا علامہ اقبال کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں شامل تھے، قائداعظم کے حوالے سے ایک واقعہ کو انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیتے ہوئے لکھا:

- ''جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 1926ء میں بمقام دہلی ہوا تو میں اور

جناب محمد علی جناح دو تین دن تک ایک کیمپ میں فروکش تھے۔ مجھے انھوں نے ازراہِ کرم اس اجلاس کی صدارت کے لیے تار دے کر بلایا اور میں حاضر ہو گیا۔ حسن اتفاق سے ان دنوں مجھے قائداعظم کی طبیعت کا ایک ایسا رنگ دیکھنے کا موقع ملا جس کا مجھے اس سے پہلے احساس نہ تھا۔ میں ان کی اعلیٰ قانون دانی اور فصاحت و بلاغت سے واقف اور ان کی بے مثال قیادت کا مداح تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس انگریزی لباس کے اندر جو اس زمانے میں ان کے زیب بدن تھا، ایک انتہا درجے کا مومن پوشیدہ ہے جو ملت اسلامیہ کے درد سے معمور ہے۔''

جمیل الدین احمد جو معرکتہ الآرا کتاب "Speeches & Writing of Mr. Jinnah" کے مؤلف ہیں، اپنی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

- ''بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ ہے کہ مسٹر جناح کا دین کی روح سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنے گرد مذہبی تقدس کا ہالہ نہیں بنایا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ عوام کے مذہبی جذبات اور تعصّبات کا استحصال نہیں کرتے تھے۔ وہ مذہبی رسومات کی نمائش نہ کرتے تھے اور نہ ہی مذہبی اور منطقی موشگافیوں کا تانا بانا بنتے تھے لیکن وہ دین کی روح سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ پوری طرح سرشار تھے۔''

تاریخ پاکستان کے ممتاز محقق ڈاکٹر حفیظ الرحمان صدیقی اپنی کتاب ''تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

- ''قائداعظم کی ایک نہیں متعدد تقریریں ہیں جن میں انھوں نے اسلام کے اجزائے ترکیبی یعنی قرآن و سنت، کلمہ توحید، اسلامی ضابطہ اخلاق، مسلم تہذیب، مسلم روایات، اسلامی تصورات، اُمت واحدہ اور مسلم اتحاد کو پاکستان کی اساسی اقدار قرار دیا ہے۔''

ممتاز ادیب ملک حبیب اللہ نے اپنی کتاب ''قائداعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو'' کے صفحہ **132** پر قائداعظم کی ایک تقریر کا اقتباس درج کیا ہے:

- ''میں بھی انسان ہوں، مجھ سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے، لہٰذا ہر شخص کو اختیار ہے کہ میرے کام کے بارے میں مشورہ دے اور اس پر تنقید کرے۔ یقین کیجیے کہ ہر خط

اور ہر تار جو مجھے بھیجا جاتا ہے میں بذات خود پڑھتا ہوں۔ ایک ایک سطر پڑھتا ہوں اور میرا زیادہ وقت اسی میں گزرتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان زبانی باتوں کے بجائے جو کچھ سوچے، محسوس کرے، مجھے لکھے۔ میں غور کروں گا اور مناسب ہوا تو مشورہ قبول کروں گا۔ میں مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ پاک نے میری مدد کی تو ان شاء اللہ میں ان کو ان کی منزل کے قریب لے جاؤں گا۔''

قائداعظم کا ایک بیان روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کے شمارے 22 اکتوبر 1939ء میں شائع ہوا جس کو منشی عبدالرحمان نے اپنی کتاب ''قائداعظم کا مذہب وعقیدہ'' کے صفحہ نمبر 197 پر درج کیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''مسلمانو! میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت لطف اٹھائے ہیں۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سر بلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح! تم نے واقعی مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح! تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علم اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔'' (''انقلاب'' لاہور، 22 اکتوبر 1939ء صفحہ آخر کالم 1)

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا:

❑ ''ہم نے پاکستان کی جنگ آزادی جیت لی ہے مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی سنگین ترین جنگ ابھی جاری ہے۔ اگر ہمیں ایک بڑی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ آپ کو وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی، معاشرتی عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی

کرنی ہے۔ آپ کو ان کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا۔ ستانے کا موقع ابھی نہیں آیا۔ یقین محکم، ضبط و نظم اور ادائیگی فرض کی دُھن ایسے اصول ہیں کہ اگر آپ ان پر کاربند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جو آپ حاصل نہ کر سکیں۔''

ممتاز مسلم لیگی راہنما میاں بشیر احمد قائداعظم سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی 10۔اورنگزیب روڈ دہلی میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہاں تحریک پاکستان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میاں بشیر احمد نے قائداعظم سے مخاطب ہو کر کہا:

''لوگ کہتے ہیں کہ قرارداد لاہور تو پاس ہوگئی ہے لیکن پاکستان شاید سو برس میں بن سکے گا۔ ہماری قوم میں بڑی کمزوریاں ہیں، ہم پاکستان کیسے بنا سکتے ہیں؟''

قائداعظم نے اس موقع پر میز پر موجود قرآن مجید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

- ''جب مسلمانوں کے پاس یہ کتاب موجود ہے، انھیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 1942ء میں کراچی میں منعقد ہوا۔ اس سالانہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جن ممبران نے تجاویز بھیجی تھیں، ان کی میٹنگ نواب محمد اسماعیل خان کی صدارت میں ہوئی جس میں مختلف قراردادیں تیار کی گئیں۔ ان میں سے ایک قرارداد آئین کے حوالے سے مرتب کی گئی جس کے الفاظ یہ تھے ''پاکستان میں جو آئین ہو گا، وہ قرآن و سنت کے مطابق ہو گا اور رائج الوقت قوانین میں جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی۔'' تمام لوگوں نے اس تجویز کی حمایت کی۔ آخر میں قائداعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا:

- ''جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے، وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار ہے اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو گا۔''

علامہ اقبال نے 8 مئی 1936ء کو ایک بیان اشاعت کے لیے دیا جس کا عنوان تھا ''مسلمانان پنجاب کے نام ایک اہم اپیل'' جس میں لکھا گیا تھا:

- ''بطل جلیل مسٹر محمد علی جناح ان قابل فخر ''مسلم'' راہنماؤں میں سے ہیں جن

کی سیاسی دانش ہمیشہ مسلمانوں کے لیے صبر آزما وقتوں میں مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔ جس خلوص اور عزیمت کے ساتھ انھوں نے مسلمانان ہند کی تمام اہم اور نازک موقعوں پر خدمت کی ہے، اس کے لیے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سر ''عقیدت و احترام'' کے ساتھ جھکے رہیں گے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر علمائے کرام نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کو بھرپور تقویت پہنچائی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کی طرح قائداعظم کو سچا و پکا مسلمان اور مسلمانوں کا بے لوث خادم سمجھتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ قائداعظم کی خدمات اور ان کے کردار کی پختگی کا کھلے عام اعتراف کیا۔ ایک خطاب میں انھوں نے کہا:

❑ ''مسٹر جناح آج کل کی سیاست کے داؤ پیچ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ واقف ہیں۔ پھر انھیں کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا اور نہ ہی وہ کسی دباؤ کے آگے جھکتے ہیں''۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے علم و فضل اور تقویٰ کا کون انکار کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال انھیں استاد الکل کہہ کر پکارتے تھے اور آپ کے خطوط کو قوت روح اور اطمینان قلب کا باعث قرار دیتے تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے 1916ء میں مشہور لکھنؤ پیکٹ کے موقع پر جو نظم کہی تھی اس سے علامہ ندوی کی نگاہ میں قائداعظم کا بلند مرتبہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ علامہ سلیمان ندوی کی طویل نظم کا ایک شعر یہاں درج کیا جا رہا ہے ؎

ہر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

1945ء کو پیر صاحب مانکی شریف کے نام ایک خط میں قائداعظم نے لکھا:

❑ ''یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی دستور ساز اسمبلی جس میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہوں، وہ مسلمانوں کے لیے ایسے قوانین منظور کرے گی جو شریعت کے قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں گے اور مسلمان کسی بھی حالت میں اس بات کے پابند

نہیں ہوں گے کہ وہ کسی غیر اسلامی قانون کی پابندی کریں۔“

27 اپریل 1946ء کو آل انڈیا سنّی کانفرنس کا آغاز ہوا تو بعض کانگریسی علما نے اپنے ایجنٹ بھیج کر اجلاس کو درہم برہم کرنے کی سازش تیار کی۔ جب پیر جماعت علی شاہ اپنے معتمد خاص مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی کے ساتھ سٹیج پر تشریف لا رہے تھے تو کسی نے راستہ میں اس سازش کی خبر آپ کو دے دی۔ پیر جماعت علی شاہ جلسہ گاہ میں پہنچے تو تلاوت کلام پاک کے بعد آپ نے پورے جوش کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ”محترم جناح صاحب کو کوئی کافر کہتا ہے،کوئی مرتد بناتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ”ولی اللہ“ ہے! وہ لوگ اپنی رائے سے کہتے ہیں لیکن میں قرآن وحدیث کی رُو سے کہتا ہوں۔ سنو اور غور سے سنو! اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتا ہے (ترجمہ): جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ (مریم:96) آپ لوگ بتایئے، ہے کوئی مائی کا لال مسلمان جس کے ساتھ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان قائداعظم ایسی والہانہ محبت رکھتے ہوں، یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔ اب رہی میری عقیدت تو میں مسٹر جناح کو ”ولی اللہ“ کہتا ہوں“۔

مفتی محمد شفیع کا شمار ممتاز علمائے کرام میں ہوتا ہے۔ آپ کی ساری زندگی علوم دینیہ کی اشاعت وترویج میں گزری۔ آپ نے خود کو سیاست کی وادی سے دُور رکھا لیکن تحریک پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔

1946ء میں مفتی محمد شفیع نے حیدرآباد سندھ میں جمعیت علمائے اسلام کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ”مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائداعظم قرار دیا ہے۔ اس حیثیت سے نہیں کہ وہ مفتی ہیں اور ان سے حلال وحرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا یا اس حیثیت سے کہ وہ شیخ اور مرشد ہیں کہ ان سے اصلاح کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک بھی مسلمان ان کو

اس خیال سے قائداعظم نہیں کہتا۔ ان کی قیادت ہند کی مسلم جمہور نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز خود اس وقت بین الاقوامی تقاضوں یا اندرونی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر جس طرح بھی آزادی برصغیر کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی طاقت، مستحکم تنظیم اور سرمایہ کے بل بوتے پر اس کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے۔ اس لیے اس وقت ایک جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی جنگ نہیں بلکہ محض قانون اور آئین کی جنگ ہے اور بالاتفاق موافق و مخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لیے مسٹر جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دوسری قوموں میں بھی نہیں ہے۔ کس قدر بدنصیبی ہے کہ یہ قوم اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے بھی اس کو میدان میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لیے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ طہارت نہیں پاتی۔ ریل، جہاز اور موٹر میں سوار ہوتے وقت بڑے سے بڑا متقی، دین دار اور دانش مند صرف اس بات کا اطمینان ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیور، ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں۔ اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اس کے ذاتی اعمال و افعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہوسکتا ہے نہ شرعاً۔‘‘

قائداعظم ...... علمائے دین کی خدمات کے دلی قدردان تھے۔ چنانچہ جب صوبہ سرحد میں مسلم لیگ نے ریفرنڈم میں شاندار کامیابی حاصل کی تو علامہ شبیر احمد عثمانی نے جو اس وقت صوبہ سرحد میں قیام فرما تھے، قائداعظم کو مبارک باد کا تار ارسال کیا جس کے جواب میں قائداعظم نے لکھا: ’’مولانا اس مبارک باد کے اصل مستحق تو آپ ہیں۔‘‘

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے اسلامی تشخص کو اُجاگر کرنے کے لیے نہایت اختصار کے ساتھ چیدہ چیدہ واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات پوشیدہ ہیں جو ان کے اسلامی تشخص کو روز روشن کی طرح عیاں کرتے ہیں۔

۞......۞......۞

حافظ شفیق الرحمٰن

قائداعظمؒ پر سیکولر ہونے کا بہتان

تحریک آزادی کے دوران برصغیر کے مسلم عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور انھیں دھوکہ دینے کے لیے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے کئی قدآور ہندو راہنما خود کو کبھی نیشنلسٹ، کبھی سوشلسٹ اور کبھی سیکولرسٹ کے رُوپ میں پیش کر رہے تھے۔ کانگریسی قیادت کے اس بہروپیے پن اور اداکاری کا مقصد وحید بھارت کی اکھنڈتا کو بچانا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ جس قدر ممکن ہو، وہ اپنے ہندومت کو چھپائیں تاکہ مسلم اقلیت کو ''اٹریکٹ'' کر سکیں۔

کانگریسی قیادت کیموفلاجڈ قیادت تھی۔ اس کے برعکس قائداعظم نے اپنی اَن گنت تقاریر میں اسلامیان برصغیر پر واضح کیا کہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، ثقافت، رہن سہن، روایات، مزاج اور اقدار ہندوؤں سے قطعی مختلف ہیں۔ قائداعظم نے اپنے اسلام کو کبھی نہیں چھپایا، ان کا نقطۂ نظر تھا کہ ہمارا نظام عبادات، نظام فکر، نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست اور نظام حکومت ہمیں برصغیر کے ہندو عوام سے ایک الگ تشخص، منفرد شناخت اور متمیز پہچان عطا کرتا ہے۔ قائداعظم تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے کہ دونوں قوموں کے ہیروز بھی مختلف ہیں۔ ہم جنھیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں، ہندو انھیں اپنا دشمن قرار دیتے ہیں۔ ہم جنھیں فاتح کہتے ہیں، ہندو انھیں اپنی خفت مٹانے کے لیے غاصب اور لٹیرا قرار دیتے ہیں اور واضح الفاظ میں یہ کہا کرتے تھے کہ یہ برصغیر جہاں ہندو اکثریت کے تعصب کا عالم یہ ہے کہ اس نے ریلوے سٹیشنوں، مارکیٹوں اور دیگر کاروباری مراکز میں ''مسلم پانی، اور ''ہندو پانی'' کے لیے الگ الگ مٹکے اور

گھڑے رکھے ہوئے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ ''سوراج'' کے بعد یہ لوگ ہمیں اپنی صفوں اور مملکت و معاشرہ میں برابر کی جگہ دے سکیں۔ قائداعظم جان چکے تھے کہ تنگ نظری، مسلم دشمنی، اسلام بیزاری اور عدم برداشت ہندوؤں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

پاکستان کا مطالبہ سورۃ الکافرون کی عملی تشریح تھا۔ قائداعظم برصغیر کی اسلام دشمن، مسلمان مخالف اور کفر نواز طاقتوں کے رُوبرو الگ ریاست اور علیحدہ وطن کا مطالبہ اور منصوبہ پیش کر کے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں کہہ رہے تھے، قیام پاکستان کا یہ مطالبہ اور منصوبہ روح قرآنی کے عین مطابق تھا۔ دوقومی نظریہ دراصل سورۃ الکافرون ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ ہر سچا اور پکا مسلمان شام ابد تک اس نظریے کا پرچارک رہے گا۔ قائداعظم فکری و نظری اور عملی طور پر ایک پکے اور سچے مسلمان تھے۔ ایک کھرے مسلمان کی حیثیت سے وہ برصغیر پر قابض برطانیہ سے آئے ہوئے صلیبی استعمار پسندوں اور ہندوؤں کو یہ بتا رہے تھے کہ اس خطے میں مسلم عوام گو کہ اقلیت میں ہیں لیکن بحیثیت مسلم ان کا راستہ غالب ہندو اکثریت سے الگ ہے۔ قائداعظم، محسن انسانیت رسول اکرم ﷺ کی پیروی میں وہی بات کہہ رہے تھے جو رسول اکرم ﷺ (ان پر میں اور میرے ماں باپ فدا ہوں) نے کفارانِ مکہ سے کہی تھی:

- آپ فرما دیجیے اے کافرو! میں پرستش نہیں کیا کرتا (ان بتوں کی) جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو اس (خدا) کی جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں۔ اور نہ ہی میں کبھی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔ (الکافرون)

مسلمان دنیا بھر کی دیگر اقوام سے نظریاتی سطح پر ایک ممتاز و منفرد قوم ہیں۔ ان کی یہ انفرادیت اور امتیاز زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیشہ قائم و دائم رہا ہے، اسلامی فن تعمیر اس کی واضح مثال ہے۔ بقول پروفیسر علم الدین سالک ''فن تعمیر فی الحقیقت ہر قوم کے اندرون کا عکس ہوتا ہے''۔

مسلمان فراخدل ہیں اور مسجد کا صحن بھی فراخ ہوتا ہے۔ ہندو پُر پیچ اور پیچدار ہے اور مندر کی بھول بھلیاں اس کی عکاسی کرتی ہیں۔ عیسائی ڈپلومیٹ قوم ہے، گرجے کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اگر قائداعظم نے پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ ہی بنانا تھا تو الگ وطن کا مطالبہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو گاندھی، نہرو، اچاریہ کرپلانی بھی کرنا چاہتے تھے۔ کیا کانگریسی قیادت اور لیگی قیادت میں یہی اختلاف تھا کہ قائداعظم حجم کے لحاظ سے ایک چھوٹے رقبہ پر سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے اور ''گاندھی اینڈ کو'' پورے ہندوستان پر۔ کیا یہ اختلاف منی سیکولر سٹیٹ اور بگ سیکولر سٹیٹ کے مسئلے پر تھا۔ یہ اختلاف تو کوئی اختلاف نہ ہوا۔ کیا محض اتنی چھوٹی سی بات کے لیے 15 اگست کے بعد چھ لاکھ انسان قتل ہوئے، ڈیڑھ کروڑ نے اپنے گھر اور جنم بھومیاں چھوڑیں اور ایک لاکھ نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی۔ کیا دنیا کا کوئی مسلمان سیکولر سٹیٹ کے قیام کے لیے قتل ہونے، ہجرت کرنے اور عصمتوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔

احوال وظروف شاہد ہیں کہ 14 اگست سے قبل اگر لیگی قیادت یہ اعلان کرتی کہ وہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتی ہے تو برصغیر کا ایک مسلمان شہری بھی مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیتا۔ کیا 1946ء کے انتخابات کے موقع پر قائداعظم اور لیگی قائدین نے کسی جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا کہ سیکولرازم ہمارا آئیڈیل ہے۔ اس دور میں قائد نے جتنی تقاریر کیں اور اخبارات میں شائع ہوتی رہیں، جایئے سیکولرازم کی حمایت میں شائع ہونے والا کوئی ایک بیان ڈھونڈ کر لایئے۔

قائداعظم عصرِ رواں میں اپنے معاصر سیاستدانوں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے، اکل کھرے، اصول پسند، واضح، صاف گو اور راست فکر انسان تھے۔ قائداعظم پر کبھی سوشلسٹ، کبھی لبرل اور کبھی سیکولر ہونے کا الزام دھرنے والے دراصل قائداعظم کے شہکار سوانحی پورٹریٹ کو مسخ کر کے انھیں غیر متوازن، غیر واضح اور اُلجھی ہوئی شخصیت

کے رُوپ میں پیش کر کے مضحکہ خیز تجریدی کارٹون بنا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔

کہنے کو تو یہ لوگ جمہوریت کے دلدادہ بنے پھرتے ہیں، لیکن قائداعظم کے افکار ونظریات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انتہائی غیر سائنسی اور غیر جمہوری طرز فکر اپناتے ہیں۔ روح جمہوریت، جمہوری طرز فکر اور جمہوری شعور اس امر کا متقاضی ہے کہ یہ بابائے قوم کے تمام خطبات، تقاریر، بیانات، پیغامات اور خطوط کو سامنے رکھیں۔ قائد کے افکار ونظریات کے حوالے سے شائع شدہ مستند مواد کا بنظر غائر مطالعہ کریں اور دیانتداری سے بتائیں کہ قائداعظم نے مسلم لیگ کی دوبارہ صدارت سنبھالنے کے دن سے لے کر اپنے یوم وفات تک قیام پاکستان اور استحکام پاکستان کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں نبی اکرم ﷺ اسلام اور قرآن پر عمل پیرا ہونے کی کتنی بار دعوت دی ہے۔ اور کتنی مرتبہ سیکولر سٹیٹ کے قیام کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مرکز ومحور گردانا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ تناسب شاید لاکھ اور ایک کا بھی نہ ہو۔ کیا دیانت فکر ونظر اس کے باوجود انھیں ''سیکولر سٹیٹ'' کا راگ مالکونس الاپنے کی اجازت دے گی؟ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات الگ ہے، وگرنہ وہ بھی جانتے ہیں کہ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست سیکولر نہیں ہوسکتی۔

کیا ہمارے نام نہاد سیکولر اور لبرل ''کرم فرما'' یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ شخص جو قرآن کو مکمل ضابطۂ حیات مانتا ہو اور اپنی تحریک کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مملکت کا آئین صرف قرآن کو قرار دیتا ہو، اسے سیکولر کہنا کس حد تک درست ہے۔

وہ شخصیت جو حضور اکرم ﷺ سے بے پناہ عشق کرتی ہو اور جس کے عشق رسالت مآب ﷺ کا عالم یہ ہو کہ وہ لنکنز اِن یونیورسٹی میں محض اس لیے داخلہ لے کہ اس کے صدر دروازے پر نصب بورڈ پر دنیا کے بڑے آئین سازوں اور قانون سازوں کی فہرست میں محمد عربی ﷺ کا اسم گرامی سرِ فہرست لکھا ہوا تھا، کیا ایسی شخصیت کو سیکولر کہنا اس کا قد چھوٹا کرنے، اس کا امیج مسخ کرنے اور اس کی کردار کشی کے مترادف نہیں؟ قائداعظم کو کمزور روایات کے سہارے سیکولرازم کا پرستار ثابت کرنے کی مذموم مساعی

کرنے والے یہ عیار دانشور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قائداعظم اور کانگریسی قیادت کے مابین کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا، بلکہ وہ محض ایک الگ ریاست میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ شاتم رسول اور گستاخ رسول راجپال کو واصل جہنم کرنے والے برصغیر کے مسلم عوام کے عظیم ہیرو غازی علم الدین شہید کے کیس کی پیروی کے لیے قائداعظم نے اپنی خدمات پیش کی تھیں؟ کیا غازی علم الدین شہید کا کیس لڑنے کی پیشکش اس امر کا واضح ثبوت نہیں کہ قائداعظم گستاخان رسولؐ کو واصل جہنم کرنے والے عاشقان رسولؐ سے عقیدت رکھتے تھے؟ اس صدی کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ قائداعظم اپنے ہم عصر سیاسی راہنماؤں میں سب سے زیادہ صاف گو اور راست فکر انسان تھے۔ اگر وہ سیکولر مائنڈڈ ہوتے تو کبھی آل انڈیا نیشنل کانگریس کا پلیٹ فارم نہ چھوڑتے۔ اگر وہ کانگریس چھوڑ بھی دیتے تو کسی ایسی سیاسی جماعت میں شامل نہ ہوتے جس کا نام ہی ایک مخصوص دین کے ساتھ گہری وابستگی کی علامت اور استعارہ سمجھا جاتا تھا، یعنی مسلم لیگ۔

اگر وہ اشتراکی کوچہ گردوں کی طرح آشفتہ مغز اور آشفتہ خو ہوتے تو اس دور میں کمیونسٹ پارٹی موجود تھی، وہ اسے بلا خوف و خطر جوائن کر لیتے۔ قائداعظم کی یہ شمولیت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بادۂ توحید کے مستانے اور شمع رسالت ﷺ کے پروانے تھے۔ اگر وہ آج کے بے سمت اور بے رُخے دانشوروں کی طرح خدانخواستہ کنفیوزڈ اور اسلام سے الرجک ہوتے تو وہ مسلم لیگ کا نام تبدیل کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ وہ اتنے پاپولر اور مقبول راہنما تھے کہ اپنے جذبۂ لبرلزم اور جنون سیکولرازم کی تسکین کے لیے مسلم لیگ سے ہٹ کر ''سیکولر لیگ'' یا ''لبرل پارٹی'' تشکیل دے سکتے تھے، ان کے پاس اس کے وسائل بھی تھے۔

اگر قائداعظم سیکولر ہوتے تو وہ غازی علم الدین شہید کے مقدمے کی پیروی کے بجائے روایتی سیکولروں کی طرح یہ کہتے کہ چونکہ سیکولرازم کے تحت ہر شخص کو فکر کی

آزادی کا حق حاصل ہے، اس لیے راجپال نے اہانت رسولؐ پر مبنی مواد شائع کر کے اپنے حق کا استعمال کیا ہے، اس لیے میں ''آزادی فکر کے علمبردار'' راجپال کی طرف سے عدالت میں پیش ہوں گا۔ قائداعظم ایک جامع العلوم اور کثیر المطالعہ شخصیت تھے۔ کیا ان کے علم میں نہیں تھا کہ انسائیکلوپیڈیا آف امریکہ کے مطابق سیکولرازم تمام بنیادی مسائل خدا یا رُوح کی لافانیت وغیرہ پر انسان کو بحث کا حق دیتا ہے۔ کیا ایک مسلمان خدا کی ذات اور اس کے اقتدار کے دوام کو موضوع زیر بحث بنانے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ کیا قائداعظم نے زندگی بھر کبھی بنیادی اسلامی عقائد کے حوالے سے آزاد خیال سیکولرسٹوں کی طرح شکوک وشبہات کا اظہار کیا؟

کانگریسی راہنما خود کو سیکولر کہتے تھے۔ اس لیے ہندو ہونے کے باوجود پیش پاافتادہ سیاسی مفادات کے حصول کے لیے کبھی ٹوپی اوڑھ کر مساجد میں جاتے، کبھی گردواروں کی یاترا کرتے اور کبھی گرجا گھروں کا رُخ کرتے۔ کیا مسلم لیگ کی صدارت اور مسلم عوام کی قیادت سنبھالنے کے بعد کسی نے قائداعظم کو بھی سیکولر کانگریسی راہنماؤں کی طرح مندروں کے استھانوں پر سیس جھکاتے، گرجا گھروں میں سرمن سنتے اور گردواروں میں گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے دیکھا؟ قائداعظم اس قسم کی سیاسی شعبدہ بازیوں سے متنفر تھے۔ وہ خود کو صرف اور صرف مسلم عوام کا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ قائداعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت کی اولین شرط مسلمان ہونا تھی۔ اس لیے 23 مارچ 1940ء سے لے کر 14 اگست 1947ء تک مسلم لیگ میں ایک بھی غیر مسلم شامل نہ ہوا اور نہ ہی لیگ میں کوئی اقلیتی ونگ قائم کیا گیا۔

تحریک آزادی کے دوران رائج الوقت سیکولر سیاسی فکر کے علمبردار اپنی اپنی جماعتوں کا پیغام پہنچانے کے لیے اور سستی شہرت کے حصول کے لیے بلاامتیاز ہر تعلیمی ادارے کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اس کے برعکس قائداعظم اپنے پیغام کا مخاطب چونکہ صرف اور صرف مسلمانوں کو سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے کبھی کسی ہندو یونیورسٹی، خالصہ کالج، کرسچین ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، آریہ سماج یا سناتن دھرم سکول کا

دورہ نہیں کیا۔ تعلیمی اداروں کی طرف جب بھی ان کے قدم اٹھے تو آسمان کی نیلی آنکھوں نے انھیں کبھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کبھی اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور اور کبھی اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے گفتگو کرتے اور انھیں یہ سمجھاتے ہوئے پایا کہ ہندو کبھی مسلمان کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا، اس لیے آپ کو اسلامی اصولوں اور قوانین کی تجربہ گاہ (پاکستان) کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جانا چاہیے...... اگر قائداعظم سیکولر ہوتے تو وہ ماتھے پر قشقہ کھینچ کر ہندو طلبا کا من موہنے، گلے میں صلیب ڈال کر عیسائیت کے پرستار طلبا کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور کلائیوں میں کڑا پہن کر اور کمر میں کرپان حمائل کر کے خالصہ کالج کے آنگن میں ست سری اکال کا نعرہ لگانے میں کوئی مضائقہ محسوس نہ کرتے۔

ستم ظریفانہ المیہ تو یہ ہے کہ قائداعظم کو سیکولر اور پاکستان کو سیکولر سٹیٹ قرار دینے والے عناصر کی اکثریت ان حضرات و خواتین پر مشتمل ہے جن کی آبا و اجداد نے تحریک قیام پاکستان کے لیے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر سے ایک لمحے کی جدوجہد بھی نہیں کی۔ ان لوگوں میں سے اکثر کے آباؤ اجداد کے ساتھ تین صورتوں میں ایک ضرور تھی:

1- وہ تحریک پاکستان اور قائداعظم کے بدترین مخالف تھے۔

2- وہ برطانوی حکومت کے مراعات یافتہ استحصالی طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔

3- وہ تحریک قیام پاکستان کے حوالے سے ''خاموش تماشائی'' کا کردار ادا کر رہے تھے۔

بد قسمتی ملاحظہ کیجیے کہ ان کی نسلیں آج بزعم خویش پاکستان کی اجارہ دار بنی ہوئی ہیں۔

قائداعظم کو سیکولر کہنا صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور حقائق و شواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ ایسا جھوٹ گھڑنے والے صدی کے سب سے بڑے جھوٹے ہیں، وہ لوگ جنھیں مغربی استعمار کی فکری غلامی کے ذہنی پولیو نے دماغی معذور بنا دیا ہے، ان سے بحث لاحاصل ہے...... چمگادڑ کو اگر سورج دکھائی نہ دے تو بھلا اس میں سورج کا کیا قصور...... ان نظریاتی بالشتیوں اور فکری بونوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے دلائل و براہین، زمینی حقائق اور تاریخی شواہد کے انبار لگانا اندھوں کی بے نور بستی میں

سورج کاشت کرنے اور آئینے سجانے کے مترادف ہے...... بہرحال میرے مخاطب یہ لوگ نہیں...... میرے مخاطب محبّ وطن اور دین دوست پاکستانی ہیں۔ اسلام جن کی شریانوں میں لہو بن کر گردش کرتا، سینے میں دل بن کر دھڑکتا، نبضوں میں زندگی بن کر پھڑکتا، آنکھوں میں نور بن کر دمکتا، ذہنوں میں سوچ بن کر چھلکتا اور ہاتھوں میں ولولۂ کار بن کر مچلتا ہے۔

کوئی بھی ذی شعور پاکستانی ایک فیمیوسیکنڈ (سیکنڈ کے کھربویں حصے) کے لیے بھی یہ ماننے کو سرِمو تیار نہیں کہ قائداعظم کل کے کسی لینن گراڈ یئے یا آج کے وائٹ ہاؤسیے گرگٹی دانشور کی طرح دین بیزار، اسلام مخالف یا علما دشمن شخصیت تھے۔

قائداعظم ایک سچے مسلمان کی طرح اسلام کو ایک کامل و اکمل ضابطۂ حیات تسلیم کرتے تھے...... بیورلی نکلسن نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ورڈکٹ آن انڈیا'' میں ایک ''بطل عظیم سے مکالمہ' کے عنوان سے متعلقہ باب میں قائداعظمؒ سے اپنی ایک ملاقات کی تفصیل پیش کی، اس ملاقات کے دوران مصنف دیگر اہم سوالات کے ساتھ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ آپ کن وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں، کیا آپ کے نزدیک مسلمان ایک الگ قوم ہیں؟...... اور پھر اسی شہرہ آفاق صحافی اور انشا پرداز کی زبانی قائداعظم کا جواب سنیے، انھوں نے فرمایا، یاد رکھیے اسلام صرف روحانی اور مذہبی اصولوں کا نام نہیں بلکہ ایک عملی نظام حیات ہے، میں زندگی پر ایک کل کی حیثیت سے غور کرتا ہوں اور پورے نظام حیات (مکمل دین) کے اعتبار سے مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم تصور کرتا ہوں، تمام امور میں ہمارا زاویۂ نگاہ نہ صرف ہندوؤں سے مختلف ہے، بلکہ اکثر شعبوں میں متضاد ہے۔ ہمارا وجود اور ہماری دنیا ہی مختلف ہے، زندگی میں ہمیں ان سے مربوط کرنے والی کوئی چیز بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے نام، ہماری غذا، ہمارا لباس، یہ سب ان سے مختلف ہیں، ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، حیوانات کے ساتھ طرزِعمل ہر نقطہ پرکار پر ہم ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ (ماخوذ از مقالہ 'ڈاکٹر عبدالغنی فاروق')

آج بعض نومولود اورنوزائیدہ دانشور جن کی فکری مسیں ابھی بھیگی بھی نہیں، وسیع مطالعے کے متقاضی مباحث کو چھیڑ کر خانہ ساز فیثا غورثی اور جعلی جالینوسی کی دھاک قارئین کے دلوں میں بٹھانا چاہتے ہیں۔فکری نابالغین کا یہ طائفہ کبھی کہتا ہے کہ پاکستان نے ایک جغرافیائی مسئلے کی کوکھ سے جنم لیا ہے، کبھی یہ اُشکلہ چھوڑ دیا جاتا ہے کہ علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ دراصل برصغیر کے مسلم عوام کی معاشی بحالی کا مطالبہ تھا، ہو سکتا ہے ان مسائل نے بھی قیام پاکستان کی منازل کوقریب لانے میں قدرے کردار ادا کیا ہو، لیکن تحریک پاکستان کا اساسی نصب العین اسلام کی نظریاتی اساس پر ایک نئ مملکت کی عمارت تعمیر کرنا تھا......فروری **1948**ء میں ایک امریکی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے ہوئے بانی پاکستان نے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا:

❑ ’’پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستورساز اسمبلی بنائے گی، مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل و ہیئت کیا ہوگی لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا، اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے، اسلام نے ہمیں انسانی مساوات، انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا درس دیا ہے۔‘‘

25 جنوری **1948**ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم نے فرمایا:

❑ ’’میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر

شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔''

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم 1948ء کے اوائل میں اسلامیہ کالج پشاور گئے، اس موقع پر طلبا سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے عالمی برادری پر دوٹوک الفاظ میں واضح کیا:

- ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں''۔

14 اگست 1948ء کو پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر قوم کو پیغام دیتے ہوئے قائد نے یاد دلایا:

- ''یاد رکھیے، پاکستان کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اور اگر ہم نے دیانتداری، تندہی اور بے غرضی کے ساتھ کام کیا تو یہ بھی سال بہ سال شاندار ترقی کرتی رہے گی۔ مجھے اپنے عوام پر کامل بھروسا اور یقین ہے کہ ہر موقع پر وہ اسلام کی تاریخ، شان و شوکت اور روایات کے مطابق عمل پیرا ہوں گے''۔

طوالت کا خوف اور کالم کی تنگ دامانی کا احساس مانع نہ ہوتا تو قائداعظم کی سوانح، جدوجہد اور فرمودات وملفوظات سے ایسے ہزاروں حوالے پیش کیے جاسکتے ہیں جو ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ قائداعظم بحیثیت ایک نظری و عملی مسلمان کے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے...... ایک ایسی فلاحی اسلامی ریاست جہاں استحصالی طبقات محروم طبقات کا استحصال نہ کرسکیں...... جہاں بینظیر اسلامی رواداری کے چھتنار درخت کی چھاؤں میں اقلیتیں اسلامی مساوات کے ثمرات سے متمتع ہوں۔

میاں عزیز الحق قریشی

کیا پاکستان سیکولر ملک بن سکتا ہے؟

جب تحریک پاکستان جاری تھی تو اس کی مخالفت میں محض ہندو ہی سرگرم عمل نہیں تھے بلکہ بعض ایسے مسلمان بھی شامل تھے جو ایک طرف ہندوؤں کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے اور دوسری طرف ان کا غلامانہ ذہن برصغیر کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ آزاد مملکت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ طویل غلامی نے ان کے دماغ ماؤف کر دیئے تھے اور خوئے غلامی نے ان کے ضمیر بدل ڈالے تھے۔ ان میں دو طرح کے لوگ شامل تھے، ایک تو سیدھے سادھے مسلمان تھے جن کو ان نام نہاد قوم پرست راہنماؤں نے ورغلایا تھا، دوسرے کمیونسٹ جنھیں دو قومی نظریے سے کوئی محبت نہ تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ کمیونسٹ عنصر تو اپنی منافقانہ مصلحتوں کے سبب تحریک پاکستان کے حامیوں میں شامل ہو گیا لیکن قوم پرستی کے دعویدار مسلمان، قیام پاکستان تک اس کے مخالف ہی رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جنونی ہندوؤں نے ان دونوں طبقوں کو معاف نہیں کیا اور یہ دونوں طبقے ان کے مظالم کا یکساں طور پر نشانہ بنے۔ انھوں نے ان کے معصوم بچوں کو بھی اسی طرح نیزوں پر اُچھالا جس طرح پاکستان کے حامیوں کے بچوں کو اُچھالا گیا۔ ان کی خواتین کی بھی عزتیں لوٹیں، ان کی مائیں بہنیں بھی اغوا ہوئیں، ان کی املاک بھی لوٹی اور جلائی گئیں، کیونکہ ہندو کو ان کے مسلمان ہونے سے دشمنی تھی۔ جب یہ عناصر پاکستان آئے تو یہاں سب کو بلاامتیاز پناہ ملی۔ ان سے برادرانہ سلوک ہوا۔ قوم پرستی کے بہکائے مسلمانوں نے تو پاکستان کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے خیالات تبدیل کر لیے اور خود کو پاکستان کا وفادار شہری بنا لیا لیکن کمیونسٹ جو محض اپنے مفادات کی خاطر تحریک پاکستان میں شامل ہوئے تھے پھر بے وفائی

پر اُتر آئے۔ انھیں چونکہ دوقومی نظریے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ محض اس لیے تحریک پاکستان میں شامل ہوئے تھے کہ شاید پاکستان میں انھیں اپنی لامذہبیت پھیلانے کا موقع مل جائے، لیکن جب ان کی یہ مذموم خواہش پوری نہ ہوئی تو انھوں نے یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ قائداعظم خود بھی سیکولر تھے اور وہ پاکستان کو بھی سیکولر مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ ایک ایسا نعرہ تھا جس نے محبّ وطن پاکستانیوں کو چونکا دیا۔ انھوں نے اس عنصر کو سمجھنا چاہا لیکن شاید یہ وہی عنصر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

- مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور اُن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (البقرہ: 7)

یہ عناصر اپنے دعوے کے ثبوت میں قائداعظم کی اس تقریر کا حوالہ دیتے ہیں جو انھوں نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں کی تھی۔ اس تقریر میں انھوں نے فرمایا تھا:

- ''اب تم اپنی مساجد، اپنے مندروں اور پاکستان میں موجود اپنی دیگر عبادت گاہوں میں جانے کے لیے بالکل آزاد ہو۔ تمہارا عقیدہ اور تمہارا مذہب کچھ بھی ہو، اس کا مملکت کے سرکاری کاروبار سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب نہ ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے اور اس ملک کا شہری ہونے کی حیثیت سے۔''

قائداعظم کی لاتعداد تقریروں اور بیانات کی موجودگی میں یہ بات کوئی انتہائی احمق ہی کہہ سکتا ہے کہ قائداعظم خود بھی سیکولر تھے اور پاکستان کو بھی سیکولر بنانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ قائداعظم کی اس تقریر کے صرف ان الفاظ کا سہارا لیتے ہیں کہ ''عنقریب نہ ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان'' اور اسی فقرے کے اگلے الفاظ کو نظرانداز کر دیتا ہے جو یہ ہیں ''مذہبی طور پر نہیں بلکہ سیاسی طور پر اور اس مملکت کے شہری کی حیثیت سے''۔ بدطینت عنصر برصغیر کے مسلمانوں کے ہاتھوں پہلے بھی عبرتناک شکست کھا چکا ہے اور اب بھی وہ محبّ وطن پاکستانیوں کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں۔ تاہم

اسے جواب دینا اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ دشمن اپنے ان گماشتوں کی باتوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ قائداعظم نے اپنی 11 اگست 1947ء کی تقریر میں جو کچھ کہا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں تمام طبقے اپنے مذہب و عقائد پر قائم رہتے ہوئے اپنے وہ تمام حقوق حاصل کریں گے جو اس ملک کے شہری کی حیثیت سے قانون انھیں عطا کرے گا۔ اس سے ان کی جان و مال، ان کی عزت و آبرو، ان کے مقامات مقدسہ اور ان کی سیاسی و مذہبی آزادی مراد تھی۔ اگر اس عنصر نے مسلمان ہونے کے ناطے اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو انھیں پتہ چلتا کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے بھی عیسائی اقلیت کو اسی قسم کا یقین دلایا تھا۔ جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو حضرت عمرؓ خود یروشلم میں موجود تھے اور ایک گرجا میں پادریوں کے ساتھ مذاکرات ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں نماز کا وقت آ گیا، لاٹ پادری نے حضرت عمرؓ کو پیشکش کی کہ وہ گرجا میں ہی نماز ادا کر لیں، اب حضرت عمرؓ کا جواب ملاحظہ فرمائیں، انھوں نے فرمایا:

❑ ''اگر میں نے گرجا میں نماز ادا کر لی تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک مثال بن جائے گی۔ پھر کوئی گرجا باقی نہ رہ سکے گا جبکہ میں عیسائی اقلیت کو اس کی جان و مال، ان کی املاک، ان کے کلیساؤں اور صلیبوں اور ان تمام اشیا کے تحفظ کا یقین دلاتا ہوں جو ان کی تحویل میں ہیں یا جن کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں ان کے مذہب سے ہے۔''

قائداعظم نے اپنی 11 اگست کی تقریر میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کا موازنہ حضرت عمرؓ کی یقین دہانیوں سے کیجیے جو وہ فاتح ہونے کے باوجود عیسائی اقلیت کو دلا رہے تھے۔ اگر قائداعظم نے بلالحاظ مذہب و عقیدہ مملکت کے تمام شہریوں کو مساوی سلوک کا یقین دلایا تھا تو اس میں سیکولرازم کہاں سے آن ٹپکا؟

''شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے مری بات'' کے مصداق گم کردہ راہ مسلمانوں کو راہِ راست پر لانا بھی اُمت مسلمہ کے فرائض میں داخل ہے، اس لیے اس عنصر کی تسلی کے لیے قائداعظم کی تقاریر و بیانات سے بعض حوالے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ قائد نے فرمایا:

❑ ''اسلامی اقدار کو اپنانا انسانی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ ایک طرف قیام پاکستان کا جواز ہیں اور دوسری طرف ایک مثالی معاشرے کی تخلیق کی ذمہ دار ہیں۔'' (چٹاگانگ میں جلسۂ عام سے خطاب، 26 مارچ 1948ء)

❑ ''اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات وادبیات کس امر پر شاہد ہیں؟ دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو اپنے مذہب میں بھی جمہوری نقطۂ نظر رکھتی ہے۔'' (اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ، 31 دسمبر 1916)

❑ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی، بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کرسکتیں۔''

(جلسۂ عام حیدرآباد دکن، 11 جولائی 1946ء)

❑ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔''

(شاہی دربار سبّی بلوچستان، 14 فروری 1947ء)

❑ ''اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصولوں کو آزماسکیں۔''

(اسلامیہ کالج پشاور، 31 جنوری 1948ء)

قائداعظم کی تقریروں کے یہ اقتباسات قیام پاکستان سے پہلے کے بھی ہیں اور بعد کے بھی۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مملکت کے بارے میں ان کا جو تصور تھا، وہ ان کی زندگی کے آخری سانس تک باقی رہا۔ انھوں نے قیام پاکستان کے بعد بھی وہی باتیں کہیں جو وہ تحریک پاکستان کے دوران بلکہ اس سے بھی قبل کہا کرتے تھے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً وہ پاکستان کو ایک جدید جمہوری، فلاحی اور اسلامی مملکت بنا دیتے۔

❁ ..... ❁ ..... ❁
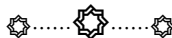
فخر الدین کیفی

قائداعظم پر سیکولر ہونے کی تہمت، قابلِ تعزیر جرم

دنیا میں ایک ایسا کالا قانون بھی ہے جس کی رُو سے اگر کوئی یہودیوں کے زندہ جلائے جانے والے واقعے (Holocaust) کی نفی کرے تو سزا کا مستحق ہوگا۔ اگر تحقیق کی جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ چھ لاکھ یہودیوں کا قتل مبالغہ ہے۔ تحقیق کی جا سکتی ہے، کیونکہ جس دور سے یہ واقعہ منسوب ہے، وہ کوئی بہت زیادہ پرانا نہیں، بس یہ سمجھیے کہ 1939ء کے بعد کا ذکر ہے۔ ہم حتمی تاریخ نہیں لکھ رہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تو تاریخ کیسی۔ مگر جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی مثال کے تناظر میں دیکھا جائے تو پھر کیا کر سکتے ہیں کہ اس کالے قانون کے تحت کچھ لوگ پابند سلاسل ہیں اور چونکہ لاٹھی ابھی بھینس والے کے ہاتھ میں ہے، اس لیے کسی دانشور یا کسی انسانی حقوق کی علمبردار تنظیم میں ہمت نہیں کہ اس کالے قانون کے تحت گرفتار اشخاص کے لیے یا اس کالے قانون کے خلاف مہم چلا سکے۔

علامہ اقبالؒ نے واضح کر دیا تھا کہ کچھ رزق ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے پرواز میں کوتاہی آ جاتی ہے۔ اب کیا کیا جائے کہ ان بین الاقوامی تنظیموں کو ایسا ہی رزق سپلائی ہوتا ہے، کیونکہ سپلائی کرنے والا بھی وہی لاٹھی والا ہے۔ ہاں، کبھی کوئی NGO چین، روس یا کوریا کی معاونت سے قائم ہوگی تو اُمید بہار رکھی جا سکے گی۔ علامہ اقبال کا مشورہ تھا کہ اس رزق سے موت اچھی ہے۔ ہم نے تو اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں، لاٹھی والے نے اس کی کاشت دگنی کر دی اور ہمارے ملک کو سپلائی کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ اب وہ زر بطور ایڈ اور قرضہ وافر مقدار میں سپلائی ہو رہا ہے اور انسانی حقوق ہی نہیں بلکہ حقوق

نسواں کے علاوہ دیگر تنظیمیں بھی بلندی پرواز کرنے کے بجائے زمین پر ہی شر پھیلانے میں مصروف ہیں۔ انھیں ہر اسلامی قانون حقوق انسانی یا حقوق نسواں کے خلاف نظر آتا ہے۔ پردے کا ذکر ہو یا توہین رسالتؐ کا، بنیادی حقوق خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ چار شادیوں کے خلاف ایسے سرگرم ہیں کہ معلوم ہوتا ہے پاکستان کا ہر مسلمان چار شادیوں پر بضد ہے۔ ڈھکے چھپے انداز میں حج اور قربانی کے خلاف بھی بیج بونے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے چند علما نما دانشوروں کو بھی رزق مفت فراہم کیا جاتا ہے، جو (استغفراللہ) قرآن سے اپنے مطلب کی باتیں نکالنے کے ماہر ہیں۔ اسلام کو پاکستان سے بیدخل کرنے کے لیے لفظ 'اسلامی' کو اسلامی جمہوریہ پاکستان سے حذف کروانا بھی ان کے ایجنڈے پر ہے۔ مولویوں کی تذلیل کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ ہر بُرے کام کو مسلمانوں سے منسوب کرنے میں پیش پیش اور ایسے ہی کوئی اقدام اگر کسی غیر مسلم سے سرزد ہوا ہو تو پردہ پوشی عین عبادت!! مثال کے طور پر یہ واقعہ کافی ہو گا کہ ایک شخص نے دو تین عورتوں کو قتل کیا تو اخبارات میں 'مولوی' غلام سرور کے نام سے رپورٹ ہوا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ مدرسے کا طالب علم رہ چکا ہے۔ جبکہ اس سے ملتے جلتے انداز میں انگلینڈ میں ایک شخص نے چند خواتین کو قتل کیا تو وہ (Jack the Ripper) جیک دا رپر کے نام سے رپورٹ ہوا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس نے کہاں سے تعلیم حاصل کی تھی، پروٹسٹنٹ تھا یا کیتھولک؟

اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جو حکمت عملی (Strategy) اپنائی گئی ہے، اس کے تحت قائداعظم کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اب سارا زور اس پر ہے کہ کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جائے کہ آپ سیکولر تھے۔ ایک نئے نئے بذعم خود دانشور نے کینیڈین اخبار گلوبل میل کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ پاکستان میں جمہوریت لاسکتا ہے۔ قانون ناموس رسالتؐ میں ترمیم لانا ہوگی اور قائداعظم سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کو ختم کرنے والا جو اپنے 9 سالہ دور میں جمہوریت نہ لا سکا تو اب کیسے لائے گا۔ رہ گئی قائداعظم کے سیکولر ہونے کی بات، تو جہالت تو اس بات سے

عیاں ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ قائد سیکولر ہوتے تو نکاح نہیں کرتے بلکہ کورٹ میرج کرتے۔ مرنے سے پہلے یہ نہیں بتاتے کہ ان کی نماز جنازہ کون پڑھائے گا۔ سیکولر ہوتے تو متحدہ ہندوستان کے وزیراعظم بننے میں کیا چیز مانع ہوتی، جبکہ یہ پیشکش کانگریس کی جانب سے تھی۔ اپنی تمام تقاریر میں ایک دفعہ بھی لفظ سیکولرازم کیوں نہیں استعمال کیا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ کیوں کہا کہ ہمیں تو ہمارا آئین چودہ سو سال پہلے ہی مل گیا تھا، اس لیے ہمیں آئین اکبر کی ضرورت نہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اکبر کا آئین آج کے بھارتی آئین سے زیادہ سیکولر تھا۔ اب جاہل دانشوروں کو یہ سب نہیں پتا کہ ہم انھیں نام نہاد کہنے میں حق بجانب ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قائد کی کئی باتوں کو کنٹروورشل بنانے کی حکمت عملی پر شد و مد سے عمل ہو رہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی جائے پیدائش پر بھی نئے نئے شوشے چھوڑے گئے ہیں جبکہ محترمہ فاطمہ جناح نے خود بتایا ہے کہ قائد کی پیدائش کراچی کی ہے۔ قائد کے پاسپورٹ جس کا اجرا **1946**ء میں ہوا تھا، اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کی پیدائش کراچی جبکہ ڈومیسائل بمبئی کا تھا۔ ہم سپریم کورٹ سے یہ التجا کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اس بات کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے کو کم ازکم چودہ سال کی قید تنہائی کی سزا دے۔ اس دوران اسے فقط قائد کی تقاریر پڑھنے کی اجازت ہو۔ اگر ''ہولوکاسٹ'' جیسی غیر حقیقی بات پر یقین نہ کرنے والا جیل جا سکتا ہے تو قائد پر سیکولر ہونے کی تہمت پر سزا کیوں نہیں؟

طارق جان

قائداعظم محمد علی جناح کی سیکولر صورت گری

سال 2001ء کے موسم گرما نے کئی شعلے بھڑکتے دیکھے۔ پہلی آگ نیویارک کی قسمت میں آئی جب اس کے اُفق سوختہ ساماں نظر آئے۔ پھر افغانستان کی باری آئی اور اسے پتھر کے دور میں واپس دھکیلنے کی خواہش میں امریکہ اور اس کے حلیفوں نے انسانی تاریخ کی بدترین بمباری کی۔ اس آگ کی تپش پاکستان تک بھی پہنچی۔ جونہی امریکہ کا چند حرفی پیغام آیا: ''تم یا تو ہمارے ساتھ ہو، ورنہ دہشت گردوں کے ساتھی'' تو پاکستان کا اسلامی امتیاز ہکلانے لگا، گویا اسلامی احساس فکر، اس کی روح میں اُتری ہوئی حقیقت نہ ہو بلکہ محض اتفاقی رویہ ہو۔

ہیئت مقتدرہ کی غیروں کی نگاہ میں بااعتبار رہنے کی تڑپ یا بالفاظ دیگر ''تشخص کی زیردستی'' ہر دوسری چیز ماپنے کا پیمانہ بن گئی۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ سیکولرازم کو اقتدار کے ایوانوں میں اتنی گستاخ اور توانا گونج اٹھانے کا موقع ملا ہو۔ کسی چینی یا جاپانی خاتون کی طرح جو سرجری قبول کرتی ہے کہ اس کا رُوپ آریائی ہو جائے، ہم نے تالیوں کی گونج میں نیا بہروپ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ کسی نے اسے ''نیا ترقی پسند پاکستان'' کہا اور کسی نے اسے ''معتدل پاکستان'' کا نام دیا۔

اس عمل کے دوران صاحبان اقتدار اور ان کے سیکولر ہم نواؤں کو یہ یاد نہ رہا کہ ایک ایسی قومی نفسیات سے کھیلنا جس کی جڑیں ایک توانا روایت میں پیوست ہوں اور اس کی جگہ ایک نئی ذہنی کیفیت پیدا کرنا، جس کا قومی تاریخ سے کوئی واسطہ نہ ہو، نری بربادی کا راستہ ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ اپنے وجود کے اجزائے ترکیبی کو بھول

جائیں۔ان کی تاریخ، ان کے اطوار و روایات اور سب سے زیادہ محترم ان کی روح کی وہ سرگوشی کہ وہ دوسروں سے مختلف ایک منفرد تہذیبی مقام کی حامل قوم ہیں اور جس کی جداگانہ حیثیت اسلام کی عطا ہے۔اس ترکیب کو نئی شکل دینے کا مطلب عوام الناس کی فطرت سے جنگ ہے۔مسلمانوں کی اپنے عقیدہ حیات سے بے پناہ محبت کہ جس نے انھیں اس جہان ہست و بود میں عزت اور سربلندی دی اور ان کے شرف انسانی کو سند جواز بخشا۔اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی بقراطی عقل کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کی اس ذہنی اور نفسیاتی ترکیب کو نئی شکل دینے کا مطلب عوام الناس کی فطرت سے جنگ ہے۔لبرل ہیئت مقتدرہ جانتی نہیں، یا جانتے بوجھتے انجان بن رہی ہے کہ اسلامیت کو ختم کرنے کی یہ مشق ہماری قوم کو محض مشت خاک بنا دے گی۔لیکن افسوس دوسروں کو خوش کرنے کی ترنگ نے ہر قدرِ خیر کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

ان صورت گروں کو البتہ دو باتوں نے خوفزدہ کر رکھا ہے: قومی ہیئت کذائی میں اس نویلی تبدیلی کو کیسے برحق ثابت کریں؟ بعض نے کہا کہ نیم سیکولر نظم اپنا لو اور اس بات کی پروا مت کرو کہ اس تشکیل نو کے لیے پیش کی جانے والی منطق کتنی بودی اور بے معنی ہے۔دوسروں نے رائے دی کہ آزاد لبرل ازم کو گلے لگاؤ (گویا یہ زیادہ قابل قبول شکل تھی) لیکن اس کے خدو خال بیان کرنے کا تکلف مت کرو۔ایک تیسرا حلقہ بھی ہے جس نے یہ دونوں اصطلاحات مترادف استعمال کیں۔آخر میں ایسے بھی ہیں جو انھیں یوں پیش کر رہے ہیں کہ جیسے لبرل ازم اور سیکولرازم اپنی اصل میں مختلف ہوں۔پاکستان کی اس بزدلانہ اور بددیانت فضائے دانش میں، جہاں یہ سیکولر ہمسفر ابہام کو ترجیح دیتے ہیں، کوئی وضاحتی تعریف سامنے نہیں آتی، کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے اپنے حرف محبوب کی تشریح کر دی تو انھیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

چنانچہ انھوں نے قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا سہارا لیا، جسے یہ اکثر پارہ پارہ کر کے سناتے رہتے ہیں، تاکہ لوگوں کو یقین آ جائے کہ قائداعظم نے اپنی زندگی میں بس یہی کچھ فرمایا تھا۔انھوں نے بعض منتخب حصے ایک طرف اٹھا کر رکھ

دیئے اور چند دل پسند پہلوؤں کی ملمع کاری شروع کر دی۔ حالانکہ قائد کے تصور اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے مجموعی متن اور جدوجہد کے پورے منظرنامے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً سیکولر طرز فکر کے لوگ اسی امر واقعی سے صرف نظر کرتے ہیں کہ قائداعظم کی سیاسی زندگی کم وبیش پچاس سال پر محیط ہے۔ لاکھوں کروڑوں لوگوں نے انھیں سنا اور تشکیل پاکستان کے کاز میں ان کے ہم آواز اور ہم رکاب رہے۔ اور یہ سب کچھ دن کے اُجالے اور تاریخ کی روشنی میں ہوا۔ صرف 11 اگست کی تقریر نہ تو یکتا تھی کہ قائداعظم کسی اور موضوع پر نہ بولے ہوں، اور نہ یہ ان کا آخری خطاب تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق قائداعظم نے 1940ء سے 1947ء تک کے عرصے میں ایسی 90 اہم تقاریر کیں جن میں انھوں نے مسلم عوام کو یقین دلایا کہ جو پاکستان وجود میں آرہا ہے، وہ اسلامی ہوگا۔ ان کا ذیل میں قول دیکھئے:

- ''پاکستان کا مطلب ہرگز آزادی اور استقلال نہیں۔ اس کا مطلب مسلم نظریہ ہے جسے ہم نے بچانا ہے، جو ہم تک ایک بیش قیمت ہدیے اور خزانے کے طور پر منتقل ہوا، اور جس کے متعلق ہمیں اُمید ہے کہ دوسرے بھی ہمارے ساتھ اس سے مستفید ہوں گے۔''

قائداعظم نے یہ بھی فرمایا کہ مسلم لیگ پاکستان کا مطالبہ اس لیے کر رہی ہے تاکہ مسلم عوام ''وہاں اسلامی قوانین کے تحت حکمرانی کریں۔'' دستورساز اسمبلی کی نوعیت واضح کرتے ہوئے قائد نے فرمایا:

- ''مجلس دستوریہ...... مسلمانوں کے لیے ایسی قانون سازی کر سکے گی جو شرعی قوانین سے متصادم نہیں ہو گی۔ مسلمان اب مزید مجبور نہیں ہوں گے کہ غیراسلامی قوانین کا اتباع کریں۔''

اب اگر سیکولر حلقہ یہ کوشش کرتا ہے کہ قائداعظم کو ایک متلون مزاج شخصیت کے طور پر پیش کیا جائے، جس نے اسلامی پاکستان کے ضمن میں عوام سے کیا ہوا وعدہ گیارہ اگست 1947ء کو اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھ دیا تھا تو وہ اصلاً اخلاقی حوالے سے قائد کی کردارکشی پر تُلا ہوا ہے اور پوری ڈھٹائی سے ایسا کر رہا ہے۔

یہ کوئی ایک موقع نہیں جب سیکولر حضرات نے قائداعظم کی توہین کی ہو۔ نہ انھوں نے اپنی ان کوششوں میں کمی آنے دی ہے کہ تحریک پاکستان میں رچابسا اسلامی رنگ کھرچ کر رکھ دیں۔ علامہ اقبال کی زندگی کا ایک واقعہ اس صورت حال کی وضاحت کر دیتا ہے۔ میاں افتخارالدین اور جواہرلال نہرو جیسے لادین ان کے پاس آئے اور انھیں قائل کرنا چاہا کہ وہ مسلمانوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیں، کیونکہ مسلمان جناح سے زیادہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس تجویز میں چھپا فتنہ بھانپ لیا کہ وہ قائد کے زیرکمان قائم مسلم اتحاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ غصے میں بھرے ہوئے علامہ نے جواب دیا: ''مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔'' اقبال جو اسلام کے شیدائی تھے، جانتے تھے کہ ان کے اسلامی پاکستان کے خواب کی تعبیر قائداعظم ہی کے ہاتھوں ممکن تھی۔ ارسطو کو سکندراعظم کی پشت پر کھڑا ہونا ہی تھا۔

قائداعظم کے اسلامی جوہر کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے رتّی بائی سے شادی کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ پہلے اسلام قبول کرے۔ پھر سول میرج کے بجائے اپنا نکاح ایک ''مولوی'' سے پڑھوایا۔ قائداعظم نے اپنی اکلوتی بیٹی سے صرف اس لیے قطع تعلق کرلیا کہ اس نے ایک غیرمسلم سے شادی کر کے اسلام سے ناشائستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ قائد کے سوانح نگار سٹینلے ولپرٹ (Stanley Wolpert) انھیں ایک قدامت پسند انسان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ رتّی بیگم سے ان کی تفریق کی وجہ قائد کا روز بروز اسلام کی طرف رجحان تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قائداعظم نے مذہبی بنیادوں پر اپنی قومیت کے اظہار پر نہ صرف اصرار فرمایا اور سیکولر ہند سے اس وقت اپنی راہ جدا کر لی جب انھوں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی حالت زار کا ادراک کرلیا۔ اس سے وابستہ یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ اسلامی نظام کے بقا میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ دیکھ رہے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے یہ کہا کہ پاکستان اسلامی طرز حیات کی تجربہ گاہ ہوگا تو مسلمان دیوانہ واران کی آواز پر لپک پڑے۔

سیکولر حلقے نے مسلمانوں کے اس تاریخی رویے کو یوں نظرانداز کیا جیسے یہ کوئی امر واقعہ نہ تھا بلکہ کوئی اضافہ تھا۔ وہ یہ سب کچھ نگل گئے۔ ان کی یہ متشددانہ خواہش کہ کسی طرح مملکت پاکستان کو اس کے اسلامی تشخص سے محروم کر دیا جائے، انھیں ہر قسم کے جھوٹ اور مکر پر مسلسل مجبور کر رہی ہے۔ وہ قرآن، حدیث نبوی ﷺ اور پاکستان کی دستوری تاریخ کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے تو عاجز ہیں، کیونکہ ان ماخذوں میں انھیں کوئی مفید مطلب نکتہ ہاتھ نہیں آ رہا۔ آخری حربے کے طور پر صرف محمد علی جناح ہی کو سیکولر میک اَپ دے کر کچھ سند جواز حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہاں بھی سوائے گیارہ اگست **1947**ء کی اکلوتی تقریر کے، جسے ان لوگوں نے پوری بیدردی سے سیکولر پس منظر میں رکھ کر دکھانے کی کوشش کی، باقی کچھ بھی عام لوگوں کے سامنے لانے سے قاصر رہے۔ معمار پاکستان نے انھیں بہت بُری طرح مایوس کیا۔

مثلاً، وہ قائداعظم کو ایک ایسا آزاد خیال باور کراتے ہیں جس کے پیش نظر ایک لادین سیکولر ریاست تھی۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو دستور کا حوالہ دیتے ہیں اور مملکت پاکستان کے اسلامی جوہر پر زور دیتے ہیں، وہ سب ان کی نگاہ میں ''عقل و برہان کے دشمن'' ہیں۔ ہر طرح کی حسیات کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے ان لادینوں نے دستور اور اسلام کی بات کرنے والوں پر بہتان و دشنام کی بوچھاڑ کر دی کہ یہ ''جنونی'' سرپھرے ہیں، ''رجعت پسند'' ہیں اور ''ہٹ دھرم'' ہیں۔

لیکن خود یہ لبرل ازم (آزاد روی، روشن خیالی وغیرہ) کیا بلا ہے؟ جب یہ لوگ جناح صاحب پر لبرل ہونے کا ٹھپہ لگاتے ہیں، تو وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ وہ اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتے۔ لیکن جب تک لبرل ازم کی باقاعدہ تعریف متعین نہ کی جائے تو لفظ ''لبرل'' جیسا کہ یہ لبرل حضرات استعمال کرتے ہیں، محض ایک ڈھیلا ڈھالا اظہار رہے گا۔

یہ بات ایک رمزیہ مذاق سے کم نہیں لگتی، لیکن واقعہ یہی ہے کہ جب کل ہند مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا تو ہندوؤں کو اس کی ہجو میں رجعت پسندی کی پھبتی ہی سوجھی تھی۔ جواہر لال نہرو نے انڈین کانگریس کے روبرو اپنی

تقریر میں یہ کہا تھا کہ عام مسلمان آبادی رجعت پسند نہ تھی کیونکہ وہ کانگریس کی ہمنوا تھی۔نہرو کے بقول رجعت پسند سب کے سب مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔

30 مارچ 1941ء کی اشاعت میں کانگریس پارٹی کے اخبار میں ہندوؤں کی ذہنی ترجمانی کرتے ہوئے ایک مضمون چھپا، جس میں انہوں نے واشگاف کہا:''دو باتوں پر کوئی مصالحت ممکن نہیں۔ ملک کی ایسی تقسیم نا قابلِ قبول ہو گی جس سے جنونیوں (Fanatics) کے ارادوں کی تکمیل اور ان کے ذوق کی تشفی کا ساماں ہو۔''

قائداعظم نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن کے خطبہ صدارت میں مذکورہ بیان کا تعاقب کیا اور ہندو سیکولر چیخ و پکار کی حقیقت اپنے مشہور زمانہ اسلوب بیان سے کھول کر رکھ دی، جو پوری تحریک کے دوران ان کا امتیاز رہا۔ قائد کے الفاظ تھے:

❑ ''جب یہ لوگ تقسیم کا ذکر کرتے ہیں تو مسلمان کو جنونی بتاتے ہیں، لیکن جب یہ خود ہندوازم کی بات کرتے ہیں تو اپنے آپ کو لبرل اور قوم پرست کا نام دیتے ہیں۔''

فی الحقیقت برطانوی ہند میں یہ مسلم قومیت کا اسلامی چہرہ اور کردار ہی تھا، جس نے ہندو اور مسلمان میں مستقل جدائی ڈالی۔ قائداعظم، لالہ لاجپت رائے کے سی آر داس کے نام خط (دیکھیے اندرا پرکاش کی کتاب) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

❑ ''رائے کہتا ہے: 'میں نے گزشتہ چھ ماہ اپنا بہت سا وقت مسلم تاریخ اور مسلم قانون کے مطالعے میں صرف کیا، اور میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد نہ تو ممکن ہے اور نہ قابل عمل...... میرا خیال ہے ان کا مذہب ایسی کوشش پر موثر روک لگاتا ہے...... تمھیں میری حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر کچلو سے گفتگو یاد ہے، جو میں نے تمھیں کلکتہ میں سنائی تھی۔ ہندوستان میں حکیم اجمل خان سے زیادہ نفیس مسلمان کوئی نہیں، لیکن کیا کوئی ایک بھی ایسا مسلمان لیڈر موجود ہے جو قرآن کو پس پشت رکھ کر فیصلہ کر سکے؟ کاش میرا اسلامی قانون کا مطالعہ جو نتائج دے رہا ہے، وہ صحیح نہ ہوں۔''

یہاں پہنچ کر قائداعظم کا چہرہ ایک اندرونی تاثر سے جگمگا اٹھتا ہے۔ وہ ایک روشن چھپ ڈھب کے ساتھ اپنی بنی سنوری مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہیں اور ایک ڈرامائی

توقف کے بعد کہتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ رائے کا مطالعہ بالکل صحیح ہے۔ (محفل میں زوردار قہقہہ)''

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ اس تاریخی مکالمہ میں ہندو حضرات، قائداعظم کو الزام دیتے ہیں کہ وہ ''رجعت پسند'' تھے، کیونکہ وہ علاقے اور نسل کی بنیاد پر قائم قومیت کے لادین تصور کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

پھر یہ لبرل ازم ہے کیا، جس کی تعریف سیکولر کھل کر نہیں کرتے؟

''انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز'' میں گیدو دی روگیرو (Guido De Ruggiero) لبرل ازم کا تعارف یوں کراتا ہے:

- ''وہ گہرا پختہ رویہ جو پہلے سے طے کردہ مزعومات کی روشنی میں انسانی معاملات کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی معاشرہ کے مختلف النوع عقلی، اخلاقی، دینی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات کو مربوط دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔''

چنانچہ لبرل ازم کے سامنے اپنا ہی ایک سماج ہے، جس میں انسان خود ہی خیروشر کے درمیان ثالث اور حکم بنا بیٹھا ہوتا ہے، جبکہ مذہب اور اخلاقیات کو کنارے لگا کر غیر منفعل بنا دیا جاتا ہے۔ دی روگیرو بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

- ''ایسی کسی مداخلت خواہ وہ اخلاقیات کی طرف سے ہو یا مذہب کی طرف سے یا پھر عقل، سماجی، اقتصادی اور سیاسی دائروں میں ہو رہی ہو، لبرل ازم نے ہمیشہ اپنی فوجیں صف آرا رکھیں۔''

چنانچہ یہ لبرل اصطلاح کی تعریف نہیں بلکہ تحریف ہوگی کہ اسے ایک روشن خیال ذہن، ایک کھلے دل اور آزادی پسند روح ثابت کیا جائے۔ لفظ لبرل کے استعمال میں یہ تشکیلی انداز کچھ دکھانے سے زیادہ چھپانے کی کوشش ہوگی۔ ڈیوڈ سمتھ تو یہاں تک کہتا ہے:

- ''آزاد رَو اکثر مذہب (کے معاملے) میں غیر مقلد، بلکہ لادین اور متشکک (skeptics)، یہاں تک کہ مذہب کے دشمن واقع ہوئے ہیں۔''

کیا سیکولرازم اور لبرل ازم ایک ہی چیز ہیں؟ یہ دونوں باہم مختلف بھی ہو سکتے ہیں اور یکساں بھی، حالانکہ اختلاف محض گردان میں ہو گا۔ دونوں ہی مذہب کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں اور انسانی زندگی میں خدا کے مرکزی کردار کے منکر ہیں۔ دونوں کو اصرار ہے کہ وہی ایسے طریق ہائے حیات ہیں جن پر کوئی حرف گیری نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں یہ ہمیشہ سیکولر رواج اور مزاج رہا ہے کہ مذہب کو برداشت نہیں کرنا، بالخصوص جہاں مذہب پبلک معاملات میں کردار ادا کرنے اور خود ترجیحات متعین کرنے پر زور دیتا ہے۔ مغرب ہو یا مشرق، سیکولر ہر جگہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ مکالمہ کے در و بست وہ خود طے کریں گے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کا زاویۂ نظر بھی خود ہی تخلیق کرتے اور بتاتے رہتے ہیں، بلکہ ان کے عقیدہ و نظریہ کے اجزائے ترکیبی بھی طے کر دیتے ہیں۔ امریکی سکالر ایڈورڈ سعید جو خود بھی لبرل ہے، اس طرح کے رویوں کو زبردستی کی مشق کا نام دیتا ہے۔

روح قائد کو بے چین کرنے کے لیے یہ الزام عائد کر دینا کافی ہے کہ وہ سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو اپنی 25 جنوری 1948ء کی وہ تقریر ضرور دہراتے جو انھوں نے کراچی بار ایسوسی ایشن کے سامنے کی تھی۔ قائد نے کہا تھا:

- ''وہ ایسے لوگوں (سیکولر پڑھیے) کو سمجھ نہیں پائے، جو جان بوجھ کر فتنے کھڑے کرتے ہیں اور پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شرعی بنیادوں پر تشکیل نہیں دیا جائے گا۔''

یہ کہنے کے بعد اس خیال سے کہ کوئی ذرہ بھر شک باقی نہ رہے، قائد نے ایک حتمی بات کہی:

- ''اسلامی اصول حیات آج بھی ویسے ہی قابل عمل ہیں جیسے 1300 برس پہلے تھے۔''

قائد کا یہ خطاب گیارہ اگست کی تقریر کے بعد کا ہے۔ اس لیے سیکولر حضرات کے پاس اب دو ہی راستے ہیں:

یا تو اعلان کر دیں کہ جناح نے 11 اگست 1947ء سے پہلے یا بعد میں اسلامی پاکستان کے حق میں کوئی تقریر نہیں کی تھی۔

یا یہ مان لیں کہ قائد نے اسلامی پاکستان کا وعدہ تو کیا تھا، لیکن چونکہ گیارہ اگست والی تقریر ان کا آخری خطاب تھا، لہٰذا اس نے پہلی والی تقاریر پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔

پہلا رویہ تاریخ کے منہ پر کھلا جھوٹ ہوگا۔ دوسرا رویہ یہ اصول طے کرتا ہے کہ آخری بیان گزشتہ بیان کو منسوخ کر دیتا ہے۔ چنانچہ کیا سیکولر حضرات اپنے قائم کردہ معیار کی روشنی میں یہ ماننے پر تیار ہیں کہ جناح کی 25 جنوری 1948ء کی تقریر نے گیارہ اگست 1947ء کے بیان کو بے اثر بنا کر رکھ دیا ہے؟ بہتر ہوگا اگر یہ لوگ فیصلہ خود کر لیں۔

ڈاکٹر محمود عالم سدانہ

قائداعظم اور سیکولرازم

سیکولرازم ایک ایسی عبا ہے جو باہر سے بڑی دلکش، دلفریب، پرکشش، دل پذیر، پیام امن و امان اور راحت جاوداں نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام انسانیت ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ کوئی اونچ نیچ نہیں۔ نسل و رنگ کا کوئی امتیاز نہیں۔ یہ زمین اور دنیا جنت سے بھی بہتر ہے۔ جب ہم اس عبا کی اندرونی سطح پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مذہب، عقائد اور رسومات کے عکس اور تصاویر نظر آتی ہیں۔ یہ ظاہر و باطن کا تضاد پھر عملاً زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ یہ تضاد انسان کو مصلحت جو بنا دیتا ہے اور حقیقت سے دور لے جاتا ہے۔

ایسی دو عملی اور ذو معنی باتوں کے لیے بہترین لفظ ''منافقت'' ہے۔ ہر سیکولر شخص یا ریاست کی بنیاد منافقت پر ہوتی ہے۔ یہ عبا اس نے لوگوں کو دھوکے دینے کے لیے پہنی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ عوام میں اور خاص کر غیر مذہب والوں سے کہتے ہیں کہ ہم سب برابر ہیں۔ ہمارے اختلافات سیاسی یا اقتصادی ہو سکتے ہیں لیکن مذہبی نہیں۔ مذہب ہمارے نزدیک ایک ذاتی معاملہ ہے۔ کسی دوسرے مذہب والے کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ عملی زندگی میں اس سے بڑا فریب ہو ہی نہیں سکتا۔

جب قائداعظم کو ایک سیکولر سوچ کا شخص کہا جاتا ہے تو مجھے حیرانی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی میں کہیں منافقت کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ تو پھر بار بار ان پر الزام تراشی کیوں کی جاتی ہے؟ بعض لوگ بار بار قائد کو سیکولر ثابت کرنے یعنی ان کا اسلام سے ناتا منقطع کرنے پر کیوں بضد ہیں؟ جبکہ قائداعظم خود سیکولرازم کو کئی بار رد کر چکے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی دو اہم وجوہ نظر آتی ہیں۔

اوّل وہ لوگ جو دانشور ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کو کوئی مقام نہیں ملتا۔تو ایسے لوگ اکثر کسی عظیم شخصیت پر مختلف زاویوں سے تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ جب کوئی کسی بڑی شخصیت پر تنقید کرتا ہے تو لوگوں میں نقاد کے لیے تجسس پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون بڑا عالم فاضل شخص پیدا ہوا ہے جو اس بڑی شخصیت پر تنقید کر رہا ہے۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں وہ دانشوروں کی صف میں نمایاں نظر آنے لگتا ہے اور یہی اس کا قلیل المدت پروگرام ہوتا ہے۔

بعض لوگ کسی سسٹم کو ختم کرنے کے لیے سسٹم کی بانی شخصیت کے متعلق عوام میں شکوک پیدا کر کے عوام کو اس کے خلاف ابھار کر اس کے سسٹم کو منہدم کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان، انگریزوں، ہندوؤں اور یہودیوں کو اب تک ہضم نہیں ہوا۔ پاکستان کو ختم کرنا تمام ہندو لیڈروں کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔ انگریز اور یہودی بھی ہندو لیڈروں کے ہم خیال ہیں۔ پاکستان کی اساس اسلام ہے، نہ کہ کوئی جغرافیائی یا لسانی یا نسلی حدود۔ پاکستان کی بقا کے لیے جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ اسلام کی نظریاتی حدود کا قائم رہنا نہایت ضروری ہے۔

اب قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عوام جو قائد کو ایک سچا اور کھرا مسلمان سمجھتے تھے اور ہیں، وہ جو پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہتے تھے، وہ سب ایک ظاہری دعویٰ تھا۔ اس طرح سے وہ قائد کی شخصیت کو مشکوک بنا کر لوگوں کے دلوں سے ان کا احترام نکالنا چاہتے ہیں۔ اس وقت قائداعظم اور پاکستان ایک طرح سے لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اُن کی جنگی حکمتِ عملی کا حصہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ قائداعظم کی شخصیت کو مشکوک بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی پاکستان کے خلاف آدھی جنگ سر ہو جائے گی۔ ان کا اگلا قدم یہ ہوگا کہ پاکستان کے وجود کو بھی مشکوک بنا دیا جائے۔ اس کے لیے پھر وہ نفرت و عداوت کا ہتھیار استعمال کریں گے۔ عوام کی سوچوں میں لسانی، نسلی اور صوبائی تعصب کا زہر گھولیں گے۔ برادریوں اور فرقوں کو ہوا دے کر اسلام کے درس ''**انما المومنون اخوة**'' کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیں گے۔ اس طرح وہ پاکستان کو بھارت کا حصہ بنالیں گے۔

آزادی کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ ''ہم نے تو آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی زمین کا ایک ٹکڑا وقتی طور پر علیحدہ کر دیا ہے''۔

بھارت کی ہندو قوم اور ہمارے بعض بھارت نواز اور بھارت کے مراعات یافتہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بھارت میں سیکولرازم کاغذوں میں ضرور ہے لیکن عملی زندگی میں سیکولرازم نام کی کوئی چیز نہیں۔ تاریخ کے اصولوں کے مطابق تہذیب و آداب اور مذہبی بالادستی جمہوریت میں اکثریتی قوم کے مذہب کے مطابق ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد جہاں بھی ممکن ہو سکا، اُردو اور انگریزی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ کا استعمال شروع کر دیا۔ جیسے نہرو نے مسٹر اور جناب کی جگہ ''شری'' کے لفظ کا استعمال شروع کر دیا۔ عام زبان میں سنسکرت کے الفاظ جو کبھی پہلے عام استعمال میں نہیں آئے تھے، ان کا استعمال شروع کر دیا۔ جیسے افتتاح کے بدل میں ''مہورت'' اور قومی گیت کے بجائے ''بندے ماترم'' جو مسلمانوں کے عقیدہ کے بالکل اُلٹ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہے۔ ہر چیز کا افتتاح تمام ہندو مذہبی رسومات سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سیکولرازم ایسے ہی ہے جیسے ایک مندر کے باہر یہ بورڈ لگا دیا جائے ''یہ سیکولر مندر ہے''۔ کانگریس نے دوقومی نظریہ کو رد کر کے ایک قوم اور ایک سیکولر جماعت کا دعویٰ کرنے کے باوجود کبھی بھی ہندو امیدوار اسمبلی کو مسلم اکثریتی علاقے میں اور مسلم امیدوار اسمبلی کو ہندو اکثریتی علاقہ میں الیکشن کے لیے نامزد نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کر سکے گی۔

نہرو خود کو بڑے سیکولر گنتے تھے اور مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لیکن ان کی وصیت کے مطابق ان کی ارتھی پورے ہندو مذہبی آداب اور رسومات کے مطابق جلائی گئی تھی۔ صندل کی لکڑی ہندو مذہب میں مقدس اور بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چتا کو آگ لگانے سے پہلے صندل کی لکڑی رکھی جاتی ہے۔ نہرو کی وصیت کے مطابق ان کی چتا ساری کی ساری صندل کی لکڑی سے تیار کی گئی تھی۔ آگ لانے کے لیے تیل کے بجائے منوں گھی کا استعمال کیا گیا۔ چتا کے پھول گنگا کے سنگھم پر رکھے گئے۔ ہم گاندھی جی کی زندگی کا بھی مطالعہ کرتے ہیں تو حالات نہرو کی زندگی سے بہت مماثلت رکھتے

ہیں۔ ظاہر اور باطن کا تضاد ہر کانگریسی میں پایا جاتا ہے۔ ہندومہاسبھا اور کانگریسی لیڈروں کی سوچ اور عمل میں یہ فرق تھا کہ ایک مہاسبھائی لیڈر جو بات اور کام گھر کی چھت پر بآواز بلند کرتا ہے، کانگریسی وہ بات اور کام گھر کے آخری کمرے میں بیٹھ کر کرتا ہے۔ گاندھی جی کے رویہ میں دو رُخی صورت نمایاں نظر آتی ہے۔ قائداعظم نے گاندھی جی سے کہا تھا:

❑ ’’جیسے میں کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں اور میں اُن کا لیڈر ہوں، اسی طرح سے آپ بھی کہہ دیں کہ ہندو ایک قوم ہے اور آپ اس کے لیڈر ہیں۔ دونوں قوموں کو اپنا اپنا حق ملنا چاہیے۔ اس طرح کسی کو کوئی گلہ نہیں رہے گی‘‘۔

قائداعظم قرآنی نکتہ نظر سے بات کر رہے تھے کہ ہر قوم کا مذہب اپنا اپنا ہونا چاہیے۔ ہر قوم کو پورا پورا حق اور پورا پورا تحفظ ملنا چاہیے۔ ہندوستان میں اگر مسلمان اکثریت میں ہوتے اور ہندو اقلیت میں ہوتے تو گاندھی جی یک قومی نظریہ پیش کرتے یا دو قومی نظریہ؟ قائداعظم سیکولرازم کے موہوم فلسفہ کے بجائے حقیقت پر مبنی شفاف دو قومی نظریہ کے مطابق ہر قوم کو اپنا اپنا حق ملنے کے داعی تھے۔

قائد پر سیکولرازم کے الزام کی تردید کے لیے قائداعظم کے ہی کچھ بیانات تحریر کر رہا ہوں تاکہ قاری کے دل سے وہ شکوک و شبہات نکل جائیں جو اس وقت مخالفین پاکستان اپنے زہر آلود پروپیگنڈا سے عوام میں پھیلا رہے ہیں۔

اگست **1941**ء...... میں جب قائد حیدر آباد دکن میں تھے تو بعض نوجوانوں نے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے آپ سے سوالات کیے تو قائداعظم نے جواب میں فرمایا:

❑ ’’جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب

کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے''۔ (حیات قائداعظم، ص 427)

- قائداعظمؒ 1942ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کے سلسلے میں الٰہ آباد میں نواب سر محمد یوسف کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وکلا کا ایک وفد ملاقات کے لیے آیا۔ ارکان وفد میں سے ایک وکیل نے قائداعظمؒ سے پوچھا کہ ''پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ کیا پاکستان کا دستور آپ بنائیں گے؟'' قائداعظمؒ نے فرمایا:
- ''پاکستان کا دستور بنانے والا میں کون ہوں؟ پاکستان کا دستور تو تیرہ سو سال پہلے بن گیا تھا'' ایسا ہی ایک بیان 27 جولائی 1944ء کو دیا جب وہ کشمیر سے راولپنڈی پہنچے۔ قائداعظمؒ کا رات کا کھانا ڈھیری حسن آباد کے عبدالغنی ٹھیکیدار کے ہاں تھا۔ کھانے کی میز پر راولپنڈی مسلم لیگ کے صدر بیرسٹر محمد جان نے قائداعظمؒ سے پوچھا ''پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟'' قائداعظمؒ نے جواب دیا:

''یہ تو اس وقت کی دستور ساز اسمبلی کا کام ہوگا البتہ ہمارے پاس قرآن مجید کی صورت میں تیرہ سو سال پہلے کا دستور موجود ہے''۔

1942ء...... میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ وہاں آئین کے متعلق قرارداد کے الفاظ مندرجہ ذیل تھے:

- ''پاکستان میں جو آئین ہوگا وہ قرآن اور سنت کے مطابق ہوگا اور رائج الوقت قوانین میں جلد شریعت کے مطابق تبدیلی کی جائے گی''۔

تمام حاضرین نے اس تجویز کی حمایت کی۔ آخر میں قائداعظم نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا:

- ''جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان کے دل کی پکار ہے اور پاکستان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ پاکستان میں اللہ کے دین کا نظام قائم ہو''۔

26 نومبر 1946ء......تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن سید بدرالدین نے قائداعظم سے پاکستان کے نظریاتی تشخص کے حوالے سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

❑ ''میرا ایمان ہے کہ قرآن وسنت کے زندہ جاوید قانون پر ریاست پاکستان دنیا کی بہترین اور مثالی ریاست ثابت ہوگی۔ مجھے اقبال سے پورا اتفاق ہے کہ دنیا کے تمام مسائل کا حل اسلام سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔ ان شاء اللہ پاکستان کے نظام حکومت کے بنیاد ''لا الہ الا اللہ'' ہوگی اور یہ ایک فلاحی ومثالی ریاست ہوگی''۔

1944ء...... میں حیدر آباد دکن میں اپنے ایک انٹرویو میں پاکستان کے مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہت کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے''۔

19 مارچ 1944ء...... لاہور میں مسلم طلبا کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے علی الاعلان فرمایا تھا:

❑ ''اشترا کیو! ہٹو...... دور ہٹو۔تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب مسلمان ایسا نہیں جیسا کہ پانچ یا سات یا دس سال پیشتر تھا۔ جب تم لوگ اسے بے وقوف بنا سکتے تھے بلکہ بے وقوف بنانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔اگر تم نے وہ کھیل کھیلنے کی کوشش کی تو یہ تم پر اسی طرح واپس آئے گا جس طرح گنبد کی صدا واپس آتی ہے۔...... اشترا کی سمجھتے ہیں کہ ہم بیوقوف ہیں۔ اُن کا اِس طرح سے سوچنا کسی حد تک جائز ہے لیکن اب اُن کی سوچ غلط ہو چکی ہے۔ کیونکہ گذشتہ پانچ، سات یا دس سال والا مسلمان اب بدل چکا ہے۔ اور اب اشترا کی ہمیں بیوقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ دور

ہٹو...... دور ہٹو...... میں کہتا ہوں اشرا کیو...... دور ہٹو۔ ہمیں ہلالی پرچم کے علاوہ اور کوئی پرچم نہیں چاہیے۔ اسلام ہمارا راہنما ہے جو ہماری زندگی کا ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ ہمیں اور کوئی سرخ یا زرد پرچم نہیں چاہیے۔ ہمیں کوئی اور فکر (ازم) مطلوب اور مقصود نہیں نہ اشتمالیت نہ اشترا کیت۔ (سوشلزم یا نیشنل سوشلزم کی ضرورت نہیں)

(قائداعظم: تقاریر و بیانات جلد سوم از اقبال احمد صدیقی ص **284**)

اکتوبر **1947**ء...... میں قیام پاکستان کے بعد نئی مملکت کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے ایک خطاب میں قائداعظمؒ نے ارشاد فرمایا:

❑ ''پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل و کرم سے ایک حقیقت ثانیہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام ہی مقصود نہیں تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایسی مملکت مل جائے جس میں آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی اسلامی زندگی اور ثقافت کے مطابق نشو ونما پا سکیں اور اسلام کے عدل و عمرانی اصولوں پر آزادانہ عمل کر سکیں''۔

اب قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ سیکولر تھے یا اسلام پسند؟

بغض بد فطرت کی فطرت سے صنم جاتا نہیں
دل اگر گمراہ ہو تو روشنی پاتا نہیں
پہن لیتے ہیں تعصب کی جو عینک دوستو
روزِ روشن میں بھی سچ اُن کو نظر آتا نہیں
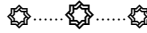
مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

قائداعظم نے پاکستان اسلام کے لیے بنایا

اصولی سوالات پر بحث کرنے سے پہلے میں اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں جو قائداعظم کی اس تقریر سے پیدا ہوئی جو انھوں نے 11/اگست 1947ء کو پاکستان کی مجلس دستورساز میں کی تھی، اس تقریر سے تین نتیجے نکالے جاتے ہیں:

اول: یہ کہ قائداعظم نے اس تقریر میں ایک ایسی ''پاکستانی قومیت'' کی بنیاد ڈالنے کا اعلان کیا ہے جو وطنیت پر مبنی ہو اور جس میں پاکستان کے ہندو، مسلمان، عیسائی وغیرہ سب ایک قوم ہوں۔

دوم: یہ کہ مرحوم نے اس تقریر میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ پاکستان کا دستور غیر مذہبی نوعیت کا یعنی سیکولر طرز کا ہوگا۔

سوم: یہ کہ مرحوم کی اس تقریر کو کوئی ایسی آئینی حیثیت حاصل ہے، جس کی وجہ سے پاکستان کے باشندے یا اس کے دستور ساز اب ان کے کھینچے ہوئے خطوط سے ہٹ نہیں سکتے۔

میرے نزدیک یہ تینوں نکات جو اس تقریر سے بطور نتیجہ نکالے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہیں اور اپنی اس رائے کے لیے میرے دلائل حسب ذیل ہیں:

(الف): قائداعظم کی اس تقریر کے الفاظ خواہ بظاہر پہلے اور دوسرے مفہوم کے حامل ہوں مگر ہمارے لیے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کا منشا بھی حقیقت میں وہی تھا، جو ان کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، اس لیے کہ ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے، ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے اور

ان ہی اصولوں کے قائل ہو گئے ہوں گے جن کے خلاف انھوں نے اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر جنگ کی تھی، نیز ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ وہ قیام پاکستان کے پہلے ہی دن یکا یک اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے ہوں گے جو انھوں نے بار بار صاف اور صریح الفاظ میں اپنی قوم سے کیے تھے اور جن کے اعتماد ہی پر قوم ان کو اپنا لیڈر مان کر اپنی جان و مال ان کے اشاروں پر قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئی تھی، پھر ہمارے لیے یہ ماننا بھی ممکن نہیں ہے کہ قائداعظم ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے کہ 11 اگست کو ایک اعلان کیا اور پھر اس کے بعد بار بار اس کے خلاف باتوں کا مسلسل پبلک کو یقین دلاتے رہیں، اس لیے ہمارے نزدیک ان کی مذکورہ بالا تقریر کو، ان کے اگلے اور پچھلے ارشادات کی روشنی میں سمجھنا زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ ہم اس کا کوئی ایسا مفہوم لیں جو ان کی تمام باتوں کے خلاف پڑتا ہے جو انھوں نے اس سے پہلے فرمائیں اور اس کے بعد بھی فرماتے رہے۔

(ب): سب کو معلوم ہے کہ قائداعظم کی کانگریس سے لڑائی تھی ہی دو قومی نظریے کی بنیاد پر۔ 10 اگست 1947ء تک ان کا مستقل نظریہ یہ تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ وطنی قومیت نہیں بنا سکتے۔ اس کے متعلق ان کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں سے صرف ایک تقریر کا ''اقتباس'' میں یہاں نقل کروں گا، جو 15 ستمبر 1944ء کو گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت کے سلسلے میں لکھی تھی۔

[قائداعظم اور خان لیاقت علی خان کی تحریروں تقریروں سے اقتباسات اور عدالت میں پیش کردہ بیان انگریزی میں تھے، یہاں اشاعت کی سہولت کے لیے ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔]

❑ ''ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہندو اور مسلم دو بڑی قومیں ہیں جو قوم کی ہر تعریف اور معیار پر پورا اترتی ہیں۔ ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ مزید برآں ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب و تمدن، زبان و ادب،

آرٹ، فن تعمیر، احساس و اقدار و تناسب، قانونی احکام و اخلاقی ضوابط، رسم و رواج، تقویم، (کیلنڈر) تاریخ اور روایات، رجحانات اور عزائم کی مالک ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک امتیازی زاویہ نگاہ ہے اور قانون بین الاقوامی کی ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں۔''

(''مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں'' بزبان انگریزی، مرتبہ جمیل الدین احمد، ص 181)

اب کیا ہم یہ باور کر لیں کہ 11 اگست 1947ء کو یک لخت وہ تمام خصوصیات مٹ گئیں جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے جدا کر کے ایک الگ قوم بناتی تھیں اور یکا یک ایک ایسی نئی قومیت کے اسباب فراہم ہو گئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا جذب ہونا ممکن ہو گیا؟ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو قائداعظم کو اس الزام سے نہیں بچایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک با اصول آدمی نہ تھے، بلکہ محض سیاسی مصلحتوں کی خاطر اصول بناتے اور بدلتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی روح کو ایسے الزامات کا تحفہ پیش کرنے کے لیے میں تو کسی طرح تیار نہیں ہو سکتا۔

(ج): بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قائداعظم مسلمانوں سے ایک اسلامی ریاست کا وعدہ کرتے رہے تھے اور اس کے بعد بھی وہ اس وعدے کو دہراتے رہے، پہلے کے وعدوں میں سے صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

21 نومبر 1945ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

- ''مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں جہاں وہ خود اپنے ضابطہ حیات، اپنی تہذیبی ارتقا، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔''

(حوالہ مذکورہ، ص 437)

پھر اسی کانفرنس میں انھوں نے 24 نومبر کو تقریر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار فرمایا:

- ''ہمارا دین، ہماری تہذیب، ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔ (حوالہ مذکورہ صفحہ 422)

پھر اسی زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

❑ ''لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت کر سکیں۔ (حوالہ نمبر مذکورہ، صفحہ 446)

11 اگست والی تقریر سے صرف ایک مہینہ بارہ دن پہلے 29 جون 1947ء کو قائداعظم نے سرحد کے حالات پر ایک بیان دیتے ہوئے لکھا:

❑ ''مگر خان برادران نے اپنے بیانات میں اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کیا ہے کہ کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی، یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔''

(ڈان 30 جون 1947ء)

دوسری طرف 11 اگست 1947ء کے بعد جو ارشادات قائداعظم کی زبان سے سنے گئے اور ان کے معمر ترین رفقا نے ان کی جو ترجمانی بار بار خود ان کی زندگی میں کی اور جس کی کوئی تردید ان کی جانب سے نہ ہوئی، ان کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''پشاور 14 جنوری 1948ء: پاکستان کے وزیراعظم مسٹر لیاقت علی خان نے اتحاد یکجہتی کے لیے سرحد کے لوگوں سے اپیل کرتے ہوئے قائداعظم کے ان ارشادات کا پھر اعادہ کیا کہ پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہوگا، انھوں نے فرمایا کہ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہوگا اور ہم دنیا کو دکھائیں گے کہ 13 سو برس پرانے اسلامی اصول ابھی تک کارآمد ہیں۔'' (پاکستان ٹائمز، 15/جنوری 1948ء)

اور پھر 11 اگست والی تقریر کے ساڑھے چار مہینے بعد قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے ایک اعزازی دعوت میں جو انھیں کراچی بار ایسوسی ایشن کی طرف سے گزشتہ شام دی گئی، تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ

پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف، ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ان کو کہہ لینے دیجیے۔ ہم دستور پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ۔"

(پاکستان ٹائمز، 27/جنوری 1948ء)

"راولپنڈی، 5 اپریل، مسٹر لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان نے آج راولپنڈی میں اعلان کیا کہ پاکستان کا آئندہ دستور قرآن مجید کے احکام پر مبنی ہو گا، انھوں نے فرمایا کہ قائداعظم اور ان کے رفقا کی دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کی نشوونما ایک ایسی مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو جو اپنے باشندوں کو عدل و انصاف کی ضمانت دے سکے۔" (پاکستان ٹائمز، 7 اپریل 1948ء)

ان صاف اور صریح بیانات کی موجودگی میں قائداعظم کی 11/اگست والی تقریر کا ایک ایسا مفہوم نکالنا جو ان کے تمام اگلے پچھلے ارشادات کے خلاف ہو، مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

(ر): علاوہ ازیں اگر قائداعظم کی اس تقریر کو اس کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم میں بھی لیا جائے تو ہمیں جذبات سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ غور کرنا چاہیے کہ ان کے ملفوظات کی آئینی حیثیت کیا ہے، انھوں نے یہ تقریر خواہ صدر مجلس دستور ساز کی حیثیت سے کی ہو یا گورنر جنرل کی حیثیت سے، بہرحال کسی حیثیت میں بھی دستور ساز ایک شاہانہ اختیارات رکھنے والے ادارے (Sovereign Body) کو اس امر کا پابند نہیں کر

سکتے تھے کہ وہ دستور انھی خطوط پر بنائے جو وہ کھینچ دیں۔ رہی قوم، تو اس نے مرحوم کو اس لیے اپنا لیڈر مانا تھا کہ وہ اس کے قومی عزائم اور مقاصد پورے کرنے میں اس کی راہنمائی کریں، نہ اس لیے کہ کامیابی کے پہلے ہی روز وہ اس نصب العین کی رسم تجہیز و تکفین ادا کر دیں جس کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں، عزتیں اور جائیدادیں قربان کی تھیں، یہ بات سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جو بات اگست **1947**ء میں کہی گئی تھی وہ اگر کہیں مارچ **1940**ء میں کہہ دی جاتی تو پاکستان کا نعرہ دس کروڑ تو کیا دس ہزار مسلمانوں کو بھی جمع نہ کر سکتا تھا۔

عظیم سرور

11 اگست 1947ء کو دنیا کی صورت حال

11 اگست 1947ء کو اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کے قیام کی نوید دی جا رہی تھی۔ پوری دنیا کی نظریں اس نئے ابھرنے والے ملک پر لگی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں اس کے خلاف مختلف قسم کا پروپیگنڈا بھی ہو رہا تھا۔ دنیا کی طاقتیں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ یہ ملک کیسا ہوگا اور اسلام کے نام پر بننے والی مملکت میں وہاں کے لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا؟ اس موقع پر قائداعظمؒ محمد علی جناح نے اپنی تقریر میں دنیا کو اسلام کے اصولوں کے مطابق تشکیل دیئے جانے والے معاشرے کے بارے میں بتایا کہ پاکستان میں ہر شخص کو اس کے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہو گی۔ پاکستان کے ہر باشندے کو معاشرتی زندگی میں برابر کا درجہ دیا جائے گا۔ حکومت کی نظر میں سب کے شہری حقوق مساوی ہوں گے۔ قائداعظمؒ نے پاکستان کے شہریوں کے برابری کے حقوق کی بات کر کے بالواسطہ طور پر دنیا کے تمام براعظموں میں واقع ملکوں کے شہریوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک پر روشنی ڈالی تھی۔ انھوں نے واضح کیا کہ پاکستان چونکہ اسلامی ملک ہوگا، اس لیے یہاں انسانوں میں رنگ، نسل اور ذات کی بنا پر کوئی تفریق نہ ہوگی۔ اگست 1947ء کو دنیا کے ایک بڑے ملک امریکہ کی صورت حال یہ تھی کہ وہاں گورے اور کالے برابر نہ سمجھے جاتے تھے۔ گوروں اور کالوں کے اسکول الگ الگ تھے، اسپتال الگ تھے۔ گورے اور کالے مسافروں کے لیے بسیں الگ تھیں۔ گورے لوگوں کے پارک میں کالے رنگ والا آدمی نہیں جا سکتا تھا۔ گوروں اور کالوں کے چرچ الگ تھے۔ ملازمتوں میں بھی تفریق کی جاتی تھی۔ ریستورانوں میں

بھی یہی تفریق تھی۔ امریکہ میں غلامی کو ختم کرنے کا قانون صدر ابراہم لنکن کے زمانے میں منظور ہو گیا تھا لیکن اس قانون کو منظور کرانے کے جرم میں لنکن کو قتل کر دیا گیا۔ یہ قانون تو منظور ہو گیا تھا لیکن اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا پھر جب جان کینیڈی نے اس قانون پر عملدرآمد کرا دیا تو اس کا انجام بھی لنکن جیسا کیا گیا۔ بہرحال 1960ء کی دہائی سے امریکہ میں گورے اور کالے کی تفریق ختم ہوئی۔ یہ تو بات ہوئی براعظم امریکہ کی۔ اب براعظم افریقہ کے ملکوں میں ایک ملک جنوبی افریقہ کی صورتِ حال اور بھی بری تھی۔ یہاں گوروں اور کالوں کے لیے واضح طور پر قانون نافذ تھے۔ شہروں میں صرف سفید فام لوگ رہ سکتے تھے۔ کالی رنگت والے لوگوں کے لیے شہر سے باہر بستیاں تھیں جن کو ٹاؤن شپ کہا جاتا ہے یا وہ دیہات میں رہتے تھے۔ گورے لوگوں کی بس میں کوئی سیاہ فام سفر نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی سیاہ فام ریل کے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ گاندھی جی اپنے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے تھے، ان کو ایک گورے مسافر نے زبردستی ڈبے سے باہر نکلوا دیا تھا۔ کسی سیاہ فام کو کرکٹ میچ دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ٹیسٹ میچ کے دنوں میں اسٹیڈیم کے آس پاس کے علاقے میں کالوں کے لیے کرفیو نافذ ہوتا تھا۔ وہ اسٹیڈیم میں اس لیے نہیں آ سکتے تھے کہ وہ کسی بھی جگہ بیٹھ کر میچ دیکھیں گے تو گوروں کی برابری ہو جائے گی۔ سیاہ فام لوگ شہروں میں صرف دن کے وقت آ سکتے تھے، شام ہونے سے پہلے ان کو شہر سے نکل جانا ہوتا تھا، دوسری صورت میں کسی بھی شخص کو ان کو گولی مارنے کی آزادی تھی۔

ایک اور براعظم آسٹریلیا میں سیاہ فام لوگوں کو، جنھوں نے یورپ سے آ کر اس براعظم میں رہائش اختیار کی تھی، یہاں کے اصل باشندوں جن کو ''ابریجنی'' (Aborigine) کہا جاتا تھا، کو گولی مارنے کی عام اجازت تھی۔ اصل مقصد اس سرزمین کے اصل باشندوں کو ختم کرنا تھا اور لوگ تفریحاً اور اپنا نشانہ پکا کرنے کے لیے کئی کئی ابریجینز کو مار دیتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس زندہ رہنے کا حق نہ تھا، معاشرتی حقوق تو بہت بعد میں آتے تھے۔ برطانیہ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے درمیان

تفریق عام تھی۔ آئر لینڈ کے کیتھولک لوگوں کو اپنی عبادات کے سلسلے میں پُر تشدد واقعات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستان جس کی تقسیم کے بعد پاکستان قائم ہو رہا تھا، ذات پات کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انسانوں کو مساوات کے بجائے چار درجوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اونچی ذات اور نچلی ذات والوں کے کنویں الگ تھے۔ اگر کوئی ہریجن کسی اونچی ذات والے کے کنویں سے پانی لے لیتا تو اس کو زندہ جلا دیا جاتا۔ نچلی ذات والے کے سائے کو بھی ناپاک سمجھا جاتا۔ اگر اونچی ذات والے پر راہ چلتے نچلی ذات کے انسان کا سایہ بھی پڑ جاتا تو اونچی ذات والا غسل کر کے اپنا بدن پاک کرتا۔ نچلی ذات والے کے مندر الگ۔ وہ اونچی ذات والے کے ساتھ ہاتھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ ریلوے سٹیشنوں پر مختلف ذات والوں کے پانی کے مٹکے الگ الگ تھے اور ان پر واضح طور پر لکھا ہوتا تھا کہ یہ پانی کون پی سکتا ہے اور کون نہیں پی سکتا۔ یہ لوگ اپنے مذہبی تہوار تک ایک ساتھ نہیں منا سکتے تھے، اسی طرح معاشرے کے کسی مقام پر ان کو برابری حاصل نہ تھی۔

یہ تھی 11 اگست 1947ء کو دنیا کی صورتِ حال۔ دنیا میں اسلام کے نام پر ایک مملکت قائم ہو رہی تھی اور دنیا کو پیغمبر اسلام ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع اور میثاق مدینہ کی روشنی میں بتانا تھا کہ پاکستان میں تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دیا جائے گا۔ ہر فرد کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور معاشرے میں اس کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ اسکول، اسپتال، پارک، ہوٹل، بس یا اسٹیڈیم میں کسی سے نہیں پوچھا جائے گا کہ تم کون ہو؟ رنگ اور نسل کی بنیاد پر تفریق کا تصور بھی نہ ہوگا۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں وہ جملے ادا کئے جو اب بھی کئی دلوں میں کھٹکتے ہیں۔

۞……۞……۞

ذوالفقار احمد چیمہ

بانیِ پاکستان اور ان کی 11 اگست کی تقریر

اپنے عشرت کدوں کے اندر ہی نہیں، باہر بھی ہر جگہ موج مستی اور شراب و شباب سے بھرپور ایک بے مہار (unchecked) زندگی کے خواہشمند خواتین و حضرات اسلام کے تعزیری قوانین سے خوفزدہ ہیں۔ اس لیے دین سے بغض اور عناد رکھتے ہیں اور بانیِ پاکستان پر بھی اپنی سوچ کا ملمع چڑھانا چاہتے ہیں مگر تاریخ ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ حقائق ان کی خواہشات کے برعکس ہیں۔

انگلستان سے پڑھے ہوئے جدید سوچ رکھنے والے، انگریزی وضع قطع کے، اجلے کردار کے ممتاز وکیل محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کی انتھک کوششیں کیں۔ انھی کوششوں کے دوران اسے ہندو ذہنیت کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا تو اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ مایوس ہو کر لندن چلا گیا۔ اگر وہ دین سے لاتعلق ہوتا تو علامہ اقبالؒ کے خطوط کے جواب میں صاف کہہ دیتا کہ ''میں سیکولر ہوں، سیکولر اور لبرل پورے معاشرے کی بات کرتے ہیں وہ ایک مذہبی کمیونٹی کے ساتھ اپنے آپ کو **identify** نہیں کرتے''۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ کسی مفاد اور منافقت سے بہت بلند تھا، اس لیے پوری طرح سوچ سمجھ کر اس نے مکمل یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کیا اور ہندوستان واپس آ کر اسلامی نظریۂ حیات کے پیروکاروں کے ساتھ ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور ان کی راہنمائی کا پرچم اُٹھالیا۔

جواہر لال نہرو سوشلزم سے متاثر اور سیکولرازم کا پرچارک تھا۔ قائداعظم نے اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی سیکولرازم کا لفظ نہیں بولا۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ

میں انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، میں پسے ہوئے طبقے کی راہنمائی کر رہا ہوں یا میں Have Nots کے حقوق کے لیے نکلا ہوں۔ بہت واضح اور غیر مبہم انداز میں وہ دین اسلام کے پیروکاروں یعنی مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہوئے، Communal ہونے کا الزام کا سامنا کیا مگر آخر دم تک علی الاعلان صرف اور صرف مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کیا اور انھی کی راہنمائی کرتے ہوئے کسی ڈر، خوف اور احساسِ کمتری کے بغیر، پورے اطمینان قلب اور خوداعتمادی کے ساتھ!......

ہمارے ملک کا دین بیزار طبقہ (جس کی تعداد پورے ملک میں بہت کم مگر برقی میڈیا پر بہت زیادہ ہے۔ اپنے کوٹے سے کہیں زیادہ) اپنی سوچ کے حق میں قائدؒ کی کسی تقریر یا بیان سے سند ڈھونڈتا رہا مگر ان کی ہزار ہا تقریروں میں سے کچھ نہ ڈھونڈ سکا۔ بالآخر انھیں 11 اگست 1947ء کی تقریر سے دو یا تین فقرے نظر آ گئے جنھیں سیاق وسباق کے بغیر اٹھا لیا اور پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ بانی پاکستان سیکولر تھے اور ان کے خیال میں مذہب کا ریاستی امور سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ فقرے کس پس منظر میں کہے گئے، قائداعظم کے ذہن میں کیا تھا، یہ جاننا بہت ضروری ہے۔

برصغیر کی تقسیم کا اعلان ہونے کے فوراً بعد اگست سے پہلے ہی بنگال اور پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے تھے۔ اپنے خوابوں کی جنت...... پاکستان تک پہنچنے کے لیے لاکھوں مسلمان ہندوستان سے پاکستان کی جانب چل پڑے تھے۔ ان میں سے ہزاروں کو راستے میں شہید کر دیا گیا۔ درندگی اور شیطانیت کے ان واقعات کی خبریں اس طرف پہنچیں تو یہاں بھی ہندوؤں اور سکھوں پر حملے شروع ہو گئے...... یہ خبریں سن کر قائداعظم بہت افسردہ اور مضطرب تھے۔ مس فاطمہ جناح کے بقول ہندوستان میں مسلمانوں اور پاکستان میں غیر مسلموں کی جان و مال کے بارے میں قائد بے حد پریشان تھے اور اس کے ذکر سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ انھیں اس بات پر بجا طور پر بہت تشویش تھی کہ عدم تحفظ کے باعث ہندو اور سکھ پاکستان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ لہٰذا نئے ملک کے حکمران کی حیثیت سے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ

مذہبی بنیاد پر پھوٹنے والے فسادات کو روکا جائے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشیدگی کو کم کیا جائے اور پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کو یہیں رہنے پر آمادہ کیا جائے اور اس کے لیے انھیں یقین دلایا جائے کہ انھیں یہاں تحفظ ملے گا اور وہ نئے ملک میں کمتر حیثیت سے نہیں، برابر کے شہریوں کی طرح رہیں گے۔ اس تقریر میں قائد اعظم نے نئے ملک کے لیے اپنی ترجیحات کا ذکر کیا اور ان تمام برائیوں کے خاتمے پر زور دیا جن کے باعث بعد میں قومی ادارے برباد ہوئے۔ اُس وقت بھی قائدؒ نے سب سے پہلے امن وامان کی بحالی اور اس کے فوراً بعد رشوت خوری اور کرپشن کو زہر قرار دے کر اس کے خاتمے پر زور دیا، اس کے بعد بلیک مارکیٹنگ کو ایک سنگین جرم قرار دیا۔ قائد نے اقربا پروری (Nepotism) کو بھی لعنت قرار دیتے ہوئے اس سے اجتناب برتنے کی ہدایت کی اور اس کے بعد قائدؒ اقلیتوں کے خدشات دور کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مسئلے کا بڑے منطقی انداز میں تجزیہ کیا اور ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر باہمی تعاون اور رواداری پر زور دیا۔ ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے برطانیہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے خونی جھگڑوں کی مثال دی اور بتایا کہ وہ کشیدگی قصۂ ماضی بن چکی ہے اور جس طرح برطانیہ کے شہری اب کیتھولک یا پروٹسٹنٹ نہیں، مساوی حقوق رکھنے والے صرف برطانوی شہری ہیں، اسی طرح یہاں بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ صرف اور صرف پاکستانی شہری بن جائیں گے۔ اقلیتوں کو تحفظ کی یقین دہانی اور reassurance کے لیے قائدؒ نے انھیں یقین دلایا کہ آپ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہوں گے۔ اس وقت چونکہ کشیدگی کی فضا ہے، اس لیے ہندو مسلم کی تقسیم نمایاں ہے مگر یہ کشیدگی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی پھر آپ کی پہچان آپ کے عقیدے کی بنا پر نہیں بلکہ صرف پاکستان کے شہری کی حیثیت سے ہوگی۔

قائد اعظمؒ کے واضح نظریات کے پیشِ نظر کئی لوگوں نے اس تقریر کو اپنے نظریات اور سیاسی جدوجہد سے انحراف بھی کہا، ان کی آٹو بائیوگرافی لکھنے والے مورخ

سٹینلے وولپرٹ نے اسے **Reversal** قرار دیا۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

یہ تقریر وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ نئے ملک کے حکمران پر اقلیتوں کے خدشات دور کرنے کے لیے ایسی یقین دہانی کرانا لازم تھا۔ یہ ان کا فرض تھا، انھیں ایسا ہی کہنا چاہیے تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس تقریر کو بجا طور پر میثاقِ مدینہ کی سپرٹ کے مطابق قرار دیا۔

قائداعظمؒ پاکستان میں بلاشبہ تھیوکریسی نہیں چاہتے تھے، اسلام میں تو ویسے بھی ملائیت یا انتہا پسندی نہیں، توازن ہے مگر قائدؒ نے سیکڑوں مرتبہ اس عزم کا اظہار کیا کہ ''پاکستان کا نظام، اسلام کے سماجی انصاف کے نظریئے کے مطابق تشکیل دیا جائے گا''۔ اور یہ تو ان کے دشمن بھی مانتے ہیں کہ وہ منافقت سے بہت بلند تھے اور وہی کہتے تھے جسے صحیح سمجھتے تھے۔ بانیٔ پاکستان ٹی وی پر بیٹھے ہوئے حضرات سے سو گنا زیادہ پروگریسو اور روشن خیال تھے۔ ہندوؤں کی ایلیٹ کلاس سے ان کی دوستیاں بھی تھیں۔ اس کے باوجود اُن کے بارے میں قائدؒ کے نظریات بہت واضح تھے۔ ان کے اپنے الفاظ سن لیں۔

"Hindu society and philosophy are the most exclusive in the world. How can you put 100 million of Muslims together with 250 millions whose way of life is so different. Unity of India was a myth'......
There is not one Indian nation...... the Hindus and Muslims belong to two different religions, philosophies, social customs and literatures. They neither intermarry nor Interdine together, In deed they belong to two different civilizations"

11 اگست کے بعد 14 اگست بھی آیا جب قانون ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں مغل بادشاہ اکبر کی رواداری کی تقلید کا 'درس' دیا جس کے بعد قائداعظمؒ نے کہا ''اس رواداری کا آغاز مغلیہ دور سے نہیں، آج سے تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی نہیں، عملی طور پر

مفتوح یہودیوں اور عیسائیوں سے بے پناہ رواداری اور ان کے مذہب کے لیے احترام کا رویہ اپنایا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور انسانیت کے اعلیٰ اصولوں سے بھری ہوئی ہے۔ انھی اصولوں کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے''۔ قائدؒ احساس کمتری سے بلند تھے، اسی لیے وہ اپنے دین، اپنی اقدار اور اپنے کلچر پر فخر کرتے تھے اور فخر کے ساتھ اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ریاستی امور چلانے کے لیے نئے ملک کے حکمران اسلام کے اصولوں سے راہنمائی نہیں لیں گے، ایسا نہ قائداعظمؒ سوچ سکتے تھے اور نہ پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے والے دوسرے راہنما۔ قائدؒ کے دستِ راست اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل لیاقت علی خان نے اسی اسمبلی میں پالیسی بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان ایک جدید جمہوری ملک ہوگا جس کے امور اللہ تعالیٰ

(Who is the ultimate source of Authority and Power)

کی قائم کردہ حدود کے اندر رہ کر چلائے جائیں گے''۔

آخر میں قائدؒ کے بارے میں سٹینلے وولپرٹ کی کتاب میں درج ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول کے خیالات بھی سن لیں۔ ''کیبنٹ مشن کے ارکان پیتھک لارنس، کرپس اور الیگزنڈر برطانیہ کے بہترین دماغ تھے مگر جناح کی قانونی بصیرت ان سے اعلیٰ نکلی، اس لیے تینوں مل کر بھی اسے مات نہ دے سکے''۔

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ

قائداعظم کی اسمبلی کی پہلی تقریر کی غلط تعبیر

11 ستمبر **1947**ء کو پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز کا صدر منتخب ہونے کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اسمبلی سے خطاب کیا۔ یہ تقریر بہت اہم ہے اور برسوں عشروں سے ریکارڈ پر ہے، مگر طویل مدت تک کسی نے اس تقریر کو پاکستان کی نظریاتی جہت تبدیل کرنے کے لیے آلۂ تخریب کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ پچھلے چند برسوں سے اس تقریر کے بہت زیادہ حوالے اس ضرورت سے دیئے جانے لگے کہ پاکستان کو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' بنانے پر اصرار درست نہیں۔ قائداعظم نے پاکستان اسلامی ریاست بنانے کے لیے حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ اسے ایک جدید سیکولر ریاست کی شکل دینا چاہتے تھے جس میں تمام مذہبی طبقات کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔ آج کل روشن خیال، ترقی یافتہ اور اعتدال پسند پاکستان کا نعرہ لگانے والوں کے طبقے میں اس خبر کا چرچا بہت بڑھ گیا ہے۔

اس تقریر کے جس اقتباس کا حوالہ بہت زیادہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہے ''آپ آزاد ہیں۔ آپ مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ پاکستان کی ریاستی حدود میں مسجدوں یا کسی بھی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا کسی بھی مذہب یا ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، اس تعلق کا کسی بھی ریاستی معاملے سے سروکار نہیں۔ کچھ عرصے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں۔ یہ بات میں مذہبی مفہوم میں نہیں کہہ رہا، کیونکہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ تو ہمیشہ برقرار رہتا ہے البتہ سیاسی مفہوم میں ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے

یہ تفریق ختم ہو جائے گی‘‘۔ (پاکستان موومنٹ، ہسٹارک ڈاکومنٹس، مصنف جی الانہ، ص 545)

’’آج بھی کچھ ریاستیں ایسی موجود ہیں جہاں امتیازات برتے جاتے ہیں اور کسی خاص طبقے پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ایسے کسی زمانے میں آغاز کار نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا آغاز تو ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب کوئی امتیاز نہیں ہے، ایک طبقے اور دوسرے طبقے کے درمیان کوئی فرق نہیں روا رکھا جا رہا۔ ہم تو اس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور مساوی الحیثیت شہری ہیں۔‘‘

اس تقریر کی بنیاد پر قائداعظم سے للّٰہی بغض رکھنے والا ایک طبقہ تو انھیں مطعون کرتا ہے کہ اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا دعویٰ کرنے والے قائد نے پاکستان بنتے ہی بلاامتیاز مذہب وقومیت سب کو ایک ہی ریاست کا مساوی الحیثیت شہری قرار دے دیا۔ یہی بات غیر منقسم ہندوستان میں بھی تو مانی جا سکتی تھی۔ ہندوستان کو تقسیم کرانا کیا ضروری تھا، اور یہ کہ قائداعظم کا یہ مؤقف جو انھوں نے 11 اگست 1947ء کی تقریر میں اختیار کیا، پاکستان کے بنیادی نظریے سے روگردانی ہے۔ ان کے خیال میں اس تقریر میں قائداعظم نے ازخود اس نظریہ کو مسترد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس تقریر کے بعد دوقومی نظریہ ختم ہو گیا، وغیرہ وغیرہ۔

ایک دوسرا طبقہ ہے جسے قائداعظم کی ذات سے تو کوئی عناد نہیں، مگر اسے پاکستان کے تصور پر اسلام کا غلبہ پسند نہیں ہے اور ملک کے بنیادی نظریے یعنی اسلامی مملکت کے تصور سے بیر ہے اور جو ملک کو لبرل اور سیکولر بنانے کا خواہاں ہے۔ یہ طبقہ قائداعظم کی اس تقریر کی تعبیر اس انداز سے کرتا ہے کہ پاکستان، ہندوستانی مسلمانوں کی بطور مذہبی وحدت حفاظت اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ضرور بنایا گیا تھا مگر مقصود ومطلوب یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہاں خالص اسلامی ریاست کے خدوخال اُبھارے جائیں۔ ان کی رائے ہے کہ قائداعظم نے اس نئی ریاست میں آباد اور موجود تمام شہریوں کو ان کے مذہب کے حوالے کے بغیر مساوی الحیثیت شہری قرار دے کر ایک

آزاد سیکولر ریاست کے قیام کی راہ ہموار کر دی تھی جسے اسلامی ریاست کا نعرہ لگانے والوں نے مسدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ خلاصہ پوری تنقید و تنقیص کا یہ بتایا جاتا ہے کہ قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم ہوتے ہی اور پہلی دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوتے ہی اس کی نظریاتی جہت بدل دی تھی۔

قائداعظم کے کردار و عمل اور ان کے قول کی راستی سے باخبر کسی بھی فرد کے لیے تو ان کی یہ تنقیص اور ان پر ہونے والی یہ تنقید قابل قبول نہیں، البتہ جو قائداعظم کی شخصیت سے ناواقف ہیں، ان پر یہ تنقید اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس تقریر کا درست تجزیہ ضروری ہے۔ قائداعظم ایک ماہر قانون دان اور بہت مضبوط دستور پسند پارلیمنٹیرین تھے۔ وہ نظریہ پاکستان کے بارے میں تمام تشریحات اور تصریحات کو تج کر اسمبلی میں کھڑے ہو کر قلابازی کھا جائیں گے، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر انھیں دو قومی نظریے پر خط تنسیخ پھیرنا ہوتا تو استدلال کے ساتھ اپنی پچھلی تمام تصریحات کا غلط ہونا تسلیم کرتے اور یہ بتاتے کہ نیا مؤقف اختیار کرنے کے اسباب کیا ہیں۔

قائداعظم نے اپنی اس تقریر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو واحد ''قوم'' نہیں کہا بلکہ ایک ریاست کے مساوی الحیثیت ''شہری'' کہا ہے۔ انھوں نے ملک کو اسلامی نظریے سے ہٹانے اور اسے سیکولر بنانے کا بھی کوئی دوٹوک اعلان نہیں کیا۔ انھوں نے جو کچھ کہا، وہ مسلمانوں کی تاریخی نظیر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اعلیٰ مرتبے کے باوقار قانون دان کی حیثیت سے وہ اسمبلی میں کھڑے ہو کر سیاق و سباق سے ہٹ کر کوئی الل ٹپ بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ بیسویں صدی میں اسلام کے نام پر قائم کی جانے والی ریاست کے بانی کی حیثیت وہ مدینے کی پہلی اسلامی ریاست کے حالات و واقعات ہی سے راہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی پاکستان کی مجلس دستور ساز کی اس پہلی تقریر میں مدینے کی پہلی اسلامی ریاست کے حالات و واقعات اور حقائق سے راہنمائی کے آثار بڑے واضح نظر آتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں کفار کے تشدد، جارحانہ رویے اور عدم برداشت

کی وجہ سے اپنے اور مسلمانوں کے لیے مساوی الحیثیت شہری حقوق اور مراعات نہیں پا سکے تھے اور چونکہ انھیں مکہ کے معاشرے میں برداشت نہیں کیا جا رہا تھا، اس لیے مکہ سے حبشہ کی طرف مسلمانوں کی پہلی ہجرت کے بعد رسول کریم ﷺ نے خود مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں پہلی مسلم ریاست کی بنیاد رکھی۔ مکہ کے کفار نے اگر رسول کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو برداشت کیا ہوتا تو شاید اس ہجرت کی نوبت نہ آتی اور مکہ ہی میں پُرامن بقائے باہمی کے کسی سمجھوتے کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کی کوئی صورت نکل آتی، مگر غیر مسلم مقتدر طبقے کی اذیت رسانی کے ستائے ہوئے مسلمان جب مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں انھیں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے اپنے اقتدار اور اپنی ریاست کی ضرورت کا شدید احساس ہوا اور پہلی فرصت میں مدینہ منورہ کی پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ مدینے میں پہلی اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی ایک مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ اس ریاست کی حدود میں جو غیر مسلم موجود ہیں، ان سے کیا سلوک ہو اور انھیں اس اسلامی ریاست میں کیا حیثیت اور درجہ دیا جائے۔ اللہ کے دین اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مدینے کے غیر مسلموں (یہودیوں) سے وہ سلوک کیا جائے جو مکہ میں غیر مسلموں نے مسلموں سے روا رکھا تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اس اہم معاملے میں جو حکمت عملی اختیار کی، وہ میثاق مدینہ میں درج ہے۔

میثاق مدینہ کی روشنی میں قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں اسلام کے نام پر قائم ہونے والی منفرد اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے نوزائیدہ ریاست ''پاکستان'' کی تشکیل و تنظیم کے لیے قائداعظم نے رسول اللہ ﷺ کے میثاق مدینہ سے ہی راہنمائی حاصل کی اور ہادیٔ برحق ہی کی حکمت عملی اختیار کی۔ حقائق کا موازنہ کیجیے تو صورت یہ تھی کہ مدینے کی پہلی اسلامی ریاست کی جغرافیائی حدود میں ایک بڑی جمعیت غیر مسلموں (یہودیوں) کی پہلے سے آباد تھی اور نوزائیدہ اسلامی ریاست پاکستان کی جغرافیائی حدود میں بھی ایک بڑی

جمعیت غیر مسلم اقلیتوں کی پہلے سے آباد تھی۔

دونوں ریاستوں میں نہ ان غیر مسلموں کو حدود مملکت سے خارج کر دینا قرین انصاف تھا، نہ ان کو جبراً مسلمان بنا دینا اچھا عمل ہو سکتا تھا اور نہ ان کے اور مسلمانوں کے حقوق میں امتیاز پیدا کرنا اسلامی اخلاق اور رواداری کے مطابق ہوتا۔ لہٰذا میثاق مدینہ میں اعلان کیا گیا کہ بنوعوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ہی امت ہوں گے۔ اس اعلان کا اتباع کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنی تقریر میں پاکستان میں اقلیتوں کی حیثیت کے حوالے سے کہا ''ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور مساوی الحیثیت شہری ہیں۔ کچھ عرصے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں، یہ بات میں مذہبی مفہوم میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ سیاسی مفہوم میں ریاست کی حیثیت سے یہ تفریق ختم ہو جائے گی۔'' اس کا مفہوم یہی تھا کہ جس طرح میثاق مدینہ کے تحت مسلمانوں اور یہود کو معاہدے کے تحت ایک ریاستی قوم بنایا گیا تھا، اسی طرح قائداعظم نے اقلیتوں اور مسلمانوں کو مساوی الحیثیت شہری بنا کر ایک ''ریاستی قوم'' یعنی پاکستانی قوم بنانے کا تصور پیش کیا تھا جو رسول مقبول ﷺ کی حکمت عملی کے عین مطابق تھا۔ جس طرح قائداعظم نے صراحت کی تھی کہ ہندو مسلم اپنے عقیدے کو ختم کر کے ایک قوم نہیں بنیں گے بلکہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ قائم رہے گا تو یہ بھی اسی تجربے کے تحت کہا گیا تھا کہ جیسے میثاق مدینہ کے تحت مسلمانوں اور یہود پر مشتمل ایک ریاستی قوم کی تشکیل کے باوجود مسلمانوں کے عقائد اور ان کا مذہبی امتیاز ہمیشہ قائم رہا، اسی طرح پاکستان میں بھی پاکستان کی ریاستی قومیت کی تشکیل کے بعد اس ریاستی قوم کے تمام اجزا کے انفرادی عقائد پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی۔

جو لوگ قائداعظم کو مطعون کرتے ہیں کہ اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا دعویٰ کرنے والے قائد نے پاکستان بنتے ہی بلا امتیاز مذہب و قومیت سب کو ایک ہی ریاست کا مساوی الحیثیت شہری قرار دے دیا تھا، وہ یہ بتائیں کہ کیا وہ یہ بات میثاق مدینہ میں مسلمانوں اور یہود کو ریاست مدینہ میں ایک قوم بنا دینے والے اللہ

کے محبوب رسول ﷺ کے بارے میں کہہ سکیں گے؟ یہ اعتراض کہ جو مؤقف قائداعظم نے 11 اگست 1947ء والی تقریر میں اختیار کیا، وہ تقسیم سے پہلے بھی تو اختیار کیا جا سکتا تھا اور یہ بات غیر منقسم ہندوستان میں مان لی جاتی تو ہندوستان تقسیم نہ ہوتا، تاریخی تجربات سے ناآشنائی کا مظہر ہے۔ قائداعظم نے کانگریس میں شمولیت اور مشترکہ ہندوستانی قومیت کے مؤقف کے ساتھ ہی اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا تھا مگر ہندوؤں کے رویے نے قائداعظم کو اس نتیجے تک پہنچایا کہ مسلمان اپنے الگ قومی تشخص کی حفاظت کے لیے فیصلہ کن جدوجہد کریں۔ چودہ نکات کی تشکیل سے پہلے نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے حقوق کے آئینی تحفظات کے لیے مناسب ترمیمات کی تمام تجاویز کو ہندوؤں اور کانگریس کی طرف سے مسترد کر دیے جانے کے بعد ہی قائداعظم یکسو ہوئے کہ ہندوؤں نے مشترکہ قومیت کے تمام امکانات کو خود ہی منہدم کر دیا اور ہندو مسلمانوں کو وہ حقوق اور آزادیاں دینے پر رضامند نہیں ہیں جو ان کے منفرد مذہبی تشخص کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی قائداعظم نے حتمی طور پر کہا تھا کہ اب ہمارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔

ہجرت مدینہ اور قیام پاکستان سے قبل کے مسلمانوں کے تجربات بھی بڑی یکسانیت رکھتے ہیں۔ نبوت پانے کے بعد رسول کریم ﷺ نے اپنی زندگی کے زیادہ برس مکہ مکرمہ میں ہی گزارے تھے۔ وہ بادل نخواستہ مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کیے گئے۔ ہجرت سے قبل رسول کریم ﷺ نے اہل مکہ سے پُرامن بقائے باہمی کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر قریش جب انھیں اور ان کے پیروکاروں کو اظہار (تبلیغ) عقیدہ اور عمل کی آزادی دینے پر رضامند نہ ہوئے تو انھیں ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ یہی صورت غیر منقسم ہندوستان میں بھی پیش آئی کہ جب اپنے حقوق، عقیدے اور تہذیب وثقافت کے تحفظ کی آزادی کی کوئی دستوری ضمانت نہیں ملی تو برصغیر کے مسلمان اپنی علیحدہ ریاست کے مطالبے پر مجبور ہوئے۔ مسلمانوں کی الگ ریاست کا تصور بھی ہجرت مدینہ ہی سے لیا گیا تھا کہ ہجرت کے بعد جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی اور

مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو انھیں من حیث القوم سکون اور آزادی نصیب ہوئی تھی۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے تجربات سے یہی سبق پایا کہ انھیں اپنی الگ ریاست ہی میں تحفظ میسر آئے گا اور پھر الگ ریاست کے قیام کے بعد اپنے دین اور ایمان پر بھرپور اعتماد کے ساتھ قائداعظم نے غیر مسلموں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک مشترکہ ریاستی قوم کی تشکیل کی طرف قدم بڑھایا۔ ریاست مدینہ اور پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام کے بعد یہ اصول بھی مستحکم ہوا کہ مسلم اقتدار کے دائرے سے باہر مسلم اور غیر مسلم آبادیوں کو کسی ریاستی قومیت میں منظّم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تاریخی تجربات کی گواہی موجود ہے کہ غیر مسلم اقتدار میں مسلمانوں کو ان کے حقوق اور انصاف نہیں ملتا، جبکہ مسلمانوں کے اقتدار میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق اور آزادی میسر رہتی ہے۔ اس لیے کسی اسلامی ریاست کے قائم ہو جانے کے بعد ہی غیر مسلم اقلیتوں کو ساتھ ملا کر ایک قومی وحدت یا ریاستی قومیت تشکیل دی جا سکتی ہے۔

قائداعظم نے اگر 11 اگست والی تقریر میں یہ کہا کہ ''آپ آزاد ہیں، مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، مسجدوں یا دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، کسی بھی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق کا کسی بھی ریاستی معاملے سے سروکار نہیں ہوگا'' تو یقیناً یہ بات اسلام کی رواداری اور عقیدے کی آزادی والی فراخدلی کی مظہر ہے۔ یہ قائداعظم کے کسی ذاتی لبرل ازم یا سیکولرازم کی آواز نہیں تھی، یہ میثاق مدینہ کی روح کی آواز تھی جس میں یہ اعلان شامل تھا کہ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض (سرکاری سطح پر) نہیں کیا جائے گا اور یہود و مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔ قائداعظم نے بھی اپنی تقریر میں یہی کچھ کہا ہے، میثاق مدینہ سے متجاوز کوئی بات نہیں کی ہے۔ اگر میثاق مدینہ سے مدینہ کی اسلامی ریاست کی ''اسلامی جہت'' تبدیل نہیں ہوئی تو قائداعظم کی طرف سے اس مؤقف کے اختیار کیے جانے کی بنیاد پر پاکستان کی نظریاتی جہت بدل دینے کا الزام محض اپنی تاریخ سے ناواقفیت کا اشتہار ہے۔

میثاق مدینہ اور قائداعظم کی 11 اگست 1947ء والی تقریر میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ مناسبت و مطابقت ہے۔ اگر یہود سے معاہدہ کر لینے کے بعد مدینہ میں اسلامی نظام حیات، اسلامی نظام مملکت اور اسلامی نظام سیاست اختیار کرنے اور رائج کرنے کے معاملے میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی تو قائداعظم کی تقریر کے بعد یہ ممانعت کیونکر پیدا ہوسکتی ہے کہ پاکستان میں دینی نظام حکومت و ریاست اور وہی نظام حیات برپا کرنے کی بات نہ کی جائے جو عملاً پہلی اسلامی ریاست میں میثاق مدینہ میں اقلیتوں کے حقوق کے اعلان کے بعد ہی قائم ہوا تھا۔ یہ بات قائداعظم پر صریحاً بہتان ہے کہ انھوں نے پاکستان اسلامی ریاست بنانے کے لیے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ وہ اسے ''جدید سیکولر ریاست'' کی شکل دینا چاہتے تھے جس میں تمام مذہبی طبقات کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ مغرب کی اصلاحی ریاستوں میں تو مسلمانوں کو ان کھلے مذہبی رواجات کی پیروی کی بھی اجازت نہیں ملتی اور اپنے مذہب کی پیروی کو بنیادی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ فرانس جیسی ''جدید سیکولر ریاست'' میں مسلمان خواتین کا اپنا سر ڈھانپنے کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا، اس کے مقابلے میں اسلامی ریاست میں تمام مذہبی طبقات کو یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی ریاست میں مذہبی سطح پر ہر طبقے کا الگ تشخص پوری طرح برقرار رہتا ہے لیکن ریاستی شہریوں کی حیثیت سے حقوق کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ ریاست ان کے جان و مال اور ان کے حقوق اور آزادیوں کی اسی طرح محافظ ہوتی ہے جس طرح وہ مسلمانوں کے جان، مال، حقوق اور آزادی کی حفاظت کرتی ہے۔ یہی کچھ قائداعظم نے کہا تھا۔ قائداعظم کی تقریر کی وہ تعبیر درست نہیں جس میں ایک اباحیت پسند جدید سیکولر ریاست کی گنجائش نکلتی ہو۔ آج کی جدید سیکولر ریاست عملاً مذہب دشمن کردار کی حامل ہوتی ہے۔ وہ دینداروں کو انتہا پسند ٹھہرا کر ان کے حقوق اور آزادیوں کو غصب کرنے کے درپے رہتی ہے۔ ایسی جدید سیکولر ریاست قائداعظم کا مطلوب و مقصود ہرگز نہیں تھی۔

۞......۞......۞

اوریا مقبول جان

قومی جھوٹ بولنے والے

میرے سامنے اس وقت منگل 12 اگست 1947ء کا انگریزی اخبار The Civil and Military Gazette ہے۔ اخبار میں 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کی روداد اس سرخی کے ساتھ چھپی ہے: Pakistan Constituent Assembly Opens. یہ اخبار کسی مسلم لیگی راہنما یا کسی مذہبی رجحان رکھنے والی شخصیت کی زیر ادارت نہیں تھا بلکہ یہ خالصتاً برطانوی سرپرستی میں نکلنے والا اخبار تھا جو 1872ء میں لاہور' شملہ اور کراچی سے بیک وقت شائع کیا گیا۔ یہ دراصل چار انگریزی اخبارات کو ختم کر کے نکالا گیا تھا۔۔۔ ایک کلکتہ کا Mofussilite دوسرا Lahore Chronicle تیسرا Punjab Times اور چوتھا Indian Public Poinion۔ اس اخبار کی شہرت مشہور انگریز ناول نگار اور شاعر رڈیارڈ کپلنگ کی وجہ سے ہے جس کا والد لاہور کے عجائب گھر کا کیوریٹر تھا۔ کپلنگ امتحانات میں اچھے نمبر نہ لے سکا اور اسے آکسفورڈ میں داخلہ نہ ملا۔ والد نے اسے اس اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر لگوا دیا۔ اس زمانے میں سٹیفن ویلر اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ 1886ء میں ''کے روبنسن'' ایڈیٹر بنا تو اس نے کپلنگ کو اخبار میں افسانے لکھنے کے لیے کہا۔ یہیں سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ وہی کپلنگ ہے جسے برطانیہ میں بھی ایک مہذب گورے کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کی مشہور نظم White Man's burdon اس تعصب کی علامت کے طور پیش کی جاتی ہے۔ اس اخبار کا مزاج اور اس کی ادارتی پالیسی ہمیشہ سیکولر رہی۔ اس کے ادارتی بورڈ پر ہمیشہ

گوروں کا قبضہ رہا یا ان کے تربیت یافتہ مقامی انگریزی لکھنے والوں کا۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ قائداعظم کی قانون ساز اسمبلی کی گیارہ اگست 1947ء کی جس تقریر کا حوالہ دے کر پوری قوم کو الجھن میں مبتلا کیا گیا ہے کہ شاید قائداعظم ایک سیکولر قسم کا پاکستان چاہتے تھے' اس کے مندرجات کو اس اخبار میں سب سے نمایاں ہونا چاہیے تھا، لیکن میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس اخبار میں گیارہ اگست 1947ء کی آئین ساز اسمبلی کی جو روداد چھپی' وہ انتہائی مختصر ہے۔ صبح دس بجے اجلاس شروع ہوتا ہے اور جوگندر ناتھ منڈل کو سپیکر منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لیاقت علی خان کی جانب سے مبارکباد اور جواب میں منڈل کے شکریے کے الفاظ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ قائداعظم کی تعریف اور ان کی قیادت پر اعتماد کا اظہار ہے۔ اس کے بعد قائداعظم کے چند رسمی جملے ہیں جو اخبار میں دیے گئے ہیں۔ میں وہ فقرے ڈھونڈتا رہا جو زور و شور سے بیان کیے جاتے ہیں اور ثابت کیا جاتا ہے کہ قائداعظم جیسا عظیم لیڈر اس نوزائیدہ ملک کے سیاسی نظام کو اسلام سے دور رکھنے کا درس دے رہا تھا جو خالصتاً اسلام کے نام پر بنا تھا اور جس کی سرحد کی دونوں جانب انسان صرف اس لیے شہید کیے جا رہے تھے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے تھے۔ یہ ایک ایسا جھوٹ ہے، جس پر یقین کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔ جو قائد پاکستان کے قیام کے مطالبے کے لیے اپنی تقریروں میں ایک علیحدہ قومیت اور علیحدہ ضابطہ حیات کی بات کرتا رہا ہو اور جو اپنی زندگی کی آخری تقریر یکم جولائی 1948ء کو ایک خالصتاً سرکاری تقریب یعنی سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح پر کرے اور اس میں یہ ہدایات دے کہ ایک ایسا معاشی نظام مرتب کیا جائے جو اسلام کے سنہری اصولوں پر مبنی ہو اور پھر اسی تقریر میں مغرب کے معاشی نظام پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہے کہ اس نظام نے ایک ایسا ''گند'' (Mess) ڈال دیا ہے کہ اسے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے، وہی شخص آئین ساز اسمبلی کے افتتاح کے وقت ایک ایسی تقریر کیسے کر سکتا ہے، حالانکہ اس تقریر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جسے اسلام کے بنیادی اصولِ حکمرانی سے متصادم کہا جا سکے، لیکن قائد

اعظم جیسی محتاط شخصیت سے یہ بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی، جو اپنا ایک ایک لفظ ناپ تول کر بولا کرتے تھے۔

مجھے دوسری حیرت اس بات پر ہوئی کہ آئین ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس ہے، آل انڈیا ریڈیو تمام تقاریب کی ریکارڈنگ کر رہا ہے اور اسے نشر بھی کر رہا ہے لیکن اس تقریر کی نہ کوئی ریکارڈنگ میسر آتی ہے اور نہ ہی تقریر کا کوئی ہینڈ آؤٹ کسی جگہ میسر ہے۔ ایک اور بے بنیاد دعویٰ کیا جاتا ہے کہ 12 اگست کے ڈان (Dawn) اخبار میں یہ تقریر چھپی تھی۔ تحقیق اور جستجو میں جاؤ تو اس دعوے پر ہنسی آتی ہے۔ ڈان اخبار کے دلی کے دفتر کو بلوائیوں نے چند ماہ پہلے آگ لگا دی تھی اور اس کے مالکان پریشان تھے کہ اخبار کہاں سے نکالا جائے۔ انھوں نے تمام بندوبست کر لیا کہ اس نوزائیدہ ملک کے دارالحکومت کراچی سے اخبار نکالا جائے۔ یوں ڈان اخبار کا پہلا شمارہ 15 اگست 1947ء کو شائع ہوا۔ اپنے جنم لینے سے تین دن پہلے اس اخبار نے قائداعظم کی یہ تقریر کیسے چھاپ دی۔ ایک اور کہانی اس تقریر کے ساتھ جوڑی گئی جو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کی اسٹیبلشمنٹ یعنی سول اور ملٹری بیوروکریسی نے اس تقریر کی اشاعت روکی تھی۔ وہ سول اور ملٹری بیوروکریسی جسے انگریز نے سیکولرازم کی لوریاں دے دے کر پالا تھا، جن کی سرکاری تقریبات میں شراب ایک سرکاری رسم کی طور پر پیش کی جاتی تھی، جہاں اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا اور سانس تک انگریزی زبان اور تہذیب میں ہوتا تھا، وہ سب کے سب کیسے متحد ہو گئے اور کہا کہ یہ تقریر روک دو کیونکہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانا چاہتے ہیں اور یہاں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک شخص کا نام بھی لیا جاتا ہے اور اسے پوری سول اور ملٹری بیوروکریسی پر بھاری ثابت کیا جاتا ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے لیکن دلیل کے ساتھ۔ طوائف کے کوٹھے سے گھنگھرو کی صدا تو بلند کی جا سکتی ہے، آخر شب کی سحر گاہی میں تلاوت کی نہیں۔

قائداعظم کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے بعد سیکولر حضرات کے

نزدیک سب سے مقدس دستاویز منیر رپورٹ ہے۔ پاکستان کے اس متنازعہ ترین چیف جسٹس کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر کہا جاتا ہے کہ قائداعظم ایک سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔ اس ضمن میں قائداعظم کا رائٹرز (Reuters) کو دیا گیا ایک انٹرویو اس رپورٹ میں درج ہے۔ فضل کریم صاحب کی بیٹی سلینہ کریم جب اپنی تعلیم کے دوران لندن گئیں تو انھیں بھی حیرت ہوئی تھی کہ ایسا انٹرویو قائداعظم کیسے دے سکتے تھے۔ انھوں نے تحقیق شروع کی۔ جھوٹا شخص اپنے بے بہا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ جسٹس منیر نے اس انٹرویو کی تاریخ نہیں بلکہ سال 1946ء لکھا ہے۔ سلینہ کو وہ تمام فائلیں ڈھونڈنا پڑیں اور آخر پتا چلا کہ قائداعظم نے رائٹرز کو صرف ایک انٹرویو دیا جو 21 مئی 1947ء کو دیا گیا تھا۔ سلینہ کریم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ جسٹس منیر نے قائداعظم کے انٹرویو کے پیرے کے پیرے ہی تبدیل کر دیے اور ان میں قائداعظم کے حوالے سے عوام کے اقتدار اعلیٰ کا سیکولر تصور ڈال دیا۔ اس کے بعد سلینہ کریم نے ایک طویل تحقیق کی اور 317 صفحات پر مشتمل کتاب لکھ ڈالی جس کا نام Pakistan: Secular Jinah What The Nation Dosn't know. ہے۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو زور وشور سے اس قوم کے کانوں میں ڈالا جاتا رہا ہے اور آج سب لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ ہوسکتا ہے، شاید، اگر، یا کسی مصلحت کے تحت قائداعظم نے ایسا کہا ہوگا، لیکن جھوٹے کو جھوٹا کوئی نہیں کہتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس ملک کے دس لاکھ شہدا سے غداری کی، ان کے مقدس خون اور قربانیوں کا مذاق اڑانے کے لیے جھوٹ بولا۔ اس قوم کو دانستہ گمراہ کرنے کے لیے سرکاری سطح پر جھوٹ کی فیکٹری لگائی گئیں۔ میری جستجو جاری ہے کہ وہ کون تھا جس نے یہ گیارہ اگست کی تقریر تخلیق کی اور اس جھوٹ کو عام کیا۔ ایک مجرم جسٹس منیر تو موجود ہے۔ کیا کوئی اس کی قبر کے ٹرائل کا نعرہ بلند کرے گا؟
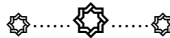
ڈاکٹر عبدالرحمٰن خاں

قائداعظم کے افکار ونظریات

اگر قائداعظم پاکستان کو سیکولر بنانا چاہتے تو دستور یہ کو نئے دستور کے بنانے کی ذمہ داری کیوں سونپی جاتی۔ اس لیے کہ 1935ء کا ایکٹ بھی تو ریاست اور حکومت کو لوگوں کے مذہبی عبادات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے بعد قائداعظم نے دستور یہ سے خطاب میں فرمایا کہ آپ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ آپ لوگوں کے جان، مال وعزت کے محافظ بنیں اور ان کے مذہبی عقائد کو تحفظ دیں۔ قائداعظم کا یہ فرمان عین اسلامی حکومت کے فرائض کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ حکومت اپنے شہریوں کی جان، مال وعزت کی محافظ ہوتی ہے۔ اس کے بعد قائداعظم نے دستور یہ سے خطاب میں ملک سے رشوت، بدعنوانی، چور بازاری، جیسی برائیوں کو ختم کرنے پر زور دیا اور فرمایا کہ میں اس معاملے میں کسی امیر، غریب، یا اعلیٰ سطح کی کسی قسم کی سفارش برداشت نہیں کروں گا اور ان برائیوں کو سختی سے کچل دیا جائے۔ یہ بھی اسلامی حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے کہ وہ مملکت سے برائیوں کے خاتمہ کے لیے سخت ترین اقدامات کرے اور اسی چیز کی طرف قائداعظم نے زور دیا۔

اس کے بعد قائداعظم نے فرمایا کہ برصغیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا مل جل کر رہنا ناممکن تھا اور اس کی تقسیم ناگزیر تھی۔ تو اب اس کے بعد مل جل کر یہاں کے رہنے والے یکساں شہری کی حیثیت سے ملک کی ترقی میں کردار ادا کریں۔ یہاں پر بھی قائداعظم نے دوقومی نظریے کا اعادہ کیا کہ مسلمان اور ہندو کسی طور پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ ظاہر ہے صرف مذہبی عبادات میں تو ہندوؤں کو بھی مسلمانوں پر کوئی اعتراض

نہ ہوتا۔ اعتراض تو اسی صورت میں ہوتا کہ جب مسلمان اپنے لیے اللہ کا عطا کردہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام چلاتے۔

اس کے بعد قائداعظم نے اقلیتوں کے حقوق پر خاص طور پر زور دیا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہبی عبادت گاہوں میں عبادت کریں، ان کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا اور یہ کہ ملک کی ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنا کردار ادا کریں۔ جہاں تک معاملہ ہے کہ 'جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے'۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی نظر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو یکساں شہری کے حقوق ملیں گے۔

اس کے علاوہ قائداعظم کے اس سے ماقبل بیانات اور اس کے مابعد بیانات کو سامنے رکھ کر اس کا وہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا جو اوپر کی سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ پھر قائداعظم کے ان اقوال کا کیا مطلب سمجھا جائے گا جس میں انہوں نے فرمایا:

- ''آزاد ریاستوں میں اسلامی قوانین کے مطابق اپنی حکومت بنا سکیں''۔
- ''پاکستان نہ صرف ایک قابل حصول منزل ہے بلکہ واحد منزل ہے اگر آپ اس ملک میں اسلام کو مکمل تباہی سے بچانا چاہتے ہیں''۔
- ''ہماری راہنمائی اور بصیرت کے لیے عظیم ترین پیغام تو قرآن مجید میں موجود ہے''۔
- ''وہ چیز جس نے مسلمانوں کو متحد رکھا ہے اور جو اس قوم کی اساس ہے، وہ اسلام ہے''۔
- ''ہمارا مطمح نظر سرمایہ دارانہ نہیں، بلکہ اسلامی ہونا چاہیے''۔
- ''اسلام محض روحانی عقائد، نظریات اور رسم و رواج کی ادائیگی تک محدود نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور پورے مسلم معاشرے پر محیط ہے، زندگی کے ہر شعبے میں من حیث المجموع اور انفرادی طور پر جاری و ساری ہے''۔
- ''آج بھی اسلامی اصولوں کا زندگی پر اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح

تیرہ سو سال پیشتر ہوتا تھا''۔

- ''اسلام نہ صرف رسم و رواج، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ ہے، بلکہ اسلام ہر مسلمان کے لیے ایک ضابطہ بھی ہے جو اس کی حیات اور اس کے رویہ بلکہ اس کی سیاست و اقتصادیات وغیرہ پر محیط ہے''۔
- ''ہمیں چاہیے کہ اپنی جمہوریت کی عمارت صحیح اسلامی نظریات پر قائم کریں''۔
- مجلس دستور ساز پاکستان کو ابھی پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی؟ لیکن مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول شامل ہوں گے۔ آج بھی ان کا اطلاق ایسے ہی ہوسکتا ہے، جیسے تیرہ سو برس قبل ہوسکتا تھا''۔
- ''آپ کا تحقیقی شعبہ، بینکاری کے طور طریقوں کو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں جو کام کرے گا، میں ان کا دلچسپی کے ساتھ انتظار کروں گا''۔
- ''دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا جس کی اساس انسانی مساوات اور معاشرتی عدل کے سچے اسلامی تصور پر استوار ہو''۔
- ''زمانہ قدیم سے عہد بہ عہد ہندو، ہندو رہے اور مسلمان، مسلمان اور انہوں نے اپنی شخصیتوں کو ایک دوسرے میں ضم نہیں کیا، یہ ہے بنیاد پاکستان کی''۔

قائد اعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کے حوالے سے ڈاکٹر شہزاد اقبال شام لکھتے ہیں:

''قائد اعظم ایک عظیم سیاست دان اور عظیم قانون دان تھے۔ ان کی اس تقریر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فی البدیہہ اور فوری اظہار کے لیے کی جانے والی یہ تقریر انتہائی محتاط اور نپے تلے الفاظ پر مشتمل تھی۔ ایک طرف تو اس تقریر میں ایک سیاست دان کا لب و لہجہ نظر آتا ہے جو سطح بین افراد کے نزدیک قائد اعظم کی گزشتہ تمام تقاریر، خطوط اور قول و قرار سے بظاہر انحراف تھا جو یقیناً قائد اعظم کے مرتبے کے شایانِ

شان قطعاً نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسمبلی کی اس کارروائی کے اخبارات میں شائع ہونے پر کوئی ایسا تہلکہ مچتا نظر نہیں آیا جس سے کہا جا سکتا کہ قائد اعظم اپنے گزشتہ اصولوں سے پھر گئے۔ یہ تو بعد کے سطح بین اور مخصوص سوچ رکھنے والے افراد کی فکر تھی جس نے اس تقریر کو متنازع بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اس تقریر میں استعمال کیے گئے الفاظ کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ قانون کی میزان پر پرکھا جا چکا ہے، حالانکہ یہ تقریر فی البدیہہ تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائد اعظم کے افکار و نظریات کس قدر صاف اور واضح تھے۔ ان کی فکر کسی کجی کی طرف مائل نہ تھی''۔

(دستور پاکستان کی اسلامی دفعات، ایک تجزیاتی مطالعہ از ڈاکٹر شہزاد اقبال شام ص 41)

قائد اعظم کے ان اقوال و ارشادات کے بعد کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان قائد اعظم پر ایسا بہتان نہیں باندھ سکتا۔ مزید یہ کہ اس دستور یہ میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر کئی علمائے کرام موجود تھے۔ انہوں نے بھی قائد اعظم کی اس تقریر پر کوئی حیرت کا اظہار نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو ابھارنے کے لیے تو اسلام کا نام لیتے رہے اور حقیقت میں وہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک بھی قائد اعظم کی تقریر کا مقصد وہی تھا جو اوپر کی سطور میں واضح کر دیا گیا۔ مزید یہ 11 اگست 1947ء کے بعد کے بھی ہم کئی اقوال پیش کر چکے ہیں جس میں پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کے حوالے سے قائد اعظم کا نظریہ بالکل واضح اور صاف تھا۔

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

اسلام کی تلوار

قائداعظمؒ نے واشگاف لفظوں میں اس حقیت کا اظہار کیا کہ تحریک پاکستان کا مقصد صرف 'آزادی' نہیں بلکہ 'اسلامی نظریۂ' ہے۔ سیکولر تہذیب کے علم برداروں، انگریز اور کانگریس سے اس اصول کو تسلیم کرا لینا اور مغربی تہذیب کے غلبے کے دور میں، جو مذہب اور ریاست کی علیحدگی کے اصول پر قائم ہے، اس نظریے کی بنیاد پر ایک آزاد ریاست کا قیام ملت اسلامیہ پر اللہ کا خصوصی کرم تھا۔ لیکن پاکستان میں سیکولر سوچ کا حامل ایک قلیل گروہ اس بنیاد کو کمزور اور پاکستان کے حقیقی وژن کو غبار آلود کرنے کے لیے مسلسل پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے کہ قائداعظمؒ تو پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے اور نظریۂ پاکستان اور 'اسلام' محض انتہا پسند ملاؤں کی اختراع ہے۔ اس بات کو بعض سادہ لوح علما نے بھی قبول کر لیا کہ قائداعظم محض ایک سیاسی راہنما تھے اور ان کے پیش نظر کوئی اسلامی نظریہ نہ تھا۔

قائداعظم کی جس تقریر کی بنیاد پر ان کے تصور ریاست کو سیکولر قرار دیا جاتا ہے وہ ان کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''اب آپ آزاد ہیں۔ اس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں: اپنے مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں''۔ مزید فرمایا: ''میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی

اعتبار سے اور مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔'' (قائد اعظم: تقاریر و بیانات، ترجمہ: اقبال احمد صدیقی، بزم اقبال، لاہور، جلد چہارم، ص359، 360)

یہ ہیں وہ الفاظ جن کی بنیاد پر قائد اعظم کے 1937ء سے لے کر 1947ء تک کے تمام ارشادات کی نفی کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہاں ان کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو اس امر کا اطمینان دلانا ہے کہ تمام غیر مسلم اقلیتوں کو اس نئی اسلامی ریاست میں عقیدہ و عبادات اور معاشرتی و مذہبی رسوم و رواج کی ادائیگی کی پوری آزادی ہوگی، نیز پاکستان میں کسی کو بھی مذہبی جبر کا اختیار نہ ہوگا۔ قائد اعظم جانتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے ملک میں قانون سازی اسلامی اقدار کو سامنے رکھ کر ہی کی جائے گی۔ چنانچہ 1949ء میں جب 'قرار دادِ مقاصد' پاس ہوئی تو اس میں وہ تمام باتیں شامل تھیں جو کسی بھی اسلامی دستور کا حصہ ہونا چاہئیں۔ اب یہ بات انصاف کے منافی ہے کہ ایک شخص کے ایک جملے یا اقتباس کو لے کر اس کے دس سالہ تمام فرمودات اور اعلانات کی نفی کر دی جائے۔ قائد اعظمؒ کے بارے میں اس بات کو تو دوست دشمن سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہرگز دہرے کردار کے حامل سیاستدان نہ تھے۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ اس نے محض لوگوں کے جذبات کو اپیل کرنے کے لیے اسلام کا نام لیا، بہت بڑی جسارت ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے بے شمار ارشادات ایسے ہیں جن سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ قائد اعظمؒ نہ صرف اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے قائل تھے بلکہ وہ مغربی جمہوریت اور مغربی نظام معیشت سے نالاں تھے۔

یہ کہنا کہ وہ پاکستان کو مغربی تصور کے مطابق سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے، صریحاً علمی بددیانتی ہے کہ 1937ء سے 1947ء تک ان کی ساری جدوجہد میں سوائے ایک اقتباس کے کوئی ایسی بات نہیں جو بظاہر سیکولرازم کی حمایت میں ہو اور جس جملے پر یہ ساری عمارت تعمیر کی جا رہی ہے، اس سے یہ مفہوم اصل عبارت کو سیاق و سباق سے کاٹنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

مغربی لباس میں ملبوس انگریزی میں گفتگو کرنے والا یہ شخص بظاہر بود و باش کے اعتبار سے سیکولر نظر آتا تھا، مگر اس مغربی لباس کے اندر کے انسان کو دشمن بھی اسلام کا سپاہی تصور کرتے تھے۔ 1946ء میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک دس رکنی وفد ہندوستان کے سیاسی زعما کے موقف کو سمجھنے کے لیے آیا۔ اس وفد کے ایک رکن مسٹر سورنسن نے بعد میں My Impression of India نامی کتاب لکھی جس میں اس نے 10 جنوری 1946ء کو قائداعظم سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے قائد اعظم کو سیکولر نیام میں رکھی ہوئی اسلام کی تلوار قرار دیا۔

اوریا مقبول جان

تہمتیں دھر کر فساد پھیلانے والوں کو قائداعظمؒ کا جواب

قائداعظمؒ محمد علی جناح وہ عظیم راہنما تھے جنھیں اللہ نے ایسے دور میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھنے کے لیے چنا جب پوری دنیا میں سیکولر تصور کے تحت نسل، رنگ، زبان اور علاقے کو بنیاد بنا کر قومی ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں۔ پوری دنیا کے انسانوں کو اسی بنیاد پر تقسیم کر کے بہت بڑے چڑیا گھر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد لیگ آف نیشنز بنی تو 1920ء میں اس نے پاسپورٹ کا ڈیزائن منظور کیا۔ 1924ء میں ویزا ریگولیشن، آئین اور پھر بارڈر سیکورٹی فورسز کے ذریعے ایک پنجرے کے انسانوں کو دوسرے پنجرے میں جانے سے روک دیا گیا۔ ایسی ریاستیں وجود میں آ رہی تھیں جن کی بنیاد خالصتاً نسلی اور علاقائی تھی۔ یہی طاقتور نظریہ برصغیر پاک و ہند پر بھی لاگو ہونے کو تھا، ایک ایسا آزاد ہندوستان جس میں کسی بھی قسم کی جمہور حکومت اپنے جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کی آمریت (Tyrany of Majority) نافذ کرتی۔ اس بدترین مستقبل کو صرف وہ لوگ محسوس کر رہے تھے جنھیں اللہ نے چشم بینا عطا کی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان کی قومی ریاست کا حصہ بن جائیں یا پھر ایک نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے یہ اعلان کریں کہ بے شک ہم زبان ایک بولیں، لباس ایک جیسا پہنیں، کھانا ایک جیسا کھائیں، گیت ایک جیسے گائیں لیکن ہم علیحدہ قوم ہیں، اس لیے کہ ہم کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔ یوں قومی ریاستوں کے مینا بازار میں ہندوستان میں بسنے والے بنگالیوں، پنجابیوں، بلوچوں، پشتونوں اور سندھیوں نے اپنی قومیتوں کا انکار کرتے ہوئے ایک

اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ تاریخ کا ایک معجزہ تھا جس کے لیے اللہ نے قائداعظمؒ محمد علی جناح کو منتخب کیا۔ایسے معجزے کے لیے جو قیادت ضروری ہوتی ہے، اسے بصیرت کی آنکھ بھی عطا ہوتی ہے۔

بصیرت کی اس آنکھ کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ آج بعض لوگ قائداعظمؒ کے کردار اور نظریے کو اپنے مخصوص خیالات کے تعصب سے داغدار کر رہے ہیں۔ قائداعظمؒ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اور قائداعظمؒ نے ان لوگوں کو اپنی زندگی میں ہی مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسا جواب دیا تھا اور ان کے رویے کو ایسے الفاظ سے یاد کیا تھا جو اس قدر واضح ہیں کہ آنے والی کئی صدیوں میں بھی محققین قائداعظمؒ کی اسلامی شریعت کے نفاذ سے وابستگی کو دھندلا نہیں سکتے۔ ایسے طبقات پاکستان کے قیام سے پہلے بھی ہندوستان میں موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ان کے لیے یہ بات انتہائی حیرت، استعجاب اور دکھ کی تھی کہ اسلام کے نام پر بھی کوئی ملک قائم ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اپنے مروّجہ علم سے مذہب کے نام پر قومیت کا خانہ ہی کھرچ دیا تھا۔ ان میں انگریز کے سوسالہ دور غلامی کی پیداوار بیوروکریٹ، انگریزی رنگ ڈھنگ میں رچے فوجی افسران، انگریز کی عطا کردہ مراعات سے بننے والے وڈیرے، خان، چودھری اور سردار شامل تھے۔ان کے ہمراہ وہ دانشور طبقہ تھا جن کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ملک کلمہ طیبہ کی بنیاد پر وجود میں آئے گا اور پھر اس کے راہنما اس ملک میں شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ شریعت جسے یہ لوگ فرسودہ اور ناقابلِ نفاذ ثابت کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کرنے میں عمریں گزار چکے تھے، پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ یہ ملک اسلام کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ معاشی وجوہ پر بنا، لٰہذا اس کا قانون موجودہ ماڈرن ریاستوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ایسی باتیں اس عظیم لیڈر قائداعظمؒ تک بھی پہنچیں۔ وہ جو اس خطے کے مسلمان شہیدوں کے خون کا امین تھا، جسے علم تھا کہ یہاں دس لاکھ لوگوں نے کس مقصد کے لیے جان دی ہے، یہ نحیف ونزار مگر عزم و استقلال کا پیکر ان

سازشی چہروں کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایسے فورم کا انتخاب کیا جہاں سب قانون دان جمع ہوں اور اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو سمجھتے ہوں۔ قائداعظمؒ نے ان سیکولر طبقات کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے تقریر کا آغاز کیا اور اپنا اور اس ملک کے قیام کا نظریہ پوری وضاحت سے بیان کیا۔ 25 / جنوری 1948ء کو سندھ بار ایسوسی ایشن، کراچی میں خطاب کرتے ہوئے اس عظیم قائد نے کہا:

"Why this feeling of nervoution of Pakistan is going to be in conflict with the shariat Law....there are people who want to create a mischief and make the propaganda that we will scrap Shariat Law. Islamic, Principles have no Parallel. Today they are as applicable in actual life as they were 1300 years ago.

میں نے اصل انگریزی عبارت اس لیے تحریر کر دی ہے تاکہ قائداعظمؒ کے اصل الفاظ میں چھپی اس نفرت کو ملاحظہ کیا جا سکے جو انھوں نے ایسے عناصر کے خلاف دکھائی تھی جو انھیں اس دور میں سیکولر اور اسلامی شریعت کے مخالف ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ تقریر کا ممکن حد تک ترجمہ یہ ہے:

- ''یہ پریشانی اور ہیجان کیوں ہے کہ پاکستان کا آئندہ آئین اسلامی شریعت سے متصادم ہوگا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو تہمتیں دھر کے فساد پھیلانے والے ہیں اور پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہم شریعت کے قانون کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ اسلامی اصولوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ یہ آج بھی اسی طرح نافذ العمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔''

یہ ہے اس قائداعظمؒ کا جواب ان سب سیکولر دانشوروں کو جو آج ان کی ذات میں کیڑے نکالنے کے لیے کبھی اسٹینلے والپرٹ اور کبھی ہیکٹر بولتھیو کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے پھرتے ہیں، کبھی ان کے زمانہ طالب علمی کے خدوخال سے انھیں نئے مطالب پہناتے ہیں، کبھی ان کے لباس اور رہن سہن سے انھیں سیکولر ثابت کرتے

ہیں۔ اگر سارا یورپ آج مسلمان ہو جائے تو کیا یورپ کے مسلمان دھوتی پہننے لگیں گے؟ آدمی مسلمان یا سیکولر نظریات سے ہوتا ہے، لباس سے نہیں۔ قائد نے اپنی آخری تقریر، جو اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر کی تھی، میں سودی نظام کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور وہ اس لشکر کا حصہ بن گئے تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا لشکر ہے۔ اللہ نے پورے قرآن میں صرف سود کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ہے، کیا وہ قائد جو اس جنگ میں شریک ہو، سیکولر ہو سکتا ہے؟ مجھے یہاں قائد اعظمؒ کی زندگی اور طرزِ زندگی سے مثالیں دے کر ثابت نہیں کرنا کہ وہ کیسے نظریات رکھتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا کہ اس ساری بحث کا مقصد قائد اعظمؒ کی شخصیت کو متنازع بنانا ہے۔ آج یہ سیکولر دانشور بھی ویسے ہی لوگ ہیں جن کی تحریروں، گفتگو اور طرزِ سیاست سے قائد کو زندگی میں اس قدر صدمہ پہنچا کہ نپی تلی اور محتاط گفتگو کرنے والے قائد اعظمؒ نے ایسے افراد کے لیے **(Mischief)** کا لفظ استعمال کیا، جس کا عرف عام میں مطلب ''تہمتیں دھر کے فساد پھیلانے والے'' (ترجمہ کتابستان کی لغت سے) ہے۔ قائد اعظمؒ نے یہ نام ان کو دیا جو ان کے بارے میں یہ تاثر پھیلاتے تھے کہ وہ اس ملک میں اسلامی شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ **1948**ء میں بھی موجود تھے اور آج بھی......تہمتیں دھر کے فساد پھیلانے والے!

حافظ شفیق الرحمٰن

پاکستان کی پہلی منتخب پارلیمنٹ میں اراکین کا پہلا حلف نامہ

7 اپریل 1946ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ہندوستان گیر کنونشن ہوا۔ یہ کنونشن دہلی میں منعقد ہوا۔ قائداعظم کے فیصلے کے مطابق برصغیر کے اطراف و اکناف اور طول و عرض سے تمام منتخب مسلم لیگی اراکین اسمبلی کو اس کنونشن میں مدعو کیا گیا تھا۔ کنونشن کی جائے انعقاد کے لیے اینگلو عربک کالج دہلی کی تاریخی عمارت کا چناؤ کیا گیا۔ کنونشن کے انعقاد سے تین چار روز قبل ہی اسلامیان برصغیر کے زعما دہلی پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہاں اس امر کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر دہلی میں تھا، یہ دفتر دریا گنج کے علاقے میں واقع تھا۔ مندوبین اور وفود ٹرینوں، موٹروں اور لاریوں کے ذریعے دہلی پہنچے۔ جن لاریوں پر وہ دہلی تشریف لائے، ان پر ''پاکستان میل'' کے الفاظ جلی انداز سے تحریر تھے۔ دہلی میں ہر سو ''پاکستان میلیں'' موج خرام سے گل کترتی دکھائی دیتیں۔ دہلی سٹیشن 4 اپریل ہی سے نعرہ ہائے تکبیر...... اللہ اکبر...... اسلام، مسلم لیگ، پاکستان اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ معزز مہمانوں میں سے چھ سو مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام نئی دہلی میں لودھی روڈ پر نو تعمیر شدہ سرکاری کوارٹرز میں کیا گیا تھا۔ ہر کوارٹر کی چھت پر مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس مہمان گاہ کا نام ''پاکستان کالونی'' رکھا گیا۔ متمول لیگی عمائدین اور ان کے رفقا نے اپنے ڈیرے سوئس، میرینا، میڈنٹ اور امپیریل ہوٹل میں آباد کر رکھے تھے۔

7 اپریل کو اینگلو عربک کالج دہلی کی سرخ پتھروں والی عمارت پوری دنیا کی

نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یہ کالج ''مرحوم دہلی کالج'' کا نیا قالب تھا۔ یہ وہی کالج ہے جہاں سرسید نے اپنا زمانۂ طالب علمی گزارا، جہاں مسدس مدوجزر اسلام کے خالق الطاف حسین حالی نے عنفوانِ شباب میں حکمت و معارف کے گل کدوں سے اکتساب رنگ و بو کیا، جہاں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، شمس العلما مولوی ذکا اللہ جیسی نابغہ اور عبقری شخصیات نے مستقبل میں فکر و نظر کی نئ دنیائیں دریافت کرنے کا ''حلف صمیم'' اٹھایا۔ اس کالج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ہر وہ اجلاس جو دہلی میں طلب کیا گیا، اس کے انعقاد کے لیے اسی کالج کے در و بام کو منتخب کیا گیا۔

پون صدی بعد آج برصغیر کی منتخب مسلم قیادت ایک نیا حلف اٹھانے کے لیے یہاں مجتمع تھی۔ کالج کے کشادہ احاطے میں ایک خوبصورت پنڈال سجا تھا۔ آج یہ احاطہ قلب مومن کی طرح کشادہ اور صوفی کی جلوہ گاہ تخیل کی طرح منور تھا...... ہزاروں قمقمے روشن تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان کے دامن پر جھلملانے والے ستاروں کی جھالر اس پنڈال کے آنچل پر اُتر آئی ہو۔ تاحدِ نگاہ سینکڑوں پلے کارڈ آویزاں تھے، ان پلے کارڈز پر قائداعظم کے فرمودات کے علاوہ مختصر مختصر مگر بامعنی جملے رقم تھے۔ ہر مختصر جملہ اپنے جلو میں معانی کا ایک سمندر لیے ہوئے تھا...... ''مغربی جمہوریت اور دستوری سیاست ایک فریب ہے۔'' ...... ''پاکستان یا خون'' ...... ''پاکستان یا شہادت'' ...... ''جو قوم اپنے نصب العین کے لیے مرنے کا عہد کر چکی ہو، اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا'' ...... ''مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں'' ...... ''مسٹر پٹیل! سول وار کا چیلنج قبول ہے'' ...... ''اکھنڈ ہندوستان ایک فریب ہے'' ...... ''اسلام جمہوریت اور مذہبی رواداری کا سب سے بڑا علمبردار ہے'' ...... سٹیج کے اوپر سب سے نمایاں موٹو پر قرآن پاک کی آیت **''واعتصموا بحبل اللّٰہ جمعیا''** دعوتِ اتحاد دے رہی تھی۔

کنونشن میں اسلامیان برصغیر کے جلیل القدر اور عظیم المرتبت راہنماؤں نے شرکت کی۔ نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب محمد اسماعیل خان، چودھری خلیق الزماں، مسٹر حسین شہید سہروردی، سردار عبدالرب نشتر، آنریبل حسین امام، سر غلام حسین ہدایت اللہ،

نواب صدیق علی خان، مسٹر چندریگر، بیگم مولانا محمد علی جوہر، راجہ صاحب محمود آباد، مولانا حسرت موہانی، قاضی محمد عیسیٰ، مولانا جمال میاں، مولانا ظفر علی خان، خان بہادر نورالامین، مسٹر یوسف عبداللہ ہارون، مسٹر ایم ایچ اصفہانی اور سید آغا بدرالدین کے علاوہ دیگر اہم شخصیات نے بھی خصوصی شرکت کی۔

اجلاس شروع ہوا تو تلاوت دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ کے پوتے قاری زاہر قاسمی نے کی۔ تلاوت کے بعد قائداعظم خطاب کے لیے کھڑے ہوئے، پنڈال دیر تک تالیوں کے ولولہ انگیز شور اور قائداعظم زندہ باد کے پُرجوش نعروں سے گونجتا رہا۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں کانگریس کی مضحکہ خیز سکیم کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ آپ نے کانگریسی فارمولے کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے کہا:

❑ ”میں ہندو اور مسلمانوں کے مابین بنیادی اور اساسی اختلافات کو مکمل تفصیلات کے ساتھ بیان کر چکا ہوں، ان دونوں بڑی قوموں کے درمیان پچھلی تمام صدیوں میں کسی وقت بھی معاشرتی، مجلسی یا سیاسی اتحاد نہیں ہوا ہے۔ ہندوستانی وحدت کا جو راگ الاپا جاتا ہے، وہ محض مادی ہے۔ کانگریس کا دعویٰ قومیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ متحدہ قومیت تو عالم وجود میں ہی نہیں ہے، البتہ جو لوگ خواب کی دنیا میں رہتے ہیں، ان کے ذہن میں یہ موجود ہے۔“

کنونشن کا آخری اجلاس جاری تھا، رات کی زلفیں تا بہ کمر آ چکی تھیں، ایک بجے کا عمل تھا۔ جدھر نظر اٹھتی، چہرے ہی چہرے اور پیشانیاں ہی پیشانیاں دکھائی دیتیں۔ یہ اُجلے چہرے، یہ روشن پیشانیاں اس امر کا اعلان کر رہی تھیں کہ دریائے گنگا کا گدلا جل اور چاہِ زمزم کا منزہ پانی ایک نہیں ہو سکتا، یہ بتا رہے تھے کہ قرآن پاک کی آیات اور بھگوت گیتا کے اشلوک ہم پلّہ نہیں ہو سکتے، یہ منادی کر رہے تھے کہ مندر کی تنگ، تاریک اور پیچیدہ راہداریوں اور مسجد کے کشادہ، روشن اور فراخ صحن میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی...... اسی دوران نوابزادہ لیاقت علی خان ڈائس پر تشریف لائے اور بتایا:

❑ ”کنونشن میں شریک مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام ممبران نے حصول

پاکستان کے لیے ایک حلف نامہ پر دستخط کیے ہیں۔ یہ دستخط شدہ حلف نامے مجھے دے دیئے ہیں۔ جو اراکین اسمبلی اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے، وہ اپنے دستخط شدہ حلف نامے بعد میں بھیج دیں گے۔''

نوابزادہ لیاقت علی خان نے یہ بھی اعلان کیا کہ:

''بعض ممبران نے حلف پر اپنے خون سے دستخط کیے ہیں۔''

آپ نے حلف نامہ کا مضمون پڑھ کر سنایا۔ یہ حلف نامہ بسم اللہ اور قرآن پاک کی ایک آیت سے شروع ہوتا اور قرآن پاک کی آیت پر ہی ختم ہوتا ہے۔اس حلف نامے پر قائداعظم نے بھی دستخط کیے۔ کیا ایک سیکولر قائد دنیا بھر کی طاغوتی قوتوں کے رُوبرو یہ اعلان کر سکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہے اور اس کی نماز، قربانی، زندگی اور موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ یہ حلف نامہ اس امر کا واضح اعلان ہے کہ قائداعظم نے پاکستان، رب کی دھرتی پر رب کے سچے نظام، اسلام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا تھا وگرنہ نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کی اجازت تو برطانوی سامراج کے دور میں بھی تھی۔ روٹی، کپڑا، مکان، علاج، امن و انصاف اور معاش کی وافر سہولیات تو مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں بھی ارزاں تھیں...... پاکستان کا مطالبہ محض چند مادی، معاشی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لیے نہیں تھا۔ یہ حلف نامہ بتاتا ہے کہ قائداعظم کی قیادت میں اسلامیان برصغیر پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک خالص اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشاں تھے...... ایک خالص اسلامی ریاست کا واضح مطلب ایک جدید، ترقی پسند، فلاحی، مثالی ریاست ہے......

آیئے حلف نامہ ملاحظہ کریں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

قل ان صلاتی ونسکی و محیای	کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا
و مماتی للّٰہ رب العالمین	اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ رب العالمین
	کے لیے ہے۔ (الانعام:162)

میں......رُکن مسلم لیگ پارٹی صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی/کونسل صوبہ......اپنے اس پختہ عقیدہ کا اعلان کرتا ہوں کہ برِّ کوچک ہند میں بسنے والی مسلم قوم کی نجات، اس کی سلامتی، اس کا تحفظ اور اس کا مستقبل حصول پاکستان میں مضمر ہے اور پاکستان ہی اس وسیع برِّ کوچک کے پیچیدہ دستوری مسائل کا حل...... باوقار اور معقول حل ہے اور اسی کے ذریعہ یہاں بسنے والی قوموں اور فرقوں کو امن، آزادی اور خوشحالی حاصل ہوسکتی ہے۔

میں بہ صمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصد عزیز یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریک بھی روبہ عمل لائی جائے گی اور اس سلسلہ میں ہدایات و احکام جاری کیے جائیں گے، میں بلا پس وپیش کمال رضامندی کے ساتھ ان کی پوری پوری تعمیل کروں گا اور اس امر کا یقین کامل رکھتے ہوئے کہ میرا مقصد و مدعا حق و انصاف پر مبنی ہے، میں عہد کرتا ہوں کہ اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا، انھیں برداشت کروں گا۔

ربنا افرغ علینا صبرا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین. (البقرہ:250)	اے ہمارے رب! ہمیں صبر و استقامت دے، ہمیں ثابت قدم رکھ اور قوم کفار پر ہمیں فتح ونصرت عطا فرما

دستخط..................

دستخط..................

کیا کوئی سیکولر قیادت اپنی جماعت کے ان اراکین کو جو ایک نوآزاد ملک کی پہلی پارلیمنٹ کے رُکن منتخب ہو چکے تھے، کسی ایسے حلف نامے پر اپنے دستخط ثبت کرنے کی تلقین کرسکتی ہے جس کی ابتدا ایک آیت قرآنی سے ہو اور انتہا بھی ایک ایسی دعائے قرآنی پر ہو جس میں اللہ سے کفار پر فتح ونصرت کی التجا کی گئی ہو۔

۞......۞......۞
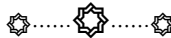
میاں محمد افضل

قائداعظم: قائدانہ خوبیوں کا بہترین مرقع

دنیا میں بہت کم ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کے اصل نام پس منظر میں چلے گئے اور ان کی شناخت ان کے القاب سے ہوتی ہے جو ان کے حقیقی ناموں کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ہی خاص لوگ ہوتے ہیں اور اپنے عظیم کارناموں، قوم کے لیے بے مثال خدمات اور بے مثال اور ہمیشہ رہنے والی عوامی قبولیت کی وجہ سے انہیں یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ کسی جلسے میں پہلی دفعہ 1938ء میں قائداعظم کے لقب سے انہیں پکارا گیا اور یہ لقب فوری طور پر پورے ملک میں اس طرح مقبول اور مشہور ہوا کہ نام محمد علی جناح کی وضاحت کے لیے بتانا پڑتا تھا کہ اس سے مراد قائداعظم ہیں، کبھی کسی کو یہ نہیں بتانا پڑتا تھا کہ قائداعظم سے مراد آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح ہیں۔ یہ بھی ایک نرالی شان ہے جو شاید ان کو نصیب ہوتی ہے جن کے لیے اس قسم کا کوئی لقب بارگاہِ خداوندی میں منظور و مقبول ہوجائے۔ بڑے بڑے لقب بہت سے دوسرے لیڈروں کو بھی اس زمانے میں ملتے رہے، کوئی امیر ملت، کوئی قائد ملت، کوئی امیر شریعت، کوئی مجاہد ملت، کوئی رئیس احرار، کوئی ظفر الملت و دین وغیرہ کہلایا لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لقب کے غلاف میں اصل شخص کون ہے، ذہن پر ذرا زور ڈالنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قائداعظم کہہ دے یا لکھ تو پھر مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

محمد علی، ایک عظیم اور بابرکت نام ہے۔ دنیائے اسلام میں کئی بڑے لوگ ہوئے جن کا یہی نام تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر، دو بہت بڑے مسلمان لیڈروں کے ناموں سے مسلسل گونجتا رہا۔ وہ تھے مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح۔ انیس سو بیس کی دہائی میں برصغیر کے سیاسی افق پر یہی دو محمد علی اس طرح چھائے

رہے کہ کسی نے یہ مشہور جملہ کہا تھا کہ یہ دور ہی محمد علیین کا دور ہے۔ دونوں کے باہمی تعلقات بے حد مخلصانہ تھے۔ 1931ء میں اپنی وفات سے ذرا پہلے (لیکن اپنی زندگی کی شمع کو بجھتا ہوا محسوس کر کے) مولانا محمد علی جوہر نے قائداعظم کی قائدانہ صلاحیت کے بارے میں اس طرح کہا تھا: ''کاش، خدا، جناح کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ مسلمانوں کی راہنمائی اب ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکے گا''۔

یوں محمد علی جناح اور قائداعظم کے نام کا غلغلہ راس کماری سے لے کر پشاور تک ہوا۔ یہ کوئی عجیب اور پراسرار روحانی معاملہ تھا یا کہ نام میں ہی کوئی ایسا مقناطیسی اثر تھا۔ رئیس احمد جعفری اپنی کتاب ''قائداعظم اور ان کا عہد'' میں لکھتے ہیں: ''محمد علی جناح! کتنا عجیب و غریب ہے یہ نام۔ ہندوستان کے در و دیوار، ملک کا چپہ چپہ، سیاسی جماعتوں اور گروہوں کی بزم و محفل کا ایک ایک گوشہ آج اسی ایک نام سے گونج رہا ہے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر اسی کا ذکر، مہاسبھا کے پنڈال میں اسی کا تذکرہ، معتدلین کے مشورت خانوں میں اسی کا چرچا، حکومت کے دفتروں اور ایوانوں میں اسی کی دہشت، مسلمانوں کی ہر مجلس اور ہر انجمن میں اسی کا نام وردِ زبان۔ ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے اور ہر شام جب شب مہتاب جلوہ گر ہوتی ہے یہی ایک نام ہے''۔

قائداعظم کو جو بے مثال محبوبیت حاصل ہوئی، اس میں ان کے خوبصورت نام کا حصہ بھی ضرور ہوگا۔ قائد کی والدہ محترمہ کو اپنے اس بیٹے سے والہانہ محبت تھی کہ جس کے نام میں حضور نبی کریم ﷺ کے ذاتی مقدس نام کے علاوہ، حضرت علیؓ کا نام بھی شامل تھا۔ چنانچہ ننھے قائد کا یہ نام ان کی والدہ محترمہ کو بہت ہی عزیز تھا۔ ''محمد علی' نام کی عظمت اور ایک دوسری وجہ سے ان کی والدہ، (جن دنوں قائد لندن میں زیر تعلیم تھے) اکثر اپنی بیٹیوں سے کہا کرتی تھی: ''میرا یہ بیٹا ایک دن راجہ (حکمران) بنے گا۔ یہ بات اس کے مقدر میں طے ہے''۔ ان کی والدہ کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ ان کا محمد علی نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کا محبوب ترین لیڈر اور قائداعظم بنا بلکہ (اس وقت) دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کا بانی، گورنر جنرل اور بابائے قوم بھی!

مختار مسعود (آواز دوست) نے لکھا ہے کہ ''ہم قائداعظمؒ کی سوانح کو تحریک پاکستان کی تاریخ کہہ سکتے ہیں''۔ اس اعتبار سے بھی یہ موضوع قائداعظم کی سوانح میں شامل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اہم وجہ یہ ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلمان ہونے کے باوجود اپنی ساری توانائی، بے مثل خطیبانہ صلاحیتیں، ذہانت اور پروپیگنڈا مسلم لیگ کی مخالفت کے ساتھ ساتھ قائداعظم پر تکلیف وہ ذاتی حملوں، تمسخر، فقرے بازی اور کیچڑ اچھالنے میں صرف کیا۔ انہیں کافر اعظم، قاتل اعظم، کافرہ عورت سے غیر اسلامی نکاح کرنے والے لیڈر اور بہت کچھ کہا گیا جس پر قائداعظم نے تو خاموشی اختیار کی لیکن تاریخ نے ان لوگوں سے سخت بدلہ لیا اور یہ بدلہ شورش کاشمیری کے مطابق اس طرح لیا گیا: ''(قیام پاکستان کے اعلان کے بعد) نیشنلسٹ مسلمانوں کا سب سے برا حال تھا۔ وہ ہندو کی نگاہ میں مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نگاہ میں ہندو۔ ان کے حوصلے ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے تھے، وہ چوبِ مسجد کی طرح سوختنی تھے نہ فروختنی، ہندوستان نے انہیں پناہ دینے سے انکار کردیا تھا جس کی آزادی کے لیے وہ انگریزوں سے لڑتے رہے، حتیٰ کہ اپنی قوم کے قہر وغضب کا شکار ہوگئے، وہ اس دور افتادہ صدا کی طرح تھے جو صحراؤں سے بلند ہوکر ریت کے تودوں میں اتر جاتی ہے، پاکستان ان کے لیے ایک سیاسی یتیم خانہ تھا، وہ آزادی کی خوشیوں سے یکسر محروم ہو چکے تھے''۔

(بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل از آغا شورش کاشمیری ص510)

مختار مسعود نے لکھا ہے کہ قائداعظم کی قائدانہ خوبیوں کا بہترین اظہار ان کی مشکلات کا اندازہ لگانے سے ہوتا ہے۔ قائداعظم نے جب برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی تو ان کے لیے سیاسی منظر ویرانی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ مسلم لیگ کی حیثیت ایک سیاسی گروہ سے زیادہ نہیں تھی۔ قائداعظم کی قیادت کی وجہ سے یہ جماعت دیکھتے ہی دیکھتے ایک عوامی تحریک بن کر ہندوستان کے سیاسی افق پر چھا گئی۔ مسلم لیگ میں کوئی قد آور شخصیت موجود نہیں تھی۔ لیگ کی اس کمزوری سے بھی قائداعظم پر اس قدر بوجھ پڑ گیا جو کسی انسان کی برداشت سے باہر تھا۔ ''وہ لیگ کی امنگوں کے مظہر، مدبر، معاملہ

فہم اور منتظم اعلیٰ، یعنی سب کچھ ہی تھے۔ اگر کانگریس سے موازنہ کیا جائے تو قائد کی ذات میں گاندھی، نہرو، پٹیل، وی پی مینن سب ہی جمع نظر آتے ہیں، یہی قائداعظم کی بے مثل خوبی تھی''۔ (جناح پیپرز جلد اول ص 81، 82 از ڈاکٹر زوار حسین زیدی)
بطور لیڈر، قائداعظم نے دیکھا کہ مسلمانوں کے رجعتی عناصر نے مسلمانوں کی پسماندگی کو بطور ہتھیار اپنی بقا کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اس ہتھیار کو حکومت، کانگریس اور رجعتی مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح چھینا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ، جداگانہ انتخاب کی مسافت طے کرنے کے بعد پاکستان کا نصب العین ہوگیا۔ وہ رجعتی مسلمان جو مسلمانوں کے مقدر پر چھائے ہوئے تھے، ان کے لیے قائداعظم کے سامنے دم مارنا مشکل ہوگیا۔ مسلمان عوام قائداعظم کے اس قدر گرویدہ ہوگئے کہ ''ان کے سامنے ابوالکلام کا تبحر، حسین احمد مدنی کا تقویٰ، عطاء اللہ شاہ کی خطابت اور علامہ مشرقی کی عسکریت کا ٹھہرنا ناممکن ہوگیا، ان سب کے چراغ گجلا گئے۔ قائداعظم نے ان سب کو ہرا دیا''۔ ان کی قائدانہ صلاحیت کی تاثیر کا کمال یہ تھا کہ مسلمان عوام نے ہر اس لیڈر اور بڑے سے بڑے خطیب کو بھی مسترد کردیا جس نے قائداعظم کی قیادت سے انکار کیا اور اگرچہ وہ مطالبۂ پاکستان سے اتفاق بھی کر رہا ہو۔ احراری لیڈر مظہر علی کی اس حرکت کو مسلم عوام نے کبھی معاف نہیں کیا کہ اس نے قائداعظم کو ایک بار ''کافر اعظم'' کہا تھا۔ آخر میں اس نے جمعیت احرار سے مستعفی ہوکر مطالبۂ پاکستان کی تائید کرنے کا عندیہ ظاہر کیا مگر قائداعظم اور لیگ کی مخالفت جاری رکھی۔ ایک جلسے سے خطاب کے دوران اس نے کانگریس اور احرار پر سخت تنقید کی تو اس پر سامعین سے خوب داد سمیٹی۔ اس کے بعد اس نے لیگ کی خامیاں گنوانا شروع کیں تو شور مچ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ پاکستان کے مطالبے سے متفق ہے مگر قائداعظم کی پیروی نہیں کرسکتا اور سامعین سے سوال کیا: ''تم قائداعظم چاہتے ہو یا پاکستان؟'' جلسہ بول اٹھا: ''قائداعظم''۔ گویا یہ وہ جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔
قائداعظم کی شروع سے خواہش تھی کہ مذہبی علما، صوفیا اور صلحا بھی مطالبۂ

پاکستان کی حمایت کریں کیونکہ ان کا عوام کے ساتھ قریبی تعلق ہمیشہ ہوتا ہے۔ جب جمعیت العلما اور مجلس احرار کے بڑے بڑے علما نے قائداعظم کی اپیلیں بار بار رد کر دیں بلکہ کانگریس کو خوش کرنے کے لیے قائداعظم کی شخصیت اور مطالبہ پاکستان کا تمسخر اڑانا شروع کیا تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شاید یہ کائنات کے مالک کا اشارہ تھا یا کیا کہ ایسے ایسے علما اور نیک لوگ قائداعظم کی مدد کے لیے آگے بڑھے کہ مشاہدہ کرنے والے دنگ رہ گئے۔ یہ وہ صالحین اور علما تھے جن کی شخصیتیں غیر متنازع تھیں اور جن کا مسلمانوں میں بڑا احترام و اکرام تھا۔ ان میں ہر مکتب فکر کے سرکردہ علما شامل تھے۔ مثلاً اہل حدیث مکتب فکر کے مشہور مناظر، جمعیت العلمائے ہند کے سرکردہ رکن اور جید عالم و مفسر قرآن مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ڈنکے کی چوٹ پر قائداعظم، مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی، اس کے حق میں اپنے اخبار ''اہل حدیث'' میں بے شمار مضامین شائع کرنے کے علاوہ، ملک بھر میں تقاریر کیں۔ 1942ء میں جمعیت العلمائے ہند کی رکنیت بھی چھوڑ دی۔ وہ قائداعظم کی ذہانت، فراست، اخلاص، دردمندی، حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور قائداعظم کو 1919ء سے بہت قریب سے جانتے تھے۔ قائداعظم کی زبردست حمایت کرنے والوں میں بریلوی مسلک کے اعتدال پسند مشہور عالم اور مفسر قرآن مولانا نعیم الدین مراد آبادی بھی تھے جنھوں نے قوم پرستوں کے نظریہ کے ابطال اور پاکستان کی تجویز کے حق میں اپنے جریدے میں کئی مضامین لکھے۔ بریلوی مسلک کے ایک بڑے عالم دین مولانا عبدالحامد بدایونی قائداعظم کے بہت قریب اور لیگ کونسل کے رکن تھے، وہ مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں موجود تھے اور قرارداد لاہور پر دستخط بھی کیے تھے۔ اس دور کے مشائخ میں جنھوں نے قائداعظم اور ان کے مشن کی حمایت اور کامیابی کے لیے سرگرم کردار ادا کیا، حضرت پیر سید جماعت علی شاہ اور پیر صاحب مانکی شریف خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب مسجد شہید گنج کے تصفیہ کے وقت سے قائداعظم

کی شخصیت اور کام میں دلچسپی لے رہے تھے۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد پیر صاحب نے قائداعظم اور لیگ کے نصب العین کے لیے کام شروع کیا اور مسلمانوں کو لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جانے کی تلقین کی۔ 1943ء میں قائداعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو پیر صاحب نے قائداعظم کے نام ایک خط اور بہت سے دینی تحائف دے کر اپنا ایک خاص ایلچی ان کی مزاج پرسی کے لیے بھیجا تھا۔ 1944ء میں سری نگر میں پیر صاحب نے قائداعظم کی شاہانہ دعوت کی تھی اور تحائف دیے تھے۔ سنی علما کی ایک کانفرنس میں پیر صاحب نے مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا تو وہاں موجود جمعیت العلما کے بعض نمائندوں نے قائداعظم کے اسلام پر اعتراضات اٹھانے کی کوشش کی۔ ان اعتراضات کا پیر صاحب نے یہ برجستہ جواب دیا: ''تم لوگوں نے جناح کے ساتھ رشتہ داری قائم کرنی ہے کہ ان کا مذہب یا فرقہ پوچھتے ہو؟ وہ ہمارے وکیل ہیں اور ہمارا کام کر رہے ہیں''۔ 1946ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے پیر صاحب نے ملک بھر کے دورے کیے اور فتویٰ جاری کیا کہ مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دینے والے کا نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں اسے دفن کیا جائے۔ انہوں نے کئی بار مسلم لیگ کے فنڈ میں خطیر چندہ بھی دیا۔ ضلع پشاور کے علاقہ مانکی شریف میں پیر محمد امین الحسنات نے بھی قائداعظم اور لیگ کی کامیابی کے لیے بے مثال کام کیا تھا۔ انہوں نے اکتوبر 1945ء میں علما اور مشائخ کی ایک بڑی کانفرنس منعقد کی جس میں ملک بھر سے آئے علما اور مشائخ نے پیر صاحب مانکی شریف کی تجویز پر قائداعظم، پاکستان اور آئندہ الیکشن میں لیگی امیدواروں کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔ کانفرنس کے ایک ماہ بعد نومبر میں قائداعظم نے صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ کیا۔ وہ پیر صاحب کی دعوت پر مانکی شریف بھی گئے۔ پشاور سے مانکی شریف کے جلسے سے پہلے پیر صاحب نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا تھا۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے یقین دلایا کہ پاکستان میں قرآن کے قانون پر عمل کیا جائے گا جس پر

سب مسلمانوں کو اتفاق تھا۔ سردار عبدالرب نشتر (آزادی کی کہانی میری زبانی) نے لکھا ہے کہ جب قائداعظم جلسہ کے بعد مانکی شریف سے رخصت ہورہے تھے تو تمام پیر اور مشائخ پیر صاحب مانکی شریف سمیت قائداعظم کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یہ نقشہ دیکھ کر سردار عبدالرب نشتر کو بے ساختہ ہنسی آئی جو انہوں نے بمشکل ضبط کی۔ واپسی کے سفر میں جب وہ کار میں قائداعظم کے ساتھ بیٹھے تو ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا کہ جن پیروں اور گدی نشینوں کے سامنے عوام احترام سے جھکتے ہیں وہ سب ان کے پیچھے سر جھکائے چل رہے تھے اور وہ ایک ایسا منظر تھا کہ ان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہورہا تھا۔ قائداعظم نے کہا: ''تمہیں معلوم ہے اور ان کو بھی معلوم ہے کہ میں متقی، پرہیزگار اور زاہد نہیں، مغربی لباس پہنتا ہوں۔ اس کے باوجود یہ لوگ میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک (احترم) اس لیے کرتے ہیں کہ ہر مسلمان کو یقین ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق میرے ہاتھ میں محفوظ ہیں اور میں کسی قیمت پر اپنی قوم کو فروخت نہیں کرسکتا۔'' بہرحال، قائداعظم بھی پیر صاحب مانکی شریف کو بہت عزت دیتے تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی عبدالغفار خان کے طلسم کو توڑا اور 1946ء کے انتخابات میں لیگ کی صوبہ سرحد میں کامیابی کے لیے قابل قدر کام کیا۔

پروفیسر احمد سعید

قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی فکری ہم آہنگی

آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے قیام کے بعد قائداعظم اور علامہ اقبال ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ یہاں آگے بڑھنے سے پیشتر اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ آخر علامہ اقبال کی نگاہ انتخاب برعظیم کے سیکڑوں مسلمان راہنماؤں میں سے صرف قائداعظم پر ہی کیوں ٹھہری۔ اس وقت پنجاب میں سر سکندر حیات خان ایسے ذہین اور منجھے ہوئے سیاست دان بھی موجود تھے اور جن کی یونینسٹ پارٹی میں وہ کام بھی کر چکے تھے۔ مولوی اے کے فضل الحق جیسے تجربہ کار سیاست دان اور جری شخص بھی زندہ وسلامت تھے جن کی بنگال میں پرجا پارٹی پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی مانند خاصا اثر ونفوذ رکھتی تھی۔ خان عبدالغفار خان بھی اس وقت صوبہ سرحد کی ایک جماعت کے سربراہ تھے۔ مولانا ظفر علی خان بھی اپنی اتحاد ملت پارٹی کی سربراہی کر رہے تھے۔ پنجاب ہی میں چودھری فضل حق جیسے دردمند مفکر متوسط درجے کے مسلمانوں کی جماعت مجلس احرار کی آبیاری کر رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی جیسے دلیر، بے باک اور پیکر حریت ہستی اور مولانا شوکت علی جیسے کہنہ مشق سیاست دان اور سرفروش ہستی بھی موجود تھی۔ میدان سیاست میں ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی بھی سرگرم عمل تھے لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے علامہ اقبال کی نظر قائداعظم پر کیوں ٹھہری؟ اس کا جواب خود انہی کی زبانی سنیے:

❑ ''مسلمانوں کی قیادت کا اہل اگر کوئی شخص ہوسکتا ہے تو وہ صرف جناح ہیں۔ اس لیے کہ وہ دیانت دار ہیں۔ انہیں خریدا نہیں جا سکتا۔ وہ مخلص ہیں۔ ان سے اختلاف رائے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے لائحہ عمل سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے تاہم ان کی

نیت پر شبہ ممکن نہیں۔ میں نے خود سائمن کمیشن کے ضمن میں ان سے اختلاف کیا۔ مجھے لکھنؤ پیکٹ کے بارے میں بھی ان سے اختلاف ہے۔اس کے باوجود میں ان پر بھرپور بھروسا کر سکتا ہوں کہ وہ قوم کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے، بے غرض ہو کر سوچیں گے۔ وہ کسی لالچ یا حرص یا ہوس کے باعث قومی مفاد کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔انہیں اسلام کے دین حق ہونے پر کامل یقین ہے نیز یہ کہ وہ بے خوف ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے مغربی جمہوریت کی انگریزی صورت کا انگلستان میں رہ کر گہرا مطالعہ کیا اور برعظیم میں جس قدر طویل براہ راست تجربہ اس جمہوری عمل کا انہیں حاصل ہے اتنا کسی اور کو نہیں۔ (1)

1936ء میں حیدر آباد دکن کے صحافی بادشاہ حسین نے علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا کہ ''عظیم شاعر اور فلسفی کے ساتھ میری ایک گفتگو ان کی وفات سے دو سال پیشتر ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ ہندو فرعونوں کی غلامی سے ہندوستانی مسلمانوں کو نجات دلانے والے موسیٰ کی تلاش میں علامہ اقبال کی نگاہ انتخاب قائداعظم محمد علی جناح پر کیوں پڑی۔ یہ گفتگو اس طرح ہوئی۔

❑ ''ڈاکٹر اقبال: میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ مجھے اپنے دینی بھائیوں سے کتنی گہری محبت ہے، شاید دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح تمہارا بھی یہ خیال ہے کہ سیاست میرا کھیل نہیں ہے۔ میرے پیارے نوجوان دوست میرے نظریئے کے مطابق میری قوم کی ترقی کا راز سیاسی آزادی میں پنہاں ہے۔ برطانوی استعمار ہمارے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے اور ہندوؤں کا غلبہ بھی ہمارے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں طرف کا دباؤ ہمیں کچل رہا ہے۔ ان حالات میں ہر صحیح الفکر مسلمان نہ صرف ہندوستانی سیاست میں حصہ لے رہا ہے بلکہ بہت مضطرب بھی ہے۔

بادشاہ حسین: کیا اسی وجہ سے آپ سیاست کے میدان میں داخل ہوئے؟

ڈاکٹر اقبال: میرے سیاست میں داخل ہونے سے آپ کا مفہوم کیا ہے؟ میں پہلے بھی میدان سیاست میں تھا اور اب بھی ہوں۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود میری

ساری زندگی کا مشن رہا ہے، کیا یہ سیاست سے کوئی مختلف چیز ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں عوامی راہنما نہیں رہا تو یہ محض غلط فہمی ہے۔ میں نے اپنے کلام سے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ کیا میں نے مسلمانوں میں کہتری کے غلط احساس کو ختم نہیں کیا؟ کیا میں نے یہ تلقین نہیں کی کہ مسلمان مجاہد ہیں؟ کیا میں نے انجام کار اس برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا تصور نہیں دیا۔

بادشاہ حسین: بے شک آپ نے ایسا ہی کیا ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحیح راہنما ہے جو مجاہدوں کی قوت کو منزل مقصود حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکے۔ آپ کے خیال میں کیا مسٹر جناح مطلوبہ شخصیت (Man of the Destiny) ہیں؟

ڈاکٹر اقبال: جی ہاں! میری بصیرت کہتی ہے کہ مسٹر جناح ملت اسلامی کو منزل مقصود تک پہنچائیں گے۔

بادشاہ حسین: کیا آپ نے انہیں بالکل قریب سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر اقبال: ہم نے اکثر اوقات تقریباً تمام اہم مسائل پر خط و کتابت کے ذریعے عملاً گفتگو کی ہے۔ ہم نے ملاقاتوں کے ذریعے بھی تفصیل سے باہم تبادلہ خیالات کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح سے بڑھ کر کوئی دوسرا راہنما اس مشکل کام (Uphile Task) کو سرانجام نہیں دے سکتا۔

بادشاہ حسین: لیکن شاید عوام میں انہیں مقبولیت حاصل نہیں۔

ڈاکٹر اقبال: یہ میری پیشین گوئی ہے کہ مسٹر جناح ایسے کردار، اخلاق، فہم و تدبر اور عزم محکم کے مالک ہیں جن کی بنا پر وہ بہت جلد ایک ایسے عوامی ہیرو بن جائیں گے کہ مسلم ہندوستان میں ابھی تک اس قسم کا کوئی لیڈر پیدا ہی نہیں ہوا۔ مسٹر جناح برطانوی استعمار اور نوکر شاہی کی اصلیت سے بخوبی واقف ہیں اور وہ کانگریس کی ذہنیت کے بھی بھیدی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف وہی ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتے اور ان کو شکست دے سکتے ہیں۔ (2)

بادشاہ حسین کی تحریر کے ثقہ ہونے کا ثبوت حوالدار عبدالرحیم خاکی کے تحریر کردہ

واقعہ سے ہوتا ہے جنھوں نے علامہ اقبال سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

❑ ''اوائل اپریل 1936ء کی بات ہے کہ ہم لوگ ایک مختصر سی جمعیت کی شکل میں حضرت علامہ اقبال کے آستانہ پر حاضر ہوئے۔ راجا حسن اختر نے ہمارا تعارف کرایا۔ راجا فضل الٰہی جو ہمارے مختصر سے قافلہ کے سرخیل تھے، اپنی بیاض خاص نکالی اور ایک کے بعد ایک جواب طلب امور حضرت علامہ سے دریافت کرنے لگے۔ بات پھیلتے پھیلتے خودی تک جا پہنچی جو علامہ کا موضوع عزیز تھا۔ آخر میں راجا فضل الٰہی نے گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا کہ ''آپ کا درسِ خودی خوب رہا۔ بلاشبہ ہمارا ذہن تاریک خلاؤں میں بھٹک رہا تھا اور آپ کی شمع ہدایت نے سیدھی راہ سجھا دی ہے مگر ایک اور بات اگر آپ اسے جسارت نہ سمجھیں تو عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔ ''کیوں نہیں کیوں نہیں'' حضرت علامہ نے پہلو بدلتے ہوئے فرمایا: ''آپ ضرور پوچھیں جو کچھ میں جانتا ہوں ضرور بتلاؤں گا''۔

راجا صاحب نے صراحت سے پوچھا کہ ''ہندوستان میں کوئی ایسا شخص ہے جسے ہم آپ کی خودی کا مظہر کہہ سکیں''۔

''ہاں بالکل ہے''۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''اور وہ محمد علی جناح ہے۔ اپنی قوم کو میں جس خودی کا درس دے رہا ہوں، وہ محمد علی جناح کے وجود میں جلوہ فرما ہے۔ یہ انگریزی ماحول کا اور تہذیب کا پروردہ شخص بڑا ہی کام کا ہے۔ زبان اس کے دل کی رفیق ہے۔ حق بات کہنے میں اسے باک نہیں، نہایت ہی اعتباری آدمی ہے۔ قوم کی راہنمائی اسے سونپ دی جائے تو بگڑی بن سکتی ہے۔ مسلم قوم کا نجات دہندہ ہونے کی ساری صفات اس میں پائی جاتی ہیں۔ وقت موافق ہو یا ناموافق، قوم کی خدمت کرنے کا اسے موقع میسر آ جائے تو یہ دنوں میں انقلاب لا سکتا ہے''۔

راجا فضل الٰہی اس پر چونک اٹھے کیونکہ ان کے نزدیک محمد علی جناح ایک چوٹی کے وکیل ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھے۔ معاً سوال کیا کہ ''اسے کیونکر میدانِ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ قوم کا کارواں بے حس ہی نہیں احساس زیاں تک سے محروم ہو چکا ہے''۔ حضرت علامہ نے کہنا شروع کیا۔

میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ انہیں سیاسی میدان میں مسلم قوم کی راہنمائی پر آمادہ کرسکوں۔ بہت دنوں سے میرے اور ان کے درمیان اس موضوع پر خط و کتابت جاری ہے۔ وہ میرے خیالات سے متاثر تو ہیں، دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے"۔ (3)

علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری دو سالوں میں پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کے لیے جس سرگرمی کے ساتھ کام کیا، خود قائداعظم نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ اب دونوں راہنما ایک دوسرے پر بے حد اعتماد کرنے لگے تھے۔ اکتوبر 1937ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو ایک بیان دیا جس میں آپ نے کہا:

- "آج کل مسلمانوں کا سب سے اہم فرض یہی ہے کہ وہ اپنی تنظیم کریں اور ہندوستان کی واحد اسلامی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ ہماری امیدیں نوجوانوں سے وابستہ ہیں جنھیں عنقریب مستقبل کا بوجھ اور ذمہ داری اٹھانی پڑے گی۔ میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خیال آرائیوں سے گمراہ ہونے کے بجائے حقائق کی روشنی میں عملی کام کر کے دکھائیں۔ میں آپ کی کامیابی کے لیے دست بدعا ہوں"۔ (4)

علامہ اقبال نے اپنے پیام میں قائداعظم کے بیان کی تائید فرماتے ہوئے کہا:

- "میں مسٹر جناح کے ایک ایک لفظ کی تائید کرتا ہوں۔ مسلمان نوجوانوں کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دیا جا سکتا"۔ (5)

1937ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ بیان داغا کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی جماعتیں ہیں، ایک کانگریس اور دوسری حکومت۔ اس پر قائداعظم نے پنڈت نہرو کو للکارا اور کہا کہ نہیں ایک تیسری پارٹی بھی موجود ہے اور وہ مسلمان ہیں۔ ساتھ ہی قائداعظم نے کانگریس کی اس پالیسی پر بھی اظہار افسوس کیا جو وہ مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کر کے اختیار کر رہی تھی۔ قائداعظم نے اس بیان پر پنڈت جی سے سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے۔ اس موقعہ پر علامہ اقبال نے جو بیان دیا،

اس سے قائداعظم کے متعلق علامہ کے دلی جذبات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ نے اپنے بیان میں کہا:

❑ ''میرے دل میں پنڈت نہرو کی بہت عزت ہے۔ انھوں نے آزادی وطن کی خاطر جو مصائب برداشت کیے ہیں اور قربانیاں گوارا کی ہیں، میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے بلاوجہ مسٹر جناح کے ساتھ الجھنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے، وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کے بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے ان کی قوم پرستی اور حب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیئے پر مبنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ پنڈت نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں''۔ (6)

ملت کے یہ دونوں زعما ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے تھے اور ایک دوسرے پر حد درجہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ اب علامہ اقبال قائداعظم کے سوا کسی کو اپنا لیڈر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے پنڈت نہرو اور میاں افتخار الدین کی علامہ اقبال کے ساتھ ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس ملاقات میں میاں افتخار الدین نے کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا''۔ علامہ اقبال لیٹے ہوئے تھے، یہ بات سنتے ہی غصے میں آ گئے اور انگریزی میں فرمانے لگے:

❑ ''اچھا تو چال یہ ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں''۔ (7)

سید نذیر نیازی نے بھی اس ملاقات کا ذکر اپنی کتاب ''اقبال کے حضور'' میں

کیا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ ''میاں افتخار الدین نے کہا کہ مسلمان بھی آزادی وطن کے ایسے ہی خواہش مند ہیں جیسے ہندو۔ وہ بھی شہنشاہیت کے ایسے ہی دشمن ہیں جیسے کوئی اور۔ آپ حق بات کیوں نہیں کہتے کہ مسلمانوں پر آپ ہی کا اثر ہے، جناح کی کون سنتا ہے''۔ اس پر علامہ نے فرمایا ''مجھے یہ کہنے میں کیا عذر ہے کہ مسلمان آزادی کے طالب، استعمار اور شہنشاہیت کے دشمن ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جناح تو حق بات سن لیتے ہیں، نہیں سنتی تو کانگریس''۔ قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی جو کوشش کر رہے تھے، ان کے متعلق علامہ نے فرمایا:

- ''اس امر سے تو شاید آپ کو (میاں افتخار الدین) بھی انکار نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کا اتحاد ایک امر ضروری ہے تو جناح کی قیادت سے جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہوا ہے تو کیا اسے اس لیے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم متحد ہو جائیں''۔ (8)

1936ء کے آخری دنوں میں ایک روز قائداعظم کی امانت و دیانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس پر علامہ اقبال نے کہا:

- ''مسٹر جناح کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج تک ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آئی۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے، تو آپ انگریزی میں فرمایا:

He is incorruptible and unpurchaseable

بات یہ ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں پارلیمانی طرز حکومت کے نام سے اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کرنے کا ایک جال بچھایا ہے۔ جناح اس جال کی ایک ایک گرہ سے واقف ہے۔ وہ بیچارہ صرف یہ کہتا ہے کہ مسلمان اس نظام حکومت کے ماتحت کہیں خسارہ نہ اٹھائیں، اس لیے وہ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں آپ کو ہوشیار ہو جانے کی تلقین کرتا ہے''۔ (9)

قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں ''دین'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ علامہ کو جب یہ تقریر پڑھ کر سنائی گئی تو آپ نے قائداعظم کے لفظ ''دین'' استعمال کرنے پر اپنی مسرت کا

اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ’’جناح کی زبان سے دین کا لفظ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے‘‘۔ (10)

قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے طرز عمل اور خصوصیت سے ’’بندے ماترم‘‘ اور اُردو زبان کا ذکر کیا۔ قائد اعظم نے اس تقریر میں ’’بندے ماترم‘‘ کے مسلم دشمن ترانے کے متعلق فرمایا:

- ’’اس سے شرک کی بو آتی ہے اور یہ مسلمانوں کے خلاف ایک قسم کا نعرہ جنگ ہے‘‘۔ کانگریسی صوبوں میں ہندی زبان کے جبری نفاذ کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ ’’میرے خیال میں یہ چیز اسلامی تمدن اور اُردو زبان کے لیے پیغام مرگ ہے اور ہمارے بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوگی‘‘۔ (11)

ایک مجلس میں جب علامہ اقبال کو قائد اعظم کی مندرجہ بالا تقریر پڑھ کر سنائی گئی تو علامہ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا:

- ’’دو باتوں سے جی خوش ہوا ایک تو جناح کے یہ کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے، دوسرے اس پر کہ ہندی زبان تحریک دراصل اُردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر‘‘۔ (12)

علامہ اقبال، قائد اعظم کی قیادت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ آپ کی یہ پختہ رائے تھی کہ مسلمانوں کی مشکلات کا مداوا یوں ہوسکتا ہے کہ:

- ’’انھیں چاہیے کہ جناح کے ہاتھ مضبوط کریں۔ متحدہ محاذ، لیگ کی ہی سربراہی میں قائم ہوسکتا ہے اور لیگ کامیاب ہوگی تو جناح کے سہارے۔ جناح کے سوا اب کوئی مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں‘‘۔ (13)

علامہ اقبال نے اپنی اس پختہ رائے کا اظہار یونینسٹ پارٹی کے ترجمان روزنامہ انقلاب کے مدیران غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک سے بھی کیا جو علامہ سے ملاقات کی غرض سے آئے تھے۔ دورانِ گفتگو علامہ نے دونوں حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

- ’’ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے۔ لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے، سب اس میں شامل ہو جائیں۔ مسلمانوں کی زمام

قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں ہو۔ ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔'' (14)

مارچ 1940ء میں یوم اقبال کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سرعبدالقادر نے ایک واقعہ سنایا جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ علامہ اقبال کی نگاہ میں قائداعظم کو کیا مقام حاصل تھا۔ سرعبدالقادر نے بتلایا کہ 20 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال کو نٹال (Natal) کے ایک انگریزی اخبار کا تراشا موصول ہوا جس میں مسلمانانِ نٹال کی طرف سے اتاترک، علامہ اقبال اور قائداعظم کی طویل زندگی کی دعا کا ذکر تھا۔ علامہ اقبال کو جب یہ تراشا پڑھ کر سنایا گیا تو انھوں نے کہا کہ ''میں تو اپنی زندگی کا کام ختم کر چکا ہوں۔ مسٹر جناح نے ابھی زندگی کا مشن پورا کرنا ہے، اس لیے مسلمان ان کی زندگی کے لیے دعا کریں''۔ (15)

....

دوسری جانب قائداعظم محمد علی جناح نے بھی کھلے دل سے علامہ اقبال کی خدمات کا اعتراف کیا۔ 1943ء میں لاہور کے مشہور ناشر کتب شیخ محمد اشرف نے، اقبال کے خطوط بنام جناح، شائع کیے۔ قائداعظم نے ان خطوط کا دیباچہ تحریر کیا جس میں قائداعظم نے اپنے دوست اقبال کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا ذکر کیا۔ یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود قائداعظم نے میاں بشیر احمد (سابق مدیر ہمایوں) کے نام مندرجہ ذیل خط میں ان خطوط کو ''تاریخی خطوط'' قرار دیا تھا۔

❑ ''مائی ڈیر میاں بشیر احمد، کچھ پرانے کاغذات دیکھتے ہوئے مجھے سر محمد اقبال کے چند پرانے خطوط ملے جو انھوں نے مجھے اپنی وفات سے قبل 1935ء اور 1938ء کے درمیان لکھے تھے۔ چونکہ یہ خطوط تاریخی اہمیت حاصل کر چکے ہیں، اس لیے میں ان کو محفوظ کر لینا چاہتا ہوں لیکن بدقسمتی سے ان خطوط کے جوابات جو میں نے تحریر کیے، وہ دستیاب نہیں ہیں کیونکہ ان خطوط کی نقول میں نے اپنے پاس نہیں رکھیں۔ کیا آپ مہربانی فرما کر ان خطوط کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں گے اور مجھے جلد از

جلد ارسال کریں گے"۔ (16)

قائد اعظم محمد علی جناح نے ان خطوط کے دیباچے میں جو کچھ تحریر فرمایا، وہ آپ کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے لکھا:

❑ "یہ خطوط اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں، وہ ہمارے قومی شاعر، فلسفی اور دانشور، مرحوم ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مئی 1936ء سے نومبر 1937ء کے درمیانی عرصے میں مجھے لکھے۔ یہ بات ان کی وفات سے چند ہی ماہ قبل کی ہے۔ یہ عرصہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے ایسے دور کے ساتھ آتا ہے جو نہایت اہم واقعات سے پر ہے یعنی آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا قیام جون 1936ء اور اکتوبر 1937ء میں ہونے والے تاریخی اجلاس لکھنؤ کا درمیانی وقفہ"۔

مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کی صوبائی شاخیں پہلی بڑی کوشش تھی تاکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت ہونے والے آئندہ انتخاب کے لیے مسلمانوں کی رائے ہموار کی جائے جس کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے لیے لیگ کے ٹکٹ جاری کیے گئے تھے۔ اگر یہ پہلا اہم اقدام تھا تو دوسرا بڑا قدم جو اٹھایا گیا، وہ اجلاس لکھنؤ میں یہ مرحلہ طے کرنا تھا کہ مسلم لیگ کو کس طرح از سر نو منظّم کیا جائے تاکہ وہ مسلم عوام کی رائے کی عکاس بن سکے اور مسلم ہند کی واحد بااختیار نمائندہ جماعت بن سکے۔

ان دونوں مقاصد کا حصول زیادہ تر اپنے دوستوں بالخصوص علامہ اقبال کی بے لوث تائید، مخلصانہ کوشش، بے غرض مساعی اور سچی کوششوں کے باعث ہوا اور لیگ اس مختصر عرصے میں قوت پکڑتی چلی گئی۔ ان تمام صوبوں میں جہاں لیگ پارلیمانی بورڈ اور لیگ پارٹیاں قائم کی گئیں، لیگ کے امیدواروں نے جس قدر نشستوں کے لیے الیکشن لڑے، ان میں سے 60 سے 70 فیصد تک نشستیں جیت لیں۔ مدراس کے دور دراز علاقے سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے تک ہر صوبے میں سینکڑوں ڈسٹرکٹ اور ابتدائی لیگیں قائم ہو گئیں۔

لیگ نے کانگریس کی جاری کردہ نام نہاد مسلم عوامی رابطے کی تحریک جو

مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے اور لیگ کو مطیع بنانے کے لیے شروع کی گئی تھی، اس پر کاری ضرب لگائی۔ لیگ نے بیشتر ضمنی انتخابات جیت لیے اور جو لوگ ریشہ دوانیوں اور عیارانہ سازشوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں، ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

لکھنؤ اجلاس سے صرف اٹھاہ ماہ قبل آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے ابھری اور اس کا ایک ترقی پسندانہ اور ترقی پذیر پروگرام بھی وجود میں آ گیا اور اس کے زیر اثر وہ صوبے بھی آ گئے جو وقت کی کمی یا تیاری کی کمی کے سبب ابھی تک لیگ پارلیمانی بورڈ کی سرگرمیوں سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھا سکے تھے۔ لکھنؤ اجلاس نے اس امر کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کر دیا کہ لیگ کے مسلمانوں کے تمام طبقوں اور گروہوں میں کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔

مسلم لیگ کے لیے ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ اکثریتی اور اقلیتی دونوں صوبوں میں اس کی قیادت تسلیم کر لی گئی۔ اس کامیابی کا سہرا تمام تر سر محمد اقبال کے سر ہے جو اس وقت عوام کے سامنے ظاہر نہیں ہوا۔ سکندر جناح پیکٹ پر عمل کے سلسلے میں ان کے اپنے کچھ شکوک تھے اور وہ اس کی تعبیر اور روشن نتائج کو جلد از جلد دیکھنے کے خواہش مند تھے تاکہ ابھرتے ہوئے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔ مگر افسوس کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے کہ پنجاب میں اس قدر ہمہ گیر ترقی ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ مسلمان مضبوطی کے ساتھ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد ان خطوط کو بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا، تاہم مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اقبال کو جو جوابات میں نے تحریر کیے، دستیاب نہیں ہیں۔ مذکورہ عرصے کے دوران میں بالکل تنہا اور ذاتی عملے کی معاونت کے بغیر کام کرتا تھا۔ چونکہ مجھے متعدد خطوط کے جوابات خود ہی لکھنا ہوتے تھے، اس لیے ان کی نقول بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ میں نے اس ضمن میں لاہور میں اقبال کے لواحقین سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جوابات وہاں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا میرے لیے کوئی اور

صورت نہ تھی کہ ان خطوط کو اپنے تحریر کردہ جوابات کے بغیر ہی شائع کر دوں کیونکہ میرے نزدیک یہ خطوط بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں اقبال نے مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے تصورات سے ہم آہنگ تھے۔ ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے، ان کے گہرے مطالعہ اور غور وخوض کے بعد میں بھی آخر کار ان ہی نتائج تک پہنچا جن تک سر اقبال پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اور یہ خیالات وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کے متحدہ عزم کی شکل میں ظاہر ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرار داد کی صورت میں ڈھل گئے جو 23 مارچ 1940ء کو منظور ہوئی اور جسے اب قراردادِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے''۔ (17)

21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس روز قائد اعظم محمد علی جناح کلکتہ میں موجود تھے جہاں کے مسلمان فٹ بال گراؤنڈ میں فلسطین کے معاملے پر غور وخوض کے لیے جمع تھے۔ جونہی ان کی وفات کی خبر جلسہ گاہ میں پہنچی تو اسے تعزیتی جلسے میں تبدیل کر دیا گیا۔ قائد اعظم نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کو نہایت شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

- ''ان کی وفات نے دنیائے اسلام پر افسردگی اور رنج وغم طاری کر دیا ہے۔ اقبال بلاشبہ تمام ادوار کے عظیم ترین شاعر، فلسفی اور پیامبر انسانیت تھے۔ انہوں نے ملکی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور اسلامی دنیا کی ذہنی اور ثقافتی تشکیل نو میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ادب اور فکری دنیا میں ان کی کاوشیں ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے۔ ایک ذاتی دوست، فلاسفر اور راہنما ہونے کے ناطے میرے لیے وہ روحانی فیضان کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ بحیثیت صدر پنجاب پراونشل مسلم لیگ وہ علالت کے باوجود تن تنہا تمام دنیا کی مخالفت کے آگے ایک مضبوط چٹان کی طرح دلیری کے ساتھ لیگ کے جھنڈے کو تھامے رہے۔ جب انہیں اپنی شدید علالت کے باعث لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونا پڑا تو انہیں لیگ کا سرپرست منتخب کیا گیا۔ اس کے باوجود وہ لیگ کی راہنمائی کرتے رہے۔

آج اگر وہ زندہ ہوتے تو انہیں یہ جان کر زبردست اطمینان ہوتا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان اب آل انڈیا مسلم لیگ کے مشترک پلیٹ فارم پر جمع ہو چکے ہیں اور اس کامیابی میں اقبال کا غیر مرئی حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اس مرحلے پر ان کی وفات سے مسلمانوں کو اس سے زیادہ شدید دھچکا نہیں لگ سکتا ہے''۔ (18)

قائد اعظم اپنے فلسفی شاعر اور دستِ راست سے محروم ہو گئے۔ علامہ کی ذات آل انڈیا مسلم لیگ اور قائد اعظم محمد علی جناح دونوں کے لیے پنجاب میں زبردست قوت کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے اپنے دوست علامہ اقبال کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ قائداعظم نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ:

❑ ''مجھے سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت ممتاز شاعر تھے۔ ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انہوں نے اتنی زیادہ خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ کسی بھی عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جا سکتا ہے۔ ابھی حال ہی تک وہ پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے جبکہ ایک غیر متوقع علالت نے انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے حامی تھے۔ میرے لیے وہ ایک راہنما بھی تھے، دوست بھی اور فلسفی بھی۔ تاریک ترین لمحوں میں جن سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انہوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہوگا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدین کے مابین ہوگیا اور آج میں فخر ومباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب مکمل طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور اس کے جھنڈے تلے آ چکے ہیں جو یقیناً سر محمد اقبال کے لیے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور گہری ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں۔ اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ایک عظیم نقصان پہنچا ہے''۔ (19)

4 دسمبر 1938ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس قائداعظم

محمد علی جناح کی زیر صدارت منعقد ہوا جہاں علامہ اقبال کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔اس اجلاس میں علامہ کی وفات پر مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

❑ ''آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ایک فلسفی اور عظیم قومی شاعر کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر اپنے ماضی کی روایات کو سامنے رکھ کر کریں۔ اگرچہ آج وہ ہم میں موجود نہیں لیکن اپنی لاثانی شاعری کے ذریعے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کا کلام تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔کونسل کا یہ اجلاس ان کی وفات پر انتہائی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے''۔ **(20)**

26 دسمبر **1938**ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں قائداعظم نے اپنے دوست علامہ اقبال کی وفات پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

❑ ''علامہ اقبال میرے ذاتی دوست تھے جن کا شمار دنیا کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے۔ان کی عظیم شاعری ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ان کی شاعری ہمارے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی''۔ **(21)**

مارچ **1940**ء میں جب قائداعظم آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو اس موقع پر آپ نے پنجاب یونیورسٹی ہال میں **25** مارچ کو منعقدہ یوم اقبام کے ایک جلسے کی صدارت بھی کی۔ قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں علامہ اقبال کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

❑ ''اقبال میرا پرانا دوست تھا۔آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتدا میں ایک قسم کی علمی **(Academic)** جماعت تھی۔ **1936**ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل **1936**ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا وہ علامہ اقبال تھے۔ میں نے انہیں

اپنے خیالات پیش کیے انہوں نے فوراً لبیک کہی اور اس وقت سے تادم مرگ اقبال میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ اقبال بہت بڑے آدمی تھے اور بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں زندہ رہیں گی، اقبال کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھا لیکن دنیا میں ''شاعرِ اعظم'' کی حیثیت سے متعارف تھا۔ اقبال نے مسلمانوں میں قومی شعور پیدا کرنے اور اس کی نشو ونما میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں علی گڑھ سے بریلی کا سفر کر رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے؟ دفعتاً ان سب نے اقبال کا یہ ترانہ پڑھنا شروع کر دیا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

شعرا اقوام میں جان پیدا کرتے ہیں، ہلٹن۔ شیکسپیئر اور بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا کہ اسے جب شیکسپیئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا''۔ (22)

2 مارچ 1941ء کو یوم اقبال کی ایک اور مجلس سے قائد اعظم نے خطاب کیا۔ اپنی تقریر میں قائد اعظم نے کہا:

❑ ''اگر میں اس تقریب میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی بے انصافی کرتا۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسے میں شامل ہو کر اقبال مرحوم کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبال کی ادبی شخصیت عالم گیر ہے۔ وہ بڑے ادیب، بلند پایہ شاعر اور مفکر اعظم تھے لیکن اس حقیقت کو میں ہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑے سیاست دان بھی تھے۔ انہوں نے آپ کے سامنے ایک واضح اور صحیح راستہ رکھ دیا

ہے جس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ مجھے ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار، رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی اور وہ اس پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔ ان کی علمی اور ادبی گل کاریوں کی وجہ سے ان کا نام جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہے''۔ (23)

1941ء میں شاہد حسین رزاقی نے ''اقبال اور سیاست'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس کتاب پر جو دیباچہ لکھا، اس کا ایک ایک لفظ اقبال کے لیے عقیدت و احترام میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ قائداعظم نے لکھا:

❑ "Every great movement has a philosopher and Iqbal was the philosopher of the national renaissance of Muslim India. He, in his works, has left an exhaustive and most valuable legacy behind him and a message not only for the Muslims but for all other nations of the world.

Iqbal was a poet who inspired the Muslims with the spirit and determination to restore to Islam its former glory and although he is no more with us, his memory will grow younger and younger with the progress and developement of Muslim India". (24)

نومبر 1942ء میں قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ 22 نومبر 1942ء کو آپ میاں بشیر احمد (سابق مدیر ہمایوں) اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں کے ہمراہ علامہ اقبال کے مزار پر پہنچے۔ فاتحہ کے بعد قائداعظم کو علامہ اقبال کا وہ فقرہ دلایا گیا جو انھوں نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مسٹر جناح آپ واحد شخص ہیں جو اسلامی ہند کو اس سیلاب سے بچا سکتے ہیں جو 1935ء کے آئین حکومت ہند کے جلو

میں آ رہا ہے۔تو قائداعظم نے فرمایا:

□ ''میں اس زمانے میں تین مرتبہ پنجاب آیا، اگر مجھے تسکین ملی تو اس مرد قلندر کی بارگاہ میں''۔ اس کے بعد قائداعظم کو''ذوق وشوق'' کے چند اشعار سنائے گئے تو آپ نے سن کر فرمایا:''روح مسلمان میں واقعی اضطراب ہے اور ان شاء اللہ ہم ایک عظیم الشان اور پاکیزہ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوں گے''۔(25)

1944ء میں ایک مرتبہ پھر قائداعظم نے علامہ اقبال کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ یوم اقبال کے موقع پر آپ نے کہا:

□ ''میں اس دن جبکہ ہمارے عظیم ملی شاعر، فلاسفر اور مفکر اقبال کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوص قلب سے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی اطمینان بخشیں۔

اگرچہ اقبال آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کا غیر فانی کلام ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ ان کی شاعری جو کہ حسن بیان کے ساتھ حسن معانی کی بھی آئینہ دار ہے، اس عظیم شاعر کے دل و دماغ میں اُن پنہاں جذبات، احساسات اور افکار کی عکاسی بھی کرتی ہے جن کا سرچشمہ اسلام کی سرمدی تعلیم ہے۔ اقبال پیغمبر اسلام ﷺ کے سچے اور مخلص پیروکار تھے۔ وہ اول تا آخر مسلمان اور اسلام کے صحیح مفسر تھے۔

اقبال محض ایک فلسفی اور معلم ہی نہ تھے بلکہ وہ حوصلہ، عمل، استقامت اور خود اعتمادی کے پیکر بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر انھیں اللہ تعالیٰ پر لازوال ایمان و ایقان تھا۔ وہ اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کی زندگی ایک شاعر کے بلند مقاصد کے ساتھ ساتھ ایک عملی انسان کی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج تھی۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ سعی پیہم ان کی مسلسل جدوجہد ان کے پیغام کا جزو لاینفک ہے۔ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں اسلامیت کا نمونہ تھے۔ انھیں اسلام کے اصولوں سے غیر فانی لگاؤ تھا اور ان کے نزدیک زندگی میں کامیابی کا راز اپنی خودی کا شعور حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ اسلام کی تعلیم پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے بلکہ اسے شاہراہ عمل بھی

گردانتے تھے۔ اقبال ایک عظیم شاعر اور فلاسفر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی سیاست دان بھی تھے۔ جہاں انھیں ایک طرف اسلام کے مقاصد سے شیفتگی اور عقیدت تھی، وہاں وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے پہلے پہل ایک اسلامی مملکت کا خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسی مملکت جو کہ ہندوستان کے شمالی مغربی اور جنوب مشرقی حصوں پر مشتمل ہوگی جو کہ تاریخی لحاظ سے مسلمانوں کے وطن سمجھے جاتے ہیں۔

میں پورے خلوص سے یوم اقبال کی کامیابی کا خواہاں ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے تاکہ ہم بالآخر پاکستان حاصل کر کے ان ہی اصولوں کو اپنی مکمل طور پر خودمختار اور آزاد مملکت میں جاری و ساری کر سکیں''۔ (26)

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ایک روز قائد اعظم نے اپنے سیکرٹری مطلوب الحسن سید سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

- ''آج اقبال ہم میں موجود نہیں لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ جان کر بہت خوش ہوتے کہ ہم نے بالکل ایسا ہی کیا جس کی وہ ہم سے خواہش کرتے تھے''۔ (27)

حواشی

1- پروفیسر محمد منور کا مضمون: ''قائد اعظم اقبال کے خضر وقت''، مجلّہ ثانوی تعلیم، قائد اعظم نمبر، 1976، ص 111، 112

2- رحیم بخش شاہین (مرتب)، اوراق گم گشتہ لاہور، 1975ء، ص 255، 257

3- ماہنامہ ہلال، راولپنڈی، 28 دسمبر 1973ء، ص 5

4- روزنامہ انقلاب، لاہور 19 اکتوبر 1937ء

5- رفیق افضل، گفتار اقبال، ص 210

6- عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، ص 384 تا 386

7- ایضاً،ص574
8- سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی، کراچی، 1971ء،ص 102
9- غلام دستگیر رشید (مرتب)، آثار اقبال، دکن 1945ء،ص 41
10- سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور،ص135
11- گفتار قائداعظم،ص198
12- سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور،ص135، 136
13- ایضاً، 297، 298
14- ایضاً، 394
15- Waheed Ahmed, The National Voice, Karachi, 1992, P. 498
16- Quaid-e-Azam Papers, File 846, P. 14
17- اقبال کے خطوط بنام جناح، شیخ محمد اشرف، لاہور، دیباچہ،ص 1 تا 4
18- The Nation's Voice, P. 25
19- سب رس، اقبال نمبر، جون 1938ء،ص 67
20- Liaqat Ali Khan, Resolution of the All-India Muslim League, Dehli, P. 303
21- Foundations of Pakistan, Vol: II, P. 303
22- روزنامہ انقلاب لاہور، 29 مارچ 1940ء، بحوالہ گفتار قائداعظم،ص 242
23- ہفت روزہ حمایت اسلام، لاہور 6 مارچ 1941ء،ص 3، 4
24- Writings of the Quaid-e-Azam, P. 311
25- روزنامہ انقلاب، 25 نومبر 1942ء
26- شورش کاشمیری (مرتب) اقبال پیامبر انقلاب، فیروز سنز، لاہور 1968ء، ص 23، 24
27- Matloob-ul-Hasan, Muhammad Ali Jinnah: A Political Study, Karachi, 1975, P. 231
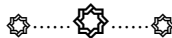
قاضی سیّد عبدالحنان

قائداعظمؒ کی مسلمانیت

قائداعظم کے اسلامی تشخص کو بگاڑنے اور داغدار کرنے میں مخالفین و معاندین نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کسی نے کہا وہ ایک ''مکمل انگریز'' تھے۔ کسی نے یہ بہتان طرازی کی کہ خدا اور قرآن کا جناح کے تصورِ حیات میں کوئی گزر نہ تھا۔ نیز یہ کہ جناح کی مسلمانیت محض اس بات پر منحصر تھی کہ ان کے والدین مسلمان تھے اور مزید گل افشانی یہ کہ ان کے سب سے بڑے حریف گاندھی کو قرآن کی آیتیں ان سے کہیں زیادہ یاد تھیں۔ 'چہ دلاور است دُز دے کہ بکف چراغ دارد'۔ کسی نے یہ سرالاپا کہ مذہب کا جناح کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہ تھا اور انہوں نے مذہب کی حلت و حرمت کے قیود کو کبھی اپنے ذوق رہائش ولباس اور اکل و شرب پر حاوی ہونے نہ دیا۔

یہ تو غیروں کی عنایت تھی، خود مسلمانوں میں سے بعض مخالفین کی ناوک فگنی ان سے کم دل خراش نہ تھی۔ کسی نے رتی جناح سے ان کی شادی کو جو اسلامی طریقہ پر ہوئی تھی، 'سول میرج' کا اتہام لگا کر ان کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ بعض 'زاہدان تنگ نظر' نے انہیں کافر و مرتد جانا اور وہ اپنے جواز میں ان کے لباس، انگریزی ذریعہ اظہار اور مغربی طرزِ زندگی کو پیش کرتے تھے۔ اس الزام تراشی اور بہتان بازی میں مجلس احرار اور جمعیۃ علمائے ہند کے مقدس و باریش بزرگ مقدمہ الجیش کی حیثیت رکھتے تھے۔ آیئے! ہم عصبیت کی پٹی آنکھوں سے ہٹا کر معروضی انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ حقیقت کیا ہے؟

سب سے پہلی بات یہ کہ محمد علی جناح ایک دیندار مسلمان والدین کی اولاد

تھے۔ ان کی دینداری کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ ان کے والدین اس بچہ کی رسم عقیقہ کی ادائیگی کے لیے کراچی سے بہت دور درگاہ حسن پیر جو ویرادل کے علاقہ گنود میں واقع تھا اور ایک بادبانی کشتی کے ذریعہ دشوار گزار مراحل کے بعد وہاں تک پہنچا جا سکتا تھا، لے گئے اور بہت سے لوگوں کی موجودگی میں آغوشِ مادر میں لیٹے ہوئے، ان کا سر مونڈن ہوا۔

جب محمد علی جناح چھ برس کے ہوئے تو مدرسہ کا جوا ان کی گردن پر رکھا گیا اور کچھ عرصہ گجراتی سکول میں اور بعد ازاں انہیں سندھ مدرسہ میں جس کا موٹو تھا ''داخل ہو، حصول علم کے لیے اور باہر نکلو تو جذبہ خدمت لے کر'' میں داخل کیے گئے۔ اسی دوران میں انہیں فارسی کی ابتدائی تعلیم دی گئی اور ''قصائد لطیف'' جیسی کتاب بھی پڑھائی گئی۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور انگریزی زبان کی یورش میں ان کے ذہن کا رخ انگریزی تعلیم کی طرف موڑ دیا گیا۔ ایک لحاظ سے یہ المیہ سے کم نہ تھا کہ ایک پندرہ سولہ سال کی کچی اور زود اثر پذیر ہونے والی عمر میں جب مذہبی تعلیم کے اثرات ان کے قلب و ذہن پر مرتب نہ ہو سکے تھے کہ انہیں دیارِ فرنگ بھیج دیا گیا۔

.... یہ بات تعجب انگیز ہے کہ قیام لندن کی پر آشوب فضا میں بھی جہاں ہر وقت مغربیت کی گھٹا ٹوپ دھند چھائی رہتی تھی، ان کی مذہبی راکھ میں کچھ چنگاری دبی پڑی تھی اور تعجب ہوتا ہے کہ اس ایمان شکن، زہد اور عصیان خیز لمحات میں بھی ان کی مذہبیت اچانک انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور اک مس سیمین بدن کے حسن فتنہ ساماں کی دعوت ترغیب کو ٹھکرا دیتی ہے۔ ان کی اس پاک دامنی کی داستان محترمہ فاطمہ جناح کی زبان سے سنیے:

❑ ''میرے بھائی مسز ایف ای ڈریک کے یہاں ایک ''پے انگ گیسٹ'' رہائش و خوراک کا معاوضہ ادا کرنے والے مہمان کی حیثیت سے کئی سال رہے...... مسز ڈریک کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی۔ وہ قائد کی ہم عمر تھی اور میرے بھائی پر بے حد ملتفت تھی مگر میرے بھائی ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو راہ میں آنے والی ہر حسین و

جمیل پر اپنی محبت نچھاور کرتے پھرتے۔ بقول شآد

جو شمع ہوا کرتی ہے روشن سر بازار
اس شمع پہ گرتا نہیں پروانہ ہمارا

کرسمس کا موقع تھا۔ ڈریک فیملی کرسمس منا رہی تھی۔ اس موقع پر دروازوں کی چوکھٹوں پر آ کاس بیل لٹکا دی گئی تھی۔ عیسائیوں کی یہ روایت ہے کہ اگر کوئی نوجوان ایسی چوکھٹ کے نیچے کسی لڑکی کو کھڑا پائے، تو وہ اس کا بوسہ لے سکتا ہے۔ اس دن میرے بھائی بے خبری میں ایک ایسے ہی دروازہ میں کھڑے تھے کہ مس ڈریک نے انہیں وہیں پکڑ لیا اور بازوؤں میں بھینچ کر کہا کہ وہ اس کا بوسہ لیں۔ لیکن انہوں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے معاشرہ میں نہ تو ایسا ہوتا ہے اور نہ اس کی اجازت ہے''۔ (میرا بھائی از فاطمہ جناح ص 94 تا 95)

والپرٹ نے بھی اپنی کتاب میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے مگر اس حاشیہ آرائی کے ساتھ کہ ''فاطمہ جناح نے اس بے ضرر واقعہ کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کو کیوں اتنا اہم سمجھا؟ کیا یہ محض ایک محتاط بہن کی بھائی کے امیج کو بے داغ رکھنے کی کوشش ہے۔ بے چارے والپرٹ کو پاک دامنی اور ''تر دامنی'' کا فرق کون بتائے؟ والپرٹ کی اس سخن طرازی کو جانے دیجیے اور یہ سوچیے کہ وطن سے اتنی دوری، والدین کی احتسابی نظر کا کوئی کھٹکا نہیں۔ یورپ کے بے لگام معاشرہ جس میں 'کسے را بہ کسے کارے نہ باشد' کی چھوٹ، عمر بھر جوانی کی امنگیں، ان کو عاشق کی تلاش بلکہ بازی عشق کا اذن عام اور ''**ھیت لک**'' (زلیخا کا حضرت یوسفؑ کو دعوت گناہ) کی کھلی ترغیب اور اس پر بھی جناح نہ پھسلے تو وہ کون سا پیری عمل تھا جس نے ان کو لغزش گناہ سے بچایا۔ بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں ؏ بے داغ تھی مانند سحر، اس کی جوانی۔

مسٹر جناح کی زیر خاکستر مذہبیت کی چنگاری کا ایک اور تماشہ دیکھیے۔

بیرسٹری میں داخلہ کا مرحلہ آیا تو انہوں نے سوچا کہ لندن کے تمام انز کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ کون سا انز ان کے لیے پسندیدہ ہے۔ ان انز کا سروے

کرتے ہوئے جب وہ لنکن انز پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے مرکزی دروازہ پر پیغمبر اسلام ﷺ کا نام دنیا کے مشہور **مقننوں** کی فہرست میں ہے تو انہوں نے وہیں فیصلہ کرلیا کہ وہ اسی انز میں داخلہ لیں گے۔

قائداعظم محمد علی جناح **1906**ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں پہلی دفعہ شریک ہوئے تو ان کی کنواری خطابت مسلمانوں ہی کے مسائل کی زلفِ پریشاں کو سلجھانے میں صرف ہوئی۔ پریوی کونسل نے مسلمانوں کے فقہی قانون، وقف علی الاولاد پر خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا جس سے مسلمانوں کے اسلام کے عطا کردہ حقوق پر ضرب پڑی تھی۔ کلکتہ کے اجلاس میں خان بہادر محمد یوسف نے اس سلگتے مسئلہ کی طرف تحریک کے ذریعہ آواز اٹھائی تھی اور محمد علی جناح نے اس کی موافقت میں زوردار آواز میں تقریر کی۔

پھر اسی مسئلہ کو سیاست کے فورم سے اٹھا کر امپیریل **لیجسلیٹیو** کونسل میں **25** فروری **1910**ء میں نکتہ سوال کی صورت میں اٹھایا اور جب مرکزی حکومت کی طرف سے حوصلہ شکن جواب ملا تو **17** مارچ **1911**ء کو وقف علی الاولاد کا بل امپیریل کونسل میں پیش کیا اور یہ بل ان ہی کی مساعی اور قانونی مہارت سے **5** مارچ **1913**ء میں قانون کا حصہ بن گیا اور لامحالہ مسلمانوں کی طرف سے ان پر تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے جن میں علما بھی شامل تھے۔

کانگریس میں ہندوؤں کے غلبہ رفاقت کی وجہ سے وہ پہلے مسلمانوں کے سواد اعظم کے متفقہ مطالبہ جداگانہ طریق انتخاب کے حق میں نہ تھے۔ ان کا اس وقت خیال تھا کہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت پر اس کا مہلک اثر پڑے گا۔ مگر پھر وہ جداگانہ انتخاب کے حامی بن گئے اور پھر **1916**ء کے لکھنؤ اجلاس کے موقع پر ''میثاق لکھنؤ'' کا کارنامہ انجام دیتے ہوئے اس پر مہر توثیق ثبت کر دی۔ یہ دراصل اسلامی مفادات کی طرف جھکاؤ کا نکتہ آغاز تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی مس رتن سے شادی کا معاملہ بھی ان کی اسلامیت کا ایک واضح اشاریہ ہے۔ مس پیٹٹ ایک ارب پتی باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ حد سے زیادہ

خوب رو، طرح دار، اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین، تیز طرار۔ وہ مسٹر جناح کی عاشق راز تھیں اور چاہتی تھیں کہ بہ زاری اور بہ زورے (محبت) اس چاند کو اپنے آنگن میں اتار لیں، مسٹر جناح بھی اس کی صورت و سیرتی محاسن کی وجہ سے ان کی طرف کشش محسوس کرتے تھے مگر اس سے بھی بڑی مقناطیسی قوت انہیں خبردار کر رہی تھی کہ "دامن تر مکن ہشیار باش"۔ چنانچہ انہوں نے مس رتی کے "غمزۂ جاں ستاں" کے باوجود ان سے کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان اسلام کی دیوار حائل ہے۔ بے شک سیکولر ذہن رکھنے والوں کے لیے سول میرج کی راہ کھلی ہوئی ہے اور بعض مسلمان راہنماؤں نے یہ راستہ اختیار بھی کیا ہے مگر بہ وجوہ میں یہ راستہ اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام سے دستبرداری کی قیمت پر یہ شادی نہیں رچا سکتا۔ محض مذہب کی پاسداری میں دعوت عشق کو ٹھکرا دینا کتنا بڑا مجاہدانہ عمل ہے۔

قائداعظم کی مسلمانوں کے مفادات سے دلی وابستگی ہی تھی کہ انہوں نے امپیریل کونسل میں مسٹر گوکھلے کے ایلیمنٹری ایجوکیشن (ابتدائی تعلیم) کے بل کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا (یہ خیال رہے کہ مسٹر گوکھلے ان کے سیاسی اتالیق، ان کے جگری دوست اور ہم عناں رفیق سفر تھے) کہ اگر اس بل میں مسلمانوں کے مفادات کے مطابق ترمیم نہ کی گئی تو میں اس کی مخالفت کرنے والا پہلا شخص ہوں گا۔

ان کی قانون ساز اسمبلی میں مختلف بلوں پر تقریر سے ان کی اسلامی قانون سے گہری واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسپیشل میرج امنڈمنٹ بل مسلم لا آف کنٹریکٹ، مسلم کرمنل لا، مسلم لا آف کاسٹ ڈس ابی لیڈیز ریموئل ایکٹ کی تقریریں، خاص طور پر آخر الذکر بل کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "قرآن کے احکام کے مطابق اگر کوئی مسلمان عورت یا مرد مرتد ہو جائے تو وہ مسلمان رشتہ داروں کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر اس قانون کے مطابق ایسے شخص کا تبدیلی مذہب کے باوجود حق وراثت قائم رہتا ہے جو اسلامی احکام سے صریحاً متصادم ہے"۔

اس سلسلہ یہ واقعہ بھی بیان کر دیا جائے تو مناسب نہ ہوگا کہ قائداعظم کی اکلوتی بیٹی اپنی والدہ کے انتقال کے بعد اپنی ننھیال کے زیر اثر آئیں اور انہوں نے

1938ء میں اپنے ننھیالی رشتہ دار مسٹر واڈیا سے شادی کرنے کا عندیہ دیا تو قائداعظم پر یہ خبر بجلی بن کر گری، انہوں نے سخت مخالفت اور اپنی نارضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا ''کیا تم کو مسلمانوں میں کوئی موزوں لڑکا نظر نہ آیا جو تم نے غیر مذہب میں رشتہ جوڑنے کا سوچا؟'' دینا پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قائداعظم نے اپنی بیٹی سے کہا کہ ''اگر تم نے یہ راہ اختیار کی تو از روئے شریعت میں تم سے قطع تعلق کر لوں گا''۔ چنانچہ انہوں نے اس پر تادمِ حیات عمل کیا۔ ''جس دن قائداعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا، اسی دن ان کو پہلی بار اپنی بیٹی کا خط (غالباً دستی) ملا تھا جس میں اس نے ملاقات کی خواہش کی تھی مگر قائداعظم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ خود آ گئیں اور سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں جہاں قائداعظم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ باتیں کیں۔ چونکہ ہم دور بیٹھے تھے، لہٰذا کچھ سن نہ سکے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ قائداعظم بالکل خاموش بیٹھے رہے اور انہوں نے بیٹی کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک اس انتظار میں بیٹھی رہیں کہ شاید کوئی جواب ملے لیکن انہیں یکسر خاموش دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں''۔

(Jinnah Creator of Pakistan, Hector Bolitho, Page. 101-102)

اب قائداعظم کی مسلمانیت کا ایک شوخ عنوان دیکھیے:

1937ء کے لکھنؤ سیشن کے بعد مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ کے ہلالی پرچم تلے جمع ہونے لگے اور مسلمانوں کے سیاسی بہاؤ نے ایک سیلابی شکل اختیار کر لی تو بہار کے ایک دیندار بزرگ (مولوی عبدالرحمٰن) جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خاص مریدوں میں سے تھے، قدرے مشوش ہوئے تو انہوں نے اپنی الجھن تھانہ بھون جا کر حضرت تھانویؒ سے بیان کی کہ مسلمانوں کا سواد اعظم تو مسلم لیگ کی طرف جا رہا ہے جبکہ اس کے قائد محمد علی جناح مغربی طرز معاشرت اختیار کیے ہوئے ہیں، تو ایسی صورت میں ہم دینداروں کے لیے کیا حکم ہے؟

حضرت مولانا نے جواب دیا:

- ''ایک بات تو آپ مانیں گے کہ اس کفرستان ہند میں جبکہ گاندھی جی اور ان کے ہم نوا ہندو، مسلمانوں کو کم از کم سیاسی طور پر صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں تو

محمد علی جناح جو مسلمانوں کی بکھری قوت کو ایک مرکز پر لانے اور ہندوؤں کے عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہیں، تو وہ کم از کم ''ناصر دین'' تو ضرور ہیں اور اگر ہم نے اس ''جہاد'' میں ان کے ہاتھ مضبوط نہ کیے تو ڈر ہے کہ دشمنان دین کہیں ہم پر حاوی نہ ہو جائیں۔ اتنا کہنے کے بعد حضرت تھانویؒ نے مزید کہا: عام مسلمانوں کو تو بس یہی کہہ سکتا ہوں لیکن چونکہ آپ میرے مرید خاص ہیں، اس لیے آپ سے کہتا ہوں کہ یقین کیجیے، میں نے انہیں عالم رویا میں اولیا کبار کے ساتھ دیکھا ہے''۔

(قائداعظم کا مذہب اور عقیدہ از منشی عبدالرحمٰن خاں ص 180)

ایک ایمان افروز واقعہ مولانا حسرت موہانی سے منسوب ہے:

- ''وزارتی مشن کے نازک مرحلہ میں جب گفت وشنید ایک اہم موڑ پر تھی، مولانا حسرت موہانی کے دل کا تقاضا ہوا کہ قائداعظم سے مل کر معلوم کریں کہ کشتی ملت کی نگہبانی کے لیے ان کے کیا منصوبے ہیں۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ قائداعظم کی کوٹھی میں ان کے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ مولانا حسرت نے دربان سے کہا ''مجھے قائد اعظم سے ملنا ہے'' مگر اس نے اجازت نہ دی۔ وہ بولا ''صاحب اپنے کمرے میں کچھ کام کر رہے ہیں''۔ حسرت کچھ دیر رک گئے مگر جب دیر زیادہ ہو گئی تو ان کی سیمابی فطرت انہیں کمرے کی طرف لے گئی اور دربان کی ''نہ جاؤ صاحب'' کی رٹ کے باوجود دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ ایک عجیب منظر سامنے تھا۔ جائے نماز بچھی ہوئی تھی اور جناح سجدے میں ہیں اور گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور مصروف دعا ہیں کہ یا اللہ! مسلمانوں کی کشتی کو منجدھار سے نکالنے میں میری مدد کیجیے۔ کچھ دیر رک کر حسرت دبے پاؤں پلٹ گئے''۔

ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ 1937ء کے بعد رفتہ رفتہ ان کے مذہبی خیالات میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ لباس میں تبدیلی آئی، کوٹ پتلون کی جگہ شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور جناح کیپ نے لے لی۔ عیدیں، جمعۃ الوداع وغیرہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ مذہبی رنگ بھی چڑھنے لگا۔ ظاہری تبدیلیوں کی

شہادت تو غیر مسلم مصنفین بھی دیتے ہیں۔ والپرٹ کہتے ہیں:

❑ ''لکھنؤ سیشن نے جو ڈرامائی تبدیلی پیدا کی، نہ صرف مسلم لیگ کے پلیٹ فارم اور مقام و اہمیت میں بلکہ ان کی شخصیت، کمٹمنٹ اور فائنل گول میں بھی اور اسی کی مطابقت میں انہوں نے اپنا لباس بھی بدل دیا۔ ''سوائل رو (Savile Row) سوٹ کو ترک کر کے انہوں نے شیروانی زیب تن کرنا شروع کیا اور پھر نواب محمد اسمٰعیل خان کی استرخانی ٹوپی پہن لی اور یہی ٹوپی جناح کیپ کی حیثیت سے مشہور ہوئی اور مسلم لیگی ہونے کی ظاہری علامت بن گئی''۔

(Jinnah of Pakistan by Stanley Wolpert P. 152, 153)

شاید ان کی وہ مجاہدانہ للکار بھی آپ کے کانوں میں گونج رہی ہو جو انہوں نے اکثریتی پارٹی کے ممبروں کو خطاب کرتے ہوئے مارچ 1939ء میں مرکزی اسمبلی میں تقریر کی صورت میں کی تھی۔ آپ تعداد کی صورت میں بھلے سب سے زیادہ ہوں، آپ زیادہ ترقی یافتہ ہوں، آپ اقتصادی لحاظ سے بھی زیادہ مضبوط ہوں گے...... لیکن مجھے کہنے دیجیے...... کہ آپ اس کلچر کو جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے، ہمارے اسلامی کلچر کو کبھی مٹا نہ سکیں گے۔ یہ روح و جذبہ زندہ رہا ہے، زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ آپ ہمیں ہوسکتا ہے کہ وقتی طور پر مغلوب کر لیں، ہمیں جبر و زر کا نشانہ بنائیں...... لیکن ہم نے یہ مصمم اور نہایت ہی گھمبیر فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر ہمیں مرنا ہی پڑا تو ہم لڑتے ہوئے مریں گے''۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس شخص کا یہ کردار ہو کہ وہ زندگی بھر سچا، کھرا اور بے لاگ رہا۔ جو نہ کبھی دبا، نہ جھکا، نہ بکا اور نہ کبھی (راہ استقامت میں) جھجکا۔ جس کی دیانت و امانت مسلم، اور جس نے اپنی زندگی کے آخری دو عشرے قوم کی کشتی کی طوفانِ حوادث سے نکال کر ساحل مراد پر لے آنے میں اپنے خون کا قطرہ قطرہ نچوڑ دیا۔ اس کا تن زار ؎ تن ہمہ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم، کا مرقع بن گیا۔ معالج خصوصی نے الٹی میٹم دے دیا کہ آپ کی شمع زندگی گل ہونے والی ہے، اس لیے آپ اپنے جسم ناتواں

پر رحم کریں، مگر مریض جاں بہ لب کا جواب عزیمت سے کتنا بھرپور تھا۔ سنیئے:

I am not going to let my rendezvous with death to cheat me out of other rendezvous with history.

ذرا غور تو کیجیے۔ اپنی اس ہولناک بیماری کو انہوں نے ساری دنیا سے چھپایا، دشمنوں سے، غیروں سے، اپنوں سے، دوستوں سے، جگری رفقائے کار سے، قریب ترین عزیزوں سے، یہاں تک کہ اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی! فریڈیم ایٹ مڈنائٹ'' کے مصنفین نے 1973ء میں دینا کا انٹرویو لیا تو انہوں نے کہا ''مجھ پر تو یہ راز ان کی موت کے بعد کھلا''۔ مونٹ بیٹن کف افسوس مل کر رہ گئے کہ کاش مجھے اس کی بھنک پہلے ملی ہوتی تو تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

لوگ باگ تو اپنی بیماری کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، اس کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔ اس رائی کو پربت بنا کر دکھاتے ہیں۔ بیمار نہ بھی ہوں تو بیمار بن جاتے ہیں مگر یہ کیسا بیمار تھا؟ جو فی الحقیقت جاں بہ لب تھا مگر اپنی بیماری پر پردہ ڈال رہا تھا اور کیوں؟

آہ! اس کا جسم ناتواں، برونکائیٹس کے بار بار حملوں اور دق کی تباہ کاریوں کی وجہ سے اتنا خستہ، نیم جان ہو چکا تھا اور ان ''نابکاروں'' نے اس کی توانائی کو اس حد تک چاٹ لیا تھا اور اس کے نظام تنفس کی اتنا مضمحل کر دیا تھا کہ صرف ایک لمبی تقریر کے بعد گھنٹوں اس کی سانس پھولی رہتی تھی، مگر آفریں ہے اس کی ہمت مردانہ بلکہ جرأت رندانہ پر کہ وہ تا دمِ مرگ اپنا چراغ طاق بادِ صرصر میں بھی جلاتا رہا۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

۞......۞......۞
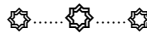
فیض احمد شہابی

قائداعظمؒ کا نظریہ پاکستان......اسلامی یا سیکولر؟

پاکستان اسلام کا دیا ہوا ایک قیمتی تحفہ اور ہمارے اسلاف کا ورثہ ہے۔ زندہ قومیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو زندہ رکھتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر تاریخ کا یہ شان دار ذخیرہ غفلت کی نذر ہوا، ہم نے اپنی اسلامی میراث بھلا دی تو ہم اپنی پوری تہذیبی اور تاریخی روایات سے محروم ہو جائیں گے۔

پاکستان کی بنیاد اسلام ہے اور یہی اس کی شناخت کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بصیرت افروز قیادت اور لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کے بعد وجود میں آیا۔ خواب سے تعبیر کا یہ طویل سفر بہت ہی کٹھن تھا۔ برٹش راج جاتے جاتے رام راج قائم کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان انگریزوں کا وطن نہیں تھا۔ وہ جنگ عظیم اول کے بعد سے اپنا بوریا بستر لپیٹنے کی سوچ رہے تھے۔ ان حالات میں اونچی ذات کے برہمنوں نے ہندو دھرم اور ہندوستان کی یکجائی کا ایک فلسفہ گھڑا۔ اس فلسفے کی رو سے کہا گیا کہ ہندو دھرم ہندوستان سے اُٹھا اور یہیں پلا بڑھا۔ اس کا مقابلہ اسلام سے ہے جو ہندوستان اور ہندوؤں کا مذہب نہیں ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ ہندو اکثریت کے پہلو بہ پہلو اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ ان کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی روایات ہندوانہ یلغار کے سامنے دم توڑ دیں گے۔ ان کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہو جائے گا اور وہ ہندوؤں سے زندگی کی بھیک مانگیں گے۔ لیکن اسلامی مملکت کا وہ سورج جو برصغیر میں غروب ہوا تھا، پوری آب و تاب سے دوبارہ طلوع ہوا۔ ہمیں ایک آزاد خود مختار مسلم قوم ہونے کا اعزاز ملا۔ پاکستان کی صورت میں اسلام کی تجربہ گاہ ہمیں عطا

ہوئی۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ ان ارباب اختیار نے، جنھیں اس تجربہ گاہ کو چلانا تھا، اسے اسلام کے بجائے غلط نظاموں کے لیے استعمال کیا۔ وہ آب کوثر کے بجائے گھاٹ گھاٹ کے پانی یہاں لے آئے۔ انھوں نے حرم کو چھوڑا اور اپنے لیے نئے مقام سجود تلاش کر لیے، حتیٰ کہ قائدؒ کے افکار و نظریات بھی ان کی دست برد سے نہ بچ سکے۔

قائداعظم نے اسلامی جمہوریت کا تصور دیا، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان کی وفات کے بعد چند آشفتہ سر دانشوروں نے اسے اپنی پسند کے معنی پہنا کر اس میں تحریف کر ڈالی۔ انھوں نے ’’خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا خرد‘‘۔ قائداعظم نے ہمیشہ اسلامی جمہوریت کے تصور کی ترجمانی کی، لیکن ان دانشوروں نے اس پر پردہ ڈال کر اسلامی نظام کی مخالفت کی اور اس دستور کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں جو ابھی تیاری کے مراحل میں تھا۔ اس طریقے سے انھوں نے نظریہ پاکستان سے انحراف کی راہ اختیار کر کے ملت پاکستان کو واپس تاریکی کی جانب دھکیلنے کی کوشش کی۔ ان عناصر نے سیاق و سباق کے بغیر قائداعظم کی اس تقریر کا حوالہ دیا جو انھوں نے 11 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کا پریذیڈنٹ منتخب ہونے کے بعد کی تھی۔ یہ دانشور جس تراشے کو سجا کر بیٹھ گئے ہیں، وہ یہ ہے:

’’آپ آزاد ہیں، اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے کے لیے۔ آپ پاکستان کی مملکت میں بالکل آزاد ہیں۔ آپ کسی مذہب، فرقہ، عقیدہ سے تعلق رکھیں، اس کا کاروبار سلطنت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول سے اپنے نظام کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں اور مساوی الحیثیت، ہمیں اس مسلک کو اپنے نصب العین کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا اور نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ تو ذاتی عقائد کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے ہم سب ایک ہی مملکت کے شہری ہو جائیں گے‘‘۔

(ماخوذ از خطبات قائداعظم، تدوین و ترتیب: رئیس احمد جعفری ص 563)

(نوٹ: رئیس احمد جعفری نے اس خطاب کی تاریخ 14 اگست لکھ کر غلطی کی ہے حالانکہ اس کی صحیح تاریخ 11 اگست 1947ء ہے۔)

یہ چوکھٹا (جس کا اُردو ترجمہ اس کے انگریزی متن سے مختلف ہے اور جسے بڑی ہوشیاری سے مختلف پیراگرافوں سے جوڑ کر ایک من پسند شکل دی گئی ہے) ہمیں بار بار دکھایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے نہ صرف پوری قوم بلکہ دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قائداعظمؒ ایک سیکولر تھے اور پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت ہم پوری دیانت داری کے ساتھ اس چوکھٹے کا سیاق وسباق پیش کرتے ہیں جسے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور جو خود اس سیکولرازم کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اس کا پہلا پیراگراف یہ ہے:

''اگر ہم اس عظیم مملکت پاکستان کو پرمسرت اور خوش حال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے عوام اور خاص طور پر غریبوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ اگر آپ ماضی کو خیرباد کہہ کر مل جل کر کام کریں اور آپ کے پیش نظر یہ جذبہ ہو کہ آپ میں سے ہر ایک رنگ، نسل اور برابری کی تفریق کے بغیر ایک ریاست کا شہری ہے اور مساوی حقوق و فرائض رکھتا ہے تو پھر ترقی کا ہر زینہ تمھارے لیے آسان ہوگا۔

میں اس سے بڑھ کر تاکید نہیں کرسکتا۔ یہ ایک جذبہ ہے جس کے تحت ہمیں کام شروع کر دینا چاہیے۔ اس وقت مسلمانوں کا اکثریتی طبقہ پٹھان، پنجابی، شیعہ اور سنیوں وغیرہ پر مشتمل ہے، ہندو اقلیت برہمن، کھتری، وشناو اس کے ساتھ ساتھ ہمارا معاشرہ بنگالیوں اور مدراسیوں کو سموئے ہوئے ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ اکثریت و اقلیت کے مذکورہ گوشے خود بخود مٹ جائیں گے۔ میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ یہ ہندوستان کی آزادی میں بہت بڑی مزاحمت تھی۔ یہ نہ ہوتی تو ہم کب کے آزاد ہو چکے ہوتے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت کسی قوم کو اور خاص طور پر اس قوم کو جو 400 ملین افراد پر مشتمل ہو، اپنا غلام نہیں رکھ سکتی، اگر مذکورہ خرابیاں نہ ہوتیں تو ایک لمحے کے لیے کوئی بھی تم پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ اس میں ہمارے لیے ایک سبق ہے۔ آپ آزاد ہیں......''

اس چوکھٹے کے صرف پہلے دو جملوں کا ترجمہ صحیح ہے۔اس سے آگے قائداعظم کے بتائے ہوئے تاریخی حقائق کو دیدہ دانستہ نظرانداز کر کے ایک خودساختہ کلمے کو پھیلایا گیا ہے۔ہم ذیل میں اصل جملے کو دہراتے ہوئے قائداعظم کی بات کو جاری رکھتے ہیں:

''آپ کسی مذہب، فرقے یا عقیدے سے تعلق رکھیں، اس کا ریاستی عمل داری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے انگلستان میں جو حالات تھے، انھیں تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ آج کے ہندوستان کے حالات سے کہیں بدتر تھے، وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو نشانہ بنائے ہوئے تھے، آج بھی دنیا میں کئی ریاستیں ایسی موجود ہیں جہاں امتیاز برتا جاتا ہے اور ایک خاص طبقے پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اس دور کی طرح اپنا آغاز نہیں کر رہے بلکہ ہم اپنی ابتدا اس عزم کے ساتھ کر رہے ہیں کہ یہاں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ایک برادری دوسری برادری سے، ایک ذات دوسری ذات سے اور ایک مسلک دوسرے مسلک سے ممتاز نہیں ہوگا۔ ہمارا ایک بنیادی اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام شہری اس ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔ایک وقت ایسا آیا کہ انگلستان کے عوام نے حقیقت حال کا ادراک کیا۔ انھوں نے اپنے اوپر لاگو وہ ساری ذمے داریاں اور بوجھ جو ان کی حکومت نے ان پر لاد رکھا تھا، ایک کڑی آزمائش کے بعد ایک ایک کر کے اتار پھینکا۔ آج آپ پورے انصاف کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انگلستان میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ موجود نہیں ہیں۔آج جو کچھ باقی ہے، وہ یہ ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کا ہر شہری برابر کا ایک شہری اور اپنی قوم کا ایک فرد ہے۔اب میرے خیال میں ہم سب کو اسے اپنا آئیڈیل بنا کر سامنے رکھنا چاہیے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ حالات کے لحاظ سے ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان نہیں ہوگا۔ مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ مذہب ہر فرد کے لیے ایک ذاتی عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس سیاسی معنی میں کہ سب اس ریاست کے شہری ہیں''۔

(Muhammad Ali Jinnah: Speeches and Statements 1947-1948 Oxford University Press Edl: 2000 pp:27-29)

قائداعظمؒ کی یہ تقریر پاکستان کی مسلم اکثریت اور ہندو اقلیت کے لیے ایک نصیحت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ ہم ذات برادری اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر پاکستان کی خدمت کریں اور اپنے اختلافات بھلا دیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں انگلستان کے پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کے درمیان اس تنازع کا ذکر کیا جو خونی لڑائیوں کے بعد بالآخر کیتھولک اکثریت کے جزیرے جنوبی آئرلینڈ کی آزادی پر جا کر ختم ہوا۔ واضح رہے کہ آئرلینڈ جس کی 95 فیصد آبادی کیتھولک ہے، صدیوں تک برطانیہ کی کالونی بنا رہا۔ ایک پالیسی کے تحت یہاں مسلسل پروٹسٹنٹ لا کر بسائے جاتے رہے۔ اپریل 1916ء میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جس سے آگے چل کر کیتھولک پروٹسٹنٹ جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ یورپ میں لڑی جانے والی آخری مذہبی جنگ تھی۔ انگریزوں نے ایسے کیتھولک جنگی قیدیوں کو جو زخموں سے نڈھال کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، کرسیوں سے باندھ کر گولی مار دی۔ اس ظلم و سفاکیت کے باوجود برطانیہ اس بغاوت کو دبا نہ سکا۔ 6 دسمبر 1921ء کو ایک معاہدے کے بعد جنوبی آئرلینڈ کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔

سیکولرازم کی رٹ لگانے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کوئی خالی خولی تصور (Idea) نہیں بلکہ ایک مکمل فلاسفی ہے جو ہر دور میں موجود رہی ہے۔ یہ ایک سیاسی، معاشرتی اور معاشی تحریک ہے جو مذہب و اخلاق کے مقابلے میں مادہ پرستی کا پرچار کرتی آئی ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم یونانی فلاسفر افلاطون (347۔427ق م) کی تحریروں میں ملتی ہے۔ افلاطونیت (Platonism) اور جدید افلاطونیت (New Platonism) اخلاقی حدود سے ماورا ایسی تحریکیں ہیں جو ان کے نام پر چلائی گئی ہیں۔ افلاطون نے جس مثالی مملکت کا خاکہ پیش کیا، وہ ''اشتراکِ عمل''، ''اشتراکِ املاک'' اور ''ایک مخصوص نظامِ تعلیم'' پر مشتمل تھا۔ اس مملکت میں گھر یا خاندان کے تصور کو ختم کرنا ضروری تھا۔

سیکولرازم ایک جدید اصطلاح ہے جو لاطینی کے ایک لفظ سیکولر (Secular)

سے لی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے ''دنیا کے لیے''۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے ایک انگریز مفکر جارج جیکب ہولی اوک (George Jacobe Holyoake) نے استعمال کی۔ انھوں نے سیکولرازم کی بنیادیں جن تین اصولوں پر رکھیں وہ یہ ہیں:

1- اس کا تعلق صرف دنیاوی زندگی سے ہے۔

2- سائنس کا علم انسان کا سب سے بڑا خدا (Providence) ہے۔

3- دنیاوی حیات کی خیر ہی اصل خیر ہے۔

ایک مفکر ورجیلئس فرم (Virgilius Ferm) کی سیکولرازم کی تعریف کو معیاری مانا جاتا ہے۔ اس نے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن میں لکھا:

''سیکولرازم افادہ پرستی (Utilitiarianism) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ مذہب سے ربط کیے بغیر انسانی فلاح چاہتا ہے''۔

مذہب سے اتنی بیزاری کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کی تعلیمات دنیا سے لاتعلقی پر زور دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ یورپ میں کئی مذہبی جنگیں لڑی گئیں جن میں لاکھوں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ہلاک ہوئے۔ سیکولرازم اسی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ یورپ کے دور بیداری میں یہ تحریک مذہب بیزاری میں تبدیل ہوئی۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس نے الحاد کو اپنے مادہ پرستانہ نظریات میں شامل کیا۔ اس سے پہلے 16ویں صدی میں میکیاولی سیاست سے مذہب واخلاق کو نکال کر اس میں الحاد کرنے کا نظریہ پیش کر چکا تھا۔

سیکولرازم ایک جمہوریت دشمن نظریہ ہے۔ وہ آزادی مذہب (Freedom of Religion) کے بجائے انسداد مذہب (Elimination of Religion) پر زور دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا سرطان ہے جو قومی زندگی کے تمام پہلوؤں (حکومت، قانون، مذہب، تعلیم، آرٹ اور ثقافت) سب کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ وہ اخبارات، ٹیلی وژن اور ریڈیو میں گھسا ہوا ہے۔ وہ کبھی روشن خیالی (Enlightenment) تو کبھی آزاد منشی (Liberalism) اور کبھی ترقی پسندی (Progressivism) کے روپ میں آتا ہے۔ پھر یہ سارے

روپ مل کر کمیونزم کے مجسمے میں ڈھل جاتے ہیں۔ کمیونزم کو سوشل ڈارون ازم (Social Darwinism) بھی کہا جاتا ہے جو انسانوں کو مذہبی و اخلاقی اقدار سے بالکل عاری کر کے انھیں جانوروں کے زمرے میں لے آتا ہے۔

پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔ اس کے چلانے کا صحیح راستہ اسلامی دستوری جمہوریت ہے۔ اس سے بڑی ناانصافی اور جمہوریت دشمنی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک ملک کی 98 فیصد آبادی مسلم ہو لیکن اسے سیکولر سٹیٹ میں تبدیل کر دیا جائے!

بہت سے یورپی ممالک جنھیں عام طور پر سیکولر تصور کیا جاتا ہے، دستوری یا سرکاری طور پر چرچ سے وابستہ ہیں۔ اس میں مالٹا، موناکو، لیختنسٹائن (Liechtenstein)، ویٹی کن، سوئٹزر لینڈ کی متعدد کینٹون (Cantons) جنوبی قبرص، یونان، فن لینڈ، ڈنمارک، آئس لینڈ، ناروے اور انگلینڈ شامل ہیں۔

ہمارے وہ دانشور جو قائداعظمؒ کی تلقین کو کسی قاعدے کلیے اور تاریخی حقائق کے بغیر سیکولر رنگ دیتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انگلینڈ اپنے غیر تحریری آئین کی رو سے چرچ آف انگلینڈ سے وابستہ ہے۔ برطانوی شاہ اس چرچ کا سپریم گورنر ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ذمے داری ملکہ الزبتھ دوم کے سپرد ہے۔ چرچ کے فتوے (Canon) کے مطابق شاہ، خدا کے بعد اس مملکت میں موجود تمام انسانوں پر حاکم ہے۔ اس کے دنیاوی اور کلیسائی فیصلے ناقابل تردید ہیں۔ چرچ سے وابستہ ہر پادری شاہ سے وفاداری کا حلف اُٹھاتا ہے۔ واضح رہے کہ 1558ء میں ملکہ ایلزبتھ اول کے دور میں ریاست کو چرچ سے وابستہ کیا گیا۔

ہمارے سیکولر دانشور اور کالم نگار ہمیں بتائیں کہ قائداعظمؒ نے اپنی 11 اگست 1947ء کی تقریر میں انگلستان کے کس سیکولر پہلو کی بات کی تھی؟ افسوس ہے کہ جو بات کھینچ تان کر بنائی گئی، وہ انھوں نے نہیں کی۔ برطانیہ تو ویٹی کن کے بعد سب سے کٹڑ مذہبی عیسائی مملکت ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہاؤس آف لارڈز میں عیسائی بشپوں کے لیے 26 سیٹیں مخصوص ہیں۔ حکومت چرچ آف انگلینڈ کے تعلیمی

اداروں کو فنڈ مہیا کرتی ہے۔

یہ بات کتنی افسوس ناک ہے کہ تخلیق پاکستان کے نظریے کو باہر کے نہیں بلکہ اپنے اندر کے لوگ جو پاکستانی کہلاتے ہیں، بلا روک ٹوک چیلنج کر رہے ہیں۔ یہ دوقومی نظریے کی مکمل نفی ہے جو آزادی سے قبل کے اکھنڈ بھارت کی تائید کرتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی قوم کے مؤسس (Founding Fathers) کے خیالات و افکار کی نفی نہیں ہوئی جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ یہاں تو پورے کا پورا قبلہ بدلنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ماضی میں ہم نے کئی غلطیاں کیں اور ابھی تک ان غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

اب نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قائد اعظمؒ کو ''سیکولر'' ثابت کرنے کی غلطی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ پاکستان یہ چوٹ برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی محبّ وطن پاکستانی سیکولرازم جیسے غیر اسلامی نظریے کو قبول کر سکتے ہیں۔ ہمارا ماضی مسلم اور ہمارا مستقبل بھی مسلم ہے۔ اسلام پاکستان کی بنیاد ہے اور یہی پیغام قائد اعظمؒ کا ہے:

❑ ''ہم نے پاکستان کی جنگ آزادی جیت لی ہے۔ مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی سنگین ترین جنگ ابھی جاری ہے اور اگر ہمیں ایک بڑی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنا ہوگی۔ فطرت کا اٹل اور سفاک قانون ہے ''بقائے اصل''۔ ہمیں خود کو اس نئی آزادی کا اہل ثابت کرنا ہے۔ فاشیت کے خطرات سے دنیا کو بچانے اور اسے جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کی خاطر کرۂ ارض کے دور دراز حصوں میں جا کر آپ نے میدان جنگ میں دادِ شجاعت حاصل کی ہے۔ مگر اب آپ کو اپنے ہی وطن عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی عدل اور مساوات انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔ آپ کو ان کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا، ہمہ تن ہوشیار۔ ستانے کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔ یقین محکم، ضبط و نظم اور ادائیگی فرض کی دھن، ایسے اصول ہیں کہ اگر آپ

ان پر کاربند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کرسکیں۔

(افواج پاکستان کے سامنے 21 فروری 1948ء)

❑ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں''۔

(شاہی دربار سبی، بلوچستان میں تقریر۔ 14 فروری 1948ء)

محمد متین خالد

محمد علی جناحؒ، عظمت کردار کا استعارہ

حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ بے پناہ خوبیوں اور خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے مشیتِ الٰہی سے قیام پاکستان کی ذمّہ داری نہایت احسن طریقے سے ادا کی۔ حضرت قائد اعظمؒ کا یہ احسان عظیم ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے دنیا میں اسلام کے نام پر قائم ہونے والی دوسری بڑی آزاد اور نظریاتی مملکت قائم کی۔ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے میں اس آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو آتش دوزخ سے بچائے گا۔ (صحیح بخاری) اس حدیث مبارک کی روشنی میں کیا کوئی شخص حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کر سکتا ہے جنہوں نے کروڑوں مسلمانوں کو انگریزوں کی بدترین غلامی اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے آزادی دلائی۔ بلاشبہ یہ کامیابی مشیّتِ ایزدی کے بغیر ناممکن تھی۔ اللہ تعالیٰ کو قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے ایک بڑا کام لینا تھا، اس لیے وہ گذشتہ صدی میں خطہ ہند میں گویا **''مامور من اللّٰہ''** تھے۔ چنانچہ انہیں حلقہ یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح مضبوط بنایا گیا تھا۔

یہ حقیقت بھی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی شخصیت میں بلند مرتبہ روحانیت شامل تھی۔ قائد اعظمؒ نہ صرف نماز پنج گانہ باقاعدگی سے پڑھتے تھے بلکہ خلوت کے اوقات میں بہت دیر تک بند کمرے میں اللہ کے حضور سربسجود رہتے اور بلک بلک کر آہ و زاری کے ساتھ قیام پاکستان کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت ان کا روز کا معمول تھا۔ انہیں بار ہا رات

گئے قرآن مجید لیے سر جھکائے، دعا مانگتے اور آنسو بہاتے دیکھا گیا۔ وہ بچپن سے لے کر آخر تک باقاعدگی سے روزے رکھتے رہے۔ وہ ایک عام دنیا دار مسلمان راہنما نہیں تھے بلکہ انہیں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں خاص غلامانہ مقام حاصل تھا۔ آپ انگلستان میں مقیم تھے کہ ایک رات خواب میں انہیں حضور خاتم النبیّین حضرت محمد ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ نے انہیں مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کی قیادت کرنے کے لیے برطانیہ سے ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ اس پس منظر میں تحریکِ پاکستان محض ایک نئے آزاد ملک کے حصول کی جدوجہد نہیں تھی بلکہ اس ملک کا قیام حضور اکرم ﷺ کا ایک عظیم اور زندہ جاوید معجزہ ہے، منصہ شہود پر جس کی تعبیر کی سعادت حضرت قائداعظم کو عطا فرمائی گئی۔ یہ یقیناً آقا کریم ﷺ کے فرمان گرامی کا فیضان ہی تھا کہ کروڑوں مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے حضرت قائداعظمؒ کے گرد جمع ہو گئے اور قیامِ پاکستان کے لیے پوری قوت کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

برصغیر کے مسلمانوں کو دوہری غلامی سے نجات کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ کا انتخاب اس خطے کے مسلمانوں پر سرورِ کونین ﷺ کی نظر کرم کی دل آویز شہادت ہے۔ قائداعظمؒ کے علاوہ متعدد جید مشائخ پر بھی سرکار دو عالم ﷺ کا یہ کرم ہوا کہ آپ ﷺ نے خواب میں براہ راست یا بالواسطہ انہیں حضرت قائداعظمؒ کی حمایت کا حکم فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ پاکستان میں برصغیر کے تمام جید مشائخ عظام اور پیرانِ کرام نے کھل کر قائداعظمؒ کا ساتھ دیا اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔

فاتح قادیانیت تاجدار گولڑہ شریف حضرت پیر سیّدنا مہر علی شاہؒ کے فرزند ارجمند حضرت پیر سیّد غلام محی الدین گیلانیؒ المعروف قبلہ بابو جی کے حوالے سے روایت بیان کی جاتی ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں وہ ایک بار اجمیر شریف گئے۔ وہاں اُن کے ایک ارادت مند نے انہیں اپنا یہ خواب سنایا کہ ”حضور نبی کریم ﷺ کرسی پر تشریف فرما ہیں، سامنے میز پر ایک فائل پڑی ہوئی ہے، چند لمحے پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپ ﷺ وہ فائل اس کو تھما کر فرماتے ہیں: یہ پاکستان کی فائل ہے“۔ وہ شخص خواب سنا چکا تو تھوڑی دیر بعد اخبار آ گیا

جس کے صفحہ اول پر ایک تصویر دیکھ کر اس ارادت مند نے کہا کہ یہی وہ آدمی ہے جسے اس نے رات خواب میں سرکار دوعالم ﷺ سے فائل لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ قائداعظم کی تصویر تھی جسے اس سے پہلے دیکھنے کا اُس شخص کو اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد پیر صاحب نے علی الاعلان قائداعظمؒ اور اُن کے مشن کی حمایت شروع کر دی۔

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت خواجہ قمرالدین سیالویؒ نے فرمایا کہ میں رات کو سیال شریف میں اپنے حجرے میں محوخواب تھا کہ میں نے دیکھا کہ میں اور ہندوستان کے تمام زعما، علما، فضلا، اولیا اور لاکھوں عوام کا اجتماع میدان عرفات میں ہے اور ہم سب ایک اونچے سٹیج کی طرف دیکھ رہے ہیں جیسے ہم سب کو کسی کی آمد کا انتظار ہے۔ پھر اس سٹیج پر آقائے دوجہاں، سرور کائنات، محبوب خدا، نبی پاک ﷺ اپنے چاروں خلفا راشدینؓ کے ہمراہ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ سب سے آگے آپ ﷺ قیام فرما ہیں اور آپ ﷺ سے پیچھے ہٹ کر دائیں جانب خلفاء راشدینؓ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے دست مبارک میں ایک جھنڈا ہے۔ چند لمحوں کے بعد حضور نبی کریم صاحب لولاک ﷺ فرماتے ہیں کہ محمد علی جناحؒ کہاں ہیں؟ ہم سب مجمع میں دیکھنے لگ جاتے ہیں جیسے ہمیں معلوم ہو کہ محمد علی جناحؒ ہم میں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ دفعتاً محمد علی جناحؒ مجمع کو چیرتے ہوئے اس اونچے سٹیج کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہم سب ان کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ نبی پاک ﷺ کے سامنے نگاہیں جھکا کر باادب کھڑے ہو جاتے ہیں اور سرکار دوعالم ﷺ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے فرماتے ہیں کہ جھنڈا لاؤ۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ وہ سبز ہلالی پرچم محمد علی جناحؒ کو عطا فرماتے ہیں۔ میری آنکھ کھل گئی اور اگلی صبح میں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ ہم پہلے ہی تحریک آزادی کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف جہاد میں مصروف تھے اور اب ہم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے وہی جھنڈا لے کر قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

بعض کم فہم لوگ حضرت قائداعظمؒ پر انگریزی وضع قطع کی پھبتی کستے ہیں اور اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لیے آپ پر تنقید کے نشتر چلاتے ہیں مگر ان کور بینوں کو کیا معلوم کہ بظاہر کوٹ پینٹ میں ملبوس اس شخصیت کو اپنے کریم آقا ﷺ کی بارگاہ میں کس

قدر شرف نیاز حاصل تھا۔ آپ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں کس قدر مقبول تھے اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوتا ہے۔ مذکور ہے کہ ایک رات خواب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مولانا محمد اشرف علی تھانوی کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ قائداعظم کے ظاہری لباس اور شکل و شباہت کو نہ دیکھیں بلکہ ان کے دل میں موجزن ملت اسلامیہ کے لیے بے پناہ جذبے اور تڑپ کو دیکھیں اور ان کی مکمل حمایت کریں۔ ایک اور رویا صالحہ میں شفیع المذنبین حضرت محمد ﷺ نے مولانا شبیر احمد عثمانی کو حکم فرمایا کہ بمبئی جا کر محمد علی جناح سے ملاقات کرو اور راہنمائی کرو۔ اس خواب کے فوراً بعد مولانا عثمانی، قائداعظم سے ملاقات کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔ جب دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی تو قائد اعظم نے رقت آمیز لہجے میں مولانا عثمانی کو بتایا کہ اسی شب ان کو بھی خواب میں پیارے آقا ﷺ نے شرف ملاقات بخشا تھا۔

مسجد نبوی ﷺ کے خادم خاص آغا اسحٰق علی کا یہ خواب بھی ایمان افروز ہے کہ جس روز قائداعظم کا انتقال ہوا، اس روز انہیں حضور رحمت للعالمین ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ خوش نظر آئے اور ارشاد فرمایا: ''آج ہمارا دوست آ رہا ہے، اس کی آمد کی آپ بھی خوشی مناؤ''۔ متذکرہ بالا واقعات کے علاوہ حضرت قائداعظم اور جید علما و مشائخ کی سوانح میں ایسے دیگر متعدد واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قائداعظمؒ کو بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں کیا خاص غلامانہ مقام حاصل تھا۔

امیر ملت حضرت پیر جماعت علی شاہؒ، حضرت مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، حضرت پیر صاحب زکوڑی شریف، حضرت پیر صاحب مانکی شریف، حضرت پیر صاحب مکھڈ شریف، غازی اسلام پیر محمد شاہ بھیرویؒ، علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا غلام مرشد ایسے صاحبان علم و تصوف نے غیر مشروط طور پر قائداعظم کی دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر ممکن سرپرستی اور مدد کی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے لاہور ہائی کورٹ میں شہید ناموس رسالت ﷺ غازی علم الدین شہیدؒ کا کیس لڑا۔ ان تمام مذکورہ عوامل کی بنیاد پر بعض اہل اللہ کا کہنا ہے کہ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ، صحابہ کرامؓ کے دور کے آدمی تھے مگر مشیت الٰہی نے ایک خاص مصلحت کے

تحت انہیں بعد میں ہمارے دور میں پیدا کیا۔

یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ جن لوگوں نے قیام پاکستان اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی مخالفت کی تھی، ان میں سے بیشتر نے پاکستان بننے کے بعد کھلے عام اپنی سیاسی شکست کا اعتراف کیا اور اپنے کارکنوں کو تمام اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے استحکام پاکستان کے لیے کوششیں کرنے کی تلقین کی۔ لیکن افسوس کہ ان کے پیروکاروں کی اکثریت نے اپنے بڑوں کی بات ماننے سے انکار کیا اور وہ آج بھی چاند پر تھوکنے کی کوشش کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگ آج بھی پاکستان کی مخالفت اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی کردار کشی میں پیش پیش ہیں۔ ایسے ہی کج فہموں میں سے ایک نور قریشی ایڈووکیٹ اور دوسرا نہایت بدطینت آنجہانی ابوسلمان شاہجہان پوری ہندی بھی ہیں۔ انہوں دونوں افراد نے اپنے خبث باطن اور مخبوط الحواسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائد اعظم کی عظیم المرتبت شخصیت پر ایسے شخصی و عائلی نوعیت کے گھٹیا اور رکیک حملے کیے ہیں جو ہر محبّ وطن پاکستانی کے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ نور قریشی کو جو لوگ جانتے ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ وہ پرلے درجے کا بدکردار، بددیانت، بے دین اور عدالتی ٹاؤٹ تھا۔ وہ حلال وحرام کی تمیز اور جائز و ناجائز کی فکر سے تہی دامن تھا۔ ایسی گھٹیا ذہنیت کے حامل شخص کا قائد اعظمؒ پر غوغا آرائی کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جہاں تک بدفطرت و بدطینت سلمان ہندی کا تعلق ہے تو یہ دریدہ دہن شخص بھی پاکستان اور قائد اعظم کی سرعام توہین کرتا اور ہذیان بکتا رہا۔ یہ غالباً 1986ء کی بات ہے کہ علی گڑھ کالونی کراچی میں وہ ہندوؤں کا روپ دھارے، قشقا لگائے، حسب معمول پاکستان کے خلاف بکواس کر رہا تھا جس سے اہل علاقہ میں سخت اشتعال پھیلا۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں نے اس بدطینت کا منہ کالا کر کے اس کے سر پر جوتے مارے اور اس کا گھر بھی نذر آتش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود یہ رذیل صفت شیطان ایسے پراگندہ باتوں سے باز نہیں آیا۔

چلن لا دینیت نے سکھلا دیا ہے دانشوروں کو
کہ مملکت پاکستان پہ زباں دراز کریں

ان لوگوں کی کج فکری کا ایک بنیادی عنصر یہ بھی ہے کہ یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا موازنہ ابوالکلام آزاد سے کرتے ہیں۔ کہاں قائداعظمؒ ایسا سچے کردار اور اجلی گفتار کا کوہ ہمالیہ اور کہاں ابوالکلام آزاد ایسا قول وفعل کے تضاد کا مجموعہ ہندی گوئبلز۔ حقائق ونظائر اور دلائل و براہین کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ابوالکلام آزاد ذاتی کردار کے حوالے سے قائداعظم کے پاپوش سے لگنے والی خاک کے برابر بھی نہیں تھا۔ چہ نسبت خاک را با محمد علی جناح! امیرالمؤمنین سیّدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان ہے کہ انسان صوم وصلوۃ سے نہیں بلکہ اپنے قول وفعل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس فرمان عالی شان کی روشنی میں مذکورہ دونوں شخصیات کی سوانح کا جائزہ لیں تو سرے سے کوئی تقابل بنتا ہی نہیں۔ بلکہ ابوالکلام آزاد تو صوم وصلوٰۃ میں بھی حضرت قائداعظم کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں جبکہ کردار کی بلندی کی تو بات ہی الگ ہے۔

قائداعظمؒ محض چند مخصوص اخلاقی اقدار پر ہی کاربند نہیں تھے بلکہ انہوں نے اسلام کو بطورِ ضابطہ حیات اپنا رکھا تھا۔ ان کی راست بازی، تقویٰ شعاری اور عالی کردار کے متعدد مظاہر تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس تناظر میں آپؒ کی بے داغ سیرت سے ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بیماری کے آخری دنوں میں جب ان کے معالج کرنل الٰہی بخش نے شراب کے چند قطرے ان کے لیے بطور دوا تجویز کیے اور بحیثیت ڈاکٹر اس پر اصرار کیا تو قائداعظم نے سختی سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ مجھے مرنا قبول ہے لیکن میں اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں شراب آلود منہ لے کر نہیں جاؤں گا۔ اسے کہتے ہیں کردار کی پختگی۔ یہ عزیمت اور تقویٰ ہے۔ حالانکہ فقہی طور پر تو طبیب کی تجویز پر بطور دوا ان چند قطروں کے استعمال کی رخصت تھی مگر قائداعظمؒ نے عزیمت کو اپنی جان کی بقا پر ترجیح دی۔ اس کے برعکس ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم دین ہونے کی شہرت کے باوجود بھی صوم وصلوۃ کے باقاعدہ پابند نہ تھے اور ایک عظیم دین دار والد گرامی کے فرزند ہونے اور خود کو مولانا اور مفسر قرآن کہلانے کے باوجود بھی ان کی داڑھی شریعت کے مطابق نہ تھی اور شراب ان کی خوراک کا لازمی حصّہ تھی۔ (بحوالہ: ''نہرو دور کی یادیں'' از ایم او متھائی، ''سچ ،

محبت اور ذرا سا کینہ'' از خوشونت سنگھ) بقول بریگیڈ یئر شمس الحق: آزاد نے نعوذ باللہ قرآن مجید کی تفسیر (ترجمان القرآن) بھی شراب میں دھت ہو کر لکھی۔ ابو الکلام آزاد نے ایک خط کے جواب میں لکھا: ''ایک شخص نے آپ کے حوالے سے لکھا ہے، تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے سید سلیمان چلے گئے ہیں؟ میں نے جی میں کہا، یہ تو سچ نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس کی نسبت آپ کا بیان سچ ہے یا غلط؟ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے، میں نے سبھی طرح کی سیہ کاریاں کی ہیں۔'' (''ابوالکلام آزاد سوانح و افکار'' از شورش کاشمیریؒ صفحہ 502، ''مکتوبات سلیمانی''، جلد اول از عبدالماجد دریابادی صفحہ 23) ان کے اس اقرار کو پڑھنے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔

کہتے ہیں کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا اور اپنے دوستوں کے دین پر ہوتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النّبیّین حضرت محمد ﷺ نے اچھے دوست اور برے دوست کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''اچھے دوست اور برے دوست کی مثال کستوری اٹھانے والے اور بھٹی جھونکنے والے کے مانند ہے۔ کستوری اٹھانے والا یا تو آپ کو ہدیہ میں دے دے گا یا آپ اس سے خرید لیں گے یا کم از کم اچھی خوشبو تو پائیں گے۔ جبکہ بھٹی جھونکنے والا آپ کے کپڑوں کو جلا دے گا یا کم از کم آپ اس سے بدبو پائیں گے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے دوستوں اور مؤیدین میں علامہ محمد اقبالؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ظفر علی خان، نواب بہادر یار جنگ، امیر ملت حضرت پیر جماعت علی شاہ، پیر صاحب زکوڑی شریف، پیر صاحب مانکی شریف، پیر صاحب سیال شریف، پیر صاحب مکھڈ شریف، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ جیسے متعدد مشائخ عظامِ پیرانِ کرام، اولیا اللہ اور علما و صلحا شامل ہیں جن کے کردار کا ایک زمانہ معترف ہے جبکہ ابوالکلام آزاد کے دوستوں میں گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل اور ماسٹر تارا سنگھ وغیرہ شامل ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اسلام دشمنی، بت پرستی، شراب اور دیگر نجاستیں ان مشرکین کی گھٹی میں شامل تھیں۔

متحدہ قومیت پر ایمان رکھنے کے باوجود ابوالکلام کے دل میں مسلمانانِ ہند کی

قیادت کی خواہش اپنی جگہ موجود تھی اور وہ ہر مرحلے پر اس کے حصول کے لیے کوشاں نظر آتے تھے۔ انہوں نے یکم جنوری 1920ء کو رہائی کے بعد مسلمانانِ ہند کی قیادت کے حصول کے لیے 'امام الہند' کی اسکیم وضع کی اور پھر خود ہی 'امام الہند' مقرر ہو کر بیعت لینے لگے لیکن تحریک خلافت کے دوران علی برادران کو جو شہرت حاصل ہوئی تھی، اس سے گھبرا کر ستمبر 1920ء میں تحریک امامت کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ویسے بھی مولانا عبدالباری فرنگی محلّی، مولانا محمود الحسن اور مولانا حسرت موہانی جیسے راہنماؤں نے پہلے ہی مرحلے میں ابوالکلام کی امامت کو قبول کرنے سے احتراز کیا تھا۔ غرض کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح سے وہ مسلمانانِ ہند کے بلاشرکت غیرے قائد قرار پائیں مگر ان کو کسی مرحلے پر بھی کامیابی نہیں ملی جس کی بنا پر وہ شدید الجھن اور نفسیاتی پیچیدگی کا شکار ہو گئے اور یہ پیچیدگی آخر وقت تک ان کے ساتھ رہی۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے مخالفین اپنے حسد اور بغض کی وجہ سے لفظ ''قائد اعظم'' پر معترض ہیں جبکہ وہ ابوالکلام آزاد کو ''امام الہند'' کا لقب دیتے ہیں۔ حیرانی ہے کہ یہ خارجی گروہ جگر گوشہ بتولؓ، راحت رسول مقبول ﷺ، جنت میں نوجوانوں کے سردار، سیّد الشہداء، امام عالی مقام سیّدنا حضرت امام حسینؓ کو امام ماننے اور کہنے سے انکاری ہے جبکہ یزید پلید کو امیر المؤمنین کہتے ہیں جو کہ شراب و کباب کا رسیا تھا، جس نے حضرت امام حسینؓ کو شہید کیا، ان کے سر مبارک کی توہین کی، خاندان اہل بیت اطہارؓ کے شہزادوں اور شہزادیوں کو بے توقیر کرنے کی کوشش کی۔ کعبۃ اللہ پر حملہ کر کے خون ریزی کی، جس کی وجہ سے وہاں کئی دن نماز اور طواف نہ ہو سکا۔ مدینہ طیبہ پر لشکر کشی کر کے عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی اور مسجد نبوی ﷺ میں گھوڑے باندھے۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسینؓ کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

چنانچہ فلسفہ سیاست کے علمبردار ابوالکلام آزاد قادیانیت سے بھی متاثر تھے۔ وہ ضروریاتِ دین کے بنیادی عقیدے حیات ونزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ظہور مہدیؑ کے منکر تھے۔ ابوالکلام آزاد نے 1908ء میں جھوٹے مدعی نبوت آنجہانی

مرزا قادیانی کی موت پر نہ صرف اس کے جنازے میں شرکت کی بلکہ 30 مئی 1908ء کو اپنے اخبار ''وکیل امرتسر'' میں اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ایک تعزیتی شذرہ بھی لکھا۔ آزاد کے والد بزرگوار محمد خیرالدین فیروز بخت صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ جب آزاد نے اپنے عقائدونظریات تبدیل کیے تو ان کے والد نے اپنی دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اس ناخلف بیٹے سے ہمیشہ کے لیے تعلقات منقطع کر لیے۔ اس حقیقت کا تذکرہ بعض حضرات کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا کہ ابوالکلام آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' مصر کے سیّد رشید رضا کی تفسیر ''المنار'' کا چربہ ہے۔ سید حسن مثنیٰ ندوی کے بقول اس کو سرقے کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔''

(تفصیل کے لیے دیکھیے جریدہ (27) چہ دلاوراست، ''مشرق ومغرب میں سرقہ بازی کی تاریخ'' از شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی)

سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہوگئیں

تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے جلسوں کے مقابلے میں کانگریس بھی اپنے جلسے منعقد کرتی تھی۔ کلمہ گو کانگریسی راہنما مسجدوں میں منعقدہ اپنے جلسوں میں ہندو راہنما گاندھی کو مہمان خصوصی یا صدارت کے لیے بلاتے۔ بقول شخصے ان ''مقدسین'' نے غیروں کے اشارے پر 'متحدہ قومیت' کے نام پر ایک نیا 'سومنات' تعمیر کیا اور تحریک پاکستان کے خلاف اس بت کی پرستش عین اسلام قرار دی۔ ہم نے یہ ضرب المثل تو سنی تھی کہ شیطان اپنی تائید میں قادیانی کتب سے حوالے تلاش کرتا ہے لیکن یہ کسی مسلمان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہماری امت کے یہ وطن پرست مذہبی پیشوا 'وطنیت کے سومنات' کی حمایت میں قرآن اور اسوہ رسالت ﷺ سے ایسے ایسے دلائل تراشنے کی بھونڈی کوشش کریں گے کہ دنیا ورطہ حیرت میں ڈوب جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کو کہنا پڑا ؎

شیخ ملت با حدیث دل نشیں بر
مراد او کند تفسیر دیں

ایک دفعہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھا نند نے جامع مسجد دہلی میں منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ جب ان خرافات پر شور مچا کہ ایک غیر مسلم اور مشرک کس طرح مسجد کے منبر پر بیٹھ کر خطاب کر سکتا ہے تو ابوالکلام آزاد نے اس غیر شرعی فعل کو اسلامی سند فراہم کرتے ہوئے اس کی تائید اور جواز میں **جامع الشواھد فی دخول غیر المسلمین فی المساجد** نامی کتاب لکھی جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غیر مسلموں کا مسجدوں میں داخل ہونا اور وہاں منعقد ہونے والی مجلسوں میں شمولیت کرنا جائز ہے۔ یعنی آزاد کے نزدیک مسجد اور ہندوؤں کے مندروں میں کوئی فرق نہیں۔ ہندوؤں کو مسجدوں میں آنے کا جواز فراہم کرنے کی یہ حرکت نہایت قابل مذمت ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ گاندھی کی ہم نوائی میں اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ انہوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مقابلے پر جو سرکاری امداد سے چلتا تھا، کلکتہ کی جامع مسجد ''ناخدا'' میں ایک مدرسہ قائم کر دیا اور **13** دسمبر **1920**ء کو گاندھی نے اس قومی عربی مدرسے کا افتتاح کیا۔ (''تحریک خلافت''، قاضی محمد عدیل عباسی، صفحہ **74**)

ع آب کوثر سے جو پھسلا لب گنگا پہنچا

یہ بات بھی تاریخ کا ناقابل تردید باب ہے کہ معروف مسلمان کانگریسی راہنما **1936**ء تک مسلسل مسلم لیگ اور قائد اعظمؒ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے۔ پھر انہوں نے اپنی مخصوص بلیک میلنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناحؒ سے **50** ہزار روپے کا تقاضا کیا تھا۔ قائداعظم ان سومناتیوں کا مطالبہ پورا کر دیتے تو آج وہ ان کے نزدیک شیخ الاسلام ہوتے۔ یہ ہوش ربا انکشافات تاریخ کی بے شمار کتابوں کے علاوہ مجاہد ختم نبوت آغا شورش کاشمیریؒ کی سوانح حیات ''بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل'' میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ قائداعظم بلندی کردار کی اس معراج پر تھے کہ جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ساری زندگی ایسا کوئی غلط کام نہیں کیا جس سے ان کی شخصیت پر حرف آئے۔ قائداعظمؒ نے ان کانگریسی زعما کو رقم دینے سے انکار کیا اور پھر اس انکار کے نتیجہ میں کانگریسی علما نے اپنے جلسوں میں ان کی کردار کشی کرنا شروع کر دی۔ کبھی قائداعظم کو کافر اعظم کہا، کبھی ان کی عفت مآب

زوجہ کے بارے میں سر عام جلسوں میں جھوٹے الزامات لگائے اور کبھی اسے اپنی بے ہودہ شاعری کا موضوع بنایا۔ ایسا کرتے ہوئے نجانے وہ کیوں بھول گئے تھے کہ اگر ان کی اپنی 'زلیخائے ہند' کے بارے میں کوئی بات کرتا تو ان کے جذبات و احساسات کیا ہوتے؟ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ملحدین نے جب اسلام پر حملہ کرنا ہوتا ہے تو وہ علما کرام کو برا بھلا کہتے ہیں اور جب پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ کرنا ہوتا ہے تو وہ بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی کردار کشی شروع کر دیتے ہیں۔

کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کے تمام طبقوں کی منظورِ نظر اور ترجمان ہے اور اپنے اس دعویٰ کے دامِ فریب میں رنگ بھرنے کے لیے اس نے جو ڈراما رچایا تھا، اس کا ایک منظر یہ بھی تھا کہ مسلمان کانگریسی لیڈر ابوالکلام آزاد کو ہندو کانگریس کا صدر بنا لیا تھا تا کہ دنیا کو باور کرایا جا سکے کہ کانگریس نہ صرف مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے بلکہ مسلمانوں کو کانگریس میں بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ابوالکلام آزاد نے بطور صدر کانگریس قائداعظمؒ کے نام خط میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو قائد اعظم نے جواب میں کہا:

میں آپ سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ کانگریس میں آپ کی حیثیت محض ایک SHOW BOY کی ہے۔

گو قائداعظم کے اس جواب پر مخالفین نے بہت ہاہا کار مچائی اور غصّے میں انہیں مغرور اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا مگر Show Boy کی ترکیب سے ابوالکلام آزاد کی حیثیت اور کانگریسی مسلمانوں کی کانگریس نوازی پر جو پردہ پڑا تھا، وہ چاک ہو گیا اور ان کی اصلیت سے لوگ واقف ہو گئے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ پاکستان کے دیگر مخالفین اور قادیانی دونوں اکھنڈ بھارت کے قائل ہیں۔ دونوں نے پاکستان کو دلی طور پر قبول نہیں کیا۔ دونوں اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے درپے ہیں۔ آج بھی دونوں کی مذہبی و ذہنی وابستگی اور ہمدردی بھارت کے ساتھ ہے۔ یہ کیسی دلیرانہ منافقت ہے کہ یہ احسان فراموش اس ملک میں مکمل آزادی سے رہ رہے ہیں۔ یہاں کاروبار کرتے ہیں،

ملازمتیں کر رہے ہیں، زندگی کی ہر آسائش انہیں میسر ہے، لیکن پھر بھی وہ اس ملک کی مخالفت کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ بدخصلت اور برے لوگوں کی پہچان کے لیے یوں تو کئی حکایات اور پند ونصائح کے انبار مل جاتے ہیں مگر شیخ سعدیؒ نے بدفطرت لوگوں کی مثال بچھو کی پیدائش سے دیتے ہوئے ان سے دور رہنے کی تلقین نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں کی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ بچھو کی پیدائش عام جانوروں کی طرح نہیں ہوتی بلکہ جب یہ اپنی ماں کے پیٹ میں کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو اندر سے پیٹ کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے اور یوں سوراخ کر کے باہر آ جاتا ہے۔ بچھو کی فطرت اور عادت پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دن سے برائی کرنا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور دیکھتے ہی مار ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے نہایت آسان مگر دلچسپ پیرائے میں مجلس یاراں کے انتخاب اور صحبت سے متعلق بچھو کی مثال دے کر اہل عقل کو شریف اور بدخصلت کی پہچان سمجھا دی۔ آپؒ نے بچھو کی پیدائش کی مثال دے کر بدفطرت لوگوں سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ انسانی نفسیات کا یہ مسئلہ بے حد الجھا ہوا ہے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ کوئی شخص شریف اور کوئی بدفطرت وبدخصلت کیوں ہے؟ لیکن اس بات سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانوں میں یہ فرق موجود ہے اور اہل عقل کے لیے لازم ہے کہ اس فرق کو ہر معاملے میں ملحوظ رکھیں۔

مخالفین پاکستان کی کم ظرفی اور مردہ ضمیری کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ انہوں نے 1947ء میں پاکستان آ کر اپنے مخصوص انداز کذب وفراڈ سے جعلی کلیم بھرتے ہوئے نہایت قیمتی جائیدادیں اپنے نام الاٹ کروائیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ہر بڑے شہر کے پوش علاقوں میں انہوں نے ناجائز ذرائع سے اربوں روپے کی جائیدادیں بنا رکھی ہیں۔ مذہب کے نام پر سادہ لوح مسلمانوں سے کروڑوں روپے سالانہ اکٹھے کرنے والوں کو شاید کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ان کے اس چندے کے دھندے میں ان محبّ وطن پاکستانیوں کی رقوم بھی شامل ہیں کہ وہ اپنی تقاریر، تحاریر اور نجی محافل میں جن کی دل آزاری کرتے ہیں۔ پاکستان کے مخالفین میں اگر رتی برابر بھی

غیرت کا مادہ ہے تو انہیں سرحد پار کر کے اپنے حقیقی آقاؤں کے پاس بھارت چلے جانا چاہیے۔ یہاں رہنا ہے تو براہ کرم انہیں پاکستان زندہ باد کہنا ہوگا، بندے ماترم کے بجائے پاکستان کے قومی پرچم کو سلامی دینا ہوگی اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کو دل سے احترام دینا ہوگا۔ انہیں یہاں پاکستان اور قائداعظمؒ پر پھبتیاں کسنے اور مسلمانوں کی دل آزاری کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ انڈیا میں ہوتے اور وہاں ہندوستان یا گاندھی کے خلاف ایک جملہ بھی ادا کرتے تو ہندو انہیں وہ سبق سکھاتے کہ وہ ساری عمر یاد رکھتے۔

حکومت سے درخواست ہے کہ پاکستان کی مخالفت اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرنے والے شر پسندوں کے خلاف فوری طور پر قانون سازی کرے اور اس سلسلہ کی تمام متنازعہ کتابوں پر پابندی عائد کرے۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی شہریت منسوخ کر کے ان کے خلاف ریاستی دہشت گردی اور بغاوت کے مقدمات درج کر کے انہیں سخت ترین سزا دی جائے۔

میری اس تحریر پر اگر پاکستان مخالف کسی کانگریسی شخص یا گاندھی کے کسی پیروکار یا ان متنازعہ کتابوں کے مصنفین یا ان کے کسی وارث کو کوئی اعتراض ہو تو حسب عادت طعن و تشنیع، دشنام طرازی اور غوغا آرائی کے بجائے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ سے کسی بھی جگہ مباہلہ یا مناظرہ کر لے یا مجھے پاکستان کی کسی بھی عدالت میں بلائے تاکہ یہ ادنی پاکستانی وہاں ان کا اصل چہرہ بے نقاب کر سکے۔ (نوٹ: احقر عنقریب انگریزوں اور ہندوؤں کے راتب پر پلنے والے کانگریسی لیڈروں کی زندگی کے خفیہ گوشوں پر مشتمل چشم کشا انکشافات سے بھرپور کتاب تحریر کرے گا۔) قائداعظم زندہ باد، پاکستان پائندہ باد

حسن و خوبی کے رنگ و خوشبو کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

۞......۞......۞
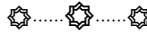
آغا شورش کاشمیری

قائداعظم: مسلمانوں کی ملی خواہش کا مظہر

یہاں آئے دن لوگ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ مگر گنے چنے لوگ چند ہی ہوتے ہیں جنہیں تاریخ اپنے دامن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتی ہے۔ قائداعظم بلاشبہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھے، جو ملت اسلامیہ نے اپنے عالمی زوال کے بعد پیدا کیے اور جن کی مساعی مشکور سے مختلف دوائر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا پرچم سربلند ہونے لگا...... قائداعظم نے جو کارنامہ سرانجام دیا، وہ کسی تفصیل وتشریح کا محتاج نہیں۔ تمام دنیا اس سے آگاہ ہے۔ اس برصغیر کا کوئی سا مؤرخ ان کی عظمت کو خراج ادا کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا، پاکستان ان کی سیاسی بصیرت کا ایک معجزہ اور مسلمانوں کی گمشدہ سلطنت کی بازیافت ہے۔

ہر بڑے آدمی کی ایک تخلیق ہوتی ہے۔ کوئی مخترعات کے باب میں اپنی یادگار چھوڑ جاتا ہے، کوئی ذہنی لمعات سے فکر ونظر کی وادیاں جگمگا جاتا ہے۔ کوئی فاتح کی حیثیت سے اپنا نقش جماتا اور کوئی مصلح کے طور پر تاریخ کی آغوش میں اپنا باب باندھتا ہے...... قائداعظم کی یگانہ روزگار شخصیت کو یہ کمال حاصل ہے کہ انھوں نے تاریخ کی باگ موڑ کر کرۂ ارضی کے جغرافیہ کی لکیریں اور حدیں بدل ڈالیں۔ وہ ہندوستانی سیاسیات میں ایک ابرنیساں کی طرح اُٹھے اور ایکا ایکی نقشہ ہی بدل ڈالا۔ صحیح تو یہ ہے کہ برصغیر کی پیچیدہ سیاسیات کا مسئلہ عملاً لاینحل تھا۔ عام ہندوستانی راہنما اس عقدہ کو جس طرز پر سلجھانا چاہتے تھے، اس سے مزید گتھیاں پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ بالخصوص یہ سوال خاصا اہم تھا کہ مسلمان اس سقفِ نیلی فام کے نیچے کیونکر زندگی بسر کریں...... آیا وہ ہندوستانی وطینت قبول کر لیں اور متحدہ قومیت کا جزو بن جائیں جس کا مطلب تھا کہ

اپنی انفرادیت گلدستہ طاقِ نسیاں بنا دیں یا ایک علیحدہ قوم کے طور پر مشخص ہو کر اپنی قومی زندگی کے نشوونما کا فرض ادا کریں...... قائداعظم نے جو کسی وقت ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے، اس مسئلہ کا حل قرارداد لاہور کی صورت میں پیش کیا، یہی قرارداد آگے چل کر قرارداد پاکستان کے نام سے منسوب ہوئی۔

....

پاکستان اور قائداعظم ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ دونوں کا چہرہ روشن اور دونوں میں جسد و جاں کا رشتہ ہے۔ دونوں زندہ و پائندہ ہیں۔ قائداعظم مسلمانوں کی تاریخی ضرورت کا مظہر تھے۔ پاکستان قائداعظم کے تاریخی تجربہ کا حاصل ہے...... واقعات ثابت کر چکے ہیں کہ انگریز سامراج اور سنگھٹی جارحیت کا ایک ہی حل تھا کہ پاکستان قائم ہو......

....

ایک زمانہ سے یہ سوال زیرِنگاہ ہے کہ مسلمانوں کا گمشدہ اقبال کیونکر واپس ہو، اور اسلام کے تجدید و احیا کا معرکہ کیسے سر ہو، اس صدی کے ربع ثانی سے نشاۃ ثانیہ کی مختلف الاصل تحریکیں چل رہی ہیں، جہاں تک فکری مواد کا تعلق ہے، مسلمانوں کا دامن خالی نہیں رہا، تاہم حرکت و عمل کے خطوط ادھورے ہیں اور جدوجہد کا ایک وسیع و عریض میدان سامنے ہے۔

مشرق کے مسلمانوں کو نہ صرف کاملاً آزاد ہونے کی ضرورت ہے بلکہ انھیں باہمدگر مربوط ہو کر ایک ایسے فیڈریشن یا کنفیڈریشن میں ڈھلنے کی احتیاج ہے جس سے ان کا آفتاب نصف النہار پر ہو...... قائداعظم نے پاکستان کی نیو رکھ کر نہ صرف اس نقشہ کے خطوط مرتب کیے...... بلکہ پاکستان کی صورت گری سے اس اسلامی سلطنت کی دیواریں بھی اُٹھا دیں جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے ایشیا کی حیاتِ نو کے زیرِ عنوان پیدا کیا اور جس کی غور و پرداخت نصف صدی سے متواتر ہو رہی ہے۔

غرض ایک ایسا قائد جس کی دماغی صلاحیتوں کا اعتراف پاکستان کے وجود کی صورت میں سامنے ہو اور جس کی سیرت پر اس کے بڑے سے بڑے حریف کی شہادت

موجود ہو کہ وہ تدبر و فراست اور دیانت و صیانت کے اعتبار سے گوہر یکدانہ تھا۔ نہ صرف ہمارے دلوں کی عقیدت کا مرجع ہے بلکہ اس کی یاد ہماری بہت بڑی متاع ہے، ہم ان کی زندگی سے کئی سبق لے سکتے ہیں، سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ ہم اس کی یاد سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اتنا سیکھیں، کہ بڑا آدمی بننے کے لیے کون سے اوصاف ضروری ہوتے ہیں اور وہ کون سی معلوم و معروف سچائیاں ہیں جن کے اختیار کرنے سے آدمی بڑا بن جاتا ہے۔

پاکستان ایک امانت ہے جو اس بے مثال راہنما کی جدوجہد کے صلہ میں ہمیں وراثتہً ملی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر قیمت پر اس کی حفاظت کریں اور اس کی عظمت کو چار چاند لگائیں، پھر جن لوگوں نے اس کے علم کو سر بلند کرنے اور اس کے نام کو بے داغ رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے، ان کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ دے کر قدم بقدم چلیں۔ قائداعظم کی حقیقی یاد کا صحیح عکس یہی ہے کہ اسی میں پاکستان کی برتری و بہتری ہے۔

....

جب تک کرۂ ارضی پر پاکستان آباد ہے، قائداعظم کی یاد کبھی محو نہ ہوگی لیکن دلوں کی یاد بالکل دوسری چیز ہے، زندہ قوموں کا یہی شعار رہا ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی اور ان سے اپنی عقیدتوں کو وابستہ کر کے اپنے لیے حرکت و عمل کے خطوط حاصل کرتی ہیں۔

....

اخباری مضامین اور وقتی مقالات بالکل دوسری چیز ہیں، ان سے ارادت کے جذبات مترشح ہوتے ہیں، لیکن ان کے مقام و عمل کے خاص خاص موقعے ہیں۔ چونکہ انسانی فطرت دلیل سے زیادہ جذبے پر مرتی ہے، اس لیے جذبے کا باقی رہنا بہرحال ضروری ہے۔ تاہم قومی سیرت ہمیشہ فکری اثبات اور اس کے مظاہر ہی سے پروان چڑھتی ہے...... ہمارے سامنے اس لحاظ سے ایک بڑا کام ہے۔ ہمیں آئندہ نسلوں کو یہ بتانا ہوگا کہ قائداعظم کون تھے، انھوں نے ہمارے لیے کیا کچھ کیا، وہ مسلمانوں کی اجتماعی انا اور کامل انفرادیت کا مظہر کیوں کر بنے...... انھوں نے پاکستان کیسے حاصل کیا اور وہ کون سے محرکات و عوامل تھے جن کا نتیجہ پاکستان ہے؟

اقبال کہتا ہے:

''کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا''

اور وہ افکار عالیہ جن سے یہ جہاں پیدا ہوتے ہیں، روز روز وجود میں نہیں آتے، ان کی بازگشت تو ہمیشہ رہتی ہے اور لوگ اعلیٰ فکر کی تشریحات وتصریحات کو نابغہ لوگوں کی معرفت قبول و وصول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جس فکر سے کوئی کارنامہ بساطِ ہستی پر رونما ہوتا ہے، بڑی ریاضت کے بعد پیدا ہوتی ہے اور اس قسم کے دیدہ ورآب و گل کی بڑی آرائشوں کے بعد جنم لیتے ہیں۔ **1857**ء کے بعد مسلمانوں کی فکر کے دو راستے ہو گئے۔ جس راستے کی جیت ہوئی، وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے لیے ایک الگ ملک چاہیے، جہاں وہ اپنے ثقافتی، تمدنی، تہذیبی، لسانی، دینی اور فکری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس فکر نے جب عمل کا روپ اختیار کیا، تو قائداعظم اس کے مظہر ہو گئے۔

....

ایک ناقابل شکست یقین کے ساتھ انھوں (قائداعظم) نے ہمیں ایک ایسا ملک لے دیا ہے جو ہماری خواہشوں کا مرجع اور ہماری امیدوں کا محور ہے۔

....

عربی کی کہاوت ہے کہ حسن وہ ہوتا ہے جس کا اعتراف سوکن کو بھی ہو۔ قائداعظمؒ سے جہاں تک عقیدت و احترام کے اتھاہ جذبات کا تعلق ہے، وہ ہندوستانی مسلمانوں کی عملی سیاست میں منفرد راہنما تھے۔ اسی اعتبار سے پورے اسلامی ہندوستان میں کوئی شخصیت ان کی ہم پلہ نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی سیاسی آواز پر پورے انہماک کے ساتھ لبیک کہا اور وہ رنگا رنگ کی مشکلات کے علی الرغم جیت گئے۔

مہاتما گاندھی کا ان کے متعلق قول تھا: ''جینا، ناقابل خرید مسلمان ہے''۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''تلاش ہند'' میں لکھا ہے: ''ان کی قیادت مسلمانوں کے لیے ناگزیر سی چیز تھی۔ راجگوپال آچاریہ نے ایک بیان میں تسلیم کیا تھا: ''جینا، مسلمانوں کے سیاسی رجحانات کا عکاس ہے''۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک ذاتی گفتگو میں مانا تھا:

''قائداعظم نے اپنے سیاسی موقف کے لیے مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی

دیوار بنا دیا ہے''۔

لانبا قد، گورا رنگ، مسکراتا ہوا چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، لاغر جثہ، خوش لباس اور خوش مزاج، بات نہایت دھیمے پن سے کرتے اور نتیجے پر نہایت تیزی سے پہنچتے تھے۔ان کا سراپا، ہندوستانی قامت میں یورپی ذہانت کا مرقع تھا۔

قائداعظم کے لفظ کے مجوز لاہور کے ایک زندہ دل نوجوان میاں فیروز الدین احمد تھے جنہوں نے سب سے پہلے پٹنہ کے اجلاس میں ''قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تھا۔

قائداعظم ہندوستانی سیاست میں صبا کی طرح نکلے،ایک زمانے میں موج کی طرح کنارہ کش ہو گئے۔ پھر آفتاب کی طرح اُبھرے، قرارداد لاہور کے بعد نصف النہار پر آگئے اور دیکھتی آنکھوں ہر کہ ومہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور پاکستان فی الواقع ایک سیاسی معجزہ ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بعض بڑے آدمیوں کے نام ان کی ''اِل'' سے پختہ اور معروف ہو جاتے ہیں۔مثلاً قطب الدین ایبک اور ایبک ترکی میں چھنگلیا کو کہتے ہیں۔ نہرو نہ ذات ہے نہ پات، جواہر لال کی اصل گوت کول ہے لیکن چونکہ ان کا خاندان، دہلی میں جمنا کی ایک نہر کے کنارے آباد تھا۔ اس لیے لوگ نہرو پنڈت کہنے لگے اور اب ان کے نام کا جز ہی نہیں بلکہ نام ہی ہے۔افلاطون کا اصل نام کچھ اور ہے۔ یونانی میں چوڑے چکلے سینے والے کو افلاطون کہتے ہیں۔ چونکہ گھر والے اس کے چوڑے چکلے سینے کی رعایت سے افلاطون کہا کرتے تھے، اس لیے اصل نام تو غتربود ہوگیا اور افلاطون پک گیا۔ ایسے ہی کئی اور تاریخی نام بھی ہیں...... الغرض، پاکستان قائداعظم کا چہرہ نما ہے۔ جب تک پاکستان زندہ ہے، قائداعظم بھی زندہ ہیں اور پاکستان ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔قائداعظم پائندہ باد

....

قائداعظمؒ کی ذات کو جتنا خراج بھی ادا کیا جائے کم ہے۔ یہ معمولی واقعہ نہیں کہ منحنی قامت کے ایک انسان نے تاریخ کی رفتار بدل ڈالی اور جغرافیہ عالم میں ایک

ایسی مملکت کی نیو رکھی جسے لوگ کبھی شاعر کا پریشان خواب کہتے تھے اور کبھی سامراج کی رجعتی سیاست ہی بے توقیر نعرہ۔

....

قائداعظمؒ نے سب کو مات دی۔ انھوں نے کوہساروں کے سینہ میں شگاف ڈالا، ہواؤں کا رخ پھیرا، زلزلوں کی عنان تھامی تو آندھیوں سے کہا، یہ تمھارا راستہ نہیں اور بجلیوں نے کوندنے کے لیے نقاب الٹی تو مسکرا دیئے۔ آخر بادلوں کی گھن گرج کا یہ انسان جس کا ہیولیٰ عزم کی مٹی سے تیار ہوا تھا، شاعر کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے تاریخ کے صفحوں کو اپنی اس فتح سے جگمگا دیا کہ پاکستان ایک مضبوط حقیقت کا نام ہے۔

....

قائداعظمؒ مسلمانوں کی ملی خواہش کا مظہر ہے۔

....

قائداعظم پیدا نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ حرکت و عمل کے خطوط چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر اس درخت کی شاخیں سرسبز ہو کر پھل دیتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کو زندہ کیا، فعال جماعت بنایا، حتیٰ کہ مسلمانانِ ہندوستان کی اکثریت نے اس کو اپنی واحد جماعت مان لیا اور پاکستان اس کا معجزہ ہے۔

....

قائداعظمؒ کے بعد ہمیں مشکلوں کا سفر پیش آ گیا، ہم ''ہائے کیا چیز'' ہو کر رہ گئے۔ میر کارواں ایسا نہ رہا جس کے پاس نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کا رختِ سفر ہوتا۔

....

پاکستان کے لیے کوئی شخص ناگزیر نہیں، وہ کسی شخص کا وجود حرف آخر ہے اور نہ کسی شخص کا یہ دعویٰ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ناخدائی ہی پاکستان کو بچا سکتی تھی۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے یا اس وہم میں مبتلا ہو کہ اس نے پاکستان کے فرضی عالم نزع میں اس کی مسیحائی کا فرض انجام دیا ہے، وہ احمق ہے۔ پاکستان زندہ ہے اور ان شاء اللہ کرۂ

ارضی کے نقشے پر صبح قیامت تک زندہ رہے گا۔ مسلمان عوام پر اللہ کا احسان ہے کہ ان کی اجتماعی قوت سے یہ ملک ایک مملکت ابد مدت ہو گیا ہے۔ جس اللہ تعالیٰ نے اس کو قائم کیا، وہی اس کی حفاظت کرے گا۔ انسانوں کو صرف فرض سونپا جاتا ہے۔ افراد پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں لیکن قومیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ پاکستان کا انحصار اگر کسی فرد پر ہوتا تو قائداعظم سے بڑا کون تھا لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اگلے سال ہی ان کا افسانہ حیات ختم ہو گیا۔ پاکستان ان کی موت کے بعد بھی زندہ رہا۔ کبھی پاکستان کا نقشہ ان کے دم قدم سے بن رہا تھا، آج پاکستان کی بدولت تاریخ کے زندۂ جاوید صفحوں میں ان کا نام ثبت ہو گیا۔ جب تک پاکستان قائم ہے، یوں کہیے کہ جب تک تاریخ کا سفر جاری ہے، لیل و نہار کی گردشیں رواں دواں ہیں، قائداعظم پاکستانی عوام کے ذہنوں اور دلوں کا مرجع ہیں۔ انھیں کوئی طاقت حافظوں سے محو نہیں کر سکتی اور یہ دوام پاکستان کی بدولت ہے۔ پاکستان کو انھوں نے حاصل کیا، پاکستان انھیں زندہ رکھے گا۔

....

ایک شخص ہندوستان کی عام خواہش کے خلاف ایک نعرہ دیتا ہے، جس قوم کے لیے نعرہ بلند ہوتا ہے، وہ خود اس ''نعرے'' کے مطالب و معانی سے آگاہ نہیں اور جس قوم کے ہاتھ میں ملک کی سیاسی نبض ہے، وہ اس نعرے کو بازیچہ اطفال سمجھتی ہوئی اس پر مسکراتی ہے، لیکن بالآخر اس نعرے کی جیت ہوتی ہے، پاکستان اسی نعرے کی عملی تفسیر اور اِسی خواب کی زندہ تعبیر ہے!

قائداعظم مسلمانوں کے عمومی مزاج کی نسبت سے کوئی دینی پیشوا نہ تھے، ان کی ذات میں ''اسلامیت'' کا وہ رنگ ناپید تھا جو ان کے شرعی محتسب ان کے وجود میں تلاش کرتے تھے۔ لیکن ایک سرد قامت منچلا انسان سب میں بازی لے گیا۔ اس کی سیرت کا آفتاب اس سج دھج سے طلوع ہوا کہ شبنمی ڈاڑھیوں کی آب اُڑ گئی اور وہ لوگ جنہیں اپنے مصنوعی فرضی ورع، بناوٹی اخلاص اور جعلی ایثار پر ناز تھا، اس کی عظمت کے آستانے پر سجدہ ہائے لٹانے حاضر ہو گئے۔

....

وہ دن لد گئے جب تاریخ بادشاہوں کی کہانیوں اور فرمانرواؤں کی داستانوں کا نام تھا۔ تیمور کی تزک ہو یا بابر کی، جہانگیر کی تزک ہو یا کسی سرکار ابد مدت کی، ان کی حیثیت اب زیادہ سے زیادہ کلاسیکی ادب میں متعین کی جاسکتی ہے اور وہ بھی زبان کا چٹخارا بدلنے کے لیے۔ ان اوراق سے عبرت کم سیکھتے ہیں، لذتِ مطالعہ زیادہ۔ ہمارے سامنے پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک بلکہ امروز و دیروز تک کتنے انقلاب آچکے ہیں۔

تلاش کیجیے کون باقی رہا، کتنے تذکروں کو جلا ملی۔ کیسی کیسی کہانیاں لوگوں کی نزہت گفتار لیے پھرتی ہیں۔ تاریخ کے یہی تجربے، مشاہدے اور مطالعے ہمیں سکھاتے ہیں کہ انسانوں کا گھمنڈ انہیں زندہ نہیں رکھتا بلکہ جو چیز انھیں زندہ رکھتی ہے، وہ قوم کے اجتماعی ضمیر میں ان کا احترام اور ملک کی معنوی زندگی میں ان کا وجود ہے۔

قائداعظم آج اس لیے زندہ نہیں کہ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے، وہ اس لیے زندہ ہیں کہ پاکستان ان کے سیاسی خوابوں کی اسلامی تعبیر تھا۔ انھوں نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا کہ اس کا وارث کوئی ایک شخص ہو یا قوم کی اجتماعی فراست کسی ایک فرد کی جاگیر ہو۔ یہ ملک سب کی مساعی سے سب ہی کے لیے بنا تھا۔ ساری کی ساری قوم اس کی وارث ہے۔ احساس کی یہ گہری چھاپ ہے جو ہر شخص کے دل پر لگی ہوئی ہے۔ پاکستان اول اور پاکستان آخر کا نصب العین ہی آج قوم کی سب سے بڑی میراث ہے۔ اس میراث سے وہی شخص دغا کرسکتا ہے جس کے خون میں ملاوٹ ہو یا جو اس خیال میں مبتلا ہو کہ تاریخ کی رفتار اس کے لیے ٹل سکتی اور زمانہ اس کی مرضی کے مطابق ڈھل سکتا ہے۔ جو لوگ قوم اور ملک کی مرضی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، تاریخ ان کے نام کو خاکستر کر دیتی اور زمانہ ان کے وجود کو اس طرح مٹا دیتا ہے جس طرح آفتاب کا طلوع رات کی تاریکیوں کو نگل جاتا ہے۔ ہم کسی فرد کے لیے نہیں، پاکستان کے لیے زندہ ہیں۔

۞......۞......۞
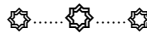
محمد رفیق عالم

قائداعظمؒ، مسلم لیگ اور ''بندے ماترم''

محمد علی جناحؒ کی ہندوستان کی سیاست میں آمد کا مقصد ہندوستانی قوم کے حقوق کا تحفظ اور ان کی خدمت کرنا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود مذہب کی بنیاد پر سیاست یا الگ وطن قائم کرنے کی ضرورت ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ وہ ایک قوم پرست سیاسی شخصیت کی حیثیت سے اس میدان میں اُترے۔ اس وقت مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا لیکن سیاست میں نمایاں حیثیت کانگریس کو حاصل تھی جسے درپردہ اور بعض معاملات میں انگریز حکومت کی اشیرباد بھی حاصل تھی۔ اس وقت کوئی بھی ہندوستانی دونوں سیاسی جماعتوں کا ممبر بن سکتا تھا۔ 1913ء میں محمد علی جناحؒ دونوں جماعتوں کے رکن بن گئے اور انہیں ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوششیں کرتے رہے تا کہ انگریز حکمرانوں کے مقابلے میں متفقہ لائحہ عمل اور مشترکہ جدوجہد کی راہ اپنائی جائے۔ ان کی دیانت دارانہ کوششوں کے نتیجے میں انہیں ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' قرار دیا گیا۔

محمد علی جناحؒ مذاکرات اور مفاہمت کے قائل تھے لیکن اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ناجائز سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوششوں کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسٹر گاندھی نے تحریکِ خلافت کے ذریعے اپنا سیاسی قد برصغیر کے مسلمانوں کی نظروں میں اونچا کرنے کے لیے نقصان دہ قائدانہ پالیسی اختیار کی تو محمد علی جناحؒ نے اس سے کھلم کھلا اختلاف کیا اور وقت نے ان کی رائے صحیح ثابت کر دی۔

گاندھی ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہندوستان واپس آئے تھے، پہلے ایک ناکام طالب علم اور وکیل کی حیثیت سے آگے آنے میں کامیاب نہ ہونے پر وہ ملازمت کے لیے جنوبی افریقہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے ہندو مزدوروں کے حقوق کے لیے

جدوجہد کی۔ نیگر و محنت کش ان کی محبت اور شفقت سے محروم رہے کیونکہ موھن داس کرم چند، بنیادی طور پر کٹر ہندو تھا۔ وہاں شہرت ملی تو انہوں نے واپس وطن آ کر وہی تجربات آزمانے کی سوچی، پہلے تو انہیں صرف کھانے کی دعوتیں ملیں لیکن گنگا دھر تلک کی موت کے ساتھ ہی کانگریس میں موجود انتہا پسند ہندو عناصر کی قیادت ان کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ ''باپو'' بن گئے۔

1920ء میں محمد علی جناحؒ نے انہیں اور کانگریس کی قیادت کو پرکھ لیا اور مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ علامہ محمد اقبالؒ اور دوسرے راہنماؤں کی کوششوں سے محمد علی جناحؒ نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی۔ کمزور تنظیم ہونے کے باوجود انہوں نے 1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار میدان میں اتارے۔ کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی اقتدار کا نشہ اور ہندو راج کا بھوت کانگریس کی قیادت کے ذہنوں پر مسلط ہو گیا۔

محمد علی جناحؒ نے مفاہمت اور انگریز حکومت کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی بات کی تو پنڈت جواہر لال نہرو اینڈ کمپنی نے گاندھی کے مشورے سے مسلم لیگ کو تحلیل کرنے اور صرف آل انڈیا کانگریس کو نمائندہ تنظیم تسلیم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ اس دوران کانگریسی صوبائی حکومتوں نے تمام تعلیمی اداروں میں کانگریس کا پرچم لہرانا، اسے سلامی دینا، گاندھی کی مورتی کی پوجا کرنا اور بندے ماترم گانا لازمی قرار دے دیا۔ چند صوبوں میں کانگریس نے اپنے مسلح گارڈز اور سرکاری عہدے دار بنا دیے جو انتظامیہ کو کنٹرول کرنے لگے۔

کانگریس کی پالیسی کے خلاف قائداعظم محمد علی جناحؒ کا پہلا زبردست ردعمل 1937ء میں سامنے آیا جب انہوں نے 18 اکتوبر کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

- ''کانگریس کی موجودہ قیادت، پچھلے دس سال سے خاص طور پر مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ غیر دوستانہ بنانے کی ذمہ دار ہے۔ وہ ایک ایسی پالیسی پر عمل کر رہی ہے جو صرف ہندوانہ ہے۔ جب سے انہوں (کانگریس والوں) نے چھ صوبوں میں حکومتیں

بنائی ہیں، اپنے قول و فعل اور پروگرام سے دکھا دیا ہے کہ مسلمانوں کو ان سے عدل اور رواداری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ہندی کو پورے ہندوستان کی قومی زبان قرار دینا چاہتے ہیں اور بندے ماترم کو قومی گیت اور وہ ایسا طاقت کے بل بوتے پر کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام مقامات پر کانگریس کا جھنڈا لہرانا اور اسے سلامی دینا ضروری ہے۔ انہوں نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ ہندوستان، ہندوؤں کے لیے ہے“۔

جب صورتِ حال تلخ پذیر ہوتی گئی تو قائداعظمؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے مابین دونوں سیاسی جماعتوں کے ذریعے مفاہمانہ فضا پیدا کرنے کے لیے بات چیت تجویز کی گئی۔ اس بات چیت کے لیے جو 1938ء میں ہوئی، قائداعظمؒ نے تین نکاتی ایجنڈا اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ تین نکاتی ایجنڈا درج ذیل تھا۔

اوّل: مسلمانوں کے ساتھ ”عوامی رابطہ“ مہم ختم کی جائے۔

دوم: بندے ماترم لازمی طور پر ختم کیا جائے۔

سوم: ترنگا پرچم لہرانا بند کر دیا جائے۔

25 اکتوبر 1937ء کو پٹنہ کے شہریوں کی طرف سے قائداعظمؒ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے خطاب میں کہا:

❑ ”کانگریس نے سات صوبوں میں اقتدار سنبھالا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انہوں نے بندے ماترم کو قومی ترانے کی حیثیت سے لگا کر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے اور ہندی بطور قومی زبان ان پر ٹھونسی جا رہی ہے“۔

”گیا“ میں مسلمانوں کی ایک استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یکم جنوری 1938ء کو قائداعظمؒ نے کہا:

❑ ”ہمارے درمیان کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔ ہمارا قدیمی فلسفۂ حیات، ہمارا دین، ہماری زبان الگ الگ ہیں۔ ہندو پانی اور مسلم پانی کی آوازیں ریلوے سٹیشنوں پر سنائی دیتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کا پانی نہیں پیتے۔ مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود بندے ماترم کو ایک قومی گیت بنا دیا گیا ہے۔ اگر گورنر کانگریس کو نہ روکیں تو وہ اس قسم کی اپنی کئی مرضیاں مسلط کر سکتی ہیں۔ کانگریس کی ہائی کمان اس

وقت بدمستی کے عالم میں ہے اور اپنے آپ کو وقت کا بادشاہ سمجھتی ہے''۔

6 جنوری 1938ء کو مومن انصار جماعت کی کولکتہ میں استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

- ''کانگریس کی اپنی الگ سیاسی ڈکشنری ہے جس میں نیشنل ازم کا مطلب ہے ہندوازم، سوراج کا مطلب ہندو راج اور آئین کی دھجیاں اُڑانے کا مطلب ہے آئین پر عمل درآمد۔ اسی طرح کانگریس کی ڈکشنری میں ''آزادی'' کا مطلب ہے، ہندوؤں کی آزادی اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں اور کمزور لوگوں کی غلامی''۔

دہلی میں صوبائی مسلم لیگ کی استقبالیہ تقریب میں 30 جنوری 1938ء کو قائداعظمؒ نے فرمایا:

- ''اب ہم ''صوبائی خودمختاری'' کی اصل کارکردگی دیکھ کر اس بات کے قائل ہوگئے ہیں کہ ہماری گردنیں، جو اس وقت کانگریس کی گرفت میں ہیں، محفوظ نہیں ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں اسلام دشمن گیت بندے ماترم گایا جا رہا ہے جو مشرکانہ بت پرستی کا شاہکار ہے اور مجموعی طور پر مسلمانوں کے خلاف جنگ کا نعرہ ہے''۔

3 فروری 1938ء کو سٹوڈنٹس یونین اینگلو عربیک کالج، دہلی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

- ''جب پہلے دن اسمبلیوں کے اجلاس میں شریک ہوئے تو کسی پارٹی سے مشورہ کیے بغیر انہوں نے بندے ماترم گانا شروع کر دیا کیونکہ وہ اقتدار کے نشے میں دھت ہیں۔ اگر ایسا بھی فرض کر لیا جائے کہ بندے ماترم ایک استثنائی گیت ہے، تب بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ گیت ہندو ثقافت اور ہندو فلسفہ کی پیداوار ہے۔ سوچیے کہ اگر مسلمان اور پارسی اپنے اپنے نعرے بلند کرتے ہوئے اسمبلیوں کے اندر داخل ہوتے تب کیا ہوتا؟ ''اللہ اکبر'' میں کچھ غلط نہیں ہے۔ اگر مرکزی اسمبلی کے 130 ارکان میری قیادت میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگاتے ہوئے ایوان میں داخل ہوتے تو کیا یہ توقع کرنا جائز ہوتی کہ باقی لوگ بھی یہی نعرے لگاتے؟

سوال یہ ہے کہ میں جارحانہ انداز میں اسمبلی میں کیوں جاؤں؟ آپ کو کسی

مسلمان سے ''بندے ماترم'' کی عزت کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تسلیم شدہ بت پرستی ہے۔ اگر آپ تاریخی پس منظر میں جائیں تو معلوم ہو گا کہ یہ گیت تو مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کو ہندو کلچر اپنانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا''۔

5 فروری 1938ء کو مسلم سٹوڈنٹس یونین علی گڑھ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:

❑ ''غربت اور بھوک کا مسئلہ حل کرنے کے بجائے ہندو، اسمبلیوں کے ایوانوں میں ہم پر بندے ماترم مسلط کرنا چاہتے ہیں اور ہم سے توقع کرتے ہیں کہ اسے سلام کریں۔ وہ مسلمانوں پر ہندی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کانگریس کا نیشنل ازم براہ راست ہندوازم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان ایک مستقل سیاسی اکثریت پر دوبارہ اعتماد کا اظہار کریں جس کا مذہب اور ثقافت، ہمارے مذہب اور ثقافت سے مختلف ہے''۔

17، 18 اپریل 1938ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی سیشن کولکتہ میں منعقد ہوا۔ قائداعظمؒ نے صدارت کی۔ انہوں نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''مذہب، ثقافت اور زبان سے متعلق کانگریس کی قراردادیں جن کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، محض کاغذی قراردادیں ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ کانگریس کی حکومتوں نے جو جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا، اس میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ انہوں نے اسمبلیوں میں بندے ماترم نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے بے انتہا تلخی پیدا ہوئی۔ تب انہوں نے اس فیصلے کو ختم کیا۔ وہ ہندی کو لازمی زبان قرار دینے کی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں جو اگر پوری طرح نہیں تو بہت حد تک اُردو کے پھیلاؤ اور ترقی کو تباہ کر دے گی۔ اس وقت سب سے بڑی بات یہ ہو رہی ہے کہ ہندی، اپنے ہندو سنسکرت ادب، فلسفے اور نظریات کے ساتھ مسلمان بچوں اور دوسرے طالب علموں پر ٹھونس دی جائے گی''۔

8 مئی 1938ء کو ماہم (ممبئی) میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

❑ ''کانگریس کی حالت ایسے غریب آدمی جیسی ہے جسے اچانک لاٹری میں بہت

بڑی رقم مل جائے۔ وہ طاقت کے نشے میں دھت ہے۔ کئی صوبوں میں اکثریت ملنے کے باعث کانگریس والے، مسلمانوں پر بندے ماترم گانے جیسی چیزیں ٹھونس رہے ہیں"۔

اپنی تقریر میں قائداعظمؒ نے کانگریس کے ان راہنماؤں کی نکتہ چینی کا حوالہ اور جواب بھی دیا جو انہیں "چسکا" لینے والا اور فرقہ واریت پھیلانے والا شخص قرار دے رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

❑ "اگر آج میں ان کی پارٹی (کانگریس) میں شامل ہو جاؤں تو وہ نہ صرف مجھے انڈین کانگریس کا صدر منتخب کر لیں گے بلکہ کوئی چون و چرا بھی نہیں کرے گا"۔

قائداعظمؒ نے میمن مرچنٹس ایسوسی ایشن ممبئی اور میمن چیمبر آف کانگریس کی تقریب سے 5 جون 1938ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ "کانگریس اپنے آپ کو قومی پارٹی بنانے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن میونسپل اور سرکاری سکولوں میں ہندی کو لازمی زبان قرار دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس پالیسی کے پیچھے ضرور کوئی مذموم عزائم ہیں تاکہ (مسلمان) معصوم بچوں اور بچیوں کو ہندو ثقافت سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اسی لیے بندے ماترم گانا لازمی قرار دیا جا رہا ہے"۔

8 اکتوبر کو سندھ مسلم لیگ کانفرنس میں اپنے صدارتی خطاب میں قائداعظمؒ نے مزید کھل کر بات کی۔ انہوں نے فرمایا:

❑ "انہوں (کانگریس والوں) نے اسمبلیوں کا آغاز بندے ماترم سے شروع کر دیا جو نہ صرف مشرکانہ اور بت پرستی سے لبریز ہے بلکہ اپنی حقیقت اور الفاظ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے والا گیت ہے۔ انہوں نے کوشش کی اور ابھی تک کر رہے ہیں کہ تقریبات میں اور سکول حکام کو بندے ماترم گانے پر مجبور کیا جائے۔ حالانکہ تسلیم شدہ بات ہے کہ بندے ماترم کوئی قومی گیت نہیں ہے۔ انہوں نے اس فرق کو ملحوظ کیے بغیر کہ ترنگا قومی پرچم نہیں ہے، جارحانہ انداز میں سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر لہرا دیا۔ وہ صوبوں کے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے پر مجبور کر رہے ہیں اور اس محکمے کو "واردھا سکیم" کے تحت چلانا چاہتے ہیں جس کا نام ودیا مندر ہے۔ ہندوستانی کے نام سے ہندی کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور اسے سنسکرت کا جامہ پہنایا

جا رہا ہے۔ اُردو کو ختم کرنے کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جا رہی جو ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کی زبان ہے۔ یوں اُن (مسلمانوں) کی ثقافت اور یکجہتی کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتے ہیں''۔

اگلے روز 12 اکتوبر 1938ء کو مسلم لیگ کانفرنس کراچی کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا:

❑ ''کانگریس، سات صوبوں میں (حکومت بنا کے) مسلمانوں پر بالادستی حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہندوراج، ثقافت اور فلسفہ مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ میں جب تک زندہ ہوں، کانگریس کو ایسا کرنے نہیں دوں گا''۔

26 دسمبر 1938ء کو پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ قائداعظمؒ نے اجلاس کی صدارت کی۔ انہوں نے اپنے فی البدیہہ خطاب میں فرمایا:

❑ ''ایک بات کسی شک وشبہ کے بغیر واضح ہوئی ہے کہ کانگریس چاہتی ہے کہ مسلمان اس کے زیر سایہ آ جائیں، اس کی قیادت کے تلوے چاٹیں، اس کے اشاروں پر چلیں، جب مطلب پورا ہو جائے تو انہیں مسل دیا جائے۔ کانگریسی راہنما چاہتے ہیں کہ وہ (مسلمان) غیر مشروط طور پر ہندوراج کے سامنے سر جھکا دیں۔ اب ان کا کھیل پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی بلکہ المیہ ہے کہ کانگریس کی ہائی کمان نے اس ملک میں دوسرے مذاہب اور ثقافتوں کو ختم کرنے اور ہندوراج قائم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ وہ ''سوراج'' کی بات کرتے ہیں لیکن ان کا مطلب ہوتا ہے صرف ہندوراج، وہ قومی حکومت کی بات کرتے ہیں لیکن مطلب صرف ہندوراج ہوتا ہے لیکن اب غبارے کی ہوا وقت سے بہت پہلے نکل گئی ہے۔ چھ یا سات صوبوں میں اکثریت کے باعث وہ اقتدار کی طاقت سے بدمست ہو گئے ہیں۔

کانگریس کا کھیل وقت سے پہلے سامنے آ گیا ہے۔ اگر واقعی کانگریس کو اقتدار مل جائے تو وہ کیا کرے گی؟ اس نے اپنے نیشنل ازم کی شروعات بندے ماترم سے کیں۔ بندے ماترم قومی گیت نہیں ہے، اس کے باوجود اسے گایا جا رہا ہے اور دوسروں پر ٹھونسا جا رہا ہے۔ یہ نہ صرف ان کے اجتماعات میں گایا جاتا ہے بلکہ گورنمنٹ

اور میونسپل سکولوں میں مسلمان بچوں کو بھی گانے پر مجبور کیا جا رہا ہے تا کہ وہ اسے اپنے قومی گیت کے طور پر تسلیم کریں، چاہے ان کے مذہبی عقائد انہیں ایسا کرنے کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ یہ گیت بت پرستی پر مبنی اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے والا گیت ہے۔ کانگریس کا جھنڈا ہندوستان کا قومی جھنڈا نہیں، پھر بھی ان کا اصرار ہے کہ ہر سرکاری اور نجی عمارت پر اسے لہرایا جائے''۔

4 جولائی **1939**ء کو ممبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے واردھا سکیم کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی۔ اس موقع پر قائداعظمؒ نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا:

❑ ''ورکنگ کمیٹی نے واردھا سکیم کو نامنظور کر دیا ہے۔ اسے اس اسکیم کے اصل نظریہ اور طبقاتی پہلو کے علاوہ مزید بنیادی اعتراضات ہیں۔ یہ سکیم مسلمانوں کی ثقافت کو بتدریج تباہ کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس کی کتابیں قطعی طور پر قابل قبول نہیں ہیں۔ اس کا مقصد ہندو کلچر کی بالادستی ہے اور یہ مسلمان کلچر اور زبان کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ یہ کانگریس کی آئیڈیالوجی مسلط کرتی ہے۔ اس کا مقصد، صرف ایک جماعت، کانگریس کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کو بچوں کے ذہن میں ڈالنا ہے۔ ''ہندوستانی'' نام کی آڑ میں سنسکرت زدہ ہندی پھیلانے اور اُردو کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے''۔

12 اگست **1939**ء کو اسلامیہ کالج سٹوڈنٹس یونین، اندھیری (ممبئی) کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

❑ ''مسلمان اور ہندو، عقیدے، تعلیم، کلچر اور فلسفے کے اعتبار سے دو مختلف نسلیں یا قومیں ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ جو بھی زیادہ طاقتور ہوگا، دوسرے کے کلچر کو متاثر اور ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں کانگریس والوں سے کہتا ہوں، ہم پر اعتماد اور ہمارے وقار کا احترام کرو، ہمیں تمہارا تحفظ نہیں چاہیے، ہم اپنی حفاظت خود کر لیں گے۔ تمہارے خلاف ہمارے کوئی عزائم نہیں ہیں۔ ہم صرف اس ملک میں قومی حکومت میں صحیح حصہ چاہتے ہیں''۔

یکم اکتوبر **1939**ء کو قائداعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے ایک بیان کے جواب

میں ایک بیان جاری کیا جس میں مسٹر گاندھی نے برطانیہ کے ایک دوست کی حیثیت سے برطانوی سیاستدانوں سے اپیل کی تھی۔ قائداعظمؒ نے کہا:

❑ ''میں انتہائی افسوس سے کہتا ہوں کہ مسٹر گاندھی نے جو کانگریس کے مطلق ترجمان اور آمر ہیں، ایسی زبان استعمال کی ہے جس سے ایک بار پھر ایسا تاثر پیدا ہوا ہے کہ کانگریس ابھی تک حقائق کا سامنا کرنے سے کترانے اور خود کو ہندوستان کی واحد نمائندہ سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ دوسرے، یہ ہندوستان میں جمہوریت کی بات کر رہی ہے اور برطانوی جمہوری نو آبادیانی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے جبکہ گزشتہ اڑھائی سال میں اس نے خود کو نہ صرف فسطائی اور آمرانہ تنظیم قرار دیا بلکہ اس اصول کو اپنا بھی رکھا ہے۔ تیسرے، یہ پورے ہندوستان میں ہندومت کے احیا اور برصغیر میں ہندو ازم کی بالادستی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ جب تک کانگریس ہائی کمان کی ان بیماریوں کا علاج نہیں ہوتا، ان سے ہندوستان کی ترقی کے لیے کچھ نہیں ہوگا جس کے ہم سب تہہ دل سے متمنی ہیں''۔

25 اکتوبر 1939ء کو نئی دہلی میں مانچسٹر گارڈین کو انٹرویو دیتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

❑ ''جب تک کانگریس والے، عرش سے فرش پر نہیں آ جاتے اور حقائق کا سامنا نہیں کرتے، وہ ہندوستان کی ترقی روکنے کے پورے ذمہ دار ہوں گے۔ خاص طور پر کانگریس ہائی کمان نے ایسی پالیسیاں چلائی ہیں جن سے صاف نظر آتا ہے کہ کانگریس کا اصل مقصد دوسری تمام تنظیموں کو نیچا دکھانا اور خود کو فسطائیت کی بدترین صورت میں مسلط کرنا ہے۔ میری رائے میں کانگریس کے مطابق جمہوریت کا مطلب پورے ہندوستان پر ہندوراج ہوگا اور یہ صورت حال مسلمان کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ ان کے علاوہ چھ کروڑ اچھوت اور دوسری اقلیتیں عیسائی، یہودی، پارسی اور برطانوی پیدائش رکھنے والے لوگ ہیں''۔

مسٹر گاندھی کے جریدے ''ہریجن'' میں ان کا ایک مضمون ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ انہوں نے یہ لکھا کہ کانگریس نے ہندو کو ہندو کی صورت میں پیش کیا۔ اس کا

جواب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 4 نومبر 1939ء کو دیا۔ قائداعظمؒ نے ان نکات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

❑ ''مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی، تب وہ حقیقت میں کن لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے؟ مسٹر گاندھی نے مزید کہا ہے کہ کانگریس نے ہندو کو ہندو کی صورت میں پیش کیا۔ یہ دعویٰ تو ہندو مہا سبھا کرتی ہے۔ میں نے کئی بار کھلے الفاظ میں کہا ہے اور ثابت ہو گیا ہے کہ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے۔ یہ ایک ہی سکے کا دوسرا رخ ہے جس کا پہلا رخ ہندو مہا سبھا ہے۔ ان میں سے ایک جو کہتا ہے، دوسرا اس پر عمل کرتا ہے''۔

7 نومبر 1939ء کو ممبئی میں ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا:

❑ ''میرے ذہن میں ہندوؤں کے خلاف کوئی بات نہیں ہے لیکن جب تک کانگریس ہائی کمان فسطائی حکمرانوں کی طرح رہے گی، سمجھوتہ ہونے کی معمولی سی امید بھی ہو سکتی ہے؟ کیا یہ جمہوریت ہوگی کہ ایک وسیع فسطائی حکمران کونسل، واردھا میں بیٹھ کر صوبائی وزیروں کو احکامات جاری کرے جو قانون سازی کے ذمہ دار ہیں۔ اس فسطائی کونسل کا مکمل اور حرف آخر آمر اس جمہوری تنظیم کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہے''۔
(آمر سے مراد مسٹر گاندھی اور جمہوری تنظیم کانگریس ہے)

دستور ساز اسمبلی کے بارے میں مسٹر گاندھی کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا:

❑ ''مسٹر گاندھی نے ایک امریکی اخبار نویس کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ صرف ایک پارٹی سب کچھ کر سکتی ہے اور وہ پارٹی کانگریس ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ وہاں مسلم لیگ بھی ہے تو مسٹر گاندھی نے کہا کہ میں کانگریس کے سوا کسی پارٹی کو تسلیم نہیں کروں گا۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ اگر ہندوستان میں صرف ایک پارٹی کی حکومت ہوئی تو وہ جمہوری نہیں فسطائی ہوگی۔ تب مسٹر گاندھی نے جواب دیا کہ مجھے اس سے

غرض نہیں، آپ اسے کوئی بھی نام دے دیں، ہندوستان میں صرف ایک پارٹی ہو سکتی ہے اور وہ کانگریس ہے''۔

قائداعظم نے کہا:

- ''میری خواہش ہے کہ مسٹر گاندھی آئے دن اپنی رائے بدلنے کی عادت ترک کر دیں اور اپنی توجہ صرف ایک سوال پر مرتکز کریں جو ہندو اور مسلمانوں سے متعلق ہے۔ وہ ہندوؤں کے نمائندے بن کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں مسلمانوں کی طرف سے ایک باعزت حل تلاش کرنے میں مدد کی مکمل یقین دہانی کراتا ہوں''۔

قائداعظمؒ کی اس خواہش اور یقین دہانی کو مذاکرات کے نئے سلسلے شروع کر کے ناکام بنانے کے نت نئے حربے استعمال کیے گئے۔ مسٹر گاندھی اپنی ڈرامائی تکنیک کو استعمال کرتے رہے جس میں وہ کبھی کانگریس کے ترجمان بن جاتے اور کبھی کہتے کہ میں تو چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ بہرحال بندے ماترم کو اپنی انا، ضد، دھرم کرم یا لائحہ عمل کی بنیاد مان کر کانگریس، مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانے کے لیے متحدہ ہندوستان کارڈ استعمال کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اسی وجہ سے قائداعظم محمد علی جناحؒ اور برصغیر کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں بہرحال اپنے لیے الگ وطن حاصل کرنا ہوگا۔ انگریزی رسالے ''ٹائم اینڈ ٹائیڈ'' کے شمارہ جنوری 1940ء میں قائداعظم نے کہا:

- ''برطانیہ والوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوازم اور اسلام دو مختلف، ایک دوسرے سے الگ تہذیبوں کے مظہر ہیں''۔

''ایک انگریز دانشور نے قائداعظمؒ سے سوال کیا تھا: ''جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں تو کیا مذہب کے معنوں میں سوچ رہے ہوتے ہیں؟'' اس پر بابائے قوم نے فرمایا تھا:

- ''آپ یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کریں کہ اسلام صرف عبادات کا نام نہیں۔ یہ تو ایک ایسا دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو زندگی کا ایک حقیقت پسندانہ اور عملی نظام حیات دیتا ہے۔ میں زندگی کے معنوں میں سوچ رہا ہوں، میں زندگی کی ہر اہم چیز کے

معنوں میں سوچ رہا ہوں، میں اپنی تاریخ، اپنے ہیروز، اپنے آرٹ، اپنے فن تعمیر، اپنی موسیقی، اپنے قوانین، اپنے نظام عدل وانصاف کے معنوں میں سوچ رہا ہوں۔ ان تمام شعبوں میں ہمارا نقطۂ نظر نہ صرف ہندوؤں سے انقلابی طور پر مختلف ہے، بلکہ بسا اوقات متصادم بھی ہے۔ ہماری اور ہندوؤں کی زندگیوں میں ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمیں بنیادی طور پر ہم رشتہ کر سکے۔ ہمارے نام، ہمارا لباس، ہماری خوراک ایک دوسرے سے مختلف ہے، ہماری اقتصادی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، جانوروں کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر، ہم زندگی کے ہر مقام پر ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے کا ابدی مسئلہ لے لیں۔ ہم گائے کو کھاتے ہیں اور وہ اس کی عبادت کرتے ہیں“۔

(انگریز دانشور ہیورلی نکلسن کی کتاب Verdict on India مطبوعہ 1944ء)

عمر حیات قائم خانی

قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سیکولر حضرات کی تمام تر تگ و دو اور بحث و مباحثے کا محور و مرکز صرف ایک ذات ہے اور وہ ہے جناح۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کچھ فرمان ہو، کتاب و سنت میں کچھ لکھا ہو، انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی بس ایک ہی رَٹ ہے، جناح سیکولر تھے اور سیکولر پاکستان ہی ان کی منزل تھی۔ لہٰذا پاکستان میں سیکولر نظام حکومت ہی قائم ہونی چاہیے۔ دلچسپ بات مگر یہ ہے کہ جناح کی درجنوں تقاریر میں سے کوئی ایک تقریر بھی ایسی نہیں جس میں انھوں نے یہ فرمایا ہو کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگی۔ اب ان کے لیے اَڑچن یہ ہے کہ جناح اور ان کے تصور پاکستان کو سیکولر کیسے ثابت کیا جائے؟ اس مقصد کے لیے ان حضرات نے ہمارے ملک کی اشرافیہ، بیوروکریٹس، سیاست دان، جرنیل، حکمرانوں اور سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے جو طریقہ واردات استعمال کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

پہلی دلیل: جناح نے اپنی تقاریر، بیانات اور انٹرویوز میں واضح کہا تھا کہ پاکستان میں ہر شخص اپنے دھرم اور مذہب کے مطابق زندگی گزار سکے گا۔ رنگ، نسل اور مذہب سے بالاتر ہو کر تمام شہریوں کو زندگی کے بنیادی حقوق مساویانہ درجے میں ملیں گے۔ ہندو اپنے مندر میں جانے کے لیے آزاد ہوگا اور عیسائی اپنے گرجا گھر میں جانے کے لیے آزاد ہوگا۔ اقلیتوں کی جان و مال کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہوگی اور مذہب کی بنیاد پر نشانہ بنا کر کسی بھی فرد پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ ملک میں وفاقی نظام ہوگا اور تمام ادارے ایک آئین کے تابع ہوں گے۔ ہمارا ملک ایک انسان دوست معاشرہ ہوگا...... پس ثابت ہوا کہ جناح کا پاکستان سیکولر ہی تھا۔

دوسری دلیل: ان عذر خواہوں کی یہ ہے کہ جناح سگار پیتے تھے۔ وہ تھری پیس سوٹ پہنتے تھے۔ وہ انگریزی بولتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر مانے جاتے تھے۔ وہ انگریزی گاڑی میں سفر کرتے تھے۔ وہ روشن خیال تھے...... یوں ان کا اپنا لائف اسٹائل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سیکولر تھے۔

یہ ہیں وہ بودے دلائل جو آپ کو جا بجا ان کی تحریر و تقاریر میں نظر آئیں گے۔ حیرانی اس بات پر نہیں کہ ان غریب دلیلوں سے یہ سیکولر ازم کا اثبات کیسے کر لیتے ہیں، حیرانی اس بات پر ہے کہ لوگ کس طرح ان کے دام فریب میں آ جاتے ہیں! ذرا سوچیے کہ سگار پینے سے، تھری پیس سوٹ پہننے سے، انگریزی بولنے سے اور ترقی پسند انسان ہونے سے کیا انسان سیکولر بن جاتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اقبال بھی ترقی پسند انسان تھے، وہ بھی ٹائی سوٹ زیب تن کر لیا کرتے تھے، سگار نہیں تو حقے سے کم پر تو وہ بھی راضی نہیں ہوتے تھے اور خیر سے ڈاڑھی تو ان کی بھی نہ تھی......لو جی، بھینس گئی پانی میں! کیا خیال ہے اب آپ کا! کیا پیر و مرشد، مفکر اسلام، مصور پاکستان، ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ بھی سیکولر تھے؟

سچی بات یہ ہے کہ قائداعظم کو سیکولر باور کرانے کی منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے لیکن اگر سیکولر حضرات خود ہی انہیں سیکولر سمجھتے رہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر یاد رہے کہ بقول شاعر

؎ اگر اپنا کہا تم ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے

اب ذرا اقلیتوں کے تحفظات کے متعلق بات کر لیتے ہیں۔ یہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ انسان دوست معاشرہ کیا ہوتا ہے اور قانونی مساوات کسے کہتے ہیں؟ نیز اس واقعہ سے آپ کو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو گا کہ اقلیتوں کی جان و مال اسلامی ریاست میں زیادہ محفوظ ہیں یا سیکولر معاشرے میں؟ اس کے ساتھ ہی آپ پر ان لوگوں کے عزائم بھی آشکار ہو جائیں گے جو جناح کے نام پر، اقلیتوں کی آڑ میں، اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلیفہ چہارم، شیر خدا، سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کی زرہ گم ہوگئی۔ آپ نے وہ زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھی۔ آپ خلیفہ وقت تھے، چاہتے تو بزورِ قوت اپنی زرہ اس یہودی سے لے سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس یہودی کے ہمراہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے۔ قاضی نے جب امیر المومنین کو دیکھا تو فوراً اپنی مجلس سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹھے رہیں۔ قاضی شریح بیٹھ گئے۔

حضرت علیؓ نے قاضی کے سامنے اپنا مقدمہ رکھتے ہوئے فرمایا:

''میری زرہ کھوگئی تھی۔ میں نے اسے اس یہودی کے پاس دیکھا ہے''۔

قاضی شریح نے یہودی سے پوچھا: تمہیں کچھ کہنا ہے؟

یہودی نے کہا: میری زرہ میرے قبضے میں ہے اور میری ملکیت ہے''۔

قاضی نے جب زرہ دیکھی تو پکار اُٹھے:

''اللہ کی قسم اے امیر المومنین! آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے، یہ آپ ہی کی زرہ ہے لیکن قانون کے مطابق آپ کے لیے گواہ پیش کرنا واجب ہے''۔

حضرت علیؓ نے بطورِ گواہ اپنے غلام کو پیش کیا جس نے آپ کے حق میں گواہی دی۔ پھر آپ نے اپنے لختِ جگر، حضرات حسنؓ و حسینؓ کو عدالت میں پیش کیا اور انھوں نے بھی آپ ہی کے حق میں گواہی دی مگر قاضی نے یہ کہہ کر ان کی گواہی مسترد کر دی کہ:

''یہ دونوں آپ کے صاحبزادے ہیں۔ باپ کے حق میں بیٹوں کی گواہی قبول نہیں''۔

چونکہ دوسرا کوئی گواہ موجود نہ تھا، اس لیے فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا جسے حضرت علیؓ نے بلا پس و پیش قبول کرلیا۔ یہودی نے جب اس قانونی مساوات کو دیکھا تو ششدر رہ گیا کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے مجھے عدالت میں پیش کیا اور جب فیصلہ ان کے خلاف صادر ہوا تو اس پر سرِ تسلیم خم بھی کر دیا!!

اس واقعہ کا یہودی پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ فوراً حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''آپ کا دعویٰ برحق ہے۔ یہ زرہ آپ ہی کی ملکیت ہے، فلاں دن یہ آپ سے گر گئی تھی تو میں نے اسے اُٹھا لیا تھا۔ لہٰذا آپ اسے لے لیں۔ پھر کلمہ شہادت پڑھ لیا:

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا

ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں''۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: ''میری یہ زرہ بھی اور یہ گھوڑا بھی تمہارا ہے''۔

(سنہرے فیصلے از عبدالمالک مجاہد)

دم بھر کے لیے یہاں ٹھہریئے اور سوچیے کہ خلافت راشدہ کے قاضی نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک جانب حضرت علیؓ ہیں جو خلیفہ وقت بھی ہیں اور دامادِ رسول ﷺ بھی ہیں جبکہ دوسری جانب ایک یہودی کھڑا ہے۔ اس نے اسلامی تعلیمات کے مطابق قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فیصلہ یہودی کے حق میں صادر کیا جسے مسلمانوں کے امیر نے بخوشی تسلیم کرلیا۔ کیا اقلیتوں کی جان و مال کے تحفظ، بنیادی انسانی حقوق کی گارنٹی، انسان دوست معاشرے اور مذہب وعقیدے سے بالاتر ہوکر تمام شہریوں کے لیے قانونی مساوات کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال ہوسکتی ہے......؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا قائداعظم نے اگر یہ فرمایا کہ پاکستان میں اقلیتوں کی عبادت گاہوں اور ان کی جان و مال کو تحفظ دیا جائے گا اور ریاست کے شہری ہونے کے ناتے انھیں تمام بنیادی انسانی حقوق مساویانہ درجے میں ملیں گے، تو اس سے کون سا سیکولرازم ثابت ہوگیا۔ اس سے تو اُلٹا یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اوّل روز ہی مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی شریعت کے سنہرے اصولوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

خیال رہے کہ یہاں اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے ناتے قانونی مساوات، معاشرتی انصاف، مذہبی آزادی اور بنیادی انسانی حقوق میں یکسانیت کی بات ہو رہی ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مسلم و غیر مسلم کے مابین امتیازی فرق مٹا کر ہر پہلو سے انھیں یکساں قرار دیا جا رہا ہے۔ اللہ کریم اپنے فرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے: (ان دونوں گروہوں (کفار اور مسلمانوں) کی مثال ایسی ہے جسے ایک آدمی اندھا، بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا ہو۔ کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟) (ہود:24) پھر ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: (اہل جہنم اور اہل جنت کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔ جنت والے ہی اصل میں کامیاب ہیں) (الحشر:20) اب اگر کوئی ''روشن خیال'' یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مسلم و

غیر مسلم ہر پہلو سے برابر ہیں اور ان میں کوئی تفاوت نہیں، اس لیے ریاست کے ہر شعبے میں انھیں مسلمانوں کے مساوی درجہ ملنا چاہیے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ پھر آپ اس مساوات کے ثبوت میں قبرستان میں دفن ہونے کے بجائے مسان میں اپنی ارتھی جلانے کی وصیت کیجیے اور مولوی سے نکاح پڑھوانے کے بجائے کسی پنڈت کے سامنے آگ کے گرد پھیرے لگوائیے۔ نیز اپنی بہن اور بیٹی کا بیاہ ایک نچلی ذات کے ہندو...... بھیل، چمار سے کیجیے اور ''مساوات'' کی اس اعلیٰ مثال پر ہم سے داد مفت میں پائیے...... **صم بکم عمی فھم لا یرجعون......**

پس وہ تمام لوگ جو وطن عزیز میں سیکولر ازم کے نفاذ کے خواہاں ہیں، بخوبی جانتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لیں، محض سیاسی، حکومتی اور بین الاقوامی امور میں اسلامی تعلیمات کے ناکافی ہونے کا دعویٰ کر کے سیکولر ازم کے نفاذ کی بات ہرگز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کے تصور پاکستان کو سیکولر ریاست کا رنگ دے کر عوام الناس کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح اس مخصوص طبقہ نے دانستہ طور پر کچھ ایسی بحثیں شروع کر رکھی ہیں جیسا کہ آپ کو کس کا پاکستان چاہیے۔ جناح کا سیکولر پاکستان یا ملاؤں کا مذہبی پاکستان؟ اس طرح یہ لوگ علمائے کرام کی تحقیر کرتے ہوئے اسلامی نظام شریعت پر چوٹ کرتے ہوئے سیکولر ازم کی راہ ہموار کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

جان رکھیے کہ یہ لوگ اس ملک سے وفادار ہیں اور نہ قائداعظم کی ذات سے انھیں کوئی دلچسپی ہے۔ دراصل انھیں پاکستان کے ساتھ ''اسلام'' کا نام برداشت نہیں۔ یہ لوگ اسلامی طرزِ حیات کو مغربی طرز معاشرت سے بدلنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ جو لادینیت، بے راہ روی، فحاشی، عریانی، شراب نوشی اور ہم جنس پرستی مغرب کے گلی کوچوں میں عام ہے، وہی گندگی اور غلاظت پر مبنی نظام پاکستان میں عملاً نافذ ہو جائے۔ ورنہ وہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس کے نظریے کی بنیاد کلمہ توحید لا الہ الا اللہ پر استوار ہے اور قائداعظم بذاتِ خود

اس ملک کو ایک اعلیٰ درجے کی اسلامی ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔............

اب جب زمینی حقائق اور احوال نامہ یہ ہے تو ہمارے اربابِ اقتدار کو چاہیے کہ وہ پوری قوم کے ساتھ رجوع الی اللہ کرتے ہوئے بلا تاخیر پورے ملک میں شریعت نافذ کر دیں۔ مگر دنیا پرست نا اہل حکمران، سیکولر طبقہ اور ہمارے ہاں کے روشن خیال بونے (Intellectual dwarfs) چونکہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ نیز ان کا دعویٰ ہے کہ جناح سیکولر تھے اور سیکولر پاکستان ہی ان کی منزل تھی۔ اس لیے ہمیں اب ذرا تفصیل سے دیکھنا پڑے گا کہ کیا قائد اعظم واقعتاً سیکولر تھے یا ان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ پاکستان کی بنیادیں حقیقی معنوں میں اسلامی خطوط پر استوار ہو جائیں۔

جناح سیکولر تھے اور سیکولر پاکستان ہی ان کا خواب تھا......سیکولر حضرات کا دعویٰ!

چلیں ہم اس بحث میں نہیں پڑتے اور مان لیتے ہیں کہ آپ اپنے دعوے پر برحق ہیں۔ اب پہلا سوال جو ہمارے سامنے ہے، یہی ہے کہ اگر سیکولر جناح سے پوچھا جاتا کہ پاکستان کا آئین کیا ہوگا؟ تو آپ بتائیے کہ ان کا جواب کیا ہونا چاہیے تھا، یہی نا کہ ایک ایسا آئین جو مذہب سے ماورا ہوگا۔ کیونکہ سیکولر ریاست کے قوانین مذہبی بنیادوں پر نہیں بنتے بلکہ مذہبی احکامات تو وہاں کی ریاستی پالیسی میں زیرِ بحث ہی نہیں آتے۔ مگر جناح سے جب مستقبل کے لائحہ عمل کے متعلق پوچھا گیا کہ پاکستان کا قانون کیا ہوگا؟ تو انھوں نے تو کچھ اور ہی فرمایا تھا، کیا فرمایا تھا، ذرا دل تھام کر آپ بھی پڑھ لیجیے۔ 26 نومبر 1945ء کو پشاور میں انھوں نے فرمایا:

- ''آپ نے سپاس نامے میں مجھ سے یہ پوچھا کہ پاکستان کا قانون (آئین) کیا ہوگا۔ یہ ایک بے معنی سوال ہے۔ مسلمان ایک خدا، ایک نبی ﷺ اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے فقط یہی قانون ہے۔ اسلام ہی پاکستان کا بنیادی قانون ہوگا اور اسلام کے خلاف کوئی قانون پاکستان میں نافذ نہیں کیا جائے گا''۔

(Dr. Safdar Mahmood, Jinnah's Vision of Pakistan, Pakistan

Journal of History & Culture, Vol. XXIII/I, 2002 P. 54)

قائداعظم کا یہ بیان ان کے سیکولر نہ ہونے کا اثبات کر رہا ہے۔ ان کے قلب میں موجود اسلام کی عظمت کو اجاگر کر رہا ہے۔ سیکولر پاکستان کا پروپیگنڈا کرنے والوں کے چہروں پر خاک مل رہا ہے۔ مسلمانوں کی پاکستان سے نسبت بیان کر رہا ہے؛ یہ ملک مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان ایک خدا، ایک رسول ﷺ اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلام ہی پاکستان کا بنیادی قانون ہوگا۔ اسلام کے خلاف کوئی قانون پاکستان میں نافذ نہیں کیا جائے گا۔

قائداعظم کے اس بیان پر غور کیجیے اور سیکولر حضرات کی ڈھٹائی دیکھیے کہ کس دھڑلے سے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں ''سیکولر پاکستان جناح کا خواب تھا!''

شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہاں سمجھنے کی بات یہ بھی ہے کہ قائداعظم نے آخر اسلام ہی کو پاکستانی آئین کی بنیاد کیوں قرار دیا؟ اس کی دو وجوہات ہیں: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کی جدوجہد ہی اسلام کے نام پر مسلمانوں کے مفاد کی خاطر ایک الگ مملکت حاصل کرنے کے لیے کی جارہی تھی۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک کامل دین اور ابدی ضابطہ حیات ہے۔ یہ دین انسانیت ہے جس کی تمام تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اس نے حقوق انسانی کے لیے ایک ایسا منشور پیش کیا ہے جو پوری انسانیت کے لیے سب سے عمدہ، سب سے بہترین، سب سے منفرد اور سب سے بے مثال ہے۔ اس میں باپ، بیٹا، شوہر، بیوی، ہمسایہ، شہری، طبیب، معلم، تاجر، جج، حاکم، جرنیل اور فاتح کے لیے کامل راہبری موجود ہے۔ یہ ایک ایسے صالح معاشرہ کا خاکہ پیش کرتا ہے جو ظلم و جبر سے پاک اور اخوت و محبت اور حریت و مساوات کی اساس پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس میں وسائل مملکت، ریاستی امور، قومی و ملکی اثاثوں کے لیے ایسے آفاقی اصول موجود ہیں جن کی نظیر کسی مذہب میں موجود نہیں۔ سو اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت ایک جامع، ہمہ گیر اور مثالی دستورِ حیات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے انتہائی پرعزم

انداز میں اسلام ہی کو پاکستانی آئین کی بنیاد قرار دیا تھا۔

قائد کی اس وضاحت کے بعد اب اس میں کیا تردد رہ جاتا ہے کہ وہ سیکولر تھے اور نہ سیکولر پاکستان ہی ان کا خواب تھا۔

پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا اور اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟

یہ وہ بنیادی سوال ہے جو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے اذہان میں گردش کر رہا تھا اور وہ اس کی وضاحت چاہتے تھے۔ سو ہمیں بھی دیکھنا پڑے گا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی امنگیں، آرزوئیں اور تمنائیں کیا تھیں اور کس جذبے کے تحت وہ حصولِ پاکستان کے لیے اپنا تن من دھن وارنے پر تیار ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ بانیانِ پاکستان نے ان سے کیا وعدے کیے تھے اور کن بنیادوں پر انھیں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ اس تناظر میں ہمیں جناح کے تصورِ پاکستان کو، جو انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے اجاگر کیا تھا، سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

خیال رہے کہ مطالبہ پاکستان اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ سیاسی ڈھانچے کی وضاحت میں نواب بہادر یار جنگ نے، جو بانیانِ پاکستان کی فہرست میں ایک معتبر نام اور قائداعظم کے ایک اہم ساتھی تھے، کراچی میں منعقدہ مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دسمبر 1943ء میں فرمایا:

- ''اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآنی نظام حکومت قائم ہو۔ یہ ایک انقلاب ہوگا، یہ ایک نشاۃ ثانیہ ہوگی، یہ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصوراتِ اسلام ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیات اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی۔ پلاننگ کمیٹی آپ کے لیے جو دستوری اور سیاسی نظام مرتب کرے گی، اس کی بنیادیں اگر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ پر نہیں ہیں تو وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں''۔

نواب بہادر یار جنگ فرماتے ہیں: ''جب میں دوران تقریر اس مقام پر پہنچا

(کہ پاکستان کا دستور، الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی) تو قائداعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے مکا مار کر فرمایا: ''تم بالکل درست کہتے ہو''۔ اور میں نے فوراً اعلان کر دیا کہ قائداعظم سے میرے قول پر سند تصدیق مل گئی''۔

(بہادر یار جنگ: مشاہیر کی نظر میں (بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی 1976ء صفحہ نمبر 192)

تصور کیجیے کہ کراچی میں مسلم لیگ کا جلسہ عام ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا جم غفیر موجود ہے۔ اس جلسے میں قائداعظم بذاتِ خود موجود ہیں اور ان کے سامنے یہ منظر کشی کی جا رہی ہے کہ پاکستان کے نام پر ہم جس آزاد ملک کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ ایک ایسی مملکت ہوگی جہاں اسلام و شریعت کی حاکمیت قائم ہوگی۔ اس ریاست کے دستور کی بنیادیں قرآن مجید کے احکامات پر مبنی ہوں گی۔ عین اس طرح یہ ایک انقلاب ہوگا جہاں اسلام کو تمکین میسر ہوگی۔ گویا مسلمانانِ ہند کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ پاکستان کا سیاسی نظام، طرزِ حکومت اور داخلی و خارجی سطح کے تمام معاملات شریعت کے تابع ہوں گے اور اگر ایسا نہ ہوا یعنی ریاستِ پاکستان کا سیاسی نظام قرآن کے سپرد نہ ہوا، ''تو وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں''!

اب اسی تصور پاکستان کے ساتھ بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح بذاتِ خود پورے ہندوستان کا دورہ کرتے ہیں اور رضائے رب، نفاذِ شریعت اور بقائے اسلام کی خاطر قیام پاکستان کا نعرہ لگاتے ہیں۔ موقع بہ موقع مسلمانانِ ہند کو یہ باور کراتے ہیں کہ پاکستان ہم سب کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اس طرح تحفظِ اسلام کے نام پر برصغیر کے مسلمانوں سے ووٹ مانگے جاتے ہیں اور کفر سے لڑنے کے لیے انھیں تیار کیا جاتا ہے۔ پھر کھلے لفظوں ان پر یہ واضح کیا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کا مقصد آپ کو پرچم اسلام تلے منظّم کرنا ہے۔ چنانچہ 46-1945ء کے انتخابات میں 24 نومبر 1945ء کو پشاور میں جلسہ عام کرتے ہوئے قائداعظم فرماتے ہیں:

- ''مسلمان ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں، ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور ایک نبی (ﷺ) کے پیروکار ہیں۔ مسلم لیگ انھیں ایک پلیٹ فارم اور سبز اسلامی پرچم

تلے منظّم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔

یہاں ہمارا کوئی دوست نہیں۔ برطانوی ہمارے دوست ہیں نہ ہندو۔ ہم اچھے طریقے سے جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان دونوں کے خلاف لڑنا ہے۔ اگر یہ دونوں ہمارے خلاف متحد جائیں تب بھی ہم ان سے ڈریں گے نہیں۔ ہم ان کی مشترکہ قوت سے ٹکرائیں گے اور ان شاء اللہ فاتح بالآخر ہم ہی ہوں گے''۔

(Jamil-ud-Din Ahmed, Speeches and Writings of Mr. Jinnah, Vol. II, P. 239)

اس وضاحت کے بعد آپ تائیداً پوچھتے ہیں:

''آپ کو پاکستان چاہیے یا نہیں؟ (اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے ہیں) اچھا تو اگر پاکستان چاہتے ہو تو لیگی امیدواروں کو ووٹ دو''۔(ایضاً ص **240**)

پھر اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''ہم ان انتخابات میں وزارتوں کے لیے نہیں لڑ رہے۔ ہم یہ انتخابات مسئلہ پاکستان کے بارے میں مسلمانوں کا فیصلہ لینے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ آج اگر ہم اپنا فرض سمجھنے سے ناکام رہے تو تم شودروں کی سی حیثیت تک پست ہو جاؤ گے اور اسلام ہندوستان سے مٹ جائے گا''۔(ایضاً **241**)

27 نومبر **1945**ء کو ایک دوسرے جلسے میں فرماتے ہیں:

''مسلم لیگ کو ملنے والے ہر ووٹ کا مطلب ہے پاکستان۔ مسلم لیگ کے خلاف پڑنے والے ہر ووٹ کا مطلب ہے ہندوراج۔ ہمارے سامنے یہی ایک اختیار ہے اور یہی ایک (قابل توجہ) مسئلہ''۔(ایضاً **247**)

جب دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ ہمیں اس ملک کو قائد کا پاکستان بنانا ہے، تو اصول یہ تھا کہ جناح کی وہ تمام تقاریر جن میں انہوں نے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا پرعزم اظہار کیا تھا، سامنے رکھتے ہوئے وطن عزیز میں شریعت کے نفاذ کی عملی کوششیں کی جاتیں۔ مگر افسوس کہ سیکولر حضرات ان تمام تقاریر سے صرف نظر کرتے ہوئے جناح کی **11** اگست کی تقریر کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مذہب

کو سیاست سے الگ سمجھتے تھے اور پاکستان میں سیکولرازم کے نفاذ کے خواہاں تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر کو بنیاد بنا کر ان پر سیکولر ازم کا الزام عائد کرنا سیکولر حضرات کے بودے پن کی صریح دلیل ہے۔ اس لیے کہ 11 اگست کی تقریر سے نہ تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جناح سیکولر تھے اور نہ اس بات کا اثبات ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ سیکولر طرزِ حکومت کے خواہاں تھے۔ پھر آخر انھوں نے 11 اگست کی تقریر میں ایسا کیا کہا جو ان نام نہاد روشن خیالوں کے لیے آسمانی صحیفہ کی صورت اختیار کر گیا؟ آیئے ایک نظر ان کی اس دلیل کا جائزہ بھی لیتے چلیں۔

قائداعظم نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا صدر منتخب ہونے پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

- ''پاکستان میں آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، آپ اپنی مساجد یا کسی اور عبادت گاہ میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا رنگ ونسل سے ہو، اس سے ریاست کے امور کا کچھ لینا دینا نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں یہ بات مطمح نظر کے طور پر سامنے رکھنی چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان، مذہب کے اعتبار سے نہیں، کیونکہ یہ شہری کا ذاتی عقیدہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے سبھی ایک ریاست کے شہری ہوں گے''۔

(Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, Speeches as Governor General of Pakistan, 1947-1948 P. 9)

اس تقریر میں چونکہ غیر مسلموں کے متعلق جناح نے یہ صراحت کی تھی کہ پاکستان میں وہ اپنی عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ نیز یہ کہ ''آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا رنگ ونسل سے ہو، اس سے ریاست کے امور کا کچھ لینا دینا نہیں''۔ اس لیے سیکولر حضرات انہی لفظوں کی جگالی کرتے ہوئے اس بات پر بضد ہیں کہ قائداعظم مذہب اور امور ریاست کو علیحدہ علیحدہ رکھتے تھے، اس لیے ثابت ہو گیا کہ

جناح کا پاکستان سیکولر پاکستان ہی ہے۔

سیکولر حضرات کی پیش کردہ اس توجیہ کے رد میں ہم یہ کہتے ہیں:

(الف): برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت کانگریس جہاں شر پسند ہندوؤں اور سکھوں کے ذریعے مسلمانوں کا قتل عام کروا رہی تھی، وہیں ساتھ ساتھ یہ راگ بھی الاپ رہی تھی کہ پاکستان چونکہ مذہب کے نام پر بنایا جا رہا ہے، اس لیے وہاں اقلیتوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا جائے گا۔ اس زبردست پروپیگنڈے سے عالمی سطح پر ایک نئی اسلامی مملکت کا نہایت خراب تاثر ابھر رہا تھا۔ یوں ناانصافی بھی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی تھی، مال و املاک بھی ان کا لوٹا جا رہا تھا اور موردِ الزام بھی انہی کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ظلم و جبر کے ان تاریک ایام میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان قائم ہونے سے تین روز قبل 11 اگست 1947ء کو ایک نہایت پرمغز تقریر کی جو ان کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی اس تقریر کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ پاکستان میں آپ سب اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، انسانی جان کی حرمت اور اموال کے تحفظ کی ہر ایک کو ضمانت ہے کیونکہ سیاسی اعتبار سے سبھی ایک ریاست کے شہری ہیں۔

اگر تقسیم ہند کے وقت کے اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جناح کی تقریر کے مافی الضمیر کو سمجھا جاتا تو کسی بھی صورت سیکولر ازم خیال جنم نہ لیتا۔ مصیبت مگر یہ ہے کہ سیکولرز یہ بات سمجھنا نہیں چاہتے!!

(ب) اس کے بعد 14 اگست 1947ء کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کیا اور اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے انھوں نے اکبر بادشاہ کی فراخدلی کا ذکر کیا۔ یعنی وہ بھی کانگریس کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس طرح متحدہ ہندوستان میں مغل بادشاہ اکبر نے غیر مسلموں کی جان و مال اور عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم کیا تھا، ہمیں امید ہے کہ اس نئی اسلامی

مملکت میں بھی اقلیتوں کو ویسا ہی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ اس پر قائد اعظم نے وائسرائے ہند کو یہ جواب دے کر مطمئن کیا:

- ''اکبر بادشاہ نے غیر مسلموں کے ساتھ جس تحمل اور خلوص کا مظاہرہ کیا، وہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی ابتدا تو تیرہ صدیاں قبل اسی وقت ہو چکی تھی جب ہمارے نبی ﷺ نے فقط زبانی کلامی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر مفتوح یہود و نصاریٰ کے ساتھ فراخ دلانہ سلوک فرمایا اور ان کے مذہب و مفادات کا احترام بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ مسلمانوں کی تمام تر تاریخ، جہاں کہیں بھی انھوں نے حکومت کی، ایسے ہمدردانہ اور عظیم اصولوں سے پر ہے جن کی پیروی اور تعمیل ہونی چاہیے''۔

(S.M Burke, Jinnah: Speeches and Statements, 1947-1948, PP. 33-34)

دیکھیے، یہاں بھی قائد اعظم وہی بات دہرا رہے ہیں کہ اسلام میں اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا ایک تاریخی حقیقت ہے، لہٰذا کسی کو بھی گھبرانے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

(ج) قائد اعظم نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ ''آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا رنگ و نسل سے ہو، اس سے ریاست کے امور کا کچھ لینا دینا نہیں''۔ سوال یہ ہے کہ ریاست کے امور ہیں کیا؟ ریاست کے امور میں شامل ہیں کہ ریاست کا اپنے تمام شہریوں کی...... بلاتفریق رنگ و نسل، ذات پات اور مذہب...... جان، مال اور املاک کا تحفظ کرنا، غذا، تعلیم، صحت اور علاج کی سہولیات فراہم کرنا، امن عامہ اور قانون کی عملداری کو یقینی بنانا، مذہب کی بنیاد پر کسی پر ظلم نہ کرنا اور یہ کہ مذہبی آزادی میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان فرق روا نہ رکھنا، خیال رہے کہ یہ امور کسی سیکولر ریاست میں تسلیم ہوں یا نہ ہوں، ایک اسلامی ریاست میں بنیادی حیثیت بہر حال رکھتے ہیں۔

(د) اسلامی ریاست کا خاصہ یہ رہا ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ قائم ہو، اقلیتوں

(ذمیوں) کو جبراً مسلمان کرتی ہے نہ انھیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھتی ہے، بلکہ تمام شہریوں کی جان کی حرمت اور ان کے اموال کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ چنانچہ خلیفہ دوم، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا اہلیان بیت المقدس کو دیا گیا امان نامہ آج بھی تاریخی صفحات پر ثبت ہے جس کی ابتدا ان سنہرے الفاظ سے ہو رہی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا والوں کو دی ہے۔ یہ امان ان کی جان، مال، عبادت گاہوں اور صلیب کے تحفظ کے لیے ہے، یعنی ان کی عبادت گاہیں، صلیبیں، بیمار، تندرست اور ایلیا کے تمام باشندے امان میں رہیں گے۔ ان کے عبادت خانوں پر قبضہ نہیں کیا جائے گا اور نہ انھیں مسمار کیا جائے گا، نہ ان کی زمینوں اور ان کے اموال میں سے کمی کی جائے گی۔ ان پر ان کے دین کے متعلق جبر نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے کسی فرد کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا''۔

یہاں امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروقؓ بیت المقدس کے عیسائیوں کو یہ امان دے رہے ہیں کہ اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے ناتے انھیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کا مال و املاک، عزت و آبرو اور عبادت خانے محفوظ رہیں گے۔ ان کے چھوٹے بڑے، بیمار اور تندرست، سب کا تحفظ یقینی ہوگا اور کوئی بھی مسلمان ان کے کسی فرد کو مذہب کی بنیاد پر نشانہ نہیں بنائے گا۔ کیا اب کہا جائے کہ (**نعوذ باللہ**) امیر المومنین، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ بھی سیکولر تھے؟ یہ سوال یہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ **24** نومبر **1945**ء کو مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جناح فرماتے ہیں:

- ''مسلمان پاکستان چاہتے ہیں، جس کا مطلب ہے مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی ایسی حکومت جہاں اقلیتوں کو مناسب اور کارگر تحفظ میسر ہو۔ ہمارا دین، ہماری تاریخ اور ہماری روایات ہی غیر مسلموں کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کی موثر ترین ضمانت دیتی ہے۔ ان کے ساتھ انصاف سے بھی بڑھ کر معاملہ ہوگا''۔

(Jamil-ud-Din Ahmed, Speeches and Writings of Mr. Jinnah, Vol. II, P. 241)

قائداعظم کے اس بیان سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ وہ سیکولر حضرات کی طرح جاہل نہیں بلکہ اسلامی تاریخ و روایات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ دوسری یہ بات ثابت ہوئی کہ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے دعوے سے مکرے نہیں، بلکہ انھوں نے ایفائے عہد کا ثبوت دیتے ہوئے نوزائیدہ پاکستان میں سب سے پہلا اصول یہی واضح کیا کہ ہماری حکومت میں انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوگی اور اموال کے تحفظ کی ضمانت ہوگی۔ اقلیتوں کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حقوق محفوظ ہوں گے کہ ہمارا دین ہمیں اسی بات کی تعلیم دیتا ہے۔

چلیے اب پہلے سوال کی طرف لوٹتے ہیں۔ امیر المومنین سیدنا عمر فاروقؓ نے ایلیا کے باشندوں کو ان کی جان و مال کے تحفظ کا یقین دلایا، ان کی عبادت گاہوں اور صلیب کے نشانات کو مسمار نہ کرنے کا حکم دیا، اور مذہب کی بنیاد پر ان پر جبر نہ کرنے کا عہد کر کے گویا اُن سے ایک **(Social Contract)** کر لیا کہ اسلامی ریاست میں ان کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کی مکمل ضمانت ہوگی۔ اب اگر یہ تمام امور بجا لانے کے بعد بھی وہ سیکولر نہیں تو پھر مان لیجیے کہ قائداعظم بھی سیکولر نہیں۔

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ قائداعظم کی **11** اگست کی تقریر سے کسی طور سیکولر ریاست کا اثبات نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی اس تقریر سے تو اسلامی طرز حکومت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے کہ وطن عزیز میں انھوں نے اقلیتوں کے ساتھ وہی معاملہ فرمایا کہ جو معاملہ سیدنا عمر فاروقؓ اپنے عہدِ خلافت میں ایلیا کے باشندوں کے ساتھ فرما چکے تھے۔

(و) یہاں، جناح کی **11** اگست کی تقریر کے ضمن میں، قائد ملت لیاقت علی خان کی ان تقاریر کا حوالہ بھی برمحل ہوگا جو قیام پاکستان کے متعلق نہ صرف اسلامیان ہند کے افکار و خیالات کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ قائداعظم کی حقیقی فکر کی بھی ترجمان ہیں۔ واضح رہے کہ قائد ملت لیاقت علی خان وہ ہستی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کی **25** بہاریں

تحریک پاکستان کو پروان چڑھانے میں وقف کیں۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں پاکستان کا پہلا وزیراعظم نامزد کیا گیا اور وطن عزیز پر انھوں نے اپنا سب کچھ تج دیا۔ جس وقت بانیٔ پاکستان نے 11 اگست 1947ء کو تقریر فرمائی تو انھوں نے بھی وہ تقریر سنی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا انھوں نے بھی جناح کی 11 اگست کی تقریر کا وہی مطلب سمجھا جو آج کے سیکولر حضرات سمجھ رہے ہیں؟ یہ سوال بے انتہا اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ان سے بڑھ کر جناح کی فکر، ان کی سوچ اور ان کے تصور پاکستان کو سمجھنے والا کوئی اور نہیں۔ وہ قائداعظم کے شب و روز کے ساتھی اور بخوبی جانتے تھے کہ مسلم لیگ، مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن کر، کس مقصد کو پانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ چنانچہ 20 فروری 1949ء کو انھوں نے کراچی میں منعقدہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

- ''جناب صدر اور مسلم لیگ کونسل پاکستان کے اراکین!

میری پہلی ذمے داری آپ سب کو مسلم لیگ کونسل پاکستان کے پہلے اجلاس میں خوش آمدید کہنا ہے۔ یہ محض ایک رسمی خیر مقدم نہیں، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ میں پچیس سال سے آل انڈیا مسلم لیگ کا رکن رہا ہوں اور بارہ سال سے اس کا جنرل سیکرٹری ہوں۔ میرا اس سے تعلق روح اور جسد کے تعلق جیسا ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ اس سے پہلے اسی ہال میں اکٹھی ہوئی تھی تو کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانانِ پاکستان کے لیے ایک علیحدہ مسلم لیگ کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ میں ان لوگوں میں سے ایک تھا جنھوں نے واضح کیا کہ آج مسلم لیگ کی ضرورت اس وقت سے بھی زیادہ ہے جس وقت ہم پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اس کا سبب تلاش کرنا کوئی مشکل نہیں۔

ہمارے اور قائداعظم کے مطالبۂ پاکستان کی واحد وجہ برصغیر میں ایک ایسے وطن کا حصول تھا جہاں مسلمان اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ہم چاہتے

تھے کہ پاکستان ایک ایسی تجربہ گاہ ہو جہاں ہم اسلامی اصولوں جو کہ دنیا میں اعلیٰ ترین ہیں، پر عمل کر سکیں اور اس طرح دنیا کو عملاً دکھا سکیں کہ اسلام نے تیرہ صدیاں قبل جو تعلیم دی تھی، وہ آج بھی اسی طرح مطلوب ہے جیسے اس وقت تھی۔ ہمیں ہرگز یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہی وہ جذبہ تھا اور اسی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہزارہا مسلمانوں نے اپنی جانیں دیں اور قریباً 70 لاکھ مسلمان اپنے آبائی گھروں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور انتہائی خستہ حالت اور غربت کے عالم میں انھوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔

ہم، یعنی مسلم لیگ، اس بات کے پابند ہیں کہ ہم پاکستان کو ایک مسلم ریاست بنائیں اور اسے اسلامی اصولوں کے تحت چلائیں۔ جب تک ہم سب یا ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے، ہمیں اس عہد کو ہرگز فراموش نہیں کرنا جس کے لیے مسلمانوں نے اتنی شاندار قربانی دی''۔

(M. Rafique Afzal, Speeches and Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan 1941-51, (Lahore Research Society of Pakistan, 1967, PP. 207-8)

قارئین کرام! ذرا غور کیجیے کہ اگر محمد علی جناح وطن عزیز پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کے خواہاں ہوتے اور ان کی 11 اگست کی تقریر کا منشا پاکستان میں سیکولر ازم کا نفاذ ہوتا، تو قائد ملت لیاقت علی خان جو مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور قیام پاکستان کے بعد جنھیں پہلا پاکستانی وزیر اعظم منتخب کیا گیا، مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان نہ کرتے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، اس لیے ہمیں اسے اسلامی اصولوں کے تحت چلانا ہوگا۔ نیز یہ کہ یہی قائد اعظم کا نصب العین تھا اور اسی عظیم مقصد کی خاطر برصغیر کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دیں۔ بالفرض اگر وہ جناح کے منشا کے برخلاف بات کر رہے تھے، تو کم از کم ایک فرد ہی سہی، کوئی تو ایسا ہوتا جو انھیں ٹوکتا کہ خان صاحب! آپ جناح کے تصور پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں...... جناح تو پاکستان کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے مگر آپ ہیں کہ وطن عزیز میں اسلامی اصولوں کے نفاذ کا عزم کیے بیٹھے ہیں......؟ لیکن ایسا

نہیں ہوا، اور یہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ پاکستان کا قیام ایک اسلامی نظریاتی ریاست کا قیام تھا اور جناح کی 11 اگست کی تقریر کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پاکستان میں سیکولر نظام حکومت رائج ہو۔

یہاں محترم لیاقت علی خان کی اس تقریر کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو انھوں نے مارچ 1949ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے کی۔ انھوں نے جناح کے پاکستان اور قیام پاکستان کے مقصد کی وضاحت ان نمایاں الفاظ میں کی:

- ''جناب! میں سمجھتا ہوں کہ حصول آزادی کے بعد اس ریاست کی زندگی کا یہ سب سے اہم موقع ہے۔ کیونکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے محض اپنے نظریات کے مطابق ایک ملک اور اس کے طرزِ حکومت کی تعمیر کرنے کا موقع پایا ہے۔

میں ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بابائے قوم...... قائداعظم...... نے بارہا اس مسئلہ پر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اور قوم نے ان کے خیالات کی واضح طور پر تائید کی تھی۔ پاکستان اس لیے قائم کیا گیا کہ اس برصغیر کے مسلمان اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق اپنی زندگی استوار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ عملاً دنیا پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ حیاتِ انسانی کو آج جو مختلف امراض لاحق ہو چکے ہیں، اسلام ان کا شافی علاج مہیا کرتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظم اور دیگر قائدین مسلم لیگ نے ہمیشہ غیر مبہم بیانات دیئے کہ مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان اس حقیقت پر مبنی تھا کہ مسلمانوں کا اپنا ایک طریقہ حیات اور ضابطہ عمل ہے۔ انھوں نے اس بات کا بھی اعادہ کیا تھا کہ اسلام محض فرد اور معبود کے مابین ایسے تعلق کا نام نہیں جو کارہائے ریاست پر کسی طرح اثر انداز ہی نہ ہوتا ہو۔ یقیناً اسلام معاشرتی رویہ سے متعلق خصوصی احکامات نافذ کرتا ہے اور معاشرہ کو درپیش روزمرہ مسائل کے متعلق سماجی طرزِ عمل میں اس کی راہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ اسلام محض

ذاتی عقائد اور طرزِ عمل کا نام نہیں۔ اسلام اپنے پیروکاروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ (اس کے احکامات کے مطابق) ایک ایسا معاشرہ تعمیر کریں گے جس سے اچھی زندگی کے حصول کا مقصد پورا ہوتا ہو۔ ایسا ہی خیال یونانیوں کا بھی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی اچھی زندگی بنیادی طور پر مذہبی اقدار پر مبنی ہوتی ہے''۔(ایضاً 232 تا 233)

قائد ملت لیاقت علی خان کے ان خطابات نے پاکستان کی نظریاتی حیثیت کو اجاگر کر دیا اور ان اصولوں کی نشاندہی کر دی جن کی بنیادوں پر وطن عزیز کا نظام سیاست اور طرزِ حکومت استوار ہونا تھا۔ یعنی قرآن وسنت کی روشنی میں کارہائے ریاست کے امور سرانجام دینا کہ جو مسلمانانِ ہند کا خواب اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کا حقیقی نصب العین تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد

قائداعظمؒ: ایک غیر معمولی شخصیت

قیام پاکستان کے ضمن میں مشیت و قدرت خداوندی کا دوسرا نمایاں ظہور قائداعظم مرحوم کی قیادت کی صورت میں ہوا تھا اور اس کے بعد سے اب تک یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت وحفاظت ہی کے ذریعے قائم ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر کے حالات میں جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی، اس کے لازمی و منطقی نتیجے کے طور پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب کم از کم مستقبل قریب میں انگریز کی غلامی سے نجات کا حصول کسی عسکری جدوجہد کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی داخلی بغاوت مفید ہوسکتی ہے نہ خارجی مداخلت بلکہ آزادی کی کوئی جدوجہد اگر ممکن ہے تو صرف قانونی اور آئینی ذرائع سے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو انگریزوں کی اجتماعی نفسیات سے بھی کماحقہٗ واقف ہو اور ان سے ان کی زبان اور محاورے میں گفتگو کر سکے، برطانوی پارلیمانی سیاست کے پیچ وخم اور اسرار ورموز سے بھی پوری طرح آگاہ ہو اور آئینی وقانونی جنگ لڑنے کی صلاحیت ومہارت سے توبدرجہ اتم مسلح ہو۔

مسلمانان ہند کے قائد وقت کے لیے دوسرا لازمی وصف یہ درکار تھا کہ وہ ہندوؤں کی ذہنیت کو اچھی طرح جانتا ہو اور ان کے احساسات و جذبات اور مقاصد و عزائم کا علم اسے بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ ذاتی تجربہ کی بنا پر حاصل ہوا ہو، نیز وہ ان

کے مخصوص طریقے ہائے واردات سے بھی پوری طرح واقف ہو اور ان کے رموز و اشارات کو بھی خوب سمجھتا ہو۔

ان دونوں اوصاف کے مطلوبہ حد تک حصول اور ان دونوں گھروں کے بھیدی ہونے کے لیے لازمی تھا کہ وہ کافی مدت تک ع ''کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ!'' کے انداز میں ان دونوں کے 'اندر' رہا ہو اور اس کی ذہنی و فکری اٹھان اور سیاسی و عملی تربیت بلاتشبیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح، جن کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی، ان دونوں 'دشمنوں' کے گھروں میں ہوئی ہو!

کون نہیں جانتا کہ ان دونوں شرائط پر بتمام و کمال پورا اترنے والا شخص محمد علی جناح کے سوا کوئی نہیں تھا جس نے انگلستان میں قانون کی تعلیم حاصل کی اور وہاں قیام کے دوران انگریزوں کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ و مشاہدہ کیا اور پارلیمانی طور طریقوں کو بھی خوب سمجھا اور اس طرح گویا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل کی، پھر تیس برس کی عمر (1906ء) سے جو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو یہ تعلق پورے چودہ سال تو بھرپور انداز میں جاری رہا (قائداعظم نے کانگریس سے علیحدگی 1920ء کے ناگپور سیشن کے دوران اختیار کی تھی۔) اس کے بعد بھی لگ بھگ آٹھ برس وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اصلاً اسی عرصہ کے دوران ان پر ہندو ذہنیت کا انکشاف ہوا۔

ظاہر بین لوگوں کے لیے یہ جملہ امور محض اتفاقیہ ہو سکتے ہیں لیکن ع ''جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے!'' کے مصداق جن لوگوں پر باطن ایام بھی روشن ہوتا ہے اور جو جانتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی واقعہ بھی خالص 'اتفاقی' طور پر ظہور میں نہیں آتا، انہیں ان 'اتفاقات' میں بلاشبہ حکمت و قدرت خداوندی کا ظہور نظر آئے گا۔

مزید انشراح صدر کے لیے ذرا ان اضافی دلائل کو بھی ذہن کے سامنے لے آیئے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی قیادت دو ہی طبقات کے ہاتھوں میں رہی تھی...... نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا طبقہ اور دوسرا علماء کرام کا طبقہ۔ قائداعظم کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے نہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے ایک ایسے تجارت پیشہ

خاندان میں آنکھ کھولی تھی جو طبقہ متوسط ہی نہیں اس کے بھی زیریں حصے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا دنیوی اعتبار سے وہ جو کچھ بھی تھے بالکلیہ خود ساختہ (Self Made) تھے۔ دوسری طرف نہ وہ واقعتہً مذہبی آدمی تھے نہ انہوں نے کبھی تکلفاً یا تصنعاً اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ تیسری طرف اس پر غور کیجیے کہ انہیں اردو بس واجبی ہی سی آتی تھی اور وہ اس میں تحریر وتقریر پر قادر نہ تھے۔ جبکہ کسی عوامی راہنما کے لیے عوام کی زبان میں اظہار خیال پر کماحقہ قدرت نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

اس سب کے باوجود وہ اگر برصغیر پاک و ہند کی دس کروڑ افراد پر مشتمل قوم کی اکثریت کے محبوب ترین راہنما بن گئے تو کیا یہ خارق عادت، واقعہ نہیں ہے؟ اور کیا اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے کہ یہ سب کچھ من جانب اللہ تھا اور اس لیے تھا کہ اُن کے ذریعے اللہ کو اپنی ایک خصوصی مشیت کی تکمیل کرنی تھی۔

قائداعظم کی صلاحیتوں کے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہونے کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی 'معجز نما' تھا اور یہ کہ سیرت و کردار اور شخصی اوصاف کے اعتبار سے وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں بالکل ہی نادرالمثال اور عجوبہ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور علما ومشائخ سے قطع نظر، جملہ ہمعصر سیاست دانوں میں کوئی ایک شخص بھی ان کا ہمسر وہم پلہ تو دور کی بات ہے، آس پاس بھی نظر نہیں آتا۔ کسی نے نہ کبھی اُن کی صداقت اور راست گوئی پر حرف رکھا، نہ دیانت اور امانت پر اور نہ کسی وعدہ خلافی کا الزام لگایا نہ فریب دہی کا بلکہ سب ان کی صاف گوئی اور راست معاملگی (Straight Dealing) کا برملا اعتراف کرتے رہے اور یہ بات ہمیشہ مسلم سمجھی جاتی رہی کہ جو کچھ اُن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، وہی اُن کی مراد ہوتی ہے اور نہ کبھی وہ عام سیاست دانوں کے مانند ع ''کجا می نمائی کجا می زنی'' کا معاملہ کرتے ہیں، نہ جھوٹ، دھوکہ، فریب اور وعدہ خلافی سے کام لیتے ہیں، نہ اُن کے یہاں دروغِ مصلحت آمیز کا وجود ہے نہ مصنوعی تواضع و مدارات کا اور نہ ریاکارانہ انکساری موجود ہے نہ چاپلوسانہ خوشامد۔

قائداعظم کی اسی غیر معمولی شخصیت اور موجودالوقت ظروف واحوال کے اعتبار سے

بالکل اجنبی اورانوکھی سیرت کا نتیجہ ہے کہ آزادیٔ ہند اور تقسیم برصغیر کے جملہ مؤرخین و مصنفین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عالم اسباب میں قیام پاکستان کا واحد سبب صرف ایک انسان ہے اور وہ ہے محمد علی جناح۔ یہاں تک کہ ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' (Freedom At Midnight) کے مصنفوں نے تو، اس کے باوجود کہ قائداعظم سے ان کا بغض وعناد کتاب کے بہت سے مقامات پر بالکل عریاں طور پر نظر آتا ہے، واضح طور پر حسرت بھرے انداز میں لکھا ہے کہ اگر وہ راز جو بمبئی کے ڈاکٹر پٹیل کی دراز میں مقفل تھا، کسی طرح فاش ہو جاتا تو برصغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی اور ہندوستان ہرگز تقسیم نہ ہوتا۔ اس لیے کہ وہ راز دراصل قائداعظم کا وہ ایکس رے تھا، جس سے اُن کے پھیپھڑوں کا ٹی بی سے متاثر ہونا ظاہر ہوا تھا...... ان مصنفوں کی رائے میں اگر اُس وقت اس کا علم حکومت برطانیہ یا کانگریس کی لیڈرشپ کو ہو جاتا تو وہ آزادیٔ ہند کو مؤخر کر دیتے اور قائداعظم کے انتقال کا انتظار کر لیتے، اس لیے ہر شخص جانتا تھا کہ مسلمانان ہند کے پاس کوئی دوسرا 'قائد' ایسا موجود نہ تھا جسے نہ دھوکہ یا فریب دیا جا سکتا ہو، نہ مرعوب و متاثر کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی خریدا جا سکتا ہو۔

اب اگر یہ بات درست ہے اور عربی مقولہ ''**الفضل ما شهدت به الاعداء**'' کے مطابق اسے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں تو ظاہر ہے کہ موجود الوقت معیارات اور ظروف و احوال کی نسبت سے اتنی غیر معمولی اور اپنے ہم عصر لوگوں سے اس درجہ مختلف شخصیت اللہ تعالیٰ کے کسی ارادہ خصوصی ہی کا مظہر ہو سکتی ہے!!

1937ء سے **1947**ء تک قائداعظم نے جس طرح اسلام کو اپنے فکر و نظر کا محور بنایا، اس پر ان کے ایک سو اقتباسات (Quotations) موجود ہیں۔ ان دس سالوں کے دوران انہوں نے اپنی تقاریر میں برملا کہا ہے کہ ہمارا قانون، ہمارا نظام، بلکہ ہماری ہر شے اسلام کے مطابق ہوگی۔ ان کے علاوہ ان کی تقاریر کے چالیس اقتباسات اور بھی ہیں جو ان کی پاکستان بننے کے بعد کی تقاریر سے ماخوذ ہیں جن میں انہوں نے اسلام ہی کی بات کی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا سیکولر حلقہ ان کی صرف ایک تقریر کے چند الفاظ کو ان کے باقی تقریباً ڈیڑھ سو خطابات پر حاوی قرار دے کر اسے

دستورِ پاکستان کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ میں یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کے صرف دو حوالے دوں گا، جس سے اندازہ کیجیے کہ یہ مسٹر محمد علی جناح بول رہے ہیں یا مولانا محمد علی جناح خطاب فرما رہے ہیں۔ 11 جنوری 1938ء کو گیا ریلوے اسٹیشن (بہار) پر ایک بہت بڑے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا کر فرمایا:

❑ ''آج اس عظیم الشان اجتماع میں آپ نے مجھے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کا اعزاز بخشا ہے۔ یہ جھنڈا درحقیقت اسلام کا جھنڈا ہے، کیونکہ آپ مسلم لیگ کو اسلام سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ بالخصوص ہمارے ہندو دوست ہمیں غلط سمجھے ہیں۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں یا جب ہم کہتے ہیں کہ یہ جھنڈا اسلام کا جھنڈا ہے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مذہب کو سیاست میں گھسیٹ رہے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں مکمل ضابطہ حیات دیتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مذہب ہے بلکہ اس میں قوانین، فلسفہ اور سیاست سب کچھ ہے۔ درحقیقت اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک آدمی کو صبح سے رات تک ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو ہم اسے ایک کامل لفظ کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ ہمارا کوئی غلط مقصد نہیں، بلکہ ہمارے اسلامی ضابطہ کی بنیاد آزادی، عدل و مساوات اور اخوت ہے''۔

اس کے بعد آپ 6 مارچ 1946ء کو فرماتے ہیں:

❑ ''ہمیں قرآن پاک، حدیث شریف اور اسلامی روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جن میں ہمارے لیے مکمل راہنمائی ہے، اگر ہم ان کی صحیح ترجمانی کریں اور قرآن پاک پر عمل پیرا ہوں''۔

یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کی چند شہ سرخیاں پیش خدمت ہیں:

6 جون 1938ء: ''مسلم لیگ کا جھنڈا نبی اکرم ﷺ کا جھنڈا ہے''۔

22 نومبر 1938ء: ''اسلام کا قانون دنیا کا بہترین قانون ہے''۔

8 اپریل 1938ء 'اسٹار آف انڈیا': ''ملتِ اسلامیہ عالمی ہے''۔

7 اگست 1938ء: ''میں اول وآخر مسلمان ہوں''۔
9 نومبر 1939ء: ''مغربی جمہوریت کے نقائص''۔
14 نومبر 1939ء: انسان خلیفۃ اللہ ہے''۔
ٹائمز آف لندن، 9 مارچ 1940ء: ''ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں''۔
26 مارچ 1940ء: ''میرا پیغام قرآن ہے''۔

قائداعظم نے اقلیتوں کو بھی کچھ یقین دہانیاں کرائیں کہ ان کو خوف نہیں ہونا چاہیے، ان کے ساتھ پاکستان میں فراخ دلانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس ضمن میں ان کی 29 مارچ 1944ء کی تقریر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں شائع ہوئی، جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

❑ ''مسٹر جناح نے غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلایا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو اُن کے ساتھ رواداری، انصاف اور فیاضی کا سلوک کیا جائے گا۔ اقلیتوں کو یہ حقوق قرآن نے دیے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ ان کو یہی سبق سکھاتی ہے، البتہ چند استثنائی صورتوں میں ممکن ہے کہ بعض افراد نے بدسلوکی کی ہو''۔

اب اسی کے حوالے سے قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صرف ایک جملہ ایسا ہے کہ جسے سیکولر ذہن رکھنے والے دانشوروں نے سیکولرزم کی بنیاد قرار دے لیا ہے، اور جسٹس منیر نے تو اس ایک جملے پر پوری کتاب لکھ دی ہے۔ حالانکہ اس جملے کا بھی 95 فیصد حصہ اسلامی ہے، صرف 5 فیصد حصہ ایسا ہے جس کی مختلف تعبیرات کی گئی ہیں اور اس سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس خطاب میں انہوں نے کہا تھا:

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan."

''آپ آزاد ہیں، آپ کو اپنے معبدوں میں جانے کی اجازت ہے، پاکستان کی اس ریاست میں آپ کو اپنی مساجد یا کوئی بھی دوسری عبادت گاہوں میں

جانے کی آزادی ہے''۔

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلامی ریاست میں بھی مذہبی آزادی سب کو ملتی ہے۔ صرف قریش کا معاملہ خصوصی تھا، اوران کے لیے حکم تھا جو سورۃ التوبہ کی ابتدائی چھ آیات میں وارد ہوا کہ اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ خود قریشی تھے اور آپ ﷺ کی قریش کی طرف خصوصی بعثت تھی۔ بعد میں سب کے لیے یہی اصول تھا کہ اسلام لے آؤ تو ہمارے برابر کے ساتھ ہو گے۔ ہم یہ بھی دعویٰ نہیں کریں گے کہ ہم سینئر مسلمان ہیں اور تم جونیئر مسلمان ہو، ہمارے حقوق زیادہ ہیں اور تمہارے کم۔ البتہ اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے بن کر رہو، لیکن تمہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ اور پوری تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ کہیں پر بھی اور کسی ایک شخص کو بھی بالجبر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ ہاں اگر طاقت ہے تو نظام صرف اللہ کا ہوگا، دین صرف اللہ کا قائم کیا جائے گا، اس لیے کہ انسانوں کے لیے اسی نظام میں رحمت ہے،سوشل جسٹس ہے، جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے نوع انسانی کو عطا کیا ہے۔ باقی یہ کہ مذہبی آزادی سب کو حاصل ہے۔اسی خطاب میں قائداعظم نے فرمایا:

"You will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Mislims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the State".

اس میں قائداعظم نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے'' اس وقت پوری دنیا کا اصول یہی ہے۔ البتہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، یہ مذہب نہیں ہے، بلکہ دین ہے اور پوری زندگی کا نظام دیتا ہے، اور یہ بات قائداعظم بھی اپنی تقاریر میں کہہ چکے ہیں۔ اگر قائد کے اس جملے کو ان کی بقیہ تقاریر کی روشنی میں سمجھا جاتا تو غلط فہمی کا امکان پیدا نہ ہوتا۔لیکن سیکولر حلقے اس کی جو تعبیر کر رہے تھے قائداعظم نے خود اس کی نفی کر دی تھی۔ چنانچہ 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دوٹوک انداز میں فرمایا تھا:

"Islamic principles today are as applicable to life as they were thirteen hundred years ago. He could not understand a section of the people who deliberately wanted to create mischief and propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basic of Shariat."

''اسلامی اصول آج بھی ہماری زندگی کے لیے اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سوسال پہلے قابل عمل تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ لوگوں کا ایک گروہ جان بوجھ کر فتنہ اندازی سے یہ بات کیوں پھیلانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر مدوّن نہیں کیا جائے گا''۔

یعنی جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کے مطابق نہیں بنے گا، وہ فتنہ پرور، شرارتی اور غلط پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔

قائداعظم کے حوالے سے مزید جان لیجیے کہ ان کی وفات سے دو تین دن پہلے پروفیسر ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور قائداعظم نے ان سے فرمایا:

❑ ''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے، تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے''۔

میں خود یہ کہتا ہوں کہ اس سے پہلے تک میرے دل میں قائداعظم کی عظمت بھی تھی، جذبہ شکر بھی تھا، لیکن محبت نہیں تھی۔ 11 ستمبر 1988ء کے روزنامہ جنگ میں مذکورہ بالا الفاظ دیکھ کر ان سے محبت بھی پیدا ہوگئی۔ دیکھیے اس شخص کے اندر کس قدر جذبہ تھا۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم کے علم میں وہ احادیث بھی تھیں جن میں یہ پیشین گوئی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں نظام خلافت قائم ہوگا اور امت محمد ﷺ کی حکومت قائم ہوگی۔ ابھی تو حالات خراب سے خراب تر ہوں گے، مزید آزمائشیں آئیں گی ع

''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' لیکن آخر کار حالات بدلیں گے۔

خالد محمود

قائداعظمؒ: قدرت کا بہترین انتخاب

تاریخ گواہ ہے کہ جب خالق کائنات کو کسی قوم کی بے بسی پر رحم آتا ہے تو اس کی راہنمائی کے لیے ایسے افراد مقرر کیے جاتے ہیں جو قیادت کا فریضہ اس شان سے ادا کرتے ہیں کہ وقت کا مورخ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ جب اپنی کٹھن منزل کی طرف بڑھتے ہیں تو اللہ کی مدد ہر قدم پر ان کے ساتھ شامل ہوتی ہے اور دیکھتے دیکھتے ایسے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں جو بظاہر اتفاق نظر آتے ہیں لیکن ہر سبب کے پیچھے غیب کی ایسی منصوبہ بندی ہوتی ہے کہ انسانی سوچ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ وطن عزیز پاکستان رب العزت کی ایسی عظیم نعمت ہے جو معجزانہ طور پر برصغیر کے مسلمانوں کو عطا کی گئی۔ اس نعمت کے حصول کی جدوجہد میں مسلم لیگ سے وابستہ تمام قیادت نے اپنا حصہ ڈالا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرفہرست دو خوش نصیب ایسے تھے جن کو قدرت نے خاص اس مشن کے لیے منتخب کیا۔ ان میں ایک شاعر مشرق اقبال تھے جن کے سر پر مفکر پاکستان ہونے کا تاج سجا اور دوسرے تھے محمد علی جناح جو بانی پاکستان ہوئے۔

غالب اکثریت کے مقابلے میں ہر اعتبار سے کمتر کسی گروہ کا میدان میں آنا اور ملک کی تقسیم کا نعرہ لگانا ایک ناممکن سا مطالبہ تھا جس کا ابتدائی ردعمل تمسخر پھر حیرت، اس کے بعد غصہ اور نفرت اور آخر میں شدید مزاحمت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مخالفت

صرف اکثریتی ہندو قوم کی طرف سے نہیں تھی، بلکہ ان کے ساتھ دوسرے اقلیتی گروہ سکھ، عیسائی اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے علاوہ کانگریسی سوچ والے مسلمانوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی۔ ان نامساعد حالات میں رب العزت نے مسلمانوں کو مسلسل جدوجہد کی توفیق عطا کی۔ جس کے نتیجے میں مشکلات آہستہ آہستہ حل ہوتی گئیں اور تمام رکاوٹیں ایک ایک کرکے دور ہوگئیں۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ حتیٰ کہ 1947ء کے رمضان کے مبارک مہینے میں قدرت کا یہ معجزہ ایک ایسی رات رونما ہوا جس کے بارے میں ہزار راتوں سے بہتر ہونے کا یقین پایا جاتا ہے۔ کسی صاحب نظر نے کیا خوب کہا ہے کہ اس خاص رات میں پاکستان کا قیام اتفاق نہیں تھا، قدرت کا انتخاب تھا۔

قدرت کا یہ خصوصی عمل دخل اسی طرح شاعر مشرق علامہ اقبال اور بانی پاکستان کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ دونوں کی زندگی کے معاملات اور مماثلت پر ایک نظر ڈالیے، پھر حسن انتخاب کی داد دیجیے کہ ان کی پیدائش کی گھڑیاں بھی ایسے ترتیب دی گئیں کہ وہ نہ صرف ہم عصر بلکہ ہم عمر ٹھہرے۔ ایسا لگتا ہے کہ انیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں کارکنان قضا و قدر نے اپنے پروگرام پر عمل شروع کردیا تھا۔ دونوں عظیم شخصیات نے متوسط درجے کے دینی گھرانوں میں جنم لیا۔ اپنے اپنے شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انگلستان سے قانون کی تربیت پائی۔ محمد علی جناح وکالت کے شعبہ سے وابستہ ہوئے جبکہ اقبال فلسفہ خودی کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے عقل و دانش کی وسیع کائنات کے راہ نورد ہوئے۔ ملت اسلامیہ کے ان عظیم سپوتوں کی عملی سوچ اور زندگی کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے۔ ابتدا میں اقبال یہ اعلان کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جلد ہی اس مقام پر پہنچے کہ

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

پھر کاتب تقدیر نے مزید راہنمائی کی اور باطنی آنکھ سے جو دیکھا اور شعر کی صورت میں یوں بیان کیا:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ان ہی باطنی کیفیات کو جب سیاسی افکار پر منطبق کیا تو نتیجہ خطبہ الٰہ آباد کی شکل میں آیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دوسری طرف محمد علی جناح بھی اپنی عملی زندگی کا آغاز کانگریس کے پرچم تلے ایک متحدہ ہندوستان کے تصور کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ شاعر نہیں تھے ورنہ شاید ہندوستان کی محبت میں کوئی ترانہ کہتے۔ سیاستدان تھے، ایسی راہ پر چلے کہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلائے۔ لیکن قدرت کا منشا کچھ اور تھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ اس اتحاد سے راہیں جدا ہونے کا مرحلہ آ گیا۔ ان کا رخ اس منزل کی طرف موڑ دیا جاتا ہے جو ان کی منتظر ہے اور ان کے لیے متعین ہو چکی ہے۔ جب ان کو کانگریس کا زمانہ یاد دلایا جاتا ہے تو کیا خوبصورت جواب دیتے ہیں کہ ہاں میں کبھی نرسری جماعت کا بھی طالب علم تھا۔

قدرت کے منتخب کردہ ان مسافروں کی جب منزل ایک تھی، تو راستے کیسے جدا ہو سکتے تھے۔ ان کے باہمی رابطے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جدوجہد کے بارے میں خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتیں ہیں۔ خط و کتابت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو تقویت دی جاتی ہے۔ حوصلہ بڑھایا جاتا ہے۔ ایک طرف محمد علی جناح چودہ نکات پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف الٰہ آباد میں اقبال اپنے منصوبے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ شہر لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوتی ہے تو قائداعظم درد

بھرا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اقبال آج زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔

اللہ کے عظیم مقصد کے لیے چنے ہوئے یہ لوگ اطمینان کی کس کیفیت کے ساتھ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ہوں گے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان کا ضمیر یقیناً مطمئن ہوگا کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اپنے سپرد کیا گیا کام پورا کر دیا۔ ایسے لوگوں پر قدرت بے پناہ عنایات کرتی ہے، ان کے عیبوں پر پردہ ڈالتی ہے اور ان کی شان یوں بڑھاتی ہے کہ اللہ کی رحمت کی دعا ان کے نام کا حصہ بن جاتی ہے۔ قوم ان کی احسان مند ہوتی ہے، ان کی یاد مناتی ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا عہد کرتی ہے۔ ایسے عظیم لوگوں کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی جستجو ہوتی ہے۔ ان کے ہر سانس کی کھوج لگائی جاتی ہے۔ ان کے منہ سے نکلا ہر لفظ محفوظ کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی ذات کی طرح ان کی کہی ہوئی بات بھی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔

میاں محمد افضل

قائداعظمؒ اور طالوتؒ میں مماثلت

قائداعظمؒ کو ہندوستان کے مسلمانوں کا طالوت کہا جاتا ہے جو ان کے انتہائی پر صعوبت، بدنصیبی اور شکست خوردگی کے ایام میں اپنی پرسکون جلا وطنی (لندن) کی زندگی ترک کر کے ان کی قیادت سنبھالنے اور انہیں کانگریس، انگریز افسر شاہی کے کاسہ لیس ٹوڈیوں اور برطانوی استعمار کے چنگل سے نکالنے کے لیے، اچانک ان کے درمیان پہنچ گئے اور طالوت کی طرح ہی پوری قوم نے انہیں اپنا نجات دہندہ تسلیم کر لیا اور ان کے پیچھے چل پڑی۔ ان کی ظاہری اور باطنی خوبیاں بھی طالوت سے ملتی تھیں۔ طالوت کون تھا؟

طالوت ایک عظیم شخصیت تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے گیارہ سو سال پیشتر حضرت سموئیل علیہ السلام کے زمانے میں، بنی اسرائیل کو جنگجو اور جابر قوم عمالقہ کی چیرہ دستیوں اور جور و جبر سے نجات دلائی۔ وہ نبی تو نہیں تھے لیکن ایک ایسے صالح اور پاک باز حکمران تھے جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی حکمرانی اور قیادت کے لیے مامور کیا تھا۔ قرآن مجید میں طالوت کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیات 246 تا 251 میں آیا ہے۔ طالوت کے بارے میں قرآن مجید میں جو تفصیل بیان ہوئی ہے، اس کے مطابق بنی اسرائیل پر تب بہت برا وقت آیا ہوا تھا۔ ان سے تابوت سکینہ

(حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے تبرکات) چھن چکا تھا۔ (عمالقہ کا جابر و ظالم بادشاہ جالوت بنی اسرئیل کو مغلوب کر کے ان کی آبادیوں پر قبضہ کر چکا تھا اور ہزاروں اسرائیلیوں کو گرفتار کر کے غلام بنا چکا تھا)۔ ان سخت برے حالات میں، بنی اسرائیل نے وقت کے نبی حضرت سموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں جس کی قیادت میں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور عمالقہ سے آزادی حاصل کریں۔ پیغمبرؑ نے ان سے کہا کہ حکمران تو مقرر ہو جائے گا لیکن جب جہاد کا حکم دیا جائے گا تو تم لڑنے سے پہلو تہی کرو گے۔ اس پر انہوں نے اصرار کیا کہ وہ جہاد بھی کریں گے کیونکہ ان سے ان کے بال بچے اور وطن چھین لیا گیا ہے۔ بہر حال، پیغمبرؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بنی اسرائیل کے لیے کسی شخص کو حکمران اور لیڈر مقرر کیا جائے۔ طالوت اس وقت ایک گمنام اسرائیلی فرد تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہی بنی اسرائیل کے بادشاہ ہوں گے۔ جب پیغمبرؑ نے اسرائیلیوں کو طالوت کی حکمرانی کے بارے میں خبر دی تو وہ اعتراض کرنے لگے۔ بڑا اعتراض یہ تھا کہ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والوں پر واضح کیا گیا کہ طالوت کو اس لیے ان کا بادشاہ بنایا گیا ہے کہ انہیں دوسروں پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ اس فضیلت کے دو نمایاں پہلو تھے، ایک دماغی اور دوسرا جسمانی، یعنی ایک باطنی اور دوسرا ظاہری۔ قرآنی الفاظ میں یہ فضیلت تھی "**فی العلم والجسم**"۔ دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ "اللہ کے پاس ہی یہ اختیار ہے کہ جسے چاہے حکمران بنا دے" (البقرہ: 247)۔ اس کے بعد طالوت کی من جانب اللہ حکمرانی کے ثبوت یا نشانی کے لیے وہ صندوق (تابوتِ سکینہ) جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے تبرکات تھے، فرشتے بنی اسرائیل کے پاس واپس لے آئے۔ طالوت کی حکمرانی تسلیم کر لینے کے بعد، ان کی قیادت میں بنی اسرائیل، جالوت سے لڑنے کے لیے نکلے۔ راستے میں ایک دریا آیا جس کا پانی پینے سے طالوت نے منع کیا، لیکن بہت ہی کم لوگوں نے ان کی اس ہدایت پر عمل کیا۔ انہی تھوڑے سے لوگوں (ایک روایت

کے مطابق آخر میں صرف تین سو تیرہ افراد رہ گئے تھے جنہوں نے جہاد میں حصہ لیا) نے طالوت کی بہترین قیادت اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے جالوت کے بہت بڑے لشکر کو فیصلہ کن شکست دی ''بسا اوقات ایک قلیل جماعت نے اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے'' (البقرہ:249)۔ لڑائی کے آغاز سے پہلے طالوت اور ان کے ساتھیوں نے اللہ تعالیٰ سے خاص طور پر صبر اور ثابت قدمی کی دعا کی۔ طالوت کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی ایک عام سپاہی (مجاہد) کی طرح شامل تھے۔ عمالقہ کے بادشاہ اور سپہ سالار جالوت کو جس کی غیر معمولی جسامت اور زبردست طاقت سے بنی اسرائیل سخت خوفزدہ تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے قتل کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام ہی، طالوت کے بعد بنی اسرائیل کے حکمران بنے اگرچہ وہ پیغمبر بھی تھے۔ اس قصے کا ایک اہم سبق قرآن مجید نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 251 میں یہ بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے ہٹاتا نہ رہے تو ملک برباد ہو جائیں، یعنی باری تعالیٰ روئے زمین پر کسی کے اقتدار کی اجارہ داری زیادہ تک قائم نہیں رہنے دیتے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھا ہے کہ طالوت کے قصے میں کئی بصیرتیں اور حکمتیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب کسی قوم کی آزادی اور خودمختاری سلب ہوجائے اور اس کو غلام بنانے والی قوم ظلم اور جبر پر اتر آئے تو غلام قوم قدرتی طور پر اپنے حقوق کے دفاع کے لیے افتراق وتشتت چھوڑ کر اتحاد کی کوشش کرتی ہے اور اپنی راہنمائی کے لیے ایک صالح اور لائق لیڈر کی تلاش کرتی ہے۔ آزادی اور تحفظ حقوق کا احساس سب سے پہلے قوم کے خواص میں پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ عوام الناس تک پہنچتا ہے۔ حکمرانی اور قیادت کے لیے نہ حسب ونسب شرط ہے اور نہ مال و دولت بلکہ علمی (ذہنی) اور جسمانی (ظاہری خوبصورتی، توازن اعضا، وقار و حشمت) فضیلت کو اہمیت حاصل ہے۔ ''شجاعت و بسالت اور جرأت حق جو حکومت و قیادت کے لیے ازبس ضروری ہیں، بیشتر **بسطة فی الجسم** کی رہین منت ہیں۔ اس لیے کہ **بسطة فی الجسم** سے یہ مراد

نہیں کہ عمدہ غذائیں کھا کر وہ خوب فربہ اندام ہوگیا ہو بلکہ جسم کی وہ قوت و طاقت مراد ہے جو میدان جہاد میں دشمن کے مقابلے میں ہیبت وسطوت کا باعث اور قوت مدافعت اور جرأت قلب کے ساتھ متصف ہو''۔ ایک اور حکمت کی بات اس قصے میں یہ ہے کہ حق و باطل کے معرکے میں کامیابی اور فتح مندی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں ہوتا۔ قلیل تعداد والوں کے اندر اگر جذبہ سچا اور شدید ہو تو وہ اکثریت پر غالب آسکتے ہیں۔

طالوت کی اعلیٰ ذہنی اور جسمانی خوبیوں کی بنا پر جب انہیں بنی اسرائیل کی قیادت اور حکمرانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا گیا، تب ان کے درمیان ایک پیغمبر (حضرت شموئیل علیہ السلام) بھی موجود تھے، لیکن جس مشن کی تکمیل بہت ضروری تھی، (بنی اسرائیل کی آزادی کی جنگ، ایک خطرناک اور نہایت طاقتور دشمن سے نبرد آزمائی، بنی اسرائیل کی تنظیم اور اتحاد اور اسے ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنا) اس کے لیے طالوت کو ہی ان کی خاص صلاحیتوں کی بنا پر موزوں اور مناسب سمجھا گیا۔ انہوں نے اپنا یہ مشن کامیابی سے مکمل کیا اور فلسطین کے علاقے میں بنی اسرائیل کے پہلے دنیاوی حکمران اور لیڈر بنے۔

طالوت کی طرح قائداعظم بھی برصغیر کے مسلمانوں کی سلطنت کے پہلے حکمران بنے۔ **1937** میں قائم ہونے والی کانگریسی صوبائی حکومتوں کی زیادتیوں، ناانصافیوں اور جور وستم کی کارروائیوں کے خلاف، برصغیر کے مسلمانوں نے مدد اور راہنمائی کے لیے قائداعظم کو پکارا، قائداعظم نے بھی مسلمانوں کی اس پریشان حالی میں بالکل اسی طرح مدد اور راہنمائی کی جس طرح طالوت نے بنی اسرائیل کی، کی تھی، قائداعظم بھی طالوت کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کی دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں اچانک جلاوطنی ختم کر کے ہندوستان پہنچ گئے تھے تاکہ ان کی ابتلا میں ان کی دستگیری کریں۔ فروری **1938**ء میں علی گڑھ کے طلبہ سے وہ یہی بات ان الفاظ میں کہہ رہے تھے: ''جلاوطنی کے چار سالوں کے اختتام پر مجھے پتہ چلا کہ مسلمان سب سے بڑے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے ہندوستان واپس آنے کا پختہ فیصلہ

کرلیا''۔ طالوت کی طرح قائداعظم بھی گویا مسلمانوں کی قیادت کے لیے مامور من اللہ تھے۔لیکن یہاں یہ بتانا شاید مناسب ہو کہ 39-1938ء میں ان کی اس غیر معمولی حیثیت اور غیر معمولی مشن کا ادراک اور احساس کئی اصحاب باطن کو بھی ہو رہا تھا اور وہ ان کی روحانی امداد کے لیے ان سے رابطہ کرنے لگے تھے جبکہ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔مثلاً اپنے وقت کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اسی دور میں قائداعظم پر توجہ دینا شروع کی اور ان سے رابطہ کے لیے اپنے بہت ہی خاص نمائندے ان کی طرف بھیجے جن کے ساتھ قائداعظم کی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایسا ہی ایک وفد قائداعظم سے فروری 1939ء میں دہلی میں ملا اور حضرت تھانوی کا پیغام پہنچایا۔اسی طرح ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ صوفی اور روحانی شخصیت سید محمد ذوقی (ایس ایم ذوقی) نے 1938ء میں قائداعظم میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کی۔ اس وقت ایس ایم ذوقی ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ انہوں نے سرسید احمد خان کا زمانہ دیکھا تھا، مسلم لیگ کی بنیاد 1906ء میں ان کے سامنے رکھی گئی تھی۔ قائد کے نام اپنے خطوط میں وہ خود کو علامہ اقبال جیسا ایک قلندر صوفی اور علی گڑھ کا بزرگ ''اولڈ بوائے'' لکھتے تھے۔ ذوقی صاحب کے خطوط سے زبردست سیاسی بصیرت اور قائداعظم کی کامیابی کے لیے ان کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے 25 فروری 1939ء کے خط میں انہوں نے قائداعظم کو لکھا کہ بطور ایک صوفی اپنے کشف کی بنیاد وہ سمجھتے ہیں کہ تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک شاندار مستقبل (الگ مملکت کی طرف اشارہ) منتظر ہے۔ اگرچہ اس منزل تک رسائی سے پہلے انہیں بڑی قربانیاں (فسادات 1947ء کی طرف اشارہ) دینا ہوں گی۔ یہی ذوقی صاحب قراردادِ پاکستان کو منظور ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے بھی 23 مارچ 1940ء کے مسلم لیگ کے تاریخی جلسے کے ایک کونے میں موجود تھے اور اس موقع پر انہوں نے قائداعظم سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس طرح کے روحانی رابطوں کے اور کئی واقعات بھی ہو سکتے ہیں، جن کا ہمیں علم نہیں۔ ان سب واقعات سے ہمیں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اہل باطن اور اصحاب کشف نے جب اپنی

باطنی آنکھوں سے یہ حقیقت دیکھ لی کہ مسلم لیگ کے سربراہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجبور ومحکوم ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کا مشن سونپا جا چکا ہے تو انہوں نے اپنی پوری توجہ ان کی طرف مبذول کرلی حالانکہ اس وقت علمائے ظاہر کی اکثریت (جمعیت العلمائے ہند اور احرار وغیرہ) کانگریس کی حمایت کر رہی تھی۔ کانگریس نواز علما کا خیال تھا کہ دین کے معاملات میں اگر وہ عوام الناس کی راہنمائی کر سکتے ہیں تو سیاست میں بھی کر سکتے ہیں اور دلیل یہ دی جاتی تھی کہ دین سے سیاست جدا نہیں۔ دین کو یقیناً سیاست سے جدا نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی کام میں زیادہ مہارت اور سوجھ بوجھ ہونا اور بات ہے۔ پیچھے ہم نے قرآن مجید کے حوالے سے لکھا کہ ایک نبی کی موجودگی میں (اللہ کے حکم سے) طالوت کو بنی اسرائیل کا سردار اور بادشاہ بنایا گیا اور ظاہر ہے کہ طالوت کی کمان میں جالوت کے خلاف جہاد کرنے والے لشکر میں وقت کے نبی کے علاوہ کئی علما اور صلحا بھی شامل تھے۔ یہی مثال جید علما کی موجودگی میں قائداعظم کی قیادت کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ جب مولانا شبیر احمد عثمانی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایما پر قائداعظم کو ہندوستانی مسلمانوں کا واحد سیاسی لیڈر تسلیم کرنے کا اعلان کیا تو کانگریس نواز جمعیت العلمائے ہند کے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اس پر انہیں تلخ خط لکھا۔ مولانا عثمانی نے مولانا لدھیانوی کو جواب میں یہی طالوت والی مثال لکھ کر بھیج دی اور کہا کہ اگر حضرت سیموئیل علیہ السلام جیسے پیغمبر کی موجودگی کے باوجود طالوت بنی اسرائیل کی قیادت کر سکتے تھے تو مفسرین قرآن کی موجودگی کے باوجود قائداعظم محمد علی جناح بھی مسلمانوں کی قیادت اور راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ بے شک ''مسٹر جناح عالم نہ سہی لیکن جو آئینی کشتی لڑی جا رہی ہے، اس کے داؤ پیچ سے وہی خوب واقف ہیں''۔ قائداعظم اور طالوت کے درمیان شخصی خصوصیات میں بھی مماثلت تھی۔ طالوت کے بارے میں قرآن مجید میں ہے کہ وہ علم میں فضیلت رکھتے تھے، اس سے مراد ہے، ان کی ذہانت۔ قائداعظم سے زیادہ ذہین لیڈر بھی اس دور میں کوئی نہ تھا۔ اپنی اسی خداداد بصیرت اور ذہانت کی بنا پر وہ ہر فیصلہ

درست انداز میں کر پائے اور گاندھی اور نہرو جیسے چوٹی کے ہندو لیڈران کی گرد کو نہ پہنچ سکے۔ قانون دانی میں بھی ان کا کوئی ہمسر نہ ہوا۔ بے مثال ذہانت کی وجہ سے ہی طالوت، بنی اسرائیل جیسی تفرقہ پسند قوم کو متحد کرنے اور جالوت پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب رہے، دوسری اہم مماثلت جسمی یا ظاہری تھی۔ ایک روایت کے مطابق جب حضرت شموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اصرار پر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان لوگوں کے لیے کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تو غیب سے ایک عصا نمودار ہوا اور انہیں بتایا کہ جس شخص کا قد اس عصا کے برابر ہوگا، وہی خدا کی جانب سے بنی اسرائیل کا حکمران ہوگا۔ بڑے بڑے ممتاز اسرائیلیوں نے اپنے آپ کو اس عصا سے ناپا لیکن کسی کا قد اس کے برابر نہ نکلا۔ بالآخر ایک غریب اسرائیلی طالوت کا قد عصا کے عین مطابق نکلا تو اللہ کے حکم کے مطابق انہیں بنی اسرائیل کا حکمران مان لیا گیا۔ اس روایت کو قرآن مجید کے بیان (**بسطة فی الجسم**) سے ملا کر پڑھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ طالوت ظاہری کشش سے مالا مال تھے اور بارعب بھی تھے۔ جس قدر کسی لیڈر میں ظاہری خوبصورتی، وجاہت اور وقار پایا جاتا ہے، خلق اتنی ہی اس کی تابعداری یا پیروی کرتی ہے۔ طالوت کا قدم عام لوگوں سے زیادہ لمبا تھا لیکن ایک خاص حد تک تاکہ وہ خوبصورت اور پرکشش دکھائی دیں۔ اسی لیے عصا کا پیمانہ مقرر کیا گیا۔ بہت زیادہ یا حد سے زیادہ لمبا قد بھی کشش کھو دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی شخصیت میں وقار اور رعب تھا اور وہ بہت طاقتور اور بہادر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سپاہ کی قلیل تعداد کے باوجود وہ جہاد کے لیے بڑھتے چلے گئے اور جالوت جیسے خوفناک دشمن کو جس کے پاس زبردست فوج تھی، شکست دے دی۔ یہ ان کی قائدانہ صلاحیت کی بدولت اور اللہ کے فضل و کرم سے ممکن ہوا۔ قائداعظم بھی دراز قد تھے، ان کی چال میں ایسا وقار تھا کہ وہ اپنے ساتھ چلتے ہوئے یا کھڑے لمبے قدے لوگوں میں بھی نمایاں اور ممتاز دکھائی دیتے تھے۔ فولادی اعصاب کے مالک تھے، کسی بھی صورت حال میں گھبراتے نہیں تھے۔ **1943**ء میں جب ان پر اچانک قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کے سٹاف نے تو کچھ دیر بعد آ کر مدد کی، جب

کہ انہوں نے کمال جرأت کے ساتھ حملہ آور کا وار بھی روکا اور اس کا مقابلہ بھی کیا۔ قاتلانہ حملے کے فوراً بعد بھی ان کے چہرے پر مکمل اطمینان اور سکون تھا۔ یہ ان کی بے مثال جرأت تھی کہ کروڑوں مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے، اپنوں کی غداریوں، ہندو اکثریت کی طاقت اور بے پناہ اثر ورسوخ اور برطانوی حکومت کی طرف سے زبردست مخالفت کے باوجود وہ ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ تسلیم کرانے میں کامیاب رہے۔ ان کا شخصی رعب اور ہیبت بے مثال تھی اور یہ سب قدرتی تھا۔ ان کے کمرے میں ملاقات کے لیے داخل ہونے سے پہلے نوابزادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر جیسے سینئر لیڈر بھی ویٹنگ روم میں اپنے سوٹ، کالر اور نکٹائی وغیرہ کو درست کیا کرتے تھے۔ جہاں تک جسمانی طاقت کا تعلق ہے، یہ بھی بہت تھی (حالانکہ وہ بظاہر کمزور اور عمر رسیدہ تھے) لیکن حقیقی طاقت ان کی منطق اور استدلال تھا جس کے ذریعے انہوں نے پاکستان کا آئینی مقدمہ جیت لیا۔

ڈاکٹر صفدر محمود

سچ اور صرف سچ بولیں!

ڈاکٹر مبارک علی کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اپنے دامن پر نگاہ ڈالی تو اس میں پاکستان سے محبت اور تحریک پاکستان کے راہنماؤں سے عقیدت نظر آئی، جب ان کے کالم پر نگاہ ڈالی تو اس میں ان کی علمی ''معصومیت'' بلکہ لاعلمی، تعصب اور قائداعظم کے لیے حقارت نظر آئی، جسے وہ اپنی تحقیق قرار دیتے ہیں۔ وہ دراصل پروپیگنڈا ہے جو انھوں نے کانگریسی اور متعصب ہندو لکھاریوں سے مستعار لیا ہے۔ ان کا سارا سورس آف انفارمیشن ولی خان کی کتاب ہے جسے تاریخ جھوٹ کا پلندہ اور غفار خان کی محبت کا شاخسانہ قرار دے چکی ہے۔ پروفیسر وارث میر مرحوم کے ساتھ مکالمے میں ولی خان مان گئے تھے کہ ان کی انفارمیشن اور تحقیق ادھوری ہے لیکن ڈاکٹر مبارک علی نے چالیس برس بعد مردے کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور نوجوان نسلوں کو تحریک پاکستان، قرارداد لاہور اور قائداعظم سے بدظن کر کے ان کے قومی اعتماد کو کمزور کرنے کی جسارت کی ہے۔ انھیں شکایت ہے کہ انھیں بھارتی ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے اور ان کے خلاف اشتعال دلایا جاتا ہے، جب وہ قائداعظم کو انگریزوں کا ایجنٹ اور قرارداد لاہور کو وائسرائے ہند کا ظفر اللہ خان سے لکھوا کر دیا گیا ڈرافٹ کہیں اور کوئی معتبر ثبوت دینے کے بجائے ٹامک ٹوئیاں ماریں تو لوگ انھیں کیا کہیں گے؟ جب وہ ٹیلی وژن کے

پروگرام میں ڈاکٹر مسعود اور مجیب الرحمٰن شامی کے ساتھ بیٹھ کر لاکھوں ناظرین کے سامنے کہیں کہ اگر میں 46-1945ء کے انتخابات کے وقت ووٹ دینے کا اہل ہوتا تو قیام پاکستان کے خلاف ووٹ دیتا، میرے اور سجاد میر کے ساتھ ٹی وی مذاکرے میں قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے میں ناکامی پر مسلمانان پاکستان کو مشورہ دیں کہ ''ہمیں قرآن سے بالاتر ہوکر سوچنا چاہیے'' تو سوچیں کہ لوگ کیا تاثر لیں گے، جب حکومت ہندان کو بڑا اعزاز دے اور وہ اپنی بیٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کو منتخب کریں اور بیٹی کو Residence Card ایڈوانی کی سفارش پر ملے تو ان کو پاکستانی ایجنٹ بہرحال نہیں سمجھا جائے گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ بیس کروڑ پاکستانیوں میں سے بھارتی ایجنٹ کا اعزاز صرف چند ایک کو نصیب ہوا ہے، بھلا کیوں؟ اس میں کچھ قصور ان کا بھی ہوگا؟ تحریک پاکستان اور قائداعظم پر سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان مصنفین میں عالمی سطح کے برطانوی، امریکی، فرانسیسی، سویڈش اور پاکستانی مورخین شامل ہیں۔ سب نے قائداعظم کی عظمت کردار، بصیرت اور مستقل مزاجی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ والپرٹ کہتا ہے کہ موجودہ تاریخ میں اتنا عظیم لیڈر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان عالمی سطح کے غیر ملکی مورخین میں سے کسی کو ظفراللہ خان کے قرارداد پاکستان سے تعلق کا اشارہ تک نہیں ملا جو ولی خان کے ذریعے ڈاکٹر مبارک تک پہنچا ہے۔ ولی خان کی کتاب کے جواب میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں پنجاب یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر اکرام علی ملک بھی شامل ہیں اور شریف الدین پیرزادہ کی تحقیقی اور حوالہ جاتی کتاب بھی موجود ہے۔ ان مصنفین نے ولی خان کے دعوؤں کی تردید کی ہے لیکن ڈاکٹر مبارک علی نے ان میں سے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔ انھوں نے قائداعظم کی تقاریر بھی نہیں پڑھیں جو تحقیق کے حوالے سے اولین سورس کا درجہ رکھتی ہیں، نہ انھوں نے مسلم لیگ کا ریکارڈ دیکھنے اور اس میں موجود قرارداد لاہور پر نظر ڈالنے کی زحمت کی ہے۔ اسے ان کی علمی معصومیت نہ کہا جائے تو اور کیا نام دیا جائے گا۔ بس آ جا کے انھیں ڈاکٹر اشتیاق احمد ملا ہے جس کا شمار چند مخالفین پاکستان و قائداعظم میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر

اشتیاق نے انھیں ٹرک کی بتی کے پیچھے لگاتے ہوئے پرویز پروازی کی کتاب کا حوالہ تھما دیا ہے۔ پرویز صاحب احمدی (قادیانی) جماعت کے رکن ہونے کے سبب قیام پاکستان کا کریڈٹ لینے کی کوشش میں ظفراللہ خان کو قرارداد پاکستان کا مصنف قرار دے چکے ہیں جبکہ خود ظفراللہ خان اخباری بیان میں اس سے انکار کر چکے ہیں۔ بحیثیت محقق سوچیے کہ پروازی کا دعویٰ اہم ہے یا خود سر ظفراللہ خان کا اپنا بیان۔ خدا کا خوف کیجیے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی فروعی باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کے اصل الزام کی تاریخی مواد کی بنا پر تردید آج کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر عائشہ کے نقطۂ نظر کا نہایت علمی اور تحقیقی جواب پروفیسر ڈاکٹر سکندر حیات اپنی دو کتابوں قائداعظم (آکسفورڈ پریس) اور ''تحریک پاکستان کے اہم شعبے'' (انگریزی) میں دے چکے ہیں اور میں بھی تاریخی حوالوں سے ان کے نقطۂ نظر کو غلط ثابت کر چکا ہوں۔ جہاں تک قرارداد پاکستان کے ڈرافٹ کا کریڈٹ ظفراللہ خان کو دینے کا تعلق ہے، اس کی تردید خود ظفراللہ خان 25 دسمبر 1981ء کو ایک نیوز ایجنسی کو دیئے گئے بیان میں کر چکے ہیں اور یہ بیان 25 دسمبر 1981ء کو قیام پاکستان کے 34 برس بعد تمام اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ اس بیان میں ظفراللہ خان نے جھنجھلا کر کہا کہ نجانے ولی خان مجھے اس کارنامے کا کریڈٹ کیوں دے رہے ہیں جس سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔ انھوں نے واضح کیا کہ ''میں نے وائسرائے لنلتھگو کے کہنے پر ایک اسکیم بنائی تھی جس میں متحدہ ہندوستان کے اندر فیڈریشن کا تصور دیا تھا۔ اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ اسکیم پروفیسر اکرام کی کتاب میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ مسلم لیگ ریکارڈ کے مطابق قرارداد لاہور ڈرافٹ کرنے کے لیے سر سکندر حیات، ملک برکت علی اور نواب اسماعیل خان پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے تیار کردہ ڈرافٹ پر سبجیکٹ کمیٹی نے قائداعظم کی صدارت میں 23 مارچ کو سات گھنٹے بحث کی۔ یہ ڈرافٹ مسلم لیگ آرکائیوز میں موجود ہے۔ اس میں علی محمد راشدی، محمد نعمان، ظہیر الدین فاروقی، مشتاق گورمانی، حسین امام، زیڈ ایچ لاری، رضوان اللہ، عبدالحمید خان، نواز آف چھتاری، عزیز

احمد اور عاشق حسین بٹالوی وغیرہ نے ترامیم تجویز کیں۔ خود قائداعظم کے اپنے ہاتھ سے لکھی ترمیم بھی قرارداد پہ دیکھی جا سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ڈرافٹ وائسرائے کی طرف سے آیا تھا تو یہ ترامیم ہوا میں کی جا رہی ہیں۔ یہ ساری کارروائی مسلم لیگ ریکارڈ میں موجود ہے جو ڈاکٹر مبارک اور ان کے علمی مریدوں کے دعوؤں کو باطل ثابت کرتی ہے۔ ایک بات شواہد سے ثابت ہو چکی کہ قرارداد کا ظفراللہ خان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ بنیادی مسودہ کس نے تیار کیا جس میں ڈھیروں ترامیم کی گئیں اور مسلم لیگ کے بہترین دماغ سات گھنٹے اس پر غور کرتے رہے۔ ڈاکٹر مبارک کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مسلم لیگ ریکارڈ کے مطابق 19 اپریل 1940ء بروز جمعہ مسلم لیگ نے قومی سطح پر یوم قرارداد لاہور منایا۔ فروری 1941ء میں مسلم لیگ نے ہر سال 23 مارچ کو قرارداد پاکستان منانے کا فیصلہ کیا جس کی تفصیل ریکارڈ کے علاوہ قائداعظم کی تقاریر میں بھی موجود ہے۔ مارچ 1941ء میں مسلم لیگ نے ہفتہ پاکستان لاہور میں منایا، قائداعظم نے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں جھنڈا لہرایا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تحت سیمینار کی صدارت کی جس میں واضح کیا کہ قرارداد پاکستان سودے بازی کے لیے نہیں بلکہ مطالبہ پاکستان ہمارے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہے، چنانچہ 23 مارچ ہر سال اہتمام سے منایا جاتا رہا اور جب پاکستان ری پبلک بنا تو اسے یوم پاکستان قرار دے دیا گیا۔ (بحوالہ شریف الدین پیرزادہ، **Evolution of Pakistan**، ہفتہ پاکستان اور قائد کے بیان کے لیے ملاحظہ فرمائیں قائداعظم کی تقاریر، جلد 2، مرتبہ خورشید یوسفی صفحہ 1339)

پروفیسر اکرام کی کتاب میں قرارداد پاکستان کے ردعمل کے حوالے سے وائسرائے اور برطانوی سیکرٹری آف اسٹیٹ کی خط و کتابت کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ برطانوی حکومت کس قدر ناراض تھی اور قرارداد لاہور کو کس طرح تختہ مشق بنا رہی تھی، اگر قرارداد لنلتھگو نے بھجوائی تھی تو پھر اس قدر غم و غصہ چہ معنی۔ یہ خطوط ٹرانسفر آف پاور میں موجود ہیں۔ برطانوی حکومت نے 23 مارچ کا جلسہ

ملتوی کروانے کے لیے جو کوششیں کیں، ان کے ثبوت بھی پیرزادہ کی کتاب میں موجود ہیں۔ آخری سوال یہ ہے کہ قرارداد کس نے ڈرافٹ کی۔ یہ ایک معتبر لیڈر کا پنجاب اسمبلی میں دیا گیا بیان ہے جس پر نہ شبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی مسلم لیگ نے تردید کی۔ 11 مارچ 1941ء کو سر سکندر حیات پرئمیر پنجاب نے اسمبلی میں بیان دیا کہ ''قرارداد لاہور میں نے ڈرافٹ کی تھی لیکن ورکنگ کمیٹی نے ترامیم کر کے اسے یکسر تبدیل کیا''۔ سر سکندر نے متحدہ ہندوستان کے اندر فیڈریشن کی بنیاد پر قرارداد بنائی تھی لیکن ورکنگ کمیٹی نے تقسیم ہند اور مکمل آزادی کی قرارداد بنا دی۔ سر سکندر ایسی تجویز سے اتفاق کر کے وائسرائے اور برطانوی حکومت کو ناراض نہیں کر سکتے تھے اور یہی وجہ تھی ان کی لاتعلقی کی جس کے بارے ڈاکٹر مبارک بار بار پوچھتے ہیں۔ کالم کی تنگ دامنی کے پیش نظر میں نے فروعی اور غیر متعلق باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف یہ واضح کیا کہ قرارداد پاکستان مسلم لیگ کی اپنی قرارداد تھی۔ جب ظفراللہ خان اس سے انکاری ہے اور ڈرافٹ تیار کرنے والا اسمبلی کے فلور پر تسلیم کر رہا ہے تو پھر لنلتھگو سے اس کا رشتہ جوڑنا چہ معنی دارد؟

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

قائداعظم، قرارداد پاکستان اور سر ظفراللہ

یادش بخیر مرحوم ہفت روزہ ''چٹان'' نے ایک زمانے میں سیاست دانوں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں خان عبدالولی خان کا انٹرویو بھی شائع کیا گیا۔ 21 دسمبر 1981ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اس انٹرویو نے کچھ ایسے مباحث کو جنم دیا جن سے بعض عناصر وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خان عبدالولی خان صاحب نے تحریک حریت سے متعلق اپنی کچھ تحقیقات پیش کرنا شروع کی تھیں۔ انھوں نے یہ ''انکشاف'' کیا کہ برطانوی وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے کہنے پر سر ظفراللہ نے ایک یادداشت لکھی اور ''مسلم لیگ نے یہی منصوبہ لاہور میں قرارداد پاکستان کے نام سے اپنے سالانہ اجلاس میں منظور کرلیا'' اس انٹرویو کی اشاعت سے ایک طویل بحث نے جنم لیا اور اس کے ایک عرصے کے بعد خان عبدلولی خان صاحب نے اپنے نتائج فکر ایک کتاب کی صورت میں پیش کردیے جس میں قرارداد پاکستان کے بارے میں محولہ بالا خیالات دہرائے گئے۔

(خان عبدالولی خان، حقائق حقائق ہیں راولپنڈی: دیرہاؤس 1988ء ص 60، 61)

ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے امسال یوم پاکستان کے موقع پر انھی خیالات کو اپنی تحقیق کے طور پر پیش کردیا جس پر تفصیلی بحث قارئین کرام ہمارے گزشتہ کالم میں

ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہمارے کالم کی اشاعت کے بعد جناب منیر احمد منیر نے ڈاکٹر مبارک علی صاحب کی تردید کرتے ہوئے سر ظفر اللہ سے اپنی ملاقات اور اس ملاقات میں قرارداد پاکستان کے حوالے سے ہونے والی گفتگو نقل کی ہے جس کے مطابق ولی خان صاحب کی جانب سے پیدا کیے گئے خلط مبحث پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے چودھری ظفر اللہ خان نے کہا: ''وائسرائے نے مجھ سے تقسیم کی مختلف تجاویز پر تجزیہ وتبصرہ مانگا، وہ میں نے دے دیا۔ میرا 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں'' (کالم'' آتش فشاں'' روزنامہ ''دنیا'' لاہور 7 اپریل 2017ء) اس سے پہلے سید شریف الدین پیرزادہ، سر ظفر اللہ کا ایک بیان نقل کر چکے ہیں جس کا حوالہ ہم نے بھی اپنے گزشتہ کالم میں دیا ہے۔ سید شریف الدین پیرزادہ صاحب نے سر ظفر اللہ کا یہ بیان انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کی اشاعت 21 دسمبر 1981ء کے حوالے سے نقل کیا ہے (Evolution of Pakistan Karachi 1995 P 208) اور یہی تاریخ ڈاکٹر صفدر محمود صاحب نے درج فرمائی ہے (روزنامہ جنگ لاہور 31 مارچ 2017ء) ہم نے روزنامہ ''ڈان'' کی فائلوں میں 21 دسمبر 1981ء کا شمارہ تلاش کیا تو اس میں اس نوعیت کی کوئی تحریر موجود نہیں پائی گئی۔ بارے تلاش جاری رہی اور بالآخر ہم یہ حوالہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان سطور کے ذریعے اس اہم تاریخی حوالے کی تصحیح کی جارہی ہے کہ قرارداد پاکستان کے حوالے سے سر ظفر اللہ کا تردیدی بیان 21 دسمبر 1981ء کو نہیں بلکہ روزنامہ ''ڈان'' کے 25 دسمبر 1981ء کے شمارے میں شائع ہوا اور پیرزادہ صاحب کی کتاب میں یہ بیان پورے طور پر نقل بھی نہیں ہو سکا ہے، درآنحالیکہ اس میں سر ظفر اللہ کے نوٹ کی، قرارداد پاکستان میں شمولیت کے امکان کو کلی طور پر مسترد کرتے ہوئے جو دلائل دیے گئے ہیں، وہ خاصے وقیع ہیں۔ ذیل میں ہم اس بیان کا متن پیش کر رہے ہیں جو روزنامہ ''ڈان'' میں Zafarullah denies submitting any partition formula کے زیر عنوان شائع ہوا:

Chaudhri Sir Mohammad Zafar ullah Khan

has denied having ever presented a formula of dividing the sub-continent to the then Viceroy of India and requested Wali Khan to submit proofs of his assertions, if any, a local daily reported.The reaction was sought with reference Mr. Wali Khan's disclosure that Zafarullah Khan, in his capacity as adviser to the then British Viceroy of India, was the original author of the partition. Vehemently refuting it, Sir Zafarullah, now in Lahore, stated that he only gave opinions to the Viceroy, whenever asked to do so. All these opinions or suggestions were totally confidential. It is, therefore, unthinkable that his opinions were passed on to the Quaid-e-Azam by the British Government and the later accepted it without any hesitation.

Again, even if it is true that he did suggest some formula to the Viceroy, which may later have formed part of the Objectives Resolution, it was unimaginable that a formula initiated on March 12, was incorporated on March 23, during those days it took more than two weeks for a communication to reach India from England because of the postal delays.He said most of his suggestions were made in 1942, the most important being the larger representation to the Indians in the Council. This suggestion could not be implemented because of the hunger strike resorted to by Mr. Gandhi.He asserted that if Wali Khan had found something sensational in the India Office Library., he could have done well to note it down and reproduced the

whole formula verbatim in Pakistan.(PPI)

اس بیان کی اشاعت سے دودن قبل پروفیسر وارث میر مرحوم نے مدیرآتش فشاں جناب منیراحمد منیر کے ہمراہ سرظفراللہ سے ان کی رہائش گاہ واقع لاہور کینٹ میں ملاقات کر کے اس موضوع پر گفتگو کی تو انھوں نے واضح طور پر ولی خاں صاحب کے بیان کی تردید کی اور بہ قول منیراحمد منیر یہ کہا کہ ولی خان مجھے قرارداد پاکستان کا جھوٹا کریڈٹ دینے پر کیوں مُصر ہیں؟

ڈان میں سرظفراللہ کے تردیدی بیان کی اشاعت کے بعد ایک دوسرے انگریزی روزنامے ''پاکستان ٹائمز'' نے اپنی 23 جنوری 1982ء کی اشاعت میں سر ظفراللہ کے اس نوٹ کا مکمل متن شائع کردیا جو انھوں نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی فرمائش پر تیار کیا تھا اور اس نوٹ کا عنوان **Zafarullah's note give Wali Khan the lie** قائم کیا۔ اس طول طویل نوٹ کے ساتھ جو اخبار کے دوصفحات کو محیط ہے، لارڈ لنلتھگو کی وہ تحریر بھی شائع کی گئی جو اس نوٹ کے حوالے سے زیٹلینڈ کو لکھی گئی تھی۔ اس تاریخی دستاویز کی اشاعت کے بعد معاملہ واضح ہوگیا۔ مزید وضاحت وصراحت زیڈ اے سلیری کے ایک مضمون نے کردی جو پاکستان ٹائمز ہی کی اشاعت 29 جنوری 1982ء میں **Paint Me As I Am** کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ ایک طویل مضمون تھا جس میں مضمون نگار نے سرظفراللہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی نسبت لکھا:

Zafarullah envisaged an all India federation, while Pakistan signified two states Zafarullah wanted one Indian state Akhand Bharat

اس مضمون کی اشاعت پر سرظفراللہ نے اپنا تحریری ردعمل ظاہر کرنا ضروری سمجھا اور انھوں نے روزنامہ پاکستان ٹائمز کو ایک مفصل تحریر ارسال کی جسے اخبار نے **Ch. Zafarullah Khan explains** کے عنوان کے تحت 13 فروری 1982ء کو شائع کیا۔ اس تحریر کا آغاز قائداعظم کی خدمات کے اعتراف سے کیا گیا اور

اپنے بارے میں قائداعظم کے اعتماد کی تفصیلات پیش کی گئیں لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے ان کے قلم سے یہ الفاظ تراوش ہوئے:

The separation scheme set out in the note was most certainly not rejected by me. As will presently appear. I set it forth as the only satisfactory and acceptable solution of the constitutional problem. (Note to Linlithgow: Ch Zafarullah Khan explains The Pakistan Times Lahore 13 February 1982)

سرظفراللہ نے معاملے کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

Lord Linlithgow had nothing whatever to do with the preparation or contents of my note, the entire responsibility for which rests on me. I may conclude with the observation that the fact that I had spelt out the scheme of the North eastern and North western federations in my note, does not diminish by one iota the credit due to the Quaid e Azam alone for the achievement of Pakistan.

گویا سرظفراللہ جو اب تک قرارداد پاکستان سے اپنے تعلق کی تردید کرتے رہے تھے، اب اس سے اپنے نوٹ کا رشتہ جوڑنے پر مائل دکھائی دینے لگے۔اس پر پروفیسر وارث میر مرحوم نے گرفت کی اور ''تصور پاکستان اور پان اسلامی سازش'' کے زیرعنوان سرظفراللہ کے محولہ بالا موقف پرتنقید کرتے ہوئے لکھا کہ ''انھوں نے جوابی حملے میں ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور قانون دان کی ساری ''فن کاریوں'' کو استعمال کر ڈالا''۔ پروفیسر وارث میر نے اپنے ساتھ ہونے والی گفتگواور سرظفراللہ کے مضمون میں پیش کیے گئے موقف میں پائے جانے والے تفاوت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑی

تکلیف اور حیرت کے ساتھ لکھا کہ ''سب سے پہلی اور بڑی حقیقت تو یہی ہے کہ بڑے سے بڑا شخص بھی تضاد بیانی سے کام لے سکتا ہے''۔ (روزنامہ نوائے وقت 16 اپریل 1982ء بحوالہ ''وارث میر کا فکری اثاثہ'' مرتبہ عامر میر لاہور: جنگ پبلشرز 2004ء جلد دوم ص 256، 257)

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سر ظفر اللہ کے نوٹ کا قرارداد پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا جیسا کہ خود ظفر اللہ خان نے اپنے بیان میں اس امر کی تردید کرتے ہوئے ان واقعات کے زمانی تناظر میں اس بات کو ناممکن الوقوع قرار دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی اس بات پر مُصر رہے کہ قرارداد پاکستان سر ظفر اللہ کی تخلیق تھی تو ایسے اصحاب کی خدمت میں قول سعدی ہی پیش کیا جا سکتا ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمہ آفتاب را چہ گناہ

محمد حنیف شاہد

ختم نبوت اور قائد اعظمؒ

قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی ذات پر بعض حلقے تنقید و تنقیص کرتے رہتے ہیں اور قابل افسوس یہ بات ہے کہ وہ مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی بنیادی وجہ ان لوگوں کی غلط فہمی، کم علمی اور کم فہمی ہے کہ انھوں نے قائد اعظم کی شخصیت اور سیرت و کردار کا دلجمعی اور صدق دل سے مطالعہ نہیں کیا۔ اگر وہ دلچسپی اور ایمانداری سے آپ کے ارشادات، افکار اور نظریات کا مطالعہ کرتے تو ان کی غلط فہمی ختم ہو جاتی۔

ہم قائد اعظم کی زندگی کے ابتدائی تیرہ سال کے دوران ان کی اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور اسلامی اداروں سے محبت اور شیفتگی کے حوالے سے بنیادی معلومات کا ذکر کرتے ہیں جن سے بڑی آسانی سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان تھے۔ پہلے وہ مسلمان تھے باقی سب کچھ بعد میں۔

قائد اعظم ایک اسلامی گھرانے میں 25 دسمبر 1876ء کو پیدا ہوئے اور آپ کا نام محمد علی رکھا گیا۔ آپ نے قرآن کریم کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ

4 جولائی 1887ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل ہوئے، پھر آپ بمبئی تشریف لے گئے اور آپ کی خالہ نے آپ کو انجمن اسلام سکول بمبئی میں داخل کروا دیا۔ اس کے بعد آپ 23 دسمبر 1887ء کو از سرِ نو سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل ہوئے۔

نومبر 1892ء کے پہلے ہفتے میں آپ کاروباری تعلیم کے لیے گراہمز شپنگ اور ٹریڈنگ کمپنی لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ 5 جون 1893ء کو آپ نے لنکنز اِن میں داخلہ لیا۔ یہ روایت قابل قدر اور غور طلب ہے کہ آپ نے لنکنز اِن میں داخلہ صرف اور صرف اس وجہ سے لیا کہ اس کے صدر دروازے پر دنیا کے چوٹی کے قانون دانوں میں سرفہرست حضرت محمد ﷺ کا نام نامی مکتوب تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ لندن میں چار لا سکولز تھے لیکن آپ نے ان میں سے لنکنز اِن کا انتخاب کیا۔ 14 اپریل 1896ء کو آپ نے اپنا نام محمد علی جناح بھائی تبدیل کر کے محمد علی جناح رکھا۔ 29 اپریل 1896ء کو آپ نے بار ایٹ لا کر لیا۔ اگست 1896ء کے پہلے ہفتے میں آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے اور 24 اگست 1896ء کو آپ نے بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا نام رجسٹر کروالیا تا کہ بطور ایڈووکیٹ وکالت کر سکیں۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ محمد علی جناح نے سب سے پہلے جس اجلاس میں شرکت کی، وہ ''انجمن اسلام'' کا اجلاس تھا جو جسٹس بدرالدین طیب جی، جج بمبئی ہائی کورٹ کی صدارت میں 8 جولائی 1897ء کو بمبئی کالج ہال میں منعقد ہوا۔

محمد علی جناح کی ابتدائی سیاسی زندگی کا قابل قدر واقعہ جسے ہم ''کارنامہ'' کہہ سکتے ہیں، وہ انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ''قانون محمدی ﷺ'' جو ''وقف علی الاولاد بل'' کے نام سے معروف ہے، ایک قرارداد کی صورت میں پیش کیا اور اسے منوایا۔

اس ضمن میں آپ کے سیکرٹری مطلوب الحسن کا بیان قابل توجہ ہے۔ ان کا کہنا ہے:

"In this memorabel session of the Congress, held in Calcutta, was present Mohammad Ali Jinnah, known to be acting as PRIVATE SECRETARY to

Dadabhai Naoroji. He was already reckoned as a "rising lawyer" and a coming "politician". For, true to his early teaching, and fired no doubt by the virile patriotism of man like the lion - hearted Pherozsbah Mehta and the indomitable Gokhale, he had long already joined the ranks of the National Congress and regularly attended its annual gatherings. Incidentaly, it is interesting to note his "maiden speech' at this National Assembly was made in connection with "WAKF-ALAL-AULAD"-- a message that was later to bring his 'NAME' into such "Prominence."

یہی وہ ''قانون محمدی ﷺ'' ہے جس کو آپ نے قانونی حیثیت دینے کے لیے **1911**ء میں پریوی کونسل میں پیش کیا اور پھر **1913**ء میں اپنی قانونی قابلیت اور زبردست قوت استدلال کی مدد سے یہ بل منظور کروالیا اور وائسرائے ہند نے بھی اس کی توثیق کردی۔ جب یہ بل منظور ہو گیا تو محمد علی جناح کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ مبارکباد دینے والوں میں سرفہرست مسز سروجنی نائیڈو تھیں۔ ان کے بقول ''اس کارنامے کے باعث پہلی مرتبہ محمد علی جناح کو سارے ملک کے مسلمانوں کا اعتراف میسر آیا۔ اس کارنامے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کے اکثر ہم مذہب سیاسی مشورے اور راہنمائی کے لیے ان سے رجوع کرنے لگے۔

آپ کے دل میں مسلمانان ہند کے لیے ایک ''نرم گوشہ'' **(Soft Corner)** تھا جس کا خصوصی طور اظہار پر وہ **26** تا **29** دسمبر **1906**ء کو منعقد ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں کر چکے تھے جس میں آپ دادابھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے شریک ہوئے، لیکن **8** جنوری **1907**ء کو آپ جب انڈین مسلمز ایسوسی ایشن **(Indian Muslims Association)** کے وائس پریذیڈنٹ (نائب صدر) منتخب ہوئے تو آپ نے کلکتہ میں ایک میٹنگ کا اہتمام کیا

تاکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ دست تعاون بڑھا کر مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی ترقی کے لیے راہیں نکالی جائیں، نیز مسلم فرقے کی خصوصی تکالیف اور ان کے مفادات اور مطالبات کا حل تلاش کیا جائے۔

فروری 1907ء کے آغاز میں آپ انجمن ضیا الاسلام بمبئی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے جس کے نتیجے میں آپ نے مولانا محمد علی جوہر کی معیت میں انجمن ضیا الاسلام کی وساطت سے متعدد دوسری انجمنوں سے روابط استوار کیے۔ 8 اکتوبر 1907ء کو محمد علی جناح نے انجمن ضیا الاسلام بمبئی کے اجلاس میں شرکت کی اور جو مختلف امور زیر بحث آئے، ان پر رائے زنی کی۔

1935ء کے آغاز میں ''ختم نبوتؐ'' کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا۔ اسی زمانے میں علامہ سر محمد اقبال نے ''اسلام اور قادیانیت'' کے حوالے سے اخبار ''لائٹ'' اور ''سٹیٹس مین'' (10 جون 1935ء) کے نام مکاتیب کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب (محررہ 21 جون 1936ء) اور ''اسلام اور احمدیت'' (مطبوعہ جنوری 1936ء) اور "Jewish Integrity Under Forman Rule" (محررہ 22 جون 1935ء) تحریر فرمائے۔ پنڈت نہرو کے نام مکتوب میں آپ نے دو ٹوک الفاظ میں لکھا:

"I have no doubt in my mind that the 'Ahmadis' are 'Traitors' both to 'Islam' and to India."

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ان دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جو انجمن کی جنرل کونسل کے رکن تھے اور قادیانی تھے، انجمن کے اجلاس کے دوران حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ جب انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس میں مسئلہ ختم نبوتؐ اٹھا تو علامہ اقبال نے یہ تحریک پیش کی کہ ''انجمن حمایت اسلام واضح اور غیر مبہم طور پر اعلان کرے کہ آئندہ انجمن کا کوئی رکن قادیانی نہیں ہوگا۔ نیز یہ کہ انجمن ''ختم نبوتؐ'' کے حوالے سے اپنی پالیسی کا اعلان خصوصی طور پر اخبارات میں کرے۔''

چنانچہ جنرل کونسل نے 2 فروری 1935ء کو اخبارات کے لیے جو اعلان ارسال کیا اس میں لکھا:

- ''دین حقہ اسلام کے قبول کرنے والوں کا نام حضرت ابراہیمؑ نے ''مسلم'' رکھا۔ یہی اسلام خاتم النبیین، افضل المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت کے ساتھ مکمل اور کامل ہو گیا اور ہدایت کی نعمت خدائے پاک کی طرف سے اس پیغام کے ساتھ مکمل ہو گئی جو رسول مقبول ﷺ کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچایا گیا اور جس کا نام ''قرآن مجید'' رکھا گیا۔ قرآن اور مسلمانوں کی دینی تاریخ...... اس امر کی شاہد ہیں کہ مسئلہ ''ختم نبوت'' دین اسلام کا ایک اساسی اصول ہے اور تمام اسلامی فرقے اس امر پر متفق ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے ساتھ دین مکمل ہو گیا اور اصول خاتمیت کی کوئی تاویل گوارا نہیں کی جا سکتی۔ سب فرقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی ہستی پیغمبر عربی ﷺ کے بعد دنیا میں بحیثیت نبی ظاہر نہیں ہو سکتی اور خواہ ان کے مابین کتنے ہی ضمنی یا فروعی اختلافات کیوں نہ ہوں، وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی خاتمیت کے قائل ہونے کی حیثیت سے قرآن پاک کو آخری وحی ماننے کی حیثیت سے اسلام کا جزو ہیں۔ انجمن حمایت اسلام اپنے دائرے میں ہر ایسے مسلمان کو لیتی رہے گی۔''

اسی زمانے میں سید سرور شاہ گیلانی ناظم تحریک تنظیم مساجد لاہور نے ''ختم نبوت'' کے حوالے سے برصغیر کی نامور اور مقتدر شخصیات کی طرف سے نہ صرف بیانات جاری کروائے بلکہ ان کے لیکچروں کا اہتمام بھی کیا اور بعدازاں ان لیکچروں کو کتابچوں کی صورت میں تحریک کی جانب سے شائع کیا۔ ان میں سرفہرست نام محمد علی جناح کا تھا۔ ترتیب حسب ذیل ہے:

- رحمت للعالمین ﷺ از محمد علی جناح
- میر حجازؐ از مولانا ظفر علی خاں
- ختم نبوت از علامہ ڈاکٹر محمد اقبال / علامہ عبداللہ یوسف علی اور مرزا سر ظفر علی جج پنجاب ہائی کورٹ لاہور

- سرورِ دو عالمؐ از ڈاکٹر محمد عالم بار ایٹ لاء
- نورِ کاملؐ از علامہ عبداللہ یوسف علی
- ظہور قدسیؐ از چودھری افضل حق
- پیغمبرؐ اسلام از چودھری چھوٹو رام

''رحمت للعالمین'' جیسا کہ فہرست سے مترشح ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ وہ تقریر سیرت ہے جو محمد علی جناح (اس وقت قائداعظم کا خطاب آپ کے نام کے ساتھ نہیں لگا تھا) نے انگریزی میں پیش کی لیکن بعد ازاں سید سرور شاہ گیلانی، ناظم تحریک تنظیم مساجد لاہور نے اس کا اُردو ترجمہ کتابچے کی صورت (مشتمل بر سولہ صفحات) میں شائع کیا۔

سید سرور شاہ گیلانی (علیگ) نے یہ سلسلۂ تقاریر اس وقت شروع کیا جب تحریک ختم نبوت ﷺ زوروں پر تھی، نیز فتنۂ قادیانیت بھی ملت اسلامیہ کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا اور سادہ لوح مسلمان اس کا شکار ہو رہے تھے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زیرِ نظر تقریر ''سیرت رحمت للعالمین ﷺ'' کے آخری پیرا میں آقائے نامدار، سرور دوجہاں، حضور اکرم ﷺ کو ''پیغمبر آخر الزماں ﷺ'' اور ''رحمت للعالمین ﷺ'' کے معزز القابات سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

- ''حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کے مختلف حصوں اور وقتوں کے لیے انبیائے کرام تشریف لاتے رہے۔ ان کی تعلیم عالمگیر نہ تھی اور عالمگیر ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں ابھی بہت وقت درکار تھا۔ بالآخر ہمارے ہادی عالم ﷺ کا ورود مقدس اس وقت ہوا جب دنیا ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے وہ حقائق و معارف کے تمام امور سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس لیے ہمارے ''پیغمبر آخر الزماں ﷺ'' کو ''رحمت اللعالمین'' کے معزز لقب سے خالق اکبر نے سرفراز فرمایا۔''

یہ عجیب اتفاق یا حسن اتفاق ہے کہ فروری 1936ء میں بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام لاہور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ تحریک پیش کی کہ ''انجمن واضح اور غیر مبہم

الفاظ میں اعلان کرے کہ آئندہ انجمن کا کوئی رکن قادیانی نہیں ہوگا۔''

مئی 1944ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے اس ضمن میں اپنے مؤقف کی وضاحت بذریعہ مکتوب مرقومہ 5 مئی 1944ء کے ذریعے کر دی تھی لیکن 10 جون 1944ء کو سری نگر سے مسلم لیگ اور قادیانیوں کے بارے (رکنیت مسلم لیگ) میں حسب ذیل بیان اخبارات کو جاری کرنا پڑا۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی قادیانی مسلم لیگ کا رکن نہیں بن سکتا۔ آپ نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا:

❑ ''میں نے دیکھا ہے کہ اخبارات کے بعض حلقوں میں پھر اکبر علی ایم ایل اے کے ساتھ میری ملاقات کے ضمن میں بہت سے الجھاؤ پیدا کیے جا رہے ہیں اور غلط ترجمانی ہو رہی ہے۔ میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی ملاقات کے دوران ان پر پھر یہ واضح کر دیا تھا کہ جہاں تک آل انڈیا مسلم لیگ کا تعلق ہے، ہم اپنی تنظیم کے دستور کی (متعلقہ) شق کے تابع ہیں اور میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ اس بات کی نشاندہی کروں کہ اپنے دستور کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ کی ابتدائی شاخ کی رکنیت کے امیدوار کو مسلمان ہونا چاہیے، وہ برطانوی ہند کا باشندہ ہو اور اس کی عمر 18 برس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے ناظر امور عامہ خارجہ، قادیان کا مکتوب موصول ہونے پر کسی ایسی بات سے اتفاق کیا ہو کہ دستور سے انحراف کرنا میرے اختیار میں ہے۔ میں نے اپنے مکتوب مرقومہ 5 مئی 1944ء میں اپنے مؤقف کی وضاحت کر دی تھی۔''

علامہ اقبال اور قائداعظم کے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں زعما منکرین ختم نبوت قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔

۞......۞......۞

نیّر زیدی

قائداعظم اور قادیانیت

چودھری ظفراللہ خان نے قائداعظم کی نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے میں نے بارہا سنا، ناقابل یقین پایا اور اس پروپیگنڈے کا حصہ سمجھا جو بعض اقلیتی فرقوں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مجھے اس کی تصدیق کی بھی جستجو تھی۔ چودھری صاحب سے کبھی بالمشافہ گفتگو کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ جون 1983ء کے اواخر میں واشنگٹن میں احمدیہ تحریک کی ایک کانفرنس میں تحریک کے سربراہ اعلیٰ مرزا طاہر احمد سے گفتگو کے دوران اچانک خیال آیا کہ ان سے اس کی وضاحت حاصل کروں، موقع بھی مناسب تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں قائداعظم کا ذکر آ ہی گیا تھا۔ مرزا طاہر کا دعویٰ تھا کہ جب قائداعظم محمد علی جناح سیاست سے دلبرداشتہ ہو کر لندن واپس چلے گئے تھے تو ان کو تحریک پاکستان کی قیادت سنبھالنے اور انڈیا واپس آنے کی ترغیب احمدیہ تحریک کے بزرگوں ہی نے دی تھی۔ مرزا طاہر کے بیان کے مطابق جناب عطا اللہ

شاہ بخاری جیسے بزرگان دین نے قائداعظم کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ احمدیہ تحریک کو اسلامی فرقوں کا حصہ نہ سمجھیں،لیکن بقول مرزا طاہر ''قائداعظم نے ان ترغیبات پر توجہ نہیں دی۔''

غالباً قائداعظم نے اپنی رواداری،اعلیٰ ظرفی اور روشن خیالی کی وجہ سے ان تمام باتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی سرظفراللہ خان کو وزارت خارجہ کا اہم قلمدان دیا، کیونکہ غالباً ان کے خیال میں وہی اس کے اہل تھے۔ بہرحال اس پس منظر میں تجسس اور بھی بڑھا کہ سرظفراللہ نے قائد تحریک پاکستان اور سربراہ مملکت کی نماز جنازہ میں شرکت کیوں نہ کی؟

مرزا طاہر نے قائداعظم کے متعلق جو کچھ بھی کہا، وہ اگر مان بھی لیا جائے اور ان کی گفتگو کو سچ سمجھ لیا جائے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ احمدی حضرات نے قائداعظم کو مسلمان کیوں نہ سمجھا اور ان کی نماز جنازہ کیوں نہ پڑھی؟

میں نے حسب عادت دوٹوک سوال کیا۔ مرزا طاہر احمد نے اس امر کی تصدیق کی اور وجہ یہ بتائی کہ احمدیہ تحریک کے آغاز کے 14 برس بعد یہ اصولی فیصلہ ہوا تھا کہ احمدی عقیدے کے افراد مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک نہیں ہوں گے۔ بقول ان کے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایسے لوگوں کے ساتھ جو احمدیت کے خلاف ہوں، نماز پڑھنے سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور قائداعظم کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرنا سرظفراللہ خان کا ذاتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ وہ اپنے فرقے کی قیادت کے اصولی فیصلے پر عمل کر رہے تھے۔ قائداعظم زندگی میں ایک بااصول انسان تھے اور مجھے یقین ہے کہ اس اصولی اجتناب کو ان کی روح نے سراہا ہوگا۔

لیکن اصول کی بنیاد تو منطق پر ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بحث کو آگے بڑھانے کی اجازت چاہی اور کہا کہ مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ احمدیہ قیادت کا ایک اصولی فیصلہ تھا جو قابل احترام ہے،لیکن چونکہ قائداعظم نے اس فرقے کے لوگوں کے ساتھ بقول مرزا طاہر اتنی رواداری دکھائی تھی، انھیں تحریک

پاکستان میں حصہ لینے کا شرف بخشا اور قیام پاکستان کے بعد بغیر کسی تعصب کے احمدیہ تحریک کے افراد کو ان کی قابلیت کی بنیاد پر اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اگر ایسے عظیم شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کی راہ میں کوئی اصول حائل ہو گیا تھا تو کیا آپ حضرات نے کسی دوسرے مقام پر قائداعظم کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی تھی؟ مرزا طاہر نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوا اور پھر انھوں نے وضاحت کی کہ اگر کسی شخص کی نماز جنازہ ایک مرتبہ ہو جائے اور اس میں ایک دو افراد بھی شریک ہو جائیں تو پھر دوبارہ نماز کی ''ضرورت'' نہیں رہتی۔ میں نے کہا کہ ''جناب یہ تو تکنیکی پہلو ہے۔'' میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اتنے بڑے لیڈر کے لیے جس نے آپ کے خلاف کسی قسم کا قانون اور آرڈیننس پاس نہیں کیا، کوئی تعصب نہیں برتا، اس کی نماز جنازہ یا ایصال ثواب کے لیے کوئی دوسرا طریق کار محض تکنیکی پہلو کی آڑ لے کر ترک کرنا عجیب سا لگتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ''اسلام کے ہر فرقے نے دوسرے فرقے کے خلاف کفر کے فتوے جاری کیے ہیں اور اگر ایک فرقے کے افراد دوسروں کی نمازوں میں شریک ہوں تو تشدد کا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے گزارش کی کہ ''بعض کتابوں میں ایسے حوالے ضرور ملتے ہیں اور بعض مذہبی لیڈر ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں بھی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر مسلمان روادار ہیں۔

جب کشمیر سے واپسی پر قائداعظم سے سوال کیا گیا کہ: ''آپ کی قادیانیوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' تو آپ نے فرمایا کہ ''میری رائے وہی ہے جو علما کرام اور پوری اُمت کی ہے۔''

آپ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پوری اُمت کی طرح قادیانیوں کو کافر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانیوں نے آپ کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور آپ کی حکومت کو کافر کہا تھا۔

قائداعظم نے 1948ء میں راجہ صاحب آف محمود آباد کی کراچی آمد کے

موقع پر ان کو آگاہ کیا تھا کہ ''قادیانی وزیرخارجہ سرظفراللہ کی وفاداریاں مشکوک ہیں، میں ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں اور عملی اقدامات اٹھانے کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار ہے۔''

شومئی قسمت کہ قافلۂ وقت تیزی سے رواں دواں تھا، قائداعظم کو مہاجرین کی آبادکاری اور دیگر مسائل نے مہلت نہ دی وگرنہ آپ اس خطرے کا ابتدا میں ہی حل ڈھونڈ لیتے اور قوم آئندہ تباہیوں سے محفوظ ہو جاتی۔ قائداعظم کے انتقال پُر ملال سے ساری قوم کی کمر ٹوٹ گئی۔ آپ کے داغ مفارقت سے ہر شخص یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ یتیم ہو گیا ہو، لیکن اس جانکاہ صدمہ پر بھی قادیانیوں کے رویہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ پاکستان کے باشعور شہری جانتے ہیں کہ چوہدری ظفراللہ خان نے بانی پاکستان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کی اور وہ ایک طرف الگ بیٹھے رہے، حالانکہ اس وقت وہ وزیرخارجہ کے عہدے پر فائز تھے۔ جب اخبارات اس معاملہ کو منظرعام پر لائے تو ان کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ ''چودھری ظفراللہ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ آپ نے قائداعظم کا نماز جنازہ نہیں پڑھا حالانکہ تمام دنیا جانتی ہے کہ قائداعظم احمدی نہ تھے۔ لہٰذا جماعت احمدیہ کے کسی فرد کا ان کا جنازہ نہ پڑھنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔'' (آتش فشاں، 24 مئی 1981ء)

قادیانی جماعت کا آرگن روزنامہ ''الفضل'' اس سلسلہ میں لکھتا ہے:

- ''اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت ابوطالب بھی قائداعظم کی طرح مسلمانوں کے بہت بڑے محسن تھے مگر نہ مسلمانوں نے آپ کا جنازہ پڑھا اور نہ اللہ کے رسول ﷺ نے۔ لیکن دنیا کے پردے پر ایسا بدبخت کون ہوسکتا ہے جو یہ کہہ سکے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور حضور ﷺ کے عالی مرتبت صحابہؓ کو حضرت ابوطالب سے محبت والفت نہ تھی۔ اور وہ بھی احسان فراموشی کے مرتکب ہوئے تھے۔''

(روزنامہ الفضل، 27 اکتوبر 1952ء)

وفاقی شرعی عدالت کے فل بنچ نے قادیانیوں کے خلاف اپنے تاریخی فیصلہ

مجیب الرحمان بنام وفاقی حکومت پاکستان (PLD 1985 FSC 8) میں لکھا:

❑ ''یہ امر بہت معروف ہے کہ پاکستان کے سابق وزیرِخارجہ سرظفراللہ خان نے قائداعظم کا جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ اخبار ''زمیندار'' مورخہ 8 فروری 1950ء کے مطابق جامع مسجد ایبٹ آباد کے خطیب مولانا محمد اسحاق نے سرظفراللہ خان سے نماز جنازہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ ''وہ قائداعظم کو صرف ایک سیاسی لیڈر سمجھتے ہیں۔'' ان سے استفسار کیا گیا کہ ''کیا وہ بھی مرزا صاحب کو نہ ماننے کی وجہ سے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں؟ حکومت کے وزیر ہوتے ہوئے بھی۔'' سرظفراللہ نے جواب دیا ''آپ مجھے ایک کافر حکومت کا مسلمان ملازم یا مسلمانوں کی حکومت کا کافر ملازم سمجھ لیں۔''

مسٹر مجیب الرحمٰن، (قادیانی جماعت کی طرف سے پیش ہونے والے وکیل) سرظفراللہ کے اس مؤقف کی تردید نہ کر سکے۔ لہٰذا یہ امر کسی قسم کے شک وشبہ کے بغیر ثابت ہو جاتا ہے کہ جیسا کہ سرظفراللہ نے پیش کر دیا ہے، یا تو پاکستان میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت کافر ہے یا قادیانی کافر ہیں، جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ہرگز نہیں مل سکتے اور نہ ہی ایک اُمت کے افراد ہو سکتے ہیں۔ دونوں میں وحدت کا کوئی نکتہ موجود نہیں۔ کیونکہ مسلمان ختم نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کے برعکس قادیانی مرزا صاحب کو ایک نیا نبی مانتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک عظیم صاحب بصیرت شخصیت (علامہ اقبالؒ) نے قادیانیوں کو اُمت مسلمہ کی سالمیت کے لیے خطرہ اور انتشار کے علمبردار قرار دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

❑ ''اس (امت مسلمہ) کی سالمیت صرف عقیدۂ ختم نبوت کی رہین منت ہے۔'' (Thoughts and Reflectionsof Iqbal, p.249)

احمدیوں کو ''قادیانی'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تحریک کے بانی مرزا غلام احمد پنجاب کے ضلع گورداسپور کی تحصیل قادیان میں 1835ء میں پیدا ہوئے تھے۔ 54 برس کی عمر میں یعنی 1889ء میں انھوں نے اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔

یہاں تھوڑی سی تفصیل نہ صرف نوجوان نسل کے لیے ضروری ہے بلکہ ان لوگوں کی یادداشت تازہ کرنے کے لیے بھی ہے جو **1974**ء میں شعور رکھتے تھے۔ یہی وہ سال ہے جب قومی اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا۔

احمدیوں کے خلاف کئی تحریکیں چلیں اور **1953**ء کو ان کو تحفظ دینے کے لیے مارشل لا بھی لگا جس کے سربراہ جنرل اعظم خاں تھے۔ **1974**ء میں نشتر میڈیکل کالج کے طلبا بذریعہ ٹرین کہیں جاتے ہوئے ربوہ سے گزرے تھے جو کہ پاکستان میں احمدیوں کا مرکز ہے۔ ان طلبا نے ربوہ سٹیشن پر احمدیہ لٹریچر دینے پر احمدیت کے خلاف بعض نعرے لگائے جنھیں مقامی افراد نے اشتعال انگیز سمجھا۔ ربوہ میں سٹیشن سمیت تمام انتظامی امور احمدی افراد کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ چنانچہ واپسی پر جب ٹرین رُکی تو اس میں سے طلبا کو جو ملتان واپس جا رہے تھے، مبینہ طور پر اُتار لیا گیا اور بعض بیانات کے مطابق سخت جسمانی اذیت پہنچائی گئی۔ اس واقعہ کی خبر پورے پاکستان میں آگ کی طرح پھیل گئی اور منتخب اسمبلی اور اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے مطالبہ کیا گیا کہ اس واقعہ کی تحقیقات کرائی جائے اور اس گروپ کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔

اسمبلی میں اس بات پر بحث ہوئی کہ مسلمان کون ہے؟ احمدی تحریک کے اس وقت کے پیشوا مرزا ناصر احمد اسمبلی کی سماعت میں احمدیہ تحریک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جب اس امر پر اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ احمدی مسلمان ہیں یا نہیں تو اس وقت کے ممبر قومی اسمبلی مولانا ظفر احمد انصاری نے مرزا ناصر سے ایک سادہ سا سوال پوچھا اور وہ یہ تھا کہ ''کیا وہ باقی قوم کو مسلمان سمجھتے ہیں؟'' مرزا ناصر سے گزارش کی گئی کہ وہ اس کا جواب ہاں یا ناں میں دیں۔ مصدقہ اطلاع کے مطابق مرزا ناصر نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد اراکین اسمبلی اور وزیراعظم بھٹو کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ احمدی تحریک کو غیر مسلم قرار دیں۔ دوسری صورت میں پوری قوم کو غیر مسلم تصور کرنا پڑتا۔

اس تفصیلی پس منظر کی ضرورت یوں پیش آئی کہ **1974**ء کے بعد اب یہ تحریک دوبارہ شروع ہو رہی ہے کہ اس گروپ کو غیر مسلم قرار دینا غلط تھا۔ یہ ناانصافی تھی

اور 1974ء کی ترمیم اور تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298 سی کے ذریعے اس فرقے پر جو پابندیاں لگا دی گئی ہیں، وہ انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ پاکستان میں نوجوان نسل اور بیرون ملک پاکستانی، تفصیلات سے واقف نہ ہونے کے باعث یہ سوچ رکھتے ہیں کہ حکومت یا کمیونٹی کو کسی کے مذہب کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

احمدیہ تحریک کی سوسالہ تقریب پر جو کتابچہ شائع ہوا ہے، اس میں احمدی اور غیر احمدی مسلمان میں جو فرق بتائے گئے ہیں، وہ باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں۔ ایک فرق تو بقول ان کے یہ ہے کہ ''مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے صلیب سے جسمانی طور پر اٹھا لیا تھا اور وہ جنت میں ہیں۔ اس کے برعکس احمدیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب سے اسی دنیا میں بچا لیا گیا تھا اور علاج کے بعد وہ صحت یاب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد چکر لگاتے ہوئے افغانستان سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے جہاں مبینہ طور پر ان کا انتقال ہوا اور سری نگر میں ان کا مزار بھی موجود ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جسمانی طور پر دوبارہ ظہور کریں گے۔ احمدیوں کا عقیدہ ہے کہ چونکہ سری نگر میں ان کی قبر موجود ہے، لہٰذا اب ان کی آمدِ ثانی جسمانی لحاظ سے نہیں بلکہ صرف روحانی لحاظ سے ہوگی۔ حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے انھیں جو معجزہ عطا کیا تھا، وہ مُردوں کو زندہ کرنے کا تھا۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ جو پیغمبر مُردوں کو زندہ کرتا تھا، اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ اس کا خدا اس کو جسمانی حالت میں واپس نہیں لا سکتا (نعوذ باللہ)۔ کیونکہ سری نگر میں ان کی مبینہ قبر موجود ہے۔ اس کتابچے میں مسلمانوں سے دوسرا فرق یہ بتایا گیا ہے کہ احمدی جہاد کی اس توضیح کو قبول نہیں کرتے کہ مذہبی معاملات میں طاقت استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ بعد میں یہ جملے ہیں کہ ''قرآنی تعلیم یہ ہے کہ مذہبی امور میں مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی ہونی چاہیے، مذہبی آزادی ہونی چاہیے اور تمام عقائد کے مصلحین کی عزت کی جانی چاہیے اور حقیقی جہاد نفس کی پاکیزگی

اور اسلام کی عمدگی کی تشہیر کرنا ہے۔ جہاد میں طاقت کے استعمال کی اجازت صرف ذاتی دفاع میں ہونی چاہیے۔''

یہ ایک دلچسپ وضاحت ہے، اس میں خود تضاد ہے اور بالواسطہ یہ تجویز بھی کہ نعوذباللہ قرآن میں تضاد ہے۔ جہاد ارکان اسلام میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے بعد آتا ہے۔جس شخص نے ان پہلے چار ارکان پر صدق دل سے عمل کیا، اس کا نفس تو پاک ہو ہی گیا، اب اسے نفس کی پاکیزگی کے لیے پانچویں رُکن کی تلقین کی ضرورت کیوں ہوگی؟

ہر شخص اپنے ایمان اور بصیرت کے مطابق کسی مذہب کو قبول کرتا ہے۔ جب عیسائیوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰؑ ''مسیح'' ہیں تو انھوں نے اپنے مذہب کو نیا نام دیا۔ یہ نہیں کہا کہ اصل یہودی وہ ہیں اور جو حضرت عیسیٰؑ کو تسلیم نہیں کرتے، وہ یہودی نہیں ہیں۔ انھوں نے یہودیوں سے اپنا تشخص الگ کر لیا اور عیسائیت کے نام سے تبلیغ کی، یہودیت کے نام سے نہیں۔ اسی طرح اگرچہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کو صاحب کتاب نبی مانتے ہیں لیکن جب وہ محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لا چکے تو وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے لگے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اصل عیسائیت یہ ہے اور جو محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا، وہ عیسائی نہیں ہے۔

اس پس منظر میں مسئلہ یہ ہے کہ احمدی تحریک اور اس کے پیشواؤں کا اصرار یہ ہے کہ اصل اسلام ان کا ہے اور جو ان کے ''مہدی'' اور ''مسیح'' پر ایمان نہیں رکھتا، وہ مسلمان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اسّی (80) کروڑ مسلمان جو ڈیڑھ ہزار برس سے بعض مشترکہ بنیادی عقائد پر عمل کرتے آ رہے ہیں، یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ ان کا مذہب ''ہائی جیک'' ہو جائے اور یہ ردِعمل مسلمانوں کا ہی نہیں ہے، مغربی دنیا میں بھی جن لوگوں نے ایسے دعوے کیے، ان کو عیسائیت کے دائرے سے خارج کر دیا گیا ہے۔ پھر ان کے خلاف شدید معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ جوزف سمتھ نے انیسویں صدی میں ''نبی'' ہونے کا دعویٰ کیا اور مورمن مذہب کی بنیاد ڈالی، لیکن عیسائیوں نے اس فرقے کو قبول نہیں کیا اور یہاں بعض قوانین ایسے وضع ہوئے جن کا مقصد صرف اس

فرقے کو روکنا تھا۔

اب جتنی بھی احمدی تحریریں نظر سے گزری ہیں اور جتنا بھی تبادلۂ خیال ہوا ہے، اس میں لفظوں کے ہیر پھیر کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ احمدی اسلام کے چمن میں اپنا آشیاں نہیں بنانا چاہتے بلکہ چمنِ اسلام سے بقیہ اُمت کو خارج کرنا چاہتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی آئینی ترمیم اور صدر ضیا الحق کے مارشل لا آرڈیننس سے پہلے ہی احمدیوں نے مسلمان نمازیوں اور مسلمانوں کی مساجد سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

اسلام کا نام کس کی ملکیت ہے، اس بحث کے نتیجے میں خونی محاذ آرائی سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟ غالباً اس کا حل یہی ہے کہ ؎

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

۞......۞......۞

طاہر احمد القاسمی

مکالمۃ الصدرین

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کا معرکتہ الآرا تاریخی مکالمہ

صدر جمعیۃ علما اسلام اور صدر جمعیۃ علما ہند و دیگر ارکان جمعیۃ علما ہند کا وہ سیاسی اور دلچسپ مکالمہ جو قائد اعظم محمد علی جناح اور پاکستان کی حمایت کیوں؟ کے متعلق باہم ہوا۔ جس نے تقسیم ہند اور تحریک پاکستان سے متعلقہ اختلافی پہلو ایسے روشن کر دیئے ہیں کہ کسی تاویل و حیلہ کی گنجائش نہیں رہی۔ یہ وہ تاریخی مکالمہ ہے جس سے صاحب ایمان و بصیرت حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی روشن ضمیری اور تیز فہمی جسے مومن کی فراست کہا جاتا ہے، کا پتہ چلتا ہے اور ساحرین برطانیہ کے سحر سے مسحور اور واردھا کے سامری کا عطا کردہ بادہ متحدہ قومیت و وطنیت کے نشہ میں مخمور دین وملت کی صورت بگاڑنے والے نیشنلسٹ علما کی اسلام ناشناسی اور کج بینی کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ اندوہناک، غم انگیز اور ہوش ربا مرحلہ تھا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے ان کانگریسی مولویوں کی اسلام کی مستقل اقدار سے دوری و بے خبری کو بھانپ کر بصد درد و اضطراب فرمایا تھا ۔

زمین کیا آسمان بھی تری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطر قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے

اس اہم مکالمہ میں ایک مرد مومن اور مرد حق کی شوخیٔ ادراک، دینی فہم و فراست اور ملی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ مکالمہ پڑھنے کے بعد تسلیم کریں گے کہ ایک خدا بین اور خود بین عالم کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے؟

”یکم دسمبر **1945**ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلما ہند دہلی اپنی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے دولت کدہ پر بھی بغرض عیادت و مزاج پرسی حاضر ہوئے۔ دوران مزاج پرسی، مولانا حفظ الرحمٰن نے علامہ عثمانی سے فرمایا کہ ہمیں آپ سے حالات حاضرہ پر کچھ نیازمندانہ گزارشات کرنی ہیں۔ مسئلہ پر شرعی حیثیت سے تو ہم آپ سے کیا گفتگو کرتے؟ یہ درجہ تو ہمارا نہیں، البتہ کچھ واقعات ایسے بیان کرنے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ آپ کے علم میں نہ آئے ہوں۔ ممکن ہے کہ ان واقعات کو سن کر حضرت والا کی جو رائے قائم شدہ ہے، اس میں تغیر ہو جائے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں گفتگو کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ جب دل

چاہے تشریف لائیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ اس گفتگو میں میرے ساتھ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، برادر زادہ علامہ عثمانی) اور کوئی تیسرے صاحب جو مناسب ہوں، شریک ہوں گے۔ اس کے بعد 5 دسمبر 1945ء کو مولانا حفظ الرحمٰن کا دہلی سے ایک خط بذریعہ ڈاک بنام علامہ عثمانی موصول ہوا جو بجنسہ درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از ندوۃ المصنفین دہلی

27 ذی الحجہ 1364ھ (1941ء)

ذوالمجد والکرم استاذی دام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج اقدس

کل دیوبند سے نو بجے صبح چل کر دہلی پہنچ گیا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے شب میں گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ جمعیت العلمائے ہند کی ایک خصوصی مجلس مشاورت وہ جمعرات کے روز دیوبند بلانا چاہتے ہیں تاکہ جمعیت العلمائے اسلام سے متعلق بعض اہم معاملات پر گفتگو ہو سکے۔ اس مشاورت میں غالباً حضرت مفتی صاحب (مولانا کفایت اللہ صاحب) اور مولانا احمد سعید صاحب بھی شرکت کریں گے۔

میں نے اپنے اس معروضہ کے پیش نظر جو حضرت والا میں حاضر ہو کر پیش کیا تھا، اب یہ مناسب سمجھا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور میں جمعرات کو شب میں پہنچیں اور جمعہ کے دن گزارشات پیش کریں۔ اب میری یہ بھی سعی ہوگی کہ اکابر جمعیۃ العلما بھی اس گفتگو میں حصہ لیں، تو اکابر علمائے دیوبند کے سیاسی افکار کی یکجہتی میں ان شاء اللہ بہت مدد ملے گی۔ اگر میری گزارشات منظور ہو گئیں تو جمعہ کے دن آٹھ بجے یہ گفتگو آپ ہی کے دولت کدہ پر ہو جائے تو بہت بہتر۔ باقی اپنی مشاورت تو شب میں اور باقی دوسرے وقت بھی ہو سکتی ہے۔

خادم محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

27 ذی الحجہ 1364ء

اس پروگرام کے بموجب 7 دسمبر 1945ء یوم جمعہ کو ساڑھے آٹھ بجے

حضرت مولانا حسین احمد (صدر جمعیۃ العلمائے ہند)، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ (سابق صدر جمعیۃ العلمائے ہند)، حضرت مولانا احمد سعید (سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند)، مولانا حفظ الرحمٰن (حال ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند) مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عبدالحنان، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، علامہ عثمانی کے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ علامہ عثمانی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان حضرات سے ملے۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی، عیادت کے بعد چند منٹ مجلس پر سکوت طاری رہا۔ یہ خاموشی غالباً اس لیے تھی کہ کون ابتدا کرے اور کس نوعیت سے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہو؟

چونکہ علامہ عثمانی کو ابتدا کرنا مقصود نہ تھا اور یہ حضرات از خود تشریف لائے تھے، اس لیے علامہ عثمانی بھی خاموش رہے۔ آخر مولانا حفظ الرحمٰن نے مسائل حاضرہ پر گفتگو کا آغاز کیا اور ایک طویل تقریر فرمائی جو تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ علامہ عثمانی برابر اس تقریر کو بغور سنتے رہے۔ جب وہ تقریر فرما چکے تو علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مجھے پورے الفاظ اور اجزا تو آپ کی لمبی چوڑی گفتگو سے محفوظ نہیں رہے۔ البتہ جو تخلیص میرے ذہن میں آئی ہے، اس کے جوابات بلالحاظ ترتیب عرض کروں گا۔ اگر کوئی ضروری بات رہ جائے تو آپ یاد دلا کر اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہیں۔

اس گفت وشنید کا سلسلہ سوا تین گھنٹے مسلسل جاری رہا۔ اس مکالمہ میں سب سے زیادہ حصہ مولانا حفظ الرحمٰن لیتے رہے اور دوسرے درجے میں مولانا احمد سعید ان کے شریک رہے۔ کبھی کبھی کوئی اور صاحب بھی کچھ بول پڑتے تھے لیکن حضرت مفتی کفایت اللہ نے جو مزاج پرسی کے بعد سکوت اختیار فرمایا، وہ اختتام مجلس تک ختم نہیں ہوا۔ کسی موقع پر بھی ایک حرف نہیں بولے۔ علامہ عثمانی کو اس طویل سکوت پر خود حیرت تھی۔ وہ بحث میں تو کیا حصہ لیتے، اشارۃً کنایۃً بھی کسی موضوع پر اثباتاً یا نفیاً کسی طرح کا اظہار خیال نہیں فرمایا۔ البتہ آخر مجلس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب کچھ بولے جو تقریباً پندرہ منٹ سے زیادہ نہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں ''جمعیت العلمائے اسلام'' حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی

''جمعیۃ العلمائے اسلام'' کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن کے ہاں قیام کیا جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیۃ العلمائے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے علما کی ایک جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لیے منظور کر لی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد سبحانی نے اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ کیا۔ جلسہ میں انھوں نے جو کچھ بکواس کی، وہ آپ کے علم میں ہے۔ ان کی تلون مزاجی بھی سب کو معلوم ہے۔ ایک زمانہ میں وہ گاندھی کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد ان کے خلاف ہو گئے۔ بہرحال اس مسلمان افسر کا تبادلہ ہو گیا اور ایک ہندو اس کی جگہ آ گیا جس نے گورنمنٹ کو ایک نوٹ لکھا جس میں دکھلایا گیا کہ ایسے لوگوں یا انجمنوں پر حکومت کا روپیہ صرف ہونا بالکل بے کار ہے۔ اس پر آئندہ کے لیے امداد بند ہو گئی۔ اسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداً حکومت کی جانب سے بذریعہ حاجی رشید احمد کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد مولوی حفظ الرحمٰن نے پاکستان کی صورت میں جو نقصانات ان کے نزدیک تھے، وہ ذرا بسیط کے ساتھ بیان کیے اور دکھایا کہ مسلمانوں کے لیے نظریہ پاکستان سراسر مضر ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ نے کلام اس قدر طویل کر دیا ہے کہ نمبروار ہر ایک چیز کا جواب دینا مشکل ہے۔ میں جو کچھ یاد رکھ سکا ہوں، ان کے جوابات دوں گا۔ اگر کسی چیز کو بھول جاؤں، تو آپ مجھے یاد دلا کر اس کا جواب لے لیں۔

مولانا عثمانی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پہلے میں اس معاملے کی نسبت

گفتگو شروع کرتا ہوں جو آپ نے مولانا آزاد سبحانی کے متعلق فرمایا ہے، جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گمنام خط کے جو دہلی سے ڈالا گیا تھا، یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط، بہرحال میرے علم میں آ چکی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے۔ میں نے جو رائے پاکستان کے متعلق قائم کی ہے، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔

''جمعیۃ العلمائے اسلام'' میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں، خود جمعیۃ العلمائے اسلام قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس روایت کو تسلیم بھی کرلوں کہ جمعیت العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایما سے قائم ہوئی ہے، تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارہ پر ہوا (اور برسوں وہ گورنمنٹ کی وفاداری کے راگ الاپتی رہی ہے، مرتب مکالمہ) بہت سی چیزوں کی ابتدا غلط ہوتی ہے مگر انجام میں بسا اوقات وہی چیز سنبھل جایا کرتی ہے۔ ہم نے مولانا آزاد سبحانی یا جمعیت العلمائے اسلام کی وجہ سے مسلم لیگ کی تائید نہیں کی، بلکہ دیانتاً یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے اور علمائے ملت کو اس کی پشت پناہی اور اصلاح میں جدوجہد کرنی چاہیے۔

عام دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی سیاسی جماعت یا تحریک کا مخالف ہو، تو اسی قسم کی باتیں اس کے حق میں مشتہر کی جاتی ہیں۔ دیکھیے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہمارے آپ کے مسلم بزرگ اور پیشوا تھے۔ ان کے متعلق لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپے ماہوار حکومت کی طرف سے دیے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانویؒ کو اس کا علم نہیں تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جا رہا

ہے،تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ماخوذ نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد علامہ عثمانی نے اشارہ کر کے فرمایا کہ ان مولوی عتیق الرحمٰن سے آپ پوچھیے کہ معاملات دارالعلوم کے سلسلہ میں دیوبند کے بعض پارٹی باز اشخاص نے ان کے سامنے نہایت قطعی الفاظ میں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ وائسرائے کے دفتر میں ہم اپنی آنکھوں سے وہ چٹھی دیکھ کر آئے ہیں جس کے ذریعہ مولانا مدنی کو شبیر احمد عثمانی نے گرفتار کرایا ہے۔ **(فلعنت اللّٰہ علی الکذبین)** لیکن میں پوچھتا ہوں، کیا اس میں ذرا بھی اصلیت ہے؟ اس پر مولوی عتیق الرحمٰن نے آنکھیں نیچی کرلیں اور خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات کے متعلق بھی عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے روپیہ لے کر کھا رہے ہیں، کیا یہ صحیح چیزیں ہیں؟ اب ہمیں ان سب قصوں سے بالکل علیحدہ رہ کر غور کرنا چاہیے کہ کون سا راستہ اختیار کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور کس راستے میں ان کا نقصان! (قطع نظر اس سے کہ وہ بات انگریز کے ایجنٹ کی زبان سے نکلے یا کوئی ہندو کا دلال کہے۔ مرتب مکالمہ) لہٰذا اب میں مزید گفتگو سے پہلے تین چیزیں دریافت کرنا چاہتا ہوں؟

پہلی چیز دریافت طلب یہ ہے کہ جو فارمولا جمعیۃ العلمائے ہند نے پاکستان کا نعم البدل ظاہر کر کے ملک کے سامنے پیش کیا اور جس کا حوالہ مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی تقریر میں بھی دیا ہے، اس فارمولا کو آپ حضرات نے کم از کم کانگریس سے منوا لیا ہے یا نہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کچھ اعذار بیان کیے۔ علامہ عثمانی کو چونکہ ان اعذار سے کچھ بحث نہیں تھی، اس لیے فرمایا کہ اعذار کچھ بھی ہوں میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا فارمولا کانگریس نے تسلیم کر لیا ہے یا نہیں؟ مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ ہمارا یہ اصول نہیں ہے کہ ہم جنگ آزادی کی شرط کے طور پر ہندوؤں سے کوئی چیز منوا لیں۔

دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے کہ آپ جو کچھ گفتگو اس وقت مجھ سے فرمانا چاہتے ہیں، وہ کس تقدیر پر ہے؟ آیا یہ فرض کرتے ہوئے کہ انگریز حکومت ہندوستان

سے چلی گئی ہے یا جا رہی ہے، یا یہ مان کر کہ ابھی وہ موجود ہے اور سردست جا نہیں رہی؟ گویا جو کچھ لینا ہے، اسی سے لینا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انگریز حکومت ابھی ہندوستان میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے جو کچھ لینا ہے، اسی سے لینا ہوگا۔

تیسری بات دریافت طلب یہ ہے کہ آپ حضرات جو انقلاب چاہتے ہیں، وہ فوجی انقلاب ہے یا آئینی؟ اس کا جواب دیا گیا کہ فوجی انقلاب کا تو اس وقت کوئی موقع ہی نہیں، نہ فی الحال اس کا امکان ہے، نہ اس کے وسائل مہیا ہیں۔ اس وقت تو آئینی انقلاب ہی زیر بحث ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ بس اب بحث کا رخ متعین ہو گیا۔ اب کلام اس پر رہے گا کہ سردست انگریزی حکومت کی موجودگی کے باوجود آئینی انقلاب میں کون سا راستہ مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ آیا وہ راستہ جو جمعیۃ العلمائے ہند نے تجویز کیا ہے یا پاکستان کا راستہ جو مسلم لیگ اختیار کر رہی ہے؟

مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ پاکستان قائم ہونے میں مسلمانوں کا سراسر نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت 53 فیصد ہے، فلاں صوبے میں اس قدر، فلاں میں اتنی، اور آسام میں اکثریت دوسروں کی ہے۔ لیکن ہر جگہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیت اتنی زبردست ہے کہ مسلمان اس سے کسی طرح بھی عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے اور بہت ہی تھوڑی اکثریت کچھ نہ کر سکے گی بلکہ ہمیشہ معرض خطر میں رہے گی۔ ادھر مسٹر جناح یہ کہہ ہی چکے ہیں پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت ہوگی۔ ایسی شکل میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ تنظیم، دولت اور تعلیم وغیرہ میں پست ہونے کی وجہ سے 53 فیصد مسلمانوں کی اکثریت 47 فیصد غیر مسلم اقلیت ہی کے عملاً تابع و محکوم رہے گی۔ سکھ نہایت جنگجو قوم ہے، وہ کسی طرح بھی پاکستان قائم نہ رہنے دے گی۔ ادھر جاٹوں کی قوم ہے، وہ بھی مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دے گی۔

اس موقع پر علامہ عثمانی نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ

کرنے والے صوبہ وار چھ پاکستان بنانا چاہتے ہیں یا تمام مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک پاکستان مطلوب ہے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں، پاکستان تو ایک ہی بنانا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا تب صوبہ جاتی اعداد کی گفتگو اس موقع پر بے کار ہے۔ مولانا عثمانی نے فرمایا کہ اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہو گی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ تعداد غلط ہے۔ مجموعہ میں مسلمان تقریباً سوا سات کروڑ ہیں۔ لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کیے لیتے ہیں اور غیر جو تین کروڑ سے کم ہیں، ان کو پورے تین کروڑ کر لیا جائے۔ اس تعداد سے سات اور تین کی نسبت، مسلم و غیر مسلم کے درمیان ہوگی اور مجموعی آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہوگی یعنی مسلمان ساٹھ فیصد اور غیر مسلم چالیس فیصد ہوں گے۔ (حالانکہ اس صورت میں مجموعہ مسلمان ستر فیصد اور غیر مسلم تیس فیصد ہوتے ہی، مرتب مکالمہ)

مگر علامہ عثمانی نے اس وقت اس سے بھی اغماض کر کے اور ان کے ہی بیان کردہ تناسب کو صحیح مان کر اس پر کلام فرمایا۔ آپ نے کہا کہ اب آپ اپنے فارمولا پر نظر ڈالیے کہ اس (کل ہند) میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب رہتا ہے؟ تو آپ کے فارمولے کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور بیس فیصد دیگر اقلیتیں ہوں گی۔ اس طرح سے آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فیصد اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصد ہوئی اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہی نسبت علی العکس رہے گی) یعنی ساٹھ فیصد مسلمان اور چالیس فیصد غیر مسلم ہوں گے۔ حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں **70** فیصد اور **30** فیصد کا ہوتا ہے۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ (ہم اگر ساٹھ فیصد رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے، تو چالیس فیصد میں کیا کر سکیں گے؟)

نوٹ:...... جمعیۃ العلما کے فارمولا میں یہ بھی مندرج ہے کہ خالص اسلامی مسائل میں دوتہائی مسلمان اگر کسی چیز کے مخالف ہوں گے، تو وہ چیز مسلمانوں کے لیے قبول نہیں کی جائے گی۔ اس شرط سے کسی درجہ میں مضر امور کا تدارک تو ہوسکتا ہے لیکن باقی مسلمانوں کے حق میں جو ضروری یا مفید امور ہوں، ان کے خاطر خواہ حاصل ہونے کی کوئی تدبیر نہیں کیونکہ مرکز میں مسلم تعداد چالیس اور غیر مسلم تعداد ساٹھ فیصد ہوگی۔ ایسی تمام تجاویز غیر مسلم اکثریت کے رحم و کرم پر رہیں گی اور یہ معاملہ بھی کہ خالص اسلامی مسئلہ کون سا ہے۔ اکثریت ہی فیصلہ کرے گی۔ (مرتب مکالمہ)

اس موقع پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان کا فارمولا سامنے آتا ہے، تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کیے جاتے ہیں اور جب جمعیۃ العلمائے ہند کا (مقدس) فارمولا پیش کیا جاتا ہے، تو وہی عیسائی گویا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرف شمار کیے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب بہرصورت ایک ہی شمار ہوں گے۔ (**الکفر ملة واحدة**) اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل رکھ کر مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔ وفد جمعیۃ العلمائے ہند نے آخر کار اس کو تسلیم کر لیا۔

علامہ عثمانیؒ نے فرمایا کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ پاکستان قائم ہونے میں سراسر مسلمانوں کا نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے، اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کیا آپ یہ بتلا سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان سے پھر کیوں اس درجہ مضطرب اور خائف اور اس کی انتہائی مخالفت پر تلا ہوا ہے۔ کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی مخالفت محض اس لیے کر رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے اور وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کا نقصان دیکھنے کو تیار نہیں؟ ان کا تو اعلان یہ ہے کہ جو جماعت یا جو شخص بھی پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف کھڑا ہوگا، کانگریس اس کی ہر طرح امداد کرے گی۔ (اس وعدہ کا تعلق کسی شخص خاص سے نہیں، کانگریس کے پورے ادارے سے ہے) اور ان کا قول ہے کہ پاکستان ہماری لاشوں پر ہی بن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ زور اور انتہائی مخالفت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ لیکن اس کا

کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اور بار بار اس پہلو سے گریز کیا جاتا رہا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو، آخر آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہوسکتی ہے؟ میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت تو سردست اوپر قائم ہے جسے آپ خود شروع میں تسلیم کر چکے ہیں۔ ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوا کبھی اور کہیں اترنے نہ پائے۔ اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں با اختیار خود پستے رہیں۔ علامہ عثمانی نے کئی بار اس چیز کو ان لوگوں سے پوچھا مگر ادھر سے کوئی شافی جواب ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد جمعیۃ العلمائے ہند کے وفد کی طرف سے کہا گیا کہ اچھا اگر پاکستان بن جائے، تو تین کروڑ کی جو مسلم اقلیت ہندو صوبوں میں رہے گی، اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا؟ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ ان کے لیے معاہدات ہوں گے۔ ان ہی معاہدات کے تحت مسلم اقلیت ان کے ہاں اور ہندو اقلیت ہمارے ہاں رہے گی اور ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کے تلے دبا رہے گا۔ آخر اکھنڈ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کی حفاظت کس طرح ہوگی؟ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید نے موضع گفتگو بدل کر کہا۔

''اجی، حضرت یہ علی گڑھ کے نیچری، علما کے وقار کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ اگر مسلمانوں کے راہنما بن گئے، تو دین کو برباد کر دیں گے، علما کو مٹا دیں گے۔ اسی سلسلہ میں ان بدتمیزیوں کا بھی ذکر کیا گیا جو بعض مقامات میں مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ کی گئی تھیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ راجاؤں، نوابوں، خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت ہے۔ سر فیروز خان نون کے متعلق فرمایا کہ وہ حکومت کے اشارے سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہوئے ہیں اور وہ کھلے طور پر سرکاری آدمی ہیں''۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ سر فیروز خان نون کے متعلق میں بحث نہیں کرتا۔ آپ جو چاہیں کہیں لیکن مسٹر جناح کے متعلق کبھی میرا یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا وہ کسی دباؤ یا لالچ میں آسکتے یا کسی قیمت پر خریدے جاسکتے ہیں۔

مولانا احمد سعید کے اس کہنے پر کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بعض

فرقے کے علما کا اقتدار مٹانا اور دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا: یہ جو مشکلات ہوئیں، ان کا حل آپ کے ذہن میں کیا ہے؟ کچھ آپ بھی تو فرمایئے! اس پر سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور کچھ دیر خاموشی سی طاری ہوگئی۔ پھر وفد کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت آپ ہی فرمائیں، کیا حل ہے؟ حضرت علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ خوب رہی۔ مشکلات تو بیان فرمائیں آپ، اور حل بتاؤں میں؟ آخر آپ نے بھی تو کچھ اس کا حل سوچا ہوگا؟

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اچھا لیجیے میں ہی اس کا حل عرض کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کا حل صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ سب حضرات مل کر مسلم لیگ میں داخل ہو جائیں اور شامل ہو کر اس پر قبضہ کریں۔ ایک دو مہینے دورہ کر کے تین چار لاکھ دو آنے والے ممبر مسلم لیگ کے بھرتی کرائیں۔ جب ہمارے ہم خیال ممبران کی اتنی بھاری تعداد مسلم لیگ میں شامل ہو جائے گی، تو پھر ہم عوام کے ذریعے سے جو مفید صورت مسلمانوں کے لیے ہوگی، بآسانی بروئے کار لاسکیں گے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ آپ حضرات کے ساتھ مل کر اس کام میں حصہ لوں۔ کیا ہمارا اثر عوام پر اتنا بھی نہیں کہ ہم دو چار لاکھ ممبران بھرتی کراسکیں؟ میرے نزدیک تو اصلاح کی یہی بہترین شکل ہے۔ اس پر مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ یہ تو صحیح ہے لیکن جب ہم لوگ ایسا کریں گے، تو یہ راجے، مہاراجے، نواب اور سر، مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر دوسری مسلم لیگ بنا لیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اگر وہ نئی مسلم لیگ بنا لیں گے، تو اس سے کیا ہوگا؟ عوام کی طاقت تو ہمارے ہی ساتھ رہے گی۔ (سر شفیع مرحوم نے بھی تو ایک زمانے میں شفیع لیگ بنائی تھی لیکن اس کا کیا حشر ہوا؟ جب شفیع صاحب رحلت کر گئے تو ان کے ساتھ ہی ان کی لیگ بھی ختم ہوگئی اور رابطہ عوام وہ کبھی پیدا نہ کر سکے۔)

رہا ان بدتمیزیوں کا قصہ جو آپ کے ساتھ ہوئیں، اس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جو پیغام جمعیت العلما اسلام کے اجلاس کلکتہ کے موقع پر بھیجا تھا، اس میں صاف طور پر لکھ دیا تھا کہ یہ پرلے درجے کی شقاوت و حماقت ہے کہ قائداعظم کو کافر اعظم کہا جائے یا مولانا حسین احمد وغیرہ کے ساتھ کوئی ناشائستہ سلوک کیا جائے۔

اس موقع پر مجھے ایک بات کہنی پڑتی ہے، وہ یہ کہ جن انگریزی خواں طلبا کے رویہ کی آپ شکایت فرما رہے ہیں، وہ نہ تو آپ کے مرید ہیں نہ شاگرد۔ نہ انھوں نے کسی دینی ماحول میں تربیت پائی ہے (اور جو سمجھتے یہ ہیں کہ آپ مسلم قوم کو ہندوؤں کی دائمی غلامی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔) اس کے بالمقابل جو عربی مدارس کے طلبا آپ کے شاگرد، آپ کے مرید اور دینی ماحول بلکہ مرکز دین و اخلاق میں تربیت پانے والے ہیں، ذرا ادھر بھی تو دیکھیے کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ نے جو گندی گالیاں اور فحش اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چسپاں کیے ہیں جن میں ہم کو ابوجہل تک کہا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا، آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین، مہتمم اور مفتی سمیت (باستثنا ایک دو کے) بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے طلبا نے میرے قتل تک کے حلف اٹھائے اور وہ وہ فحش اور گندے مضامین میرے دروازے میں پھینکے کہ اگر ہماری ماں بہنوں کی نظر پڑ جاتی، تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ملامت کا کوئی جملہ کہا؟ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ان کمینہ حرکات پر خوش ہوتے تھے۔ ''حریت'' اخبار دہلی آج کل میری ذاتیات پر نہایت رکیک مضامین لکھ رہا ہے۔ کیا آپ حضرات میں سے کسی نے اس پر بیزاری کا اظہار کیا؟ اس پر سب کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ مولانا احمد سعید نے اتنا فرمایا کہ اجی حضرت، عزیز حسن بقائی تو ہمیشہ اسی قسم کی بے ہودہ بکواس کیا کرتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں؟ علامہ عثمانی نے فرمایا، اس وقت تو وہ آپ کی حمایت اور ہمنوائی میں سب کچھ کہہ رہا ہے۔ گو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں اس نے آپ صاحبان کو بھی بری طرح مجروح کیا تھا، لیکن دکھلانا صرف یہ ہے کہ آپ حضرات نے کبھی اس قسم کی چیزوں سے جو ہمارے متعلق کہی گئیں، اظہار بیزاری نہیں کیا، نہ کسی پر ملامت کی۔ ہم نے تو بلکہ یہ کہا کہ موقع ملنے پر ایسے امور سے پوری قوت کے ساتھ اظہار بیزاری کرتے رہے۔

محلّہ کسرول مرادآباد کے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مولانا حسین احمد

صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب آپ کے نزدیک محض ذاتی مفاد کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دے رہے ہیں یا ان کا اتباع بے دینی اور کفر ہے؟ یا وہ اپنے استاد کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں؟ میں نے جواب لکھا کہ میرے حاشیہ خیال میں ہی یہ نہیں آ سکتا کہ یہ حضرات محض کسی ذاتی مفاد کے لیے ایسا کریں گے۔ وہ اپنے نزدیک جو حق سمجھتے ہیں، کر رہے ہیں اور اسی کو اپنے استاد کا مسلک سمجھتے ہیں۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جو ان کا خیال ہے، وہ واقعی میں صحیح ہو، نہ ان کی تقلید دوسروں پر واجب ہے۔ ان امور مذکورہ کا تذکرہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ مجھے کوئی انتقام لینا مقصود ہے۔ میں تو بہر صورت ایسے امور کو برا سمجھتا ہوں۔ دکھلانا صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے موافق اس قسم کے امور کو روکنے کی ہمیشہ سعی کی۔

آخر گفتگو میں مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی جیب سے دو تین کالم کا ایک مضمون نکال کر تقریباً دس منٹ تک پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون ایک انگریز کی تجویز اور رائے پر مشتمل تھا جس میں اس نے ہندوستان کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو اس کا ایک حل بتلایا تھا۔ اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان کو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور بمبئی کے بجائے کراچی کو تجارت کا مرکز بنایا جائے۔ گویا اس مضمون کو سنانے کی غرض یہ تھی کہ مسلم لیگ نے جو نظریہ پاکستان پیش کیا ہے، وہ اس انگریز کی تجویز پر مبنی ہے اور مسلم لیگ انگریزوں کے اشاروں پر چلنے والی جماعت ہے۔

اسی دوران مولانا احمد سعید نے سوال کیا کہ انگریز کی پالیسی ٹکڑے کرنے کی ہے یا جمع کرنے کی؟ یعنی اس کا فائدہ کس جانب میں ہے؟ مطلب یہ تھا کہ ہم جو وفاقی حکومت چاہتے ہیں، انگریز کے لیے مہلک ہے اور آپ جو تقسیم ہند چاہتے ہیں، یہ صورت حکومت کے لیے مفید و معین ہے۔ علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک یہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی آپ کے سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انگریز کا فائدہ ہمیشہ ٹکڑے کرنے میں ہے یا نہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ کبھی انگریز کا فائدہ ٹکڑے کرنے میں اور کبھی جمع کرنے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک حالیہ نظیر ملاحظہ فرمائیے۔ برطانیہ نے ترکی اور عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ عراق، شام،

لبنان، نجد، یمن سب کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وقت میں پالیسی یہ تھی۔ اب جو عرب لیگ قائم ہو رہی ہے جس میں تمام عربوں کو روس کے خطرہ سے متحد کرنا اور ان سب کا ایک بلاک بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ بھی آپ کے نزدیک انگریز کے اشارے سے نہیں ہو رہا جس کا منشا یہ ہے کہ تمام عرب ممالک کی ایک آہنی دیوار بنا دی جائے؟ اس کو وفد نے تسلیم کیا کہ بیشک۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز کی پالیسی ہمیشہ ٹکڑے کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ کبھی اس کی پالیسی جمع کرنے کی بھی ہوتی ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمارا فائدہ کس صورت میں ہے۔ خواہ اس میں حکومت کا فائدہ ہو یا نقصان! ظاہر ہے کہ ہندو یا مسلمان کسی کے مقابلے میں بھی گورنمنٹ اپنے مفاد کو بہ اختیار خود نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد صاحب نے جو ایک انگریز کا مضمون پڑھ کر سنایا، یہ ایک انگریز کی شخصی رائے اور تجویز ہے جو آج سے چودہ برس پہلے اسے پیش کی گئی تھی۔ لیکن حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا نمائندہ وائسرائے ہند لارڈ ویول، جو ہندوستان پر اس وقت حکمران ہے، اس نے اپنی تقریروں میں برملا یہ کہا ہے کہ اس ملک کا مرکز اور اس کی حکومت ایک ہی رہنی چاہیے۔ اس ملک پر کوئی بڑا عمل جراحی نہیں ہوسکتا۔ پہلی مرتبہ یہ تقریر کلکتہ کے کامرس چیمبر میں کی۔ دوسری مرتبہ لیجسلیچر میں یہی مضمون ادا کیا اور ابھی دو تین ماہ ہوئے کہ راولپنڈی کے دربار میں لارڈ ویول نے یہی کہا کہ اس ملک کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ اس سے پہلے سابق وائسرائے ہند لارڈ لنتھگو نے بھی 1942ء میں اس قسم کی تقریر کی تھی۔ اب آپ حضرات غور فرمائیں کہ آج وائسرائے ہند کے نظریے کی حمایت کانگریس کر رہی ہے یا مسلم لیگ؟

مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ اجی حضرت! یہ تو انگریزوں کی چالیں ہیں۔ کہتے تو کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس انگریز کی تجویز میں بھی تو یہی احتمال ہو سکتا ہے لیکن حجت کے درجہ میں تو سب سے بڑے ذمہ دار ہی کا قول ہم پیش کر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ اچھا اگر پاکستان قائم ہو گیا، تو ہندوستان کا دفاع کیسے ہو سکے گا؟ روس نے اگر حملہ کر دیا، تو سرحد کے مسلمان بیچارے پس جائیں گے، سارا بوجھ ان پر پڑ جائے گا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تو آپ

مان ہی چکے ہیں کہ انگریز ابھی یہاں موجود ہے۔ سردست اگر پاکستان بنائے گا، تو وہی بنائے گا۔ سرحدوں کی حفاظت کی بھی کوئی صورت ضرور نکالے گا اور اس کے چلے جانے کی صورت میں بیرونی قوت ہندوستان پر چڑھائی کرے گی تو دونوں متفقہ مل کر اس کی مدافعت کریں گے اور ہر ایک دوسرے کی، آدمی، سامان اسلحہ اور روپے سے مدد کرے گا کیونکہ یہ سب کا مشترکہ مفاد ہوگا۔ ایسا نہیں کریں گے تو سب کا نقصان ہوگا۔ اس قسم کے دفاع کے کام باہمی معاہدوں سے انجام پائیں گے۔ مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ حضرت معاہدوں کو آج کل کون پوچھتا ہے؟ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جب بلا معاہدہ آپ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، تو معاہدہ کی صورت تو بہر حال اس سے قوی تر ہونی چاہیے۔

پھر آپ کی تقریر کا حال تو یہ ہوا کہ ہم کسی حالت اور کسی وقت بھی ہندوؤں کی احتیاج سے باہر نہیں ہو سکتے، اور نہ ان کے بدون کبھی کوئی کام کر سکتے ہیں۔ (یہ بات کم از کم شیر دل بہادروں کو زیب نہیں دیتی جو کہتے ہیں ذرا انگریز سے آزادی مل جائے پھر ہم ہندو وغیرہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ مرتب مکالمہ)

نیز آپ دیکھتے ہیں کہ معاہدات ہی کی طاقت تھی کہ روس اور برطانیہ نے مل کر جرمن اور جاپان کو کس طرح پیس ڈالا کیونکہ تینوں کی غرض مشترک تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کا جب مفاد مشترکہ ہوگا، تو دونوں بذریعہ معاہدات عملی اتحاد کیوں نہیں کر سکتے؟ (گو قومی اتحاد نہ ہو نہ سہی، مرتب مکالمہ)

اس موقع پر مفتی عتیق الرحمٰن نے علامہ عثمانی سے کہا کہ آپ تو ہمیشہ سیاسیات سے یکسو رہا کرتے تھے، اس الیکشن میں کیا داعیہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے آپ نے شرکت فرمائی؟ حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا کہ اس الیکشن کی نوعیت پچھلے الیکشنوں سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اس مرتبہ منتخب ہونے والی اسمبلیاں ہی آئندہ ہندوستان کا مستقل دستور بنائیں گی۔ چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ وابستہ تھا، اس بنا پر میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر ان مسلمانوں کی مدد کی جائے جو استقلال ملت اور مسلم حق خود ارادیت کے حامی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے کیا کہا کہ میں سیاسیات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہوں۔

گزشتہ چند سالوں کو چھوڑ دیجیے، اس سے بیشتر جمعیۃ العلما ہند میں ہماری بھی تو کچھ ناچیز خدمات رہی ہیں۔ ہم نے بھی تو کچھ معرکے سر کیے ہیں اور ادھر آپ حضرات طوفانی دورہ کر رہے تھے، جس سے میرے نزدیک مسلمانوں کا نقصان تھا، تو ظاہر تھا کہ ایسے موقع پر میں سکوت کیسے باقی رکھ سکتا تھا۔

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

ان وجوہ سے میں نے مسلم لیگ کی تائید وحمایت کی۔ (پھر علامہ عثمانی نے یکا یک کوئی اعلان نہیں فرمایا، بلکہ مہینوں پاکستان کے نظریہ پر شرعی و سیاسی حیثیت سے انتہائی غور وتعمق کیا، جب کلکتہ کے اجلاس کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام میں اپنا پیغام بھیجا، تو استخارہ بھی فرمایا۔ مکمل بصیرت اور شرح صدر کے بعد یہ اقدام فرمایا گیا۔ مرتب مکالمہ) اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر میرا اثر ہی کیا ہے؟ ہندوستان میں اگر میری اپیل پر بیچارے نوابزادہ لیاقت علی خان کو دس بیس ووٹ مل ہی گئے تو کیا ہوا؟ آپ حضرات تو ماشاء اللہ با اثر ہیں۔ (موجودہ پروپیگنڈے کی طاقتیں آپ کے ساتھ ہیں) میں تو اب آپ میں ایک اچھوت کی حیثیت رکھتا ہوں۔ کسی نے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ آپ کے اعلانات نے ملک میں ہلچل مچا دی ہے۔

مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ بہر حال یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس میں احتمالِ خطا دونوں طرف ہے۔ مگر آپ تو اس قوت سے بیانات دے رہے ہیں کہ اپنے مخالفوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ ذرا کچھ تو نرمی اختیار کریں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ سب حضرات ماشاء اللہ اہل علم ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب احناف و شوافع وغیرہ کے باہمی اختلافی مسائل کی تقریریں آپ اور ہم کرتے ہیں تو باوجود یکہ سب آئمہ ہدیٰ ہیں لیکن ہم میں سے کون اپنے مذہب کی تصویب و تائید میں کسر اٹھا رکھتا ہے؟ اور حنفی مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے شافعی یا مالکی یا حنبلی کے لیے اپنے زعم میں کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا ہے۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرا تو وہی خیال ہے جو فقہائے کرام نے مسئلہ کے عقیدے کی نسبت لکھا ہے کہ اپنا

امام جو مسئلہ بیان کرے، اس کی نسبت یہ رائے رکھے کہ **صواب یحمل الخطا**۔ یعنی جو ہمارے امام نے مسئلہ بیان کیا، وہ صحیح اور درست ہے۔ ہاں اس میں خطا کا بھی احتمال ہے اور دوسرے امام نے جو کہا (**خطا یحمل الصواب**) یعنی وہ خطا ہے گو اس میں احتمال ثواب کا بھی قائم ہے۔ کیونکہ معصوم ان میں سے کوئی نہیں۔

آخر میں مولوی حفظ الرحمٰن نے فرمایا کہ جمعیۃ العلما اسلام محض ہماری جمعیۃ کے مقابلے میں اس کو توڑنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ مناسب ہوگا کہ آپ کم از کم اس کی صدارت قبول نہ فرمائیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول وعدم قبول کی نسبت فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن کل کے لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا؟

(نوٹ: لیکن اس کے بعد علامہ عثمانی نے کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی منظوری کا تار روانہ فرما دیا ہے۔ فللہ الحمد۔ مرتب)

جب یہ حضرات علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے، تو مولانا احمد سعید نے دریافت فرمایا کہ آپ کو حضور نظام نے حیدر آباد بھی تو بلایا تھا۔ آپ حیدر آباد کب تشریف لے جائیں گے؟ علامہ عثمانی نے فرمایا میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدر آباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انھوں نے مجھے طلب فرمایا، تو مجھ کو بہرحال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔

(الحمدللہ! اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکرٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔ مرتب)

چلتے چلتے وفد کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہو چکی ہیں، وہ بیان مسئلہ کے لیے کافی ہیں۔ اب اگر یکسوئی (یعنی خاموشی) اختیار کی جائے، تو کیا بہتر نہ ہوگا؟ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں، ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لیے سکوت کیسے مناسب ہے؟

اس کے بعد وفد رخصت ہو گیا۔ یہ تمام گفتگو نہایت خوشگوار فضا میں ہوئی۔ کسی موقع پر بھی الحمدللہ ادنیٰ سی تلخی پیدا نہ ہوئی۔ جب یہ تاریخی مجلس برخاست ہونے لگی تو

علامہ عثمانی نے اپنے یہاں آنے والے علما کے احترام میں اتنا فرمایا کہ یہ سلسلہ گفتگو آخری نہیں ہے۔ پھر جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ جانبین کو موقع غور وفکر کا حاصل ہے۔ اب تک کی صورت حال یہ ہے کہ آپ اپنی جگہ قائم ہیں اور میں اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ شرعی حیثیت سے مسائل حاضرہ پر جمیعت علما ہند کے وفد کی طرف سے کوئی کلام نہیں ہوا۔

(غالباً یہ حضرات یہ سمجھ کر آئے تھے کہ علامہ عثمانی کی سیاسی معلومات کم ہوں گی، تو ہم اپنے بیان کردہ واقعات سے علامہ موصوف کی رائے کو متاثر کر دیں گے۔ شرعی حیثیت سے گفتگو تو مولانا حفظ الرحمٰن پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اس پر ہم آپ سے کیا بحث کرتے؟ لیکن اس مکالمہ سے غالباً ان پر یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ علامہ عثمانیؒ کی معلومات شرعیہ جہاں بے پناہ ہیں، وہاں سیاسی حذاقت بھی کچھ اس سے کم نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ عثمانی نے مسئلہ پاکستان کو اپنی گفتگو میں اس طرح سے **منتقح** کیا کہ جو لوگ سیاسی ہیں، جب اس مکالمہ کو سنتے ہیں تو وہ خود بھی تنقیح مسئلہ کے انداز پر عش عش کرتے ہیں۔ (مرتب)

(گزارش: یہ مکالمہ مصدقہ و مرمم علامہ عثمانی کا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے جس طرح گفتگو فرمائی، اسی طرح قلمبند کر لی گئی اور مزید احتیاط یہ کی گئی کہ مسودہ صاف کر کے مولانا عثمانی کو دکھلا لیا گیا۔ مرتب)

۞......۞......۞

محمد عطاء اللہ صدیقی

سیکولرازم کا مفہوم

گزشتہ پانچ صدیوں کے دوران مغرب کی سیاسی فکر میں اہم ترین تبدیلی

ریاستی اُمور سے مذہب کی عملاً بے دخلی ہے۔ یہی امر سیکولر یورپ کا اہم ترین فکری ''کارنامہ'' بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جدید یورپ میں کلیسا کے خلاف شدید ردعمل کے فکری اسباب کیا تھے اور کلیسا اور ریاست کے درمیان ایک طویل محاذ آرائی بالآخر مؤخرالذکر کی کامل فتح پر کیونکر منتج ہوئی۔ بیسویں صدی کے وسط میں استعماری یورپ کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونے والی مسلمان ریاستوں میں بھی یہ سوال بڑے شد و مد سے زیر بحث لایا گیا کہ مذہب کا ریاستی اُمور کی انجام دہی میں کیا کردار ہونا چاہیے۔ مسلمان ملکوں کا جدید دانشور طبقہ جس کی سیاسی فکر کی تمام تر آبیاری مغرب کے فکری سرچشموں سے ہوئی تھی، مسلمانوں کی ریاست میں اسلامی شریعت کو ایک سپریم قانون کی حیثیت دینے کو تیار نہ تھا۔ مذہب کے متعلق اپنے مخصوص ذہنی تحفظات کی وجہ سے وہ اسلام کو محض مسلمانوں کی انفرادی یا شخصی زندگی تک محدود دیکھنے کا خواہشمند تھا اور اسلام اور ریاست کے باہمی تعلق کو بھی مسیحی مغرب کے کلیسا اور ریاست کے تصادم کے تناظر میں بیان کرنے پر مُصر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک کے دینی طبقہ کے متعلق ان کے تاثرات کلیسا کے بارے میں مغربی دانشوروں کے تاثرات سے مختلف نہ تھے۔ مغرب کے کلیسا دشمن دانشوروں نے جس جذباتی انداز میں اہل کلیسا کو جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا تھا، تقریباً وہی ناقدانہ اسلوب مسلمانوں کے اس طبقۂ جدید کا بھی تھا۔ وہ اپنے خودساختہ مفروضات کی بنا پر شدید خدشات کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اسلام کو ریاستی اُمور میں بالادستی عطا کر دی گئی تو دینی طبقہ کلیسا کی طرح روشن خیالی، آزادی اظہار اور ترقی پسندی کے تمام امکانات کو نہ صرف ختم کر دے گا بلکہ روشن خیال طبقہ کو مذہبی آمریت کا تختہ مشق بھی بنایا جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسلام کے بجائے سیکولرازم کے نفاذ پر زور دیا۔ یہ طبقہ اعداد و شمار کے لحاظ سے تو بہت قلیل تھا، لیکن مغربی استعماری طاقتوں کے سیاسی جانشین ہونے کی وجہ سے اسے بے حد اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ان کے خیالات، اُمنگیں اور فکری دھارے عوام کی اجتماعی فکر سے مطابقت

نہیں رکھتے تھے۔ مسلمان عوام، اسلام کے علاوہ کسی اور قانون کی برتری کا تصور تک قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ جدید طبقہ اور سوادِ اعظم کے نظریات میں اس واضح خلیج نے آزاد ہونے والی مسلم ریاستوں میں ایک نئے فکری تصادم کو جنم دیا، جس کی مختلف صورتیں آج بھی مسلم ریاستوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

پاکستان جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کی نظریاتی اساس اور اسلامی تشخص کو ایک مخصوص لابی کی طرف سے مشکوک و متنازعہ بنانے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ان کے خیال میں سیکولرازم کا مطلب، مذہب دشمنی یا لادینیت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ریاست کی مذہبی معاملات کے بارے میں غیر جانبداری اور بے نیازی ہے۔ وہ دین پسندوں کو مطعون ٹھہرا رہے ہیں کہ وہ سیکولرازم کے مفہوم تک سے واقف نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیکولرازم کا مفہوم کیا ہے؟ کیا سیکولرازم اپنے لغوی و اصطلاحی معنوں میں اسلام یا نظریۂ پاکستان سے متصادم ہے؟ اور پھر ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا پاکستان جیسی اسلامی تصور پر قائم ریاست سیکولرازم کی متحمل ہو سکتی ہے؟ یہ معاملہ بھی تحقیق طلب ہے کہ مغرب میں سیکولرازم کو فروغ کیونکر ہوا؟ مغرب میں مختلف ادوار میں سیکولرازم سے کیا مطلب مراد لیا جاتا رہا اور آج کل عملی طور پر اس نظریے کے نفاذ کے کیا کیا مظاہر سامنے آئے ہیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات درج ذیل سطور میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہم انگریزی زبان کے چند معروف مصادر و مآخذ، انسائیکلوپیڈیاز اور لُغات کی روشنی میں سیکولرازم کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آکسفورڈ ڈکشنری انگریزی زبان کی وسیع ترین ڈکشنری ہے جو پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ علمی اعتبار سے اس اہم ترین لغت میں مختلف الفاظ کے نہ صرف معانی بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان معانی کو مزید واضح کرنے کے لیے مختلف ادوار میں معروف مصنفین کی طرف سے ان کے استعمالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں سیکولر، سیکولرازم، اور سیکولرائزیشن، جیسے الفاظ کے متعلق جس قدر مضبوط

تشریح آ کسفورڈ ڈکشنری میں ملتی ہے، کسی اور لغت میں نہیں ملتی۔صرف 'سیکولر' کے لفظ کو دو صفحات پر بیان کیا گیا ہے۔اس کے مطالب کی اسم صفت **(Adjective)** اور اسم فاعل **(Subject)** کے دو واضح عنوانات کے تحت وضاحت کی گئی ہے اور پھر ان عنوانات کے مزید ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں، ان ذیلی عنوانات کو مختلف مصنفین کی طرف سے تحریر کردہ فقروں کی مثالوں سے بیان کیا گیا ہے۔

آ کسفورڈ ڈکشنری کی تمام وضاحتوں کو لفظ بہ لفظ پیش کرنا تو شاید غیر ضروری ہے، البتہ اس کے اہم ترین حصوں کے ترجمے سے اس اہم لفظ کے اصل مفہوم تک پہنچا جا سکتا ہے۔

یہ لاطینی زبان کے لفظ **Seculeer** یا **Secler** کی بدلی ہوئی انگریزی شکل ہے۔ اس کے کئی مطالب اور اشکال ہیں۔ معروف ترین مطلب **"The World"** یعنی 'دنیا' ہے جو چرچ کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔اسم صفت کے طور پر اس کے کئی مطالب ہیں۔

Pertaining to the World یعنی ''دنیا کے متعلق یا دنیاوی'' اس کی مزید تشریح یوں کی گئی ہے:

Of members of clergy: living in the World and not in monastic seclusion, as distinguished from regular and 'religious'.

''سیکولر سے مراد کلیسا کے وہ ارکان ہیں جو راہبانہ خلوتوں کے بجائے عام لوگوں کے درمیان رہتے ہوں، اس اعتبار سے وہ ریگولر (باقاعدہ) اور مذہبی لوگوں سے متمیز ہیں۔''

سیکولر تعلیم کے بارے میں آ کسفورڈ ڈکشنری کے الفاظ ہیں:

"Of education, instruction, Relating to non-religious subjects. In recent use often in plying the exclusion of religious teaching from education."

''سیکولر سے مراد ایسی تعلیم ہے جو غیر مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، حالیہ استعمال

میں اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ تعلیم سے مذہبی تعلیمات کو یکسر نکال دیا جائے۔''

درج ذیل سطور میں انگریزی زبان کے چند مزید انسائیکلو پیڈیاز (موسوعات) اور لغات سے سیکولرازم کی تعریف وتوضیح کو یکجا کر دیا گیا ہے تا کہ متنوع حوالہ جات سے اس انتہائی اہم اصطلاح کی تفہیم میں زیادہ آسانی پیدا ہو۔

(1) انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد 9، (پندرہواں ایڈیشن) میں سیکولرازم کی وضاحت ملاحظہ کیجیے:

- ''سیکولرازم سے مراد ایک ایسی اجتماعی تحریک ہے جس کا اصل ہدف اُخروی زندگی سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر دنیوی زندگی کی طرف مرکوز کرانا ہے۔قرون وسطیٰ کے مذہبی میلان رکھنے والے افراد میں دنیاوی معاملات سے متنفر ہو کر خداوند قدوس کے ذکر اور فکر آخرت میں انہماک واستغراق کا خاصا قوی رجحان پایا جاتا تھا۔قرون وسطیٰ کے اس رجحان کے خلاف ردّعمل کے نتیجے میں نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں سیکولرازم کی تحریک انسان پرستی (ہیومن ازم) کے ارتقا کی شکل میں رونما ہوئی، اس وقت انسان نے انسانی ثقافتی سرگرمیوں اور دنیاوی زندگی میں اپنی کامیابیوں کے امکانات میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کی۔ سیکولرازم کی جانب یہ پیش قدمی تاریخ جدید کے تمام عرصہ کے دوران ہمیشہ آگے بڑھتی رہی اور اس تحریک کو اکثر مسیحیت مخالف اور مذہب مخالف (Anti-Religion) سمجھا جاتا رہا''۔

(2) Lobister کی ''ڈکشنری آف ماڈرن ورلڈ'' میں سیکولرازم کی تعریف دو حصوں میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

(i) ''دنیوی روح یا دنیوی رُجحانات وغیرہ بالخصوص اُصول وعمل کا ایسا نظام جس میں ایمان اور عبادت کی ہر صورت کو رَد کر دیا گیا ہو۔''

(ii) یہ عقیدہ کہ مذہب اور کلیسا کا اُمورِ مملکت اور عوام الناس کی تعلیم میں کوئی عمل دخل نہیں ہے''۔

(3) ''نیو تھرڈ ورلڈ ڈکشنری'' میں سیکولرازم کی تعریف ان الفاظ میں دیکھی جا سکتی ہے:

❑ ''زندگی یا زندگی کے خاص معاملہ سے متعلق وہ رویہ جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دین یا دینی معاملات کا حکومتی کاروبار میں دخل نہیں ہونا چاہیے یا یہ کہ مذہبی معاملات کو نظامِ حکومت سے ارادتاً دور رکھنا چاہیے۔ اس سے مراد حکومت میں خالص لادینی سیاست ہے''۔

مندرجہ بالا سیکولرازم کے متعلق وضاحتوں، مفاہیم اور تعریفات کی روشنی میں سیکولرازم کا مختصراً مفہوم جو سامنے آتا ہے، اس کے اہم ترین پہلو درج ذیل ہیں:

1۔ سیکولرازم ایک ایسا نظریہ ہے جو اُلوہی، روحانی اور الٰہیاتی اُمور کے بجائے دنیاوی، مادّی، غیر روحانی، غیر مذہبی اور غیر مقدس اُمور پر توجہ مرکوز کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

2۔ سیکولرازم درحقیقت قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی انتہاپسندی کے خلاف شدید ردِعمل تھا۔

3۔ سیکولرازم کا نظریہ دین و سیاست یا مذہب اور ریاست کی مکمل تفریق پر مبنی ہے۔ سیکولر ریاست میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

4۔ سیکولرازم ایسا نظام ہے جو ایمان اور عبادت کی کسی صورت کو قبول نہیں کرتا، بلکہ ان کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ لہٰذا سیکولرازم اپنے مزاج کے اعتبار سے مذہب مخالف یا دوسرے الفاظ میں ''لادین'' نظریہ ہے۔

سیکولرازم کا اُردو میں ٹھیک ترجمہ کیا ہے؟

اس سوال کے متعلق آج کل ہمارے اخبارات میں نئے سرے سے بحث کی جارہی ہے۔ اردو میں عام طور پر اس کا مطلب ''لادینیت'' کیا جاتا ہے، مگر ہمارے 'دانشور' ''لادینیت'' کو سیکولرازم کے 'مترادف' کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انگریزی صحافت کے معروف ترین 'دانشور' جناب اردشیر کاوٗس جی (پارسی) نے اپنے ایک حالیہ کالم میں سیکولرازم کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس میں منجملہ دیگر باتوں

کے ان کا ارشاد ہے:

''اُردو زبان میں کوئی واحد لفظ ایسا نہیں ہے کہ جس سے 'سیکولر' کا ترجمہ کیا جا سکے۔'' (روزنامہ ''ڈان''، 25 جون 2000ء)

روزنامہ پاکستان میں تنویر قیصر اُردو زبان کی اس مبینہ تہی دامنی پر یوں اظہار افسوس کرتے ہیں:

❑ ''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُردو زبان میں کوئی ایسی لغت ابھی تک مرتب نہیں کی جا سکی ہے جو ہمیں سیکولرازم کی جامع اور واضح تعریف بتا سکے۔ ہمارے ذہنوں میں اس لفظ کے بارے میں جو شکوک وشبہات ہیں، ان کا ازالہ کر سکے۔ لے دے کے ہمارے پاس مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ لغت، قومی انگریزی اُردو لغت ہے جس کی تدوین معروف اور معزز سکالر جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی ہے۔ اس لغت کے تیسرے ایڈیشن (1996ء) میں سیکولرازم کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے، لادینی جذبہ یا رجحانات بالخصوص وہ نظام جس میں جملہ مذہبی عقائد واعمال کی نفی ہوتی ہے، اسے مزید یوں واضح کیا گیا ہے: یہ نظریہ کہ عام تعلیم اور مغربی ماندوبود کے معاملات میں مذہبی عنصر کو دخیل نہیں ہونا چاہیے۔'' (روزنامہ پاکستان: 14 جون 2000ء)

معلوم ہوتا ہے کہ فاضل کالم نگار ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے نابغہ عصر اور اُردو زبان کے جید عالم کی مذکورہ بالا سیکولرازم کی تعریف سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے وہ برطانوی خاتون اخبارنویس ایما ڈنکن ('بریکنگ دی کرفیو' کی مصنفہ) کی اس مسئلے کے متعلق رائے کا جواب دیتے ہیں، وہ لکھتی ہے:

❑ ''پاکستان میں مذہب کے لیے جو بڑی لڑائی لڑی جا رہی ہے، اس کے حوالے سے اُردو میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ مثلاً سیکولرازم کا اُردو میں کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ پاکستان کے مذہبی طبقات اور مولوی حضرات سیکولرازم کی مخالفت تو کرتے ہیں، مگر انھیں اس لفظ کے معنی نہیں آتے۔''

ایما ڈنکن مزید لکھتی ہے:

❑ ''اُردو میں 'سیکولر' اور 'سیکولرازم' کا جو قریب ترین ترجمہ رائج ہے وہ 'لادین' اور 'لادینیت' ہے...... 'لادینیت' کو 'سیکولرازم' کے مترادف اور ہم معنی کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سیکولرازم کا درست مطلب ہے: مذہبی غیر جانبداری۔ وہ لکھتی ہے کہ پاکستان میں ایک بڑے ادیب نے مجھے بتایا کہ جب پہلے پہل سیکولرازم کے بارے میں لکھنا چاہتے تھے تو بھی لفظ ''سیکولرازم'' اُردو میں لکھ دیتے تھے کیونکہ اُردو زبان میں اس کا ہم معنی یا مترادف موجود ہی نہیں لیکن مذہبی حلقوں نے سیکولرازم کے لفظ کو ناپسندیدہ قرار دے کر مسترد کر دیا اور اس کی جگہ 'لادینیت' لفظ کی سرپرستی شروع کر دی اور اب گذشتہ دس برسوں سے یہ لفظ اخباروں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کی جگہ 'لادینیت' رائج ہو چکا ہے۔'' (حوالہ ایضاً)

تنویر قیصر صاحب نے نجانے برطانوی صحافی ایماڈنکن کا مذکورہ بالا طویل اقتباس اس اصطلاح کے اُردو مترادف کے بارے میں ابہام کو دور کرنے کے لیے یا اس ابہام کو مزید بڑھانے کے لیے درج کیا ہے۔ ایماڈنکن کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ اُردو زبان کے مترادفات کے بارے میں اس کا مبلغ علم اتنا ہی ہے جتنا کہ اسے ہمارے سیکولر دانشوروں نے ملاقاتوں کے دوران 'چوگا' دیا ہوگا۔ مگر ہمارے صحافی حضرات کا یہ کہنا کہ اُردو میں سیکولرازم کا کوئی مترادف ہی نہیں ہے، بے حد حیران کن امر ہے۔ ایماڈنکن نے اہل پاکستان کو ان کی 'جہالت' پر متنبہ کرتے ہوئے انھیں درس دیا ہے کہ 'سیکولرازم' کا درست مطلب ''مذہبی غیر جانبداری'' ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جہالت یا انگریزی لغت مرتب کرنے والے ماہرین لسانیات (Lexicographers) کی 'جہالت' کے بارے میں آگاہ نہیں ہیں۔ سیکولرازم کا درست مطلب اگر اُردو زبان میں واقعی ''مذہبی غیر جانبداری'' ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی لغات اور انسائیکلوپیڈیا میں سیکولرازم کی وضاحت کے ضمن میں "Religious impartiality" یا کم از کم "Anti-indifference" جیسے الفاظ آخر استعمال کیوں نہ کیے گئے۔ انھی لغات میں سیکولرازم کے لیے Anti-Religion کے واضح الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

ایماڈنکن یا ہمیں پاکستان کے کوئی روشن خیالی دانشور ہی سمجھائیں کہ ہم انگریزی زبان کی معروف لغات کے مقابلے ان کی سیکولرازم کی خانہ زاد، خودساختہ اور ساقط الاعتبار وضاحت کو کس منطق کے مطابق قبول کریں۔ اور پھر ایماڈنکن اور وہ صاحب جنھوں نے اسے بتایا کہ اُردو زبان میں مذہبی طبقہ نے سیکولرازم کے لیے 'لادینیت' کی اصطلاح کو رواج دیا، اگر ذرا سا غور کریں تو انھیں اس سطحی الزام تراشی پر خود ہی شرم محسوس ہونے لگے گی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب جیسے اُردو زبان وادب کے عظیم دانشور، جو فکری اعتبار سے سیکولر ہیں، اگر اپنی مرتب کردہ لغت میں سیکولرازم کے لیے ''لادینی جذبہ'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو پھر مذہبی طبقہ کو مطعون کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا کوئی سیکولر دانشور یہ فرض کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب جیسا لسانیات کا بحرذخّار اس معاملہ میں کسی غیر ذمہ دارانہ اور غیر ثقہ ترجمہ کو پیش کرسکتا ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ اُردو زبان میں سیکولرازم کا مترادف موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی زیرنگرانی مرتب کیے جانے والے ''اُردو معارف اسلامیہ'' جو پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا (1972ء) کی جلد 9، صفحہ 446 پر سیکولرازم کا ترجمہ ''دُنیویت'' کیا گیا ہے۔ انگریزی لغات میں سیکولرازم کی درج شدہ چند وضاحتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو ''دنیویت'' بھی بہت مناسب مترادف معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص "Worldliness" کا یہی ترجمہ ہی مناسب ہے۔ عالم اسلام کے نامور مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جن کی عربی اور اُردو زبان میں تصنیفات کا ایک زمانہ معترف ہے، انھوں نے اپنی تحریروں میں سیکولرازم کے لیے ''نامذہبیت'' کا مترادف استعمال کیا ہے۔ ان کی معروف تصنیف ''عالم اسلام میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش'' میں متعدد مقامات پر ''نامذہبیت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں انھوں نے ''لادینیت'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زبان وادب کے اتنے بڑے شاہسوار اور مایہ ناز ادیب نے ''نامذہبیت'' اور ''لادینیت'' کے الفاظ کیا محض تہذیب مغرب کے خلاف کسی تعصب کی بنا پر استعمال کیے ہیں؟ سید ابوالحسن علی ندوی کے متعلق اس طرح کا

سوئے ظن کوئی بہت بڑا بد باطن ہی پال سکتا ہے۔

پاکستان کے ایک سیکولر دانشور عزیز صدیقی صاحب جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

❑ ''ہر ملک کے آئین میں اس امر کا اعلان واشگاف طور پر ہونا چاہیے کہ اس کے تمام شہری اور مذہبی، نسلی اور لسانی گروہ قانون کی نظر میں برابر ہیں اور انھیں برابری کی سطح پر اور پوری آزادی کے ساتھ ہم آہنگی کے ماحول میں ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ریاست کو لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے سیکولر ہونا پڑے گا۔ ایک بے عمل ریاست کے بعد بدترین منافرت پیدا کرنے والی ریاست وہ ہے جو اپنے عمل میں جانبدار ہے اور اور جو حکومت غیر سیکولر ہے وہ صریحاً جانبدار ہے۔ چنانچہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہونی چاہیے کہ وہ علم، آگہی اور معقولیت کا ایسا ماحول پیدا کرے جس میں عصبیت پر مبنی اصول اور تشدد کے حربے بالعموم ناپسند کیے جانے لگیں۔''

(پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری: مرتب حسن عابدی، صفحہ 64)

عزیز صدیقی صاحب جن معنوں میں سیکولر ریاست کو غیر جانبدار سمجھتے ہیں، ان معنوں میں ایک اسلامی ریاست بھی غیر جانبدار ہوتی ہے۔ اس میں قانون کی حکمرانی کا وہی تصور موجود ہے لیکن عملی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو سیکولر ریاست کلیتہً غیر جانبدار ہوتی ہے اور نہ ہی اسلامی ریاست۔ چونکہ دونوں ریاستوں کے پس پشت ایک بے حد توانا نظریہ کارفرما ہوتا ہے، اس لیے دونوں ریاستیں ہی درحقیقت نظریاتی ریاستیں ہوتی ہیں۔ اور ایک نظریاتی ریاست کبھی بھی مکمل غیر جانبدار نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اسے ہونا چاہیے۔ ایک اسلامی ریاست اسلام کی نظریاتی اساس سے متصادم سرگرمیوں کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کرے گی۔ ایک سیکولر ریاست اپنے شہریوں کو ساحل پر فطری لباس (ننگاپن) میں گھومنے کی تو بخوشی اجازت دے دیتی ہے، مگر یہی ریاست سکول کی بچیوں کے سر پر سکارف اوڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ فرانس اور مصر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ترکی کی سیکولر ریاست شہوت انگیز موسیقی کی کھلم کھلا اجازت

دیتی ہے، مگروہ مساجد میں لاؤڈسپیکر کے ذریعے اذان دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہاں کے تعلیمی اداروں میں مذہب دشمن مضامین پڑھائے جاتے ہیں مگر دین کی تعلیم کی اجازت نہیں ہے۔ اور پھر ہمارے ہاں عزیز صدیقی صاحب جیسے سیکولر دانشور جوعلم، آگہی اور عقلیت سے بھرپور مگر عصبیت سے خالی معاشرے کا قیام چاہتے ہیں، وہ دینی مدارس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہاں ان کی 'رواداری' ایک عجیب تنگ نظری میں بدل جاتی ہے۔ وہ علم سے مراد صرف دنیاوی علوم لیتے ہیں۔ اگرعوام اپنی مرضی سے دینی علوم کا اہتمام کرنا چاہیں تو یہ اسے برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ المختصر سیکولر ریاست کی ''غیر جانبداری اور عدم مداخلت'' ایک ڈھونگ اور لایعنی دعویٰ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فحاشی اور عُریانی کے خاتمے کے لیے ریاستی مداخلت زیادہ قابل قبول ہے یا دینی مدارس کوختم کرنے یا سکارف پر پابندی لگانے کے لیے ریاستی مداخلت زیادہ بہتر ہے۔اس بات کا فیصلہ ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان خود کرسکتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک مخصوص طبقہ جو مذہب سے مکمل انکار نہیں کرتا، اسلام اور سیکولرازم کے درمیان عجب مشابہت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ چونکہ سیکولرازم کا ایک پہلو دنیوی اُمور کی انجام دہی بھی ہے اور اسلام دین و دنیا کی تفریق کا قائل نہیں ہے، لہٰذا یہ حضرات 'دنیاداری' کو اسلام اور سیکولرازم کے درمیانی قدر مشترک قرار دے کر اسلام اور سیکولرازم کے درمیان فرق کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور پھر اس استدلال کے ذریعے بزعم خویش ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست ہی سیکولر ریاست ہے۔

روزنامہ ڈان (25 جون 2000ء) میں کراچی کے پروفیسر سید جمیل واسطی کا ایک مفصل مکتوب ''اسلام اور سیکولرازم'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ موصوف رقمطراز ہیں:

- ''لفظ 'سیکولر' کا ترجمہ ''لادینی'' کرنا درحقیقت اس لفظ کے اصل مطلب کو مسخ کرنے اور اس کی اہمیت کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ اس لفظ کو اس کے اصل تاریخی تناظر سے الگ کر کے صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ مسیحی مغرب میں دو متحارب قوتیں تھیں، یعنی چرچ اور ریاست، پوپ اور قیصر، جو ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے

لیے اکثر آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔

اسلام کے مذہبی اور سیاسی نظام میں، نہ تو کوئی چرچ ہے، نہ کوئی پوپ اور نہ ہی کسی قیصر (Emperor) کی گنجائش ہے۔ پہلے چار خلفائے راشدین نہ بادشاہ تھے، نہ ہی سلطان۔ سیکولر کا متضاد لفظ Theocratic (تھیوکریسی)، Monastic (راہبانہ) اور Clerical ہے، چونکہ اسلام میں کوئی چرچ نہیں ہے، نہ ہی کوئی راہبانہ سلسلہ ہے، اس لیے 'اسلامک' اور 'سیکولر' ریاست دونوں اپنے شہریوں کو مذہبی آزادی دیتی ہیں۔ انھیں انسانی حقوق، آزادی، قانون و انصاف کی نگاہ میں مساوات کی ضمانت دیتی ہیں، سیکولر کا مطلب ہے: دنیاوی اور مادّی اور چونکہ اسلام ایک جامع مذہب کی حیثیت سے دنیاوی معاملات و مفادات کا احاطہ بھی کرتا ہے، لہٰذا یہ ایک سول (Civil) اور سیکولر مذہب ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام دنیوی اور اُخروی زندگی دونوں کے معاملات کا احاطہ کرتا ہے، اسلام میں دین و دنیا کی ثنویت نہیں ہے۔ اسلام جہاں اپنے پیروکاروں کو اُخروی زندگی کی تیاری کے لیے ہدایت کرتا ہے، وہاں انھیں یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ ''اس دنیا میں سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو' (القصص : 77)۔ مگر سیکولرازم اور اسلام کی 'اپروچ' یکسر مختلف ہے۔ اسلام اُخروی و دُنیوی زندگی میں توازن کا درس دیتا ہے، مگر سیکولرازم کے ہاں 'اُخروی' معاملات کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہاں تو مقصود و مطلوب محض دنیاوی لذائذ ہیں۔ دنیاوی لذتوں کی طرف یکطرفہ رجحان سے خودغرضی، حرص اور مادہ پرستی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ سیکولرازم میں دنیا سے شدید رغبت اور آخرت سے عدم رغبتی کا تصور ملتا ہے۔ اسی لیے اسلام اور سیکولرازم میں ایک جزوی مماثلت کے باوجود دونوں کے نظریۂ حیات میں بہت فرق ہے۔ لہٰذا اسلام کا سیکولرازم سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ''دنیویت'' سیکولرازم جیسی وسیع اصطلاح کا محض ایک پہلو ہے۔ اس اصطلاح کا غالب پہلو وہ ہے جسے ''لادینیت'' کہا جاتا ہے۔ پروفیسر جمیل واسطی صاحب جیسے افراد کی عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری ظاہر

کرنے کی یہ کاوش جتنی بھی نیک نیتی پر مبنی ہو، مگر اس کے مضمرات نہایت خطرناک ہوں گے۔ پاکستان میں بعض اشتراکی منکرین نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے 'اسلامک سوشلزم' کی اصطلاح وضع کی۔ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان انھوں نے بہت سے مشترک پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی۔ ایک اور طبقہ جو یورپ کی جمہوریت سے بے حد متاثر ہے وہ اسلام اور جمہوریت کے درمیان اسطرح مشترکہ نکات کو بیان کر کے ''اسلامک ڈیموکریسی'' جیسی اصطلاح کو رواج دینے میں مصروف رہتا ہے۔ مگر ایسا ہونا نہیں چاہیے کیونکہ اسلام، اسلام ہی ہے۔ اسے کسی سابقے یا لاحقے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر بقول واسطی صاحب اسلام ایک سیکولر مذہب ہے، تو پھر سیکولرازم کے نفاذ کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ سیدھے سبھاؤ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ اس طرح کے التباس اور ابہام کو جان بوجھ کر کیوں پیدا کیا جاتا ہے؟

جناب تنویر قیصر شاہد اپنے مذکورہ کالم میں لکھتے ہیں:

- ''یہ ہماری کم علمی ہے یا حقیقت سے فرار کہ پاکستان میں سیکولرازم کے لفظ کی گالی تو آسانی سے دے دی جاتی ہے لیکن قانون یا پارلیمنٹ نے اس لفظ کی تشریح کی ہے، نہ اسے **Define** کیا ہے''۔

پاکستان کی پارلیمنٹ کی ''کوتاہیوں'' کا شمار کیا جائے تو ایک طویل فہرست مرتب ہوسکتی ہے، مگر موصوف کی اس ضمن میں خفگی بے جا ہے کیونکہ دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے سیکولرازم کی تعریف کا تعین نہیں کیا، یہ کام وہاں کے ماہرین لسانیات اور دانشوروں نے انجام دیا ہے۔ پاکستان کے دانشور سخن سازیاں تو بہت کرتے ہیں مگر 'سیکولرازم' کو اپنی خواہش کے مطابق **Define** نہیں کرتے، مزید برآں ایک 'سیکولر' آدمی کو 'لادین' کہنا اسی طرح گالی نہیں ہے جس طرح ایک طوائف کو بدکار کہنا اور ایک کرپٹ آدمی کو حرام خور کہنا گالی نہیں ہے۔ یہ حقیقت حال کا اظہار ہے۔ جو لوگ اسلام کے مقابلے میں پاکستان میں سیکولرازم لانا چاہتے ہیں، انھیں مسلمان عوام کو اس قدر اظہار رائے کی آزادی دینی چاہیے کہ وہ انھیں 'لادین' کہہ سکیں۔ ظاہر ہے وہ انھیں ملک بدر کرنے سے

تو رہے۔ اگر سوشلسٹ ریاست میں سوشلزم کے مخالفوں کو ملک بدر کرنا غلط نہیں سمجھا جاتا تو ایک خالص اسلامی ریاست میں اس کے نظریاتی مخالفوں کو ملک بدر کرنا بھی غلط نہیں سمجھنا چاہیے۔ مگر ہمارے سرخ جنت کے پجاری جو بات سوویت یونین کے ضمن میں درست سمجھتے تھے، وہ پاکستان کے بارے میں غلط سمجھتے ہیں!!!

آخر میں ہم بے حد زور دے کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سیکولرازم کا مطلب بلاشبہ اسلام دشمنی ہے۔ چونکہ پاکستان کی نظریاتی اساس اسلام ہے، ان معنوں میں اس کا دوسرا مطلب پاکستان دشمنی بھی ہے۔ اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ اسلام ہی پاکستان کی اصل شناخت ہے، ورنہ اس کا وجود بے معنی ہے، اگر سیکولرازم کو ہی نافذ کرنا تھا تو پاکستان کے قیام کے لیے لاکھوں جانوں کی قربانی دینی کیا ضروری تھی؟

آج کا ماڈرن، مغرب زدہ اور بزعم خویش لبرل مسلمان سیکولرازم کو جو بھی معنی پہنائے، اسلام اور سیکولرازم کے درمیان کسی قسم کی مطابقت پیدا کرنے کی کاوش صحرا میں سراب کو پانی سمجھ کر اپنے آپ کو ہلکان کرنے کے مترادف ہے۔ یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور سیکولرازم باہم مخالف اور متصادم نظام ہائے فکر ہیں، مگر وہ تلبیس کوشی کے پردے میں بات کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے اگر اسلام کی کھل کر مخالفت کی تو عوام کے شدید عتاب کا انھیں سامنا کرنا پڑے گا اور مغربی جمہوریت نے انھیں کچھ اور بات ذہن نشین کرائی ہو یا نہیں، البتہ انھیں جمہوریت کے رَٹو طوطے ضرور بنا دیا ہے۔ وہ جمہوریت اور عوام کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ وہ عوام کو اپنے فکری الحاد میں رنگنا چاہتے ہیں، مگر اس باغیانہ تبلیغ کے لیے جو اخلاقی جرأت درکار ہے، اس سے ان کا دامن دل تہی خاطر ہے۔

اسلام اور مغرب کے سیاسی تصورات کے درمیان اصولی، کلیدی اور بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اسلام، چرچ اور ریاست یا زیادہ بہتر الفاظ میں دین و سیاست کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔ اسلام کے اندر پوپ اور قیصر کی تفریق نہیں ہے۔ خلفائے راشدین سے لے کر خاندان بنو اُمیّہ ، خاندان بنوعباسیہ، عثمانی سلطنت و مابعد اسلامی تاریخ کا کوئی بھی دور ایسا نہیں ہے جہاں پوپ اور قیصر یا کسی مذہبی پنڈت اور خلیفہ کے

درمیان کوئی تصادم یا باقاعدہ محاذ آرائی کی صورت نظر آتی ہو۔ اسلامی تہذیب وتمدن کلیسا جیسے کڑی درجہ بندی پر مشتمل ادارے کے وجود تک سے نا آشنا ہے۔ جبکہ مسیحی یورپ کی پوری تاریخ میں کلیسا نے اہم ترین ادارے کا کردار ادا کیا ہے۔ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی کئی صدیاں تو ایسی ہیں کہ جس میں قیصر کا اقتدار تو برائے نام رہ گیا تھا۔ اصل اقتدار کا مالک کلیسا یا پوپ ہی تھا۔ قیصر سیاسی حکمران ہونے کے باوجود عملاً پوپ کا ماتحت ہی تھا۔ پوپ کی خوشنودی کا حصول مسیحی حکمرانوں کے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر تھا۔ مگر دوسری طرف اسلامی تاریخ کو ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے متقی ترین افراد کو خلیفۂ وقت کی طرف سے سزاؤں سے دوچار کیا جاتا ہے کہ انھوں نے خلیفہ کی طرف سے ملازمت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے جلیل القدر آئمہ کرام نے اس ضمن میں عزیمت کی جو داستانیں رقم کی ہیں، اسلامی تاریخ ان پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ دوسری جانب کلیسا کی تاریخ کا ایک ایک ورق گواہی دے رہا ہے کہ پوپ اور اس کے حواری مجسٹریٹ جیسی معمولی آسامی کے لیے حکمران وقت سے تصادم اور جنگ وجدل کرتے رہے ہیں۔

اسلام اور عیسائیت کے درمیان دوسرا اہم ترین فرق یہ ہے کہ عیسائیت میں تقویٰ اور تدین کی معراج یہ ہے کہ انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جنگل میں ڈیرے ڈال لے اور دنیاوی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ کلیسا کی اس غیر فطری روش کا نتیجہ ہی تھا کہ مسیحی پادریوں کے لیے عورت سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ مگر اسلام اپنے پیروکاروں کو دنیا میں رہتے ہوئے تزکیۂ نفس اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی ہدایت کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام، محسن انسانیت حضور اکرم ﷺ کا معروف ارشاد گرامی ہے کہ: ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔''

گزشتہ سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب میں سیکولرازم کے نظریے کی ابتدا ہی اس تصور سے ہوئی کہ وہاں کے بعض مفکرین نے روحانی معاملات سے ہٹ کر دنیاوی معاملات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اسلام کے اندر نماز، روزے

کی طرح اپنے بچوں کے لیے رزق حلال کی کوشش کو بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ کلیسا نے عورت کو چھونا حرام قرار دیا تھا مگر اسلام نے اپنی زوجہ سے صنفی مواصلت کو صدقہ اور باعث اجر قرار دیا۔ قرآن مجید میں واضح حکم دیا گیا ہے:

- **ولا تنس نصیبک من الدنیا** (القصص: 77) یعنی "دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔"

جہاں تک چرچ اور ریاست کے درمیان تفریق کی بات ہے، یہ تصور مغرب کے سیکولر دانشوروں کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے۔ خود عیسائیت کی بنیادی تعلیمات میں دین و سیاست کی تفریق کی واضح تعلیم موجود ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا اُسلوب اور منہج اخلاقی ہے، اسی لیے انھوں نے برملا یہ اعلان کیا کہ وہ شریعت موسوی کی پابندی کرتے ہیں۔ شریعت یعنی نظام عمل یا طریقہ کار کے بغیر ریاستی نظم ونسق نہیں چلایا جا سکتا۔ اخلاقی تعلیمات کے مقابلے میں شریعت کی خصوصیت اس کا قانونی پہلو اور محکم ضابطوں کا وجود ہے، جسے معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے نافذ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ نئی شریعت نہیں لائے تھے اسی لیے انھوں نے حکومت کرنے کی خواہش کا اظہار یا جدوجہد کبھی نہیں کی۔ لیکن اسلام اور شارع اسلام کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اسلام مجرد اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ نہیں ہے۔ اسلام ہر اعتبار سے مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں بالخصوص سیاسی پہلو کے متعلق واضح ہدایات دیتا ہے۔ اسلام کا نظام حیات ایک قوت نافذہ کا متقاضی ہے۔ اسلامی شریعت سماجی عدل کے قیام کے لیے اسلامی ریاست کے قیام کو ناگزیر سمجھتی ہے۔ انجیل میں واضح طور پر یہ الفاظ ملتے ہیں: "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب یہ جملہ اپنی روح کے اعتبار سے دین و دنیا کی اسی تفریق کا اعلان ہے جو سیکولرازم کی اساس ہے۔ یورپ کی موجودہ سلطنتیں اسی تصور پر قائم ہوئی ہیں۔ یہ تصور چونکہ عیسائیت اور سیکولرازم دونوں میں مشترک ہے لہٰذا مغرب میں اس نظریے کو جو والہانہ پذیرائی میسر آئی ہے، وہ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے

کہ سلطنت اور دین کی تفریق کا یہ نظریہ جدید سیکولر مغرب کا ''متفقہ مذہب'' ہے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ مگر یہ تصور اسلام کے اساسی نظریات کے صریحاً منافی ہے۔ سید سلیمان ندوی اسلام میں دین و دنیا کی وحدت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

❑ ''اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت لے کر اوّل ہی روز سے پیدا ہوا۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علیٰ الاطلاق ہے جس کی حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ۔ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمران ہے، وہی زمین پر فرماں روا ہے۔''

(سیرت النبیؐ: جلد ہفتم، صفحہ 45)

ایک اور مقام پر سید سلیمان ندوی اسی بات کو بے حد خوبصورت پیرائے میں بیان فرماتے ہیں:

❑ ''اسلامی سلطنت ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتا پا سلطنت ہے مگر سلطنت الٰہی کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں۔ اس میں ایک ہی حاکم اعلیٰ و آمر مانا گیا ہے۔ وہ حاکم اعلیٰ علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ اس دین کے سب سے آخری نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے۔ آپؐ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خداوندی کی بجا آوری ہے۔

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' (النسا:8)

(ایضاً، صفحہ 110)

اسلامی تاریخ کا شاید ہی کوئی نامور مصنف ہو جس نے اسلام اور مسیحیت کے اس اصولی فرق کی نشاندہی نہ کی ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

❑ ''کسی بھی پیغمبر نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اس

سے حاصل نہیں ہوتی کہ آدمی تمدن کے معاملاتی حصے میں بعض طبائع کی خود غرضی اور فساد سے بیزار ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ جنھوں نے لوگوں سے میل جول رکھنے اور خیر و شر میں ان کے شریک حال رہنے سے قطعاً علیحدگی اختیار کر کے پہاڑوں کی کھوؤں اور خانقاہوں کے تنگ و تاریک حجروں میں جا کر پناہ لی اور وحشیانہ زندگی بسر کرنا انھوں نے اختیار کر لیا، ان کی یہ ادا حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں ہرگز پسندیدہ نہیں۔''

جدید اسلامی دنیا کے نامور مفکر، مصر کے علامہ یوسف القرضاوی سیکولرازم اور اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے نہایت بلیغ اور مؤثر پیرائے میں ارشاد فرماتے ہیں:

- ''اسلام میں سرے سے انسانی زندگی کے معاملات کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ زندگی کے یہ اُمور دینی ہیں اور یہ غیر دینی۔ دین و دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی، اور مسیحی مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ اور جو ہمارے معاشرے میں بعض اداروں اور لوگوں کے بارے میں دینی اور غیر دینی (سیکولر) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس تقسیم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے...... اسلامی نظام حیات میں زندگی کے یہ دو حصے کبھی نہیں رہے اور دین و دنیا کی تفریق کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اسلام اس دین سے آشنا نہیں جو سیاست سے عاری ہو اور اس سیاست کو تسلیم نہیں کرتا جو دین سے خالی ہو۔ اسلام میں انسانی زندگی کے تمام پہلو اس طرح باہم مربوط اور دوش بدوش رہے ہیں جس طرح جسم و جان کا رشتہ باہم مربوط ہے۔ اس لیے اسلام کی نظر میں دین اور علم، دین اور دنیا، دین اور حکومت، ہر رشتہ مربوط، غیر منفصل اور کبھی نہ جدا ہونے والا ہے۔''

(''سیکولرازم اور اسلام'' صفحہ 53، اُردو ترجمہ: ساجد الرحمٰن صدیقی)

یورپ کی جدید تہذیب عدم توازن کا شکار ہے۔ قدیم یورپ ایک انتہا پر تھا تو جدید یورپ ایک دوسری انتہا پر پہنچ گیا ہے۔ قدیم یورپ میں عورت کو پاپ کی گٹھڑی اور غلیظ مخلوق سمجھا جاتا تھا، اسے جائیداد میں سرے سے کوئی شراکت حاصل نہ تھی۔ اس کا اپنا کوئی تشخص نہ تھا، مگر جدید یورپ میں عورت کو اس قدر آزادی دی گئی ہے کہ عملاً وہ

کوئی بھی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔عورتوں کی ہم جنس پرستی اور اسقاط حمل کے حق کو اقوام متحدہ کی بیجنگ پلس فائیو کانفرنس میں ''بنیادی انسانی حقوق'' کے طور پر اقوام عالم سے تسلیم کرانے کی کوشش کی گئی۔قرون وسطیٰ کے یورپ میں فرد کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔حکمرانوں کو خدائی حقوق کے نام پر جابرانہ اختیارات حاصل تھے، آج فرد کی آزادیوں کے مقابلے میں معاشرے کے حقوق نہ ہونے کے برابر ہیں۔قدیم یورپ میں جائیداد کی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کی صورت میں جاگیرداری نظام رائج تھا،اس کے ردّعمل میں جب اشتراکیت کا نظام سامنے لایا گیا تو اس میں ذاتی جائیداد کے حق کا سرے سے ہی انکار کر دیا گیا۔قدیم یورپ میں کلیسا کو اس قدر اختیارات حاصل تھے کہ اُمور ریاست کا کوئی بھی معاملہ کلیسا کی رضاجوئی کے بغیر جائز تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔کلیسا جسے چاہتا تھا جائز قرار دیتا اور جسے چاہتا، ناجائز اور کافرانہ قرار دے کر مسترد کر دیتا۔جدید یورپ سیکولرازم کا حامی ہے جس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔سیکولرازم کے تصور سے پہلے دنیاوی زندگی سے متمتع ہونا ایک گناہ کی بات تصور کی جاتی تھی۔معمولی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا بھی عاصیانہ عیش پرستی کے زُمرے میں شمار ہوتا تھا،مگر اس کا ردّعمل یہ ہے کہ آج کا سیکولر یورپ اُخروی زندگی کے تصور سے ہی بیزار ہے۔آج کا مغربی انسان اس دنیا کی لذتوں سے حریصانہ طور پر لذت اندوز ہونے کو ہی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہے۔پہلے اگر دنیاوی معاملات کے متعلق تفریط تھی تو آج افراط کی اجارہ داری ہے۔

اسلامی نظام میں دین و دنیا کے درمیان حسن توازن قائم کیا گیا ہے۔اسلام دنیا سے مکمل بے رغبتی کا پرچار نہیں کرتا اور نہ ہی دنیاوی لذتوں میں غرق ہو کر اُخروی زندگی کو یکسر بھلا دینے کو قابل تحسین سمجھتا ہے۔

اُردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار کے مطابق:

- ''قرآن مجید میں دنیا کا لفظ ایک سو پندرہ مرتبہ آیا ہے اور اکثر آخرت کے مقابلے پر آیا ہے۔قرآن کی رُو سے دنیا اور آخرت دونوں کائنات کی حقیقت میں شامل ہیں اور مومن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان دونوں کی فلاح وسعادت کے لیے کوشاں

ہو، خداپرستی اور دینداری، دنیوی معیشت اور ترقی کے خلاف نہیں،اسی لیے **ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة** ”یعنی اے رب! ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما (البقرۃ:201) کی دعا سکھائی گئی ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کی بہتری کے حصول کی التجا کی گئی ہے۔قرآن مجید میں حج کے احکام کے سلسلے میں حکم ہوا: ”اس میں تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں کہ (اعمال حج کے ساتھ) تم اپنے پروردگار کے فضل کی تلاش میں بھی رہو۔ البتہ ایسا نہ کرنا چاہیے کہ کاروبار دنیوی کے انہاک کی وجہ سے حج کے اوقات و اعمال سے بے پروا ہو جاؤ۔“ (البقرۃ: 198)۔لیکن اسلام میں اس امر کی ممانعت ہے کہ صرف دنیا کو عین مقصود سمجھ لیا جائے اور آخرت کا انکار یا اس سے قطع نظر ہو جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے: ”کیا تم آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کو پسند کرنے لگے ہو۔“ (التوبہ:32)

ان ارشادات ربانی سے معلوم ہوا کہ دین اسلام دنیا کا مخالف نہیں بلکہ دنیاپرستی کا مخالف ہے جو انسان کو خداپرستی، نیکی اور جزا و سزا کے عقیدے سے غافل کر دیتی ہے۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں زُہد و تصوف کے کچھ مسالک ظہور میں آئے، جن کے زیر اثر ترک دنیا اور ترک سعی کی تلقین ہوئی، لیکن یہ انتہاپسند صوفیوں اور زاہدوں کا مسلک تھا۔ جن معتدل صوفیا کی نظر روح شریعت پر رہی، انھوں نے بُری دنیاداری سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ کسب معاش اور سعی و عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ جمہور اکابر علما اور حکمائے اسلام نے زندگی کو ایک معرکۂ عمل قرار دیا ہے اور اس سے فرار کا سبق نہیں سکھایا۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے ’مقدمہ‘ میں دنیا کو آخرت کی تجربہ گاہ قرار دے کر اس میں حسن زندگی کو انسان کا فطری تقاضا اور اس کا کمال ظاہر کیا ہے۔ مفکر اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے دنیوی زندگی کو آخرت سے وابستہ کرنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اعمال انسانی کے لیے ایک ایسا اخلاقی معیار مہیا ہو جائے جو مثالی ہو۔ ابن مسکویہ اور امام غزالی نے سعادت کو دنیوی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔

اس دور میں مغرب کی مادیت (Materialism) اور دنیویت (Secularism) کے نظریات بھی ایک چیلنج کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان سے نئے مصنفوں کا ایک طبقہ متاثر بھی ہوا۔ چنانچہ ترکی، شام، مصر اور ہندوستان میں ایک مؤثر اقلیت دین اور دنیا (مذہب اور سیاست) کو جدا جدا شعبے قرار دینے لگی، لیکن روایت سے وابستہ دینی نقادوں اور مفکروں کی اکثریت اس پر قائم ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا دونوں ایک کلی حقیقت کے طور پر یکجا ہیں اور دونوں ایک عظیم مقصد کے تحت لازمی ہیں۔ ان نقادوں میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ شامل ہیں۔ علمائے عرب میں مفتی محمد عبدہ، الاستاذ عبدالعزیز شاویس، علامہ رشید رضا، سید قطب شہید وغیرہ نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔'' (ماخوذ از اُردو دائرہ معارف اسلامیہ: صفحہ 443 تا 446)

ہمارے نام نہاد لبرل دانشوروں نے رُوسو، والٹیئر، ہیوگو، جان لاک، ہابز، جان سٹیورٹ مل، کارل مارکس، فریڈک انجلز، ماؤزے تنگ، لینن اور یورپی مستشرقین کو تو بہت پڑھ رکھا ہے مگر انھوں نے کبھی اسلام کے صحیح معنوں میں مفکرین اور مؤرخین کو نہیں پڑھا۔ ان میں سے شاید ہی کسی نے امام غزالی، شاہ ولی اللہ، حافظ ابن قیم، امام ابن تیمیہ، امام شاطبی، حافظ ابن حجر، الماوردی، ابن خلدون، ابن الخطیب، علامہ ابن حزم، نظام الملک طوسی، شعیب ارسلان جیسے نابغہ ہائے عصر کو کبھی پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ ان کا اسلام کے متعلق مبلّغ علم بس اتنا ہے جتنا کہ یورپی مستشرقین کی تحریروں میں وہ دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اسلام کو اسلام کے اصل ماخذوں کے بجائے یورپی متعصّب مصنفین کی تحریروں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ عربی زبان سے وہ واقف نہیں ہیں اور اُردو زبان سے واقف ہونے کے باوجود اسے ''منہ نہیں لگانا'' چاہتے کہ اس طرح ان کی دانشوری ترقی پسندی سے پھسل کر رجعت پسندی کے گڑھے میں گر سکتی ہے۔ اگر کبھی قرآن وسنت کے بنیادی ماخذوں کے متعلق ان میں سے بعض کا میلان پیدا بھی ہوتا ہے تو وہ یہ مطالعہ اس نیت سے کرتے ہیں کہ انھیں ایسا مواد مل جائے جس

سے ان کی ''روشن خیالی'' اور ''ترقی پسندی'' کی تائید ہوتی ہو۔ وہ اسلام کی روشنی میں مغربی افکار کو جانچنے کا میلان نہیں رکھتے، ان کی فکری تگ و دو ساری اس نکتے کے گرد گھومتی ہے کہ کسی طرح اسلام کو مغربی افکار کا لبادہ اوڑھا کر دنیا کو اسے 'ماڈرن' بنا کر دکھایا جائے۔ علامہ یوسف القرضاوی اپنی مشہور کتاب ''سیکولرازم اور اسلام'' میں سیکولر دانشوروں کی اسی نفسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

❑ ''لادینیت کے داعی حضرات علی الاعلان اس صاف ستھرے اسلام پر تو اعتراض کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، البتہ انھوں نے اپنا ایک الگ اسلام اختراع کر لیا ہے اور اسے وہ ہم پر زبردستی تھوپنا چاہتے ہیں۔ ان کا اسلام اس اسلام سے قطعی مختلف ہے جو اللہ کی کتاب قرآن پاک میں موجود ہے۔ جو اسلام قرآن مجید میں محفوظ ہے، یہی حقیقی اسلام ہے، حضور اکرم ﷺ اسی اسلام کو لے کر مبعوث ہوئے تھے، اسی کی جانب آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دی تھی۔ یہی وہ اسلام ہے جسے خلفائے راشدین نے عملاً نافذ کیا اور جس کی توضیح وتشریح ائمہ محدثین اور مفسرین نے کی ہے۔ لیکن اسلام سے لادینیت پسندوں کی مراد ایسا اسلام ہے جن پر وہ ان غلطیوں کا بوجھ لاد سکیں جو تاریخ میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی ہیں۔ وہ اسلام کی وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو انھوں نے خود بنائی ہے یا ان کے پیشرو مستشرقین اور مسیحی مشنریوں نے تیار کی ہے۔'' (صفحہ 30)

جدید یورپ کے نامور شہرہ آفاق فلسفیوں اور مؤرخین مثلاً ٹائن بی، جی ایچ ویلز، ول ڈیورانٹ اور پروفیسر ولفریڈ کینٹ، ول سمتھ بھی اقرار کرتے ہیں کہ مغرب کی تہذیبی روایات کا سرچشمہ صہیونی مسیحی **(Judo-Christian)** اور یونان و روم کی میراث ہے۔ شاید پاکستان کے لبرل ازم کے پجاریوں کو بھی اسی حقیقت سے انکار نہ ہو، مگر ان کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ مسیحی یورپ کی تہذیبی اقدار، ان کے لادینی مزاج، ان کے کلیسا کے کردار، ان کے ثقافتی ارتقا کے اہم عوامل، ان کی تہذیب میں مسیحی صہیونی اثرات وغیرہ جیسے عناصر اور ان کے مخصوص تاریخی پس منظر کا لحاظ کیے بغیر تہذیب مغرب کو پاکستانی معاشرے پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے قول وفعل میں

تضاداوران کے معیارات دوہرے ہیں۔ وہ پاکستان اور مغرب کا جب بھی موازنہ کریں گے، پاکستان کو ایک وحشی تمدن کا نمونہ ظاہر کرنے میں کوئی ابلاغی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔انھیں پاکستان اور جدید مغرب کے اداروں میں کسی قسم کی کوئی قدر مشترک نظر نہیں آئے گی۔مگراس کے باوجود وہ پاکستانیوں کو گھسیٹ کر تہذیب مغرب کے گڑھے میں دھکیلنے کے لیے بے چین ہیں۔ یہی منافق لبرل دانشور ہی ہیں جنھوں نے پاکستان میں پانچ اقلیتوں کا شرانگیز نظریہ گھڑا ہوا ہے۔انھیں صوبہ پنجاب کے ہی دو علاقوں ملتان اور لاہور کی تہذیب و کلچر میں اس قدر معرکتہ الآرا فرق نظر آتا ہے کہ یہ سرائیکی صوبہ کے قیام کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ بلوچستان، سندھ، سرحد اور پنجاب کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ چارمختلف ممالک کا تذکرہ کیا جا رہا ہو۔ اسی صوبائی تعصب کو ہوا دینا ہی ان کی سیاست کا ایک اہم اصول ہے۔مگر وہ اس اصول پر قائم نہیں رہتے۔ جب یہ مغربی تہذیب اور سیکولرازم کو پاکستان میں نافذ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو انھیں سکینڈے نیویا کی ننگ دھڑنگ اور یورپ کی ملحدانہ تہذیب اور روس جیسے خنک علاقے کے کلچر اور پاکستانی معاشرے میں بالکل کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہاں پاکستانی کلچر کے تشخص سے ہی یہ انکار کرتے ہیں۔ ان آزادی ضمیر کے اَن تھک منادوں کا ضمیر اگر زندہ ہوتا تو شاید پاکستان اور یورپ کے درمیان ثقافتی فرق کا ادراک کوئی مشکل امر نہیں تھا۔اور شاید سیکولرازم کی بات کرتے ہوئے انھیں اپنے ہی ضمیر کے طمانچوں کا سامنا کرنا پڑتا۔مگر یہ بات تو زندہ ضمیر لوگوں کی ہے!!

سیکولرازم ایک وسیع الجہات اور سریع الاثر نظریہ ہے جو اپنے معتقدین کی فکر میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔تصور کائنات یعنی انسان کے کائنات میں مقام سے لے کر زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں سیکولرازم پر یقین رکھنے والوں کے خیالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ چونکہ یہ نظریہ مسیحی یورپ کی دینی آمریت کے خلاف ردّعمل کے طور پر پروان چڑھا، اسی لیے سیکولر افراد میں مذہب کے خلاف شدید نفرت اور عمومی بغاوت کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کسی بات کو درست بھی سمجھتے ہوں، جونہی انھیں معلوم ہو

جائے کہ اس بات کا سرچشمہ مذہب کی تعلیمات ہیں، تو وہ اس سے شدید بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اس کو جنونی انداز میں مسترد کر دیتے ہیں۔ان کے اندر مریضانہ عقل پرستی بلکہ الحاد پرستی کا نفسیاتی مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ذرا معتدل مزاج کے سیکولر افراد خدا کے وجود سے تو کلیۃً انکار نہیں کرتے مگر یوم آخرت، جنت اور دوزخ کے معاملات انھیں محض علامتی باتیں لگتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔(نعوذ باللہ)

ایسے معتدل حضرات اخلاقی بزدلی کا شکار ہوتے ہیں، وہ کھل کر پبلک میں تو مذہب کا انکار نہیں کرتے لیکن اپنی نجی محفلوں میں مذہب کو رجعت پسندی کہہ کر اپنی ''ترقی پسندی'' کا اعتبار قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ مذہب کا جو منافقانہ اور خانہ زاد مجہول سا تصور ان لوگوں نے قائم کر رکھا ہے، اس کی رُو سے یہ لوگ نماز، روزہ، حج وغیرہ کو غیر ضروری بلکہ نامعقول رسومات (Rituals) کا نام دیتے ہیں۔ مغرب کے سیکولر دانشوروں نے مذہبی عبادات کے لیے Rituals کی ترکیب گھڑ کر ایسے نوآموز سیکولر افراد کے منہ میں ڈال دی ہے، اب یہ موقع بے موقع اس کی جگالی کا شغل فرما کر مولویوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اپنی تمام تر مذہب دشمنی کے باوجود یہ حضرات یہ دعویٰ کرنے سے باز نہیں رہتے کہ مذہب کا اصل مقصود 'انسان دوستی' ہے۔عبادات تو اس مذہب کے زمرے میں آتی ہیں جنھیں مولویوں نے مسخ کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنی پیٹ پوجا کر سکیں۔'انسان دوستی' ایک اور مغالطہ آمیز ترکیب ہے جو ان حضرات کے وردِ زبان رہتی ہے اور یہ پاکستان جیسے مذہبی معاشروں میں اس اصطلاح کو عوام کی طرف سے ممکنہ ردّعمل کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس ''انسان دوستی'' جس کے لیے انگریزی میں ''ہیومن ازم'' کی اصطلاح مروّج ہے، کا وہ مفہوم پاکستانی عوام کے سامنے قطعاً پیش نہیں کرتے جو انگریزی زبان کے انسائیکلوپیڈیا یا بنیادی ماخذوں میں موجود ہے۔ ہیومن ازم کی اصطلاح اپنے مفہوم کے اعتبار سے سیکولرازم کے بہت قریب ہے۔اس کا مختصر مطلب یہ ہے کہ کائنات میں خدا، یا مافوق الطبیعیاتی وجود کے بجائے انسان ہی درحقیقت اصل مرکز ومحور ہے۔ الہامی

تعلیمات کے بجائے انسانی عقل عام انسانوں کے لیے زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکتی ہے۔ ہیومن ازم دراصل ''خداپرستی'' کے مقابلے میں ''انسان پرستی'' کا درس دیتی ہے۔ سیکولرازم میں ''دنیا پرستی'' اور ہیومن ازم میں ''انسان پرستی'' دراصل ایک ہی فلسفہ کے دو رُخ ہیں۔ پاکستان کے علما کو یہ سیکولر افراد حقارت سے 'مُلاّ' اور آج کل انسانی حقوقیوں کی ایک جدید سیکولر نسل انھیں ''جنونی اور جہادی مُلاّ'' کے القابات عطا کرتی ہے۔ 'مُلاّ' کا لفظ سنتے ہی ان کے چہرے کی رنگت بدلنا شروع ہو جاتی ہے اور ان کے روشن خیال ذہن سے ترقی پسندانہ گالیاں جھاگ بن بن کر اُڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ 'مُلاّ' کو انھوں نے محض نام کے طور پر استعمال کرنا ہوتا ہے، ورنہ ان کا اصل ہدف اسلام ہی ہوتا ہے۔

آپ جب بھی ان کی ترقی پسندانہ (درحقیقت ملحدانہ) سوچ کی تردید کے لیے قرآن وسنت کا حوالہ دیں، تو یہ سیکولر افراد بغیر کوئی وقت ضائع کیے 'فتویٰ' اُچھال دیں گے: ''جناب چھوڑیے! یہ سب مُلاّ کی کارستانی ہے، مُلاّ نے اسلام کی من چاہی تعبیر نکالی ہوئی ہے، ورنہ اسلام تو روشن خیال، لبرل اور بے حد ترقی پسندانہ مذہب ہے۔ کٹھ ملائیت نے اسلام کو جدید زمانے میں بے حد بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہم مہذب ملکوں میں ملاؤں کی اس تنگ نظری کے باعث وحشی سمجھے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ''...... آزادئ نسواں کی علمبردار سیکولر خواتین تو بات بات میں 'مُلاّؤں' پر برسنا اپنی ذہنی اور 'روحانی صحت' کی حفاظت کے لیے ضروری سمجھتی ہیں۔ عورتوں کی نصف وراثت کا معاملہ ہو، یا مردوں کے لیے طلاق کا حق مخصوص کرنے کی بات ہو، یا پھر مرد و زَن کے اختلاط کے منافی کوئی قرآن وسنت سے حوالہ، یا پھر حجاب، جس سے یہ بے حد خار کھاتی ہیں، کی بات ہو، ایسی کوئی بات کر کے متکلم کو اپنی آبرو کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ وہ چھوٹتے ہی اسے تنگ نظر، ظالم، عورت دشمن، رجعت پسند اور شہوت پرست مُلاّ کے ''ریڈی میڈ'' قسم کے خطابات کا تختۂ مشق بنانا شروع کر دیں گی۔ انھیں قرآن سے خود یہ حوالہ جات دیکھنے کی تجویز دی جائے تو کہتی ہیں: ہم عربی تو جانتی نہیں ہیں، مولویوں نے قرآن کا غلط ترجمہ کر کے عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کی سازش کی ہے۔''

سیکولرازم کے 'متاثرین' کے مختلف درجات ہیں۔ یاد رکھیے سیکولرازم ایک فکری سرطان ہے جو قومی جسد کے اعضائے رئیسہ کو تباہ کر کے پوری قوم کو اس کی نظریاتی اساس یعنی اس کی روح سے اسے جدا کر کے اسے فکری اور روحانی موت سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس مرض کے جراثیم جس فرد یا معاشرے میں نفوذ کر جائیں، آہستہ آہستہ بڑھتے رہتے ہیں۔ سرطان کے مرض کے متعلق یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اگر اسے ابتدائی مرحلے میں کنٹرول کر لیا جائے تو یہ مہلک ثابت نہیں ہوتا۔ مریض کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتا ہے، لیکن اگر اس پر توجہ نہ دی جائے تو پھر اچانک اس کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور مریض آناً فاناً موت کے اندھے غار میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب بے بسی سے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی اس جہانِ فانی سے رخصتی کا ہولناک منظر دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہی مثال معاشروں کو لگے ہوئے سیکولرازم کے سرطان پر بھی صادق آتی ہے۔ مغربی معاشرہ اپنی تباہی کے آخری دہانے پر ہے۔ اس تباہی کے پس پشت اگر غور کیا جائے تو اس کا سبب سیکولرازم کا سرطان ہی ہے۔ مغربی دانشوروں نے اس فکری سرطان کو آزادیوں کا سرچشمہ سمجھ کر بڑھنے دیا۔ اس کے علاج کی بات تو ایک طرف، وہ اسے مرض سمجھنے کے لیے ہی تیار نہ تھے۔ آج وہ سر پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں، اور یہ مرض لاعلاج صورت اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن مفکر اوسوالڈ سپنگلر نے ''زوالِ مغرب'' کے عنوان سے اپنی کتاب میں مغرب کے اس مرض کی طرف توجہ دلائی تھی، کچھ اور مفکرین نے بھی مغرب کے بڑھتے ہوئے اخلاقی زوال کے خطرات سے اہل یورپ کو متنبہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کی ساری کاوشیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ آزادیوں اور جنسی آوارگیوں میں مست مغرب اس طرح کے اہل دانش کو پرانے وقتوں کے لوگ سمجھ کر دھتکارتا رہا اور آج خاندانی نظام کو بچانے کے لیے اہل مغرب بالکل اس طرح کی لاحاصل کوششیں کر رہے ہیں جس طرح کہ ایک فزیشن خون کے سرطان کے مریض کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ

وہ سمجھتا ہے کہ اس کے علاج کا اس مریض کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

ممکن ہے بعض حضرات راقم کی طرف سے سیکولرازم کے لیے فکری سرطان کی ترکیب کو قبول کرنے میں تامل کا شکار ہوں، مگر یورپ و امریکہ میں جنسی ہوسنا کی کی تسکین کے یہ گھٹیا اور عام مناظر، بے نکاحی ماؤں کی گود میں حرامی بچوں کی بہاریں، خاندانی ادارے کی تباہی، الحاد و زندیقیت کا سیلاب، حیوانیت وشہوانیت کے اُبلتے جذبات، عورتوں اور مردوں میں ہم جنس پرستی جیسے غلیظ رجحان میں روز بروز اضافہ، عورتوں میں حیا وشرم کا فقدان، نسوانی حقوق کے نام پر بے حیائی کا پرچار، مادّہ پرستی اور ہوس پرستانہ خودغرضی کے غیرانسانی واقعات، سمندری ساحلوں، پارکوں اور ایئرپورٹوں پر اباحیت مطلقہ کی شرمناک حرکات، آخران سب مظاہر کے اسباب کیا ہیں۔ ہرعمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی سوچ کارفرما ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا چند اور دیگر جرائم اور قباحتوں کی بنیادی وجہ مغربی معاشرے کی الہامی تعلیمات سے رُوگردانی اور سیکولرازم (لادینیت) کی پذیرائی ہے۔ایسے مظاہر کا ظہورصرف مغربی معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ پاکستان جیسے اسلامی معاشرے میں بھی رونما ہو سکتے ہیں اور کہیں کہیں ہو رہے ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ سیکولرازم کو جس طرح فروغ دے رہے ہیں، اس کے نتائج یہاں بھی وہی ہوں گے جو مغرب میں قابل مشاہدہ ہیں۔

سیکولرازم کے فتنہ کا شکار بعض وہ مسلمان بھی ہیں، جو اپنے آپ کو''اسلامی مفکر'' سمجھنے کی خوش فہمی میں بھی مبتلا ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اس مرض کا اثر ابھی ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ اسلام کی ہر بات کو سیکولر نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل ان پر 'جدیدیت' کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔شروع شروع میں جب کسی اسلامی مفکر کو سیکولرازم کا دورہ پڑتا ہے تو وہ غلام احمد پرویز اور رفیع اللہ شہاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ رفیع اللہ شہاب پر اس سیکولرازم کا اثر ہی ہے کہ موصوف انگریزی زبان میں اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر پرمبنی اپنے مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ چند ماہ قبل روزنامہ ''دی نیشن'' میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں موصوف نے اسلام

کے دور اوّل میں پائی جانے والی کنیزوں اور لونڈیوں کو جدید دور کی اصطلاح میں ''ورکنگ وومن'' قرار دیا اور پھر ان کی مثال سے استنباط کرتے ہوئے آج کل کی ''ورکنگ وومن'' کے لیے پردہ غیرضروری ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ موصوف چونکہ انگریزی زبان میں لکھتے ہیں، اس لیے علما کی گرفت سے بھی بچے رہے۔ موصوف روشن خیال عورتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے جنون میں قدیم عرب معاشرے کی لونڈیوں اور آج کل کی ملازم بیگمات کے درمیان حفظ مراتب کو یکسر فراموش کر گئے۔ سیکولرازم کے مرض میں تھوڑا سا اضافہ ہوتا ہے تو فرد کی شخصیت میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے، وہ جسٹس محمد منیر اور اصغر خان کی طرح کی شخصیات کی افزائش میں بدل جاتی ہے۔ سیکولرازم کے سرطان کی آخری منزل میں پہنچے ہوئے 'لبرل' لوگ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جیسی ارواح خبیثہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ملعون رشدی نے اپنے ناول ''شیطانی آیات'' کے متعلق دفاع کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں یہ بکواس کی: (استغفراللہ)

"It is an attempt to write about religion and revelation from the point of view of a secular person." (Times of India: 8-10-88)

یہ (کتاب) مذہب اور وحی کے بارے میں ایک سیکولر آدمی کا نقطہ بیان کرنے کی کوشش ہے''۔

جو لوگ سیکولرازم کا مطلب ''ریاستی معاملات میں غیرجانبداری'' ہی بتاتے ہیں، انھیں سلمان رُشدی کے اس بیان پر توجہ دینی چاہیے۔ کیا پاکستان کے لبرل دانشور یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ سیکولرازم کے بارے میں سلمان رشدی سے زیادہ جانتے ہیں؟ ملعونہ تسلیمہ نسرین جس نے اپنے ناول میں قرآن مجید کے متعلق سخت اہانت آمیز باتیں لکھی تھیں، وہ آزادئ اظہار کے اس سیکولر تصور کی روشنی میں ان خرافات کا جواز بتاتی ہے۔ ہمارے پاکستان میں بھی تسلیمہ نسرین کی ہم خیال این جی اوز سے تعلق رکھنے والی کئی بیگمات موجود ہیں۔ مگر رائے عامہ کے خوف کی وجہ سے اور کچھ رشدی اور تسلیمہ کی عبرتناک دربدری

اور رُوپوشی کی وجہ سے ان میں اپنے غلیظ خیالات کو ظاہر کرنے کی جرأت نہیں ہوسکی۔

آئین پاکستان کی رُو سے پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے۔ پاکستانی آئین قرآن وسنت کی بالادستی کے اصول پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئین کے آرٹیکل 227 کی رُو سے قرآن وسنت کے منافی کسی قسم کی قانون سازی نہیں کی جاسکتی۔ مذکورہ آرٹیکل کی رُو سے پاکستان میں پہلے سے موجود کسی بھی قانون جو قرآن وسنت سے متصادم ہو، کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے۔ بالفرض پاکستان میں سیکولرازم کو نافذ کر دیا جائے، تو اس سے جو گھمبیر انقلاب رونما ہوگا اور اس بنیادی تبدیلی کے پاکستان کے ریاستی ڈھانچے اور سماجی اداروں پر جو اثرات مرتب ہوں گے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) اسلام کے بنیادی اصول کے مطابق حکم حقیقی صرف اللہ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیات میں اس بنیادی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے: **ان الحکم الا للّٰہ** (یوسف:67) ''حکم کسی کا نہیں چلتا مگر اللہ کا''۔ ایک اور جگہ فرمایا: **الالہ الحکم وھواسرع الحسبین** (الانعام:62) ''خبردار! اسی کو حاصل ہیں فیصلے کے سارے اختیارات اور وہ سب سے جلد حساب لینے والا ہے۔''

اسلامی نظریہ کے مطابق حکومت اور سلطنت کی اصل مالک ذات باری تعالیٰ ہے۔ رسول کریم ﷺ اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے جہاں شریعت کے ترجمان ہیں وہاں مسلمانوں کے سیاسی سربراہ بھی ہیں۔ بعد میں آنے والے خلفا اور مسلم حکمران، حضور نبی اکرم ﷺ کی اس سیاسی حیثیت کے ذمہ دار متصور ہوتے ہیں جو ایک مقدس امانت ہے۔ اسلامی ریاست کا مقصود ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق نافذ کرے۔ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

❏ ''اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصل حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیے ہیں، ان کے تتبّع سے اہل علما اور مجتہدین

دین کے نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

- ''اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ اس لیے حقیقی مصلحتیں اس حکم میں ہیں جس کو اللہ تعالیٰ عالم الغیب نے نازل فرمایا''۔

(سیرت النبیؐ: جلد ہفتم، ص 174)

اسلام کے ان اساسی نظریات کا موازنہ اگر سیکولرازم کے بنیادی تصورات سے کیا جائے تو دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ سیکولرازم میں خدائی احکام کے بجائے عقل کی تاویلات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ سیکولرازم کی بنیاد ہی مذہب سے نفرت اور بیزاری پر مبنی ہے۔ اگر سیکولرازم کو پاکستان میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام ریاست کا سرکاری مذہب نہیں رہے گا۔ کیونکہ سیکولرازم کے مطابق مذہب ایک شخصی معاملہ ہے جس کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب مذہب کی سرکاری حیثیت ختم ہو جائے تو پھر قرآن وسنت کی قانونی ڈھانچے میں بالادستی بھی قائم نہیں رہے گی۔ کوئی بھی قانون چاہے وہ قرآن وسنت سے کس قدر متصادم ہو، اسے چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔ اب تک پاکستان میں یہ صورت ہے کہ اگرچہ اسلامی شریعت کا مکمل نفاذ عمل میں نہیں لایا گیا، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ اسلام سے مخلص نہیں ہے۔ مگر رائے عامہ کے دباؤ کے تحت پاکستان کے کسی بھی سیکولر حکمران کو قرآن وسنت کی صریحاً خلاف ورزی پر مبنی کسی بھی قانون کو نافذ کرنے کی اب تک جرأت نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً پاکستان کے کئی حکمران شراب نوشی میں مبتلا رہے ہیں لیکن پاکستان میں شراب نوشی کو جائز قرار دینے کا حوصلہ کسی کو بھی نہ ہوا۔ پاکستان میں ابھی تک سودی نظام رائج ہے مگر کسی بھی صدر یا وزیراعظم یا کسی فوجی حکمران نے سود کو جائز قرار دینے کی ہمت نہیں کی۔ سودی نظام کو جاری رکھنے میں مختلف تاویلات سے کام لیا جاتا رہا ہے اور

مستقبل میں غیر سودی نظام رائج کرنے کے وعدوں پر عوام کو مسلسل ٹرخایا جاتا رہا ہے۔ اگر سیکولرازم کو پاکستان کی نظریاتی اساس تسلیم کرلیا جائے تو پھر شراب نوشی اور سودی کاروبار کو اگر کوئی جائز قرار دیتا ہے تو اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔

(2) پاکستان کا سیکولر طبقہ جو آج کل سیکولرازم نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے، سیکولرازم کو محض ''ریاستی غیر جانبداری'' کا نام دیتا ہے۔ اگر اسے مکمل اقتدار مل گیا تو پھر یہ محض 'غیر جانبدار' نہیں رہے گا۔ دینی طبقہ، علما اور اسلام پسندوں کے خلاف یہ جس طرح کی شدید نفرت کرتے ہیں، اس کا عملی مظاہرہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد سامنے آ جائے گا۔ ترکی اور دیگر اسلامی ممالک میں لادینیت پسندوں نے علما کو جس بہیمانہ تشدد اور ذلت آمیز سلوک کا نشانہ بنایا، وہ اسلامی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے۔ جب لادینیت پسند اقتدار میں نہیں ہوتے تو یہ 'برداشت' اور 'رواداری' کے ترانے گاتے ہیں، مگر اقتدار میں آ کر ان پر وحشت اور بربریت غالب آ جاتی ہے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ 1998ء میں ترک پارلیمنٹ کی رکن ایک خاتون محترمہ مروہ کی محض اس 'جرم' کی پاداش میں نہ صرف پارلیمنٹ کی رُکنیت ختم کر دی گئی بلکہ انھیں ملک بدر کر دیا گیا کہ وہ اسمبلی کے اجلاس میں سر پر سکارف لے کر آئی تھیں جو کہ اسلامی خواتین کے شرم وحیا کی علامت ہے۔ تُرکی کے بظاہر مسلمان مگر اصل میں 'روشن خیال' لادینیت پسندوں کو ان خواتین پر تو کوئی اعتراض نہیں ہے جو اسمبلی میں یورپی لباس سکرٹ وغیرہ پہن کر آتی ہیں، مگر ایک خاتون رکن کے سکارف پہننے سے ان کا سیکولرازم خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

(3) پاکستان کے لادینیت پسند مغرب زدہ طبقہ کا اصل ہدف ہی یہ ہے کہ ترقی کے نام پر اس ملک میں مغربی تہذیب اور الحاد کو رواج دیا جائے۔ وہ خود سوچنے سمجھنے یا آزادانہ تحقیق کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ان کی فکر کا حقیقی سرچشمہ تہذیب مغرب ہی ہے۔ یورپی مفکرین کے افکار کی جگالی کو ہی یہ لوگ 'دانشوری' کا نام دیتے ہیں۔ پاکستان

کے بدیسی اشتراکیوں کی کوئی تحریر دیکھیں یا ان کی تقریر سنیں، ڈیڑھ درجن اشتراکی اصطلاحات کو گھما پھرا کر یہ لوگ موقع بے موقع بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال مغربی تہذیب کے دلدادگان کا ہے۔ پاکستانی کلچر، اُردو زبان، مقامی لباس، مقامی کھانوں اور مقامی اقدار سے انھیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ ان سے یہ نفرت کرتے ہیں۔ مقامی اقدار سے نفرت کے اظہار کو یہ روشن خیالی کا نام دیتے ہیں۔ اگر اس ملک میں سیکولرازم کو نافذ کر دیا جاتا ہے تو سرکاری ذرائع ابلاغ میں قومی ثقافت کی معمولی سی جھلک جو آج ہم دیکھ پاتے ہیں، یہ بھی مفقود ہو جائے گی۔ اتاترک نے ترکوں کو ترکی ٹوپی پہننے سے منع کر دیا، اس نے اعلان کیا کہ یہ لباس غیر مہذب اور غیر شائستہ ہے، لہٰذا اس نے مغربی لباس کا پہننا ضروری قرار دیا۔ اس نے عربی رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط جاری کیا جس کے نتیجے میں ترکوں کی آنے والی نسلیں مسلمانوں کے عظیم تاریخی ورثہ اور کتب سے بیگانہ ہو کر رہ گئیں۔

(4) سیکولرازم میں کسی ایسے نظام تعلیم کو برداشت نہیں کیا جاتا جس میں مذہبی تعلیمات کا ذکر ہو، پاکستان کے موجودہ نظام تعلیم میں ایک خاص تناسب سے اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کو مختلف درجات میں نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اگر پاکستان کو خدانخواستہ سیکولر ریاست بننے دیا گیا تو یہاں کا نظام تعلیم یکسر لادینی اور مذہب دشمن ہو جائے گا۔ اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان جیسے مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تعلیمی اداروں کا ماحول 'لبرل' اور 'ماڈرن' ہو جائے گا۔ یونیورسٹیوں میں ہی نہیں بلکہ کالجوں میں بھی مخلوط تعلیم کو رائج کر دیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں میں جنسی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہ بات تو پہلے ہی یونیسکو کے پروگرام میں شامل ہے۔ موسیقی اور لہو ولعب کے پروگراموں کے تعلیمی اداروں میں انعقاد پر کسی قسم کی قدغن نہیں ہو گی۔ کسی ایسے فرد کو تعلیمی اداروں میں ملازمت نہیں ملے گی جو سیکولرازم پر یقین نہ رکھتا ہو۔ مصر کی سیکولر حکومت نے طالبات پر پابندی لگا دی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں میں سکارف اوڑھ کر نہیں جاسکتیں۔ پاکستان کے لادینیت پسند ان سے

پیچھے نہیں رہیں گے۔آزادانہ اختلاط کی وجہ سے نوجوان نسل میں جنسی بے راہ روی فروغ پائے گی۔ پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں خدا وہ دن نہ دکھائے جب تعلیمی اداروں میں بے نکاحی مائیں زیرِ تعلیم ہوں جیسا کہ جدید یورپ میں ہو رہا ہے۔

(5) پاکستان میں این جی اوز نے عورتوں کے حقوق کے نام پر ہی فتنہ کھڑا کر رکھا ہے۔سیکولرازم کے نفاذ کے بعد پاکستانی خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ پاکستان میں طلاقوں کی شرح میں ہوش رُبا اضافہ ہو جائے گا۔'لبرل' عورتیں یورپ کی طرح کھلم کھلا اپنے آشناؤں کے ساتھ 'میاں بیوی' کی حیثیت سے رہنا شروع ہو جائیں گی اور قرآن وسنت کی رُو سے ان پر گرفت نہیں کی جا سکے گی۔این جی اوز خواتین کے لیے ہر وہ حق مانگ رہی ہیں، جس میں ان کی آزادانہ مرضی کو دخل ہو۔ یورپ کی عورتوں نے اسی آزادانہ مرضی کا حق استعمال کرتے ہوئے ہم جنس پرستی کو بنیادی حقوق میں شامل کروا لیا ہے۔ ازدواجی عصمت دری کی سزا بھی نافذ ہوگئی تو کئی شوہروں کو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔خواتین جب چاہیں گی، مردوں کو طلاق دے کر نئی منزلوں کا سفر اختیار کر لیں گی۔سیکولرازم کے نفاذ کے بعد پاکستان میں گھریلو زندگی کا نقشہ یکسر بدل جائے گا۔اسقاطِ حمل کی اجازت کی وجہ سے جنسی بے راہ روی کا سیلاب آجائے گا۔

(6) سیکولرازم کے نفاذ کے بعد پاکستان میں سب سے اہم تبدیلی یہ آئے گی کہ پاکستان اپنے قیام کے جواز سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ پاکستان کا صحیح تشخص، اس کی اسلام سے وابستگی ہے۔سیکولرازم کا ہدف پاکستان جیسے اسلامی معاشرے کو اسلامی تشخص سے محروم کر کے اس میں مغربی تہذیب کی ملحدانہ اقدار کو پروان چڑھانا ہے۔ ہمارے سیکولر دانشوروں کو پاکستان کے نام کے ساتھ ''اسلامی جمہوریہ'' کے الفاظ تک پسند نہیں ہیں۔ پاکستان کا ہر قابل ذکر دانشور جو سیکولرازم پر یقین رکھتا ہے، یہی فکر رکھتا ہے۔ پاکستان کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کا سوال پاکستان کے مستقبل اور بقا کے سوال سے جُڑا ہوا ہے۔ یہ ایک عظیم چیلنج ہے جو اہل پاکستان کو فکری ارتداد کے شکار 'پاکستانیوں' کی

طرف سے دیا جا رہا ہے۔ بیرونی اعتبار سے پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کا ذمہ تو پاکستان کی مسلح افواج نے لے رکھا ہے، مگر اس مملکت خداداد کی نظریاتی سرحدوں کی ذمہ داری کون سنبھالے گا؟ یہ ہم سب کے سوچنے کی بات ہے۔ اگر ہم ایک زندہ قوم کی طرح سے اپنا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس اہم قومی مسئلہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ سیکولرازم ایک عظیم فتنہ ہے جس کی بیخ کنی انفرادی جدوجہد کے بجائے اجتماعی تحریک کے ذریعہ ہی ممکن ہے!!

محمد عطاء اللہ صدیقی

قائداعظمؒ اور تھیوکریسی

قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد بارہا وضاحت فرمائی کہ پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آنے والی ریاست کا طرزِ حکومت 'تھیوکریسی' پر مبنی نہیں ہوگا۔ انھیں اپنے بیانات و تقاریر میں اس طرح کی وضاحت یا 'تھیوکریسی سے بریت' کے اعلان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ نہایت اہم سوال ہے مگر قائداعظم کے ان بیانات سے ان کے تصورِ ریاست کے بارے میں استنباط فرمانے والے دانشوروں میں سے کسی نے اس بنیادی سوال کا شافی جواب دینا تو ایک طرف، اس پر غوروفکر کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ پاکستان کے سیکولر دانشوروں نے 'تھیوکریسی' کے ضمن میں قائداعظم کے بیانات سے بلااستثنا یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ وہ (قائداعظم) سیکولر ریاست قائم فرمانا چاہتے تھے۔ یہ حضرات قائداعظم کے تھیوکریسی کی مخالفت پر مبنی بیانات سے بے حد اعتماد کے ساتھ یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ وہ اسلامی ریاست کے مخالف تھے۔ ہمارے خیال میں ان کا یہ استنباط واستخراج نہایت مغالطہ انگیز ہے۔ قائداعظم بلاشبہ 'تھیوکریسی' کے حامی نہیں تھے، مگر ان کا کوئی بھی بیان سیکولر ریاست کی تائید یا اسلامی ریاست کی مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ ہماری اس رائے کی صداقت اور حقیقت اس وقت تک کھل کر سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ درج ذیل سوالات اور اشکالات کی وضاحت پیش نہ کردی جائے......

1- 'تھیوکریسی' کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم کیا ہے؟ مغرب کے سیاسی لٹریچر میں اس سے عام طور پر کیا مراد لیا جاتا ہے؟

2- 1940ء کے عشرے میں ہندوستان کے سیاستدان یا دانشور 'تھیوکریسی' کا ذکر کن معنوں میں کرتے تھے؟

3- قائداعظم کے ذہن میں تھیوکریسی کا مفہوم کیا تھا؟

4- قائداعظم نے اپنی جن تقاریر، بیانات اور انٹرویوز میں 'تھیوکریسی' کے متعلق اظہارِ خیال کیا، ان کا سیاق وسباق اور حقیقی پس منظر کیا ہے؟

5- قائداعظم کے اسلامی ریاست کے قیام اور تھیوکریسی کی مخالفت پر مبنی بیانات میں تطبیق کیسے کی جاسکتی ہے؟

قائداعظم کے تھیوکریسی کے متعلق بیانات کا ان کے دوقومی نظریہ، قراردادِ لاہور اور اسلام کے نام پر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کے پرجوش مطالبہ سے گہرا تعلق ہے۔ 23 مارچ 1940ء کو جب اُنھوں نے لاہور کے منٹو پارک میں دوقومی نظریہ کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کیا اور لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں قراردادِ لاہور پاس کرائی تو ہندوستان کا سیاسی منظر یک لخت بدل گیا۔ ہندو پریس نے قرار دادِ لاہور کو طنزاً قراردادِ پاکستان کہا۔ گاندھی، نہرو اور دیگر چوٹی کے ہندو راہنماؤں نے قائداعظم کے علیحدہ وطن کے مطالبہ کی شدید مخالفت کی۔ ہندوستان کے سیکولر اور کمیونسٹ دانشوروں نے محض مذہب کی بنیاد پر علیحدہ ریاست کے قیام کے مطالبہ کو دقیانوسی، رجعت پسندی اور فرقہ وارانہ ذہنیت پر مبنی قرار دیا۔

ہندو راہنماؤں نے تحریر وتقریر میں تصورِ پاکستان کی مخالفت میں رائے عامہ کو بیدار کرنا شروع کردیا۔ اُنھوں نے قائداعظم اور پاکستان کے خلاف اپنے مذموم پروپیگنڈا میں جن دلائل کو بار دہرایا، ان میں ایک دلیل یہ تھی کہ قائداعظم پاکستان کا نام لے کر ایک تھیوکریٹک ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں غیرمسلم اقلیتوں کو اچھوت کا درجہ حاصل ہوگا اور ان سے نہایت درجہ امتیازی سلوک ہوگا، انھیں کسی قسم کے سیاسی یا معاشی حقوق حاصل نہیں ہوں گے، وہ محض تیسرے درجہ کے شہری بن کر رہنے پر مجبور ہوں گے، وہاں سخت گیر ملاؤں کی حکومت ہوگی جو ان کا جینا حرام کردیں گے۔ کانگریسی راہنماؤں کے اس مذموم پروپیگنڈا کو یورپ کے اخبارات اور دانشوروں میں بے حد پذیرائی ملی۔

یورپ کئی صدیوں سے کلیسائی پیشوائیت کو شکست دے کر سیکولرازم کو عملاً نافذ

کرچکا تھا۔ وہاں کے لبرل اور روشن خیال دانشور ہر اس سیاسی فلسفہ کے شدت سے مخالف تھے جس میں مذہب کی بنیاد پر ریاست کے قیام کی گنجائش موجود ہو۔ گذشتہ کئی صدیوں کے دوران عالم اسلام اور یورپ کے درمیان برپا سیاسی کشمکش کی وجہ سے ان کے ذہن اسلام کے خلاف سخت تعصب کا شکار تھے۔ وہ اسلامی ریاست اور تھیوکریسی کے درمیان بدیہی اور اُصولی فرق کے متعلق بالکل بے بہرہ تھے، قائداعظم جیسے مغرب کے اداروں سے تعلیم یافتہ مسلمان راہنما نے جب اسلام کے نام پر پاکستان کا مطالبہ پیش کیا، تو ہندوستان اور برطانیہ کے پریس نے اسے تھیوکریسی کے احیا کا مطالبہ قرار دیتے ہوئے پروپیگنڈا کا طومار باندھ دیا۔

قائداعظم کی پوزیشن بے حد نازک تھی، وہ کسی طریقے سے یورپی تاریخ میں مذکور تھیوکریسی کے تصور کو قبول بھی نہیں کرسکتے تھے اور اسلام کے نام پر قیامِ پاکستان کے مطالبہ سے دستبردار ہونے کو تیار بھی نہ تھے۔ ان حالات میں انھیں ایک سیاستدان کے ساتھ ایک اسلامی فلسفی اور متکلم کا کردار بھی ادا کرنا پڑا۔ اُنھوں نے بارہا تھیوکریسی اور اسلامی ریاست کے مابین اُصولی فرق کو بیان فرمایا اور بے حد مبلغانہ اور مدبرانہ انداز میں اسلام کے رواداری اور انسانی مساوات کے اعلیٰ اُصولوں کی وضاحت فرماتے ہوئے بار بار یقین دہانی کرائی کہ پاکستان بن جانے کے بعد غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں کی جائے گی، اُنھوں نے تاریخ اسلام کے روشن ابواب کا حوالہ دے کر ثابت کیا کہ مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہیں کیا جس کا خوف دلا کر پاکستان دشمن عناصر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ تھیوکریسی کے متعلق قائداعظم کا جو پہلا بیان ریکارڈ پر ہے، وہ قراردادِ لاہور کے پیش ہونے کے بعد کا ہے۔ اس ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام بیانات اُنھوں نے پاکستان کے متعلق پیش کیے جانے والے بے بنیاد اور غلط خدشات کی تردید میں ارشاد فرمائے۔

قائداعظم کی تقاریر اور بیانات کو مدوّن کرکے شائع کردیا گیا ہے۔ بزمِ اقبال

لاہور نے چار ضخیم جلدوں میں ان کا 1998ء میں ترجمہ از اقبال صدیقی شائع کر دیا ہے۔

راقم الحروف کے علم کے مطابق قائداعظم کے صرف چھ ایسے بیانات ریکارڈ پر ہیں جو اُنھوں نے 'تھیوکریسی' کے متعلق اُٹھائے گئے سوالات کی وضاحت کرتے ہوئے دیے۔ ان چھ بیانات کے مفصل اقتباسات اور ان پر راقم کا تبصرہ حسبِ ذیل ہے:

1- 'تھیوکریسی' کے متعلق قائداعظم کا پہلا بیان 2 نومبر 1941ء کا ہے جو اُنھوں نے ''مستقبل قریب کی جدوجہد میں نوجوانوں کی ذمہ داری'' کے موضوع پر مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ قائداعظم کا یہ پورا خطبہ ہندو راہنماؤں اور ہندو اخبارات کے اداریوں کے جوابات پر مبنی ہے۔ اس تقریر میں آپ نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

- ''آپ نے ہندو راہنماؤں کے بیانات اور ذمہ دار ہندو اخبارات کے اداریے بھی پڑھے ہوں گے۔ وہ بہت شرارت آمیز اور خطرناک قسم کے دلائل دے رہے ہیں۔ لیکن وہ یقیناً اُلٹ کر انھیں کے سر پر آن پڑیں گے۔''

مہاتما گاندھی کے ایک بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

- ''موجودہ صورتحال کے بارے میں مسٹر گاندھی نے کہا تھا: ''اس مرحلے پر فرقہ وارانہ اتحاد کی عدم موجودگی میں عوامی کارروائی کے معنی ہیں: خانہ جنگی کو دعوت دینا''

اُنھوں نے کہا:

- ''اگر میں کانگریس کے ذہن کو سمجھتا ہوں تو یہ کانگریس کی خواہش اور دعوت پر کبھی نہیں ہوگی...... جب دو بھائی اکٹھے نہیں رہ سکتے تو کیا ہوتا ہے؟ وہ تقسیم کا سہارا لیتے ہیں اور خوش وخرم زندگی بسر کرتے ہیں۔ پاکستان کی تجویز کے تحت ہم بھی یہی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس تجویز کا نتیجہ خانہ جنگی ہونا چاہیے؟ میں صرف ایک حصہ مانگتا ہوں اور مسٹر گاندھی کل طلب کرتے ہیں۔''

قائداعظم کے تقریر کے اس بہاؤ rythm میں ان کا یہ بیان دیکھئے جس میں اُنھوں نے 'تھیوکریسی' کے متعلق ہندو راہنماؤں کے خدشات کا دلیل سے جواب دیا

ہے۔ اُنھوں نے فرمایا:

❑ ''پس خواتین و حضرات! دیکھیں ہندو راہنما کیا کہہ رہے تھے۔ میں صرف ایک ممتاز سابقہ کانگریسی اور ایک سابق وزیر داخلہ مسٹر منشی کی تقریر سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔ اخبارات میں شائع شدہ تقریر کے مطابق اُنھوں نے کہا: ''تجویز پاکستان کے تحت جو حکومت قائم ہوگی، وہ سول حکومت نہیں ہوگی جو تمام فرقوں پر مشتمل ایک مخلوط مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہو بلکہ وہ ایک ''مذہبی حکومت'' (تھیوکریسی) ہوگی جس نے اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق حکمرانی کرنے کا عہد کر رکھا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمام لوگ جو اس مذہب کے پیروکار نہیں ہوں گے، ان کا اس حکومت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ایک کروڑ تیرہ لاکھ سکھ اور ہندو مسلمانوں کی مذہبی ریاست کے زیر سایہ اقلیت بن جائیں گے۔ یہ ہندو اور سکھ پنجاب میں عاجز ہوں گے اور ہند کے لیے غیر ملکی'' (اقتباس ختم)

مسٹر منشی کے بیان کو پڑھنے کے بعد قائداعظم نے فرمایا:

❑ ''کیا یہ ہندوؤں اور سکھوں کو مشتعل نہیں کیا جا رہا؟ ان کو یہ بتانا کہ وہ ایک مذہبی ریاست ہوگی جس میں انھیں جملہ اختیارات سے تہی دست رکھا جائے گا، بالکل غیر درست بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ میں مسٹر منشی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ صرف ان کے مذہب اور فلسفہ کی ہی اچھوتوں سے آشنائی ہے۔ اسلام ان غیر مسلموں کے ساتھ جو ہماری حفاظت میں ہوں، عدل، مساوات، انصاف، رواداری بلکہ فیاضانہ سلوک کا قائل ہے۔ وہ ہمارے لیے بھائیوں کی طرح ہوں گے اور ریاست کے شہری ہوں گے۔'' (تالیاں)

(قائداعظمؒ: تقاریر و بیانات: 1925، شائع کردہ: بزم اقبال، 2 کلب روڈ لاہور)

قائداعظم کی تقریر کے اس اقتباس کے آخری جملوں کا اُسلوب خالصتاً ایک مسلم فقیہ اور متکلم کا سا ہے جو ہندومت کے مقابلے میں اسلام کے اقلیتوں کے ساتھ سلوک کو برتر اور اعلیٰ بنا کر پیش کر رہا ہے، مگر الفاظ کا انتخاب مجادلانہ نہیں۔ قائداعظم نے

اپنی تقریر میں مسٹر منشی کے جس اخباری بیان کو پڑھ کر سنایا، وہ **1941**ء کے دوران ہندو راہنماؤں کی طرف سے قیامِ پاکستان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈا کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ قائداعظم کا جواب اسلام کے ریاستی فلسفہ کی مدبرانہ ترجمانی پر مبنی ہے۔ آپ نے بے حد خوبصورت انداز میں مستقبل کی اسلامی ریاست کے خلاف پیش کردہ خدشات کا جواب دیا۔

واضح رہے کہ مسٹر منشی نے مندرجہ بالا الفاظ **1941**ء میں لدھیانہ میں منعقد ہونے والی 'اکھنڈ ہندوستان کانفرنس' میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے کہے۔ اُنھوں نے اس خطبہ میں یہ بھی کہا:

❑ ''کیا تمھیں علم ہے کہ نظریہ پاکستان کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنے لیے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اُصولوں کے سانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظّم کیوں نہ ہو، وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کرلیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر وسناں کا نشانہ بنائے جائیں گے۔ ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوگی۔'' (ماہنامہ طلوع اسلام، دسمبر **1941**ء)

14 نومبر **1940**ء کے اداریے میں 'ہندوستان ٹائمز' نے تحریر کیا:

❑ ''تھیوکریسی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیا کی کوشش کریں۔''

قیامِ پاکستان کے مطالبہ کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں اہم ترین رکاوٹ یہی اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ بنگال، پنجاب اور سندھ میں ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی کا تناسب معتدبہ تھا۔ کانگریسی راہنما مسلسل ان میں عدمِ تحفظ کے احساس کو اُبھار رہے تھے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان کے ساتھ ناروا برتاؤ کیا جائے گا۔ علمی اور منطقی اعتبار

سے بھی یہ مسئلہ بے حد اہم تھا کیونکہ مسلم لیگ قائداعظم کی قیادت میں مذہب کی بنیاد پر علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کررہی تھی جس کی وجہ سے دوسرے مذاہب کے افراد کے دلوں میں وساوس کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ ان کے جذبات کو بھڑکانا بھی مشکل نہ تھا۔ پاکستان کے منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کے لیے کانگریس نے اس نفسیاتی کمزوری کو مؤثر ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ 1940 اور 1948ء کے دوران قائداعظم کی تقاریر میں اقلیتوں کو تحفظ کی یقین دہانی کا تذکرہ مسلسل ملتا ہے۔ ان کے ایسے بیانات جس میں اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ مذکور ہے، کا بالواسطہ تعلق 'تھیوکریسی' کے متعلق کانگریسی پراپیگنڈے کے جواب سے ہے۔

-2 'تھیوکریسی' کے الفاظ کے ساتھ قائداعظم کا دوسرا بیان جو ریکارڈ پر ہے، وہ 10 اپریل 1946ء کا ہے۔ یہ ان کا وہ معروف خطاب ہے جو اُنھوں نے 1946ء کے انتخابات میں بھرپور کامیابی کے بعد مسلم لیگ کے منتخب اراکین پارلیمنٹ سے فرمایا۔ اُنھوں نے پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

❑ "What are we fighting for? what are we aiming at? It is not theocracy, not for a theocratic state. Religion is there and religion is dear to us."

''ہم کس چیز کے لیے لڑ رہے ہیں؟ ہمارا نصب العین کیا ہے؟ یہ مذہبی پیشوائیت (تھیوکریسی) نہیں ہے، نہ ہی تھیوکریٹک مملکت کا قیام ہمارا مقصود ہے۔ مذہب موجود ہے اور مذہب ہمیں بہت عزیز ہے۔''

اس کے بعد کے جملوں کا صرف اُردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

❑ ''جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں تو تمام دنیاوی مفادات ہیچ نظر آتے ہیں۔ لیکن اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو بہت زیادہ اہم ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی، ہماری معاشی زندگی اور سیاسی اقتدار کے بغیر آپ کس طرح اپنے دین اور معاشی زندگی کا دفاع کرسکتے ہیں۔'' (ایضاً: جلد چہارم، صفحہ 116)

مسلمان اراکین اسمبلی کے نمائندۂ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایک دفعہ

پھر آپ نے ہندو راہنماؤں کے 'تھیوکریسی' کے مذکورہ بالا پروپیگنڈا کا بھرپور جواب دیا۔ آپ نے واضح کر دیا کہ پاکستان کے حصول کی ساری ان تھک جدوجہد کا مقصد اس 'تھیوکریسی' کا قیام نہیں ہے جس کا تصور مسٹر منشی جیسے ہندو راہنماؤں کے دماغ میں ہے۔ اُنھوں نے اپنے اس بیان میں واضح طور پر کہا کہ 'تھیوکریسی' ان کا مقصود نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مذہب یعنی اسلام انھیں عزیز نہیں ہے۔ اس بیان میں اُنھوں نے بیک وقت 'تھیوکریسی' سے اظہارِ بریت اور اسلام سے اظہارِ محبت فرمایا۔ آج جو دانشور قائداعظم کے بیانات کی من چاہی تاویلات کرتے ہیں اور مذہب بیزاری کو ہی لبرل ازم اور روشن خیالی سمجھتے ہیں، انھیں قائداعظم کے اس بیان پر غور کرنا چاہیے۔ قائداعظم کا یہ بیان سیکولر ازم کی واضح تردید پر بھی مبنی ہے۔ سیکولر ازم میں مذہب اور ریاست کی یکجائی قبول نہیں کی جاتی۔ مگر قائداعظم نے دین اور معاشی زندگی دونوں کے تحفظ اور دفاع کے لیے سیاسی اقتدار کے حصول کو ضروری قرار دیا۔ گویا ان کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم مقصد دین کا دفاع بھی تھا۔ کیا کوئی سیکولر راہنما یہ بیان دے سکتا ہے؟

3- پاکستان کو معرضِ وجود میں آنے میں ابھی ایک ماہ مزید باقی تھا۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان صوبوں میں انتقالِ آبادی کے لیے فضا بے حد ناسازگار تھی۔ انسانی تاریخ کی عظیم ترین خونی ہجرت کے المیے کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل نامزد ہو چکے تھے۔ انتقالِ آبادی اور اقلیتوں کے مسائل نے ان کا ذہنی سکون تلپٹ کر دیا تھا۔ یہ ان کی زندگی کے مشکل ترین ایام تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندو پنجاب اور بنگال میں مقیم رہیں۔ مگر پاکستان مخالف مشنری کے زہرناک پروپیگنڈے کے سامنے بند باندھنا ان کے بس کے بات نہ تھی۔ پھر بھی ان کا آہنی عزم قائم تھا۔ 13 جولائی 1947ء کو اُنھوں نے دہلی میں ایک پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں ان کے بیانات کو مرتب نے بجا طور پر 'پاکستان اور اقلیتوں کا تحفظ' کا عنوان دیا ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا:

''سوال: کیا آپ گورنر جنرل کی حیثیت سے اقلیتوں کے مسئلہ کے بارے میں ایک مختصر سا بیان دے سکتے ہیں؟

جواب: اس وقت تو میں صرف نامزد گورنر جنرل ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ 15 اگست 1947ء کو میں واقعی پاکستان کا گورنر جنرل ہوں گا۔ اس مفروضے کے بعد میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کے بارے میں، میں نے جو بات بار بار کہی ہے، میں اس سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہر بار جب بھی میں نے اقلیتوں کے بارے میں گفتگو کی تو جو کچھ میرا مطلب تھا، وہی میں نے کہا اور جو کچھ میں نے کہا، وہی میرا مطلب تھا۔ اقلیتوں کا تحفظ کیا جائے گا، ان کا تعلق خواہ کسی فرقہ سے ہو۔ ان کا مذہب یا دین یا عقیدہ محفوظ ہوگا۔ ان کی عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ انھیں اپنے مذہب، اپنے عقیدے، اپنی جان اور اپنے تمدن کا تحفظ حاصل ہوگا۔ وہ بلا امتیاز ذات پات اورعقیدہ، ہراعتبار سے پاکستان کے شہری ہوں گے۔ ان کے حقوق ہوں گے اور انھیں مراعات حاصل ہوں گی اور اس کے ساتھ ساتھ بلاشبہ شہریت کے تقاضے بھی ہیں، لہٰذا اقلیتوں کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی۔ وہ اس مملکت کے کاروبار میں اپنا کردار بھی ادا کریں گے۔ جب تک کہ اقلیتیں مملکت کی وفادار ہیں اور صحیح معنوں میں ملک کے خیرخواہ رہیں اور جب تک مجھے کوئی اختیار حاصل ہے، انھیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔'' [ایضاً: جلد چہارم، صفحہ 349]

یہ بے حد مؤثر، بلیغ، مدبرانہ اور خوبصورت بیان ہے جس کی توقع ایک نوزائیدہ اسلامی ریاست کے سربراہ سے کی جاسکتی ہے۔ سلیم القلب انسان کے لیے اتنی وضاحت کافی ہونی چاہیے مگر ہندو کانگریس کے وہ گماشتے جو صحافت کے میدان میں تھے، ان کی اس واضح بیان سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ ایک صحافی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک ہندو اخبار کے نمائندہ تھے، نے سوال کیا:

"Q. Will Pakistan be a secular or theocratic state.?

Mr.M.A.Jinnah: You are asking me a question that is absurd. I do not know what a theocratic state means,(A correspondent suggested that a theocratic state meant a state where only people of a particular religion, for example, Muslims could be full citizens and non-Muslims would not be full citizens.)
Mr.M.A.Jinnah: Then it seems to me that what I have already said is like throwing water on duck's back (Laughter). When you talk of democracy, I am afraid you have not studied Islam. We learnt democracy thirteen centries ago."

ترجمہ:

''سوال: پاکستان ایک لادینی ریاست ہوگی یا دینی ریاست؟
مسٹر ایم اے جناح: آپ مجھ سے ایک بے ہودہ سوال کررہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تھیوکریٹک ریاست کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ (ایک اخبارنویس نے کہا کہ تھیوکریٹک ریاست ایسی ہوتی ہے جس میں صرف کسی مخصوص مذہب کے لوگ مثلاً مسلمان تو پورے شہری ہوسکتے ہیں اور غیرمسلم پورے شہری نہیں ہوسکتے۔)
مسٹر جناح: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے، وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں کسی بطخ کی پیٹھ پر پانی پھینکتا رہا (قہقہہ) جب آپ جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں، آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہم نے جمہوریت کا سبق تیرہ سو برس پہلے پڑھا تھا۔'' [ایضاً: جلد چہارم صفحہ:315]

مندرجہ بالا سوال وجواب میں قائداعظم نے جس لہجے میں جواب دیا، وہ غیرمتوقع نہیں ہے۔ جب وہ اسی پریس کانفرنس میں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے

متعلق مفصل بریفنگ دے چکے تھے تو اس صحافی کا سوال یقیناً بے ہودہ اور شرارت پر مبنی تھا۔ ظاہر ہے ایسا سوال کوئی مسلمان صحافی نہیں کرسکتا تھا۔ مندرجہ بالا سطور میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ تھیوکریٹک ریاست میں شہری حقوق مختلف ہوتے ہیں۔ مگر یہ محض ایک طرح کی وضاحت ہے جو پریس کانفرنس میں موجود ایک صحافی نے کی، ورنہ تھیوکریٹک ریاست سے عام طور پر مذہبی پیشوائیت یا پاپائیت مراد لی جاتی ہے جس میں حکومت کے عہدوں پر مذہبی پیشواؤں کو ہی فائز کیا جاتا ہے اور یہ تصور عیسائیت کی قدیم تاریخ سے وابستہ ہے۔ قائداعظم نے اپنے جواب میں بالکل درست فرمایا کہ مسلمانوں نے جمہوریت کا درس تیرہ سو برس پہلے ہی سیکھ لیا تھا اور جمہوری ریاست میں پادریوں کی نامزدگی ناقابل تصور ہے۔ جو لوگ 'تھیوکریسی' میں 'اسلامی ریاست' کو داخل سمجھتے ہیں، قائداعظم نے ان کے بارے میں ہی فرمایا کہ اُنھوں نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا یا پھر ایسا وہ لوگ کہتے ہیں جن کی سوچ الحاد پر مبنی ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں عیسائیوں کی طرح کی مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ملتا۔ اسلام میں کسی پوپ کی گنجائش نہیں ہے۔

-4 14، 15 دسمبر 1947ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس ہوا۔ تقسیم ہند کے جگر پاش ہنگاموں کی وجہ سے پوری قوم حزن و ملال کا شکار تھی۔ قائداعظم نے دل گرفتگی کے عالم میں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''آپ جانتے ہیں کہ مسلم لیگ نے پاکستان کے حصول اور قیام کے لیے جس انداز میں جدوجہد کی، وہ بے مثال ہے۔ مسلمان ایک ہجوم کی مانند تھے۔ وہ شکستہ دل تھے، اقتصادی طور پر پامال تھے۔ ہم نے پاکستان حاصل کرلیا، لیگ کے لیے نہیں، اپنے کسی رفیق کے لیے نہیں، بلکہ عوام کے لیے۔ اگر پاکستان حاصل نہ کیا جاتا تو مسلمانوں کا خاتمہ ہوجاتا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہندو نہ صرف قتل و غارت اور اَملاک کی تباہی پر اتر آئیں گے بلکہ منظّم طور پر جتھہ بندی کرکے ظلم وتشدد کا پہاڑ کھڑا کردیں گے۔ اس کا مقصد پاکستان پر ضرب لگانا تھا اور یہ سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔''

قائداعظم کے اس خطاب میں درج ذیل سطور بھی ملتی ہیں:

❑ ''میں صاف طور سے واضح کردوں کہ پاکستان اسلامی نظریات پر مبنی ایک مسلم ریاست ہوگی۔ یہ پاپائی (کلیسائی) ریاست نہیں ہوگی۔ اسلام میں جہاں تک شہریت کا تعلق ہے، کوئی امتیاز نہیں ہے۔'' [ایضاً: جلد چہارم: صفحہ 398]

معلوم ہوتا ہے کہ کونسل میں کسی شخص نے قائداعظم سے پاکستان کی ریاست کی نوعیت کے بارے میں سوال کیا تو انھیں یہ جواب دینا پڑا۔ ان کے اس انگریزی بیان میں "Theocratic" نہیں بلکہ "Ecclesiastical" (کلیسائی) کے الفاظ ہیں۔ جس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس مذہبی ریاست کے وہ مخالف تھے، وہ یہی کلیسائی طرز کی پیشوائیت تھی جو ازمنہ قدیم میں یورپ میں رائج تھی۔ ان کی یہ وضاحت کہ پاکستان اسلامی نظریات پر مبنی مسلم ریاست ہوگی، اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ان کے ذہن میں سیکولر ریاست کا خاکہ نہیں تھا۔

-5 19 فروری 1948ء کو آسٹریلیا کے عوام سے ان کے قومی دن کے موقع پر قائداعظم نے مفصل خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں اُنھوں نے آسٹریلوی عوام سے پاکستان اور پاکستانی قوم کا مفصل تعارف کروایا۔ اُنھوں نے کہا:

❑ ''نہ صرف یہ کہ ہم میں سے بیشتر لوگ مسلمان ہیں، بلکہ ہماری اپنی تاریخ ہے، رسوم و روایات ہیں اور آئیڈیالوجی ہے، وہ نظریہ اور جبلت ہے جس سے قومیت کا شعور اُبھرتا ہے۔''

آسٹریلوی قوم چونکہ بنیادی طور پر یورپی کلچر کی نمائندہ ہے، اس لیے قائداعظم نے ان سے خطاب کرتے ہوئے نئی اسلامی ریاست کے سیاسی فلسفہ کی وضاحت بھی مناسب سمجھی۔ آپ نے فرمایا:

❑ ''ہماری عظیم اکثریت مسلمان ہے۔ ہم رسولِ خدا ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ ہم اسلامی ملت و برادری کے رکن ہیں جس میں حق، وقار اور خودداری کے تعلق سے سب برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں اتحاد کا ایک خصوصی اور گہرا شعور موجود ہے۔ لیکن غلط نہ سمجھئے پاکستان میں کوئی نظامِ پاپائیت رائج نہیں ہے، اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلام ہم سے دیگر عقائد کو برداشت کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور ہم اپنے ساتھ ان لوگوں کے گہرے اشتراک کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں جو خود پاکستان کے سچے اور وفادار شہریوں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ اور رضا مند ہوں۔''

[ایضاً: جلد چہارم، صفحہ:416]

آج کے ہمارے سیکولر دانشور دوسرے ممالک میں جب پاکستان کا تذکرہ کرتے ہیں تو بے حد احتیاط کرتے ہیں کہ کہیں اسلامی تعلیمات اور ملتِ اسلامیہ کا تذکرہ کرنے سے انھیں بنیاد پرست نہ سمجھ لیا جائے مگر قائداعظم اس طرح کے معذرت خواہانہ انداز کے قائل نہیں تھے۔ اُنھوں نے آسٹریلوی عوام کو بے حد فخر سے بتایا کہ پاکستانی قوم رسولِ خدا ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہے، اسے کسی 'ازم' کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ فرمانے کے بعد انھیں برطانوی اور ہندو ذرائع ابلاغ کے 'تھیوکریسی' والے پروپیگنڈا کا بھی احساس تھا، اسی لیے اُنھوں نے خود ہی یہ وضاحت بھی کردی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ایک ریاست کو پاپائیت نہ سمجھ لیا جائے۔ ان کے بیان کا یہ حصہ عام طور پر ہمارے دانشور بیان کرتے ہیں:

"Make no mistake, Pakistan is not a theocracy or anything like it."

مگر ہمارے سیکولر دانشور ہمیشہ سکوت فرماتے ہیں اور بالکل بیان نہیں کرتے کہ قائداعظم نے یہ جملے کب اور کیوں اور کن لوگوں سے ارشاد فرمائے۔ مزید برآں وہ اقلیتوں کے حقوق کا واویلا تو بہت کرتے ہیں مگر قائداعظم کی طرح ان کی پاکستان سے وفاداری کا ذکر کبھی نہیں کرتے۔

-6 'تھیوکریسی' کے ضمن میں قائداعظم کا آخری بیان جو ریکارڈ پر ہے یا جسے میں تلاش کرسکا ہوں، وہ 25 فروری 1948ء کا ہے۔ اس تاریخ کو آپ نے امریکہ کے عوام سے نشری خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں من جملہ دیگر باتوں کے آپ نے فرمایا:

- ''پاکستان سب سے بڑی اسلامی مملکت اور دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور خیر سگالی ہماری خارجہ حکمتِ عملی ہے۔''

آپ نے امریکی قوم کو پاکستان کے دستور اور ریاستی نظام کی نوعیت کے متعلق بریف کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''مجلس دستور ساز کو ابھی پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی، لیکن مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ جمہوری نوعیت کا ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اُصول شامل ہوں گے۔ آج بھی ان کا اطلاق عملی زندگی میں ویسے ہی ہوسکتا ہے جیسے کہ 13 سو برس قبل ہوسکتا تھا۔ اسلام نے ہر شخص کے ساتھ عدل اور انصاف کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کے مرتبین کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے باخبر ہیں۔ بہرنوع پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگی جس پر آسمانی مقصد کے ساتھ پاپاؤں کی حکومت ہو۔ غیر مسلم، ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں، لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ انھیں وہ تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو کسی اور شہری کو حاصل ہوسکتی ہیں اور وہ اُمور پاکستان میں اپنا جائز کردار ادا کرسکیں گے۔''

[ایضاً: جلد چہارم، صفحہ 422]

امریکی قوم سے خطاب کرتے ہوئے بھی قائداعظم نے تقریباً وہی اُسلوب پسند کیا جو وہ پہلے آسٹریلوی قوم سے خطاب میں کرچکے تھے یعنی پہلے 'اسلامی تعلیمات' اور اسلام کے 'بنیادی اُصول' کا فخر سے تذکرہ اور اسلامی جمہوریت کے تصور کی وضاحت، پھر اس کے فوراً بعد یہ تصریح کہ اسلامی جمہوریت کوئی تھیوکریسی نہیں ہے۔ اگر کوئی امریکی اسلام یا اسلامی ریاست کے متعلق پہلے سے کوئی غلط تصور کو قائم کیے ہوئے ہے، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی ریاست، تھیوکریسی یا پاپائیت سے بالکل مختلف نظریہ ہے۔ قائداعظم کا یہ بیان اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں اُنھوں نے تھیوکریسی کی تعریف بھی بیان کردی ہے۔ ان کے انگریزی الفاظ ملاحظہ کیجیے:

"In any case, Pakistan is not going to be a theocratic state, to be ruled by priests with a divine

mission."

گویا قائداعظم کے خیال میں ''تھیوکریسی ایک ایسا نظامِ حکومت ہے جس میں پادری یا نام نہاد مذہبی پیشوا با قاعدہ خدائی مشن سمجھتے ہوئے حکومت چلاتے ہیں۔''

مغرب کے جدید دانشور بھی 'تھیوکریسی' سے عام طور پر یہی مراد لیتے ہیں۔ کلیسائی اقتدار کی تاریخ گواہ ہے کہ تھیوکریسی چلانے والے مذہبی پیشوا نہ تو عوام کی رائے کو اہمیت دیتے تھے کیونکہ وہ عوامی نمائندے نہیں بلکہ پوپ کے نامزد کردہ ہوتے تھے، نہ حکومتی اُمور میں وہ کسی الہامی شریعت کے وضع کردہ قوانین کے پابند تھے کیونکہ عیسائیت میں محض اخلاقی تعلیمات پائی جاتی ہیں، باقاعدہ شریعت یا شرعی قوانین واحکام کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں ہے جسے دستورِ مملکت بنایا جاسکے۔ اس لیے ریاستی اُمور میں وہ اپنی آرا کا آزادانہ استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیسا نے 'اجتہاد' سے کام لیتے ہوئے سائنس اور طبیعی علوم کے ماہرین کو شدید ترین سزاؤں کا نشانہ بنانا۔ ان کا یہی طرزِ عمل آج بھی مغرب کے کسی بھی تعلیم یافتہ فرد کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام یا اسلامی تاریخ کلیسا کے نظریات و تاریخ سے بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ قائداعظم نے فرمایا کہ مسلمانوں نے جمہوریت کا سبق چودہ سو برس قبل ہی سیکھ لیا تھا۔ اسلامی تاریخ میں خلفاے راشدین کا دور تو مثالی ہی ہے، مگر بعد میں بھی کسی خلیفہ یا سلطان نے قرآن وسنت کو مسترد کرکے کوئی نیا دستور وضع کرنے کی جسارت نہ کی۔ اسلامی تاریخ ایسی متعدد مثالیں پیش کرسکتی ہے جن کے مطابق مسلمانوں کے خلیفہ کو بارہا قاضی کے سامنے پیش ہوکر اپنے عمل کی وضاحت کرنا پڑی، بعض اوقات تو انھیں جرمانے بھی ادا کرنے پڑے۔

اسلام عیسائیت کی طرح محض اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ نہیں ہے، یہ زندگی کے ہر شعبے میں راہنمائی عطا کرتا ہے۔ ریاستی اُمور چلانے کے لیے اسلام کا اپنا ضابطہ حیات ہے۔ اسلام میں کلیسا کی طرح کوئی **"Hierarchy"** نہیں ہے جس میں پوپ، کارڈینل، چیف بشپ، پادری یا فادر پر مبنی درجہ بہ درجہ کلیسائی نظم ہو۔ اسلام نے حکمرانی

کا حق کسی مخصوص طبقہ کو تفویض نہیں کیا، جو خدائی مشن کا نام لے کر اقتدار پر قابض ہوجائے اور اپنی من مانی کرتا پھرے۔ اسلام میں ہر وہ شخص اقتدار کی امانت کو سنبھال سکتا ہے جو اس کے بنیادی عقائد پر یقین رکھتا ہو اور نظم مملکت کو قرآن وسنت کے ضابطے کے تحت چلانے کی اہلیت رکھتا ہو اور جسے عوام کا اعتماد بھی حاصل ہو۔

تھیوکریسی کا جو تصور قائداعظم کے پیش نظر تھا، اس کی حمایت اسلامی دانشور بھی نہیں کرتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام کے سیاسی فلسفہ کا معمولی علم رکھنے والا کوئی فرد اس طرح کی 'تھیوکریسی' کا اسلام میں وجود ثابت نہیں کرسکتا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جو بہت بڑے عالم دین ہی نہیں، تحریکِ پاکستان کے عظیم راہنما بھی تھے، اُنھوں نے **12** مارچ **1949**ء کو قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

- ''اگر ہم دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنا ہوگا۔ اسلام اس غلط نظریہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ مذہب صرف خدا اور بندے تک محدود ہے اور اس کا روزانہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اسلام صرف مذہبی عقائد اور احکام تک محدود نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ ہے جس کا اطلاق پورے مسلم معاشرے پر ہوتا ہے۔ اس ریاست کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے چلانے والے مولوی ہوں گے۔ اسلامی ریاست تو وہ ہے جو اسلام کے اعلیٰ اور بلند اُصولوں کے تحت چلائی جائے گی۔'' [نوائے وقت: سنڈے میگزین، **18** جنوری **2004**ء]

یاد رہے علامہ شبیر احمد عثمانی وہ عظیم اور قابلِ احترام ہستی ہیں جنھوں نے قائداعظم کے انتقال پر اُن کا جنازہ پڑھایا۔ قائداعظم نے تو تھیوکریسی کا رد کرتے ہوئے اسے **Priests** یعنی پادریوں کی حکومت کہا، مگر علامہ عثمانیؒ نے مسلم معاشرے کے تناظر میں زیادہ واضح طور پر کہا کہ اسلامی ریاست کو چلانے والے محض 'مولوی' نہیں ہوں گے۔ ان کا مندرجہ بالا بیان قائداعظم کی فکر سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

'تھیوکریسی' کی مخالفت کی وجہ سے ہمارے وہ سیکولر دانشور جو کہتے ہیں کہ قائداعظم سیکولر ریاست کا قیام چاہتے تھے، کیا وہ یہ بات علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے متعلق

بھی کہہ سکتے ہیں، جو اسلامی ریاست کے پر جوش علمبردار تھے؟ اگر تھیوکریسی کی مخالفت کی وجہ سے ان کے اسلامی ریاست کے قیام کے متعلق دیے گئے بیانات پر کوئی فرق نہیں پڑتا تو قائداعظم کے ان بیانات کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس میں اُنھوں نے واضح طور پر اسلامی جمہوری ریاست کے قیام کی بات کی۔ ہمارے بعض انتہا پسند سیکولر دانشور پاکستان کے آئین میں اسلامی دفعات کی موجودگی کی وجہ سے پاکستان کو 'تھیوکریٹک' ریاست قرار دیتے ہیں۔

ان کی یہ انتہا پسندانہ سوچ قائداعظم کے افکار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ قائداعظم صرف 'پاپائیت' کے خلاف تھے، وہ اسلام کے روشن اُصولوں کی روشنی میں چلائی جانے والی اسلامی ریاست کے زبردست حامی تھے، جناب اکبر ایس احمد اپنی معروف کتاب **Jinnah Pakistan and Islamic identity** میں لکھتے ہیں:

"Jinnah certainly did not want a theocratic state, a nation run by mullahs." (p.198)

''جناح یقینی طور پر 'تھیوکریٹک' ریاست نہیں چاہتے تھے، ایک ایسی قوم جسے ملاؤں کی طرف سے چلایا جائے۔''

جناب اکبر ایس احمد کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود قائداعظم کے بیان کی جزوی تحریف پر مبنی ہے۔ ایک تو قائداعظم نے تھیوکریسی کی وضاحت کرتے ہوئے کبھی بھی **"Mullah"** کا لفظ استعمال نہیں کیا، اُنھوں نے **"Priest"** کہا۔ مزید برآں اکبر ایس احمد نے قائداعظم کے بیان میں شامل **"Divine Mission"** کے الفاظ کو نظر انداز کر دیا۔ قائداعظم صرف پادریوں کی ایسی حکومت کے مخالف تھے جو وہ 'خدائی مشن' سمجھ کر چلاتے ہوں۔ فرض کیجیے آج کے دور میں علما جدید جمہوری طریقے سے منتخب ہو کر کسی صوبہ یا ملک میں اقتدار میں آ جاتے ہیں، تو ان کی حکومت کو قائداعظم کی بیان کردہ تعریف کے مطابق 'تھیوکریسی' نہیں کہا جائے گا۔

جناب اکبر ایس احمد قائداعظم کو 'بنیاد پرست' قرار دیتے ہیں اور نہ ہی سیکولر۔ تھیوکریٹک ریاست کی مخالفت کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ قائداعظم اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اسلام کی طرف غالب میلان رکھتے تھے۔ ہم اپنی گذارشات کا خاتمہ اکبر ایس احمد کی کتاب کے درج ذیل اقتباس پر کرتے ہیں:

"Jinnah's last few years were a conscious attempt to move towards Islam in terms of text, purity, and scriptures and away from village folk and modern westernized Islam. He constantly pointed to the principles laid down in the Quran and in the time of the Prophet as the basis for his state: our bedrock and sheet anchor is Islam." (R.Ahmad 1993:22).

In 1944 Jinnah declared:

"We do not want any flag excepting the league flag of crescent and star. Islam is our guide and the complete code of our life. We do not want any red or yellow flag. We do not want any isms, Socialism, Communism or National Socialism" (Ibid:153). In 1946, Jinnah made the Muslim League members sign their pledges for Pakistan "in the name of Allah, the Beneficient, the merciful" (Wolpert 1984:261). After the creation of Pakistan. The references from the Quran and the Prophet were prominent in Jinnah's speaches."(p.194-195)

❑ ''جناح کی زندگی کے آخری چند برسوں میں اصل متن، خالصیت اور تعلیمات کے اعتبار سے اسلام کی طرف بڑھنے اور دیہاتی طرزِ زندگی اور جدید مغرب زدہ اسلام سے دور ہٹنے کی شعوری کاوش نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے تسلسل کے ساتھ قرآن وسنت میں بیان کردہ اُصولوں کو اپنی ریاست (پاکستان) کی اساس قرار دیا:

''ہماری چٹان اور بنیاد اسلام ہے۔'' [آر احمد، 1993ء صفحہ 22]

''1944ء میں جناح نے اعلان کیا:

- ''ہم لیگ کے ہلال اور ستارے والے پرچم کے علاوہ اور کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہی ہمارے لیے ہدایت اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ہم کوئی سرخ یا زرد پرچم نہیں چاہتے۔ ہم سوشلزم، کمیونزم یا نیشنل سوشلزم کی طرح کا کوئی 'ازم' نہیں چاہتے۔'' [ایضاً: 153]

1946ء میں جناح نے مسلم لیگ کے ارکان سے کہا کہ وہ پاکستان کے لیے حلف پر 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کے ساتھ دستخط کریں۔ قیامِ پاکستان کے بعد جناح کی تقاریر میں قرآن وسنت سے حوالہ جات بہت نمایاں تھے۔'' [صفحہ 194، 195]

مختصر یوں ہے کہ قائداعظم جب 'ڈیموکریٹک' ریاست کی بات کرتے تھے تو یہ 'تھیوکریٹک' ریاست کے خلاف تو تھی لیکن 'اسلامک' ریاست کے خلاف ہرگز نہیں تھی۔ وہ جس مذہبی یا دینی ریاست کے خلاف تھے، اس میں پادریوں کے ٹولے کی عملداری تھی، وہ سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ وہ کسی ایسی ریاست کے خلاف نہ تھے جس کی نظریاتی اساس اسلام جیسے آفاقی مذہب کی الہامی تعلیمات پر قائم ہو۔ دورِ حاضر میں 'تھیوکریسی' کے مخالف بعض دانشور مذہبی جماعتوں اور الہامی احکام، دونوں کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ کلیسا کی مخالفت میں بالآخر وہ مذہب کے بھی مخالف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی فکر کو قائداعظم سے منسوب کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں حالانکہ قائداعظم کلیسا کے مخالف تھے مگر مذہب کے مخالف نہیں تھے، بالخصوص دین اسلام کے۔ بدقسمتی سے قائداعظم کی فکر کے حوالہ سے اس اہم فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا!!

۞......۞......۞

انجینئر مختار فاروقی

اللہ تعالیٰ کی پاکستان پر چند خصوصی عنایتیں

اس بات میں کوئی شک نہیں اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ ملک پاکستان برطانوی ہند کے مسلمانوں کے اس عزم کے اظہار پر...... کہ وہ اس خطہ ارضی میں عصر حاضر میں اسلام کے نظامِ خلافت یعنی نظام عدلِ اجتماعی (JUST POLITICO-SOCIO- ECONOMIC SYSTEM) کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں...... اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ تھا۔ ملک پاکستان پہلے دوحصوں پر مشتمل تھا، ایک مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) اور ایک مشرقی پاکستان (جو 1971ء میں ہم سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا)۔

20ویں صدی میں تاریخ انسانی کے ایک خاص نظریاتی تناظر میں اس ملک پر اللہ تعالیٰ کی چند خصوصی عنایتیں بڑی واضح ہیں جن کو ہم یہاں مسلمانانِ پاکستان کے لیے پیش کررہے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے چاہا تو نئی نسل میں حوصلہ پیدا ہوگا اور اس ملک کے روشن مستقبل پر اعتماد بڑھے گا جبکہ بڑی عمر کے لوگوں کو یہ عمل اپنی ذمہ داریوں کو یاد دلانے کا سبب بنے گا۔

ہمارے نزدیک پاکستان پر اللہ کی کئی عنایتیں ہیں جو ہم اختصار کے ساتھ بیان کررہے ہیں:

1۔ اس ملک کے لیے جدوجہد کی بنیاد...... دوقومی نظریہ بنا۔ یعنی آسمانی ہدایت کے ماننے والے اور حضرت محمد ﷺ کے پیروکار ایک اُمت (ENTITY) ہیں جبکہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہ رکھنے والے ایک دوسری قوم یا ENTITY ہیں۔

2۔ علامہ اقبال کی نظموں شکوہ اور جوابِ شکوہ، تنسیخ خلافت کے خلاف برطانوی

ہند کے مسلمانوں کا غیظ وغضب، 1930ء کے علامہ اقبال کے خطبہ اِلٰہ باد کے بعد مسلمانوں کا والہانہ انداز میں اسلام کے نظام کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا ویسے تو ایک معجزہ ہی ہے تاہم اس کے پیچھے مرد درویش حضرت علامہ اقبال کا کلام ہی تھا۔ جوابِ شکوہ (ستمبر 1913ء) میں ہی اس الہامی شاعر نے یہ کہہ دیا تھا

ے وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

ے قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کردے

ے میرے درویش خلافت ہے جہانگیری تری

اسی الہامی کلام کی 'بانگ درا' سے مسلمان بیدار ہوئے اور آگے بڑھ کر قیام پاکستان کے نعرے کو حقیقت بنا کر رکھ دیا۔

3۔ اس ملک کے نام اور اس ملک کے دارالحکومت کے نام میں بھی ایک معنویت ہے ورنہ ادیب، دانشور ہر ملک میں ہوتے ہیں، صرف دکھاوے کے لیے نام رکھے جاتے تو شہر ریاض کا نام بدل کر روضۃ الاسلام رکھا جاسکتا تھا مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا۔

اس ملک کا نام اور اس کے دارالحکومت کا نام اس خطہ...... جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی چارصد سالہ احیائے اسلام کی کوششوں کا آئینہ دار ہے اور قوموں کی تاریخ میں ایسے انمٹ نقوش ان کے اجتماعی ضمیر اور اجتماعی شعور کا ثمر ہی ہوتے ہیں۔

4۔ اس ملک پاکستان کے قیام کے بارے میں 3 جون 1947ء کے اعلان کے بعد زیادہ تر اقدامات ماہِ رمضان المبارک (19 جولائی 1947ء) کے دوران ہی حتمی شکل میں سامنے آئے۔

5۔ اس ملک پاکستان کے قیام کا فیصلہ اور اس کی الہامی تاریخ کا چناؤ بھی یقیناً DIVINE معاملہ ہی ہے۔ پہلے یہ تاریخ بھارت کے لیے تھی اور پاکستان کا اعلان

15 اگست کو ہونا تھا مگر بھارت کے جوتشیوں اور علم نجوم کے ماہرین نے 14 اگست کی تاریخ اپنے لیے غیر موزوں سمجھی اور یوں یہ خصوصی رات 13 اور 14 اگست کی درمیانی رات قیام پاکستان کے لیے مقدر بن گئی۔

یہ نصیب، اللہ اکبر...... یہ رات لیلۃ القدر تھی اور 27 ویں رمضان المبارک۔

6۔ قیام پاکستان کے بعد جب اس ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کام کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو اس عظیم کام کے لیے جناب قائداعظم کی نگاہ انتخاب نے صحیح ترین انسان ...... جناب علامہ اسد صاحب (نومسلم اور مصنف روڈ ٹو مکہ) کا انتخاب فرمایا۔ انہیں پاکستانی شہریت عطا کی گئی اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل (RECONSTRUCTION) کی ذمہ داری سونپی گئی۔

7۔ قیامِ پاکستان اور اس کے لیے کیے گئے ابتدائی اقدامات سے صرف جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو ہی تسکین نہیں ہوئی بلکہ مسلمانانِ عالم کو بھی روحانی سکون ملا اور اجتماعی مسلم شعور کو پاکستان کی شکل میں اسلام کی سربلندی کے لیے امید کی کرن نظر آئی۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں نظام خلافت اور 'خلیفہ' کی بہت اہمیت ہے۔ مسلمانوں میں یہ نظام کسی نہ کسی کمزور شکل میں سہی، 1924ء تک جاری رہا۔ جب 'ترک ناداں' مصطفٰے کمال نے ایسی بے کمالی دکھائی کہ نظام خلافت کو منسوخ کر دیا، خلیفہ معزول کر دیا گیا، اسلامی شریعت کی جگہ رومن لا (ظالمانہ اور ملحدانہ نظام) نافذ کر دیا گیا۔ خلافت کے خاتمے پر مصر اور سعودی عرب نے عالم اسلام کی راہنمائی کی 'دستار' بزعم خویش اپنے سر باندھنے کی کوششیں کیں تاہم پاکستان کے نوزائیدہ، کمزور اور بے وسائل ملک کے عوام اور خواص کے خلوص کا ثمرہ تھا کہ عالم اسلام نے بے کہے امت کی سربراہی کا 'تاج' پاکستان کے سر پر رکھ دیا۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے اور اس کے ابھی عینی شاہد بھی خال خال موجود ہیں کہ پاکستان کے دوسرے یومِ آزادی کی تقریبات منعقدہ کراچی 14 اگست 1948ء میں 25 اسلامی ممالک کے وفود اور فوجی دستوں نے شرکت کی۔ یہ بات مسلمانانِ پاکستان

کی قیادت اور مسلمانوں کے خلوص کو عقیدت کا تمغہ اور عظمت کو سلام تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت تک صرف اتنے مسلمان ممالک ہی آزاد تھے۔ اسی پر بس نہیں، اگلے سال تیسرے یومِ آزادی کی تقریبات میں 33 ممالک کے وفود اور فوجی دستوں نے شرکت فرمائی اور پاکستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا اور عالم اسلام کی یکجائی اور ایک قیادت کی طرف بڑھنے کے عزم کا اظہار کیا۔

8۔ اس ملک کے لیے دستور ساز اسمبلی نے مجوّزہ دستوری خاکہ پر غور کیا تو صاف ظاہر تھا کہ آئین سازی کے اس عمل میں طویل عرصہ صرف ہونے کا احساس ہوا۔ لہٰذا ہمارے اسلاف، اکابرین اور اس وقت کی قیادت نے 'قراردادِ مقاصد' کی شکل میں پاکستان کے مجوزہ اسلامی آئین کے لیے راہنما اصول طے کر دیے۔ ملک کا نام اور مذہب اسلام طے کر دیا گیا۔ ملک میں قرآن وسنت کے منافی کسی قسم کی قانون سازی (کسی بھی سطح پر) پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا۔ انہیں اصولوں کی روشنی میں پہلے آئین میں ملک کا نام 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' قرار پایا۔

دنیا کے اُس وقت موجود ممالک میں پاکستان واحد ملک تھا جو اسلام کے نام سے موسوم ہوا اور اس کے نام میں مذہب اور وہ بھی 'اسلام' کا نام شامل ہو گیا۔

بیسویں صدی کے نصف میں جبکہ دنیا میں یورپ اور امریکہ صہیونیّت کے کل پرزوں کے طور پر سیکولرازم، جمہوریت، انسانی حقوق، آزادی (لبرل ازم)، خدا بیزاری، اخلاق دشمنی اور ابلیس پرستی کا راگ الاپ رہے تھے اور مغربی تہذیب کا سورج عین نصف النہار پر تھا، اس پس منظر میں ایک مسلمان ملک کا جمہوری طریقے پر معرضِ وجود میں آ جانا، اس کا سرکاری مذہب اسلام قرار پانا، قرارداد مقاصد کی منظوری وغیرہ وغیرہ ایسے اقدامات تھے جو مغرب (صہیونیت) کے اپنے ابلیسی مقاصد کی راہ کا بھاری پتھر، سیکولر مغربی افکار کی کامل نفی اور مغربی تہذیب کے منہ پر طمانچہ تھے جسے مغرب نے بظاہر برداشت کر لیا اس لیے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں فلسطین کے علاقے پر مشتمل اسرائیل کی ایک ناجائز ریاست جبراً قائم کرنے کے قریب تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ

پروگرام درھم برھم ہوجائے۔ چنانچہ UNO کی MIDWIFERY میں مغربی اقوام کا یہ ناجائز بچہ (THE STATE OF ISRAEL) مئی 1948ء کو منصۂ شہود پر آ گیا۔ اس کے بعد سے عالمی ایجنسیاں اور مغربی طاقتیں صہیونیت سے اشارہ پا کر اور ابلیس کے منصوبے کے عین مطابق پاکستان کے خاتمے کے در پے ہیں اور پاکستان آج بھی انہیں قوتوں کے سامنے بے بس ہے، اگرچہ انہیں قوتوں سے دست و گریبان بھی ہے۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو آج مغربی قوتوں (NATO) سے دست و گریباں ہے۔نتیجہ کیا ہوگا...... یہ ایک الگ موضوع ہے۔

9۔ پاکستان کا خطہ دورِ خلافت کے بعد مسلم اکثریت کا وہ خطہ ہے جو جغرافیائی طور پر کعبہ کے دروازے کے عین سامنے ہے اور یہاں کے لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو ان کا رُخ بیت اللہ کے دروازے کی دہلیز پر ہوتا ہے۔

یہ بات تفصیل طلب ہے جو ہم یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے دے رہے ہیں۔ اب پاکستان کی فضیلتیں شمار کرتے ہوئے بھی درج کررہے ہیں اور یہ بہت بڑی معنوی فضیلت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔

یروشلم کی وادیٔ قدس کی طرح سرزمینِ حجاز کی وادیٔ فاران اور وادیٔ بطحا کے پہاڑ اور ریگ زار اپنے اندر اہل حق کی لازوال داستانوں کے بے شمار انمٹ نقوش رکھتے ہیں۔ امت مسلمہ کا ہر فرد مکہ کی اس وادی کے بارے میں اپنے دل و دماغ میں کئی ''تاج محل'' سجائے رکھتا ہے اور مکہ حاضری کو ہر مسلمان باعث سعادتِ دارین سمجھتا ہے اور...... بجا طور پر یہ بات باعث فخر و مباہات ہے۔

آج سے ایک صدی پہلے تک دور دراز علاقوں سے مکہ جانا اور حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنا ایک جان جوکھوں کا کام تھا اور جو انسان اس راہ پر نکلتا تھا اس کا اس بابرکت سفر سے واپس گھر صحیح سلامت پہنچ جانا اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہوتا تھا۔ فاصلے زیادہ، ذرائع آمدورفت محدود، راستے پُر خار وپُر پیچ اور ملکی وسیاسی حالات میں جنگ وامن کی کیفیت بہت غیر یقینی ہوتی تھی۔ تاہم...... اب گزشتہ تین چار دہائیوں سے سفر بہت آرام دہ ہوگیا ہے اور

ہوائی سفر نے تو وقت کو بہت ہی کم کر دیا ہے اور سہولتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ مزید برآں ...... گھر سے نکل کر حرم پہنچ جانا اور وہاں کی برکتوں کے ساتھ ساتھ اَن گنت نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اب ہر آسودہ مسلمان کے لیے ممکن بھی ہو گیا ہے۔

مکہ جا کر...... پھر مدینۃ النبی ﷺ میں مسجد نبوی کی زیارت اور منبر رسول ﷺ اور آپ کی قبر کے درمیان ''جنت'' کے ٹکڑے میں وقت گزارنا کسی بھی بڑی سے بڑی ممکنہ دنیاوی نعمت سے بڑی نعمت وسعادت ہوتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَ رَسُوْلِکَ وَ صَلِّ عَلَی الْمؤْ مِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ

بقول شاعر ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنے والے جانتے ہیں کہ بیت اللہ شریف کی زیارت اور طواف کتنی بڑی سعادت ہے اور اس سے ہر انسان کو کتنا سکون میسر آتا ہے۔ زمین کے اس ٹکڑے پر قدم قدم پر اَن گنت یادگاریں اور قابل غور'' آیاتِ الٰہی'' ہیں جن پر انسان کو توجہ ہو جائے تو لازماً غور وفکر کرنا چاہیے۔

حجر اسود اور بیت اللہ شریف کے دروازہ کے درمیان ڈھائی گز کے قریب بیت اللہ شریف کی دیوار کا جو حصہ ہے، وہ ملتزم کہلاتا ہے اور رسالت مآب حضرت محمد ﷺ نے اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے اور یہاں چمٹ چمٹ کر دُعائیں کرنا ہر مسلمان کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے اور یہاں دُعائیں قبول ہوتی ہیں اگرچہ ان دُعائیں کی قبولیت کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں جن میں اکل حلال سب سے اوّل اور بڑی شرط ہے تاہم مجموعی طور پر ملتزم قبولیت دعا کا مقام ہے۔ اسی کے قریب مقامِ ابراہیم ہے اور چاہ زمزم کی جگہ ہے اگرچہ اب چاہ زمزم **UNDER GROUND** ہے اور کچھ فاصلے پر موجود راستے کے ذریعے وہاں تک ہر شخص جا سکتا ہے۔

اس ملتزم کے سامنے والا سارا علاقہ بہت اہم اور خوش قسمت ہے۔ نیز بیت اللہ شریف پوری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ ہے اور ہر چہار طرف سے اس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی جارہی ہیں۔ نقشہ کے اعتبار سے بیت اللہ شریف کے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں جو اہم بابرکت شعائر آتے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں۔

شمال مشرق: مقام ابراہیم، چاہ زمزم، کعبہ کا دروازہ، ملتزم

مشرق: حجرِاسود، کوہِ صفا شمال مغرب حطیم، میزابِ رحمت

جنوب: رکن یمانی

مغرب: رکن شامی

کعبہ کے حجرِاسود والے کونے سے مشرق کی طرف کوہ صفا ہے جہاں سے 'سعی' شروع کی جاتی ہے اور اسی لکیر سے طواف کا آغاز اور اختتام ہوتا ہے۔

بات مکۃ المکرّمہ کی ہو یا مدینۃ المنورہ کی، جو شخص ایک دفعہ وہاں سے ہو آیا ہے وہاں کے حالات کا تذکرہ کرنے سے اس کا دل مچل جاتا ہے، اکثر بے تاب ہو کر انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور وہاں گزارے ہوئے یادگار لمحات انسان کو حضرت جامی علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں ؎

مشرف گرچہ شد جامی ز لطفش
خدایا ایں کرم بار دگر کُن

تصورات کی دنیا میں سہی، دامن کھینچ کر وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ایسے قارئین یقیناً ان سطور کو پڑھتے ہوئے یہی محسوس کر رہے ہوں گے۔

بات ہو رہی تھی...... بیت اللہ شریف کی اس مبارک دیوار کی جس کو 'ملتزم' کہا جاتا ہے اور جو کعبۃ اللہ کے اطراف میں سب سے بابرکت متصور ہوتی ہے۔

دنیا اسلام کے وہ علاقے جو ملتزم کی طرف ہیں اور جب نماز میں قبلہ رو ہوتے ہیں تو وہاں کے مسلمان شعوری یا غیرشعوری طور پر ملتزم کے سامنے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ''دل زندہ'' اور 'دل بینا' عطا کرے تو اس سعادت بھری نمازوں اور دُعاؤں کے کیا

کہنے...... بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ ۔ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مدینۃ النبی ﷺ اسی ملتزم والی طرف ہے جبکہ جنوبی ایشیا کا مسلم اکثریت کا علاقہ جو 1258ء میں عربوں کے زوال کے بعد اسلام کا گہوارہ بنا ہے جسے آج ہم پاکستان کے نام سے جانتے ہیں، یہ علاقہ بشمول شمالی علاقہ جات اور افغانستان کے، اسی ملتزم والی طرف واقع ہے۔ پاکستان کا وسطی علاقہ تو عین کعبے کے دروازے کے سامنے واقع ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ جب نماز میں سجدہ ریز ہوتے ہیں تو عین کعبے کے دروازے کے سامنے سر رکھتے ہیں۔ اس پاک سرزمین کی یہ خوش بختی اور مسلمانان پاکستان کی بلند نصیبی ایسی سعادت ہے کہ جس میں یورپ و امریکہ اور افریقہ کے مسلمان شریک و سہیم نہیں ہو سکتے ۔یقیناً ع ''ایں سعادت بزور بازو نیست''

اس سعادت اور بے منت عطا کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نماز میں محسوس کریں کہ ہم عین کعبہ کے دروازہ کے سامنے کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں اور ہم ملتزم میں ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں۔ آج اس سرزمین کا کیا حال ہے؟ عالمی سازشوں کے نرغے میں ہے دشمن ہمارے علاقوں پر بمباری کررہے ہیں۔ ہم خود دین محمدی سے دور، سودی معیشت، جاگیرداری اور بے حیائی واباحیت پرستی کا شکار ہیں۔ اس سعادت کی بنا پر عملاً ہم پر واجب ہے کہ ہم کھڑے ہوجائیں اور یہود و ہنود کی سازشوں کے خلاف ڈٹ جائیں اور ہمت کر کے پاکستان کو اسلام کا قلعہ اور گہوارہ بنا دیں اور اسلام دشمن قوتوں سے اس سرزمین کو پاک کرنے کا عہد کریں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کا عزم مصمم کرلیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی نگاہِ لطف وکرم ہماری طرف کر دے۔

ے چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اسلام کے ابتدائی عروج کے دور میں مدینۃ النبی ﷺ کے بعد عراق، ایران اور افغانستان اس ملتزم والی طرف واقع ہونے والے ممالک ہیں۔ جبکہ......عربوں کے زوال 1258ء کے بعد جو علاقے مستقل طور پر اسلام کے زیر حکومت آئے، ان میں

پاکستان، مسلم انڈیا کا شمالی حصہ اور روسی ریاستیں وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب علاقوں میں پاکستان اپنی تاریخ، جغرافیہ، دوقومی نظریہ کی جدوجہد، قائداعظم محمد علی جناح اور جید اکابرین کی محنتوں کی امین سرزمین ہونے کے ناطے اہم بھی ہے اور اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے لحاظ سے منفرد بھی کہ یہ ملک عین ملتزم کے سامنے واقع ہے۔ پاکستان کا یہ خطہ زمین جسے بے پناہ قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا، اللہ نے اس کا وقوع بڑا منفرد اور بابرکت بنایا ہے اور دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے امکانات کے حوالے سے پاکستان کا ہی علاقہ دنیا بھر کے ممالک میں سرفہرست ہے۔ کاش مسلمانان پاکستان اپنی قسمت کی اس بلندی کے باعث اپنے دینی تقاضے ادا کرنے میں بھی سرفہرست ہو جائیں! تو کیا کہنے۔

اس سعادت اور نعمت غیر مترقبہ پر آپ جتنا غور کریں گے، آپ پر اللہ تعالیٰ کے احکامات اور انعامات کی قدر و قیمت کھلتی چلی جائے گی اور آپ کا دل اللہ کے احسانات کے احساس سے نرم ہو جائے گا اور اللہ کا بندہ اور حضرت محمد ﷺ کا غلام بن کر زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

آئندہ اپنی نمازوں میں ذرا چشم تصور سے محسوس کیجیے کہ میں عین کعبے کے دروازے کے سامنے سجدہ ریز ہوں، دل پر خاص انوار کا نزول ہوگا، ان شاء اللہ۔

قارئین کرام...... ہمارے نزدیک اس ملک خداداد پاکستان کی کئی فضیلتیں ہیں جو ربّ ذوالجلال والاکرام کا 'سایہ' اور خصوصی عنایتیں ہیں اور اس ملک کے شاندار اور عظیم مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کو صہیونی اور ابلیسی جبر سے جلد از جلد نکالے اور اسے اپنے مقصد قیام نظام خلافت کی طرف لوٹ جانے کی توفیق دے تاکہ اس نظام سے حضرت محمد ﷺ کی رحمت للعالمینی کی برکات تمام انسانوں تک پہنچ سکیں۔ آمین!

✿......✿......✿

مزمل ریاض شیخ

ہمیں 1948ء کا پاکستان چاہیے!

کابینہ کا اجلاس جاری تھا، اے ڈی سی نے پوچھا ’’سر! اجلاس میں چائے سرو کی جائے یا کافی؟‘‘ چونک کر سر اٹھایا اور سخت لہجے میں فرمایا ’’یہ لوگ گھروں سے چائے کافی پی کر نہیں آئے‘‘، اے ڈی سی گھبرا گیا، آپ نے بات جاری رکھی ’’جس وزیر نے چائے کافی پینی ہو، گھر سے پی کر آئے یا پھر گھر واپس جا کر پیے، قوم کا پیسہ قوم کے لیے ہے، وزیروں کے لیے نہیں‘‘۔ اس حکم کے بعد جب تک وہ برسرِ اقتدار رہے، کابینہ کے اجلاسوں میں سادہ پانی کے سوا کچھ سرو نہ کیا گیا۔ گورنر جنرل ہاؤس کے لیے ساڑھے اڑتیس (38.5) روپے کا سامان خریدا گیا، آپ نے حساب منگوا لیا، کچھ چیزیں محترمہ فاطمہ جناح نے منگوائی تھیں، حکم دیا ’’یہ پیسے ان کے اکاؤنٹ سے کاٹے جائیں‘‘ باقی چیزیں گورنر جنرل ہاؤس کے لیے تھیں، فرمایا ’’ٹھیک ہے یہ رقم سرکاری خزانے سے ادا کر دی جائے لیکن آئندہ احتیاط کی جائے‘‘۔

برطانوی شاہ کا بھائی ڈیوک آف گلوسٹر پاکستان کے دورے پر آ رہا تھا، برطانوی سفیر نے درخواست کی ’’آپ اسے ایئرپورٹ پر خوش آمدید کہہ دیں‘‘ ہنس کر کہا ’’میں تیار ہوں لیکن جب میرا بھائی لندن جائے گا تو پھر برٹش کنگ کو بھی اس کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ آنا پڑے گا‘‘۔

ایک روز اے ڈی سی نے ایک وزٹنگ کارڈ سامنے رکھا، آپ نے کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور فرمایا ’’اسے کہو آئندہ مجھے شکل نہ دکھائے‘‘۔ یہ شخص آپ کا بھائی تھا اور اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے کارڈ پر اپنے نام کے نیچے ’’برادر آف قائد اعظم محمد علی جناح، گورنر جنرل پاکستان‘‘ لکھوا دیا تھا۔

زیارت میں سردی پڑ رہی تھی، کرنل الٰہی بخش نے نئے موزے پیش کر دیے، دیکھے تو بہت پسند فرمائے، قیمت پوچھی، بتایا گیا دو روپے ''گھبرا کر بولے'' کرنل یہ تو بہت مہنگے ہیں'' عرض کیا'' یہ آپ کے اکاؤنٹ سے خریدے گئے ہیں، فرمایا ''میرا اکاؤنٹ بھی قوم کی امانت ہے، ایک غریب ملک کے سربراہ کو اتنا عیاش نہیں ہونا چاہیے'' موزے لپیٹے اور کرنل الٰہی بخش کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔

زیارت ہی میں ایک نرس کی خدمت سے بہت متاثر ہوئے اور اس سے پوچھا ''بیٹی میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' نرس نے عرض کیا ''سر! میں پنجاب سے ہوں، میرا سارا خاندان پنجاب میں ہے، میں اکیلی کوئٹہ میں نوکری کر رہی ہوں، آپ میرا تبادلہ پنجاب کرا دیں''، اداس لہجے میں جواب دیا ''سوری بیٹی! یہ محکمہ صحت کا کام ہے، گورنر جنرل کا نہیں''۔

اپنے طیارے میں رائٹنگ ٹیبل لگوانے کا حکم دیا، فائل وزارتِ خزانہ پہنچی تو وزیرخزانہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ نوٹ لکھ دیا ''گورنر جنرل اس قسم کے احکامات جاری کرنے سے قبل وزارتِ خزانہ سے اجازت کے پابند ہیں''، آپ کو معلوم ہوا تو وزارتِ خزانہ سے تحریری معذرت کی اور اپنا حکم منسوخ کر دیا۔

ایک مرتبہ گل حسن نے آپ کی گاڑی گزارنے کے لیے ریلوے کا پھاٹک کھلوا دیا تھا، آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، پھاٹک بند کرانے کا حکم دیا اور فرمایا ''اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا، تو پھر کون کرے گا؟''

جب آپ گورنر جنرل ہاؤس سے نکلتے تھے تو آپ کے ساتھ پولیس کی صرف ایک گاڑی ہوتی تھی جس میں صرف ایک انسپکٹر ہوتا تھا اور وہ بھی غیر مسلم تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب گاندھی قتل ہو چکے تھے اور آپ کی جان کو سخت خطرہ تھا اور اس خطرے کے باوجود آپ بغیر سکیورٹی کے کھلی ہوا میں سیر کرتے تھے۔ یہ تھا آج سے ساٹھ (60) برس پہلے کا پاکستان، وہ پاکستان جس کے سربراہ محمد علی جناح تھے۔

لیکن پھر ہم ترقی کرتے کرتے اس پاکستان میں آ گئے، جس میں پھاٹک تو

ایک طرف رہے، سربراہِ مملکت کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل سڑکوں کے تمام سگنل بند کر دیے جاتے ہیں، دونوں اطراف ٹریفک روک دی جاتی ہے اور جب تک شاہی سواری نہیں گزرتی، ٹریفک کھلتی ہے اور نہ ہی اشارے۔ جس میں سربراہِ مملکت وزارت خزانہ کی اجازت کے بغیر جلسوں میں پانچ پانچ کروڑ روپے کا اعلان کر دیتے ہیں، وزارت خزانہ کے انکار کے باوجود رائٹنگ ٹیبل تو کجا پورے پورے جہاز خرید لیے جاتے ہیں۔

جس میں صدور اور وزرائے اعظم کے احکامات پر سینکڑوں لوگ بھرتی کیے جاتے ہیں، اتنے ہی لوگ نوکریوں سے برخواست کیے جاتے ہیں اور ان سے کہیں زیادہ تبادلے عمل میں آتے ہیں اور کتنوں کو ہی قوانین وضوابط بالائے طاق رکھ کر ترقیوں سے نوازا جاتا ہے۔

جس میں موزے تو رہے ایک طرف، بچوں کے پوتڑے تک سرکاری خزانے سے خریدے جاتے ہیں۔ جس میں ساڑھے اڑتیس (38.5) روپوں کی کیا وقعت؟ آج ایوانِ صدر کا ساڑھے اٹھارہ (18.5) اور وزیر اعظم ہاؤس کا بجٹ بیس (20) کروڑ روپے ہے۔

جس میں کارڈ پر بھائی کا نام لکھوانے کی کسی کو ضرورت ہی نہیں کہ ایوانِ اقتدار میں عملاً باپوں، خاوندوں، بھائیوں، بہنوں، بہنوئیوں، بھتیجوں اور بھانجوں کا راج رہا ہے، جس میں وزیر اعظم ہاؤس سے سیکرٹریوں کو فون کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا ''میں صاحب کا بہنوئی بول رہا ہوں''۔

جس میں انگلستان کے ڈیوک آف گلوسٹر تو بہت دور امریکہ کے صرف نائب وزیر کے استقبال کے لیے پوری کی پوری حکومت ایئر پورٹ پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

جس میں چائے اور کافی کے بجائے کابینہ کے اجلاس میں مکمل لنچ اور مکمل ڈنر سرو کیا جاتا ہے اور جس میں ایوانِ صدر اور وزیر اعظم ہاؤس کے باورچی خانے ہر سال کروڑوں روپے دھواں بنا دیتے ہیں۔

جس میں سربراہِ مملکت جدید ترین بلٹ پروف گاڑیوں، ماہر سکیورٹی عملہ

اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کے بغیر دس کلومیٹر کا فاصلہ طے نہیں کر سکتے۔ہم اس ملک میں مساوات رائج نہیں کر سکے، اسے ایک بھی خوددار، باوقار اور ایماندار قیادت نہیں دے سکے، ہم اسے جدید، ترقی یافتہ اور پر امن ملک نہیں بنا سکے تو نہ سہی۔لیکن شاید ہم اسے واپس 1948ء تک بھی نہیں لے جا سکتے، ہم اسے 60 برس پرانا پاکستان بھی نہیں بنا سکتے۔کوئی ہے جو ہم سے یہ ترقی، خوشحالی اور یہ عروج لے لے اور ہمیں ہمارا پسماندہ، غریب اور غیر ترقی یافتہ پاکستان واپس کر دے، جو ہمیں قائد اعظم کا پاکستان واپس کر دے کہ اس ملک کے 16 کروڑ عوام کو 2007ء کے بجائے 1948ء کا پاکستان چاہیے۔

پروفیسر سعید راشد علیگ

گفتار و کردار قائداعظم

1946ء میں جب قائداعظمؒ پاکستان کی جنگ اصولی طور پر جیت چکے تھے، ایک ملاقات کے موقع پر مشہور کشمیری راہنما چودھری غلام عباس مرحوم نے ان سے کہا ''یہ سب کچھ آپ کی ذہانت و فراست کا نتیجہ ہے''۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ فقرہ ازراہِ عقیدت تعریف کے طور پر کہا تھا لیکن یہ سن کر قائداعظمؒ قدرے چونکے اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

❑ ''میرے دشمن میرے متعلق جو چاہیں کہیں، انھیں اختیار ہے لیکن میرے دوستوں کو علم ہونا چاہیے کہ محمد علی جناح نے کانگریس کو جس سیاست سے ہر قدم پر مات دی ہے، اس کا نام راست بازی اور سچائی ہے''۔

قائداعظم کی ساری سیاسی زندگی ان کے اس قول کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔ برصغیر کے وہ واحد سیاست دان ہیں جنھوں نے سیاست میں اخلاقی اصولوں کو نہ صرف مقدم سمجھا بلکہ عملی طور پر ملحوظ بھی رکھا۔ لیکن کس طرح ملحوظ رکھا؟ اور کہاں کہاں کس کس موقعہ پر ملحوظ رکھا؟ اس کی تفصیلات عام لوگوں کو شاید زیادہ معلوم نہیں۔ اسی طرح یہ بات کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں قائداعظمؒ کیسے تھے؟ ان کی قدریں کیا تھیں؟ ان کی زندگی کے راہنما اصول کیا تھے اور کس طرح وہ ان اصولوں پر سختی سے کاربند تھے، اس بارے میں بھی عام پاکستانیوں کی معلومات بہت ناکافی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قائداعظمؒ کی شخصیت و کردار کے موضوع پر ضروری مواد قابل قبول شکل میں اور کافی مقدار میں دستیاب نہیں۔

اس اہم قومی ضرورت کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے یہ اوراق ترتیب دیے گئے ہیں۔ طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ قائداعظمؒ کی ساری سوانح حیات اور ملفوظات

کا جائزہ لے کر اور ان کی چھان بین کر کے ایسے واقعات و مکالمات کو مختلف موزوں عنوانات کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے جن سے قائد اعظمؒ کی شخصیت و کردار پر براہ راست روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ان اوراق میں قائد اعظمؒ کے کردار کی کہانی خود ان کے الفاظ میں واقعات کے تانے بانے سے بیان کی گئی ہے۔ ان مکالمات کے مطالعہ سے قائد اعظمؒ کی جو تصویر ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے، وہ ایک ایسے مرد مومن کی تصویر ہے جس کے لیے اقبالؔ نے کہا ہے:

گفتار میں کردار میں اللہ کی برھان

قائد اعظمؒ کی ذات مسلمانان برصغیر کے لیے ایک تحفہ خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کہا کرتے تھے کہ محمد علی جناح برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خدا کی رحمت ہیں اور ان کا یہ کہنا غلط نہیں تھا۔ اب سے چالیس پچاس برس پہلے مسلمانوں کو حصول پاکستان کے لیے جس قسم کی قیادت کی ضرورت تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بے پایاں شان ربوبیت سے محمد علی جناح کی شکل میں ان کو عطا کی۔ **فبای الا ربکما تکذبن**

آج تعمیر پاکستان کے لیے قائد اعظمؒ کی شخصیت و کردار کا مطالعہ ہمارے لہو کو سوز یقین سے گرما سکتا ہے اور زندگی کے بہت سے دائروں میں خاص طور پر سماجی تعلقات اور سیاسی تگ و دو کے میدان میں ہماری راہوں کو روشن کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ قومی تاریخ کے اس مرحلہ میں بحیثیت قوم جس کرداری راہنمائی کی ضرورت ہے، وہ قائد اعظمؒ کے کردار میں موجود ہے۔ قائد اعظم کے قد کے سے قائد کبھی مرتے نہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ قومی ہیرو کو ہر نسل اپنے طور پر دریافت کرتی ہے اور فیض پاتی ہے۔

برطانوی وزیر اعظم سے ہاتھ ملانے سے انکار

جب **1935**ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ملک کو فیڈریشن کی پیشکش ہوئی تو اس وقت ہندوستانی لیڈروں میں قائد اعظمؒ ہی ایک ایسے راہنما تھے جنھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ریمزے

میکڈانلڈ نے قائداعظم کو ایک نجی ملاقات کے لیے زحمت دی اور کہا:

''اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی دوسرا کیوں نہیں بن سکتا۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کرسکتا ہے تو کوئی اور کیوں نہیں حاصل کرسکتا''۔

یہ سن کر قائداعظم، لارڈ ریمزے کے کمرے سے بغیر کسی تمہید کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بات برطانوی وزیراعظم کے لیے انتہائی تعجب کا باعث ہوئی اور وہ حیران ہو کر قائداعظمؒ کے ساتھ دروازے تک آیا اور جب اس نے الوداع کہنے کے لیے مصافحے کا ہاتھ بڑھایا تو قائداعظمؒ نے اس سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ اس پر برطانوی وزیراعظم نے بے انتہا خجالت سے کہا:

میکڈانلڈ: آخر یہ کیوں؟

قائداعظم: (برہمی سے) اب میں آئندہ کبھی آپ سے نہیں ملوں گا۔ آپ کے خیال میں، میں کوئی قابل فروخت چیز ہوں۔

مسجد کا احترام

21 فروری **1936**ء کو قائداعظم مسجد شہید گنج کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے۔ اس روز جمعہ تھا۔ قائداعظم نماز کے لیے بادشاہی مسجد تشریف لے گئے جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو خواجہ اشرف احمد ان کے پاس پہنچے:

خواجہ اشرف: (آٹوگراف بک آگے بڑھاتے ہوئے) جناب، آٹوگراف۔

قائداعظم: یہاں نہیں گھر جا کر۔

خواجہ اشرف لکھتے ہیں کہ محض مسجد کے احترام کی خاطر انھوں نے آٹوگراف نہیں دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے میاں احمد یار خاں کی کوٹھی پر جا کر ان سے آٹوگراف لیا۔

کسی غیر کا ہاتھ، ہاتھ میں نہیں

جب قائداعظم انگلستان میں زیرتعلیم تھے تو کرسمس کے موقع پر طلبہ اور طالبات کے ساتھ ایک کھیل میں حصہ لے رہے تھے۔ کھیل کی ایک دلچسپ شرط یہ تھی کہ جیتنے والے لڑکے یا لڑکی کو دوسرے ساتھیوں کی ایک ایک فرمائش پوری کرنی پڑتی تھی۔

طلبہ: جناح! مبارک ہو۔ آپ بازی جیت گئے، اب آپ ہماری ایک فرمائش پوری کیجیے۔

جناح: فرمایئے، آپ کیا چاہتے ہیں؟

طلبہ: وہ جو سرخ بالوں والی لڑکی ادھر بیٹھی ہے، اس کے ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ رقص کیجیے۔

جناح: معاف کیجیے۔ میں آپ کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔ میں اپنی ہونے والی بیوی کے سوا کسی اور لڑکی کا ہاتھ نہ تھاموں گا اور نہ ہی اس کے ساتھ رقص کروں گا۔

اس واقعہ کی راوی بیگم نصرت عبداللہ ہارون کو خود قائداعظم نے یہ واقعہ سنایا۔

میرے سامنے نہیں، خدا کے سامنے جھکو

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور نے **1941**ء کے اوائل میں ایک خصوصی اجلاس پاکستان کے موضوع پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور قائداعظمؒ کو شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ دعوت قبول کی بلکہ یہ بھی لکھا کہ میں طالب علموں کا ہی مہمان ہوں گا۔ بہرحال جب قائداعظم تشریف لائے تو ان کے استقبال کے لیے مجلس انتظامیہ کے ایک رکن خواجہ اشرف آگے بڑھے اور جھک کر قائد کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

قائداعظمؒ: ایسا نہ کیجیے۔ میرے سامنے نہیں، صرف خدا کے سامنے جھکیے۔

قائداعظم کو عقیدت مندی کے اظہار کا یہ طریقہ پسند نہیں تھا۔ ہیرو پرستی کے وہ خلاف تھے۔ قائداعظم نے اسی موقع پر اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ سے کہا: ''حضرات آج یکم مارچ ہے، مارچ آن، مارچ آن۔ آگے بڑھیے اور آگے بڑھتے جایئے''۔

ان واقعات کے راوی جسٹس ذکی الدین پال ہیں جو فیڈریشن کی مجلس استقبالیہ کے ایک رکن تھے اور ان واقعات کے عینی شاہد۔

صرف خدا کے آگے جھکو

یکم مارچ **1941**ء کو قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ بڑا شاندار جلوس نکلا۔ اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں تقریر کی اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے پرچم کشائی کی رسم ادا

کی۔ اسی روز شام کو فلیٹیز ہوٹل میں فیڈریشن نے گارڈن پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مقررہ وقت پر قائداعظم ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنے لان میں داخل ہو رہے تھے، استقبال کرنے والوں میں فیڈریشن کے عہدیداروں کے علاوہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل خواجہ دل محمد بھی تھے کہ یکایک ایک پرجوش مسلم لیگی نوجوان خواجہ اشرف نے جھک کر عقیدت سے ان کے گھٹنے چھو لیے۔

قائداعظمؒ: مائی بوائے، صرف خدائے بزرگ و برتر کے سامنے جھکنا چاہیے۔ اسلام اسی کی تلقین کرتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھو اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔

خواجہ دل محمد: سر، یہ محبت ہے!

خواجہ اشرف یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ قائداعظم نے اپنا فقرہ دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھانے کے بعد تین دفعہ دہرایا تھا۔

اگر میرا بیٹا بھی ہوتا تو میں اس کے لیے سفارش نہ کرتا

مجاہد حسین 1938ء سے 1948ء تک قائداعظمؒ کے جز وقتی اسٹینو رہے تھے۔ گو ان کی اصل ملازمت دہلی سیکرٹریٹ میں تھی۔ انہوں نے ترقی کے لیے ای ایچ اینڈ ایل ڈیپارٹمنٹ میں سٹینوگرافر کی ایک جگہ کے لیے ٹیسٹ دیا۔ جس میں وہ اوّل بھی رہے لیکن محض سفارش نہ ہونے سے ناکام رہے۔ اس طرح انہیں یقین ہو گیا کہ بغیر سفارش لائے کام نہ بنے گا۔ انہی دنوں فیڈرل کورٹ نیا نیا بنا تھا اور سر شاہ سلیمان ایک جج کی حیثیت سے دہلی آئے تھے۔ انہیں ایک سٹینوگرافر کی ضرورت تھی۔ مجاہد حسین کو معاً خیال آیا کہ اگر میں قائداعظمؒ سے سفارش کراؤں تو یقیناً کام بن جائے گا۔

مجاہد حسین: سر، سر شاہ سلیمان کو ایک اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔

قائداعظمؒ: تو پھر؟

مجاہد حسین: میں اس جگہ کے لیے امیدوار ہوں۔ پچھلی بار ای، ایچ اینڈ ایل ڈیپارٹمنٹ میں ٹیسٹ میں اول آنے پر بھی مجھے جگہ نہیں ملی۔ محض اس لیے کہ میری کوئی سفارش نہیں تھی۔

قائداعظمؒ: کیا کہنا چاہتے ہو؟

مجاہد حسین: سر، میں عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ سر شاہ سے میرے لیے کہہ دیں تو کام بن جائے۔
قائد اعظمؒ: (برہم ہو کر) تم نے کیا سمجھا ہے؟ میں کوئی ملازمت دلانے کی ایجنسی ہوں۔ (پھر دھیمے پڑ کر) مجاہد! میں ایک واقعہ سناتا ہوں، اسمبلی میں ایک بل زیر غور تھا جس کے لیے حکومت کو میری پارٹی کی حمایت درکار تھی۔ سر ٹیک اس وقت فنانس ممبر تھے اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں چند اسامیاں خالی تھیں اور نہ معلوم خالی تھیں بھی یا نہیں۔ بہرحال فنانس ممبر نے مجھ سے کہا۔ مسٹر جناح! ان اسامیوں کے لیے قابل مسلمان نہیں مل رہے۔ کچھ آپ ہی مدد کریں اور چند نام تجویز کر دیں۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تین اسامیوں کے لیے دس نام دیتا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیا کیا۔ میں نے کہا۔ دیکھیے سر بیل آسامیاں حکومت کی ہیں۔ حکومت کے فنانس ممبر آپ ہیں۔ اب یہ آپ کا اور حکومت کا کام ہے، وہ موزوں امیدوار ڈھونڈے۔ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ قابل مسلمانوں کی کمی نہیں ہے، بشرطیکہ آپ ان کو ملازمت دینا چاہیں۔ میرے اس جواب سے سر بیل سمجھ گئے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے پھر انہوں نے یہ مسئلہ نہیں چھیڑا۔ (دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اُٹھا کر)

دیکھو۔ اگر میرا بیٹا ہوتا تو اس کے لیے بھی کبھی کوئی سفارش کسی سے نہ کرتا۔

اس عظیم کتاب کے ہوتے ہوئے تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

اواخر 1943ء میں میاں بشیر احمد 10۔اورنگ زیب روڈ پر دہلی میں قائد اعظم سے ملاقات کے لیے گئے۔ کرپس مشن کے پس منظر میں گفتگو شروع ہوئی۔

میاں بشیر احمد: سر، مسلمانوں کی موجودہ حالت اور ان کے افتراق کو دیکھا جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے، آگے کا بھی اللہ ہی مالک ہے۔

قائد اعظمؒ: (قریب کی میز پر رکھے قرآن حکیم کے نسخہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ''ہمیں پریشان یا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ کتاب ہماری راہنمائی کے لیے ہمارے پاس موجود ہے''۔

میاں بشیر احمد قائد اعظم کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ان الفاظ

سے اس مفروضے کی تردید ہوتی ہے کہ وہ سیکولر خیالات رکھتے تھے۔ میرے کانوں میں قائداعظم کے وہ تاریخی الفاظ اب بھی گونج رہے ہیں جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بڑے یقین کے ساتھ کہے تھے۔

- ''وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہو گئے۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر اُن کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک اللہ، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب اور ایک اُمت''۔ (اجلاس مسلم لیگ، کراچی، 1943ء)

الم تر کیف

تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے قائداعظم کو چومکھی لڑنی پڑ رہی تھی، لیکن وہ اللہ کی نصرت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ قرآن حکیم کے مطالعے نے ان کے اس یقین کو اور مستحکم کر دیا تھا۔ ایک روز ممدوٹ ولا میں رانا نصر اللہ خاں قائد کی خدمت میں حاضر تھے تو یہ گفتگو ہوئی:

قائداعظمؒ: میں نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ کئی بار پڑھا ہے۔ مجھے اس کی بعض سورتوں سے بہت تقویت ملتی ہے۔

رانا نصر اللہ خاں: مثلاً:

قائداعظمؒ: وہ چھوٹی سی سورۃ ہے، جس میں ابابیلوں کا تذکرہ ہے۔

رانا نصر اللہ خاں: **الم تر کیف فعل ربک۔**

قائداعظمؒ: جی ہاں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح کفار کے بڑے لشکر کو ابابیلوں کے ذریعے شکست دی، اسی طرح ہم لوگوں کے ذریعے ان شاء اللہ کفار کی قوتوں کو شکست ہو گی۔

اس واقعہ کے راوی رانا نصر اللہ خاں کہتے ہیں کہ قائد سورہ الم تر کیف، بہت ذوق وشوق سے سنتے تھے اور اپنی بات چیت اور تقریروں میں اکثر ان شاء اللہ اور اللہ کو

اگر منظور ہوا جیسے فقرے استعمال کیا کرتے تھے۔

میں اس قرارداد کو پیش کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا

یہ واقعہ مسلم لیگ کے کراچی اجلاس کا ہے جو 1943ء میں ہوا تھا۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور قائداعظمؒ اس کے صدر تھے۔ اس موقع پر بعض مندوبین نے جوش عقیدت میں سوچا کہ کیوں نہ قائداعظم کو تاحیات صدر مسلم لیگ منتخب کر لیا جائے۔
مندوبین: اجازت ہو تو آپ کو تاحیات مسلم لیگ کا صدر منتخب کرنے کی قرارداد پیش کی جائے۔ یہ ہر سال نئے سرے سے انتخاب کرانے کی کیا ضرورت ہے۔
قائداعظمؒ: میں اس قرارداد کو پیش کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ یہ امر ذہن میں رکھیں کہ میں عام انسانوں کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ غلطی سے مبرا نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ آئندہ سال کے دوران مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے یا حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ کسی وجہ سے آپ مجھے مسلم لیگ کا صدر منتخب نہ کرنا چاہیں۔ اس صورت میں یہ قرارداد آپ کے ہاتھ باندھ دے گی۔ آپ کو ہر سال بلا جبر و اکراہ، آزادی، بے خوفی اور بے باکی سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ مجھے صدر منتخب کرنا چاہتے ہیں یا کسی اور کو، مزید یہ بھی نہ بھولیے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی لافانی نہیں اور نہ کوئی ناگزیر یا لابدی ہے۔ اس لیے آپ کو انسانی خطا اور فنا کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ صرف خدا پر بھروسا کیجیے اور صراط مستقیم پر گامزن رہیے۔

اس واقعہ کے عینی شاہد میاں منظر بشیر لکھتے ہیں کہ میں وہ لمحہ نہیں بھول سکتا جب پنڈل میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ اصولوں کو شخصیات سے بلند رکھنے پر یقین رکھتے تھے اور اسی پر ان کا عمل رہا۔

شخصیت پرستی

دسمبر 1945ء میں ڈسٹرکٹ مسلم لیگ بمبئی کے کارکن، قائداعظم کو ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت دینے گئے۔ مصافحہ کے دوران ایک کارکن نے جوش عقیدت میں قائداعظم کے ہاتھوں کو جھک کر بوسہ دے دیا۔

کارکن: اگر آپ ہمارے جلسہ میں ....

قائداعظمؒ: وہ تو میں ضرور آؤں گا۔ لیکن فی الحال میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ مجھے ایک عام انسان تصور کریں۔ پیر و مرشد نہ سمجھیں۔ اس طرح لوگوں میں غلط اور تباہ کن طریقے پر سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے جسے شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ یہ مرض نقصان دہ اور مضرت رساں ہے اور اسلام میں ناروا اور ناجائز ہے۔

پیسے پیسے کا حساب

قائد اعظم بہت ہی محتاط طبیعت کے مالک تھے۔ عوام سے جو روپیہ انھیں وصول ہوتا تھا، اس کا حساب دینے میں نہایت پابندی برتتے تھے۔ جب بھی انھوں نے مسلم لیگ کی طرف سے یا مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کے لیے روپیہ کی درخواست کی، مسلم عوام کی طرف سے اس کا بڑا حوصلہ افزا جواب ملا۔ 1946ء کی انتخابی مہم کے لیے ہر روز ڈاکیہ چھوٹی بڑی سب طرح کی رقموں کے منی آرڈر کثیر تعداد میں لایا کرتا تھا۔ قائد اعظم نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ ساری رسیدیں خود ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جائیں اور پیسے پیسے کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ چنانچہ رسید چار آنے کی ہو یا دس ہزار روپے کی، ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جاتی۔ اس طرح ان کا خاصا وقت ان چھوٹی چھوٹی رسیدوں پر دستخط کرنے میں صرف ہو جاتا۔ ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا:

سیکرٹری: جناب، اس طرح چھوٹی بڑی رسیدوں پر دستخط کرنے میں آپ کا خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اگر آپ رسیدوں پر دستخط کرنے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیں تو کیا بہتر نہ ہوگا۔ حساب کا گوشوارہ آپ دیکھ لیا کریں۔

قائداعظمؒ: ہرگز نہیں۔ رسیدوں پر مجھے خود دستخط کرنے چاہئیں۔ اس غریب شخص کے لیے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے، یہ رقم ایسی ہی ہوگی جتنی کہ دس ہزار یا بیس ہزار کے عطیے کی۔ اس غریب آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی مدد کی قدر کرتا ہوں اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں جب میں کسی رسید پر دستخط کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہو

جاتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقصد کے لیے ہمیں ایک اور خیر خواہ مل گیا ہے۔ اس مسرت سے بڑھ کر مجھے قوم سے اور کیا انعام مل سکتا ہے۔ بہرصورت چند سو رسیدوں پر دستخط کرنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ عوام کی امداد و تائید سے لیگ کی اور میری قوت میں اضافہ ہوگا اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لیے ہمیں اس قوت کی ضرورت ہے۔

یہ پیسے بھی اہم ہیں

جب قائد اعظم نے اعلان کیا کہ تم مجھے چاندی کی گولیاں دو، میں تمھیں پاکستان دوں گا تو برصغیر کے طول و عرض میں ہر مسلمان نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔ یہاں تک کہ سکول کے بچوں نے ایک ایک روپے کے منی آرڈر بھیجے۔ قائد اعظم ایک ایک رسید پر اپنے ہاتھ سے دستخط کر رہے تھے۔

حنیف مینار: یہ زحمت آپ کیوں کر رہے ہیں؟

قائد اعظم: یہ پیسے اہم ہیں کیونکہ بچوں نے محبت سے جمع کر کے بھیجے ہیں۔ مسلمانوں کا لیڈر بننا بہت مشکل ہے خاص کر پیسے کے معاملے میں مسلمان لیڈر کو احتیاط برتنی چاہیے کیونکہ ماضی میں بعض مسلمان لیڈر اسی وجہ سے بدنام ہوئے۔

جب مجھے مرنا ہوگا کوئی مجھے بچا نہ سکے گا!

اوائل 1947ء میں قائد اعظم جب آخری بار بمبئی گئے تو ہوائی اڈے پر خصوصی حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔ پولیس کے علاوہ نیشنل گارڈز بھی موجود تھے۔ لوگوں کا بے انتہا ہجوم تھا۔ قائد اعظم کو جس کار میں بیٹھنا تھا، اس کو ڈرائیو کرنے کی سعادت بمبئی اسمبلی کے لیگی کارکن حسین بیگ محمد کے حصے میں آئی تھی۔ جب قائد اعظمؒ کار کے قریب پہنچے تو حسین بیگ محمد نے جلدی سے کار کا دروازہ کھولا تاکہ وہ آرام سے بیٹھ جائیں لیکن قائد اعظم نے اشارے سے دروازہ بند کرنے کو کہا اور خود ہجوم کی طرف بڑھنے لگے اور پھر ہجوم میں گھل مل گئے۔ نیشنل گارڈز کو ان کے گرد حفاظتی دائرہ قائم رکھنے میں بہت دقت پیش آئی۔ کچھ دیر کے بعد جب قائد اعظم کار میں آ بیٹھے تو یہ مکالمہ ہوا۔

حسین بیگ محمد: سر، آپ تو لوگوں کے ہجوم میں چلے گئے اگر کوئی شخص آپ پر حملہ آور ہو

جاتا تو!

قائداعظمؒ: حسین! جب مجھے مرنا ہوگا تو مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ان احکامات سے کوئی مستثنیٰ نہیں

یہ واقعہ ستمبر 1947ء کا ہے۔ قائداعظمؒ گورنر جنرل ہاؤس کے جنوبی لان میں چہل قدمی کر رہے تھے اور نیوی کے اے ڈی سی لیفٹیننٹ ایس ایم احسن تھوڑے فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سیر کے دوران وہ خلاف معمول ذرا آگے بڑھ گئے اور گورنر جنرل ہاؤس کے جنوبی گیٹ کے بالکل قریب جا نکلے جہاں ایک نیا سنتری ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ جس نے قائداعظمؒ کو روبرو نہیں دیکھا تھا۔

سنتری: یہیں رُک جایئے جناب۔ آپ آگے نہیں جا سکتے۔ آرڈر نہیں۔

قائداعظمؒ: ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

سنتری: نہیں جناب یہ ٹھیک نہیں۔ کسی شخص کو اس نشان سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔ یہی آرڈر مجھے ملا ہے۔

احسن: (جو اس دوران میں عین موقعہ پر پہنچ گئے تھے) کیا معاملہ ہے جناب۔

قائداعظمؒ: احسن، ذرا اس کو بتایئے کہ میں کون ہوں۔

احسن: (سنتری سے) بھئی کیا کر رہے ہو تم۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ قائداعظم ہیں، پاکستان کے گورنر جنرل!

سنتری: نہیں جناب، میں نہیں جانتا کہ یہ صاحب کون ہیں اور نہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ جو آرڈر مجھے ملا ہے، اس کی پابندی کرانا میرا فرض ہے خواہ وہ کوئی ہو۔

قائداعظمؒ: (بہت متاثر ہو کر) احسن، خدا ہمیں اس قسم کے اور آدمی عطا فرمائے۔ جب تک پاکستان میں اس قسم کے انسان موجود ہیں، مجھے پاکستان کے لیے نہ کوئی فکر ہے اور نہ کوئی خطرہ۔

(سنتری سے) شاباش۔ ہر وقت اسی طرح اپنا فرض بجالاتے رہو۔ مجھے تم پر

فخر ہے۔ پاکستان کو تم پر فخر ہے۔ قانون واقعی سب کے لیے ایک ہوتا ہے۔

ایک بتی بھی زائد نہیں

قائد اعظم روپے کے ضیاع کے قائل نہ تھے خواہ وہ ان کا اپنا ہو یا کسی دوسرے کا یا حکومت کا۔ وہ اس کا بہت اہتمام کرتے تھے کہ اپنے گھر میں زائد از ضرورت بتیوں کو گل کر دیں حتیٰ کہ اپنے میزبان کے گھر میں بھی وہ زائد بتیاں بجھا دیتے تھے جو ان کے لیے جلائی گئی ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد جب قائد اعظم گورنر جنرل ہاؤس میں رہتے تھے تو وہ اکثر رات کو غیر ضروری روشنیوں کو گل کر دیتے تھے۔ ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا:

سیکرٹری: جناب، آپ کے اس طرح بتیاں گل کرنے سے ہمیں شرمندگی ہوتی ہے، یوں بھی چند بتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟

قائد اعظمؒ: فرق کی نہیں۔ اصول کی بات ہے۔ روپیہ کو ضائع کرنا ایک گناہ ہے اور اگر وہ عوام کا روپیہ ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے۔

وہ قائد اعظم جو پیسے پیسے کا حساب رکھتے تھے اور ایک پیسے کو ضائع کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ پیسے کو فراخدلی سے صرف کرنا بھی جانتے تھے۔ اپنی وصیت میں انھوں نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت کا بڑا حصہ قومی تعلیمی اداروں کی فلاح و ترقی کے لیے وقف کر دیا۔

مسجد کا مقدمہ

بمبئی کی ایک مسجد تھی جس کی وقف جائیداد کی اس زمانے میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ مالیت تھی۔ اس کا متولی مشکوک کردار کا غلط آدمی تھا۔ محلّہ والے اس کی بد دیانتی اور بدکرداری کی بنا پر اس کو مسجد کی تولیت سے ہٹانا چاہتے تھے، بات عدالت تک پہنچی۔ جب سمن کی تعمیل ہوئی تو وہ شخص قائد اعظم کے پاس پہنچا۔

متولی: جناب، مقدمہ کی یہ صورت ہے۔ لوگ ذاتی دشمنی کی بنا پر مجھے مسجد کی خدمت

کرنے سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور مسجد کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔آپ یہ مقدمہ لیں، آپ جو کہیں گے پیش کروں گا۔

قائداعظمؒ: صورت حال سے میں خود واقف ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی وکالت کسی قیمت پر نہیں کرسکتا۔

اس واقعہ کے راوی محمد شریف طوسی کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کے اس طرح انکار کے بعد وہ لوگ آئے جو متولی کو ہٹانا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ نے ان کا کیس لڑنا فوراً منظور کرلیا اور وہ بھی بلامعاوضہ، عدالت کا فیصلہ ان ہی کے حق میں ہوا۔ فیصلہ یہ تھا کہ چار افراد کا بورڈ بنایا جائے جو مسجد کی وقف جائیداد کا انتظام کرے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پرانا متولی چھ مہینے کے اندر ہی مرگیا اور سارا انتظام اس نئے بورڈ کے ہاتھ آگیا۔ پھر یہ لوگ دس ہزار روپے فیس کے طور پر لائے۔ قائداعظمؒ نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کردیا۔ یہ واقعہ قائداعظمؒ کی ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ کی رہائش کے زمانہ کا ہے۔

میں کبھی پرائمری اسکول میں بھی تھا

کیبنٹ مشن پلان پر مذاکرات کے بعد 1946ء کے اواخر میں قائداعظمؒ دوسرے لیڈروں کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ ایک پریس کانفرنس میں وہ اس نکتے کی وضاحت کر رہے تھے کہ کس طرح کانگریس نے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا ہے کہ یکا یک سوئٹزر لینڈ کے ایک صحافی بول اٹھے:

سوئس صحافی: لیکن سر، کبھی آپ خود بھی تو کانگریس میں تھے۔

قائداعظمؒ: جی ہاں! کبھی میں پرائمری کلاس میں بھی تھا۔

محمد متین خالد

قائداعظم کی میٹھی میٹھی باتیں

پاکستان: اسلام کا بنیادی مطالبہ

❑ ''مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد صرف کلمہ توحید ہے، نہ وطن، نہ نسل...... ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا تھا۔ وہ ایک الگ قوم کا فرد بن گیا تھا۔ آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا''۔ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 8 مارچ 1944ء)

اسلام کی روایات

❑ ''اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات وادبیات کس امر پر شاہد ہیں؟ دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو اپنے مذہب میں بھی جمہوری نقطۂ نظر رکھتے ہیں''۔ (اجلاس مسلم لیگ، لکھنؤ، 31 دسمبر 1916ء)

قرآن مجید، ضابطۂ حیات

❑ ''قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی، شہری، کاروباری، فوجی، عدالتی، تعزیری اور قانونی ضابطۂ حیات جو مذہبی تقریبات سے لے کر روزمرہ زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، تمام افراد سے لے کر ایک فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لے کر جرم تک، اس دنیا میں جزا اور سزا سے لے کر اگلے جہان تک کی سزا و جزا تک کی حد بندی کرتا ہے''۔ (پیامِ عید، 1945ء)

قرآن، قطعی رہبر

❑ ”اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشاد خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کرسکتیں۔ ہم فتح یاب ہوں گے، اسی طرح جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران اور رُوم کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے تھے“۔(جلسۂ عام، حیدرآباد دکن، **11** جولائی **1946**ء)

زندگی اور موت

❑ ”تمام مسلمانوں کے لیے پاکستان زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس وقت تک مسلمان اور عرب حکومتیں حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہوں گی جب تک پاکستان قائم نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جو ہندوستان پر اقتدار رکھتا ہے، وہی مشرق وسطیٰ پر بھی اقتدار رکھتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ہندوشہنشاہیت قائم ہوگئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان سے اسلام ختم ہوگیا بلکہ ہندوستان سے ہی نہیں، دوسرے اسلامی مما لک سے بھی۔اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوب جائیں گے“۔(قاہرہ میں ایک تقریر، **20** دسمبر **1946**ء)

ہماری نجات

❑ ”میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں“۔

(شاہی دربار، سبّی بلوچستان، **14** فروری **1947**ء)

اسلام، عین انصاف

❑ ”اگر کوئی چیز اچھی ہے تو عین اسلام ہے، جو چیز اچھی نہیں ہے، وہ اسلام نہیں ہے، کیونکہ اسلام کا مطلب عین انصاف ہے“۔

(میمن چیمبر آف کامرس، بمبئی، **27** مارچ **1947**)

اسلام کی تعلیم

❑ ”ہر قسم کی احتیاج کو پورا اور ہر طرح کے خوف کو دُور کرنا ہی ہمارا مقصد نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ آزادی، وہ اخوت، وہ مساوات بھی حاصل کرنی چاہیے جس کی تعلیم ہمیں اسلام نے دی ہے“۔ (کراچی کارپوریشن، 25 اگست 1947ء)

آزمائش

❑ ”خدا جن لوگوں سے محبت کرتا ہے، ان کو امتحان اور آزمائش میں بھی ڈالتا ہے۔ آیئے آج ہم یہ عہد کریں کہ اپنے تصورات کے مطابق اس نئی مملکت کی تخلیق کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے اور آزمائشوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ یہ وقت ہر چند کہ بہت نازک ہے مگر مجھے پختہ یقین ہے کہ ہم اس پر غالب آ جائیں گے کیونکہ ہم اپنی طویل تاریخ کے دوران ایسے بہت سے طوفانوں کے منہ پھیر چکے ہیں“۔ (پیامِ عید، 24 اکتوبر 1947ء)

اہم اضافہ

❑ ”پاکستان دنیا کے نقشے پر محض ایک اور نام کا اضافہ ہی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اسلامی ممالک کی طویل صف میں ایک نہایت اہم اضافہ ہے“۔

(آسٹریلیا کے ایک نامہ نگار سے انٹرویو، 30 اکتوبر 1947ء)

موت سے نہ ڈریں

❑ ”اپنے اندر حوصلہ پیدا کیجیے، موت سے خوف نہ کھایئے، ہمارے مذہب نے یہی سکھایا ہے کہ ہمیشہ موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پاکستان اور اسلام کی عزت بچانے کے لیے ہمیں بہادری سے موت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر وسیلۂ نجات اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ حق کی خاطر شہید کی موت مرے“۔

(جلسۂ عام، لاہور، 30 اکتوبر 1947ء)

اسلام بنیادی سرچشمہ

❑ ”اسلام ہماری زندگی اور ہمارے وجود کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی

تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں''۔

(اسلامیہ کالج، پشاور، 13 جنوری 1948ء)

دنیا کی عظیم ترین ہستی

❑ ''آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کی عزت و تکریم کروڑوں انسان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیات بھی آپ ﷺ کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار، بندۂ ناچیز اتنی عظیم، عظیموں کی بھی عظیم ہستی کو بھلا کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ عظیم مصلح تھے، عظیم راہنما تھے، عظیم واضعِ قانون تھے، عظیم سیاست دان تھے، عظیم حکمران تھے''۔ (کراچی بار ایسوسی ایشن، 25 جنوری 1948ء)

اسلام ضابطہ حیات

❑ ''اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ پھر کسی کو ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔ ہم پاکستان کا دستور بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ ایک اعلیٰ آئینی نمونہ ہے۔ رسول کریم ﷺ کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ آپ ﷺ نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔ تجارت سے لے کر حکمرانی تک، ہر شعبۂ حیات میں آپ ﷺ مکمل طور پر کامیاب رہے۔ رسول اکرم ﷺ پوری دنیا کی عظیم ترین ہستی تھے، انھوں نے تیرہ سو سال قبل ہی جمہوریت کی بنیادیں رکھ دی تھیں۔

اسلام محض رسوم، روایات اور روحانی نظریات کا مجموعہ نہیں...... اسلام ہر مسلمان کے لیے ضابطۂ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی، اپنے افعال و اعمال، حتیٰ کہ سیاست اور معاشیات اور دوسرے شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا

ہے۔ اسلام سب انسانوں کے لیے انصاف، رواداری، شرافت، دیانت اورعزت کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ صرف ایک خدا کا تصور اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اسلام میں انسان، انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مساوات، آزادی اور اخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں"۔ (کراچی بار ایسوسی ایشن، 25 جنوری 1948ء)

نجات کا واحد ذریعہ

❑ "میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ اس سنہری اصولوں والے ضابطۂ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم واضع قانون، پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے قائم کر رکھا ہے۔ ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر رکھنی چاہئیں۔ اسلام کا سبق یہ ہے کہ "مملکت کے امور و مسائل کے بارے میں فیصلے باہمی بحث وتمحیص اور مشوروں سے کیا کرو"۔ (سبّی دربار بلوچستان، 14 فروری 1948ء)

اسلامی حکومت

❑ "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس میں تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص کی، یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت (پاکستان) کی ضرورت ہے"۔ (کراچی، 1948ء)

رشتہ اسلام

❑ "وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہو گئے۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر اُن کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر اللہ کی

کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک اللہ، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب اور ایک اُمت''۔ (اجلاس مسلم لیگ، کراچی، 1943ء)

نورِ ایمان

❑ ''ہندوؤ اور انگریزو! تم دونوں متحد ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ تم اس اسلامی تہذیب کو کبھی نہ مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے، ہمیشہ زندہ رہا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا''۔

(مرکزی اسمبلی، 22 مارچ 1939ء)

اسلام اور ہندوازم

❑ ''حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے قومی تصور اور ہندو دھرم کے سماجی طور طریقوں کے باہمی اختلاف کو محض وہم و گمان بتانا ہندوستان کی تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ ایک ہزار سال سے ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب پہلو بہ پہلو موجود رہی ہیں۔ دونوں قومیں آپس میں میل جول بھی رکھتی چلی آئی ہیں مگر ان کے قدیم اختلافات اسی شدت سے موجود ہیں۔ یہ توقع رکھنا سراسر غلط ہے کہ جمہوری آئین کا دباؤ پڑے گا تو ہندو مسلمان ایک قوم بن جائیں گے۔ جب ہندوستان میں ڈیڑھ سو سال سے قائم برطانوی سیکولر حکومت انھیں ایک قوم نہ بناسکی تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں فیڈرل نظام کے جبری قیام سے وہ دونوں ایک قوم بن جائیں گے۔ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ فرقوں سے متعلق نہیں بلکہ قوموں سے متعلق ہے۔ بلاشبہ اسے ایک بین الاقوامی مسئلہ قرار دینا چاہیے اور اسی نقطہ نگاہ سے اس کا حل تلاش کرنا لازم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس بنیادی امر واقعہ کی صحت تسلیم کرلیں۔ جب تک ہم اسے درست نہ مانیں گے، ہمارا وضع کردہ آئین ناکام رہے گا اور تباہی لائے گا''۔

(اجلاس مسلم لیگ، لاہور، 23 مارچ 1940)

❑ ''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی

نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی نہ صرف ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کے لیے مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے تاریخی ماخذ مختلف ہیں، ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور راہنما دوسری قوم کی بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھنے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی۔ خاص کر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہو اور دوسری کو اکثریت حاصل ہو۔ ایسی ریاست کے آئین کا عمل خاک میں مل کر رہے گا''۔ (اجلاس مسلم لیگ، لاہور، 23 مارچ 1940ء)

❑ ''جناب گاندھی کیوں یہ بات فخریہ نہیں کہتے: ''میں ہندو ہوں اور کانگریس کو ہندوؤں کی حمایت حاصل ہے۔'' مجھے تو یہ کہنے میں کہ ''میں مسلمان ہوں'' کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی''۔ (اجلاس مسلم لیگ، لاہور، 23 مارچ 1940ء)

مردمومن

❑ ''میں نے بہت دنیا دیکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شہرت بھی بے حساب دی، اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ مسلمانوں کو باوقار اور سربلند دیکھوں۔ میری خواہش ہے کہ جب مروں تو میرا دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے

دین اسلام سے خیانت اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی اُمت سے غداری نہیں کی۔ مسلمانوں کی آزادی، تنظیم، اتحاد اور مدافعت میں اپنا کردار ٹھیک ادا کیا اور میرا اللہ کہے کہ اے میرے بندے! بیشک تو مسلمان پیدا ہوا، بے شک تو مسلمان مرا۔"

(قائداعظم کا 30 جولائی 1948ء کو لاہور میں سکاؤٹ ریلی سے خطاب)

اسلام ایک مکمل ضابطہ زندگی

❏ "اب مسلمانوں کو ہر سمت میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر مسلمان خوب جانتا ہے کہ قرآن کے احکامات صرف مذہبی اور اخلاقی فرائض تک محدود نہیں ہیں جیسے کہ گبن نے کہا تھا کہ "بحر اقیانوس سے لے کر دریائے گنگا تک قرآن کو صرف الٰہیات ہی کے ضمن میں بنیادی ضابطہ نہیں مانا جاتا بلکہ دیوانی اور فوجداری قوانین اور وہ تمام قواعد وضوابط بھی جو نوعِ انسانی کے اعمال وافعال اور ملکیت وتصورت میں نظم و ضبط پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کبھی نہ تبدیل ہونے والی مشیت کے تابع ہیں۔" صرف ناواقف لوگوں کو چھوڑ کر ہر انسان جانتا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے لیے ایک ایسا عمومی ضابطہ ہے جس میں مذہبی، عمرانی، شہری، تجارتی، فوجی، عدالتی اور جرائم اور ان کی تعزیرات سمیت تمام پہلو شامل ہیں۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر عمل یعنی مذہبی رسومات سے لے کر جسم کی صحت اور تندرستی تک، اجتماعی مصالح اور حقوق سے لے کر انفرادی حقوق تک، اخلاقیات سے لے کر جرائم تک، اور دنیاوی سزا سے لے کر اُخروی عذاب تک جملہ معاملات میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔اور ہمارے رسول کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہر مسلمان قرآن کا ایک نسخہ اپنے پاس رکھے اور اپنا مفتی خود بنے۔ لہٰذا اسلام صرف روحانی معاملات اور عقائد و رسومات تک محدود نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطہ ہے جو پورے مسلم معاشرے کو زندگی کے جملہ پہلوؤں سمیت جو خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، منظّم اور منضبط کرتا ہے۔"

(قائد کا پیغام رمضان المبارک، روزنامہ ڈان، 11 ستمبر 1945ء)

قائداعظم اور نظامِ حکومت

❑ ”مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا؟ میں کون ہوں پاکستان کے طرزِ حکومت کا فیصلہ کرنے والا؟ مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن مجید نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا تھا۔ الحمدللہ! قرآن مجید ہماری راہنمائی کے لیے موجود ہے اور تا قیامت موجود رہے گا“۔ (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، جالندھر، 12 جون 1947ء)

❑ ”میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو جان بوجھ کر اور شرارت سے یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول زندگی کے معاملات میں آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام محض چند روایات اور روحانی عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے ضابطۂ حیات ہے جو اسے سیاست اور معیشت سمیت ہر شعبۂ زندگی کے لیے راہنمائی مہیا کرتا ہے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی پاکستان میں کوئی خوف ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ مخالفین کو پروپیگنڈا کر لینے دیجیے، ہم شریعت کی بنیاد پر ہی آئین پاکستان بنائیں گے اور دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ رہا ایک اعلیٰ آئینی نمونہ“۔ (کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب، 27 جنوری 1948ء)

❑ ”13 جولائی 1947ء کو دہلی میں پریس کانفرنس میں آپ سے اسلامی نظام کے بارے میں متعدد سوالات پوچھے گئے۔ ایک اخبار نویس نے پوچھا ”کیا پاکستان میں ایک غیر مذہبی حکومت ہوگی یا وہاں حکومت الٰہیہ قائم ہوگی؟“ قائداعظم نے کہا:

”آپ لوگ مجھ سے ایسا سوال کر رہے ہیں جو بالکل لغو ہے اور جس کے کوئی معنی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حکومت الٰہیہ کے کیا معنی ہوتے ہیں۔“

اس موقع پر ایک نامہ نگار نے کہا کہ ”حکومت الٰہیہ کے معنی ایسی حکومت کے ہیں جہاں صرف ایک خاص مذہب کی حکومت ہو۔ مثال کے طور پر وہاں مسلمان پوری

طرح سے شہری ہوں گے اور غیر مسلموں کو مکمل طور پر وہاں کا باشندہ نہیں سمجھا جائے گا۔“

قائداعظم نے کہا:

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے، وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے میں کسی بطخ کی پیٹھ پر پانی پھینکتا رہا (قہقہہ) مہربانی کر کے آپ ان تمام لغو باتوں کو اپنے دماغ سے نکال دیجیے جن پر اس وقت گفتگو ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت الٰہیہ کے کیا معنی ہیں، یہ میں بالکل نہیں سمجھتا۔“

ایک موقع پر ایک دوسرے نامہ نگار نے کہا کہ ”حکومت الٰہیہ کا مطلب ہے وہ حکومت جو مولاناؤں کے مشورے سے چلائی جائے۔“ قائداعظم نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”انڈیا کی حکومت کی بابت آپ کی کیا رائے ہے جو پنڈتوں کے مشورے سے چلائی جائے گی۔“ (قہقہہ)

مسٹر جناح نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

”جب آپ جمہوریت پر غور کرتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسلام کا قطعاً مطالعہ نہیں کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم آج سے تیرہ سو برس قبل ہی جمہوریت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔“

(حالاتِ قائداعظم، از خالد اختر افغانی، ص780، 781، ایڈیشن دوم، 1947ء بمبئی)

شخصیت پرستی تباہ کن ہے

24 دسمبر 1945ء کو ای وارڈ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے چند کارکن قائداعظم کے دولت خانے پر ایک جلسہ میں شرکت کی دعوت دینے گئے۔ ان میں سے ایک شخص نے مصافحہ کرتے ہوئے جوشِ عقیدت سے مجبور ہو کر آپ کے ہاتھ چوم لیے۔ یہ حرکت دیکھ کر قائداعظم نے فرمایا:

❑ ”لوگوں کو چاہیے کہ وہ مجھے معمولی آدمی تصور کریں۔ پیر و مرشد نہ سمجھ لیں۔ اس طرح لوگوں میں غلط اور تباہ کن طریقہ پر سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے جسے عرف

عام میں شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ اور یہ مرض نقصان دہ اور مضرت رساں اور اسلام میں ناروا اور ناجائز ہے''۔ (روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی، 25 دسمبر 1945ء)

قرآنی آئین

اواخر جولائی 1947ء کا واقعہ ہے۔ قائداعظم دہلی میں 10-اورنگزیب روڈ پر اپنی کوٹھی میں قیام پذیر تھے اور قیام پاکستان سے متعلق معاملات کو سلجھا رہے تھے کہ علامہ شبیر احمد عثمانی اپنے چند رفقا کے ساتھ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

علامہ عثمانی: آپ کو قیام پاکستان مبارک ہو۔

قائداعظم: مبارکباد کے مستحق تو آپ لوگ ہیں، جنھوں نے تحریک پاکستان کو کامیاب کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔

علامہ عثمانی: اب جبکہ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان بن رہا ہے، آپ یہ فرمائیں کہ پاکستان میں آئین کون سا ہوگا؟

قائداعظم: پاکستان میں قرآنی آئین ہوگا۔ میں نے قرآن پاک مع ترجمہ پڑھا ہے، اور میں پختہ یقین رکھتا ہوں کہ قرآنی آئین سے بڑھ کر کوئی آئین نہیں ہوسکتا۔

...... میں نے مسلمانوں کا سپاہی بن کر جنگ جیتی ہے۔ قرآنی آئین کا ماہر میں نہیں، آپ اور آپ جیسے علما ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ دوسرے علما کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنے نئے ملک پاکستان کے لیے قرآنی آئین کا مسودہ تیار کریں۔

اسلام اور عیسائیت کا فرق

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنے مخصوص زوردار لہجے میں فرمایا نوجوان! بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا تو بولے ''جانتے ہو اسلام اور عیسائیت میں کیا فرق ہے'' پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگے ''عیسائیت میں صرف مقصد کا نیک ہونا ضروری ہے، اس میں نیک مقصد کے لیے غلط ذرائع بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن اسلام میں مقصد اور طریق کار دونوں کا نیک ہونا ضروری ہے''۔

(بریگیڈیئر گلزار احمد، اُردو ڈائجسٹ لاہور، ستمبر 1985ء)

دین اسلام ہمارا ضابطۂ حیات

□ ''کمیونسٹ ہمیں بے وقوف خیال کرتے ہیں۔ان کے پاس اس سوچ کا کچھ جواز نہیں ہوسکتا۔لیکن اب وہ غلطی پر ہیں کیونکہ پانچ یا دس سال قبل کے مسلمان اب خود کو بدل چکے ہیں۔کمیونسٹ اب ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔مت چھیڑو،مت چھیڑو کمیونسٹس ہمیں مت چھیڑو! اگر تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو تم خود اپنے داؤ کی زد میں آجاؤ گے۔ہمیں مسلم لیگ کے چاند ستارے والے جھنڈے کے سوا کسی دوسرے جھنڈے کی ضرورت نہیں۔اسلام ہمارا رہبر و راہنما ہے۔وہی ہمارا ضابطہ حیات ہے۔ ہمیں کسی سرخ یا زرد جھنڈے کی ضرورت نہیں۔ہمیں کسی ازم،سوشلزم،کمیونزم یا نیشنل سوشلزم کی ضرورت نہیں''۔(لاہور میں مسلم طلبہ کے اجتماع سے خطاب 19 مارچ 1944ء)

اسلام صرف نظام عبادات کا نام نہیں

□ ''ایک انگریز دانشور نے قائداعظمؒ سے سوال کیا تھا:''جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں تو کیا مذہب کے معنوں میں سوچ رہے ہوتے ہیں؟''اس پر بابائے قوم نے فرمایا تھا:

''آپ یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کریں کہ اسلام صرف نظام عبادات کا نام نہیں۔یہ تو ایک ایسا دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو زندگی کا ایک حقیقت پسندانہ اور عملی نظام حیات دیتا ہے۔میں زندگی کے معنوں میں سوچ رہا ہوں،میں زندگی کی ہر اہم چیز کے معنوں میں سوچ رہا ہوں،میں اپنی تاریخ،اپنے ہیروز،اپنے آرٹ،اپنے فن تعمیر، اپنی موسیقی،اپنے قوانین،اپنے نظام عدل و انصاف کے معنوں میں سوچ رہا ہوں۔ان تمام شعبوں میں ہمارا نقطۂ نظر نہ صرف ہندوؤں سے انقلابی طور پر مختلف ہے، بلکہ بسا اوقات متصادم بھی ہے۔ہماری اور ہندوؤں کی زندگیوں میں ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمیں بنیادی طور پر ہم رشتہ کر سکے۔ہمارے نام،ہمارا لباس،ہماری خوراک ایک دوسرے سے مختلف ہے،ہماری اقتصادی زندگی،ہمارے تعلیمی تصورات، جانوروں کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر،ہم زندگی کے ہر مقام پر ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔مثال کے طور پر

گائے کا ابدی مسئلہ لے لیں۔ ہم گائے کو کھاتے ہیں اور وہ اس کی عبادت کرتے ہیں“۔

(انگریز دانشور ہیورلی نکلسن کی کتاب Verdict on India مطبوعہ 1944ء)

قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے

❑ ”مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن مجید میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں۔ قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی“۔

(نومبر 1939ء میں عید الفطر کے موقع پر مسلمانوں کے نام پیغام)

پاکستان کا دستور کیسا ہوگا؟

قائداعظمؒ 1942ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کے سلسلے میں الٰہ آباد میں نواب سر محمد یوسف کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وکلا کا ایک وفد ملاقات کے لیے آیا۔ ارکان وفد میں سے ایک وکیل نے قائداعظمؒ سے پوچھا کہ ”پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ کیا پاکستان کا دستور آپ بنائیں گے؟“ قائداعظمؒ نے فرمایا:

❑ ”پاکستان کا دستور بنانے والا میں کون ہوں؟ پاکستان کا دستور تو تیرہ سو سال پہلے بن گیا تھا“ ایسا ہی ایک بیان 27 جولائی 1944ء کو دیا جب وہ کشمیر سے راولپنڈی پہنچے۔ قائداعظمؒ کا رات کا کھانا ڈھیری حسن آباد کے عبدالغنی ٹھیکیدار کے ہاں تھا۔ کھانے کی میز پر راولپنڈی مسلم لیگ کے صدر بیرسٹر محمد جان نے قائداعظمؒ سے پوچھا ”پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟“ قائداعظمؒ نے جواب دیا:

”یہ تو اس وقت کی دستور ساز اسمبلی کا کام ہوگا البتہ ہمارے پاس قرآن مجید کی صورت میں تیرہ سو سال پہلے کا دستور موجود ہے“۔

کیا مسلمان کمزور ہیں؟

❑ ”یہ تو ٹھیک ہے کہ یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں لیکن مسلمانوں کو اپنے تئیں ”ناچیز محض“ سمجھ لینے کی عادت کو ایک دم چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ یاد

کریں کہ جس وقت آٹھ سو برس قبل وہ ہندوستان میں آئے تھے تو مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھے لیکن انھوں نے سلطنتیں قائم کر ڈالیں۔ اس وقت بھی جو انگریز ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں ان کی تعداد صرف 2 لاکھ ہے۔ یہ ہی نہیں، تمام انگریزی قوم کی تعداد چار کروڑ سے بھی کم ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تو ہندوستان میں نو کروڑ ہے، لہٰذا ان کو اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر پیچھے نہ رہ جانا چاہیے۔ جب تک اسلامی خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے، ان کو کسی شخص سے خوفزدہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اغیار کی امداد کے بغیر ہی اپنے خدا پر بھروسا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے"۔ خاتمۂ کلام پر آپ نے زور دیا کہ: "مسلمان موحد ہیں، ان کی ایک مجلس، ان کا ایک جھنڈا، ان کا ایک راہنما اور ان کا ایک ہی قسم کا سوراج ہونا چاہیے۔ ان کو ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ ان کو نہ انگلینڈ پیس سکے اور نہ ہندو دبا سکے"۔ (قائداعظمؒ اور مسلم پریس از ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا)

❑ "اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطۂ حیات بھی ہے۔ اسلام کے معنے خدا اور بندے کے ساتھ امن کے ہیں۔ یہ بندہ کو بندہ نواز سے ملاقات اور ساتھ ہی بندہ کو بندہ سے مربوط رکھتا ہے۔ مسلم قوم کی پوری زندگی، مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ، خواہ وہ سماجی ہو یا تہذیبی، سیاسی یا معاشی، تابع احکام اسلامی ہے۔ ہماری پاکستانی سلطنتیں آئین و قوانین کی سختی سے حامل ہوں گی۔ ان کے سماجی، تہذیبی اور معاشی نظام قطعاً اسلامی اصول کے تحت ہوں گے۔ غیر مسلموں کو خائف ہونے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسلام اپنے متبعین کو انتہائی رواداری اور انصاف کی تعلیم دیتا ہے۔ پاکستانی ریاستوں میں انصاف اور رواداری کی حکومت ہوگی اور عصر حاضر کی نام نہاد جمہوری طرز کی پارلیمانی حکومت سے کہیں زیادہ بہتر طریقے پر غیر مسلموں کے ثقافتی، مذہبی، سیاسی معاشی حقوق کی نہ صرف پاسداری بلکہ کامل حفاظت بھی کی جائے گی۔ قرآن حمید نے اپنے متبعین کے ذریعہ غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت اور کامل پاسداری کا وعدہ کیا ہے"۔ (روزنامہ عصر جدید، کلکتہ 10 فروری، 1943ء، صفحہ 1: کالم 201 بحوالہ قائداعظمؒ اور مسلم پریس از ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا)

پاکستان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان

❑ ''یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس ہند سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ آج وہ قوم آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کا اپنا ایک ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت اور اپنا سکہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی ''انعام'' ہوسکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن، بچے بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لانے کے لیے فرط انبساط سے جھک جاتا ہے''۔ (قائداعظمؒ اور اسلام از محمد حنیف شاہد ص 43)

پاکستان: اسلامی ریاست: سیکولر یا تھیوکریٹک سٹیٹ؟

11 اکتوبر 1947ء کو سول بحری، بری اور فضائی افواج کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے ''اسلامی ریاست'' کے ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

''قیام پاکستان ...... اللہ کے فضل و کرم سے آج ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن اپنی مملکت کا قیام دراصل ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، بذات خود کوئی مقصد نہیں۔ تصور یہ تھا کہ ہماری ایک مملکت ہونی چاہیے جس میں ہم رہ سکیں اور آزاد افراد کی حیثیت سے سانس لے سکیں، جسے ہم اپنی صوابدید اور ثقافت کے مطابق ترقی دے سکیں جہاں اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصول جاری و ساری ہوں''۔

(گفتار قائداعظم از احمد سعید)

14، 15 دسمبر 1947ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل (کراچی) سے آخری خطاب میں قائداعظم محمد علی جناح نے جہاں تقسیم ہند کے واقعات پر تبصرہ فرمایا، وہاں

قیام پاکستان، بھارتی مسلمانوں، ہند مسلم لیگ اور اسلامی حکومت (ریاست) کے بارے میں بھی اظہار خیال فرمایا: اسلامی ریاست کے سلسلے میں قائداعظم نے دوٹوک، غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

- ''میں صاف طور پر واضح کر دوں کہ پاکستان اسلامی نظریات پر مبنی ایک مسلم مملکت ہوگی۔ یہ پاپائی (کلیسائی) ریاست نہیں ہوگی۔ اسلام میں جہاں شہریت کا تعلق ہے، کوئی امتیاز نہیں ہے۔ تمام دنیا، حتیٰ کہ ادارہ اقوام متحدہ نے پاکستان کو ایک مسلم ملک قرار دیا ہے''۔ (قائداعظم تقاریر و بیانات، بزم اقبال لاہور ص 241 جلد دوم)

19 فروری 1948ء کو آسٹریلیا کے عوام سے نشری خطاب میں قائداعظم نے پاکستان کے قیام، خارجہ تعلقات، اسلامی تاریخ، مسلم ممالک، اسلامی ریاست اور استحکام پاکستان کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا۔ اسلامی سلطنت یا اسلامی ریاست کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے قائداعظم نے واضح کیا:

- ''ہماری عظیم اکثریت مسلمان ہے۔ ہم رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ ہم اسلامی مملکت و برادری کے رکن ہیں جس میں حق، وقار اور خودداری کے تعلق سے سب برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں اتحاد کا ایک خصوصی اور گہرا شعور موجود ہے لیکن غلط نہ سمجھئے، پاکستان میں کوئی نظام پاپائیت رائج نہیں۔ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہم سے دیگر عقائد کو گوارا کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور ہم اپنے ساتھ ان لوگوں کے گہرے اشتراک کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں جو خود پاکستان کے سچے اور وفادار شہریوں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ اور رضا مند ہوں۔ ہماری اپنی تاریخ ہے، رسوم و روایات ہیں اور وہ تصورات فکر ہیں وہ نظریہ اور جبلت ہے جس سے قوم کا شعور ابھرتا ہے''۔ (ایضاً)

پاکستان کا آئین اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا

یہ امر بے جا نہ ہوگا کہ قرارداد لاہور (قرارداد پاکستان) کی منظوری کے بعد قائداعظم نے اسلامی سکالروں اور علما سے خط و کتابت اور میل ملاقات کا سلسلہ شروع

کر دیا تھا تا کہ وہ اسلامی آئین اور اسلامی قانون جو پاکستان کے لیے مرتب کیا جانے والا تھا، کے ضمن میں صلاح ومشورہ کر سکیں، ان کی حتمی رائے لے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے پیر صاحب مانکی صاحب سے بھی خط و کتابت کی۔

پیر صاحب موصوف نے قائداعظم محمد علی جناح سے اس ضمن میں استفسار کیا تو قائداعظم نے انھیں نومبر 1945ء میں مندرجہ ذیل مکتوب تحریر فرمایا جس میں وضاحت کی کہ پاکستان کا آئین اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔ قائداعظم نے لکھا:

"It is needless to emphasise that the Constituent Assembly which would be predomianantly Muslim in its Composition, would be able to enact laws for Muslims not inconsistent with the SHARIAT LAWS and Muslims will no longer be obliged to abide by the Un-Islamic Laws.

اسلام کے سنہری قوانین

14 فروری 1948ء کو سبی شاہی دربار میں اہل بلوچستان سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے اہل بلوچستان پر واضح کیا کہ:

- ❑ ”اس اسکیم کو پیش کرتے ہوئے میرے پیش نظر ایک ہی اصول تھا یعنی اسلامی جمہوریت کا اصول۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری نجات انھیں سنہری قوانین کی پابندی میں ہے جو ہمارے شارع اعظم پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لیے متعین کیے۔ آیئے! ہم اپنی جمہوریت کی اساس صحیح اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں“۔

پاکستان کا دستور، جمہوری اور اسلامی

امریکہ کے عوام سے نشری خطاب کے دوران جو قائداعظم نے کراچی سے 25 فروری 1948ء کو فرمایا، دستور پاکستان کے سلسلے میں بتایا:

- ❑ ”مجلس دستور ساز پاکستان کو بھی پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنا ہے۔ مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ دستور کی حتمی شکل کیا ہوگی لیکن مجھے اس امر کا یقین ہے کہ یہ

''جمہوری نوعیت'' کا ہوگا۔ جس میں ''اسلام کے لازمی اصول شامل ہوں گے''۔ آج بھی ان کا اطلاق عملی زندگی میں ویسے ہی ہوسکتا ہے جیسے کہ تیرہ سو سال قبل ہوسکتا تھا۔ اسلام نے ہر شخص کے ساتھ عدل اور انصاف کی تعلیم دی ہے۔ ہم ان شاندار روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کے مرتبین کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے باخبر ہیں''۔

پاکستان کا اقتصادی نظام

یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے پاکستان کے اقتصادی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

- ''بینک دولت پاکستان کا قیام اقتصادی شعبے میں ہماری مملکت کی خودمختاری کی علامت ہے...... آپ کا تحقیقی شعبہ بینکاری کے طور طریقوں کو معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے اسلامی تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں جو کام کرے گا، میں اس کا دلچسپی کے ساتھ انتظار کروں گا۔ اس وقت مغربی اقتصادی نظام نے تقریباً ناقابل حل مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور ہم میں سے اکثر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید کوئی معجزہ ہی دنیا کو اس بربادی سے بچا سکے جس کا اسے سامنا ہے...... مغربی اقدار، نظریے اور طریقے خوش وخرم اور مطمئن قوم کی تشکیل کی منزل کے حصول میں ہماری مدد نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنے مقدر کو سنوارنے کے لیے اپنے ہی انداز میں کام کرنا ہوگا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا جس کی اساس انسانی مساوات اور معاشرتی عدل کے سچے اسلامی تصور پر استوار ہو۔ اس طرح ہم مسلمان کی حیثیت سے اپنا مقصد پورا کر سکیں گے اور بنی نوع انسانی تک پیغام امن پہنچا سکیں گے کہ صرف یہی اسے بچا سکتا ہے اور انسانیت کو فلاح و بہبود اور مسرت وشادمانی سے ہمکنار کر سکتا ہے''۔

پاکستان صدیوں سے موجود ہے

مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ کے زیراہتمام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے 10 مارچ 1941ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے اعلان کیا:

□ ’’امر واقع یہ ہے کہ پاکستان صدیوں سے موجود ہے، یہ آج بھی ہے اور ابد تک موجود رہے گا۔ (مرحبا) یہ ہم سے چھین لیا گیا تھا، ہمیں صرف اسے واپس لینا ہے۔ اس پر ہندوؤں کا کیا حق ہے؟ ہمیں اس چیز پر دعوے سے کس طرح باز رکھا جا سکتا ہے جو ہماری اپنی ہے۔ دراصل یہ تو خود ہندوؤں کے اپنے مفاد میں زیادہ ہے......

پاکستان نہ صرف ایک قابل حصول منزل ہے بلکہ واحد منزل ہے۔ اگر آپ اس ملک میں اسلام کو مکمل تباہی سے بچانا چاہتے ہیں...... پاکستان تو موجود ہے لیکن ہمیں اسے لینا ہے۔‘‘ (قائداعظم کا تقاریر و بیانات، جلد دوم ترجمہ اقبال احمد صدیقی لاہور بزم اقبال 1998ء صفحات 458، 460)

پاکستان صدیوں سے موجود ہے

قائداعظم نے 27 دسمبر 1940ء کو احمد آباد کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ فلک شگاف نعرہ بلند فرمایا:

□ ’’پاکستان صدیوں سے موجود ہے۔ ان اوطان شمال مغرب اور مشرق میں جہاں وہ آج بھی ستر 70 فیصد اکثریت میں ہیں۔ ان علاقوں میں ’’خود مختار مسلم ریاستیں‘‘ ہونی چاہیں تا کہ وہ اپنی زندگی اپنے مذہب، اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کے مطابق بسر کر سکیں‘‘۔ (قائداعظم تقاریر و بیانات، جلد دوم، ترجمہ اقبال احمد صدیقی لاہور، بزم اقبال 1998ء صفحات 434 تا 435)

پاکستان پہلے سے موجود ہے اور سرگرم عمل ہے

22 مارچ 1945ء کو ’’یوم پاکستان‘‘ کی مبارک تقریب پر نئی دہلی سے قائداعظم محمد علی جناح نے جو پیغام دیا اس میں دوٹوک اعلان فرمایا:

□ ’’آج ہمارے اس عزم صمیم کے اعلان کی پانچویں سالگرہ ہے جو 23 مارچ 1940ء کے دن لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں کیا گیا جس میں ہم نے حتمی طور پر اپنے ’’نصب العین...... پاکستان‘‘ کی تشریح کر دی تھی۔ یہ ہمارا نا قابل تنسیخ و تبدل قومی مطالبہ ہے۔ مسلم ہند اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ

ہم شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں مکمل طور پر پاکستان ''حاصل اور قائم نہیں کر لیتے جیسا کہ آپ کو علم ہے یہ مسلم ہند کے لیے ''زندگی اور موت'' کی جدوجہد ہے۔

پاکستان کے حصول میں ہماری نجات، دفاع اور وقار مضمر ہے۔ اگر ہم ناکام ہو گئے تو ہم ختم ہو جائیں گے اور اس برصغیر میں ''مسلمانوں'' یا ''اسلام'' کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔ یہ ایک زبردست فریضہ ہے جو آپ کے سامنے ہے۔...... مجھے بھروسا ہے کہ پاکستان ہماری رسائی میں ہے۔ یہ پہلے سے موجود ہے اور سرگرم عمل ہے اور ہم ان صوبوں میں جیسے سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب، بنگال اور آسام میں اپنی کوششوں سے اس تمام قوت پر قبضہ کر لیں جو اس وقت ہمیں دستیاب ہے''۔

(قائداعظم تقاریر و بیانات، جلد سوم، ترجمہ اقبال احمد صدیقی صفحات 423 تا 425)

پاکستان کا مطلب: اسلام کی عظمت

23 مارچ 1944ء کو ''یوم پاکستان'' کی مبارک تقریب کے موقع پر لاہور سے جاری کردہ پیغام میں اعلان فرمایا:

- ''ہمارے لیے پاکستان کا مطلب ہے ہمارا دفاع، ہماری نجات اور ہمارا مستقبل۔ یہ واحد راستہ ہے جو ہمیں اپنی آزادی، اپنے وقار اور ''اسلامی عظمت'' کو برقرار رکھنے کی ضمانت دے گا''۔

(قائداعظم تقاریر و بیانات، جلد سوم، ترجمہ اقبال احمد صدیقی لاہور، بزم اقبال 1998ء صفحہ 291)

محمد متین خالد

حاصل مطالعہ

تحریک پاکستان، ایک دینی تحریک

تحریک پاکستان کوئی ہنگامی یا دستوری الجھنوں کا ردِعمل نہ تھی بلکہ اس کی تہہ اور باطن میں گہرا دینی ادراک (Vision) تھا۔ نامور آئینی ماہر، مولانا ظفر احمد انصاری کا یہ ارشاد اس دینی بصیرت کا اظہار ہی تو ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ: ''تحریک پاکستان اصلاً ایک دینی تحریک تھی، جو برعظیم پاک و ہند کے تاریخی اسباب کا لازمی نتیجہ تھی''۔ (مولانا ظفر احمد انصاری ماہنامہ چراغ راہ کراچی، نظریہ پاکستان نمبر 1960ء) یہی سبب تھا کہ: ''حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تحریک پاکستان کی حمایت (1938ء سے تاحیات 1945ء تک) کی۔ انہوں نے اس درپیش دینی مرحلے اور مسئلے پر مولانا حسین احمد مدنی اور جمعیت علما ہند سے اپنے اختلاف کے باعث دیو بند مدرسے سے اپنے تعلقات تک ختم کر دیئے''۔ (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علما میدانِ سیاست میں، ماہنامہ چراغ راہ کراچی، نظریہ پاکستان نمبر 1960ء)

یہی وہ مرحلہ اور مقصود تھا جو 1857ء کے پرآشوب دَور اور سقوط دہلی کے بعد برعظیم کی ملت اسلامیہ کے اتحاد و تنظیم اور یقین محکم کے عزم و ہمت کی داستان بن گیا، مسلم ملت اور مسلم مملکت ان دونوں کا نام پاکستان بن گیا، جس کا روحانی تصور اس ملک کی عصری پہچان اور شعر اقبالؒ کا جامع ہو گیا کہ:

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

یہی وہ شعور ملت تھا جو مسلم مملکت کے قیام کی جانب یکسو ہو گیا اور یہ ہی برعظیم کی ملت اسلامیہ کی آزادی کا مطلب تھا اور یہی مسلمانوں کی آزادی کی بات تھی۔ علما ہند پہلے آزادی پھر مسلمانوں کے آئینی حقوق کے لیے ''برادارن وطن یعنی ہندو اکثریت سے بات کریں گے'' کہتے تھے یہ مذہبی مدرسین کی سادگی تھی کہ سادہ دلی، یا بصیرت و بصارت سے محرومی کہ اب تک اکابر پرستوں اور مقابر پرستوں کی طرف سے تحریک پاکستان اور مخالفت پاکستان کو صرف ''سیاسی اختلاف'' کے لفظ میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کوئی وقتی سیاسی اختلاف تھا جو گاندھی اور جناح کی ضد کا نتیجہ ہے۔ اقبالؒ کی عمر رواں کے آخری برس میں ان کی صحبت پاک میں چلتے ہیں، وہاں اس نقطہ نظر پر کیا ارشادات ہیں؟ سید نذیر نیازی اپنے روزنامچے میں اقبال کے آخری سال 10 جنوری 1938ء کی روئیداد میں لکھتے ہیں کہ حضرت علامہؒ نے فرمایا: ''مجھے تو مسلمانوں کے مستقبل سے قطعاً مایوسی نہیں، ہمارا کوئی مسئلہ ہے تو قیادت! مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہم ہی میں سے کوئی صاحب ایمان اٹھ کھڑا ہوگا اور اس کا خلوص اور دیانتداری ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دے گی، ارشاد ہوا ''یہ محض خیال ہی خیال نہیں ہے حقیقت ہے''۔

(اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی) (زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی)

پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ صاحب ایمان جس کے خلوص اور دیانتداری نے ساری قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دیا، وہ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔

آسمان تری لحد پر شبنم افشانی کرے

دو قومی نظریہ

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا: ''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت جداگانہ معاشرتی نظام ہیں۔ یہ ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ دونوں مختلف مذہبوں، فلسفوں، معاشرتی نظاموں اور ادبیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ نہ ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مختلف تہذیبوں سے واسط رکھتے ہیں جن کی بنیاد ایسے افکار و

تصورات پر ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، بلکہ اکثر متصادم رہتے ہیں۔ دونوں اپنی اپنی تمنائیں اور آرزوئیں، تاریخ کے مختلف سر چشموں سے اخذ کرتے ہیں۔ ان کی مثنویاں مختلف، ہیرو مختلف، قصے کہانیاں مختلف، اکثر اوقات ایک قوم کا ہیرو، دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ ایسی دو جداگانہ قوموں کو ایک ہی ریاست کے تحت زبردستی متحد کرنے سے، جبکہ عددی اکثریت اور اقلیت کا بھی خاصا فرق ہے، لازماً بے اطمینانی پیدا ہو گی اور ہر وہ آئینی ڈھانچا بالآخر تباہ ہو کر رہ جائے گا''۔ (مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس، لاہور **1940**ء)

ایک فرد ناتواں آیا تواں دے کر گیا
قوم کو بے تابی عزم جواں دے کر گیا
ابر رحمت کی طرح برسا وطن کی خاک پر
اس زمیں کو اعتبار آسماں دے کر گیا

ختم نبوت کا انکار اور وطنیت: اقبال کی نظر میں

''وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں 'انکار خاتمیت' کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر، اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانون الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کے اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ ﷺ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔ بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی 'انکار خاتمیت' الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے''۔

(بیان علامہ اقبالؒ مطبوعہ انقلاب، لاہور مورخہ **10** مارچ **1938**ء)

افکار قائد کی ایک جھلک!

''نواب بہادر یار جنگ کی موجودگی میں طلبہ اور نوجوانوں سے گفتگو کرتے

ہوئے قائد اعظم نے وضاحت کی ''جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں، تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ ملاّ، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرض کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہے بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔'' (رہبر دکن 19 اگست 1941ء)

اسی گفتگو کے دوران قائد اعظم نے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے وضاحت کی ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ بنیادی امتیاز پیش نظر رہے کہ اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے اس لیے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں، قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ آپ جس نوعیت کی بھی حکمرانی چاہتے ہو اس کے لیے بہر حال سلطنت اور علاقہ کی ضرورت ہے''۔

ان الفاظ پر غور کیجیے اور قرارداد مقاصد کو یاد کیجیے جس کا پہلا فقرہ ہی وہ ہے جو قائد اعظم نے 1941ء میں بولا تھا، پھر یاد کیجیے قرارداد مقاصد کے حوالے سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تقریر جس میں انھوں نے کہا کہ یہ قرارداد قائد اعظم کی سوچ کی ترجمانی کرتی ہے۔ یاد رہے لیاقت علی خان نے اپنی جوانی قائد اعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان کی نذر کر دی تھی اور ان سے زیادہ کوئی قائد اعظم کو نہیں سمجھتا تھا۔ آخری فقرہ وہ ہے جو علامہ اقبال نے 28 مئی 1937ء کو اپنے خط میں قائد اعظم کو لکھا تھا

(بحوالہ خطوط اقبال بنام جناح) قیام پاکستان سے چھ برس قبل کے یہ چند فقرے پڑھیے اور دل سے پوچھئے کہ کیا ایسے آدمی کو سیکولر کہا جاسکتا ہے جو مستقبل کے پاکستان میں شریعت کی عمل داری کی بات کررہا ہے۔قرآن حکیم پر گہری نظر رکھتا ہے اور قرآن حکیم کو قوانین ،معاشرت، معیشت اور سیاست کا ماخذ قرار دے رہا ہے۔کیا ایسے شخص کو سیکولر قرار دینا اور اس کے تصور پاکستان پر سیکولر کا بہتان لگانا تاریخ کی نفی اور خود قائداعظم سے زیادتی نہیں؟ اگر سیکولر ازم کے ماڈرن مفہوم یعنی مذہب اور ریاست و سیاست کو الگ الگ بھی سمجھ لیا جائے تو قائداعظم اس معیار پر پورے نہیں اترتے کیونکہ وہ ہر مسلمان کی مانند اسلام کو مکمل ضابطہ حیات سمجھتے تھے اور ''معاشرت، سیاست، معیشت غرض کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو قرآنی تعلیمات کے تابع قرار دیتے تھے''۔ میں اپنے مؤقف کی حمایت میں قائداعظم کے ہزاروں الفاظ ''کوٹ'' کرسکتا ہوں لیکن مقصد آپ کو فقط جھلک دکھانا ہے۔'' (گفتار قائداعظمؒ از احمد سعید صفحہ 261، ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''افکارِ قائد کی ایک جھلک!'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 20 اکتوبر 2013ء)

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

نظریۂ پاکستان کے منکر

مسئلہ تو فقط اتنا سا ہے کہ سیکولر حضرات اسلامی ریاست اور اسلامی قانون کے تصور سے گھبراتے ہیں۔ وہ دین سے بیزار اور بیگانہ ہیں اور وہ پاکستان میں انھی آزادیوں کا خواب دیکھتے ہیں جو مغرب کے جمہوری ممالک میں بہ افراط پائی جاتی ہیں۔انھیں مغربی لباس میں ملبوس سگار کے کش لگاتا جناح تو پسند ہے لیکن وہ جناح پسند نہیں جس نے 27 جولائی 1944ء کو راولپنڈی میں واضح کر دیا تھا ''پاکستان کے دستور کے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے پاس 1300 سال سے دستور موجود ہے''۔ ایک سوال کے جواب میں قائداعظمؒ نے کہا کہ ''پاکستان میں شراب پر یقیناً پابندی ہوگی''۔ (بحوالہ: قائداعظمؒ کے شب و روز مؤلفہ خورشید احمد خان، مقتدرہ قومی

زبان اسلام آباد صفحہ نمبر 10) لطف کی بات ہے کہ آج قائداعظمؒ کا نام استعمال کرنے والی سیاسی جماعتیں غیر شرعی عادات کے شکار امیدواروں کو ٹکٹ دے رہی ہیں۔ اسلامی دستور، اسلامی قانون کے لیے قائم ہونے والی ریاست کا تصور یا نظریہ نہ سیکولر حضرات کو گوارہ ہے اور نہ ہی ان سیاسی قائدین کو جو اسمبلیوں میں اراکین کو اسلامی کردار کی بنا پر نہیں بلکہ دولت کی طاقت پر پہچاننا چاہتی ہیں۔ یہی وہ جمہوریت ہے جس سے اقبالؒ نالاں تھے۔ ''اقبال نے جمہوری طرزِ حکومت پر جو تنقید کی ہے، وہ بھی اس لیے کہ غریب اور جاہل عوام کو سرمایہ دار خرید لیتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ جمہوریت کو روحانی اقدار کا پابند کرنا چاہتے تھے''۔ (بحوالہ علم کا مسافر ڈاکٹر طالب حسین سیال ص 86)

کالم کا دامن محدود ہے اس لیے اختصار سے کام لینا پڑے گا۔ نظریۂ پاکستان کو سمجھنے کے لیے اقبالؒ کے خطبہ الہ آباد کے ان فقروں پر غور فرمائیں ''برعظیم پاک و ہند میں ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم رکھ سکے۔'' اقبالؒ کے تصور پاکستان کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط بنام جناح (7-1936) کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قائداعظمؒ نے قیام پاکستان سے قبل 101 بار واضح کیا کہ پاکستان کے دستور اور قانونی ڈھانچے کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جائے گی اور قیام پاکستان کے بعد یہی بات چودہ بار کہی۔ فروری 1948ء میں بحیثیت گورنر جنرل انھوں نے امریکی عوام کے نام ریڈیو پیغام میں پاکستان کو پریمیئر اسلامی ریاست قرار دیا اور زور دے کر کہا کہ پاکستان کا دستور جمہوری ہوگا جس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ ملکی قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل دینے کے لیے قائداعظمؒ نے ڈاکٹر اسد کی سربراہی میں باقاعدہ ایک محکمہ قائم کیا جو قائداعظمؒ کی وفات کے بعد اپنا کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ مختصر یہ کہ اقبالؒ اور جناحؒ کا تصور پاکستان ایک اسلامی ریاست کا تصور ہے اور یہی نظریہ پاکستان ہے لیکن سیکولر حضرات کو یہ تصور گوارہ نہیں، چنانچہ وہ نظریئے ہی سے انکاری ہیں جبکہ یہ نظریہ ہماری ساری تاریخ

میں پھیلا ہوا ہے۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ قائداعظمؒ نے کبھی آئیڈیالوجی کا لفظ ادا نہیں کیا جبکہ صرف 23 مارچ 1940ء کی تقریر میں قائداعظمؒ نے یہ لفظ تین بار ادا کیا البتہ سیکولر کا لفظ کبھی قائداعظمؒ کے منہ سے نہیں نکلا۔ کچھ روشن خیال قائداعظمؒ پر سیکولرازم کا غلاف چڑھانے کے لیے جسٹس منیر کی کتاب ''جناح ٹو ضیا'' کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ کاؤس جی، پرویز ہود بھائی اور دوسرے سیکولر دانشور اس کتاب سے جن الفاظ کا حوالہ دیتے ہیں وہ الفاظ جسٹس منیر نے قائداعظمؒ کے منہ میں ڈالے ہیں اور برطانوی نژاد سلینہ کریم اپنی کتاب ''سیکولر جناح'' میں تحقیق سے ثابت کرچکی ہے کہ وہ الفاظ قائداعظمؒ کے نہیں، ان کی انگریزی گرائمر بھی غلط ہے اور الفاظ بھی جسٹس منیر کے ہیں۔ کچھ حضرات مطالبہ کرتے ہیں کہ سپریم کورٹ نظریۂ پاکستان کی وضاحت کرے۔ سپریم کورٹ جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں نظریۂ پاکستان کی وضاحت کرچکی ہے جو پی ایل ڈی 1973ء سپریم کورٹ صفحہ 49 اور 72، 73 پر موجود ہے۔ دوسطریں ملاحظہ فرمایئے ''پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہے اور اس کا نظریۂ 1949ء کی قرارداد مقاصد میں درج ہے جسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا ہے...... مملکتِ پاکستان اسلامی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں لائی گئی تھی اور اس نظریئے کی بنیاد پر چلائی جائے گی''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''نظریۂ پاکستان کے منکر'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 19 اپریل 2013ء)

قائداعظمؒ کیا چاہتے تھے؟

''سیکولر حضرات مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا پرچار کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ریاست اور چرچ کی علیحدگی کا تصور بنیادی طور پر عیسائیت کا تصور ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں بقول اقبالؒ

جدا ہوا دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ان کا یہ الزام کہ موجودہ فرقہ واریت اور دہشت گردی سیاست کو مذہب سے ملانے کا نتیجہ ہے، سراسر بے بنیاد اور سطحیت کا شاہکار ہے کیونکہ اسلام بذات خود فرقہ

واریت، دہشت گردی اور انتہا پسندی کی مذمت کرتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا دراصل یہ سب کچھ ہمارے حکمرانوں کی بے بصیرت پالیسیوں اور عالمی قوتوں کی چالوں کا کیا دھرا ہے جس میں پاکستانی عوام پھنس کر رہ گئے ہیں۔

ایک ریسرچ سکالر کے بقول قائد اعظم نے قیام پاکستان سے قبل تقریباً **101** بار یہ اعلان کیا کہ نئی مملکت کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار کی جائیں گی۔ یوں تو ان کی سینکڑوں تقریریں اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں لیکن آپ کو اس کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھانے کے لیے میں قائداعظم کے خط بنام پیر مانکی شریف آف صوبہ سرحد سے چند سطریں پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس خط کا ذکر قائد اعظمؒ کی تقاریر اور اکثر کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ ہی لوگ عام طور پر اس سے آگاہ ہیں۔ یاد رہے کہ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان بے پناہ سیاسی اثر رکھتے تھے اور انھیں کانگریس کے ایک ستون کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا صحیح معنوں میں توڑ پیر آف مانکی شریف تھے جن کی مسلم لیگ کے لیے حمایت سیاسی پانسہ پلٹ سکتی تھی۔ **1945**ء میں پیر صاحب نے مسلم لیگ کو جوائن کرنے سے قبل قائد اعظمؒ سے تصور پاکستان کے حوالے سے وضاحت چاہی تو قائداعظمؒ نے پیر صاحب کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے وضاحت کی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کبھی شریعت کے منافی قوانین نہیں بنائے گی اور نہ ہی پاکستان کے مسلمان غیر اسلامی قوانین کی اجازت دیں گے''۔ (بحوالہ دستور ساز اسمبلی کارروائی **9** مارچ **1949**ء جلد **V** نمبر **3** صفحہ نمبر **46**) (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''قائد اعظم کیا چاہتے تھے؟'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور **13** ستمبر **2013**ء)

خلافت راشدہ کا نمونہ

علامہ اقبال ہی کی طرح قائداعظم بھی پاکستان میں خلافت راشدہ کے قیام کے خواہشمند تھے۔ اس ضمن میں قائداعظم کے معالج ٹی بی سپیشلسٹ ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب کی یہ تحریر حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے (اس میں قائداعظم کے فرمودات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بعض ذاتی مشاہدات اور احساسات بھی اس لیے نقل کیے جا

رہے ہیں کہ ان سے قائداعظم کے اخلاق عالیہ کی تصویر سامنے آتی ہے)۔

''میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ لاہور سے زیارت تک کا طویل سفر طے کر کے میں شدید بیماری میں مبتلا قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے باوجود کہ بانی پاکستان کافی کمزور ہو چکے تھے اور ان کا جسم کمبل میں لپٹا ہوا تھا، انھوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا ''آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' مرض الموت میں مبتلا اس عظیم انسان کے اخلاق، تواضع اور انکساری کی یہ اچھوتی مثال تھی، حالانکہ مجھ سے ہاتھ ملانے اور مزاج پرسی کرنے سے ہی وہ ہانپنے لگے اور بعد میں کئی منٹ تک آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔ ایک بار جب ہم خوفزدہ تھے کہ خون اور تھوک وغیرہ کی تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں، انھیں قائداعظم تک کیسے پہنچائیں؟ انھوں نے ازخود ہماری پریشانی محسوس کر لی اور بولے ''آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، کھل کر بیان کریں کیونکہ بیماری کی نوعیت معلوم ہونے کے بعد میں آپ سے زیادہ تعاون کرسکوں گا۔ گھبرائیں نہیں، میں موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ موت کو بہرحال آنا ہے۔ البتہ اگر آپ کے پیشے کے اصول راستے میں حائل ہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔''

برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن سے روشناس کرانے والے قائداعظم کا خدا پر ایمان اور اصولوں پر یقین ہمارے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ قائداعظم بظاہر ان معنوں میں مذہبی راہنما نہ تھے جن معنوں میں عام طور پر ہم مذہبی راہنماؤں کو لیتے ہیں، لیکن مذہب پر ان کا یقین کامل تھا۔ ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کے لیے ہم ان کے پاس بیٹھے، میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن ہم نے بات چیت سے منع کر رکھا تھا، اس لیے الفاظ لبوں پر آ کر رُک جاتے ہیں۔ اس ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کے لیے ہم نے خود انھیں دعوت دی تو وہ بولے ''تم جانتے ہو جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہ کرسکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ

کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافتِ راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔ پاکستان میں سب کچھ ہے، اس کی پہاڑیوں، ریگستانوں اور میدانوں میں نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی۔ انھیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے۔ قومیں نیک نیتی، دیانتداری، اچھے اعمال اور نظم و ضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی برائیوں، منافقت، زر پرستی اور خود پسندی سے تباہ ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میری قوم کون سا راستہ اختیار کرے گی۔ البتہ میں نے اپنا فرض پورا کیا۔ آگے پاکستان کو چلانا اس کا کام ہے۔''
(آخری کلمات کیا تھے؟ از ڈاکٹر ریاض علی شاہ مطبوعہ روزنامہ جنگ، 11 ستمبر 1988ء)

تو حاشیۂ نعرۂ دیں قائد اعظم
دیوانۂ قرآن مبین قائد اعظم
فرزند زمیں خلد مکیں قائد اعظم
اغیار سہی، چیں بہ جبیں قائد اعظم
تجھ سا کوئی اور نہیں قائد اعظم

''روشن خیال'' یا قائداعظمؒ کا پاکستان

''ہمارے یہ سیکولر دوست بار بار قائداعظم کی 11 اگست والی تقاریر کا حوالہ دیتے ہیں جو ان کی علمی بے سروسامانی کی محکم دلیل ہے۔ اس تقریر میں قائداعظم نے اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کے لیے مذہبی آزادی کی بات کی ہے، اس میں سے سیکولرازم اور لادینیت کیسے برآمد ہو گئی۔ دس نکات پر مشتمل یہ تقریر قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کی۔ اس تقریر میں جس نکتے پر قائداعظم نے بہت زور دیا، وہ تقریر کا دوسرا نکتہ ہے جس میں آپ نے رشوت ستانی اور کرپشن کو نوزائیدہ ریاست کے لیے زہر قاتل قرار دیا ہے جبکہ ساتویں نکتے میں مذہبی آزادی کی بات کی گئی ہے۔ سیکولر نواز دوست قانون کی حکمرانی، کرپشن اور رشوت ستانی کے خاتمے جیسے اہم نکات کا کبھی تذکرہ نہیں کرتے۔ لگتا یہ ہے کہ ہمارے ان دوستوں

نے 11 اگست والی تقریر کے مکمل متن کو کبھی نہیں پڑھا۔ قائداعظمؒ نے 1938ء سے لے کر 1948ء تک بلا مبالغہ سینکڑوں تقاریر کیں۔ ان کی یہ تقاریر جواہر پارے اور اقوال زریں ہیں۔ ہر تقریر اسلام کے ساتھ جذباتی وفکری وابستگی کا شاہکار ہے۔

قائداعظمؒ نے جون 1945ء میں فرینڈز مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں کہا ''ہم نے اس قابل بننا ہے کہ ہم آزادی کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصول کے مطابق زندگی بسر کر سکیں'' اور پھر قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے ببانگ دہل ایک عظیم اسلامی ریاست کا اعلان کیا اور فرمایا: ''اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میں دنیا کو دکھادوں گا کہ پاکستان اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ساری دنیا کے لیے مشعل راہ ہے، پاکستان ایک تحریک کا نام ہے جس کا مقصد پاکستان کے مرکز سے اسلامی نظریہ حیات کا فروغ واشاعت ہے''۔ قائداعظم نے یہ تقریر تو 11 اگست 1947ء والی تقریر کے بعد ارشاد فرمائی۔ کیا اب بھی قائداعظمؒ کے فرزند اسلام اور داعئ اسلامی نظریہ حیات ہونے میں کوئی شک وشبہ ہے۔ سیکولرازم کے مٹھی بھر ''فدائی اور شیدائی'' یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ قائداعظم کی زندگی میں منافقت تو ناممکن، مصلحت اور مداہنت تک نہ تھی۔ سیکولر دوستوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ 11 اگست والی تقریر سے سیکولرازم کشید کرنے کا عمل بے فیض وہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے انجام نہیں دے رہے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقلیتی برادری کو اسلامی ریاست میں برابری کا جو حق دیا جاتا ہے ویسا کہیں اور ممکن نہیں۔ ہمارے یہ ''روشن خیال دوست'' تو اسلامی ریاست کو سیکولر اس لیے بنانا چاہتے ہیں تاکہ اپنی بے لگام حسرتوں کے مزار پر روشن خیالی کا کوئی دیا جلا سکیں۔ سیکولر حضرات کے ''روشن خیال'' ارمانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قائداعظم کا اسلامی پاکستان ہے جس کے وہ داعی تھے''۔ (ڈاکٹر حسین احمد پراچہ کا کالم ''روشن خیال یا قائداعظم کا پاکستان'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 30 مارچ 2017ء)

شرارتی اور منافق

''جب قائداعظم کو علم ہوا کہ کچھ سیکولر حضرات ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں تو بابائے قوم نے 25 جنوری 1948ء کو عید میلادالنبیؐ کے موقع پر

کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ ''کچھ حضرات جان بوجھ کر شرارت کر رہے ہیں اور یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں ہو گی۔ ہماری زندگی پر آج بھی اسلامی اصولوں کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح تیرہ سو سال قبل ہوتا تھا''۔ انھوں نے واضح کیا کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر استوار ہو گی اور جو لوگ یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں وہ شرارتی اور منافق ہیں۔ قائداعظم بابائے قوم تھے وہ تو ان سازشی حضرات کو شرارتی اور منافق کہہ سکتے تھے لیکن میں تو نہیں کہہ سکتا۔ میں انھیں صرف شرارتی کہہ سکتا ہوں''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''مولوی قائد اعظم محمد علی جناح؟'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 29 دسمبر 2013ء)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و ملا کی کہنہ ادراکی

نظریہ پاکستان کیا ہے؟

''بنگال میں مسلم لیگ کو پذیرائی ملنے کی وجہ یہ تھی کہ سیکولر کانگریس کا لیڈر سبھاش چندر بوس ہندو ترانے بندے ماترم کو پورے ہندوستان پر مسلط کرنے کا حامی تھا۔ مسلم لیگ نے ایک ایسے ترانے کو مسترد کر دیا جس میں لکشمی دیوی، سرسوتی دیوی اور درگا دیوی کو نمسکار کیا گیا تھا۔ سبھاش چندر بوس کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ علامہ اقبالؒ کی وفات پر کلکتہ کی میونسپل کارپوریشن کا اجلاس ملتوی کیا گیا تو اس نے مخالفت کی۔ کانگریسی قیادت کی مسلم دشمنی کے باعث کلکتہ کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت میں نماز عید ادا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کانگریس کے حامی تھے۔ ایک طرف سیکولر کانگریس تحریک پاکستان کی مخالف تھی، دوسری طرف جمعیت علما ہند اور دیگر مذہبی جماعتیں قائد اعظمؒ پر کفر کے فتوے لگا رہی تھیں''۔ (حامد میر کا کالم ''نظریہ پاکستان کیا ہے؟'' مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 8 اپریل 2013ء)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

دانشوری کے شاخسانے: ایک معصوم وضاحت

’’قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل 101 بار اور قیام پاکستان کے بعد چودہ بار پاکستان اور اسلام کے حوالے سے بات کی اور عوام کو یقین دلایا کہ پاکستان کے آئینی، قانونی اور معاشرتی ضابطوں اور ڈھانچے کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ 46-1945ء کے انتخابی جلسوں کے دوران بھی اسی تصور کے لیے ووٹ مانگے۔ جمہوری تقاضوں کے مطابق کئی بار کہا کہ پاکستان کا آئین عوام کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق تشکیل دیا جائیگا۔عوام کی امنگوں کی ترجمانی بہرحال منتخب دستور ساز اور قانون ساز اسمبلی کرتی ہے۔ پھر یہ کہہ کر بحث کو انجام تک پہنچادیا کہ پاکستان ایک پریمیئر (اعلیٰ درجے کی) اسلامی ریاست ہوگی۔ اسی لیے مجھے حیرت ہوتی ہے جب ہمارے بعض دانشوران آئیں بائیں شائیں کرکے اس حوالے سے ابہام اور کنفیوژن پھیلاتے ہیں۔کبھی قائداعظم کی تقاریر کے چند فقروں کو مسخ کرکے اور ان میں من پسند الفاظ اور غلط ترجمہ کرکے غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں اور کبھی یہ کہہ کر قائداعظم کے خیالات کی نفی کرتے ہیں کہ وہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھتے تھے۔ میں آئندہ آپ کو ٹھوس مثالیں دوں گا کہ کس طرح قائداعظم کے اصلی الفاظ کو بدلا گیا اور ان کا مفہوم سے ہٹ کر ترجمہ کرکے انھیں سیکولر ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ سیکولر دوست اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ بنیادی تاریخی حقائق کو بدل دیتے ہیں اور ایسے ایسے بے بنیاد دعوے کرتے ہیں جن کا کوئی نام ونشان ہی نہیں۔ قائداعظم کا جگن ناتھ آزاد سے ترانہ لکھوانا ایسی ہی ایک مثال ہے۔گزشتہ دنوں روشن خیالی کا ایک شاخسانہ پڑھنے کو ملا اور میں اس جھوٹ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ایک بڑے کالم نگار نے انگریزی میں لکھا تھا کہ قرارداد مقاصد کا مسودہ قائداعظم کو دکھایا گیا تو انھوں نے اسے مسترد کردیا۔ میں نے ثبوت مانگا تو وہ غائب ہوگئے۔گزشتہ چند ماہ کے دوران لکھی گئی ایسی ’’بہتانی‘‘ تحریروں کے نمونے میرے پاس محفوظ رکھے ہیں جنھیں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا تو آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ اسلامی

ریاست میں دین اور سیاست الگ الگ نہیں ہوتے، آئین، قانون، اصول وغیرہ دین کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں اور قائد اعظم پر سیکولر ازم کا الزام لگانا محض بہتان ہے۔ جب انھوں نے کئی بار یہ کہا کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کے تابع ہوگا تو پھر سیاست دین و مذہب سے الگ کیسے ہوگئی؟ قائداعظم کے وژن کو سمجھنے کے لیے ان کی سینکڑوں تقاریر کا مطالعہ ناگزیر ہے اور اس دور کے زمینی حقائق کو بھی ذہن میں رکھنا حد درجہ ضروری ہے۔ ان کی سینکڑوں تقاریر سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی گیارہ اگست کی تقریر سے ایک فقرے کا مطلب سمجھنا نہایت آسان ہے۔ ''عقیدے کا ریاست کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں'' کا مطلب اقلیتوں کو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہے اور یہ یقین دہانی کہ عقیدے کی بنیاد پر کسی سے کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ دوستو! یہ ایک اسلامی ریاست کا بنیادی اصول ہے اور اسی اصول کے تحت اقلیتوں کو حکومتی ڈھانچے میں حصہ دینے کے لیے جوگندر ناتھ منڈل اور سر ظفر اللہ خان کو مرکز میں وزارتیں دی گئی تھیں اور بہت سے غیر مسلموں کو اہم عہدوں پر برقرار یا تعینات کیا گیا تھا''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''دانشوری کے شاخسانے: ایک معصوم وضاحت'' مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور 13 نومبر 2016ء)

یہ بدنیتی ہے یا تحقیق کا فقدان؟

''قائداعظم سیکولرازم کی اصطلاح سے اچھی طرح واقف تھے، اس لفظ کے معانی اور تصور کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اگر ان کی سوچ سیکولر ہوتی تو کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی پریس کانفرنس میں ہی سوالات کا جواب دیتے ہوئے سیکولرازم کا لفظ استعمال کرتے جب کہ ان کے مخالف کانگریسی سیاستدان اس ''ٹرم'' کو خوب استعمال کررہے تھے۔ سمجھنے کی بات یہ بھی ہے کہ کانگریس سیکولر ہندوستان کا پرچار اور مطالبہ کررہی تھی۔ اگر قائداعظم بھی سیکولر ہوتے تو علیحدگی کی راہ اختیار کرتے ہوئے ایک آزاد اسلامی ریاست یا مسلمان ملک کا مطالبہ کیوں کرتے؟ دم بھر کو یہ بھی سوچیے کہ اگر قائداعظم سیکولر پاکستان کا تصور پیش کرتے تو کیا ان کو مسلمان قوم کی اتنی والہانہ اور مخلصانہ حمایت

ملتی جو انھیں نصیب ہوئی اور جس کے بل بوتے پر انھوں نے پاکستان حاصل کرلیا۔ 1945-46ء کے فیصلہ کن انتخابات میں مسلم لیگ نے 75 فیصد ووٹ حاصل کیے اور مرکزی اسمبلی کی تمام مسلمان نشستیں جیت لیں کیونکہ یہ انتخابات پاکستان کے ایشو پر لڑے گئے تھے اور انتخابات سے قبل قائداعظم سینکڑوں بار وضاحت کر چکے تھے کہ پاکستان کی بنیاد، پاکستان کے قوانین کے ڈھانچے کی اساس اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ وہ کئی بار اعلان کر چکے تھے کہ قرآن ہمارا ضابطہ حیات ہے اور قرآن ہی ہمارا لنگر اور رہبر ہے۔ (مسلم لیگ اجلاس 1943۔ پیام عید 1945 وغیرہ)

شہری برابری، انسانی مساوات، اقلیتوں کا تحفظ اور مکمل مذہبی آزادی اسلام کے اصول ہیں جن کی سینکڑوں روشن مثالیں ریاست مدینہ کے قیام سے لے کر خلفائے راشدین کے دور تک ملتی ہیں۔ اس لیے اقلیتوں کے حقوق کی آڑ میں سیکولرازم کے ایجنڈے کو بڑھانا اسلام سے لاعلمی ہے یا پھر ارادے کچھ اور ہیں۔ سیکولر ریاست میں آزادی کے نام پر شراب نوشی، جسم فروشی، ہم جنس پرستی وغیرہ کی کھلی اجازت ہوتی ہے جبکہ اسلامی ریاست میں ان غلاظتوں پر قانونی قدغن ہوتی ہے۔ چوری چھپے قانون شکنی کو جواز بنا کر قانون ختم نہیں کیا جاسکتا''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''یہ بدنیتی ہے یا تحقیق کا فقدان؟'' مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور 31 مارچ 2017ء)

حضرت بابو جیؒ اور قائداعظمؒ

''صاحبزادہ سید نصیر الدین شاہ گولڑویؒ فرماتے ہیں:

- ''میرے دادا محترم بابو جی (حضرت محی الدین گیلانیؒ) کو دوسرے کئی علما اور مشائخ کی طرح قائداعظم کی ظاہری غیر شرعی شخصیت اور اسلام کے نام پر ایک خطے کا حصول قدرے کھٹکتا تھا۔ اسی دوران آپ اجمیر شریف تشریف لے گئے تو وہاں ایک دن ایک مخلص شخص نے آپ سے عرض کیا کہ حضرت! میں نے رات سرکار دو عالم ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے، آپ ﷺ کے سامنے میز پر ایک فائل پڑی ہے، چند لمحے بعد ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے

اس کو وہ فائل دے کر فرمایا کہ ''یہ پاکستان کی فائل ہے''۔ وہ شخص جب اپنا یہ خواب سنا چکا تو تھوڑی ہی دیر بعد اس دن کا اخبار آ گیا۔ اخبار کے صفحہ اول پر ایک شخص کی تصویر دیکھ کر اس نے حضرت بابو جیؒ سے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جسے رات میں نے خواب میں حضور رسالت مآب ﷺ کی بارگاہ اقدس سے پاکستان کی فائل لیتے دیکھا تھا، وہ محمد علی جناح (مستقبل کے قائداعظمؒ) تھے۔ اس دن سے حضرت بابو جیؒ مسلم لیگ کے حامی بن گئے اور اسی نسبت سے ہم آج تک مسلم لیگ کی حمایت کرتے ہیں''۔

(ماہنامہ ''ساندل سویرا'' اسلام آباد اکتوبر 1997ء۔ صفحہ 15)

میر عرب ﷺ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا خواب

پرانے مسلم لیگی خواجہ افتخار لکھتے ہیں کہ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ تحریک پاکستان کے فیصلہ کن انتخابات سے قبل کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے جب قائد اعظمؒ کی کردار کشی کی مذموم مہم شروع کی اور ان کی پاکیزہ شخصیت کو خود ساختہ الزامات سے داغدار بنانے کی ناکام مہم چلانے کے علاوہ انہیں کافر اعظم تک کہنے سے گریز نہ کیا، ان ہی دنوں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک خواب مسلم لیگ کی طرف سے بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں برصغیر بھر میں چسپاں کیا گیا جس میں حضرت مولاناؒ کی جانب سے کہا گیا تھا:

- ''میں نے نصف شب کے بعد ایک خواب دیکھا ہے۔ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کا دربار لگا ہوا تھا۔ ان کے اردگرد خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ تشریف فرما تھے کہ اسی اثنا میں قائداعظمؒ اس مقدس محفل میں داخل ہوئے۔ حضور ﷺ نے جب انہیں سینے سے لگایا تو خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ ششدر رہ گئے اور حضور ﷺ سے بڑے ادب کے ساتھ استفسار کرنے لگے کہ آپ نے ایک ڈاڑھی منڈے شخص کو سینہ سے لگا لیا؟ اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کے ظاہر لباس اور شکل و شباہت

کو نہ دیکھو بلکہ اس کے سینے میں جھانک کر غور سے دیکھو کہ اس میں ملت اسلامیہ کا بے پناہ درد موجود ہے۔ حضرت مولانا موصوف کا کہنا ہے کہ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کی تفصیل پر مبنی پوسٹروں نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجود والہانہ عقیدت اور محبت کو چار چاند لگا دیئے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تو طویل عمری کے باعث نہ جانے کتنے عرصہ سے گھر سے باہر سفر نہ کرتے، لیکن ان کے حکم پر ان کے ہزاروں عقیدت مندوں نے تحریک پاکستان میں دل و جان سے حصہ لیا حتیٰ کہ ان کے بھانجے ظفر احمد انصاری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے جو خدمات سرانجام دیں، وہ تو تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔

(قائداعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص18، 19)

مولانا حسرت موہانی کا خواب

جناب ظہیر الاسلام فاروقی ایڈووکیٹ اپنی کتاب ''مقصد پاکستان'' میں رقمطراز ہیں:

❑ ''1946ء میں مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں تھا۔ ٹرین میں پیر سید علی محمد راشدی کے ساتھ مولانا حسرت موہانی بھی ہم سفر تھے۔ راشدی صاحب نے مولانا موہانی صاحب سے پوچھا کہ 'کیا مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان مان لیا جائے گا'۔ مولانا حسرت نے جواب میں کہا کہ 'پاکستان تو بن جائے گا۔ آگے کی فکر کرو'۔ پھر کہا 'میں نے رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے خود اس کی بشارت دی'۔ بعد ازاں میں نے دیوان حافظ سے فال نکالی اور اس کی تضمین میں یہ اشعار کہے''۔

جب کہے خواب میں خود آ کے وہ شاہ خوباں
جبکہ حافظ بھی مصدق ہو بہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرت یہ مبارک سند و مہر و نشاں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کند جملہ جہاں

(مقصد پاکستان از ظہیر الاسلام فاروقی ایڈووکیٹ)

مولانا حسین احمد مدنی کا خواب

مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کے ممتاز لیڈر اور تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے۔حضرت مولانا حسین احمد مدنی جمعیت علما ہند کے صدر بھی منتخب ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث بھی بنائے گئے۔علم و فضل کی دنیا میں ایک بلند مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اورآپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ میں حضرت مدنی کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف رکھتا ہوں لیکن ان کے علمی و روحانی مقام کا احترام کرتا ہوں۔آپ سے بے شمار کرامات منسوب ہیں جن میں ایک کا تعلق ہندوستان کی آزادی کے اہم ترین دور سے ہے جسے میں من وعن یہاں نقل کر رہا ہوں۔

مولانا رشید احمد صدیقی آف کلکتہ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔اس لیے میں اُن کے ہی الفاظ نقل کر رہا ہوں۔

❑ ’’1946ء جنرل الیکشن کی ہنگامہ خیزیوں کا زمانہ تھا۔حضرت مدنی مسلم پارلیمانی بورڈ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ قافلہ میں مولانا عبدالعلیم صدیقی، مولانا نافع گل اور دیگر پشاوری طالب علم تھے۔ 3 مارچ کو گوپال پور تھانہ بیگم پہنچے۔ چودھری رازق الحیدر کے دولت کدے پر قیام ہوا۔ دوسرے دن ایک عظیم الشان انتخابی جلسہ میں تقریر کا پروگرام تھا۔ رات گیارہ بجے کھانا تناول فرما کر 12 بجے کے قریب آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے۔ میں پاؤں دباتا رہا۔ کچھ دیر بعد نیند آ گئی۔ ہم لوگ دوسرے کمرے میں جا کر کچھ ضروری کام کرنے لگے۔تقریباً 2 بجے رات، مجھ کو اور چودھری محمد مصطفیٰ کو طلب فرمایا۔ ہم دونوں حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ ’’لو بھئی! اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ساتھ بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا۔‘‘ میں نے عرض کیا ’’اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں، کیا کریں گے۔‘‘ آپ نے ارشاد فرمایا ’’ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اس کے لیے پوری قوت

کے ساتھ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ دوسرے دن گوپال پور کے عظیم الشان جلسہ میں تقسیم کی مضرتوں پر معرکتہ الآرا تقریر فرمائی۔ بالآخر 3 جون 1947ء لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند کے غیر متوقع اعلان سے اس واقعہ کی حرف بحرف تصدیق ہوگئی''۔

(اقبال جناح اور پاکستان از ڈاکٹر صفدر محمود)

حالتِ سجدہ

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے کسی نے پوچھا: ''آپ ایسے شخص کی حمایت کر رہے ہیں جو کوٹ اور ٹائی پہنتا ہے''۔ مولانا نے کہا: ''جب تم علاج کے لیے ڈاکٹر اور مقدمہ کے لیے وکیل ڈھونڈتے ہو تو ان کی قابلیت کے بارے میں پوچھتے ہو یا اس کے لباس کی تحقیق کرتے ہو کہ وہ ٹائی پہنتا ہے یا نہیں؟'' مولانا حکیم اخترؒ فرماتے ہیں: ''مجھ سے براہ راست مولانا شبیر احمدؒ نے فرمایا: ''میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا خط لے کر جناح کے پاس گیا۔ میں رات 12 بجے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ قائداعظمؒ حالت سجدہ میں پاکستان کے لیے رو رہے ہیں''۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''میں نے خواب میں جناح کو علما کے لباس میں دیکھا ہے، ان کو حقیر نہ سمجھو۔ اللہ تعالیٰ جس سے چاہے کوئی بھی کام لے لیتے ہیں''۔ (قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟ از احسن فاروق امینی، روزنامہ اسلام کراچی، 14 اگست 2017ء)

نقش تیرا ثبت ہے تاریخ کے صفحات میں
تو چراغ نور ہے ہر عہد کی ظلمات میں

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک خط مولانا احمد سعید کے نام

مولانا السلام علیکم......! آپ کا دعوت نامہ برائے اجلاس جمعیت علما ہند آیا۔ میرا عذر تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ حاضری سے قاصر ہوں۔ اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں کا (خصوصاً علما حضرات کا) کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے۔ بلکہ کانگریس سے بے زاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے

نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔(والسلام احقر اشرف علی)

''آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی منعقدہ اپریل 1943ء میں شمولیت کے لیے دعوت'' قائداعظمؒ محمد علی جناح کی ہدایت پر مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد 23 اپریل 1943ء میں شمولیت کے لیے تحریری دعوت نامہ ارسال کیا گیا۔ خط پر نوابزادہ لیاقت علی خان کے دستخط تھے۔ جب یہ خط مولانا تھانوی کو ملا تو وہ اجلاس میں شرکت کے لیے تیار تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ قرار داد لاہور 1940ء یعنی قیام پاکستان کے حق میں اس اجلاس میں تقریر کریں۔ مگر خالق کل مالک کل کی طرف سے بھی بلاوا آ چکا تھا۔ وہ اچانک بیمار ہو گئے اور 23 اپریل 1943ء کے اجلاس دہلی میں بھی باوجود صد خواہش کے شرکت نہ کر سکے۔ ایک خط عذر کا نواب زادہ لیاقت علی خان جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو لکھ دیا جس میں یہ تحریر تھا کہ ''بیماری کی وجہ سے اجلاس میں شرکت کے لیے معذور ہوں۔ میری بجائے مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی دونوں اجلاس میں شرکت کریں گے۔ کوشش کروں گا کہ سید سلیمان ندوی بھی اجلاس میں پہنچ جائیں۔ باقی میں دعا ہر حال میں (خصوصی طور پر ان تاریخوں میں) زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا''۔

اس خط کے شروع میں حضرت نے اپنے قلم سے یوں الفاظ لکھے تھے! ''از ناکارہ آوارہ ننگ انام اشرف برائے نام بخدمت لیاقت علی خان صاحب سیکرٹری مسلم لیگ و دیگر ارکان مسلم لیگ ''نصرہم اللہ نصرہم اللہ''۔ بیماری زور پکڑ گئی اور تین ماہ بعد تھانہ بھون میں 19 جولائی 1943ء کی رات اپنے اللہ سے جا ملے۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ نے راقم الحروف کو بتلایا کہ وفات سے پندرہ روز قبل اپنے ان دو متبعین کو بلایا یعنی (1) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور (2) مولانا ظفر احمد عثمانی (جو مولانا تھانوی کی ہمشیرہ کے صاحب زادے تھے) ان دونوں اجل علما سے فرمایا! ''حق تعالیٰ نے مجھ پر انعام فرمایا ہے۔ مجھے کشفاً معلوم ہوا ہے کہ قائداعظمؒ محمد علی جناح کو حق تعالیٰ کامیابی سے نوازیں گے۔ 1940ء کی قرار داد پاکستان کی ان شاء اللہ فتح ہو گی۔ میرا یہ مرض

الموت ہے۔ میں اس سے جانبر نہیں ہوں گا۔ اگر میں مزید زندہ رہتا تو تحریک پاکستان کے لیے خود کام کرتا۔ تم دونوں کو میری وصیت ہے کہ جناح صاحب کے پلان کے مطابق کام کرنا، مشیت ایزدی یہی ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطہ زمین بنے۔ قیام پاکستان کے لیے جو کچھ ہو سکے کر گزرنا۔ مخالفین کی ذرہ بھر بھی پروا نہ کرنا۔ اپنے مریدوں اور متوسلین کو بھی تحریک پاکستان کے لیے کام کرنے پر ابھارتے رہنا''۔

1947ء کے سلہٹ کے ریفرنڈم میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے بستی بستی قریہ قریہ دورہ کیا اور قائداعظمؒ کی ہدایات کے بموجب دن رات ایک کر دیا۔ جب سلہٹ ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں نکلا تو مولانا ظفر احمد عثمانی سجدہ ریز ہو گئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے اپنے مرشد شیخ اور ماموں کی وصیت پوری کر دی'' مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی تحریک پاکستان کے سلسلہ میں **1947**ء سے پہلے ہندوستان میں اور **1947**ء کے بعد پاکستان میں جو جو خدمات سر انجام دیں، وہ ہر کسی کو معلوم نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد حسن، مفتی محمد شفیع اور مولانا احتشام الحق تھانوی نے بھی اپنے اپنے حلقہ میں کافی کام کیا۔ **1971**ء میں جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہو گیا تو مولانا ظفر احمد عثمانی کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ بیمار رہنے لگے اور اسی صدمہ میں تین سال بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

(''اوج'' کا قرارداد پاکستان گولڈن جوبلی نمبر [گورنمنٹ کالج راوی روڈ، شاہدرہ، لاہور]
مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک پاکستان، از احسان قریشی صابری، ص 159)

جناح کا وعدہ

مولانا شبیر علی تھانوی اپنی اولین ملاقات کی تفصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

❑ ''دوران گفتگو میں نے جناح صاحب سے یہ سوال کیا کہ آپ ہزاروں روپیہ خرچ کرا کے پنڈال وغیرہ بنواتے ہیں اور لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرہ تکبیر بلند کرتے ہیں، اس میں کیا نفع ہے؟ جناح صاحب نے فرمایا کہ اس سے غیر اقوام پر رعب پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک اور تدبیر بتا دوں جس سے رعب زیادہ ہو گا۔ فرمایا کہ وہ

کیا؟ میں نے کہا کہ جب دوران جلسہ نماز کا وقت آجائے تو اس سوا ڈیڑھ لاکھ کے مجمع کو لے کر باجماعت نماز ادا کریں، پھر آپ خود دیکھیں گے کہ کتنا رعب پڑتا ہے۔ اس پر جناح صاحب نے فوراً فرمایا کہ آپ فرماتے تو صحیح ہیں مگر میں اس وقت اس پر عمل کرنے سے معذور ہوں، میں نے کہا کہ آپ کو کیا عذر ہے؟ تو فرمایا کہ آپ باجماعت نماز پڑھنے کو کہتے ہیں تو امام کس کو بناؤں؟ ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح ہو کہ اگر میں امامت کروں، سب لوگ نہیں تو بہت بڑی اکثریت میرے پیچھے نماز پڑھ لے مگر میں امامت کے قابل نہیں، مجھ میں اس کی اہلیت نہیں، اس لیے کسی دوسرے کو امام بنانا پڑے گا۔ اگر امام دیوبندی ہوگا تو بریلوی اس کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے، اگر بریلوی ہوگا تو دیوبندی نہ پڑھیں گے اور الگ جماعتوں سے بجائے رعب پڑنے کے غیر اقوام کو مسلمانوں کا اختلافات نمایاں ہوگا۔ اب تو اپنی اپنی مسجدوں میں پڑھتے ہیں اور یہاں اگر کئی جماعتیں ہوئیں تو یہ زیادہ نمایاں ہوگا۔ اس لیے میں اس وقت تو معذور ہوں، آگے چل کر دیکھا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اس پر تو بحث طویل ہو جائے گی کہ یہ عذر صحیح ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق تو پھر کسی ملاقات میں عرض کروں گا۔ اب دوسری بات عرض کرتا ہوں کہ خود آپ پر بھی تو نماز فرض ہے، آپ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ جلسوں میں اپنا یہ معمول رکھیں کہ جب نماز کا وقت آوے مصلیٰ بچھا کر آپ نیت باندھ لیں اور کوئی پڑھے یا نہ پڑھے''۔ یہاں تک تو میں نے جناح صاحب کی گفتگو نقل کی ہے الفاظ میرے ہیں بات اُن کی ہے۔ آگے مندرجہ بالا سوال کا جو جواب جناح صاحب نے دیا، اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جن کو سن کر مجھے تو پسینہ آگیا تھا کہ ایک بے عمل مگر اتنا بڑا آدمی یوں مجمع کے سامنے اقرار خطا کرے، بڑی بات ہے۔ ہم جیسوں سے اس قسم کا سوال ہوتا تو شاید تاویل ہی کرتے مگر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے (آمین) کہ وہ کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے، میری بات سن کر وہ آگے جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجہ میں یہ الفاظ فرمائے:

''میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ

اس کو سنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا‘‘۔

چونکہ اس کمرہ میں ہمارے (ارکان وفد) کے علاوہ بارہ تیرہ اور حضرات بھی موجود تھے جن میں سے مولوی منفعت علی صاحب وکیل سہارن پوری، مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ، مسٹر عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ کو جانتا تھا۔ باقی حضرات سے میں واقف نہ تھا۔ ان سب کے سامنے ان الفاظ سے بغیر کسی تاویل کے اظہار ندامت اور اقرار اصلاح نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس تاویل سے فوراً سنبھل کر میں نے کہا کہ دیکھئے! یہ وعدہ جناح صاحب کا ہے کسی چلتے پھرتے آدمی کا نہیں۔ اس وعدہ کو پورا فرمایا جاوے، اس پر مرحوم سیدھے ہو کر تن گئے اور بار بار سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ:

’’جناح کا وعدہ! جناح کا وعدہ! میں اس کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا، آپ میرے لیے دُعا کریں‘‘۔ (مشاہدات وواردات از منشی عبدالرحمٰن ص 114 تا 118)

مین آف کریکٹر

قائداعظمؒ سے بار بار ملاقات کرنے والے مولانا شبیر علی تھانویؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

- ’’بعض حضرات کو میں نے کہتے سنا ہے کہ جناح صاحب بہت ضدی تھے مگر میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بالکل وثوق سے کہتا ہوں کہ ضد اور ہٹ دھرمی آپ کے پڑوس میں بھی نہ رہتی تھی، وہ مشورے کرتے رہتے تھے، بحث بھی خوب کرتے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں آجاتی تھی تو ہر مرتبہ وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتے تھے کہ ’’میری غلطی تھی، اب میری سمجھ میں آ گیا، آپ صحیح کہتے ہیں‘‘۔ تو بھلا جو شخص مجھ جیسے شخص کے سامنے غلطی کا اعتراف کر کے بات کو تسلیم کرے، اس کو میں ضدی کیسے سمجھوں، ہاں بعد بحث وتمحیص کے جو بات طے کر لیتے تھے، پھر اس پر پختہ رہتے تھے، ڈھلمل یقین نہ تھے، نہ یہ تھا کہ میں گیا تو میرے ہمنوا ہو گئے اور دوسرا گیا تو اس کے ہمنوا بن گئے‘‘۔ (روئیداد، ص: 8) (آیئے! پاکستان کی قدر کریں از محمد اسحاق ملتانی)

مقام قائداعظم

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد عثمانی کا ارشاد ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

- ''میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدان حشر معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیا، علما اور صلحا کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور مسٹر محمد علی جناح بھی عرب لباس پہنے ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے؟ مجھے کہا گیا کہ محمد علی جناح آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔'' (آیئے! پاکستان کی قدر کریں از محمد اسحاق ملتانی)

قائداعظم محمد علی جناحؒ، مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر میں

ملک حبیب اللہ نے جو قائداعظمؒ کے ایک پرستار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کے محقق بھی ہیں، اپنی کتاب ''قائداعظمؒ کی شخصیت کا روحانی پہلو'' میں قائداعظمؒ کی روحانیت کے بارے میں منتشر واقعات و حالات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس نادر دستاویز نے لوگوں کی آگاہی کے لیے، کہ ان کا بے مثال سیاسی راہنما اس قابل فخر صنف کا مالک بھی تھا، ایک نہایت ضروری خلا کو پر کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (1863ء۔1943ء) ایک برگزیدہ عالم اور صوفی لیکن مکمل طور پر غیر سیاسی شخصیت تھے جنہوں نے کبھی بھی کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہ کی اور نہ ہی کسی سیاسی شخصیت سے کبھی کوئی رابطہ جوڑا۔ 1938ء میں امرتسر میں اپنے مریدین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مولانا تھانوی نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی تعریف اور حمایت کر کے سب کو حیران کر دیا۔ انہوں نے فرمایا:

- وہ ایک مخلص اور سچے مسلمان اور ہندوستانی مسلمانوں کے قابل ترین راہنما ہیں۔ ان کے اخلاص اور سچائی کی روشنی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو کر رہیں گے! اللہ تعالیٰ جل شانہٗ انہیں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک قائم کرنے کا شرف ضرور

عطا کرے گا۔ میں نے اپنے تمام مریدوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ ہر بات اور ہر حال میں محمد علی جناحؒ کی حمایت کریں۔

مولانا تھانوی نے محمد علی جناحؒ کی زوردار حمایت کیوں کی؟ مولانا کے بھتیجے مولانا ظفر احمد عثمانی نے اس کی وضاحت کی۔ بقول ان کے ایک صبح مولانا اشرف علی تھانوی نے انہیں بلا کر کہا:

❑ ''مجھے خواب کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ لیکن گزشتہ شب مجھے ایک عجیب و غریب خواب آیا۔ مجھے ایک عظیم انبوہ نظر آیا۔ یوں لگا جیسے یہ یوم حشر ہے۔ اس ہجوم میں بزرگانِ دین، دانشور اور پرہیز گار حضرات کرسیوں پر فروکش ہیں۔ محمد علی جناحؒ عرب لباس میں ملبوس ان حضرات کے ہمراہ ہیں۔ میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ اس گروہ میں یہ کیسے شامل ہیں۔ مجھے یہ آگاہی دی گئی کہ محمد علی جناحؒ عین اس وقت اسلام کی عظیم خدمت بجالا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے یہ مرتبہ عنایت کیا گیا ہے!''

4 جولائی 1943ء کو مولانا تھانوی نے مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی (1885ء۔ دسمبر 1949ء) کو طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو کہا:

❑ ''مجھے کشف ہوا ہے کہ اللہ جل شانہ محمد علی جناح کو کامیابی عطا کرے گا۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان کامرانی سے ہمکنار ہوگی۔ میرے دن گنے جا چکے ہیں۔ اگر میں زندہ رہتا تو یقیناً ہاتھ بٹاتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ ریاست نصیب ہو۔ آپ سے جو بھی بن پڑے، قیام پاکستان کے لیے کریں۔ اپنے مریدوں کو بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہیں۔ تم میں سے ایک عثمانی میری نماز جنازہ پڑھائے گا اور دوسرا محمد علی جناحؒ کی نماز جنازہ کی امامت کرے گا''۔

مولانا تھانوی کی نمازِ جنازہ والی پیشین گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی۔ مولانا حسرت موہانی (1857ء۔ 1951ء) جو ایک ممتاز دانشور، اسلام کے عظیم خادم اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے ساتھی تھے، قائد اعظمؒ کی مشغولیتِ دعا کے ایک ناقابل فراموش مشاہدہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

☐ ایک دن میں نے جناحؒ صاحب کے بنگلہ پر ایک ضروری کام سے علی الصباح حاضری دی اور ان کے ذاتی خدمت گار کو انہیں مطلع کرنے کے لیے کہا۔ اس نے جواب دیا: ''براہِ مہربانی انتظار فرمائیں۔ اس وقت کسی کو بھی ان کے کمرہ میں جانے کی اجازت نہیں۔ وہ خود ہی تھوڑی دیر میں باہر تشریف لے آئیں گے''۔ میرا کام بے حد اہم تھا۔ لہٰذا میں خدمت گار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ پہلے ایک کمرہ میں گیا۔ پھر دوسرے میں داخل ہوا۔ عین اس وقت ملحقہ کمرے سے مجھے کسی کے بولنے اور سسکیاں بھرنے کی آواز آئی۔ یہ جناحؒ صاحب کی آواز تھی! مارے تشویش کے میں نے آہستہ سے پردہ سرکایا۔ مجھے جناحؒ صاحب سجدہ میں گرے نظر آئے۔ وہ اللہ کے حضور التجا کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے واپس مڑا۔ دوستو! اب میں جب بھی کبھی جناحؒ صاحب کے بنگلے پر حاضری دیتا ہوں اور خدمتگار کہتا ہے کہ وہ اندر موجود ہیں تو میری چشم نظارہ اس منظر کو فوراً دہرا دیتی ہے کہ جناحؒ صاحب سجدہ میں گرے آہ وزاری کر رہے ہیں۔ (قائداعظم کی شخصیت کا روحانی پہلو از ملک حبیب اللہ)

قائداعظمؒ اور حرمت انبیاؑ

1927ء: توہین انبیا کے انسداد کا بل: اگست **1927**ء میں دہلی سے مولانا محمد علی جوہر نے قائداعظمؒ کو یہ تار بھیجا۔ ''واجب الاحترام پیشوایانِ مذاہب کی توہین کے انسداد کے لیے دہلی میں ایک کانفرنس **18** اگست کو ہونے والی ہے۔ مسلمانان دہلی قانونی کونسلوں کے جملہ ارکان کو شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ براہِ کرم شملہ جاتے ہوئے یہاں ٹھہریئے اور احباب کو ہمراہ لایئے۔ تشریف آوری سے مطلع فرمائیں''۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''جناب کا تار موصول ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں **18** اگست کو دہلی حاضر نہیں ہوسکتا۔ میں شکار پور ہوتا ہوا شملہ جا رہا ہوں۔ جملہ مذاہب کے بانیوں اور پیشواؤں کے متعلق دریدہ ذہنی اور حملہ کرنے والوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے جو بھی کارروائی کی جائے، میری تائید اس کے شامل حال رہے گی۔ میری استدعا ہے کہ مسلمان آئینی طریق کار اختیار کریں۔
(انسائیکلو پیڈیا، قائداعظم جلد دوم صفحہ **588** از منصور احمد بٹ)

ناموس رسالت ﷺ کا علمبردار

غازی علم الدین شہید کا مقدمہ بعض مسلم اکابرین کی آزمائش بھی ثابت ہوا۔ کھرے اور کھوٹے کا علم عموماً ایسے ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ سیشن کورٹ نے راجپال کے ہندو ملازموں اور چند دیگر افراد جو ہندو تھے، کی گواہی وغیرہ کی بنیاد پر، سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ سزائے موت کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی جائے۔ یہ اپیل دائر کرنے کے لیے پنجاب کے مشہور بیرسٹر اور شفیع لیگ کے سربراہ محمد شفیع سے درخواست کی گئی جو ویسے بھی اس کیس کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ تاہم سر محمد شفیع نے مقدمے (اپیل کیس) کی پیروی سے اس لیے انکار کر دیا کہ ہندو اسے برا سمجھیں گے۔ سر محمد شفیع کی طرف سے مقدمے کی پیروی سے بوجوہ انکار کے بعد لاہور کے مسلمانوں نے بمبئی میں مسٹر جناح سے رابطہ کیا جو اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود مقدمہ اپیل کی پنجاب ہائی کورٹ میں پیروی کے لیے تیار ہو گئے۔ قائد نے تو اس وقت نہیں کہا کہ کیس کی نوعیت ذرا فرقہ وارانہ ہے، اس لیے وہ اس کی پیروی نہیں کر سکتے کہ کہیں ان سے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا پرانا خطاب چھین کر انہیں مسلم فرقہ پرست کا خطاب نہ عطا کر دیا جائے۔ چنانچہ قائد نے پنجاب ہائی کورٹ کو تار دیا کہ مقدمے کی سماعت کی تاریخ 15 جولائی (1929ء) مقرر کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی قائد نے پنجاب ہائی کورٹ میں بطور وکیل پیش ہونے کی خصوصی اجازت بھی ہائی کورٹ سے مانگی کیونکہ قانون کے مطابق وہ صرف بمبئی ہائی کورٹ کی حدود میں ہی پریکٹس کر سکتے تھے۔ وکالت کے لیے اجازت کی درخواست پنجاب ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس براڈوے کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے قائد کو یہ اجازت دینے سے انکار کیا۔ ان کے فیصلے کے خلاف، قائد نے چیف جسٹس سر شادی لعل سے رجوع کیا تو اس نے غالباً اس خیال سے اجازت دے دی کہ ہندو ہونے کی بنا پر اس کے انکار پر مسلمان ردعمل ظاہر کریں گے۔ کیس (اپیل) کی سماعت 15 جولائی کو پنجاب ہائی کورٹ کے دو انگریز ججوں کے سامنے ہوئی، ان میں سے ایک (جسٹس براڈوے) تو

وہ جج تھا جس نے پنجاب ہائی کورٹ میں پیش ہونے کی اجازت کے لیے قائد کی درخواست مسترد کی تھی حالانکہ یہ ایک روٹین کی اور رسمی اجازت تھی۔ کسی بھی مشہور وکیل کو کسی ہائی کورٹ میں (اور یجنل ہائی کورٹ کے علاوہ) پیش ہونے سے عام حالات میں کبھی نہیں روکا گیا تھا۔ لیکن غازی علم الدین شہید کے اپیل کیس میں کوشش کی گئی کہ قائد پیش ہی نہ ہوسکیں۔ بہرحال قائد نے اگرچہ شاندار دلائل دیے اپیل پھر بھی مسترد کر دی گئی۔ مقدمہ درحقیقت سیشن عدالت میں صحیح انداز میں نہیں لڑا گیا تھا۔ گواہیاں کمزور اور مشکوک تھیں۔ پھر معاملہ قتل عمد کا نہیں، دینی غیرت کے جوش اور کتاب سے پیدا کردہ اشتعال میں قتل کا تھا، لیکن ان پہلوؤں پر دلائل سزا سنانے والی عدالت (ٹرائل کورٹ) میں دیے جا سکتے تھے، اپیل کیس میں دلائل مضبوط ہونے کے باوجود ٹیکنیکل بنیادوں پر قبول نہیں کیے گئے اور پھانسی کی سزا کا فیصلہ برقرار رہا۔ بہرحال جس طرح قائد اس کیس میں اپیل کی پیروی کے لیے مسلمانوں کی خواہش پر بمبئی سے لاہور بھاگے بھاگے آئے اور بہترین قانونی دلائل پیش کیے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائد اس وقت تک فیصلہ کر چکے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کی خواہش کے باوجود ان کی سیاست کا اصل محور اور مرکز مسلمانوں کے حقوق اور مفادات ہوں گے اور مسلمان عوام جب بھی انہیں آواز دیں گے، وہ ان کی خدمت کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔ (میر کارواں از میاں محمد افضل ص 280)

سلام اے راہبر ملت، سلام اے قائد اعظم
سلام اے مخزن عظمت، سلام اے قائد اعظم
تیرے ہر قول سے چشمے ابلتے تھے اخوت کے
تیرے افعال سے گلشن مہکتے تھے حمیت کے

غازی عبدالقیوم شہیدؒ اور قائداعظمؒ

عبدالقیوم نام کے عاشق رسول ﷺ نے ناتھورام کو واصل جہنم کیا تھا۔ ناتھورام نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ پمفلٹ شائع کیا تھا۔ حکومت نے عبدالقیوم کو پھانسی کی سزا دی۔ مسلمانوں کے ہجوم نے غازی عبدالقیوم شہید

کے جنازے کو کاندھا دینے کی کوشش کی۔ پولیس نے ہجوم پر فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ شہر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ نئ دہلی میں **لیجسلیٹیو** اسمبلی میں اس واقعہ کو اٹھایا گیا۔ مسلمان ممبر اسمبلی جناب کے ایل گابا نے **21** مارچ **1935**ء کو تحریک التوا روک کر پولیس کے گولی چلانے اور مسلمانوں کی ہلاکتوں پر بحث کرنے کی تجویز پیش کی۔ **SIR HENRY CRAIK** ہوم ممبر نے حکومت کا دفاع کرتے ہوئے کہا اگر مسلمانوں کے ہجوم کو جنازے کا کاندھا دینے کی اجازت دے دی جاتی تو امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ مسئلے کو اسمبلی میں زیر بحث لانے اور ایک کمیشن قائم کرنے کے حق میں **52** کے مقابلے میں **68** ووٹ سے تحریک منظور ہوئی۔ قائداعظم نے بھی حق میں ووٹ دیا۔ قائداعظم نے سر ہنری کریک کے موقف کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ قائداعظم نے کہا کہ ان کے خیال میں معزز ممبر نے عقل و دانش کو بروئے کار لانے کے بجائے تن آسانی سے کام لیا۔ میرا سوال یہ ہے کہ آنریبل ہوم ممبر نے **20** ہزار کے مجمع کو کنٹرول کرنے کا کیا انتظام کیا؟ جیل سے قبرستان دو میل کے فاصلے پر ہے، **20** ہزار کا مجمع قبرستان کیسے پہنچ گیا۔ بادشاہ آتا ہے تو آپ تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دیتے ہیں۔ آپ نے تو مجمع کو ذبح کرنے کے لیے ان پر گولی چلا دی۔ آپ کو معلوم تھا کہ لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں، جنازے کو کاندھا دینا مجمع کا حق تھا۔ حالات کے خراب ہونے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، میرا مطالبہ یہ ہے کہ اس سنگین واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آنریبل ہوم ممبر، کمیشن قائم کرنے کی کیوں مخالفت کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس موقع پر سول اتھارٹی کیا کر رہی تھی؟ گولی چلانے کا حکم کس نے دیا تھا؟ ہوم ممبر سر ہنری کریک نے کہا کہ گولی چلانے کا حکم فوجی کمانڈر نے دیا۔ قائداعظم نے اس پر یہ ریمارکس دیئے کہ فوجی کمانڈر نے میرے خیال میں حالات کی نزاکت کا خیال نہیں کیا۔ گولی چلانے کا فیصلہ عجلت میں کیا یا اسے **ERROR OF JUDGEMENT** کہہ سکتے ہیں۔ کمیشن مکمل تحقیقات کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہ حکومت کو آئندہ کے لیے

سبق سکھائے گا۔ وہ انھیں عقل سکھائے گا کہ ایسے موقعوں پر دانشمندی کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔'' (جناب سعید صدیقی کا کالم ''ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز'' مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور 21 جنوری 2011ء)

ختم نبوت

1935ء کے آغاز میں ''ختم نبوت'' کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے۔ اسی زمانے میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ''اسلام اور قادیانیت'' اخبار ''لائٹ'' اور ''سٹیٹس مین'' (10 جون 1935ء) کے نام مکاتیب کے علاوہ پنڈٹ جواہر لعل نہرو کے نام مکتوب (21 جون 1936ء)، ''اسلام اور احمدیت'' (جنوری 1936ء) اور **"Jewish Integrity Under Forman Rule" (Written on 22nd June 1935)** تحریر فرمائے۔ پنڈت نہرو کے نام مکتوب میں آپ نے دوٹوک الفاظ میں لکھا:

"I have no doubt in my mind that the 'Ahmadis' are 'Traitors' both to Islam and to India".

(Speaches, Writings & Statements of Iqbal, compiled by L.A. Sherwani, Lahore, Iqbal Academy 1977, Page 200

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اُن دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر تھے۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ (جو انجمن کی جنرل کونسل کے رکن تھے اور قادیانی تھے انجمن کے اجلاس کے دوران حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ جب انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس میں مسئلہ ختم نبوت اٹھا تو علامہ اقبال نے تحریک پیش کی کہ انجمن حمایت اسلام واضح اور غیر مبہم طور پر اعلان کرے کہ آئندہ انجمن کا کوئی رکن قادیانی نہیں ہوگا۔ نیز یہ کہ انجمن ختم نبوت کے حوالے سے اپنی پالیسی کا اعلان خصوصی طور پر اخبارات میں کرے۔

چنانچہ جنرل کونسل نے 2 فروری 1936ء کو اخبارات کے لیے جو اعلان ارسال کیا اس میں لکھا:

❑ ”دین حقہ اسلام کے قبول کرنے والوں کا نام حضرت ابراہیم نے ”مسلم“ رکھا۔ یہی اسلام خاتم النبیین، افضل المرسلین حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ مکمل اور کامل ہوگیا اور ہدایت کی نعمت خدائے پاک کی طرف سے اس پیغام کے ساتھ مکمل ہوگئی جو رسول مقبول ﷺ کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچایا گیا اور جس کا نام ”قرآن مجید“ رکھا گیا۔ (اقبال اور انجمن حمایت اسلام مؤلفہ محمد حنیف شاہد صفحہ 132)

قرآن اور مسلمانوں کی دینی تاریخ ...... اس امر کی شاہد ہیں کہ ”ختم نبوت“ دین اسلام کا ایک اساسی اصول ہے اور تمام اسلامی فرقے اس امر پر متفق ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے ساتھ دین مکمل ہوگیا اور اصول خاتمیت کی کوئی تاویل گوارا نہیں کی جاسکتی۔ سب فرقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی ہستی پیغمبر عربی ﷺ کے بعد دنیا میں بحیثیت نبی ظاہر نہیں ہوسکتی اور خواہ ان کے مابین کتنے ہی ضمنی یا فروعی اختلافات کیوں نہ ہوں، وہ حضرت محمد ﷺ کی خاتمیت کے قائل ہونے کی حیثیت سے قرآن پاک کو آخری وحی ماننے کی حیثیت سے اسلام کا جزو ہیں۔ انجمن حمایت اسلام اپنے دائرے میں ہر ایسے مسلمان کو لیتی رہے گی“۔

(اقبال اور انجمن حمایت اسلام مؤلفہ محمد حنیف شاہد، صفحات 132 تا 133)

اسی زمانے میں سید سرور شاہ گیلانی، ناظم تحریک تنظیم مساجد لاہور نے ”ختم نبوت“ کے حوالے سے برصغیر کی نامور اور مقتدر شخصیات کی طرف سے نہ صرف بیانات جاری کروائے بلکہ ان سے لیکچروں کا اہتمام بھی کیا اور بعد ازاں اُن لیکچروں کو کتابچوں کی صورت میں تحریک کی جانب سے شائع کیا۔

سید سرور شاہ گیلانی (علیگ) نے یہ سلسلۂ تقاریر اس وقت شروع کیا جب تحریک ختم نبوت ﷺ زوروں پر تھی نیز فتنہ قادیانیت بھی ملت اسلامیہ کے لیے دردسر بنا ہوا تھا اور سادہ لوح مسلمان اس کا شکار ہو رہے تھے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر ”سیرت رحمت للعالمین ﷺ“ کے آخری پیرا میں آقائے نامدار سرور دو جہاں حضور اکرم ﷺ کو ”پیغمبر آخر الزمان“ اور ”رحمت للعالمین“ کے معزز القابات سے

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل دنیا کے مختلف حصوں اور وقتوں کے لیے انبیائے کرام تشریف لاتے رہے۔ ان کی تعلیم عالمگیر نہ تھی اور عالمگیر ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں ابھی بہت وقت درکار تھا۔ بالآخر ہمارے ہادی عالم ﷺ کا ورود مقدس اس وقت ہوا جب دنیا ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے وہ حقائق و معارف کے تمام امور کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس لیے ہمارے ''پیغمبر آخر الزمان'' کو ''رحمت للعالمین'' کے معزز لقب سے خالق اکبر نے سرفراز فرمایا''۔ (تقریر سیرت رحمت للعالمین ﷺ از محمد علی جناح، صفحہ 16)

یہ عجیب اتفاق یا حسن اتفاق ہے کہ فروری 1936ء میں بحیثیت صدر انجمن حمایت اسلام لاہور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ تحریک پیش کی کہ ''انجمن واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرے کہ آئندہ انجمن کا کوئی رکن قادیانی نہیں ہوگا۔

(اقبال اور انجمن حمایت اسلام مؤلفہ محمد حنیف شاہد صفحہ 132)

قائد اعظمؒ اور قادیانیت

مئی 1944ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے اس ضمن میں اپنے مؤقف کی وضاحت بذریعہ مکتوب مرقومی 5 مئی 1944ء کے ذریعے کر دی تھی لیکن 10 جون 1944ء کو سری نگر سے مسلم لیگ اور قادیانیوں کے بارے (رکنیت مسلم لیگ) میں حسب ذیل بیان اخبارات کو جاری کرنا پڑا: مقصد یہ تھا کہ کوئی قادیانی مسلم لیگ کا رکن نہیں بن سکتا:

❑ ''میں نے دیکھا ہے کہ اخبارات کے بعض حلقوں میں پھر اکبر علی ایم۔ ایل۔ اے کے ساتھ میری ملاقات کے ضمن میں بہت سے الجھاؤ پیدا کیے جا رہے ہیں اور غلط ترجمانی ہو رہی ہے۔ میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی ملاقات کے دوران ان پر پھر یہ واضح کر دیا تھا کہ جہاں تک آل انڈیا مسلم لیگ کا تعلق ہے، ہم اپنی تنظیم کے دستور کی (متعلقہ) شق کے تابع ہیں اور میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ

اس بات کی نشاندہی کر دوں کہ اپنے دستور کے مطابق آل انڈیا مسلم لیگ کی ابتدائی شاخ کی رکنیت کے امیدوار کو مسلمان ہونا چاہیے، وہ برطانوی ہند کا باشندہ ہو اور اس کی عمر 18 برس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے ناظر امور عامہ خارجہ، قادیان کا مکتوب موصول ہونے پر کسی ایسی بات سے اتفاق کیا ہو کہ دستور سے انحراف کرنا میرے اختیار میں ہے۔ میں نے اپنے مکتوب مرقومہ 5 مئی 1944ء میں اپنے مؤقف کی وضاحت کر دی تھی''۔

(قائداعظم: تقاریر و بیانات، جلد سوم، لاہور، بزم اقبال 1998ء صفحہ 314)

علامہ اقبال اور قائداعظم کے بیانات سے واضح ہو گیا ہے کہ دونوں زعما قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔

(رحمت للعالمین ﷺ قائداعظم کی نظر میں از محمد حنیف شاہد)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس جماعت کا کوئی غیر مسلم، کوئی قادیانی ممبر نہیں بن سکتا تھا، کیا وہ جماعت قائداعظمؒ کی قیادت میں ایک سیکولر ریاست کی تشکیل کے لیے پاکستان حاصل کرنا چاہتی تھی یا اسلامی قوانین کی حکمرانی کے لیے۔ اس کا جواب قائداعظمؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ: ''ہمارا دین، ہمارا تمدن اور اسلامی تصورات حصول آزادی کے لیے ہماری قوت محرکہ ہیں''۔ (پشاور 20 نومبر 1945ء) (عظیم قائد، عظیم تحریک، ایک حقیقت ایک دستاویز حصہ دوم صفحہ 609، از ولی مظہر ایڈووکیٹ)

معروف دانشور اور ماہر پاکستانیات جناب ڈاکٹر صفدر محمود اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

❑ ''قائداعظم مذہبی رواداری، انسانی برابری، معاشرتی عدل اور قومی اتحاد کے قائل تھے، اس لیے وہ ہمیشہ مسلکی تفریق اور فرقہ بندی سے نہ صرف پرہیز کرتے رہے بلکہ اس سوچ کی عملی طور پر حوصلہ شکنی بھی کرتے رہے۔ بے شمار مواقع پر مسلمانوں کے اتحاد میں مسلک اور مذہبی فرقہ بندی کی بنا پر تفریق پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن قائداعظم نے انھیں کامیاب نہ ہونے دیا اور ہمیشہ ایسی سازشوں کا توڑ اسوۂ حسنہ ﷺ

سے کیا۔ احمدیوں (قادیانیوں) کے حوالے سے ان کا مؤقف واضح تھا جس کی روشن جھلک ان کے ایک بیان میں ملتی ہے جو انھوں نے سری نگر سے 10 جون 1944ء کو جاری کیا(حوالے کے لیے دیکھیں **Speeches and statements of Quaid-E-Azam, Vol III P-1904-5, by Khurshid Ahmad Yousfi Bazam-i-Iqbal Lahore.)**

ہوا یوں کہ پیر اکبر علی ایم ایل اے (رکن لیجسلیٹو اسمبلی) نے قائداعظم کا انٹرویو کیا جس سے تاثر پیدا کیا کہ قائداعظم احمدیوں کو مسلم لیگ کی رکنیت دلانے کے لیے رولز میں تبدیلی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کی نفی کرتے ہوئے قائد اعظم نے اپنے اس بیان میں واضح کیا کہ مسلم لیگ کی رکنیت کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے اور ان سے یہ منسوب کرنا کہ وہ آئین سے بالاتر کسی اقدام کا سوچ رہے ہیں، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس بیان میں قائداعظم نے واضح کیا کہ وہ قادیان کے ناظم امور کے خط کے جواب میں پانچ مئی کو یہ پوزیشن واضح کر چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ احمدی مسلم لیگ کے رکن نہیں بن سکتے کیونکہ وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہیں، چنانچہ اس پس منظر میں کوئی کنفیوژن نہیں ہونا چاہیے کہ سر ظفر اللہ خان کو ان کی قابلیت کی بنا پر اور اقلیتوں کو ریاستی ڈھانچے میں احساس شرکت دینے کے لیے دسمبر 1947ء میں وزیر خارجہ بنا دیا گیا تھا، جس طرح ہندو رکن اسمبلی جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون مقرر کیا گیا تھا۔ مقصد اقلیتوں کو احساس تحفظ، اعتماد اور سیاسی برابری کا پیغام دینا تھا جو اسلامی معاشرے کے روشن اصول ہیں۔ خود سر ظفر اللہ خان بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے بارہ ستمبر 1948ء کو قائداعظم کے جنازے میں تو شرکت کی لیکن نماز جنازہ کے وقت ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم قائد اعظم، ختم نبوتؐ اور عید میلاد النبی ﷺ مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 15 دسمبر 2017ء)

دندان شکن جواب

قیام پاکستان سے پہلے یہ سوالات اٹھتے تھے کہ یہ اسلامی حکومت کیسی ہو گی؟

قائداعظم کے بجائے متذکرہ بالا سوال کا جواب مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی نے دیا:

❑ ''اسلامی حکومت اپنی بد سے بدتر شکل میں اور کسی فرقہ کے مطابق سہی، بہر حال ہر کافرانہ حکومت سے بہتر اور قابل ترجیح ہو گی۔ صحت کمزور سے کمزور سہی، بہر حال بیماری کی ہم سطح تو نہیں ہوسکتی۔ روشنی دھیمی سے دھیمی سہی، بہر حال تاریکی سے تو غنیمت ہی رہے گی''۔ (صدق ص 22,2 جنوری 1946ء)

مفت ہے خونِ جگر عظمتِ کردار کے ساتھ

جب مولانا مظہر علی اظہرؔ نے قائداعظمؒ کی شادی کے متعلق ایک شعر کہا تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے اسے سخت ناپسند کیا اور مولانا مظہر علی اظہرؔ سے کہا تھا:

❑ ''مظہر علی اظہرؔ تم نے ایک عفیفہ عورت پر الزام لگا کر اچھا نہیں کیا۔ مظہر علی تم ہار گئے ہو''۔

اور اسی طرح ماسٹر تارا سنگھ نے جب تلوار لہرا کر مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکی دی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

❑ ''ماسٹر جی ہوش کے ناخن لو، کیا کہتے ہو؟ جس قوم کے فرزند خون کے سمندروں میں تیرتے رہے ہیں، تم انہیں اپنی ننھی منھی ندیوں سے ڈراتے ہو؟ پھر فرمایا مسٹر جناح کے مقابلے میں تارا سنگھ کی تلوار اُٹھے گی تو اس کے مقابلے میں سب سے پہلے بخاری آئے گا''۔ (سیّد عطا اللہ شاہ بخاری اور پاکستان از ڈاکٹر زاہد منیر عامر)

سیّد عطا اللہ شاہ بخاری نے کہا:

❑ ''تقسیم سے پہلے ایک مسئلہ پر میں نے لیگ سے دیانتدارانہ اختلاف کیا۔ صرف ایک سیاسی مسئلہ کا اختلاف تھا، رائے کی ٹکر تھی، برادری کے دو بھائیوں کے درمیان ایک سوال پر بحث تھی۔ میں نے تو شاہ جہاں کی مسجد میں لاکھوں مسلمانوں کے سامنے قائداعظم کے جوتوں پر سفید ڈاڑھی رکھی اور کہا کہ میری یہ ٹوپی لے جا کر ان کے قدموں میں رکھ دو، شاید ان تک میری رسائی ہو سکے''۔

(سیّد عطا اللہ شاہ بخاریؒ اور پاکستان از ڈاکٹر زاہد منیر عامر)

حضرت امیر شریعتؒ اور مجلس احرار نے نہ صرف اپنا تمام سابقہ سیاسی کردار مسلم لیگ کو سونپ دیا بلکہ اپنے عظیم سرفروش جیالے کارکن جو احرار رضا کار کہلاتے تھے، وہ بھی مسلم لیگ کی نیم عسکری تنظیم ''نیشنل گارڈز'' میں ضم کر دیئے۔ اس موقع پر شاہ صاحبؒ نے احرار رضا کاروں سے خطاب سے پیشتر ان میں اعزازی تلواریں پیش کیں اور بعدازاں باوردی احرار رضا کاروں سے فرمایا:

❑ ''احرار رضا کارو! آج کے بعد تم احرار رضا کار نہیں رہے۔ جاؤ قومی رضا کاروں کی نیشنل گارڈز میں بھرتی ہو جاؤ۔ اب گلی کوچوں میں چپ و راست کا وقت نہیں رہا۔ فوجی ٹریننگ حاصل کر کے ملک و ملت پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، مجلس احرار کا سرمایہ تم ہو۔ میری ساری عمر کی کمائی تم ہو، میں تمہیں قوم کے سپرد کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ ہماری عمر بھر کی کمائی صحیح کام آئی۔ فوجی وردی میں ملبوس ہو کر رائفل پکڑو اور دین و ملت کی پاسبانی کے لیے جان قربان کرنے کی تربیت حاصل کرو''۔

(روزنامہ آزاد لاہور 28 نومبر 1949ء صفحہ دوم)

شاہ جی نے مزید کہا:

❑ ''ہم نے دس لاکھ مسلمانوں کا خون دے کر اور ایک کروڑ مسلمانوں کو بے گھر کر کے ایک آزاد وطن حاصل کیا ہے، اس کی آزادی ہمیں ہر چیز پر مقدم ہے۔ ہم پاکستان کو ایک مستحکم اور ناقابل تسخیر ملک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ داخلی اور خارجی دشمنوں سے محفوظ ہو۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ اس ملک کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے۔ مسلم لیگ نے آج سے چالیس سال قبل ایک نعرہ لگایا تھا۔ وہ نعرہ تھا مسلمانوں کی سربلندی کا۔ آہستہ آہستہ ایک دور آیا کہ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ وہ اس برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن چاہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجلس احرار نے اس نظریہ سے دیانتدارانہ اختلاف کیا۔ ہم نے جب یہ سمجھا اور محسوس کیا کہ قوم نے ایک فیصلہ دے دیا ہے اور وہ فیصلہ ہے قیام پاکستان کا تو ہم نے اس مطالبہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ وطن جس کی خاک کا ہر ذرہ مجھے عزیز ہے، ہر چیز سے عزیز تر ہے۔ اس کی آزادی،

سالمیت اور استحکام جزو ایمان ہے۔ پاکستان کی آزادی کی حفاظت کے لیے کروڑوں عطا اللہ شاہ بخاری قربان کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے وطن کی آزادی پر کوئی آنچ آئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ پاکستان بن چکا ہے اس کی حفاظت ہر مسلمان کا جزو ایمان ہونا چاہیے۔ میں پاکستان کو داخلی دشمنوں سے محفوظ کرنے کا ہر قیمت پر تہیہ کر چکا ہوں۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی گروہ یا ٹولہ اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگا کر پاکستان کی حدود کے اندر آباد رہ سکے۔ خارجی دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن داخلی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کی موجودگی میں یہ سمجھ لینا کہ ہم محفوظ ہیں، انتہائی بے وقوفی ہے، حماقت ہے۔ اس لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو مستحکم بنایا جائے کیونکہ مسلم لیگ کا استحکام مسلمانوں کے استحکام کا ضامن ہے۔ اس صوبہ میں مسلم لیگ کی جس پارٹی میں بھی حکومت ہوگی، ہم اس کی حمایت کریں گے اور جو پارٹی بھی مسلم لیگ کے نام پر اس وقت برسر اقتدار ہے، ہم اس کی حمایت کریں گے۔ ہم اس صوبے کے امن و امان، خوشی، فلاح و بہبود، استحکام اور سربلندی کے لیے حکومت سے پورا اور غیر مشروط تعاون کرتے رہیں گے"۔

(روزنامہ زمیندار لاہور **21** جولائی **1952**ء مولانا سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کی لاہور میں تقریر)

❑ "آج ہم کسی سے دب کر کچھ نہیں کہتے بلکہ پوری آزادی سے کہتے ہیں کہ دفاع وطن کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر کوئی غدار ہو تو اسے کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ ثروت۔ میں آپ کی خدمت میں پورے خلوص سے التجا کرتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پر سفید ڈاڑھی رکھ کر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اسے منظور کریں اور یہ کہ کوئی ایک نوجوان بھی ایسا نہ رہے جو نیشنل گارڈز کی وردی نہ پہنے ہوئے ہو"۔ (حیات امیر شریعتؒ از جانباز مرزا)

❑ "تم میری رائے کو خود فراموشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی۔ اب اس کہانی کو یہیں ختم کر دو۔ اب پاکستان نے جب بھی پکارا، واللہ باللہ میں اس کے ذرہ ذرہ کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں،

عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی۔ کسی نے ہاتھ اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلہ میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں اور نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے''۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور، شاہ جی نمبر 15 جنوری 1962ء ص18)

لاہور کے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں فرمایا:

❑ ''پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا ہے، اب اس کی حفاظت ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ آئندہ کے لیے میں نے تو سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، جو حضرات صرف تبلیغ دین اور عقیدہ تحفظ ختم نبوت کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں وہ میرے ساتھ آ جائیں اور جو سیاسیات میں حصہ لینا چاہیں، وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کریں۔ (اسلامی جمہوریہ پاکستان از مولانا ڈاکٹر محمد عادل خاں ص 193)

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

سیّد عطاءاللہ شاہ بخاریؒ نے حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وفات پر اُنہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

❑ ''وہ وکالت یا خطابت کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ وہ ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ جس نے ہندوستان کی تاریخ حریت میں جگہ جگہ ایسے رنگین اور دیرپا نقوش ثبت کیے اور اسلامی تاریخ میں تو انہوں نے ایسا بیش بہا اضافہ کیا جو پاکستان کے نام سے رہتی دنیا تک یادگار رہے گا''۔

(قائداعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص258، لیڈر کون ہوتا ہے؟ از ڈاکٹر حسین احمد پراچہ، مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور، 25 دسمبر 2013ء)

پاکستان کا ظہور

''پاکستان کا ظہور فی الحقیقت دین اور دل کی جیت ہے جبکہ اسے ناممکن اور ناکام بنانے کے ہندو ہتھکنڈے، عقل عیار کی ریت۔ اس معرکے میں گاندھی جی کا استدراج، پنڈت جواہر لعل نہرو کا استدلال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا استدراک، تینوں

عملاً اپنا منہ لے کے رہ گئے اور پاکستان اللہ کے فضل سے قائم ہو کے رہا۔ گویا عقل پر عشق غالب آ گیا۔ یعنی پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کی عملی تفسیر ہاتھ آ گئی۔ جس ملک کا نظریہ اور بانی دونوں کو پیش کرنے میں فقر و دین کے ترجمان حضرت علامہ اقبالؒ پیش پیش ہوں، وہاں تعقل کی گمراہی اور عقل کی رسوائی کو مشیت الٰہی کہنا ہی پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے غنیم اور نتیجتاً بھارت کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تک کو بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ”پاکستان بن گیا، یہی مشیت الٰہی کو منظور تھا“ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہ بھی فرمان اقبالؒ ہی تو ہے کہ پیکار عقل و دین میں ”جیتا ہے رومیؒ، ہارا ہے رازی“ (زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی)

مولانا ابوالکلام آزاد اور شراب نوشی!

بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی 7 اپریل 2012ء کو نوائے وقت میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

❑ ”راقم اس دوران 1945ء سے 1947ء تک تاریخ پاکستان کی جدوجہد کے دوران دہلی میں موجود تھا اور مختلف اوقات میں مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے پاکستان مخالف مسلمانوں اور کانگریسی لیڈروں کے بیانات اور تقاریر سنتا رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت کو پاکستان بننے کے ذریعے کمزور کرنا پاکستان کی وجہ سے تھا یا مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی خواہشات پر مبنی تھا۔

راقم غالباً وہ واحد فرد موجود ہے جس نے برطانوی پاکستان کی پاکستان تجویز کے بارے میں نئی دہلی میں کانگریس کا جلسہ دیکھا اور سنا۔ اس جلسہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان اور دوسرے غیر ہندو لیڈروں نے جو تقاریر کی تھیں۔ اس میں جو بات نوٹ کرنے والی تھی وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب بھی مجھے یاد ہے کہ ہندو لیڈر سردار ولبھ بھائی پٹیل ہوم منسٹر نے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمان ہمارے لیے کینسر کی بیماری ہیں جن کو اکھیڑ کر پھینک دینا ہماری صحت کے لیے بہت ضروری ہے اور اسی کا نام انگریزوں کی پاکستان تجویز ہے۔ میں اپنی منسٹری میں کسی

مسلمان چپڑاسی پر بھی اعتبار نہیں کرسکتا۔ اس لیے انگریز حکومت کی بنائی تجویز ہماری زندگی کیلئے نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ اسی دوران ولبھ بھائی پٹیل نے ہندوستان کے مختلف علاقوں دہلی ، بہار، کلکتہ اور اس کے قرب و جوار وغیرہ میں مسلمانوں کا قتل عام کرا کے وہ نقشہ دکھایا جو کانگریسی ہندوؤں کے دل میں تھا۔

چنانچہ ہندو کانگریس کا یہ پروگرام تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان کے مسلمانوں کو ختم کیا جائے جس میں مولانا آزاد اور دوسرے کانگریسی مسلمان بھی شامل تھے اور دوسری طرف پاکستان کی نئی مملکت کا ناطقہ بند کیا جائے تا کہ وہ ملک چلنے کے قابل ہی نہ رہے اور پنڈت نہرو نے بطور خاص اپنے نمائندے پنڈت درگا پرشاد دھر وغیرہ کو مسلم ہسپانیہ میں یہ دریافت کرنے کیلئے بھیجا کہ ہسپانیہ میں عیسائیوں نے مسلمانوں کی 800 سالہ حکومت کو ختم کر کے مکمل طور پر مسلمانو ں سے کیسے خلاصی حاصل کی۔ اس میں ہندوؤں اور عیسائیوں کے دوست مسلمان بھی شامل تھے۔ ہسپانیہ اور ہندوستان دونوں علاقوں میں اسلام دشمن عیسائیوں اور ہندووں کو مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح کے آلہ کار مہیا تھے جو دشمنوں کا پروگرام آگے چلانے کے لیے تیار تھے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کو نمونے کے طور پر کانگریس کا صدر بنا کر برٹش گورنمنٹ کے ساتھ گفت وشنید کے لیے استعمال کیا گیا۔ قائداعظم نے مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس کا شوبوائے بتایا۔ جب پاکستان اور ہندوستان دو آزاد ملک بنانے پر فیصلہ ہو گیا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو کھڈے لائن لگا کر پنڈت جواہر لال نہرو خود کانگریس کا صدر بن کر ہندوستان کا پہلا وزیراعظم بن گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو پنجاب کی تقسیم کے لیے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور جا کر وزیراعظم پنجاب سرخضر حیات کے ساتھ ملاقات کر کے اُس کو کانگریس لیڈر کی حمائت کا یقین دلا کر صوبائی اسمبلی سے پنجاب کی تقسیم پاس کرا کر کانگریس کی ایسے خدمت کی جس کے لیے ساری عمر ہندووں پر احسان جتاتے رہے کہ انہوں نے آدھا پنجاب اور کشمیر دونوں کو ہندوستان کے لیے حاصل کر لیا۔ دوسری طرف جب ہندوؤں کا مقصد پورا ہو گیا تو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ عبداللہ دونوں

کو اپنی INNER کابینہ سے نکال دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی اصلی منزل بھول کر ہندوؤں کی تعریف و توصیف کے ساتھ ان کے پروگرام کا حصہ بن گئے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ مولانا آزاد کی تفسیر کو احتیاط سے پڑھا جائے اور عمر کے آخری حصہ میں اپنی اس قلا بازی پر اس قدر پشیمان ہوئے کہ اس صدمے کو بھلانے کے لیے ان کو شراب کا سہارا لینا پڑا۔ چنانچہ پنڈت نہرو کا پرائیویٹ سیکرٹری اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد آخری عمر میں شراب کے غلام ہو چکے تھے۔ جن کو انگریزی میں AL-COHOLIC کہتے ہیں یعنی جب تک ان کو طلب کے مطابق شراب نہ دی جاتی تو ان کا بدن بے جان ہو جاتا اور وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوتے۔ پنڈت نہرو کے سیکریٹری نے لکھا کہ کئی بار مولانا ابوالکلام آزاد کو شراب پلا کر ملاقات کے قابل بنایا اور پھر وہ پنڈت نہرو کی میٹنگ میں شامل ہوئے''۔ (مولانا ابوالکلام آزاد اور شراب نوشی از بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور بتاریخ 7 اپریل 2012ء)

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسے امام سے گزر ایسی نماز سے گزر

اے تعصب زدہ دنیا ترے کردار پہ خاک

''ہم ایک حویلی پر رُک گئے۔ باہر سے کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اس پر کیا بیتی ہے؟ اندر قدم رکھا تو ویرانی ہی ویرانی تھی، تمام چوبی دروازے نکال دیئے گئے تھے، سامان لوٹ لیا گیا تھا، دیواروں پر لہو کی دھاریں تھیں، کپڑوں کو آگ لگا دی گئی تھی، معلوم ہوتا تھا، تماش بین ایک عفیفہ کو لوٹ کر اس کو ننگا کر گئے اور اس کے جسم پر زخموں کی چنت پڑی ہے، میں اس لرزہ خیز حالت کو دیکھ کر سہم گیا اور جب گاؤں کا مسلمان محلّہ دیکھا تو میرے بند کا انگ انگ کانپ اٹھا، جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ یاد آ گیا کہ فاتح قومیں کس طرح آبادیوں کو برباد کرتی ہیں، برقعوں میں دوڑتی ہوئی لڑکیوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے، پستانوں کا ڈھیر، انگلیوں کی پوریں، سروں کا انبار، منجمد چہروں کی پتھرائی

ہوئی آنکھیں، اوپلوں کی آگ سے جلی ہوئی لاشیں، کتابوں کی راکھ، ٹوٹے پھوٹے برتن، پھٹی ہوئی دیواریں، چھتوں کے بڑے بڑے شگاف، مکانوں سے شہتیر غائب، زنانے میں کنواں اور کنوئیں میں تعفن، انسان کے گوشت کی سڑانڈ، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا بجھا ہوا الاؤ، آگ کے ہاتھوں ساز و سامان پر کئی پھٹی عبارتیں، فضا میں نالہ کشیدہ اور ہوا میں آہ نارسیدہ، شقاوت و بربریت، تعدی، استبداد، ہلاکت، بے رحمی، سنگدلی اور خونریزی کی منہ بولتی تصویریں، کیلوں سے ٹھکے ہوئے بچے، مقتول سہاگنوں کا لٹا پٹا سہاگ، مردہ چہروں پر خون آلود لٹیں، سورہ اللیل کا نالہ اضطراب بچوں کے پنجر، آنگنوں میں حیا کی آخری ہچکی کا انجماد، جان بچاتی ہوئی عصمتوں کے پیازی آنسو اور آنسوؤں میں خون کی ملاوٹ، کٹے ہوئے کانوں میں ٹھیری ہوئی بالیاں اور ٹوٹے ہوئے ہاتھوں میں پٹی ہوئی تالیاں، یہ سب کچھ دیکھا تو میرے ہوش پراں ہو گئے۔ سیاست کا طوفان اس خوفناک حد تک چلا گیا تھا کہ خود خوف خدا تھرا رہا تھا، ہندو اس المیہ پر ہنستے اور مسلمان اس سانحہ پر روتے تھے"۔

(بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل از آغا شورش کاشمیری ص436، 437)

نسل کش منصوبہ

ہندوؤں کا شروع سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان غیر ملکی ہیں، انہیں یہاں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسی عقیدہ کے تحت قیام پاکستان سے قبل اور بعد ہندو مسلمانوں کے خون سے سرزمین ہند سیراب کرتے چلے آ رہے ہیں جیسے بھارتی فرقہ وار تنظیم جن سنگھ کے صدر پروفیسر بلراج مدھوک نے کئی دفعہ بہ الفاظ ذیل دہرایا۔

1- بھارتی حکومت بھارت کو خالصتاً ہندو مملکت قرار دے۔

2- مسلمانوں کو ہندو بنا کر بھارتی قومی دھارے میں ضم کر دے۔

3- مسلمان دو قومی نظریہ ترک کر کے ہندو بن جائیں ورنہ حشر برپا کر دیا جائے گا۔ (سیٹسمین فروری 1983ء)

سیوا جی مرہٹہ سے لے کر اب تک اسی لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ہندوؤں کے اس نظریہ پر قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں یوں روشنی ڈالی ہے۔

❑ اور (کفار) ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے۔(البقرہ:217)

صدیوں سے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دل میں نفرت کا جولاوا پک رہا تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو آزار پہنچانا، دکھ دینا، ذلیل کرنا، بائیکاٹ اور قتل و غارت سے نیست و نابود کرنا اپنی زندگی کا لازمی جزو بنالیا تھا۔ ہندو ہر چیز برداشت کرسکتا تھا مگر وہ مسلمان کا وجود برداشت نہ کرتا تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران یہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے انگریزوں کا معاون رہا۔ کانگریس کی تحریک میں اس نے مختلف حیلے بہانوں سے ایک طرف مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھا اور دوسری طرف ان کی جڑیں کاٹنے کے لیے اور انہیں ہندو بنانے کے لیے مختلف منصوبے بناتے رہے تاکہ ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے یہاں مسلمانوں کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم اعلان گاندھی نے اپنے اخبار ''ینگ انڈیا'' میں شائع کیا کہ:

''مسلمان، عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ ہیں جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ تین طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔

1- مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے پرانے (ہندو) دھرم پر لایا جائے۔

2- اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم (عرب) علاقے میں واپس بھیج دیا جائے۔

3- اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رعایا (غلام) بنا کر رکھا جائے۔(جب پاکستان بن رہا تھا ص 108)

کانگریس کی تحریکِ سوراج میں مسلمان نیک نیتی سے شریک رہے کیونکہ وہ بھی فرنگی راج سے نجات چاہتے تھے۔مگر ہندو سیاسی اغراض کے لیے انہیں شریک حال رکھتے تھے تاکہ انگریزوں پر واضح رہے کہ مسلمان بھی انگریزی اقتدار نہیں چاہتے اور انگریزوں کو ملک بدر کرنے میں دونوں قومیں متحد و متفق ہیں۔مگر ہندو سوراج یا آزادی حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کو شریک اقتدار نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ انہیں بھی ہندوستان سے نکالنا یا ہندو بنانا چاہتے تھے۔اس لیے انہوں نے انگریزوں کی موجودگی میں مختلف طریقوں سے اس منصوبہ میں رنگ بھرنا شروع کر دیا اور اس کا نام ''ہندو مسلم اتحاد'' رکھا۔ ہندو مسلم اتحاد کی شرائط کا اعلان 1925ء میں دستیہ دیوہری پراجک نے بمقام ساگر (متوسط ہند) کیا جس کی رو سے مسلمانوں سے تقاضا کیا گیا کہ:

1- قرآن کو اسلامی کتاب نہ سمجھا جائے۔

2- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسول نہ مانا جائے۔

3- عرب وغیرہ کا دل سے خیال نکال دیا جائے۔

4- سعدی و رومی کے بجائے کبیر تلسی داس کی تصانیف کو زیر مطالعہ رکھا جائے۔

5- اسلامی تہواروں اور تعطیلوں کے بجائے ہندو تہوار اور تعطیلات منائی جائیں۔

6- مسلمان صرف رام اور کرشن وغیرہ دیوتاؤں کے تہوار منائیں۔

7- اسلامی نام رکھنے ترک کر دیے جائیں۔

8- تمام عبادتیں عربی کے بجائے ہندی میں کی جائیں۔

ہندوؤ! سنگھٹن (اتحاد) کرو، مضبوط بنو۔اس دنیا میں طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے اور جب مضبوط ہو جاؤ گے تو یہی مسلمان تمہارے قدموں پر سر جھکائیں گے اور ہم ان سے یہ شرطیں منوائیں گے۔(اخبار وکیل امرتسر 9 دسمبر 1925ء)

تحریک پاکستان کے دوران 1937ء میں ہندوستان کے ہندو صوبوں میں کانگریسی ہندوؤں کی وزارتیں آ گئیں اور انہوں نے عنان حکومت سنبھالتے ہی اپنے لنگوٹی پوش باپوں کے نسل کشی کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ کانگریسی

وزارتوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ہندوؤں نے:

- سب سے پہلے ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان اُردو پر ہاتھ صاف کیا اور اس کی جگہ سنسکرت آمیز ہندی زبان رائج کر دی۔
- مسلمان طلبہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ گاندھی کی تصویر کی پوجا کریں اور کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو سلامی دیں۔
- بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دے کر مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنی صبح کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بجائے اس مشرکانہ نعرے سے کریں۔
- ہندو مسلم اتحاد کی یہ صورت مقرر کی گئی کہ سارے مسلمان شدہ یعنی ہندو ہو جائیں۔
- مسلم لیگ کو ختم کر کے کانگریس میں شامل ہو کر اس کی سرپرستی قبول کریں۔
- اپنی تمام اغراض اور ضروریات کے لیے ہندوؤں کے تابع رہیں۔
- اسلام کا تمسخر اُڑانے کے لیے اذانیں روک دی گئیں۔ مسجدوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے۔
- جہاں مسلمان تقاضائے ایمان کے تحت مساجد میں پہنچ کر رکوع و سجود میں مصروف ہوتے تو پیچھے سے ان پر قاتلانہ حملہ کر کے آئندہ کے لیے مسجد میں آنے سے روک دیا جاتا۔
- مساجد، مقابر اور دوسرے مقدس اور تاریخی مقامات کو حتیٰ الوسع منہدم کرنے کی کوشش کی جاتی یا ان کی بے حرمتی کی جاتی۔

اعلانیہ مسلم کشی کانگریس وزارتوں کے دور میں شروع ہوئی۔ اس دور کی مسلم کش خونریزیوں نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس سے قبل اتنا جانی و مالی نقصان مسلمانوں کو پہلے کبھی برداشت نہ کرنا پڑا تھا جو ان دو سالوں میں اٹھانا پڑا۔

کانگریسی وزارتوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل و غارت، لوٹ مار اور آتش زدگی کی ڈیڑھ سو منظّم اور سنگین وارداتیں کیں۔ ہندو غنڈے مسلح ہو کر پہلے مسلمانوں کی بستیوں اور محلوں پر بے خبری کے عالم میں لوٹ مار شروع کر

دیتے۔ پیچھے سے فوج اور پولیس پہنچ جاتی جو حملہ آوروں کے بجائے مظلوم و مجروح مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو جیل میں ڈال دیتی۔ جیسے آج کل بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم ہو رہا ہے جس میں صوبہ آسام سرفہرست ہے جس میں تین دن کے اندر پندرہ ہزار مسلمان ذبح کر دیئے گئے۔

ان انسانیت سوز حالات کی بدولت پاکستان کی نہ صرف ضرورت اور اہمیت بڑھ رہی تھی بلکہ ہندوؤں کی وحشیانہ درندگی اور بربریت پاکستان کو روز بروز قریب سے قریب تر کر رہی تھی۔ (پاکستان کی قیمت از منشی عبدالرحمٰن ص 67، 68)

نہ جھکتا ہے نہ بکتا ہے نہ ڈرتا ہے

جلوت میں قوم کی غم خواری پر ٹسوئے بہانے والے تو کئی دیکھے مگر خلوت میں اس کی حالت زار پر آنسو بہانے والا صرف یہی ایک انسان نکلا جسے قائداعظم محمد علی جناح کہتے ہیں۔ بقول خواجہ حسن نظامی: ''گاندھی جی کی جیب عمر عیار کی زنبیل ہے کہ بڑے بڑے موٹے موٹے آدمی ان کی جیب میں آ جاتے ہیں اور وہ خود بھی چھوٹی سے چھوٹی جیب میں سما جاتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو قائداعظم کو جیب میں ڈال سکے اور نہ انہوں نے انہیں جیب میں گھسنے دیا''۔

ستمبر 1942ء میں گاندھی جناح ملاقات کے دوران میں گاندھی جی نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے قائداعظم کو جل دینے کے لیے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

''مسٹر جناح! میں تو بھیک مانگنے آیا ہوں''۔

اس وقت اگر قائداعظم کے سوا کوئی اور شخص ہوتا۔ تو ممکن ہے وہ رواداری کے فریب میں آ کر موم ہو جاتا۔ مگر قائداعظم نے غیر معمولی جرأت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے گاندھی جی کی درخواست مسترد کر دی:

- ''اس قسم کی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کچھ مجھ سے نہیں مانگ رہے۔ جو کچھ مانگ رہے ہیں، وہ قوم کا ہے اور اس پر میرا کوئی حق نہیں''۔

اس جواب پر ساری ہندو قوم سٹ پٹا گئی اور اس نے جناح دشمنی میں اور

اضافہ کر دیا۔ مگر بالآخر گاندھی کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

❑ ''اسے (قائد اعظم کو) نہ کوئی خرید سکتا ہے اور نہ وطن و ملت کے خلاف استعمال کر سکتا ہے''۔ (مشاہدات و واردات از منشی عبدالرحمٰن خاں)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قائداعظم محمد علی جناح......سب سے بڑا بنیاد پرست

''غلامی کو قبول نہ کرنا اور آزادی کی بات کرنا اگر جذباتی باتیں اور بنیاد پرستی ہے تو قائداعظم سب سے بڑے جذباتی اور بنیاد پرست تھے جنھوں نے نظریہ کی بنیاد پر ایک ملک بنا ڈالا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے بڑا کوئی مسلمان نہیں تھا جو انگریزی بولتا، کوٹ پینٹ پہنتا اور سگار پیتا تھا۔ وہ ایک کھرا اور سچا مسلمان تھا جس نے مدینہ کے بعد اسلام کے نام پر بننے والی دوسری ریاست کی بنیاد رکھی۔ غلامی کو قبول کرنا اگر جذباتیت ہے تو میرا خیال ہے کہ قائداعظم بھی تھوڑے سے جذباتی تھے اور اگر یہ کہنا کہ دین کی بات کرنا بنیاد پرستی ہے تو محمد علی جناح سے بڑا بنیاد پرست پیدا ہی نہیں ہوا۔ جس نے دین کے نام پر ایک ملک بنا ڈالا۔''

(جنرل (ر) حمید گل کا انٹرویو، اشاعت خاص روزنامہ انصاف، لاہور، 9 جولائی 2003ء)

بہتان

''قائداعظمؒ کے ذہن میں کسی سیکولر پاکستان کا تصور تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولرازم کا لفظ قائداعظم کی زبان پر کبھی نہیں آیا لیکن اسلام کا نام ہزاروں بار ان کی زبان سے ادا ہوا۔ قائداعظمؒ نے قیام پاکستان سے قبل 101 بار اور قیام پاکستان کے بعد 14 مرتبہ یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہوگی، قرآن پاک ہی ہمارا قانون اور اسوۂ حسنہ ﷺ ہمارے لیے بہترین ضابطہ حیات ہے۔ قائداعظمؒ صرف بیانات تک ہی محدود نہ رہے بلکہ انھوں نے علامہ محمد اسد مرحوم کو بلا کر اسلامک ری کنسٹرکشن ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ بھی مقرر کر دیا تھا جس کا کام پاکستان کے قوانین کو

اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا۔ جو شخص عمر بھر پاکستان کو اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے کے اعلانات کرتا رہا، اسے سیکولر کہنا بہتان نہیں تو اور کیا ہے؟ (کاشف مرزا کا مضمون ''ہماری حالت بھٹکے ہوئے مسافر جیسی کیوں ہے؟'' مطبوعہ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، لاہور دسمبر 2012ء)

ایک بچے کا قرارداد پاکستان کی وضاحت کرنا

''لمبے سفر کی وجہ سے قائداعظم بیٹھے بیٹھے کچھ تھک سے گئے تھے اور موسم خوشگوار تھا۔ اس لیے ان کے اصرار پر آپ موٹر سے اترے۔ عین اس وقت جب آپ چائے پی رہے تھے، اس تقریب سے کچھ دور ایک لڑکا جس کی عمر بمشکل 9 سال ہوگی، 'مسلم لیگ زندہ باد' 'قائداعظم زندہ باد' اور 'لے کے رہیں گے پاکستان' کے نعرے لگا رہا تھا۔ یہ اسی دیہات کا ایک غریب لڑکا تھا جس کے بدن کو پھٹے پرانے چیتھڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ قائداعظم اس لڑکے کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے میزبان سے اس لڑکے کو بلانے کی فرمائش کی۔ وہ اس بچے کو بلا لایا۔ قائداعظم کے سیکرٹری سید مطلوب الحسن جو ان کے ہم سفر تھے، لکھتے ہیں کہ 'جب لڑکا آیا تو بے چارہ سہم سا گیا۔ لیکن قائداعظم نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا تو اس کی ہمت بندھی۔ قائداعظم نے اس سے پوچھا کہ تم نعرے لگاتے ہو کہ ''پاکستان لے کے رہیں گے'' مگر کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستان کس چیز کو کہتے ہیں؟ اس بچے نے ادھر ادھر دیکھا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی ضرور ہمت بندھی ہوگی۔ اس نے جواب دیا کہ ''مجھے اس کے سوا اور کچھ علم نہیں کہ جہاں ہندو ہوں، وہاں ہندوؤں کی حکومت اور جہاں مسلمان ہوں، وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے'' قائداعظم نے کہا: شاباش لاہور کی قرارداد کی اس سے بہتر اور کوئی وضاحت نہیں ہوسکتی''۔ (کردار قائداعظم از منشی عبدالرحمٰن ص 151)

اسلامی اصولوں کی بنیاد پر معاشرے کا قیام

''22 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کا لاہور میں اجلاس ہماری تاریخ کا روشن مینار اور اہم ترین سنگ میل اس لیے ہے کہ اس اجلاس میں مسلمان اکثریتی علاقوں پر

مشتمل آزاد مملکت کا مطالبہ کیا گیا تھا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے دل کی آواز تھا۔ قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان کی منظوری سے قبل اس اجلاس میں قائداعظم نے دو گھنٹوں پر محیط جامع خطاب کیا جو اُن کے سیاسی تجربے اور تاریخی مطالعے کا نچوڑ تھا۔ اپنی تقریر میں جہاں قائداعظمؒ نے یہ انکشاف کیا کہ انھوں نے گزشتہ چھ ماہ مسلمانوں کی تاریخ اور قانون کے مطالعے میں صرف کئے ہیں، وہاں یہ بھی کہا کہ انھوں نے اپنے طور پر قرآن مجید کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کا مطالبہ پاکستان قرآن مجید، مسلمانوں کی تاریخ اور قانون کے مطالعے کا نچوڑ ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی الگ شناخت، ہندو مذہب اور کلچر سے تضادات اور مسلم قومیت پر زور دیا۔ قائداعظم کی تقریر پڑھتے ہوئے ان کا ایک فقرہ میرے دل کو چھو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے اُن کے باطن سے نکلا ہوا یہ فقرہ اُن کے تصور پاکستان کا بنیادی ستون تھا۔ فقرہ کچھ یوں تھا "ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے عوام اپنی روحانی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اپنے آئیڈیلز کے مطابق بہترین انداز میں ترقی دیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندگی گزاریں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندو اکثریتی ریاست اور ہندو غلبے میں اس مقصد کا حصول ممکن نہیں تھا۔ اپنے آئیڈیلز کے مطابق کا مطلب اسلامی اصول حیات ہیں جن پر قائداعظم ہمیشہ زور دیتے رہے اور انسانی برابری، معاشی و معاشرتی عدل، مساوات اور قانون کی حکمرانی کا سبق قوم کے ذہن نشین کراتے رہے۔ اسی پس منظر میں قائداعظم نے بار بار ایمان، نظم اور اتحاد پر زور دیا اور قوم میں یہ احساس بیدار کرنے کی کوشش کی کہ اتحاد اور نظم وضبط (ڈسپلن) کے بغیر وہ اپنی منزل حاصل نہیں کر سکتے لیکن ڈسپلن اور اتحاد سے پہلے ایمان (Faith) کا مقام یا درجہ ہے کیونکہ ایمان ہی سے نظم وضبط اور اتحاد کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ مختصر یہ کہ قائداعظم کے نزدیک حصول پاکستان کا مقصد محض ایک ریاست کا قیام نہیں تھا بلکہ وہ ایسی ریاست کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں مسلمان اپنی روحانی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بلا روک ٹوک ترقی دے سکیں۔ گویا ریاست ایسا ماحول، حالات اور مواقع پیدا

کرنے کی پابند تھی جس میں زندگی کے ان شعبوں کو خوب سے خوب تر ترقی دی جا سکے۔ ذرا غور کیجیے تو احساس ہوگا کہ قائداعظم کا زور صرف مادی زندگی کی ترقی پر نہیں تھا، انھوں نے سب سے پہلے لفظ روحانی استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ روحانی ترقی کا براہ راست تعلق انسانی باطن اور انسانی مذہب سے ہے اور روحانی بالیدگی اللہ سبحانہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر ہی چلنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس راستے کے موٹے موٹے اصول رزق حلال، احترام انسانیت، حسن اخلاق، خدمت، ایمانداری، عدل وانصاف اور خوفِ الٰہی ہیں۔ گویا قائداعظم کے بیان کردہ اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پاکستان میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر معاشرے کا قیام ناگزیر تھا۔ ذرا سوچیے کہ کیا ہم ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ اگر کامیاب نہیں ہوئے تو اس کی وجوہ کیا ہیں؟''

(ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم، 23 مارچ 1940ء، مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 23 مارچ 2018ء)

جھوٹ کی یلغار

''اسکالرز اور محققین کا رویہ ملاحظہ فرمایئے کہ ڈاکٹر مبارک علی نے قرارداد پاکستان کا مصنف سر ظفر اللہ خان کو قرار دے کر جھوٹ بولا کیونکہ خود سر ظفر اللہ خان 25 دسمبر 1981ء کو ولی خان کے حوالے سے اس کی تردید کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرارداد پاکستان کو منانے کا سلسلہ قیام پاکستان کے کئی سال بعد شروع ہوا، اُن کی لاعلمی کا شاہکار تھا۔ اس سے اُن کی تحقیق کے معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انھوں نے مجیب الرحمٰن شامی کے ساتھ ٹیلی وژن پروگرام میں لاکھوں ناظرین کے سامنے فرمایا کہ اگر وہ 46-1945ء کے انتخابات کے وقت دنیا میں موجود ہوتے تو قیام پاکستان کے خلاف ووٹ دیتے۔ یہی بات ہندوستان یاترا کے دوران الطاف حسین نے کہی تھی اور اب ان کے ''را'' سے تعلقات کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ رہے ولی خان تو وہ غفار خان کے سوانح نگار پیارے لال کے بقول جب کانگریس نے غفار خان سے بالا بالا تقسیم ہند کا منصوبہ منظور کر لیا تو باچا خان نے کہا تھا کہ ''آپ نے ہمیں بھیڑیوں (Wolves) کے سپرد کر دیا ہے''۔ باچا خان کو بہرحال یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انھوں

نے اس سرزمین میں دفن ہونے سے انکار کر دیا۔ اُن منافقین کو آپ کیا کہیں گے جو اس ملک کا نمک کھاتے اور اس کی مخالفت ببانگ دہل کرتے ہیں۔ حیرت ہے ان عالم و فاضل حضرات پر جو ان تمام حقائق کو جاننے کے باوجود ایسے عناصر کی تعریف اور خوشامد میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ اتوار کے روزنامہ جنگ میں ایوب ملک کا خصوصی مراسلہ پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کیا پاکستان کی کانوں سے نکلنے والا نمک بے تاثیر ہو چکا ہے۔ سر ظفر اللہ نے قرارداد پاکستان سے تعلق کی 36 برس قبل تردید کر دی تھی لیکن مراسلہ نگار مبارک علی کی 'محبت' میں ابھی تک یہ کریڈٹ سر ظفر اللہ کو دینے پر بضد ہیں۔ غلطی کو تسلیم کرنے کے لیے حوصلے اور ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوستو! چھوٹے موٹے حادثات اور سانحات کو چھوڑو۔ ہماری اصل ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارے معاشرے سے سچ کا نور اٹھتا جا رہا ہے اور جھوٹ کی تاریکی پھیلتی جا رہی ہے''۔ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم ''جھوٹ کی یلغار'' مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور 18 اپریل 2017ء)

آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی

قرارداد لاہور اور ظفر اللہ خاں قادیانی

''قرارداد لاہور (پاکستان) کی عظمت کو ٹھیس لگانے کے لیے خان ولی خان اور ڈاکٹر مبارک علی دعویٰ کرتے ہیں کہ وائسرائے لنلتھگو نے قرارداد لاہور سر ظفر اللہ سے لکھوائی اور قائداعظم کو دے دی۔ جنھوں نے 23 مارچ 1940ء کے اجلاس میں مسلم لیگ سے منظور کروا دی۔ اس سے بڑا جھوٹ شاید ہی کبھی تاریخ کے نام پر بولا گیا ہو۔ قرارداد پاکستان کا اصلی مسودہ کراچی یونیورسٹی کے ریکارڈ میں محفوظ ہے اور اس میں کوئی چودہ پندرہ ترمیمات اور اضافے کئے گئے تھے جنھیں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایک اضافہ قائداعظم نے خود کیا تھا۔ پس منظر کے طور پر ذہن میں رہے کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے 21 مارچ 1940ء کو قرارداد ڈرافٹ کرنے کے لیے کمیٹی تشکیل دی تھی جو گھنٹوں قرارداد پہ کام کرتی رہی۔ بنیادی ڈرافٹ پنجاب کے پریمیئر سر سکندر حیات نے تیار کیا تھا جس میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں اراکین کمیٹی نے کیں۔ سر سکندر حیات نے گیارہ

مارچ 1941ء کو پنجاب قانون ساز اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے بتایا کہ قرارداد پاکستان کا بنیادی ڈرافٹ انھوں نے تیار کیا تھا لیکن اس میں اتنی زیادہ تبدیلیاں کی گئیں کہ اس کی شکل ہی بدل گئی۔ مسلم لیگی قیادت نے کبھی اس کی تردید نہیں کی۔ اس حوالے سے سر ظفر اللہ خان کا اپنا بیان اہم ہے جو 21 دسمبر 1981ء کو اخبارات میں چھپا۔ قرارداد پاکستان کی منظوری کے 41 برس بعد انٹرویو دیتے ہوئے سر ظفر اللہ نے وضاحت کی کہ ان کا قرارداد پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی ان کی تیار کردہ کوئی قرارداد قائداعظم قبول کرتے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ سر ظفر اللہ خان قرارداد لاہور لکھنے کی تردید کر چکے ہیں اور ہم اسے ان کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال کی بنیادی وجہ لاعلمی اور تحقیق سے دوری ہے۔ اس لیے میری دردمندانہ گزارش ہے کہ تاریخ مسخ کرنے والوں سے ہوشیار رہیں اور بلا تحقیق نہ لکھا کریں کیونکہ اس سے ہماری نوجوان نسلیں گمراہ ہوتی ہیں۔'' (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم، تاریخ پاکستان کو مسخ کرنے کی سازش مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 30 مارچ 2018ء)

قائداعظم کے جنازے سے سردمہری کا مظاہرہ

''اگر قادیانیوں کے خلاف سب امت ایک ہو چکی تھی تو قائداعظم کو کیوں اس بات کا پتہ نہیں چلا؟ یہ سوال بہت ہی اہم اور ضروری ہے جس کا جواب ماضی کے منظرنامے کو سمجھے بغیر حل کرنا ممکن نہیں...... عام مسلمان اس سلسلے میں اکثر اوقات پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ قادیانی واقعی اگر متفق علیہ غیر مسلم تھے تو قائداعظمؒ نے ظفر اللہ خان قادیانی کو کیوں وزیر خارجہ بنایا؟ یہ سوال واقعی کوئی حیرت افزا نہیں کہ اس کا جواب مشکل ہو۔

ذہن میں رہے کہ ملک آزاد ہونے پر انڈیا اور پاکستان دونوں کی مصلحت اور عہد نامہ سے طے کیا گیا تھا کہ کچھ عرصہ سابقہ انگریزی حکومت کے ایک ایک آدمی کو اپنی اپنی حکومت کو چلانے اور انتظامی امور کی رکھوالی کے لیے رکھا جائے گا۔ انڈیا باوجود اس کے کہ کانگریس ہمیشہ انگریزوں کے خلاف رہی تھی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل بنایا اور پاکستان میں ظفر اللہ خان قادیانی کو۔ یہ محض اس لیے کیا گیا کہ وہ انگریزوں کے

منتخب کردہ آدمی تھے، اس لیے نہیں کہ قائداعظمؒ ظفر اللہ قادیانی کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو ظفر اللہ خان قائداعظمؒ کے جنازے سے سرد مہری کا مظاہرہ نہ کرتا جو اس نے جنازہ نہ پڑھ کر کیا"۔

(Good اور Bad پروپیگنڈا کرنے والا طبقہ، از مولانا سہیل باوا، صفحہ 34)

جب تک اقلیتیں ملک کے ساتھ وفادار رہیں!

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 11 اکتوبر 1947ء کو کراچی میں سول، بحری، بری اور فضائی افواج کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

- "جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے، میں اس امر کا پرزور اعادہ کروں گا کہ ہم اس سلسلے میں طے شدہ حکمت عملی پر ہی کاربند رہیں گے۔ ہم پاکستان میں اقلیتوں کی جان اور ان کے مال کی حفاظت کرتے رہیں گے اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کریں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ انہیں پاکستان سے چلے جانے پر مجبور کیا جائے اور یہ کہ جب تک وہ ملک کے وفادار رہیں، ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے گا جو دوسرے شہریوں کے ساتھ کیا جائے گا۔" (قائداعظم: تقاریر و بیانات جلد چہارم از اقبال احمد صدیقی ص 379)

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"As regards the Government of Pakistan, I again reiterate with all the emphasis at my command that we shall pursue our settled policy in this respect and we shall countinue to protect the life and property of minorities in Pakistan and shall give them a fair deal. We do not want them to be forced to leave Pakistan and that so long as they remain faithful and loyal to the State they shall be entitled to the same treatment as any other citizens."

(Muhammad Ali Jinnah: Speeches and Statements 1947-1948 Ministry of Information & Broadcasting, Islamabad Edl: 1989 P:78)

بلاعنوان

’’محترم ضمیر نیازی نے اپنی کتاب میں ایک چوتھائی سچ بیان کیا تھا جسے بلاتحقیق بار بار بیان کر کے سچ بنا دیا گیا ہے۔ تواتر سے کہا جا رہا ہے کہ قائداعظم کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر سنسر کی گئی تھی۔ دوستو! صرف اتنا سوچو کہ اس وقت قائداعظم عملی طور پر پاکستان کے سربراہ تھے، وہ بابائے قوم اور بانی پاکستان تھے۔ ان کی شخصیت کی سچائی کے سامنے کسی کو دَم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ کیا ان حالات میں کوئی ان کی تقریر سنسر کرنے کی جسارت کر سکتا تھا؟ توپ سے مکھی مارنے والے شاید قائداعظم کے وقار اور کردار کے دبدبے سے آگاہ نہیں۔ اگر ان کا دعویٰ مان لیا جائے تو مجھے صرف اتنا بتائیں کہ پھر دستور ساز اسمبلی (DEBATES) میں گیارہ اگست کی کارروائی میں قائداعظم کی تقریر من وعن کیسے شائع ہوئی؟ اگر آپ قائداعظم کی تقاریر کے مجموعے دیکھیں تو ان میں یہ مکمل تقریر مختلف اخبارات سے لے کر شامل کی گئی ہے۔ اگر اس وقت بارہ اور تیرہ اگست 1947 کے اخبارات میں مکمل تقریر چھپی تھی تو پھر سنسر کے دعوے کا کیا مطلب؟ میں نے اس بیانیے کی تحقیق کی تو پتا چلا کہ چند ایک مسلم لیگی زعما کو اس تقریر کے حوالے سے کچھ خدشات اور تحفظات تھے۔ جب ایک انگریزی اخبار کے مدیر کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ میں اسے قائداعظم کے نوٹس میں لاتا ہوں۔ پھر اس کے بعد اس خواہش کے چراغوں میں روشنی نہ رہی، وہ حضرات جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ کس کی مجال تھی کہ قائداعظم کی تقریر کو سنسر کرتا۔‘‘ (ڈاکٹر صفدر محمود کا کالم، دل پھر طواف کوئے ’’صداقت‘‘ کو جائے ہے مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 13 اپریل 2018ء)

’آل انڈیا مسلم لیگ‘ کی قیام پاکستان کی تحریک

مغرب کے آلہ کار عناصر قیام پاکستان کے وقت سے مقاصد پاکستان کے حوالے سے اعتراضات، مغالطوں، گمراہ سوچ کی گرد و غبار اڑا رہے ہیں اور قائداعظمؒ کی ایک تقریر کو غلط طور پر بنیاد بنائے ہوئے ہیں، حالانکہ اس کی وضاحت میں سینکڑوں تحریریں صفحات قرطاس پر جلوہ گر ہو چکی ہیں۔ اس کا بے حد مسکت اور ناقابل تردید

جواب ہفت روزہ 'ندائے خلافت' نے اپنے ٹائٹل پیج پر آل انڈیا مسلم لیگ کے رکنیت فارم کا عکس شائع کر کے دے دیا ہے جس کے بعد اصولی طور پر اس بحث کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ رکنیت فارم کا متن یوں ہے:

لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ

یایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود (المائدہ:1)

میں مسلم لیگ کا ممبر ہونا چاہتا ہوں اور بحیثیت مسلمان اقرار کرتا ہوں کہ

(1) میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نصب العین ''آزاد ہندوستان کے ساتھ آزاد ملت اسلام'' یعنی براعظم ہند میں، اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ مدراس کی تصریحات کے مطابق آزاد مسلم وطنوں کی تعمیر اور قومیت ملت اسلامیہ، ہند کے کامل استقلال و آزادی کے قیام اور مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی سارے براعظم ہندوستان کے اندر ملکی حفاظت پر عقیدہ رکھتا ہوں۔

(2) میں ملت اسلامیہ ہند کو براعظم ہند کے اندر ایک مستقل قومیت یقین کرتا اور فکر اسلامی کا مسلک قبول کرتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ تمام فکروں پر فکر اسلامی کو اور تمام مفادوں پر مفادِ اسلامی کو اور تمام وفاداریوں پر وفاداریٔ اسلام کو برتر، غالب و مقدم رکھوں گا۔

(3) میں مسلم لیگ کے اصول، اغراض و ضوابط کے ماتحت لیگ کے فیصلوں اور حکموں کی پوری تائید کروں گا اور لیگ کے پروگراموں کی کامیابی کے لیے خلوص سے کام کروں گا۔ (وما توفیقی الا باللہ)

دستخط (پورا نام) ممبر.................................

رکنیت فارم کی اس عبارت کو اگر بغور پڑھا یا سن لیا جائے تو کسی ناخواندہ کو بھی یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ آل انڈیا مسلم لیگ یا قائداعظم کے پیش نظر کیا مقاصد تھے، تمام فکروں پر فکرِ اسلامی، تمام مفادوں پر مفادِ اسلام اور تمام وفاداریوں پر وفاداریٔ اسلام کو برتر، غالب اور مقدم رکھنے کا عہد کس نظریہ کا غماض ہے۔

افسوس کہ مسلم لیگ کے لیے یہ میثاقِ رکنیت ایک بھولا ہوا سبق بن گیا، ذاتی

اور سیاسی مفادات نے برتر، غالب اور مقدم حیثیت حاصل کر لی، حالانکہ قیام پاکستان نے اس عہد کو عملی شکل دینے کی راہ ہموار کر دی تھی۔ مسلم لیگ بلاشبہ اس حوالے سے مجرمانہ غفلت کا شکار ہوئی ہے۔ (اسرار بخاری کا کالم 'آل انڈیا مسلم لیگ' کی قیام پاکستان کی تحریک مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۔ 26 مئی 2013ء)

پاکستان......معجزہ نبی آخرالزماں ﷺ

معجزے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے مخصوص ہیں۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ایک اعزاز و امتیاز یہ بھی ہے کہ وصال کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا ظہور جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے بے پناہ محبت کرنے والے مسلمانانِ برصغیر نے جس بے سروسامانی کے عالم میں حصولِ پاکستان کی تحریک چلائی، انگریز ہندو گٹھ جوڑ کے باوجود قیامِ پاکستان کی شکل میں اس کا کامیاب ہو جانا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ایک زندہ معجزہ ہے...... **اَللّٰھُمَّ صَلِ وَعَلٰی آلِ وَاَصحَابِ وَسَیِّدنَا مُحَمَّدO**

ہر طلوعِ صبح ہے اس معجزے کی یادگار
جو بشکلِ مُلک پاکستاں ہے عالم آشکار
تفرقے کی دشت میں گم کردہ راہ و منتشر
ہم کروڑوں بے وطن تھے سر زمینِ ہند پر
دو بلائیں کر رہی تھیں سعی وحدت رائیگاں
سایہ افرنگ اور سرمایہ ہمسائیگاں
کون تھا جو دامِ صیادی سے وابستہ نہ تھا
کوئی آزادی کا تھا رستہ؟ کوئی رستہ نہ تھا
چُپ لگی تھی، گونگے بہرے تھے، ہزیمت خوردہ تھے
چِیل کوّے ہم پہ تھے سایہ فگن، ہم مردہ تھے

مل گئی کیوں رستگاری گیسوئے اضام سے
ہو گئی وابستگی کیوں غیرتِ اسلام سے
آج کیوں لاکھوں کروڑوں شاد ہیں، آباد ہیں
اک وطن کے مالک و مختار ہیں، آزاد ہیں
ہاں! یکے از معجزاتِ رحمۃً للعالمیں
معجزہ ہم، بخت بیداروں نے دیکھا ہے یہیں
معجزہ، مومن کے لب پہ مصطفیٰ ﷺ کے نام کا
معجزہ، دینِ مُبیں کا، معجزہ، اسلام کا
روح، جسم مردگاں میں بھرنے والا معجزہ
کارِ ناممکن کو ممکن کرنے والا معجزہ
مردِ مومن جس کے دل میں نور تھا، ایمان کا
کر رہا تھا آج وہ اعلان پاکستان کا

(ابوالاثر حفیظ جالندھری مطبوعہ ماہنامہ ہلال راولپنڈی گولڈن جوبلی نمبر پاکستان 99-1998)

قائداعظم اور سیکولر حضرات

سیکولر حضرات مذہب اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا پرچار کرتے ہیں اور پھر قائداعظم پر سیکولرازم کا لیبل چپکا دیتے ہیں۔ میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ سیاسی و ذاتی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال اور خاص طور پر ایسے مذہبی نعروں کا استعمال جو بذات خود مذہبی اصولوں کو پامال کرتے ہیں، نہایت افسوس ناک امر ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سیاست کو اسلامی اور اخلاقی اصولوں سے ماورا کر کے مادر پدر آزاد قرار دے دیا جائے جس طرح کئی مغربی ممالک میں ہو رہا ہے جہاں ہم جنسی کو قانونی اجازت دینے کا سلسلہ جاری ہے، وغیرہ وغیرہ۔!! اس مسئلے کی جڑ یا بنیاد فقط اتنی سی ہے کہ سیکولر حضرات اسلام کو مکمل ضابطہ حیات نہیں مانتے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کا تعلق صرف ہماری نجی زندگی سے ہے، نہ کہ قومی زندگی سے۔ 25 دسمبر کو

ایک ٹی وی چینل (جیو نہیں) کے مذاکرے میں میرے ساتھ ایک سیکولر دانشور تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے ببانگ دہل قرآن وسنت کی حدود سے ماورا اور بلند ہو کر قانون سازی اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا۔ جبکہ میرا مؤقف تھا کہ ہماری قانون سازی اور اجتہاد اسلامی اصولوں کے تابع ہے۔ دراصل یہی ایک بنیاد تھی مطالبہ پاکستان کی اور اسی مقصد کے حصول کے لیے مسلمانان ہند نے تاریخی قربانیاں دیں، ورنہ تو متحدہ ہندوستان میں بھی زندہ رہا جا سکتا تھا اور زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم بار بار اسلامی طرز حیات اور دستور کی اسلامی اصولوں پر بنیاد کی بات کرتے تھے اور اس جمہوریت کا ذکر کرتے تھے جو ہم نے چودہ صدیاں قبل سیکھی تھی۔ گویا بنیادی فرق یہ ہوا کہ سیکولر حضرات اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم نہیں کرتے اور وہ اقبال کے اس مصرعے کی زد میں آتے ہیں کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی، جبکہ قائداعظم اسلام کو مکمل ضابطہ حیات مانتے تھے۔

اس ضمن میں قائداعظم کی ایک تقریر کے چند فقرے آنکھیں کھول کر پڑھیئے اور ان پر غور کیجیے:

"...You can not separate the Muslim League from Islam. Islam gives us a complete code. It is not only religion but it contains laws, philosophy and politics. When we talk of Islam we take it as an all embracing word.."

(قائداعظم کی تقریر، یکم جنوری 1938ء، مرتبہ خورشید احمد خان یوسفی، جلد دوم، ص 691)

اب پس منظر میں قائداعظم کے اس انٹرویو کو پڑھیے:

"...The Constitution of Pakistan has yet to be framed by the constituent Assembly. I am sure that it will be of democratic type, embodying the essential principles of Islam."

(بحوالہ یوسفی، جلد چہارم، ص 2694)

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میری تحقیق کے مطابق قائداعظم نے پاکستان کے حوالے سے کبھی سیکولر کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ بار بار اسلامی ریاست کا ذکر کیا۔ اس لیے خدارا! قائداعظم کو معاف کر دیں اور ان کے منہ میں وہ الفاظ نہ ڈالیں جو انھوں نے کبھی نہیں کہے اور ان پر وہ لیبل نہ لگائیں جس سے ان کے خیالات اور وژن کی نفی ہوتی ہو۔ (پاکستان میری محبت از ڈاکٹر صفدر محمود)

قائداعظمؒ ہرگز منافق نہیں تھے

''آزادی کی اکہتر ویں سالگرہ مناتے ہوئے بعض حلقے آج بھی یہی سوال کرتے ہیں کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کیسا پاکستان بنانا چاہتے تھے؟ ان کا تصور پاکستان کیا تھا اور کیا ہم اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے؟ قیام پاکستان کے اسباب، پس منظر، برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیاں اور کرۂ ارض کے سینے پر ابھرنے والی نئی ریاست کے خلاف مقامی اور عالمی سازشیں پوری طرح واضح اور سامنے ہوں تو یہ سوال بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے قائداعظم کی بے مثال قیادت میں کس قسم کے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی۔ مسلم قومیت کو پاکستان کے قیام کی بنیاد قرار دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ یہاں اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق زندگی گزارنا مقصود تھا، لیکن اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان ہند کی تحریک آزادی میں اسلام ایک بنیادی نظریے کی حیثیت سے شامل تھا اور جب ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ پورے برصغیر جنوبی ایشیا میں گونجا تو قیام پاکستان کی تحریک میں بجلی کی سی چمک اور تیزی پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ کہ 1940ء کی قرارداد لاہور (جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا) کے صرف سات سال کے عرصے میں مدینہ منورہ کے بعد دنیا میں اسلامی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں کی دوسری سلطنت وجود میں آ گئی۔ اس سے زیادہ وطن عزیز کی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ستر سال گزرنے کے بعد بھی خود پاکستان میں مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے بہت سے نام نہاد دانشور قائداعظم محمد علی جناح کی گیارہ اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی میں کی جانے

والی تقریر کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے کہ بانی پاکستان اس ملک کو سیکولرازم کی بنیاد پر چلانا چاہتے تھے۔ اسلام اور پاکستان دشمنی پر مبنی اس تصور کا پرچار کرنے میں حیرت انگیز طور پر کراچی کا وہ انگریزی معاصر ہمیشہ پیش پیش نظر آتا ہے جو اپنے صفحہ اول کی پیشانی پر قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر سجا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس اخبار کی بنیاد قائداعظم نے رکھی تھی۔ اس اخبار کی جسارت کا عالم یہ ہے کہ اس نے یوم آزادی سے ایک روز قبل اپنے ادارتی نوٹ میں ایک بار پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بابائے قوم محمد علی جناح پاکستان کی اقلیتوں کو مسلمان شہریوں کے برابر حقوق دینا چاہتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ریاستی معاملات کو مذہبی اصولوں سے ہٹ کر چلانے کے قائل تھے۔ نظریہ پاکستان کے یہ مخالفین محض ایک تقریر کی بنیاد پر قائداعظم محمد علی جناح کو ایک سیکولر سیاستدان اور راہنما ظاہر کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے اس حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے ہیں کہ بانی پاکستان نے اپنی کسی تقریر میں ایک مرتبہ بھی سیکولرازم کا لفظ استعمال نہیں کیا، جبکہ ان کی تقریباً تمام تقریروں میں اسلام کا حوالہ لفظی ومعنوی طور پر بالکل واضح دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مسلمانوں کا جو قتل عام کیا گیا تھا، اس تناظر میں بھارت کے انتہا پسند اور جنونی ہندوؤں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ پاکستان میں کسی ایک ہندو کو بھی شاید زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ ہندوؤں کے اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے پیش نظر قائداعظم محمد علی جناح کے لیے ضروری تھا کہ وہ پاکستان کی اقلیتوں کو تحفظ اور برابر کے شہری ہونے کا احساس دلائیں، جس کی بنیاد پر دین بیزار عناصر نے قائداعظم کو سیکولر راہنما کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا اور ستر برسوں کے بعد بھی آج تک وہ اسی تاثر کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔

گیارہ اگست **1947**ء سے قبل نومبر **1945**ء میں قائداعظم نے کہا تھا کہ مجھے آپ کے اس سوال پر سخت افسوس ہوا کہ پاکستان میں کون سا قانون لاگو ہوگا۔ ہمارا ایک اللہ، ایک رسولؐ اور ایک کتاب ہے۔ یہی مسلمانوں کا قانون ہے۔ اور بس۔ اسلام

پاکستان کے قانون کی بنیاد ہوگا اور وہاں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا۔ پھر چودہ فروری 1947ء کو شاہی دربار سبی بلوچستان میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے ارشاد فرمایا ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے، جو ہمیں قانون عطا کرنے والے عظیم پیغمبر اسلام (حضرت محمد ﷺ) نے دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں''۔ فروری 1948ء میں مسلمانوں سے خطاب میں نہیں، بلکہ امریکی عوام کے نام اپنے ریڈیو پیغام میں آپ نے فرمایا: ''مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا آئین جمہوری قسم کا ہوگا، جسے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق تشکیل دیا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی عملی زندگی پر اسی طرح لاگو ہوتے ہیں، جس طرح تیرہ سو سال قبل ہوتے تھے۔ ہم اسلام کی مساوات اور انصاف پر مبنی شاندار روایات کے امین اور وارث ہیں اور دستور سازی میں انھی سے راہنمائی حاصل کی جائے گی''۔ قائداعظم نے متعدد مواقع پر واضح کیا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی جائے گی، وہ سازشی اور منافق ہیں۔ بانی پاکستان کے ایسے سینکڑوں بیانات کے باوجود اگر کوئی انھیں سیکولر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو وہ مسلمان ہونے کے باوجود منافق قرار پائے گا۔ جبکہ یہ بات اٹل ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح میں کوئی اور کمزوری یا خامی ہو سکتی تھی، لیکن ان کا بدترین دشمن بھی انھیں منافق کہنے کی ناپاک جسارت نہیں کر سکتا''۔

(اداریہ: روزنامہ امت کراچی، 14 اگست 2018)

جناح کے سوا کوئی مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں

''علامہ ان دنوں بیمار تھے، صاحب فراش تھے، اپنے احباب سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ''بات یہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں پارلیمانی طرز حکومت کے نام پر اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کر رہا ہے۔ جناح اس جال کی ایک ایک گرہ سے واقف ہے۔ وہ بیچارہ صرف یہ کہتا ہے کہ مسلمان اس نظام حکومت کے ماتحت کہیں خسارہ نہ اٹھائیں، اس لیے وہ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں آپ کو ہوشیار ہو جانے کی تلقین کرتا ہے''۔ قائد

اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں کانگریسی وزارتوں کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''بندے ماترم مسلم دشمن ترانہ ہے۔ بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے اور یہ مسلمانوں کے خلاف نعرۂ جنگ ہے''۔ علامہ کو جب اخبار میں قائداعظم کا بیان پڑھ کر سنایا گیا تو بہت خوش ہوئے۔ فرمایا ''مسلمانوں کو چاہیے جناح کے ہاتھ مضبوط کریں۔ لیگ کامیاب ہوگی تو صرف جناح کے سہارے...... اس کے سوا کوئی مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں''۔ (بحوالہ اقبال اور قائداعظم از پروفیسر احمد سعید، اقبال اکادمی پاکستان)
(اقبال، جناح اور مذہبی کارڈ از ڈاکٹر صفدر محمود مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 11 اکتوبر 2019ء)

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

چوہدری رحمت علی کی برسی اور لفظ ''پاکستان''

''میں چوہدری رحمت علی کی قبر کے سرہانے کھڑا قرآنی آیات پڑھ رہا تھا تو مجھے اُن کی انگریز سیکرٹری کا بیان یاد آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی انگریز سیکرٹری کو نہ پاکستان سے کوئی غرض تھی نہ الفاظ کو توڑنے موڑنے کی ضرورت تھی اور پھر یہ بیان بھی چوہدری صاحب کے انتقال کے کئی برس بعد کا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ چوہدری صاحب جب ہندوستان کی تقسیم اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے عشق میں مبتلا ہوئے تو وہ دن رات اس کے نام پر غور کرنے لگے۔ بقول چوہدری رحمت علی کہ انہوں نے اس مقصد کے لیے مراقبے کیے، نمازوں کے بعد نوافل پڑھ کر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے راہنمائی مانگتے رہے اور پھر ایک دن اُن کے ذہن پر لفظ پاکستان (Pakistan) اُبھرا جسے انہوں نے حکمتِ الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا۔ اُن کی سیکرٹری کے بقول اُس وقت چوہدری صاحب ڈبل ڈیکر بس کی اوپر والی منزل پر محوِ سفر تھے اور گہری سوچ میں گم تھے۔ شاید یہ واقعہ 31-1930ء کا ہے کیونکہ 1931ء میں علامہ اقبالؒ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن میں موجود تھے جہاں چوہدری صاحب اور خواجہ عبدالرحیم اُن سے ملے اور پاکستان اسکیم سے اُن کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رُود میں لکھا ہے کہ

اقبال نے کہا لفظ پاکستان کے حروف علیحدہ علیحدہ لکھ کر میرے بستر کے اردگرد رکھ جائیں تا کہ اس پر غور کر سکوں۔ (صفحہ 514) میں نے لندن میں دیے گئے اس ''ڈنر'' کی تصویر بھی دیکھی ہے جو چوہدری رحمت علی نے گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین کے اعزاز میں دیا اور جس میں قائداعظم اور علامہ اقبال بھی تشریف فرما ہیں۔ تمام تر مساعی کے باوجود مسلمان لیڈر اُس وقت تک، نہ پاکستان کے لفظ کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے نہ علیحدہ آزاد مسلمان مملکت کے قیام کا مطالبہ کرنے کے لیے۔ سر آغا خان نے سلیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں اس اسکیم کی خوب مخالفت کی تھی اور مسلم لیگی لیڈران بھی اسے طالب علموں کی اسکیم سے زیادہ وقعت اور اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دو تین برس تک لیڈران سے ملاقاتیں کرنے کے بعد چوہدری رحمت صاحب نے پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد رکھی اور بالآخر 28 جنوری 1933ء کو 3 ہمبر سٹون روڈ کیمبرج سے ''ناؤ آر نیور'' نامی کتابچہ شائع کیا جس میں ٹھوس دلائل کے ساتھ پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ''ہمیں زندہ رہنا ہے یا ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانا ہے'' کے الفاظ سے شروع ہونے والا کتابچہ پاکستان کے حصول کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے زندگی و موت کا مسئلہ قرار دیتا ہے۔ بعینہٖ یہ بات ہمیں قائداعظم کی اَن گنت تقاریر میں ملتی ہے جو انہوں نے قراردادِ پاکستان کے بعد مختلف مقامات پر کیں''۔

(چوہدری رحمت علی کی برسی اور لفظ پاکستان از ڈاکٹر صفدر محمود مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 11 فروری 2020ء)

قائداعظم مسلمانوں کے بہترین جرنیل

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحبؒ نے فرمایا:

''کوئی دانشمند اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا ایک مرکز پر مجتمع ہونا ضروری تھا تو اب فرض ہے کیونکہ اس ملک میں مسلمانوں کی قومی بقا بغیر اس کے محال ہے، لیکن مسلمانوں کی چند جماعتیں اور افراد اس نظم و اجتماع میں شریک ہونے سے اس لیے رکے ہوئے ہیں کہ ان کو قائدین مسلم لیگ پر کچھ اعتراضات ہیں۔

اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ناگزیر ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر ہونا اور شئے

ہے اور امارتِ شرعیہ اور چیز ہے۔ بہت سے شبہات تو اس جگہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک انجمن کے قائد کو اصلاحی اور شرعی امیر قرار دے کر اس کے احکام اس پر نافذ کر کے اس کے تمام شرائط اس میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی جنگ آزادی کا ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائد اعظم محمد علی جناح کو قائد تسلیم کیا گیا ہے، نہ کہ اس حیثیت سے کہ وہ مفتی ہیں، ان سے حلال وحرام کا فتویٰ لیا جائے گا، نہ وہ کوئی پیر ومرشد ہیں۔ ان کی قیادت تو مسلمانوں نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ اس وقت انھیں انگریز اور ہندوؤں سے مقابلہ درپیش ہے، انگریز اور ہندو ان سے متصادم ہیں، انگریز اس وقت بین الاقوامی مقتضیات کی بنا پر چیخ اور پکار کی بنا پر ہندوستان کو آزادی دینا چاہتا ہے اور ہندو اکثریت بے شمار دولت وثروت کے بل بوتے اس علاقہ کی تنہا مالک بننا چاہتی ہے، اور دس کروڑ مسلمانوں کے گلے میں طوق غلامی چاہتی ہے، اس لیے یہ جدل ہماری ہے، جنگ کوئی توپ وتفنگ کی تو نہیں، بلکہ آئین وقانون کی ہے۔

ادھر بالاتفاق موافق ومخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ میں قائد اعظم محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف مسلم قوم بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں ہے، کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ وہ قوم اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے تامل کرے کہ اس میں تقویٰ وطہارت کی کمی پاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تقویٰ و طہارت اسلام کا مقصودِ اعظم ہے، اگر مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے متقی و پارسا میسر آئیں تو بلاشبہ سعادت کبریٰ ہے لیکن اگر اس کام کے لائق متقی موجود نہ ہوں تو غیر متقی سے کام لے لینا اس فسق و فجور کے دور میں ہی نہیں، بلکہ خیر القرون میں بھی حرام نہ سمجھا گیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''السیاسۃ الشرعیہ'' میں لکھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ سے آپ کے کسی صوبہ دار نے دریافت کیا کہ دو فرد ہیں، پہلا فرد غیر متقی ہے، لیکن وہ اپنے فن کا ماہر ہے، جب کہ دوسرا فرد پرہیز گار ہے لیکن وہ ماہر فن نہیں ہے، آپ فیصلہ کریں کہ عہدے کا مستحق کون ہے، آپ نے فرمایا:

''پہلے فرد کی قوت مسلمانوں کے کام آئے گی اور اس کے اعمالِ قبیحہ کی خرابی اس کی ذات کی ہوگی، متقی کا تقویٰ اس کے کام آئے گا، اس لیے غیر متقی کا انتخاب ہونا چاہیے''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عقلی و شرعی حیثیت سے کارگر اس کو ٹھہرایا جو کام کی پوری اہلیت رکھتا ہو، اس کے ساتھ اگر تقویٰ و طہارت بھی ہو تو سبحان اللہ، ورنہ شرط اول کا لحاظ مقدم ہے۔ (پاکستان ایک نعمت ہے ص 11 تا 12، محمد علی جناح، ایک اسلامی مطالعہ از نوراللہ رشیدی)

ایک فرد ناتواں آیا تواں دے کر گیا
قوم کو بے تابی عزم جواں دے کر گیا
جادۂ آزادی گم گشتہ کا پا کر سراغ
رہرووں کو منزل نو کا نشاں دے کر گیا
ابر رحمت کی برسا وطن کی خاک پر
اس زمیں کو اعتبار آسماں دے کر گیا

ایم ایس طوسی اور قائداعظم کی لائبریری

ایم ایس طوسی صاحب نے "My Reminiscences" کے نام سے قائد اعظم کے ساتھ نومبر 1924ء سے مئی 1943ء تک اپنے انٹرویوز اور مکالمات کو جمع کیا ہے۔ وہ قائداعظم کی لائبریری کے بارے میں لکھتے ہیں:

❑ ''آپ کے پاس اپنی لائبریری میں اسلامی تاریخ، سیرت رسول اللہ ﷺ اور دیگر عظیم شخصیات کے موضوعات پر کتابیں ہیں، آپ نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی کتاب ''الفاروق (خلیفہ حضرت عمرؓ) کا مطالعہ کیا تھا جس کا انگریزی ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ آپ اس کتاب کا دوسرا حصہ پڑھنا چاہتے تھے جو خلیفہ عمرؓ کی اصلاحات اور انتظامی امور سے متعلق تھا لیکن اس کا انگریزی ترجمہ دستیاب نہ تھا۔ اپنے فارغ اوقات میں آپ قرآن کریم کا ترجمہ پڑھتے جو علامہ یوسف علی نے کیا تھا اور آپ سید امیر علی کی "The Spirit of Islam" کا مطالعہ فرماتے۔ آپ کی خواہش تھی کہ انگریزی

زبان میں اسلام کے تمام مذہبی اور سیاسی ادب کا مطالعہ کر لیں لیکن ہمیشہ ان کو وہ کتب انگریزی میں دستیاب نہ ہوتی تھیں جن کا وہ مطالعہ کرنا چاہتے تھے“۔

(My Reminiscences of Quaid-e-Azam by M.S Toosy Page 18,19)

قائداعظم اور حضرت عمر فاروقؓ کا نظامِ حکومت

قائداعظم کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان میں حضرت عمر فاروقؓ کے دور کا نظام حکومت قائم ہو، قائداعظم نے ایسے عناصر جو پاکستان کے بدخواہ تھے، مخاطب کر کے کہا:

❑ ”پاکستان قائم ہو چکا ہے اور یہ مسلمانوں کی قربانیوں سے بنا ہے۔ پاکستان کے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں مکمل اتحاد و اتفاق ہو۔ ہمارا خدا، رسول، کلمہ اور قرآن پاک ایک ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک ہو کر اپنے ملک اور اپنے مذہب کی اشاعت اور ترقی کے لیے انتھک جدوجہد نہ کریں۔ اگر آپ نے مکمل اتحاد و تعاون اور صحیح اسلامی جوش و خروش سے کام کیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان جلد ہی دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شمار ہونے لگے گا، تعمیر پاکستان کے لیے مسلمانوں کے تمام عناصر اور طبقوں میں یکجہتی اور اتحاد ضروری ہے۔ میں نے مسلمانوں اور پاکستان کی جو خدمت کی ہے، وہ اسلام کے ادنی سپاہی اور خدمت گزاری کی حیثیت سے کی ہے۔ اب پاکستان کو دنیا کی عظیم قوم اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے آپ میرے ساتھ مل کر جدوجہد کریں۔ میری آرزو ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں ایک ایسی مملکت بن جائے کہ ایک بار پھر دنیا کے سامنے ”حضرت فاروق اعظمؓ“ کے سنہری دور کی عملی تصویر عملی طور پر کھنچ جائے، خدا میری اس آرزو کو پورا کرے۔ پاکستان میں کسی ایک طبقے کی لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کی اجازت نہیں ہوگی۔ پاکستان میں بسنے والے ہر شخص کو ترقی کے برابر مواقع میسر ہوں گے“۔ (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی از منشی عبدالرحمٰن خاں ص55، 56)

قائداعظم اور سلطنتِ عثمانیہ

قائداعظم نے ستمبر 1920ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت

کی تھی۔ اس اجلاس کا مقصد خلافت اور عدم تعاون جیسے مسائل پر غور کرنا تھا۔ قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

❏ ''ہم یہاں خاص طور پر اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو صلح کے بعد سے حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی سے پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے تو پنجاب میں ظلم و ستم کی لہر کے ساتھ رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اور پھر سلطنت عثمانیہ اور خلافت کی بے حرمتی کی گئی۔ پہلا حملہ ہماری آزادی پر اور دوسرا حملہ ہمارے مذہب پر کیا گیا...... اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں اور ہم سب کو یقین ہو گیا کہ ہم بین الاقوامی مسائل میں اپنی نمائندگی کے لیے حکومت ہند یا برطانوی حکومت پر بھروسا نہیں کر سکتے''۔ (تحریک خلافت اور قائداعظم از ڈاکٹر معین الدین عقیل، مطبوعہ مجلّہ علم و آگہی کا خصوصی شمارہ، قائداعظم محمد علی جناح گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی)

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

آئین پاکستان کا حقیقی ماخذ اور قراردادِ مقاصد کی اصل روح

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس میں تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص کی، یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت (پاکستان) کی ضرورت ہے''۔ (کراچی، 1948ء)

پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوگا

قائداعظم کے ذہن میں سیاسی طور پر کس پاکستان کا تصور تھا، ان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 25 دسمبر 1945ء کو مسلمانان بمبئی نے قائداعظم کی

انہترویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی۔ اس موقع پر مسلم اکثریتی علاقے خوب سجائے گئے تھے۔ سڑکوں، گلیوں اور محلوں میں محرابیں بنائی گئی تھیں۔ جگہ جگہ قائداعظم کی قد آور تصاویر لگائی گئی تھیں۔ جے جے ہسپتال کے قریب ایک آرائشی محراب پر قائداعظم کی ایک بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی، جس کے نیچے لکھا ہوا تھا: ''شہنشاہ پاکستان زندہ باد''۔ قائداعظم اپنی بہن فاطمہ جناح کے ہمراہ یہاں سے گزرے اور اس تصویر پر ان کی نظر پڑی، تو فوراً ڈرائیور کو حکم دیا، گاڑی روکو۔ کار رُکی تو ہزاروں مسلمان پل بھر میں ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ قائداعظم نے ان سے پوچھا: یہ تصویر کس نے لگائی ہے؟ مجمع میں سے آواز آئی، ہم نے۔ قائداعظم کے لہجے میں اگرچہ قدرے برہمی تھی لیکن مسکراتے ہوئے کہا: یہ تصویر آپ اتار دیں۔ اگر آپ یہ تصویر نہ ہٹانا چاہیں تو یہ عبارت مٹا دیں جو اس کے نیچے لکھی ہوئی ہے۔ بس ''پاکستان زندہ باد'' کافی ہے۔ انہوں نے اپنے شیدائیوں کو سمجھاتے ہوئے کہا: ''پاکستان ایک جمہوری ملک ہوگا۔ ہم جس پاکستان کے لیے لڑ رہے ہیں، اس میں کسی بادشاہ اور شہنشاہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی''۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ محمد یامین خان بیان کرتے ہیں:

''دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک خوشامدی نے نعرہ لگایا: ''شاہ پاکستان زندہ باد''۔ قائداعظم بجائے خوش ہونے کے فوراً بولے: دیکھیے آپ لوگوں کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوگا۔ وہ مسلمانوں کی ری پبلک ہوگی، جہاں سب مسلمان برابر ہوں گے۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہوگی''۔

قائداعظم کی زندگی کے یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ان کے سیاسی نظریات اور ان کے ذہن میں پاکستان کی مجوزہ مملکت کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ بلاشبہ ایک ایسے پاکستان کا قیام چاہتے تھے جو اسلامی اور جمہوری اقدار کی تجربہ گاہ ہو، جہاں سب لوگوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو اور وہ اپنے عقیدے اور نظریے کے مطابق زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔

(قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے؟ از پروفیسر ڈاکٹر حمید رضا صدیقی)

نہیں جناب! بادشاہت نہیں

18 دسمبر 1946ء کی صبح لندن کانفرنس سے واپس آتے ہوئے قائد اعظمؒ اور لیاقت علی خان اپنے سیکرٹریوں کے ایچ خورشید اور ممتاز حسن کے ساتھ مارسیلز میں ناشتہ کررہے تھے کہ حکومت کی ہیت (فارم) اور صورت کے مسئلے پر گفتگو چھڑ گئی۔

قائداعظم: یہ جو حال ہی میں انڈین آئین ساز اسمبلی نے فیصلہ کیا ہے کہ انڈیا کے ایک ری پبلک (جمہوریہ) ہونے کا اعلان کیا جائے، اس بارے میں ممتاز مسلمانوں کے نقطہ نظر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

ممتاز حسن: اسلام مسلمانوں کو اس طرح کی حکومت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں افراد کو قانون سازی کے لامحدود اور غیر مشروط اختیار حاصل ہوں، حاکمیت اعلیٰ صرف خدا کی ہے، وہی کائنات کا حاکم مطلق ہے۔ ہمیں اختیار اس سے ملتا ہے اور اس اختیار کو ہم ان احکامات کی روشنی میں جو رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہم تک پہنچے ہیں، استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔

قائداعظمؒ: بنیادی اور اصولی نکتہ یہی ہے ورنہ حکومت کی شکل کی اتنی اہمیت نہیں ہے، (خوش مزاجی سے) ہوسکتا ہے کہ پاکستان کوئی بادشاہ چن لے۔

لیاقت علی خان: جی ہاں، لوگ تو پہلے سے شہنشاہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔

قائد اعظمؒ: (یک دم گہری سنجیدگی سے) نہیں جناب! بادشاہت اسلام میں حکومت کی مقبول صورت نہیں، اسلام بادشاہوں کو پسند نہیں کرتا۔ قرآن میں مالک کا لفظ صرف اللہ کے نام کے طور پر آیا ہے، ہاں میں اس امر سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ حکومت کی کوئی بھی شکل ہو، اس میں حاکمیت اعلیٰ قرآن حکیم ہی کی ہے۔ (گفتار و کردار قائداعظم از سعید راشد صفحہ 523)

اسلام میں دین اور سیاست علیحدہ نہیں

1945-46ء کا واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشہور سٹریچی ہال میں مسلم ویمن سٹوڈنٹس فیڈریشن علی گڑھ کی طرف سے ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قائد اعظم مہمان خصوصی تھے۔ جلسے کے اختتام پر فیڈریشن کی علی گڑھ شاخ کی صدر شمیم خان

نے (جو بعد ازاں کوئین میری کالج لاہور کی پرنسپل بنیں) قائداعظمؒ کو بڑے ادب سے کہا کہ طالبات آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ قائداعظمؒ نے اجازت دے دی لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ ہر طالبہ صرف دو مختصر سوال کرے۔ سب سے پہلے رضیہ برلاس (بعد ازاں رضیہ اعظم علی بیگ سپورٹس ڈائریکٹر پنجاب یونیورسٹی) سوال کرنے اُٹھیں۔

رضیہ برلاس: جناب میرا پہلا سوال گاندھی جی کے بارے میں ہے۔ یہ چیز کیا ہے، ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیے؟

قائداعظمؒ: جو ان کی زبان پر ہوتا ہے، ان کے دل میں نہیں ہوتا اور جو دل میں ہوتا ہے، وہ ان کی زبان پر نہیں آتا، اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں۔

رضیہ برلاس: شکریہ! میرا دوسرا سوال پاکستان میں نظام حکومت کے بارے میں ہے، پاکستان میں طرز حکومت کیا ہوگا؟

قائداعظمؒ: اسلام میں مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

(گفتار و کردار قائداعظم از سعید راشد صفحہ 523)

قائداعظم سے میری ایک ملاقات

ڈاکٹر سید بدرالدین کہتے ہیں کہ 26 نومبر 1946ء کو قائداعظمؒ نے ایک ملاقات کے دوران مجھ سے فرمایا:

❑ ''مسٹر بدر، میں مطمئن ہوں کہ قرآن و سنت کے زندہ جاوید قانون پر مبنی ریاست (پاکستان) دنیا کی بہترین اور مثالی ریاست ہو گی۔ یہ اسلامی ریاست اسی طرح سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم اور کیپیٹل ازم کا قبرستان بن جائے گا جس طرح حضور سرور کائنات ﷺ کا مدینہ اس وقت کے تمام نظام ہائے فرسودہ کا گورستان بنا۔ پاکستان میں اگر کسی نے روٹی کے نام پر اسلام کے خلاف کام کرنا چاہا یا کسی ازم وغیرہ کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی، تو پاکستان کی غیور قوم اسے کبھی برداشت نہیں کرے گی۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، دنیا کی تمام مشکلوں کا حل اسلام سے بہتر کہیں نہیں ملتا۔ سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم، ہندو ازم، کیپیٹل ازم، امپیریل ازم، امریکہ ازم، روس ازم،

ماڈرن ازم سب دھوکہ اور فریب ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر میں لندن کی پرسکون زندگی چھوڑ کر عظیم مفکر علامہ اقبالؒ کے اصرار پر واپس آ گیا ہوں۔ ان شاء اللہ پاکستان کے نظام حکومت کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہی ہوگی"۔ (اُردو ڈائجسٹ لاہور دسمبر 1970ء)

درِ دل مسلم، مقام مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ماز نام مصطفیٰ ﷺ است

دین یا لادینیت؟

آج کل ہمیں امریکہ کے کلیدی مفادات اور بھارت سے ذہنی اور قلبی ہم آہنگی کی خاطر ایک نئے خطہ خواب (New ideological territory) کے جادو میں مبتلا کرنے کے لیے نت نئے جتن کیے جا رہے ہیں۔ امریکی سپاہ دانش بڑی سرگرمی کے ساتھ اس نئی نظریاتی سر زمین کو جانے والے راستوں کو سیکولرازم کے پتھروں سے تعمیر کرنے میں مصروف ہے۔ سٹیفن کوہن نے اپنی کتاب میں بانیانِ پاکستان کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے عقل کے گھوڑے خوب دوڑائے ہیں۔ سٹیفن کوہن کے خیال میں قائداعظم کا تصورِ پاکستان ایک سیکولر تصور تھا (صفحہ 44)۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم کی تقاریر کی روح سیکولر تھی (صفحہ 42) اور قراردادِ مقاصد میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اُس میں سیکولر مسلمانوں اور سیکولر اسلام کا ذکر تک نہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ قراردادِ مقاصد جس قومی اسمبلی نے منظور کی تھی، اُس کے ممبران تحریک پاکستان کے قائدین اور عمائدین پر مشتمل تھے۔ قرارداد منظور کرنے والوں کو بخوبی علم تھا کہ پاکستان کا وژن کیا ہے؟ اسلامیانِ ہند نے کس خواب و خیال کو عملی زندگی میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں پاکستان قائم کیا ہے؟ اپنے خیالات، تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں ہی انہوں نے پاکستان کو اسلامی جمہوریۂ پاکستان قرار دیا تھا۔ قراردادِ مقاصد میں سیکولر کی اصطلاح کی عدم موجودگی ایک قدرتی امر ہے۔ چونکہ حقیقی اسلام میں سیکولرازم کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں، اس لیے سیکولر نام کی کوئی اصطلاح بھی سرے سے موجود نہیں ہے۔ سیکولرازم کے خوشگوار عناصر یعنی

تھیا کریسی (شہنشاہیت + ملائیت) سے انکار، ہر مذہب و ملت کو اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی، وسیع النظری اور انسان دوستی تو اسلام سے مستعار ہیں۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار مدینۃ النبی ﷺ میں ان تصورات کا عملی ظہور سامنے آیا تھا۔ اقبال اور قائداعظم اسلام کے مفہوم سے بھی آگاہ تھے اور سیکولرازم کے مفہوم سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں نہ تو کبھی ''سیکولر مسلم'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اور نہ ہی ''سیکولرائیزڈ اسلام'' کی۔

اقبالؒ نے اپنی شاعری میں بھی روحانی اصول و اقدار سے آزادی پر نازاں سیکولر سیاست کو مختلف متنوع انداز میں بے نقاب کر رکھا ہے۔ مختصر نظم بعنوان ''دین و سیاست'' ہمیں بڑے سادہ اور سلیس انداز میں سیکولرازم سے متعارف کراتی ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں سیکولرازم اور اسلام کی بحث کے دوران اسلامیان ہند سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ سیکولر سیاست کو اپنا کر اسلام کا بھی وہی حشر کر دینا چاہتے ہیں جو مغربی دنیا نے عیسائیت کا کر رکھا ہے؟ اقبال نے خود اس سوال کا جواب یوں دیا تھا کہ اسلامیانِ ہند، اسلام کے روحانی سیاسی مسلک پر قائم رہتے ہوئے دنیا کے سامنے روحانی جمہوریت کی مثال پیش کریں گے۔ وہ اسلام کے دینی مسلک اور سیاسی اور معاشرتی مسلک کی یکجائی پر انتہائی استقلال کے ساتھ قائم رہیں گے۔ تحریکِ پاکستان اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامیانِ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان قائم کر کے اقبال کے اس اعتماد کو سچ ثابت کر دکھایا۔

بانیانِ پاکستان کا جدید اسلامی ریاست کا تصور مبہم نہیں، متعین تھا۔ ہاں اس طرح کی مبہم باتیں کہ قائداعظم کی تقاریر کا مزاج سیکولر ہے یا بانیانِ پاکستان کا تصور پاکستان سیکولر ہے، ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جو نہ تو اسلام کو سمجھتا ہے اور نہ ہی سیکولرازم کو۔ (فتنہ انکار پاکستان از پروفیسر فتح محمد ملک)

قدرت اللہ شہاب اور ایک یہودی

معروف قانون دان ایس ایم ظفر، قدرت اللہ شہاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

❑ جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنے تل ابیب کے خفیہ دورے کی روداد بیان کرتے ہوئے ایک یہودی پروفیسر کی ایک بات مجھے بتائی تھی جو گزشتہ سالوں میں مجھے اکثر یاد آتی ہے، ہوا یوں کہ قدرت اللہ شہاب ایک عیسائی ایرانی کی حیثیت میں تل ابیب کے شہر ایک یہودی پروفیسر کے مہمان رہے اور اس کے گھر انہوں نے ممتاز شخصیات کی آویزاں تصاویر میں ایک تصویر محمد علی جناح کی بھی دیکھی، تجاہل عارفانہ دکھاتے ہوئے قدرت اللہ شہاب نے پوچھا: ''یہ صاحب کون ہیں؟'' جواباً اس پروفیسر نے کہا: یہ محمد علی جناح بانی پاکستان ہیں اور میں نے اس کی تصویر اس لیے رکھی ہے کہ اس شخص نے اسلام کے نام سے ایک ملک حاصل کیا ہے اور اب اگر اس ملک

ہی میں اسلام ناکام ہو جائے تو پھر اور کہیں کامیاب نہ ہوگا''۔

(عوام، پارلیمنٹ، اسلام از ایس ایم ظفر ص 18)

کوئی امید نہ تھی ہوش میں آنے کی مگر
ہم کو بیدار کیا قائد اعظم تو نے

قائداعظم پر بہتان لگانے والے

''ہمارے سیکولر دانشور شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اور کنفیوژن پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ حضرات قرارداد مقصد سے نہایت الرجک ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مذہبی انتہا پسندی پیدا ہوئی ہے۔ پھر وہ اس صدمے سے بھی نڈھال ہیں کہ قرارداد مقاصد سے ڈر کر وفاقی ہندو وزیر منڈل ہندوستان بھاگ گیا تھا۔ ان کو قرارداد مقاصد اس لیے ناپسند ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا اعلان کر کے یہ پیغام دیتی ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلام، قرآن اور سنت سے اخذ کردہ اصولوں کے مطابق گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ اگرچہ اس قرارداد میں اقلیتوں کو مذہبی و شہری حقوق کی یقین دہانی کرائی گئی تھی لیکن کیا کیجیے کہ سیکولر دانشوروں کو اسلام سے خوف آتا ہے اور وہ اس افسانے پر آنسو بہاتے ہیں کہ اس قرارداد کی وجہ سے منڈل ہندوستان چلا گیا۔ اس دور میں دونوں ملکوں کے شہریوں کو آنے جانے اور پسند کے مطابق سکونت اختیار کرنے کی آزادی تھی اس لیے منڈل اپنے پسندیدہ معاشرے میں چلا گیا جو اس کا حق تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ قرارداد وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 7 مارچ 1949ء کو پیش کی جب منڈل وفاقی کابینہ میں وزیر تھے۔ اگر انھیں اعتراض تھا تو وہ استعفیٰ دے دیتے، لیکن وہ ستمبر 1950ء تک وفاقی کابینہ کے رکن رہے اور پھر راتوں رات ہندوستان چلے گئے۔ اگر انھیں قرارداد مقاصد کے خوف سے بھاگنا تھا تو وہ ڈیڑھ برس وزارت کے مزے کیوں لوٹتے رہے؟'' (پاکستان...... میری محبت از ڈاکٹر صفدر محمود)

سب سے بڑا جھوٹ

''دانشوروں کے اسی گروہ نے یہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ قائداعظم نے جگن

ناتھ آزاد سے ترانۂ پاکستان لکھوایا۔ میں نے تحقیق سے ثابت کیا اور اسی جگہ لکھا تھا کہ یہ 2010ء کے سال کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ قائداعظم نہ ہی جگن ناتھ آزاد کو جانتے تھے، نہ انھوں نے اس سے ترانہ لکھوایا اور نہ کبھی اس سے ملے''۔

(پاکستان......میری محبت از ڈاکٹر صفدر محمود)

ایک اور جھوٹ

ہندوستانی سفیر سری پرکاش کی کتاب بہت سے جھوٹوں کا مجموعہ ہے۔ قائداعظم کی شخصیت کے وقار کے پیش نظر ہندوستانی سفیر گورنر جنرل کو سوالات کے کٹہرے میں کھڑا کرلے، ناقابل فہم ہے۔ پھر قائداعظم جیسا کھرا انسان کیسے کہہ سکتا تھا کہ: ''میں نے کبھی ''اسلامی'' کا لفظ استعمال نہیں کیا''۔ قائداعظم کو معذرت خواہانہ رویے اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی اور نہ اُن کا یہ مزاج تھا، جبکہ وہ اسلامی نسبت کا لفظ کئی بار ادا کرچکے تھے۔ سری پرکاش نے یہ واقعہ ستمبر 1947ء کا لکھا ہے، صرف ایک ماہ بعد 30 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے پنجاب یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا:

- ''اس امر کے لیے تیار رہیے کہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے اگر ضروری ہو تو اپنا سب کچھ قربان کردیں گے''۔

(قائداعظم کے بیانات، تقاریر از اقبال احمد صدیقی جلد چہارم، ص 2643)

(قائداعظم اور سیکولرازم کے علمبردار از ڈاکٹر صفدر محمود مطبوعہ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور مارچ 2016ء)

جسٹس منیر کا جھوٹ

''جسٹس محمد منیر نے اپنی کتاب From Jinnah to Zia میں قائداعظم کی ایک تقریر کے الفاظ میں اپنی طرف سے تبدیلیاں کرکے سیکولرازم کے لیے بنیاد فراہم کی ہے۔ پاکستانی نژاد محترمہ سلینہ کریم نے اپنی کتاب Secular Jinnah-Munir's Big Hoax Exposed میں تقریر کے اصل الفاظ دے کر جسٹس منیر کی دیانت کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ جسٹس منیر کی کتاب سے یہی الفاظ

لے کر سیکولر ازم کے علمبردار، قائداعظم کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے اپنی ذہنی توانائیاں صرف کرتے رہے لیکن محترمہ سلینہ کریم نے ان الفاظ کو غلط اور من گھڑت ثابت کر کے ان کی دانشوری کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔ مصنفہ کا بجا طور پر کہنا ہے:

❑ ''جب میں نے جسٹس منیر کی کتاب اور اس میں قائداعظم کی تقریر کا حوالہ پڑھا تو میں پریشان ہوگئی کہ ان الفاظ کی انگریزی غلط تھی، جبکہ قائداعظم غلط انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ میں نے تحقیق کی تو راز کھلا کہ جسٹس منیر نے یہ الفاظ اپنے پاس سے لکھے تھے''۔

دیانتدارانہ تحقیق کی بنیاد پر قائداعظم کو کسی صورت بھی سیکولر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے میں سیکولر دانشوروں سے گزارش کرتا ہوں کہ خدارا! قائداعظم کو معاف کردو۔ اپنے ایجنڈے کا جواز قائداعظم کی تقریروں یا شخصیت میں مت تلاش کرو۔ پاکستان ایک اسلامی جمہوری ریاست ہے اور ان شاء اللہ اسی سمت میں سفر جاری رکھے گا''۔

(قائداعظم اور سیکولر ازم کے علمبردار از ڈاکٹر صفدر محمود مطبوعہ ترجمان القرآن لاہور مارچ 2016ء)

اصول بیچ کر مسند خریدنے والو
نگاہِ اہل وفا میں بہت حقیر ہو تم

عدالتی فیصلہ

سپریم کورٹ آف پاکستان اس بارے میں آخری فیصلہ دے چکی ہے۔ عبدالولی خان کے مقدمے (پی ایل ڈی 1976ء ایس سی 167) میں سپریم کورٹ نے قائداعظم کی پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کی متعدد تقریروں کا حوالہ دیا ہے جن میں دوقومی نظریے کو تخلیق پاکستان کا بنیادی سبب اور اصل جواز قرار دیا گیا ہے۔ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی بقا کی لازمی شرط بھی یہی نظریہ ہے۔ بے نظیر بھٹو کے مقدمے بنام وفاق پاکستان (پی ایل ڈی 1988ء ایس سی 416) میں معزز عدالت نے فیصلہ دیا ہے:

''لہٰذا اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ نظریۂ پاکستان مسلم قومیت پر

مبنی اور اسلامی نظریۂ حیات پر مشتمل ہے جس کا مطلب دستور میں واضح الفاظ میں قرآن وسنت کے احکام کو بتایا گیا ہے اور یہی مسلم قومیت کے تصور میں اصل عنصر تھا۔ پاکستان کا یہی تصور تھا جو برصغیر کی تقسیم پر منتج ہوا اور جو دوقومی نظریہ کے نام سے معروف ہے۔ اسلامی نظریۂ زندگی کا تصور، نظریۂ پاکستان کے ساتھ قطعی پیوستہ ہے، اسے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ دوقومی نظریے کی بنیاد ہے، اس لیے پاکستان کی سالمیت میں صرف نظریۂ پاکستان ہی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ (اسلامی آئیڈیالوجی) بھی شامل ہے''۔

(قائداعظم کا تصور پاکستان، اسلامی جمہوری ریاست از سید شریف الدین پیرزادہ)

قائداعظم اور مسلم طالبات

جناح اسلامیہ گرلز کالج لاہور کی طالبات نے قائد اعظم کو ایک مرتبہ پھر خطاب کے لیے مدعو کیا۔ قائداعظم نے یہ دعوت منظور کی اور **3** مارچ **1941**ء کو کالج میں طالبات کے جلسہ میں شرکت کی۔ طالبات نے قائداعظم کی خدمت میں ایک طویل سپاسنامہ پیش کیا جس میں اسلامیان ہند کو سیاسی بیداری میں قائد اعظم کے گراں مایہ کردار اور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے طالبات نے ان کی قیادت پر مندرجہ ذیل الفاظ میں اعتماد کا اظہار کیا۔

❑ ''ہم طالبات اسلامیہ جناح گرلز کالج اپنے درمیان آپ کا خیر مقدم کرنے میں شرف محسوس کرتی ہیں۔ یہ کالج جس کی بنیاد آپ کے نام پر رکھی گئی ہے، اگرچہ ابھی ابتدائی دور میں ہے، تاہم اسے یہ فخر حاصل ہے کہ شمال مغربی ہند میں یہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے اگر مسلمانانِ ہند بلکہ ساری دنیا کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک بار پھر دنیا کی راہنمائی اسی طرح کریں جس طرح وہ پہلے کر چکے ہیں تو انہیں لازم ہے کہ وہ قرآن شریف اور سیرت رسول ﷺ کو اپنی عملی زندگی کا راہنما بنائیں۔ دنیا میں اس وقت جو خلفشار ہے، اس سے بلاتردید یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آئندہ بنی نوع انسان کی فلاح اور ان کی مسرت

تنگ نظر قومیت اور نسلی وفاداری سے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔

امن وترقی کی عمارت کی بنیاد ایسے دینی عقیدے پر رکھنا ضروری ہے جو مختلف نسلوں، مختلف رنگوں اور ملکوں کے لوگوں میں یکساں ہو۔ یہ بنیاد جو بنی نوع انسان کی اخوت کی حامل ہے، صرف اسلام ہی فراہم کرتا ہے۔ اگر دنیا کو خودغرضانہ جنگجوئی سے بچانا ہے تو اس کے لیے ہم سبھوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

حضرت علامہ اقبال پہلے ہندی مسلمان مفکر تھے جنھوں نے رسول کریم ﷺ کے پیغام کے صحیح مقصد کو صفائی کے ساتھ سمجھا۔ ہم یہ محسوس کر کے مسرور ہیں کہ مرحوم فلسفی اسلام نے اس کالج سے ہمدردی کی تھی۔

مسٹر جناح! ہمیں بہت سی وجوہ سے آپ پر فخر ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ آپ مسلمانان ہند کے مسیح ہیں تو یہ خوشامد نہیں ہوگی۔ اگر آپ نے مسلسل جدوجہد نہ کی ہوتی تو شاید عیار ہندو مسلمانوں کے قدم متزلزل کر دیتے۔

پیارے نبی حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد آپ نے پہلی بار ہمارے سامنے وہ مطمح نظر رکھا ہے جو اس قابل ہے کہ اس کے لیے زندگیاں قربان کر دی جائیں۔ آپ کی اس زبردست جنگ میں دشمنان اسلام جو رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ وہ منافقین ہیں جو ہم میں موجود ہیں اور جو غداری کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری بات کا یقین کیجیے اور ہم کلام پاک کے الفاظ میں کہتے ہیں کہ جن منافقین کو آپ کی پشت پر چھری گھونپنے میں شرم نہیں آئی، وہ ناکام رہیں گے۔ ہمارا مقصد اسلام کی آزادی ہے اور یہ مقصد ہر رکاوٹ کے باوجود ضرور حاصل ہوگا۔

ہم آپ کو اختیار دیتی ہیں کہ آپ حکومت برطانیہ اور کانگریس دونوں سے کہہ دیں کہ اگر ان دونوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی ناپاک اتحاد کیا تو کل ہی اس ملک کے نوجوان اپنا خون بہا کر اس کو غارت کر دیں گے۔ ہم اس کالج کی طالبات اچھی طرح جانتی ہیں کہ ہمیں ملت کی قیادت کے لیے کیا کام انجام دینا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم صنفوں کے علیحدہ علیحدہ رہنے پر یقین رکھتی ہیں۔ لیکن اگر وقت آیا اور ہم نے محسوس کیا

کہ اسلام کو میدان میں ہماری خدمات کی ضرورت ہے تو ہم پردہ پھینک کر باہر نکل آئیں گے اور ہم اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ دشمنانِ اسلام سے جنگ کریں گی''۔

قائد اعظم نے مسلم طالبات کے اس پرجوش اور عزم سے بھرپور سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:

- ''پاکستان کے لیے کام کرو اور جب تک اسے حاصل نہ کرلو، دم نہ لو''۔

مسلم طالبات نے اپنی علیحدہ فیڈریشن کے قیام کے بعد قائد اعظم کے ان الفاظ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جلسوں کا انعقاد کر کے خواتین میں مسلم لیگ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ جلد ہی طالبات کی سرگرمیاں خواتین سب کمیٹیوں کے لیے جزو لائینفک بن گئیں۔ پنجاب میں مسلم طالبات نے قائد اعظم کا پیغام دور دراز تک پہنچانے کے لیے دیہی علاقوں کا دورہ بھی کیا۔

(قائد اعظم محمد علی جناح، موضوعاتی مطالعہ از ایس منصور حسن ص 47، 48)

بچوں کی دانائی

پاکستان بننے سے کئی سال پہلے، قائد اعظم بمبئی سے دہلی جا رہے تھے۔ جب رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب ان کی گاڑی ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو کسی نے زور سے اس ڈبے کی کھڑکی کو کھٹکھٹایا جس میں قائد اعظم سفر کر رہے تھے۔ رات اور وہ بھی سردیوں کی رات، قائد اعظم کے ملازم کھڑکی کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ قائد اعظم کے کہنے پر انھوں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ دو کم سن بچے سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ قائد اعظم کو بڑا تعجب ہوا اور پوچھا: تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟

بچے: ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔

قائد اعظم: تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں اس گاڑی سے آ رہا ہوں۔

بچے: ہم نے اخبار میں پڑھا تھا اور پھر خود اندازہ لگایا کہ تقریباً اس وقت آپ کی گاڑی یہاں پہنچے گی۔

قائد اعظم: تم مجھے کیوں دیکھنا چاہتے تھے؟

بچے: آپ ہمارے لیے پاکستان بنارہے ہیں نا!
قائداعظم: اچھا! اب یہ بتاؤ کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟
بچے: وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔

قائداعظم نے یہ واقعہ 11 جولائی 1947ء کو جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودھری حمید اللہ خان اور سیاسی کارکن محمد اسحاق قریشی کو سنایا اور آخر میں فرمایا: 'دیکھیے گاندھی اور نہرو کہتے ہیں کہ انہیں پاکستان کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ اگر سمجھنے کی نیت ہوتو سکول کے کمسن بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔'
(گفتار و کردارِ قائداعظم از سعید راشد)

ہمارا قائد

قوم نے قائداعظم کی بے حد قدردانی کی۔ کسی لیڈر کو اتنی ارادت و عقیدت نصیب نہیں ہوئی، جو قائداعظم کو ملی، اور کیوں نہ ملتی جبکہ قائداعظم نے اس قوم کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیا تھا اور انتھک جدوجہد سے اپنی قوم کو چند ہی سال میں ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ ہمارا قائد فی الواقع دنیا بھر میں وقت کا بہترین اور مخلص قائد ہے جو ایسے صید قنوطیت کو لے کر شب تاریک میں نکلا اور اپنے ایمان و یقین محکم کے چراغ کی روشنی میں ایک بڑا اسلامی ملک ڈھونڈ ھ نکالا، اور ایک ایسے ملک کو جنم دیا جو مسلمانوں کا مرکز اور وطن ہونے کے خواص کا حامل ہے۔ جہاں مسلمان اپنی زندگی اسلامی معاشرت کے مطابق گزار سکتا ہے اور خدا کے قوانین کی حدود میں آزاد ہے۔
(مائی لیڈر از ضیاالدین احمد سلہری ص 231، 232)

ایسے تھے ہمارے قائدِ اعظمؒ

''کھیل کے میدان کی طرح اس گھر کی ڈیوڑھی کا ایک واقعہ بھی مرزا صاحب کی مہکتی ہوئی یادوں کا حصہ ہے۔ قائداعظمؒ ایک بار کہیں جانے کے لیے گھر سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھے تو ایک نوعمر اچانک ان کے سامنے آ گیا اور ایک لفافہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ قائداعظمؒ کے چہرے پر خوش گوار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انھوں

نے اپنی بارعب آواز میں پوچھا: ’’What is this?‘‘

مرزا جواد بیگ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کی بارعب آواز سن کر ایک بار تو میرا حوصلہ جواب دے گیا لیکن ماموں کو پاس کھڑے دیکھ کر ہمت پکڑی اور کہا:

’’مسلم لیگ کے فنڈ کے لیے‘‘۔

قائدِاعظم مسکرادیے، لفافہ لیکر شیروانی کی اوپری جیب میں رکھا اور کچھ دیر کے بعد روانہ ہوگئے۔ مرزا صاحب کا خیال تھا کہ اتنی محنت سے جمع کیے ہوئے روپے تو گئے۔ خدشہ تھا کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی لڑائی میں مصروف یہ عظیم شخص اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب یقیناً بھول جائیگا کہ جب وہ نواب فیض علی خان کے گھر سے روانہ ہو رہا تھا تو ایک بچے نے کچھ رقم اسکے حوالے کی تھی۔ پریشانی بالکل جائز تھی لیکن چند ہی دنوں کے بعد مرزا صاحب کے خیالات بدل گئے۔ مرزا صاحب بتاتے ہیں کہ ایک روز میں لان میں بیٹھا تھا کہ خدمت گار نے اطلاع دی، آپ کی چٹھی آئی ہے جس پر میں بھاگتا ہوا ڈاکئے کے پاس پہنچا، لفافہ اسکے ہاتھ سے تقریباً جھپٹ لیا اور بے صبری کے ساتھ کھولا۔ میرے ہاتھ میں پچاس روپے کی رسید تھی جس پر سیکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم لیگ نواب زادہ لیاقت علی خان کے دستخط تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قائد اعظمؒ نے ایک معمولی سی بات کو بھی یاد رکھا اور چندے میں دی جانیوالی رقم کی رسید ارسال کرانی ضروری سمجھی۔ مرزا جواد بیگ دہائیوں پہلے کے اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے اور انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا: ’’ایسے تھے ہمارے قائدِاعظمؒ‘‘۔

نظم و ضبط قائدِاعظمؒ کا طرزِ زندگی تھا، وہ ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے اور اپنے نام آنیوالے ہر خط کا اہتمام سے جواب دیتے لیکن اس واقعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آنے والی نسلوں کی تربیت کا معاملہ بھی ان کے پیشِ نظر تھا۔‘‘

(جوصورت نظر آئی از فاروق عادل)

میرے خیال نے جتنے بھی لفظ سوچے ہیں
تیرے مقام تیری عظمتوں سے چھوٹے ہیں

تاریخ کی تحقیق

قائداعظم 25 دسمبر 1876ء بروز پیر پیدا ہوئے (اتوار نہیں)۔ جب 14 اگست 1919ء کو قائداعظم کی بیٹی وینا لندن میں پیدا ہوئی تو جمعرات تھا۔ قائداعظم اور ان کی رفیقہ حیات بیگم رتی جناح دونوں کا یوم پیدائش اس سال جمعرات ہی کو تھا۔ جب 14 اگست 1947ء کو پاکستان قائم ہوا تو یہ ساری تاریخیں جمعرات کو آئی تھیں۔ جب 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کا انتقال ہوا تو دن سنیچر کا تھا۔ قائداعظم کی پیدائش، قیام پاکستان، وینا کی ولادت بھی اسی سال سنیچر ہی کو پڑی تھی۔ 1951ء میں جب 16 اکتوبر کو لیاقت علی خان کی شہادت ہوئی تو دن منگل تھا۔ قائداعظم کی پیدائش، یوم وفات، یوم قیام پاکستان، وینا کی پیدائش سب ہی منگل کو پڑے تھے۔ قائداعظم کی یوم پیدائش یوم وفات، یوم قیام پاکستان، وینا کی پیدائش کا دن اور لیاقت علی خان کی شہادت ہر سال جب تک عیسوی کیلنڈر رائج ہے، ایک ہی دن پڑتے رہیں گے۔

(3 ستمبر 1990ء کے اخبار جہاں سے ایک تحقیق)

گاندھی جی کا آشرم

گاندھی کے بدنام زمانہ آشرم کے بارے میں پاکستان کے معروف ادیب اور بیوروکریٹ (وفاقی سیکرٹری تعلیم) اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ محترمہ حمیدہ اختر حسین اپنی کتاب ''ہم سفر'' (شوہر کی سوانح حیات) میں لکھتی ہیں:

''صبح تڑکے انہوں (سروجنی نائیڈو) نے مجھے اٹھایا کہ جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر باہر چلو۔ بعد میں ناشتہ کرنے چلیں گے۔ باہر آ کر تماشا دیکھا کہ ہر طرف ادھر ادھر لوگ جھاڑو لگا رہے ہیں، کچھ خواتین بھی۔ پیچھے کی طرف لڑکے لڑکیاں تھیں جو بڑی پھرتی سے جھاڑو لگانے، گوبر اٹھانے میں مصروف تھے۔ بتایا کہ یہ لڑکے لڑکیاں یہاں (گاندھی کے) آشرم ہی میں رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر نیچے اتریں، برآمدے میں رکھی جھاڑو اٹھا کر گز دو گز ادھر ادھر دو چار ہاتھ مار کر ہنستی ہوئی اوپر پھر برآمدے میں آ گئیں۔ دور کی طرف اشارہ کیا، وہ دیکھو سیٹھ برلا جھاڑو لگا رہے ہیں''۔

''توبہ توبہ، یہ سب کیا ڈھونگ ہے؟'' میں نے کہا ''تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ برابری کا درس ہے۔ دیکھو میں تمہیں باپو جی کے پاس ایک شرط پر لے جاؤں گی کہ ہرگز ایسی اوٹ پٹانگ باتیں نہیں کرو گی۔ دوسرے یہ کہ ان کو گاندھی جی نہیں بلکہ باپو جی کہو گی''۔ ''بہت بہتر''۔

ناشتے میں ایک اسٹیل کے گلاس میں دودھ اور ایک پھلکا ملا۔ وہ تو نہانے چلی گئیں۔ میں کھڑکی سے لگ کر باہر کا تماشا دیکھنے لگی۔ کچھ لڑکیاں لڑکے بالٹی اور گگریاں لیے پانی بھرنے کنویں پر جا رہے تھے، کچھ پانی بھر کر لوٹ رہے تھے۔ کسی نے ایک بالٹی پانی کی ہمارے برآمدے میں بھی رکھ دی۔ مسز نائیڈو تیار ہو کر باہر آئیں تو کہا، پانی کی بالٹی غسل خانے میں لے جاؤ اور تیار ہو کر آؤ۔ میں اتنے میں ذرا اخبار پڑھ لوں۔

میں نکلی تو وہ مجھے لے کر، جو بیچ میں ہٹ بنی ہوئی ہے، اس طرف کو چلیں۔ اپنا سر پلو سے ڈھانک کر کہا۔ ''تم بھی سر ڈھانپ لو''۔ باہر برآمدے میں 'اینی بیسنٹ' ایک انگریز خاتون کھڑی ملیں۔ بے بلاؤز کی ساڑھی کا پلو کس کر سر پر سے ہوتا ہوا کمر پر کھونس رکھا تھا۔ ذرا سا پلو سر پر سے کھسکا تو نظر آیا کہ سر منڈا ہوا ہے۔ یہ عرصے سے گاندھی جی کی چیلی بنی ہوئی ان کی سیوا اور ٹہل خدمت کے کام انجام دے رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں ایک کٹوری میں کدوکش کی ہوئی گاجر، ایک میں چقندر تھا اور ایک طرف کچھ پتے مولی کے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے ان سے اندر جانے کی اجازت لی اور مجھے لے کر اندر آئیں اور جھک کر نمسکار کر کے گاندھی جی کے پاؤں ہاتھ لگا کر چھوئے اور ان کا آشیرباد لے کر مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی ایسا کروں۔ میں نے تو صرف جھک کر آداب کیا۔ مجھے ملایا کہ یہ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی بیوی ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہیں۔

''بیٹھیے بیٹھیے آپ دونوں''۔ کمرے کے لپے پتے فرش پر ایک بڑی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ پیچھے ایک گاؤ تکیہ اور سامنے ایک منے سے ڈیسک نما نیچی سی میز پر قلم اور کاغذ رکھے تھے۔ اب میں نے ہمت کر کے ان کی طرف دیکھا۔ موٹے کھدر کی دھوتی اس انداز سے بندھی ہوئی تھی کہ پتلی سوکھی ٹانگیں ران تک ننگی۔ نہ بنیان، نہ کرتا۔ ایک

ایک پسلی یوں نمایاں کہ بڑی آسانی سے گن لو۔ لمبا سا جینیو گلے میں پڑا تھا۔ ماتھے پر تلک، سر کے بال برائے نام۔ ابھرتا ہوا بے حد چوڑا ماتھا، پتلے پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے بھنچے ہوئے، ناک موٹی سی اور موٹی موٹی سی بھنویں، عجیب قسم کی آنکھیں، نہ تو بہت بڑی، نہ چھوٹی۔ مگر ان میں برقی روشنی سی! جیسے مقابل والے کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ دھنسے ہوئے کلے، جبڑے کی ہڈیاں ابھار لیے ہوئے، گندمی رنگ اور سامنے کے چار دانت غائب۔ مٹھی بھر وزن مگر جانے ان میں کون سی طاقت تھی؟ مجھے یوں لگا کہ انہوں نے مجھے اندر تک پڑھ لیا ہے۔ ان کے آگے یا تو انسان کی آنکھیں جھکی کی جھکی رہ جائیں، یا اگر ان کی طرف دیکھ لے تو نگاہیں ٹکی ٹکی رہ جائیں! سروجنی نائیڈو پلو ڈھانکے بڑی مؤدب بیٹھی تھیں، نظریں نیچی کیے ہوئے اور میں گاندھی جی کی طرف دیکھے ہی جا رہی تھی۔

مسکرا کر بولے۔ ''آپ کو ہم یہ کہے ہے کہ بڑا کسمت والی ہے کہ پتی اکثر حسین رائے پوری ملا ہے۔ اگر ایسا لوگ اور بھی ذرا ہو تو کھوب اچھا ہو۔ وہ کابل بہت سا ہے۔ اور بہت سانڈر، بے باک ہے۔ ناگپور کانفرنس میں زبان کے بارے میں بولا تو ہم سمجھ لیا کہ اس کو ہلا سکتا نہیں۔ ہم جانتا کہ مسلمان بھائی لوگ کبھی ساہتیہ لنکار کی ڈگری بنارس یونیورسٹی سے نہیں لے سکتا۔ اس کو ہندو بھائی لوگ کھٹن سے لے سکتا۔ ہندوستان کو ایسا ہی لوگ کا ضرورت ہے جو ہندی اور اردو ایک موافق سا جانے۔ جب یہاں آیا تو اس وکت پاسپورٹ کا بات کچھ کسی سے نہیں بولا''۔ میں نے کہا۔ ''وہ بہت خوددار ہیں۔ اپنے لیے کسی سے کچھ نہیں کہتے۔

میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ وائسرائے کو تار بھیجا'' نہیں شکریے کا بات نہیں بی بی، سوچو اگر آپ بھی ان کے ساتھ جاتا ہے، پڑھائی آدھی نہ ہو جائے۔ ایسا بھی تو آپ کر سکتا۔ یہاں آشرم میں رہ کر کچھ سیکھے۔ کوئی بڑا آدمی جو ملک کا سیوا کرے، اس کا پتنی میں بھی حوصلہ، ہمت، اور دیس کی سیوا کا سوک اگر ہو گا تو پھر پتی دل لگا کر دیس کی سیوا کرتا ہے۔ بولے آپ کہ اس آشرم میں اگر رہ جائے تو کیسا لگے؟'' ''باپو جی مجھے اپنے شوہر سے دور رہنا ذرا اچھا نہ لگے۔ اور پھر یہاں کی بہت سی باتیں پسند نہیں''۔

سروجنی نائیڈو نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ ''کون سا بات؟''

آپ برا نہ مانیے گا، سچ بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ سب تماشا لگا کہ لوگ جھاڑو دے رہے ہیں، پانی بھر کے لا رہے ہیں، گوبر اُٹھا رہے ہیں۔ جبکہ یہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں واپس جا کر صاحب بہادر اور میم صاحب بن جاتے ہیں۔ آج صبح میں نے سروجنی جی کو جھاڑو دیتے دیکھا۔ یہ تو اپنے گھر میں کبھی خود ایک گلاس پانی بھی اُٹھ کر نہیں پیتیں۔ یہ بیٹھی تو ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔ بات تو جب ہے کہ آپ کی سکھائی پڑھائی باتوں کو آپ کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد یاد رکھ کر اس پر عمل کریں۔

سروجنی جی نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

اب گاندھی جی نے اپنی عینک کو سرکا کر بالکل ناک کی نوک پر کر کے اوپر کی طرف سے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور پھر نیچے دیکھنے لگی۔

گاندھی جی نے ٹھہر ٹھہر کر یوں جواب دیا۔ ''بات ایسا ہوتا ہے ماں باپ جب بچوں سے ایک ہی بات کو بار بار کہتا جاتا ہے، ایسا کرنا ہے ویسا کرنا ہے، کتنا سال نکل جاتا ہے تب فر وہ اس بات کا تھوڑا سا جان جاتا ہے، کچھ سنتا ہے، کچھ نہیں مانتا''۔

''جی یہ بات ٹھیک ہے لیکن یہ سب بچے تو نہیں ہیں۔ بڑے لوگ تو عقل سمجھ والے ہوتے ہیں۔ ان کو تو آپ کی بات فوراً مان لینا چاہیے''۔

اینی بیسنٹ نے آ کر کہا ''فلاں صاحب سے ملاقات کا وقت ہوگیا'' تو گاندھی جی نے کہا ''کہہ دیں ابھی ان کے پاس ملاقات کا وقت نہیں''۔ سروجنی نائیڈو تو اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو حکماً کہا ''ابھی آپ بیٹھیے''، تو میں پھر بیٹھ گئی۔ آپ بولے کہ ''جب ہم سارا ہندوستانی لوگ ایک ہی دھرتی ماتا کا رہنے والا ہے، پھر یہ ہندو اور مسلمان الگ الگ کیسا ہوسکتا ہے؟ مل جل کر کیوں نہی رہئے سکتا؟ ملک کی آزادی کے لیے ایک موافق کام کیوں نہیں کرنے سکتا؟''

''میں خود آپ سے یہ بات پوچھنے کو تھی کہ اگر آپ یہ بات دل سے چاہتے ہیں تو اگر ایک مسلمان کسی ہندو لڑکی سے شادی کر لے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ آپ کی نظر میں جب ہندو اور مسلمان ایک ہے تو آپ کو سب سے بڑھ کر اعتراض کیوں ہو؟

بیچاری لکشمی پنڈت نے جب سید حسین صاحب سے شادی کر لی تو آپ ہی نے بہانے سے سید حسین صاحب کو ولایت بھیج کر لکشمی جی کو کئی ماہ نظر بند کیے رکھا، جب تک کہ ان کے پھیرے نہ ڈلوا لیے۔ میں ٹھیک بات کہہ رہی ہوں نا؟ اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟'' (واضح رہے کہ نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت نے مذکورہ کانگریسی مسلمان سید حسین سے پسند کی شادی کی تھی جسے گاندھی نے بعد میں زبردستی ختم کروا دیا تھا۔ بلکہ تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ پورا نہرو خاندان ہی انگریز اور مسلمان مردوں اور عورتوں کے ساتھ رومانی پینگوں میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جواہر لال نہرو پر موہن چند گاندھی کا بہت گہرا اثر تھا)۔ عینک کو اور نیچے ناک پر کر کے ذرا تھم کر بولے ''بات یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو بہن بھائی۔ تو پھر بہن بھائی کی شادی کیسے ہونا؟'' اس جواب پر مجھے ہنسی تو بڑے زور سے آئی۔ مشکل سے ضبط کر کے کہا ''ہندو بھی تو آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں۔ پھر تو کوئی شادی مت ہونے دیں۔ کتنی اچھی طرح بڑھی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا''۔

یہ سن کر وہ ہنسے تو سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے۔ مجھے کھڑکی کا خیال آیا۔

اب انہوں نے بات کا رخ بڑی ہوشیاری سے یوں موڑا۔ ''آپ سامنے وہ بکسے کو دیکھتا ہے؟ اس پر کیا لکھا ہے؟'' ہندی میں 'کانگریس فنڈ' لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی سی ہندی شادی سے پہلے شد بد تک جان گئی تھی۔ میرے بتانے پر کہ فنڈ لکھا ہوا ہے، خوش ہو کر بولے۔ ''خوب خوب۔ آپ ہندی پڑھ لیتا ہے۔ یہاں جو بھی عورت آتی ہے، وہ اپنا زیور اتار کر اس میں ڈال دیتی ہے۔ مرد لوگ جیب کا روپیہ ڈال دیتا ہے، تب کانگریس کا کام چلتا ہے۔ آپ 12 سونے کی چوڑیاں پہنے ہیں، ان کو ڈبے میں ڈال دیں۔ جس ملک میں آدمی لوگ کے پاس بدن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ہو، اور پیٹ بھر کر کھانا نہ مل سکے، وہاں پر سونا پہننا شرم کی بات ہے نا''۔

''بات تو آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ مگر یہ چوڑیاں میری اماں نے مجھے تحفے میں دی تھیں اور میرے ہاتھوں میں پہناتے وقت یہ کہہ کر دی تھی: 'خدا تمہارے سہاگ کو ہمیشہ قائم رکھے، ایک تو ماں کا تحفہ اور سب سے بڑی دعا جو کسی بیٹی کے لیے ہو سکتی ہے، وہ

ان چوڑیوں کے ساتھ شامل ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا میں ایسے تحفہ اتار سکتی ہوں؟ ہاں جب ان شاء اللہ اختر کی کمائی والی چوڑیاں پہن کر آپ کے درشن کرنے آؤں گی تو اندر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا کام کروں گی کہ ان کو پہلے فنڈ کے ڈبے میں ڈال دوں گی‘‘۔

’’آپ تو ہماری بات کوئی سا بھی نہیں مانتا۔ اچھا ایسا بات ہونا چاہیے کہ جانے سے پہلے سروجنی جی کو یہ بتا کر جانا کہ آشرم میں رہے گا اور مولانا عبدالحق شاہب کو میرا اسلام دینا۔ وہ تو ہم سے بہت بگڑ گیا ہے اُردو، ہندی دونوں زبان ان کا بھی ہمارا بھی، پھر وہ بس اُردو، اُردو کیوں کہتا ہیں؟‘‘

اتنے میں ’اینی بیسنٹ‘ ایک بکری کو رسی کے ٹکڑے سے پکڑے ہوئے چٹائی پر آئیں تو میں اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بڑی پھرتی سے بکری کے تھنوں کو اس طرح دبا رہی تھیں کہ گاندھی جی کے کھلے ہوئے منہ میں دودھ کی دھاریں سیدھی جاتیں اور وہ غٹا غٹ کر کے پی رہے تھے۔ جھک کر آداب کیا اور وہاں سے نکل کر برآمدے میں آئی تو دیکھا کہ سروجنی جی کھڑی میرا انتظام کر رہی تھیں۔ بڑے روکھے انداز سے بولیں۔ ’’حمیدہ تم بھی خوب ہو۔ بھلا کبھی باپو جی سے کسی نے ایسی باتیں کی ہوں گی؟‘‘ ’’تو وہ مجھ سے آخر یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ میں آشرم میں رہ جاؤں اور اختر چلے جائیں ولایت کو؟‘‘

’’یہ تو میں نے ان سے خود کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آشرم میں رہنے کو خود کہیں گے تو شاید تم مان لو گی تا کہ اختر کی پڑھائی مکمل ہو سکے۔ یوں میں مدراس میں جو ’برلاسٹ‘ ہے، (اختر کو) اسکالرشپ دلانے کی پوری کوشش کروں گی‘‘۔

’’اگر مل جائے تو کیا ہی کہنے! اور نہ ملے تو آپ ذرا فکر نہ کریں۔ اللہ اختر کے قلم کو سلامت رکھے۔ ہم دونوں آسانی سے گزارا کر لیں گے اور پھر میری پاکٹ منی بھی تو ہے‘‘۔ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ کر چپ ہوگئیں۔......

9 بجے رات کو حیدرآباد (بھارت) کے لیے روانہ ہوئیں۔ اس خیال سے بے حد مگن کہ اسٹیشن پر مولوی صاحب (عبدالحق) اور اختر کھڑے ملیں گے۔ گاڑی رکی، اتری تو دیکھا کہ صرف مولوی صاحب ہیں۔ جب میں نے انہیں گاندھی جی سے ملاقات کی ساری باتیں بتائیں تو خوش ہو کر بولے ’’تم نے بہت اچھا کیا، سید حسین اور لکشمی پنڈت والی بات

کا ذکر کیا۔ دیکھو بڈھا کیسا چالاک ہے، بالکل لومڑی جیسا''۔ بکری کے تھن سے تازہ دودھ پینے کے طریقے کو سن کر کہا ''میں تمہاری جگہ ہوتا تو اپنا منہ بھی کھول کر بیٹھ جاتا اور یوں شاید اپنے حصے میں بھی کچھ آ جاتا''۔ (ہم سفر از حمیدہ اختر حسین ص 206 تا 221)

بقول جناب رضی الدین سید: ''گاندھی کے کردار کی یہ نقشہ گری ایک ایسی خاتون کے قلم سے ہے جن کے شوہر اختر حسین رائے پوری کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے کہ ہم کہہ سکیں کہ خاتون نے مذہبی جوش ہی میں ان کے خلاف لکھی ہیں بلکہ درحقیقت گاندھی جی کے ساتھ ان کی یہ ایک بالمشافہ دو بدو ملاقات تھی اور انہوں نے جیسا گاندھی کو دیکھا، ویسا ہی بیان کیا۔ چنانچہ ان کے اس بیانیے کا پس پردہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ گاندھی اپنے طرزِ عمل سے قوم کو بیوقوف بنا رہے تھے۔ جس آشرم میں بھلا لاتعداد نوجوان لڑکیاں اور عورتیں، ان گنت مردوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کے دن رات گاندھی کی خدمت کے لیے رہتی ہوں، وہاں بہت سے ''غیر معمولی'' حادثات کے ہو جانے کا تصور کوئی بھی کر سکتا ہے۔

گاندھی کی یہ عجیب وغریب تصویر آپ نے ملاحظہ کی۔ اس کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا کردار بھی کچھ ایسا ہی تھا؟ کیا ان کے ساتھ بھی کبھی 'اینی بیسنٹ' بکری کا دودھ منہ میں پلاتی تھی؟ کیا ان کے ساتھ بھی کسی عورت کا اسکینڈل سامنے آیا تھا؟ کیا وہ عیسائی مورخین جو مسلمانوں کے خلاف الزامات لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، انہوں نے بھی کبھی کوئی 'ایسی ویسی' بات بابائے قوم کے ساتھ ذکر کی ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں اپنے قائد کے اجلے کردار پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینا چاہیے۔ آخر تو وہ قوم کے محسن ٹھہرے ہیں!

محمد علی جناح ایک صاف ستھرے اور شریف النفس انسان تھے جو نہ کبھی ننگ دھڑنگ رہے اور نہ کبھی انہوں نے معمولی سا غیر مہذب لباس پہنا۔ ایک طرف وہ اگر لباس کے معاملے میں اجلے تھے تو دوسری طرف دل و زبان کے معاملے میں بھی اسی طرح اجلے تھے۔ تو پھر کیسے کوئی مقابلہ کر سکتا ہے، پاکستان کے قائداعظم اور باپو موہن داس کرم چند گاندھی کا؟''

گاندھی ایک بدکردار شخصیت

''1910ء میں ایک یہودی ہرمن کیلن باخ (Herman Kallenbach) نے جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ) کے باہر 1100 ایکڑ زمین خرید کر گاندھی کے حوالے کر دی جہاں اس نے ایک آشرم قائم کیا اور اس کا نام ٹالسٹائی فارم (The Tolstoy Farm) رکھا۔ اس فارم میں گاندھی نوجوان لڑکیوں اورلڑکوں کو اکٹھا نہانے کی ترغیب دیتا اور غسل کرتی ہوئی نوخیز لڑکیوں کی ''حفاظت'' کے لیے خود وہاں موجود رہ کر ان پر ''گہری نظر'' رکھتا مگر کہتا یہ کہ میں انہیں ماں کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ رات کو کھلے صحن میں سب گاندھی کے اردگرد اکٹھے سوتے۔ اس ترغیب اور آگ اور پانی کے کھیل کا وہی نتیجہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی آگ اور پانی مل کر رہے مگر گاندھی نے اپنی خو نہ بدلی اور نہ ہی حکمتِ عملی تبدیل کی البتہ بطور سزا دولڑکیوں کے سر منڈوا دیے۔ یاد رہے کہ اس وقت گاندھی کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔

(Louis Fischer, The Life of Mahatma Gandhi, Page 137)

1920ء میں گاندھی پچاس سال کی عمر میں کرسچین مشنری کی ایک نوجوان سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ڈنمارک کی حسینہ ایستھر فیرنگ (Esther Faering) پر عاشق ہوگیا۔ گاندھی کی بیوی کستوری بائی کو جب پتا چلا تو اس نے اس گوری حسینہ کی زندگی اجیرن کر دی۔ پریشان ہوکر Esther نے گاندھی کو شکایت کی تو اس نے کستوری بائی کو ہی موردِ الزام ٹھہرا کر Esther کو تسلی دیتے ہوئے لکھا کہ اس کی بیوی واقعی بڑی نک چڑھی ہے، وہ اپنی فطرت کبھی نہیں بدل سکتی جس طرح ایک چیتا اپنے نشانوں کو نہیں بدل سکتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی کی مہاتمائی اور مقبولیت کا سورج پوری تیزی سے نصف النہار کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ اسے کسی سیکنڈل سے ہرگز زوال پذیر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کھلم کھلا اس عشق کا اظہار تو نہ کر سکتا تھا مگر دل کے ہاتھوں کیا کرتا۔ لہٰذا اپنی فطری منافقت کے عین مطابق گاندھی نے اسے ''ڈیر چائلڈ'' کے نام سے خطوط لکھنے شروع کر دیے لیکن حقیقت پھر بھی کھل کر ہی رہی۔ ان خطوط

کے چند فقرات ملاحظہ فرمایئے۔ ''میرے لیے کھل جاؤ اور مجھے اپنے اندر سما لو''۔ **(Cleft for me, Let me hide myself in Thee)** (غور کیجیے، ان الفاظ کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔ کیا کوئی بھی بزرگ یہ الفاظ ایک جوان بچی کے لیے استعمال کرسکتا ہے؟) ''تم نے اپنی محبت سے خود کو میرے لیے بہت ہی پیاری بنا لیا ہے''۔ ''تم ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہو''۔ ''کاش میں تمہارے ساتھ ہوتا''۔ ''تمہارے خیالات سے مخمور و معمور ایک اور شام آ گئی''۔ جب اس ''ڈیئر چائلڈ'' کی شادی کی خبر ملی تو بجائے خوش ہونے کے گاندھی پر کوہ غم ٹوٹ پڑا اور اس حسینہ کو فوراً خط لکھ کر بتایا کہ ''الفاظ میرا غم بیان کرنے سے قاصر ہیں''۔ اس کے بعد گاندھی کافی دیر تک بیمار پڑا رہا۔

(Collected works of Mahatama Gandhi, quoted by Stanley Wolpert, Pages. 104-106)

اپنی برہمچاری (زہد، مجردی) کو ٹیسٹ کرنے کے لیے گاندھی آشرم کی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بالکل برہنہ ہوکر سوتا تھا۔ آشرم کی ایک دوشیزہ ''لیلا وتی'' کے ساتھ ایک ایسی ہی برہنہ ہم بستری نے کافی فتنہ اٹھایا، بالخصوص ایک برٹش ایڈمرل کی بیٹی **Madeleine Slade** (جو گاندھی کی چیلی بن چکی تھی اور جسے گاندھی نے ''میرا'' کا نام دیا ہوا تھا) بہت ناراض ہوئی حتیٰ کہ وہ گاندھی کی رفاقت کو چھوڑ کر انگلینڈ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ مگر موقع شناس گاندھی نے فوراً یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ ''مجھے تو کچھ یاد نہیں مگر شاید اس کے گلے میں باہیں ڈالی تھیں۔ میں نے لیلا وتی سے صبح اس اتصال کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ اسے تو اس اتصال کا علم نہیں''۔ ذرا سوچیے کہ اگر لیلا وتی یہ نہ کہتی تو اور کیا کہتی۔ یہ وہی گاندھی تھا جس نے صرف چند دن پہلے کپورتھلہ کی راجکماری امرت کور کو ایک خط میں لکھا تھا:

"The sexual sense is hardest to overcome in my case."

ترجمہ: ''شہوانی جذبات کو قابو میں رکھنا میرے لیے سب سے مشکل امر ہے''۔

(Collected Works of Mahatama Gandhi, May 1938, quoted by Staneley Wolpert, Page 186)

اس کے باوجود ایک اور نوجوان لڑکی ڈاکٹر سوشیلا نیر کبھی کبھی گاندھی کے اوپر لیٹ کر اسے سکون پہنچاتی۔ ایک رات جبکہ سوشیلا اور گاندھی ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے تو صبح تین بجے کے قریب گاندھی اپنے بستر سے اٹھ کر سوشیلا کے بستر میں چلا گیا۔ اس کے بعد کافی شور مچا اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں بھی آئیں۔ اس سارے ڈرامے کی آوازیں نرمل بوس نے سنیں جو ساتھ کے کمرے میں سو رہا تھا۔ صبح جب بوس نے گاندھی سے پوچھا کہ رات کو کیا ہو رہا تھا تو اسے مطمئن کرنے کے لیے گاندھی نے جواب دیا کہ وہ اپنے آپ کو تھپڑ مار رہا تھا۔ (Gandhi's Passion, P 226) جب وہ برہنہ ہو کر نہاتا تو کبھی لیلا وتی، کبھی پربھاوتی (جے پرکاش نرائن کی نوجوان بیوی) اور کبھی سوشیلا غسل خانے میں موجود ہوتی مگر گاندھی نہایت ڈھٹائی سے کہتا:

"But I see nothing wrong in it..... I have never felt any embarrassment in being seen naked by a woman."

ترجمہ: ''لیکن مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی...... اگر کوئی عورت مجھے برہنہ دیکھے تو مجھے کوئی شرمندگی یا گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی''۔

اگر کوئی کسر باقی رہ گئی تھی تو یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہے کہ 77 سال کی عمر میں، بند کمرے اور خلوت میں گاندھی اپنی 19 سالہ نوجوان پوتی بھانجی ''مانو'' کے ساتھ ایک ہی بستر پر شب باشی کرتا تھا حالانکہ ''مانو'' نے اس پر یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے مگر گاندھی نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کر دی کہ فکر نہ کرو، کوئی ایسی بات کہنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ گاندھی کا ایک خط ریکارڈ میں موجود ہے جس میں اس نے لکھا ہے ''وہ میری پوری تسلی کر دیتی ہے''۔

(Collection of Works of Mahatama Gandhi, Dec. 23, 1946)

یہ وہ دن تھے جب گاندھی نے بھری محفل میں سری رامپور گاؤں میں کھلے بندوں یہ اعتراف کیا تھا کہ ''میں مہاتما نہیں، میں تمہاری طرح معمولی فانی انسان ہوں''۔ (17th December 1946) گاندھی کے ٹائپسٹ اور سیکرٹری پرسورام نے گاندھی کو ایک دفعہ بالکل برہنہ حالت میں مانو کے ساتھ ہمبستری کرتے دیکھ لیا۔

اس کو اس نا قابل یقین منظر سے اس قدر ذہنی دھچکا لگا کہ اس نے گاندھی کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر گاندھی کے ایک اور حواری پیارے لعل نے گاندھی کو بدبداتے ہوئے سنا:

''میرے دل کی گہرائیوں میں ضرور کوئی سنگین خرابی ہوگی جو میں تلاش نہیں کر سکتا...... کہیں میں صراطِ مستقیم سے بھٹک تو نہیں گیا''۔

پرسورام کی یہ چشم دید گواہی ایسی چونکا دینے والی خبر تھی کہ منہ سے نکلی اور کوٹھے چڑھی۔ جب یہ خبر ایڈمرل کی بیٹی میڈیلین سلیڈ (میرا) تک پہنچی تو وہ کانپ اُٹھی۔ گاندھی نے جو متضاد جواب اسے دیا، وہ ملاحظہ فرمانے کے قابل ہے:

''سب کچھ انسان کے خیالات، الفاظ اور اعمال کی پاکیزگی پر منحصر ہے''

مگر دوسرے ہی سانس میں یہ بھی کہہ دیا:

''ہم لفظِ پاکیزگی اکثر استعمال کرتے ہیں اور اسے ہر طرح کی بھول چوک اور کوتاہی کا بہانہ بنا لیتے ہیں''۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد تک جب یہ خبر پہنچی تو اس نے مشورہ دیا کہ ''مانو'' کو چھوڑ کر اپنے پوتے بھانے ''کانو'' کو کیوں نہیں اپنے پاس رکھ لیتے۔ گاندھی کا بیٹا رام داس بھی باپ کے اس انوکھے پن (یا بدچلنی) پر بہت پریشان ہوا۔ اس کی تسلی گاندھی نے یوں کہہ کر کر دی:

''گھبراؤ مت۔ مانو بہت سارے کام کر رہی ہے...... اور میں نے اسے کہا کہ میرے ساتھ ہم بستری کے بارے میں لکھے''۔

منی لعل گاندھی نے جب اس ہم بستری کی خبر سنی تو بھونچکا رہ گیا۔ مگر گاندھی کے اندر کے شیطان نے فوراً جواب گھڑ دیا اور اسے لکھ دیا کہ:

''مانو کے ساتھ میری ہم بستری تمہیں پریشان نہ کرے۔ میرا یقین ہے خدا نے خود مجھے یہ قدم اٹھانے کی ترغیب دی ہے''۔

19 جنوری 1947ء تک ''مانو'' نے بھی گاندھی سے ناگواری اور بیگانگی کا

اظہار شروع کر دیا۔ گاندھی مانو کے اس اندازِ برگشتگی سے بہت سٹپٹایا۔ آخر گاندھی کا مجرمانہ ضمیر رنگ لایا اور اس نے کلکتے میں اپنے ایک دوست ستیش چند مکر جی کو خط لکھ کر پوچھا:

''ایک 19 سالہ لڑکی جو رشتے کے حساب سے میری پوتی ہے، میرے ساتھ ہم بستری کرتی ہے...... کیا تمہیں اس ہمدوشی میں کوئی برائی یا ناواجبی نظر آتی ہے؟''

مگر مکر جی نے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ جب یہ مذموم خبر طشت از بام ہو ہی گئی تو کئی لوگوں نے ''مہاتما جی'' سے پوچھا کہ کیا مہاتما جی کا اتباع کرتے ہوئے ہمیں بھی جوان لڑکیوں کے ساتھ سونا چاہیے؟ گاندھی نے جواب دیا کہ یہ سب کے کرنے کا کام ہے اگر وہ انہی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھیں جو وہ رکھتا ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل یہ خبر سن کر کافی ناراض ہوا مگر گاندھی نے اسے لکھا:

''تمہیں ناشاد نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میرے خدا کے ہاتھوں میں چھوڑ دو''۔

مگر جب یہ خبر گاندھی کے سب سے بڑے فنانسر جی۔ ڈی۔ برلا کے پاس پہنچی تو اس نے گاندھی سے وضاحت طلب کی۔ اب گاندھی نے سراسیمہ ہو کر فوراً اقرار کر لیا:

''میں خدا نہیں۔ میں غلطی کر سکتا ہوں۔ میں نے غلطیاں کی ہیں۔ میری زندگی کے آخری بیکار ایام میں یہ میری سب سے بڑی غلطی ثابت ہو سکتی ہے''۔

20 اور 22 جولائی 1947ء کے درمیان ریاست ٹراونکور کے دیوان سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئیار ماؤنٹ بیٹن سے ریاست کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کرنے آئے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ریاست ٹراونکور ہندوستان کے ساتھ ہرگز الحاق نہیں کرے گی۔ اپنی پہلی نشست میں راما سوامی نے ماؤنٹ بیٹن کو مختلف اخبارات کے وہ تراشے دکھائے جن میں گاندھی کی جنسی حرکات کی بنا پر اسے شہوت پرست جنونی بتایا گیا تھا۔ یاد رہے کہ جونہی دیوان صاحب ریاست ٹرانکور واپس آئے کانگریس کے آدمیوں نے ان پر درانتی سے حملہ کر کے انہیں شدید زخمی کر کے تقریباً موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ریاست میں 15 اگست کے بعد فساد برپا کرنے کے لیے سیٹھ ڈالمیا نے کانگریس کو پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا تھا۔ یہ تھی سزا گاندھی کے خلاف آواز نکالنے کی یا

آزادی کی آرزو رکھنے کی۔

"Between 20th and 22nd July Sir C.P. Ramaswamy Aiyar, Dewan of Travancore...... at his first interview with Lord Mount Batten after producing files of Press cuttings... implying that Mahatama Gandhi was a sex maniac...... declared that the State would never accede to India. Shortly after his return to Tranvancore, Sir C.P. was violently attacked with a billhook and nearly killed."
(The Great Divide, H.V. Hodson, P 378)

لیجیے گاندھی کی مہاتمائی اور خدا رسیدگی کا پول بھی کھل گیا۔ (Gandhi's Passion, Pages 225 to 230) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گاندھی بالکل برہنہ ہو کر نوجوان لڑکیوں سے مالش کرواتا تھا۔ دیدہ دلیری ملاحظہ فرمایئے کہ یہ نام نہاد "اندر دیوتا" کہتا تھا کہ برہنگی خالص معصومیت کا اظہار ہے۔ (فریڈم ایٹ مڈنائٹ)"
(گاندھی، مسلمان اور پاکستان از ڈاکٹر سعید احمد ملک ص 140 تا 147)

دنیا بھر میں مہاتما سمجھے جانے والے گاندھی کی جنس زدہ زندگی کا مشاہدہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ بے حد مفید رہے گا۔

1- Gandhi Behind The Mask of Divinity by G.B. Singh
2- Gandhi Naked Ambition by Jad Adams
3- Sex and Power, Defining History Shaping Societies by Rita Banerji
4- Mahatma Gandhi's Letters on Brahmacharya Sexuality and Love by Girja Kumar
5- Great Soul: Mahatma Gandhi and his Struggle with India by Joseph Lelyveld

گاندھی، مسند امامت پر

"گاندھی کے خرقۂ درویشی اور ملمع مہاتمائی کا طلسم ابلیسی نہ صرف اس کی

زندگی کے دوران قائم رہا بلکہ اس کی موت کے بعد بھی بھارتی مسلمانوں بالخصوص بھارتی علمائے دین کے اذہان کو ابھی تک مسحور کیے ہوئے ہے۔ اسی طاغوتی طلسم کا اثر تھا کہ پارٹیشن اور مسلم قتل عام کے بعد بھی اس کی موت سے صرف چند یوم پہلے تک (کانگریسی) علمائے دین نے گاندھی کو مساجد کی مسند امامت پر بٹھایا جہاں وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے کی تلقین کرتا رہا۔ مثلاً جنوری **1948**ء میں گاندھی نے مہرولی (دہلی سے تقریباً سات میل دور) کی مسجد قوت الاسلام میں مسند امامت پر بیٹھ کر اپنے منافقانہ دستور کے مطابق مسلمانوں کو آہنسا کا درس دیا تاکہ مسلمانوں میں سے تحفظ کی جبلت (**Instinct**) اور روح جہاد کھینچ کر انہیں ہندوؤں کی غلامی کے لیے تیار کر سکے۔ گاندھی کو مسند امامت پر بٹھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ باون برس بعد ہندو اس مسجد کے دعویدار بن گئے۔ **14** نومبر **2000**ء کو وشوا ہند پریشد کے **400** مسلح کارکنوں نے گنیش دیوتا کی مورتی کو مسجد قوت الاسلام میں رکھ کر پوجا کرنے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ یہ مسجد پہلے مندر تھا حالانکہ یہ مسجد سلطان قطب الدین ایبک نے بنوائی تھی۔ جنوری **1948**ء کے آہنسا کے درس سے صرف چند مہینے پہلے گاندھی کے اسی مہلک مشورے پر عمل کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند بے خبری کے عالم میں مکمل طور پر منصوبہ بند مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں لاکھوں بہن بھائیوں کی جانیں گاندھی کے اسی فلسفے کی بھینٹ چڑھا چکے تھے۔ اسی لیے اس زمانے کے اعلیٰ انگریزی افسران نے گاندھی کی ناصحانہ تقاریر کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ گاندھی کے عدم تشدد کے پرچار کرنے کا نتیجہ ہمیشہ تشدد ہوتا ہے۔ (فریڈم ایٹ مڈ نائٹ صفحہ **22**)۔ حیرت کی بات ہے کہ جھوٹے مہاتما کا طاغوتی طلسم اس قدر خوفناک و مسحور کن تھا کہ متعدد سحر زدہ مسلمان اسے اپنا مسیحا مان رہے تھے بلکہ بھارتی پروپیگنڈے کے زیر اثر ابھی تک مان رہے ہیں''۔

(گاندھی، مسلمان اور پاکستان از ڈاکٹر سعید احمد ملک)

واعظِ ما چشم بر بتخانہ دوخت　　　مفتیٔ دینِ مبیں فتویٰ فروخت

چیست یاراں بعد ازیں تدبیر ما　　　رخ سوئے مے خانہ دارد پیر ما

(اقبال)

ترجمہ: ہمارے واعظ کی آنکھ بت خانہ پر لگی ہوئی ہے اور ہمارے مفتیانِ دیں فتوے فروخت کر رہے ہیں۔ دوستو! اب ہمارے لیے کیا چارہ باقی رہ گیا ہے جب ہمارے پیر نے میخانہ کا رخ اختیار کر لیا ہے۔

یک جان دو قالب

اب ابوالکلام آزاد کی گاندھی کے بارے میں عقیدت و محبت سے لبریز رائے بھی پڑھ لیں:

❑ ''غرض اس طویل مدت میں بہت سے مواقع آئے کہ ہم میں اور ان (گاندھی) میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی۔ انہوں نے اور ہم نے دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسی ہماری گردنوں میں پڑی تھی، ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے''۔ (خطبات آزاد از مالک رام ص 347، 348)

ظاہری بات ہے کہ یہ تو سیاسی رفاقت کے سن و سال اور ان میں اختلاف رائے کے طلوع و غروب کا تذکرہ ہے۔ البتہ اس خطاب میں ''دلوں کے رُخ'' اور ''گردن میں عظمت کی رسی'' اپنے ابلاغ کا تمام تر تاثر لیے، مولانا ابوالکلام آزاد کا فکری دریچہ وا کیے دیتی ہے۔ یہاں ہندوستان میں ''ابن تیمیہ'' اور بھارت کے بابائے قوم (باپو جی) مہاتما (روح عظیم) گاندھی جی کا مقام اتصال و وصال بھی ہے اور امام الہند کی فکری معراج اور گاندھی جی کے استدراج کی پرواز کا حاصل مقصود بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد بڑی آزادی سے اپنا راز خود کھولے دیتے ہیں۔ یہ ہدیہ سپاس ہے کہ اعتراف، کم و بیش جو کچھ ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنا ارشاد ہے۔ یہ نقد جان ہے کہ ہدیہ دل اس کی وضاحت خود ہیں۔ فرمایا:

❑ ''اس موقع پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے، وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آ جائے، جو میرے دماغ پر چھا جائے، اور میری گردن کو دبا لے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے

جھکا نہیں سکتا ''میری گردن کی رگیں بڑی سخت ہیں''۔ میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے تو پہلے میرا ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہین کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے، چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا، اس وقت میں ان کا معتقد نہ تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی۔ جو انسانوں کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں واضح کر دیا اور جو دن گزرا، میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں (یعنی مولانا اور پنڈت نہرو) کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن اور ہر لفظ دُھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا''۔ (خطبات آزاد از مالک رام ص 348 تا 349)

یہ اظہارِ عقیدت و اعتراف اپنی وضاحت خود ہے۔ یہاں مولانا آزاد کے گاندھی جی کے بارے میں محض عقیدہ اور کیفیت دماغ کا معاملہ تو نہیں، ان کی عظمت ''دل میں راسخ'' ہے اور راسخ العقیدہ مولانا، پنڈت کی ہمراہی میں گاندھی جی کے قرب اور تنہائی سے جو حظ اُٹھاتے رہے، وہ ان کی قلبی واردات ٹھہری ہے۔

(زوال سے اقبال تک از پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی)

؎ خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے

میر کارواں

ایک تاریخ ساز عہد آفریں شخصیت جو اپنے مداحوں اور عقیدت مندوں کی نگاہوں میں یوں نظر آتا ہے:

1- ہندو مسلم اتحاد کا نقیب وسفیر جو تیس سال تک فرشتہ اتحاد بن کر امن و آشتی کی بانسری بجاتا رہا۔

2- وقت کے فرعونوں کے لیے موسیٰ دوراں مگر دوستوں اور عقیدت مندوں کے لیے زیتون کی جھکی ہوئی شاخ نرم۔

3- آزادیٔ ہند کا وہ سرگرم مناد جو برادران وطن کی تنگ نظری اور غیر مصالحانہ بلکہ

جارحانہ رویوں سے دل برداشتہ ہوکر مسلمانوں کا بے باک پاسباں بن کر ابھرا۔

4- مصافِ زندگی میں صورت فولاد، مگر شبستان محبت میں حریر و پرنیاں کا مرقع۔

5- بزم گل میں نسیم سحری کا فرحت بخش جھونکا مگر صف جنگاہ میں وہ موج تند جولاں بھی نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا۔

6- اشتراک و اتحاد کا سہانا خواب جب منت کش تعبیر ہوتا نظر نہ آیا اور ''اکھنڈ بھارت'' کا خطرہ سامنے آ گیا تو پھر وہ ''ملک تقسیم کرو اور چلے جاؤ'' کا جوابی نعرہ بلند کرنے پر مجبور ہوا۔

7- شائستگی، جامہ زیبی اور نفاست مزاجی کا دل نشین پیکر۔ لباس اور چال ڈھال ڈوموریر (Du Murior) جیسی انگریزی برک کی خطابت میں ڈھلی ہوئی، لب ولہجہ رونالڈ کالمن کا سا، سج دھج انتھونی ایڈن جیسی، جدید لباس میں شیکسپیئر کے ڈراموں کا سجیلا ہیرو اور جب اسلامی رنگ چڑھا تو پر تکلف، بے شکن شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور جناح کیپ میں ملبوس ایک طرح دار، جوان رعنا، جو اپنے جاذبِ نظر سراپا، سحر انگیز شخصیت، گونجدار آواز اور اپنی طبعی خوش مزاجی کی وجہ سے پورے مجمع کا مرجع نگاہ بن جاتا تھا۔

8- خاتم سیاست ہند کا تابندہ گہر جس کی جوت سے ایوان عدالت، محفل سیاست اور بزم مقننّہ جگمگاتی رہی۔ سیاست جس کی رگ و پے میں رچی بسی تھی اور معقولیت اور منطقی استدلال جس کی پیشانی خطابت کے جھومر تھے۔

9- جو 1906ء سے 1936ء تک ہندوستان کی جنگ آزادی میں مجاہدانہ شانِ استقامت کے ساتھ آئینی جنگ لڑتا رہا۔ قانون ساز اسمبلیوں میں، سیاست کے اسٹیج پر، وائسرائے کی کونسلوں میں اور گول میز کانفرنسوں کے ہر ہیئت فورم میں! یہ تو دعویٰ ہے اس کی دلیل بھی سنیے۔ لارڈ منٹو سے 1910ء میں امپیریل کونسل میں اپنی کنواری خطابت میں کس نے ٹکر لی اور جرأت اظہار کا کیا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ رولٹ بل کے مسئلہ پر امپیریل کونسل کی ممبری کی

قربانی کس نے دی۔ لارڈ چیمسفورڈ سے مختلف مواقع پر کون معرکہ آرا ہوتا رہا۔ دہلی میں چیمسفورڈ کی بلائی ہوئی کانفرنس میں اس کی للکار سننے والے کانوں میں ابھی تک گونج رہی ہے۔

-10 وہ کون تھا جو لارڈ ولنگڈن سے کئی محاذوں پر معرکہ آرا رہا۔ اس ''طائر زریں بال'' کی گرفتاری کے لیے رمزے میکڈونالڈ نے جو ریشمی جال بچھائے تھے، یہ شاہین صفت انسان کس بے نیازی سے اس کی بزم سطوت سے دو بول سنا کر نکل آیا۔ ''لارڈ پیل کو کھری کھری کس نے سنائی؟ لارڈ سینکی کا ناطقہ فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں کس نے بند کیا؟ پہلی گول میز کانفرنس میں انہوں نے آزادیٔ ہند کا ساز کس مطربانہ لے میں چھیڑا جبکہ ان سے قبل کج دلے شاشتری نے صرف چند چکنی چپڑی باتوں پر قناعت کی۔ لارڈ لنتھگو کے قصر وائسرائیلٹی سے کون یہ کہہ کر اُٹھ آیا اور وائسرائے منہ دیکھتے رہ گئے کہ آپ مجھ سے منافقانہ چال چل رہے ہیں۔

کس کے جگر گداز رویہ سے 5 اپریل 1947ء کی صبح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پسینہ چھوٹ گیا اور وہ اپنے پریس سیکرٹری سے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ آج رات مجھ میں اس کا دوبارہ سامنا کرنے کا یارا نہیں۔

ماؤنٹ بیٹن کے پیہم اصرار کے باوجود وہ کون تھا جو اسے پاکستان کا ''سربراہ مملکت'' بنانے پر آمادہ نہ ہوا جبکہ نہرو اور پٹیل بخوشی یہ ''تاج شاہانہ'' اس کے سر پر سجانے کے لیے تیار ہو گئے اور پھر بھی الزام ہے کہ وہ انگریزوں کا کفش برادر اور ہندوستان کی آزادی کا دشمن تھا۔

-11 نظم وضبط کے خوگر، اصول پسندی کے پیکر اور ایک سخت قسم کے ڈسپلنرین اور اپنے عقیدت مندوں کے لیے جوئے نغمہ خواں۔

-12 آمریت کا الزام ایک تہمت بے جا ہے۔ انہوں نے سیاسی فیصلے قوم پر کبھی نہیں تھوپے، البتہ اپنے دلائل، دل نشین انداز بیان اور دل میں اُتر جانے

والی ترغیبات سے قائل کر کے نشان راہ دکھاتے تھے۔

13- دوستوں کے لیے ایک کھلی کتاب جس میں ان کی سیاسی زندگی، ان کا کردار اور مؤقف آئینہ کی طرح جھلکتا ہے۔ گو دشمنوں کو ان کی سیاسی چالیں پراسرار معلوم ہوتی ہوں۔

14- بے شک کم سخن مگر جب کہنے کی بات ہو اور مائل گفتار ہوں تو باون تولہ پاؤ رتی کی اصلی اور کھری بات کرنے والے اور وہ بھی اس طرح کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

15- 'سالہا زمزمہ پرداز، جہاں خواہد بود۔ زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ است'۔ (قوم کی دعا تھی کہ یہ آواز اسی طرح سامع نواز ہوتی ہے اور اس کی نوائے جگر تاب اسی طرح گنبد گرداں میں گونجتی رہے)

بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کو نہ فرنگ کا دام و دانہ تہہ دام لا سکا اور نہ ہنود کا مکروزور دبا اور جھکا سکا جو ان کی بڑی سے بڑی پیشکشوں کو 'بروایں دام بر مرغ وگرنہ کہ عنقارا بلند است آشیانہ' کہہ کر ٹھکراتا رہا۔ ایک نیم جان، دبی، پسی اور بکھری ہوئی قوم کو ایک لڑی میں پرو کر حیاتِ نو بخشنے والا، مسیحائے قوم، وہ ناخدائے ملت جو مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی اور ہندومت کے گرداب میں پھنسی اور ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سلامتی کے ساتھ ساحل مراد پر لے آیا اور پاکستان کی نئی مملکت اسلامیہ کی بنا ڈالی۔ یعنی ؏ نگہ بلند، سخن دل نواز، جان پرسوز کا حامل ''میر کارواں'' آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ شخصیت کون سی ہے؟ (میر کارواں محمد علی جناح از قاضی سیّد عبدالحنان)

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

کردار کی پختگی

جناب مجیب الرحمٰن شامی اپنے مضمون ''قائد اعظم کی باتیں'' میں میجر جنرل اکبر خاں سے ملاقات کا یوں ذکر کرتے ہیں:

❑ ''ہوا یوں کہ جب قائداعظمؒ بیمار پڑے اور مرض نے شدت اختیار کر لی، تو کرنل الٰہی بخش مرحوم نے شراب کی کچھ مقدار ان کے لیے بطور دوا تجویز کی اور اس پر انتہائی اصرار کیا تو قائداعظمؒ نے سختی سے انکار کر دیا اور فرمایا ''مجھے اب مرنا ہے، میں خدا تعالیٰ کے حضور شراب آلود منہ لے کر نہیں جانا چاہتا''۔ اللہ، اللہ! کیا کردار ہے؟ سچ پوچھیے تو یہی کردار کی پختگی تھی کہ قائداعظمؒ دس کروڑ مسلمانوں کے سینوں میں دل بن کر دھڑکنے لگے تھے''۔(قائداعظم: چند باتیں، چند ملاقاتیں از آفتاب احمد)

قائد اعظم فی الحقیقت ایک عظیم الشان انسان تھا
چودھویں کا چاند وہ معمارِ پاکستان تھا
سامنے اس کی نگاہ کے اللہ کا فرمان تھا
صاحبِ صدیق و یقیں تھا حاملِ قرآن تھا

یا رب! میرے وطن کی یہ کھیتی ہری رہے

احمد ندیم قاسمی کی وہ لازوال مناجات ویسے بھی دل و دماغ سے محو نہیں ہوتی، لیکن ماہِ اگست میں تو خصوصیت سے درِ دل پہ باقاعدہ دستک دینے لگتی ہے کہ ''خدا کرے میری ارضِ پاک پر اترے...... وہ فصل گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو...... یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے برسوں ...... یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو...... یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے ...... اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو ...... گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں...... کہ پتھروں کو بھی روئیدگی محال نہ ہو...... خدا کرے نہ کبھی خم، سر وقار وطن......اور اس کے حسن کو تشویش ماہ و سال نہ ہو...... ہر ایک خود ہو، تہذیب وفن کا اوجِ کمال......کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو...... خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے......حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو''۔ بے شک یہ ہر محبّ وطن کے دل سے نکلی صدا ہے، لیکن صدائیں بھی تب ہی سنی جاتی ہیں، جب ان پر یک دل، یک سو ہو کر ''لبیک'' کہا جائے۔

لگ بھاگ پون صدی سے ہم دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے

موجود ہیں۔ اس عرصے میں ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟ یہ بحث تو ہر سال ہی کسی نہ کسی انداز سے چھڑ جاتی ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ خالی خولی بحث مباحثے سے بھی کیا حاصل، بات تو اس دن بنے گی، جس دن محض جھنڈے لہرا کے، جھنڈیاں ٹانک کے، منڈیروں پہ چراغ، دیے جلا کے، ملی نغموں کی دھنوں پہ رقص ہی نہیں کیا جائے گا، یہ عزم صمیم بھی کچھ اور راسخ ہوگا کہ یہ جو آج اقبال کا خواب، قائد کی تعبیر ہمارے سپرد ہے، آنے والی نسلوں کو اس سے کہیں بہتر حالت میں سونپی جائے گی۔ وہ کیا ہے ناں ؎ موج بڑھے یا آندھی آئے، دیا جلائے رکھنا ہے...... گھر کی خاطر سو دکھ جھیلیں، گھر تو آخر اپنا ہے۔ تو اپنے گھر کو بہر طور بچانا، سنبھالنا، بنانا سنوارنا تو ہم ہی نے ہے۔ باہر سے جو آئے گا، وہ کسی مفاد کی خاطر یا نقب لگانے ہی آئے گا۔ گھر کی صفائی ستھرائی، تعمیر و ترقی کے لیے تو آنے سے رہا۔

ہم پاکستانیوں کا اگر دنیا میں کوئی ٹھور ٹھکانا ہے، تو وہ یہ ''دھرتی ماں'' ہی ہے۔ تو اس دلی تمنا، خواہش کہ ''میرے وطن یہ عقیدتیں اور پیار تجھ پہ نثار کر دوں...... محبتوں کے یہ سلسلے بیشمار تجھ پہ نثار کر دوں...... میرے وطن میرے بس میں ہو تو تیری حفاظت کروں میں ایسے ......خزاں سے تجھ کو بچا کے رکھوں، بہار تجھ پہ نثار کر دوں...... تیری محبت میں موت آئے تو اس سے بڑھ کر نہیں ہے خواہش...... یہ ایک جاں کیا، ہزار تجھ پہ نثار کر دوں...... یہ ساری عزت، یہ ساری عظمت تیرے ہی دم سے مجھے ملی ہے...... یہ دھن دولت، یہ عزت اور یہ وقار تجھ پہ نثار کر دوں''۔ اِک اِک سانس کے ساتھ دعا ہے یارب! میرے وطن کی یہ کھیتی ہری رہے...... صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے۔ (یارب میرے وطن کی یہ کھیتی ہری رہے از نرجس ملک، روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 9 اگست تا 15 اگست 2020ء)

دوقومی نظریہ اور قرارداد پاکستان

بلاشبہ بانی پاکستان، حضرت قائداعظم محمد علی جناح بیش بہا خوبیوں کے مالک اور کبھی نہ جھکنے والے بے باک لیڈر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت اس وقت اپنے ذمے لی، جب ہندوستان کے تمام مسلمان انگریزوں کی حکمرانی سے سخت مایوس

تھے، غلامی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ تاہم، قائداعظم محمد علی جناح کی کرشماتی شخصیت نے اس پژمردہ اور مایوس قوم کو چند ہی برسوں میں ایک زندہ قوم میں تبدیل کر کے انہیں یقین دلا دیا کہ ان کے دکھوں کا مداوا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کے پاس ایک آزاد، علیحدہ مملکت ہو۔ قائد کی تقریروں میں قانون سے واقفیت کے ساتھ بلا کا اعتماد اور گھن گرج بھی ہوتی تھی۔ ان کی تقریریں ایسی ہوتیں کہ دشمن بھی مسحور ہو جاتا۔ گویا ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' والی کیفیت طاری ہو جاتی۔ قائد ہمیشہ سوچ سمجھ کر بات کرتے تھے اور جب اپنی بات لوگوں تک پہنچا دیتے، تو اس پر ڈٹ جاتے۔

وقت اور حالات کے لحاظ سے انہیں خال ہی اپنی باتوں کی تردید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تاجِ برطانیہ اور ہندو سامراجی طاقتیں ان کے عزم کے آگے کچھ حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ ایک بار وائسرائے ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن قائداعظم کو اپنے کسی موقف پر قائل کرنے میں ناکام رہے، تو مایوسی کے عالم میں کہا ''میرے خدا، وہ تو برف کی طرح سرد تھے۔ میرے انٹرویو کا زیادہ وقت اسی برف کو پگھلانے میں صرف ہوا''۔ (ہیکٹر بولائتھو کی کتاب، ''جناح کری ایٹر آف پاکستان'' سے)۔ سو، ان کی شخصیت مسخ کرنے والے جان لیں کہ وہ ایک بے باک اور پراعتماد ہستی اور کسی کے بھی خواب و خیال سے بہت آگے کے انسان تھے۔ ذیل میں مردِ آہن قائداعظم محمد علی جناح کی پرزور تقریروں کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

ایگزیکٹیو کاؤنسل کے اجلاس کے دوران ایک بار انہوں نے برطانوی کمانڈر انچیف کو کھری کھری سنا دیں۔ انہوں نے کہا۔ ''کمانڈر انچیف کہہ رہے ہیں کہ ہم یک جان قوم نہیں۔ اگر بھارت کو جوڑ کے رکھنے کی بات نہ ہوتی، تو میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ کمانڈر انچیف وہاں نہ کھڑے ہوتے، جہاں وہ ہیں اور ہمارے ساتھ ایسی باتیں نہ کرتے، جیسی کہ وہ پچھلے روز کر رہے تھے۔ اس کے برعکس ہوتا یہ کہ میں ان کی جگہ پر کھڑا ہوتا اور کمانڈر انچیف کو تعمیل کے لیے احکامات دے رہا ہوتا''۔ (حسن ریاض، ''پاکستان ناگزیر تھا'')

ستمبر 1930ء میں انہوں نے کلکتہ میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں

برطانوی حکومت پر بے رحمانہ تنقید کرتے ہوئے کہا:

- ''پہلے رولٹ بل آیا، پھر سلطنتِ عثمانیہ کی تاراجی اور لوٹ کھسوٹ ہوئی۔ ایک نے ہماری آزادی پر حملہ کیا اور دوسرے نے ہمارے مذہب پر۔ مسلمانوں کی متحدہ رائے کے باوجود اور اپنے ہی دعووں کے برخلاف انہوں نے ترکی پر غیر شجاعانہ اور ظالمانہ شرائط عائد کر دیں۔ اتحادیوں نے حکم برآری کے پردے میں سلطنتِ عثمانیہ کو لوٹا اور پارہ پارہ کر دیا''۔ (ہیکٹر بولائتھو، ''جناح دی کری ایٹر آف پاکستان'')

- ''میں نے پنڈت نہرو سے پہلے بھی کہا تھا اور میں پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان میں ایک تیسری قوت بھی ہے اور وہ ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی! ہم کسی کے اشارۂ ابرو پر چلنے کو تیار نہیں اور نہ ہم کسی پارٹی کے خیمہ برادر بننے کے روادار ہیں''۔ (ہیکٹر بولائتھو، ''جناح دی کری ایٹر آف پاکستان'')

- ''پنڈت نہرو بنارس اور ماسکو کے درمیان بٹے ہوئے ہیں۔ وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہندوازم سے ناتا، دوسری طرف اشراکیت واشتمالیت سے بھی واسطہ۔ وہ ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ کیا انہیں احساس ہے کہ ان کی ہوائی باتیں اور غیر سنجیدہ تبلیغ وتلقین، انہیں کہاں لے جائے گی؟ اور وہ سادہ دل اور معصوم عوام جو ان کے پیچھے ''آمنا وصدقنا'' کہہ کر چل رہے ہیں، کہاں جا کر گریں گے؟ میں ان سے دردمندانہ گزارش کروں گا کہ خدا کے لیے زمین کی سطح پر اتر آیئے اور وہ تلخ حقائق وحالات، جن کا ہمیں سامنا ہے، ان کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیجیے۔ وہ سنگین مسائل جو چیخ چیخ کر مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیجیے۔ کیا وہ موقعے کی مناسبت سے اٹھنے کے لیے تیار ہیں؟ یا محض ''پیٹر مین'' کی طرح رہنا چاہیں گے، جو کبھی بالغ ہی نہ ہو سکا تھا؟''

(سروپالی گوپال ''جواہر لعل نہرو: اے بائیوگرافی'')

قرارداد لاہور کے جواب میں گاندھی نے جب راجِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ''QUIT INDIA، ملک سے نکل جاؤ''، تو ہمارے دور اندیش سیاستدان، محمد علی جناح نے برجستہ جواب دیا ''Divide and Quit India تقسیم کرو اور پھر نکلو''۔

ہندو لیڈروں نے چیخ چیخ کر شور مچایا کہ ''مادرِ ہند کی تقسیم؟ اس کی چیر پھاڑ؟ اس کی قطع و برید؟'' مثلاً گاندھی نے بیان دیا کہ ''یہ تو مادرِ ہند کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف ہے۔ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے پہلے میرے جسم کے دو ٹکڑے کر دو''۔ راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ ''یہ تو گئوماتا کی چیر پھاڑ ہے۔ یہ ایک روگی ذہن کی پیداوار ہے''۔ ان سب کے جواب میں قائداعظم نے للکار کر کہا کہ ''کہاں ہے وہ ملک، جس کے حصے بخرے کیے جا رہے ہیں؟ جن علاقوں پر ہمارا دعویٰ ہے، وہ تو پہلے ہی سے ہمارے علاقے ہیں۔ وہاں ہماری اکثریت ہے اور میں خواہ روگی ذہنیت میں مبتلا ہوں یا نہیں، مگر قراردادِ لاہور پر راج گوپال اچاریہ کی تنقید سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہی ہے۔ یہ ایک دانشمندانہ اور اچھی سوچی سمجھی اسکیم ہے اور اس پر سوادِ اعظم کا اجماع ہے''۔

(سروپالی گوپال ''جواہر لعل نہرو: اے بائیوگرافی'')

ایک بار لاکھوں کے جلسے میں انہوں نے برطانوی حکومت کو کھری کھری سناتے ہوئے خبردار کیا کہ ''اگر ان کے کوئی ایمان دار اور باصلاحیت کارندے ہیں، تو انہیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ ہو جانا چاہیے۔ میں انہیں اس پلیٹ فارم سے متنبہ کرتا ہوں کہ ہماری مایوسی اور تلخی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں اس سے زیادہ سخت زبان استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ آپ مسلم ہندوستان کے ساتھ جو سلوک اور نازیبا برتاؤ رکھ رہے ہیں، وہ خود آپ کے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے مسلم لیگ حکومتِ برطانیہ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ بغیر کسی غیر ضروری تاخیر کے ایک صاف اور غیر مبہم اعلان کرے، جس میں مسلمانوں کے حق خودارادی کی ضمانت ہو اور اس بات کا حتمی وعدہ کہ لاہور ریزولیشن کے مطابق ہونے والے استصواب کے فیصلے کی تعمیل کی جائے گی''۔

(اسٹینلے والپرٹ، ''جناح آف پاکستان'')

قائداعظم نے گاندھی جی کی مہاتمائیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا:

- ''انہوں نے اپنی مہاتمائیت کی تشہیر کے لیے ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں ''نائب گاندھی'' بھی بنا رکھے ہیں۔ مثلاً بہار کے گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد

بنائے گئے۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان ''ڈپٹی گاندھی'' مقرر ہوئے اور انہیں سرحدی گاندھی کے خطاب سے نوازا گیا۔ اسی طرح بلوچستان بھی ''ڈپٹی گاندھی'' کی معاونت اور عزت افزائی سے محروم نہ رہا اور عبدالصمد اچکزئی اس منصب سے سرفراز کیے گئے۔ گاندھی جی دراصل پورے ہندوستان کو ''ہندو آشرم'' بنانے پر تلے ہوئے ہیں''۔

(اسٹینلے والپرٹ، ''جناح آف پاکستان'')

❑ ''ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہمارا مطالبہ کیا ہے؟ جواب ہے ''پاکستان''۔ ہم ایک علیحدہ مملکت چاہتے ہیں، جہاں ہم اپنے تصورات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ہماری ان تجاویز پر کیا اعتراض ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا برطانیہ اپنی سنگینوں کے بل پر سارے ہندوستان کا قبضہ ہندوؤں کی اکثریت کے حوالے کر دے گا؟ اگر ایسا ہو، تو آپ عزت، انصاف اور دیانت کے تمام تقاضوں سے محروم ہو جائیں گے۔ جمہوریت ہمارے خون میں ہے۔ ہم مسلمان، اخوت، مساوات اور آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اب ہندوستان کی تقسیم کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ بس مسلمانوں کا خطہ مسلمانوں کے حوالے کیجیے اور ہندوؤں کا ہندوؤں کے''۔

(جمیل الدین احمد، ''اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف ایم اے جناح'')

❑ ''اگر ہندوستان پر ہندو استعمار پسندوں کا اقتدار قائم ہو گیا، تو یہ آپ کے لیے مستقبل میں ویسا ہی خطرہ بنا رہے گا، جیسی برطانوی شہنشاہیت ہے۔ مشرق وسطیٰ کا پورا علاقہ گویا کڑاہی سے نکل کر آگ میں جا گرے گا۔ اگر ہندوستان میں ہندو سلطنت قائم ہوگئی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں تو اسلام کا بوریا بستر گول ہو ہی جائے گا، مگر دوسرے اسلامی ممالک بھی اس کی زد میں آ جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی اور روحانی رشتے ہمیں پوری قوت سے مربوط کیے ہوئے ہیں۔ تو اگر ہم ڈوب گئے، تو سب ہی ڈوب جائیں گے''۔ (مصر سے واپسی پر قاہرہ میں دسمبر 1946ء میں عرب لیگ کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب)

❑ ''مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ عمل جراحی اور ہندوستان کی تقسیم! مسلمانوں کی وکالت کرنے والا ایک ہی فرد ہے، جبکہ کانگریس کی طرف سے کئی مدعی ہیں۔ گاندھی بے

پناہ اختیارات کے مالک ہیں، مگر ذمے داری اٹھانے سے انکاری ہیں اور نہرو اور پٹیل مختلف خیالات کے حامل ہیں۔ ادھر کانگریس بھی متواتر اپنا محاذ بدلتی رہتی ہے"۔

(ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات۔ 7 اپریل 1945ء لیری کولینز "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ")

❑ "کانگریس سے کہتا ہوں، تقسیم کرو۔ میں تمہارے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتا۔ اگر تم اس کے سوا کچھ اور کہتے ہو، تو یہ دھوکا ہے۔ ہم مساویانہ حصہ نہیں مانگتے۔ ہم ایک چوتھائی مانگتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کو تین چوتھائی حصہ دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے فلسفے، تمدن اور عقائد کے مطابق رہ سکیں اور ہم اپنے فلسفہ زندگی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہم نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے الگ ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں"۔ (نیوز کرانیکل، بمبئی 1946ء)

❑ "میری زندگی کی واحد تمنا یہی ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین و اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی ہے اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کر دیا ہے"۔

(خطاب آل انڈیا مسلم لیگ کاؤنسل 21 اکتوبر 1939ء)

(دوقومی نظریہ اور قرارداد پاکستان از رضی الدین سیّد، روزنامہ جنگ سنڈے میگزین 9 اگست تا 15 اگست 2020ء)

آزادی ایک نعمت

ہمارا وطن پاکستان جہاں ہم رہتے ہیں، وہ وطن نہیں جو وراثت میں اس کے بننے والوں کو ملا بلکہ پاکستان کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہڈیاں اینٹوں کی جگہ اور خون پانی کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی گراں قدر تخلیق کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس نے تعمیر پاکستان میں اپنا من دھن، بھائی، عزیز و اقارب قربان کیے۔ حصول پاکستان کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ کتنی ماؤں کے سامنے ان کے بچے قتل کر دیئے گئے۔ کتنی پاکدامنوں نے نہروں اور کنوؤں میں ڈوب کر پاکستان کی قیمت ادا کی۔ کئی بچے یتیم ہوئے جو ساری زندگی

والدین کی شفقت کے لیے ترستے رہے۔ 14 اگست 1947ء وہ مبارک وقت تھا جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ مسلمانوں کے اتفاق اور قائداعظمؒ کے خلوص کی وجہ سے یہ عظیم سلطنت وجود میں آئی، ہندوؤں نے طرح طرح کی مکاریوں سے پاکستان کی مخالفت کی، انگریزوں نے بھی طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، ہمیں ہر قسم کی آزادی اور سامان اور آسائش و آرائش مہیا ہے مگر یہ کبھی نہ بھولیں کہ اس میں ٹیپو سلطان کا خون، سرسید کی نگاہ دوربین، اقبالؒ کے افکار، قائداعظمؒ کی جدوجہد اور دوسرے اکابرین کا ایثار شامل ہے۔ اے میرے وطن! بیشک آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرو، یہ وطن تمہارے بزرگوں نے بہت مصیبتوں اور مشکلات سے حاصل کیا ہے۔ اے میرے ہم وطنو! یہ جو تم آزادی سے رہ رہے ہو۔ یہ بڑی مہنگی اور قیمتی ہے۔ ہم وطنو! آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے''۔

(آزادی ایک نعمت از کاشرہ کرم، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ اگست 2020ء)

تو بھی ہے ہجرت کدہ، شہر مدینہ کی طرح
ہم نے دوہرائی ہے اک رسم، آبا کی طرح

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

''پنجاب یونیورسٹی نے ان دنوں جرمن اور فرانسیسی پڑھانے کے لیے شام کی کلاسیں شروع کر رکھی تھیں۔ میں نے اور میرے رفیق کار محمد اجمل نے جرمن کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ڈاکٹر بی اے قریشی جو اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے تھے، ہمارے استاد تھے۔ ڈاکٹر صاحب جو غازی آباد کے رہنے والے تھے، خاصا عرصہ برلن میں رہ چکے تھے۔ ایک مرتبہ کئی روز کلاس میں نہ آئے۔ واپسی پر ہم نے سبب پوچھا، کہنے لگے۔ ''دلی چلا گیا تھا''۔ دلی ان دنوں آنا جانا روز کا معمول تھا۔ لوگ احتیاطاً صرف اتنا دیکھ لیتے کہ امن و امان کی صورت کیا ہے؟ کیونکہ وہاں سے اچھی خبریں نہیں آ رہی تھیں، اس لیے ہم نے پوچھا۔ ''دلی میں قیام کہاں رہا؟'' کہنے لگے ''مولانا آزاد کے ہاں''۔ یہ سن کر اشتیاق بڑھا تو میں نے پوچھا: ''مولانا کا خیال پاکستان کے بارے میں کیا ہے؟''

کہنے لگے ''میرے روبرو ایک صاحب لاہور سے وارد ہوئے تھے۔ مولانا نے ان سے پوچھا۔'' کہیے لاہور ان دنوں کیسا ہے؟ تو وہ صاحب کہنے لگے ''بڑی ناگفتہ بہ حالت ہے، ہمیں تو پاکستان چلتا دکھائی نہیں دیتا''۔ ان کے اتنا کہنے پر مولانا کا مزاج برہم ہو گیا اور وہ جوش میں آ کے کہنے لگے''۔ جایئے واپس لاہور اور پاکستان کو چلایئے۔ اب اگر پاکستان مٹ گیا تو ایشیا سے مسلمان کا نام مٹ جائے گا''۔

یہ گفتگو ہمارے لیے تعجب کا باعث تھی اس لیے کہ ہم مولانا کو اور ہی رنگ میں دیکھنے کے عادی تھے۔ کئی برس گزرے ایک محفل میں اس واقعہ کو دہرایا۔ وہاں اتفاق سے ہمارے دفتر کے فورمین محمد عثمان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عثمان ہمارے ساتھ دِلی ڈان میں کام کر چکے تھے۔ ان کی ہمدردیاں جمعیت علمائے ہند کے ساتھ تھیں۔ اس لیے وہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ دلی میں ٹھہرے رہے۔ پہلی عیدالفطر کے روز وہ آصف علی کے مکان پر قوم پرست، مسلمان راہنماؤں سے عید ملنے گئے۔ مولانا بھی وہاں موجود تھے۔ پاکستان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ''مسلمانانِ عالم کی فلاح اسی میں ہے کہ پاکستان مستحکم ہو اور پھلے پھولے''۔ (آہنگ بازگشت از محمد سعید)

قائداعظم کا مرد مومن

علامہ اقبالؒ نے اوائل 1930ء میں ایک مسلم دانشور کو بتلایا تھا کہ: ''مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کا خیال مجھے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر عبادت کے دوران آیا تھا''۔ اس دانشور کے مطابق علامہ اقبالؒ پر یہ خیال اس مشہور صدارتی خطبہ سے پہلے القاء ہوا تھا جو انہوں نے 29 دسمبر 1930ء کو الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے پہلی مرتبہ ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا خاکہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے درحقیقت تخلیق پاکستان کی پیشنگوئی اپنی ایک مشہور پرجوش نظم ''طلوع اسلام'' میں 1920/21ء میں ہی کر دی تھی۔

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی!

یہ کون مسلمان تھے جنہیں قدرت ایک عظیم ریاست کی نشانیاں عطا کرنے والی تھی؟ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی روحانی بصیرت پر یہ بھی عیاں ہو چکا تھا کہ مسلم عوام کے اس منتشر ہجوم کی قیادت کے لیے ایک عظیم راہنما کا ظہور ہوگا۔ انہوں نے **1927**ء میں اپنی ایک فارسی نظم میں نوجوانانِ اسلام کو خطاب کرتے کہا تھا:

می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما!

(وہ مرد راہنما آ رہا ہے جو غلاموں کی زنجیر توڑ ڈالے گا۔ مجھے تمہارے زندان کی دیوار میں درازوں سے یہ نظر آ رہا ہے!)

اسی ولولہ انگیز شاعرانہ کلام یعنی ''زبورِ عجم'' کی ایک اور نظم میں وہ اپنی بصیرت افروز چشم تصور میں ایک عظیم راہنما اور ایک عظیم ریاست کے جنم لینے کی پیشنگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خضر وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں
کارواں زیں وادئ دور و دراز آید بروں
من بسیمائے غلاماں فر سلطان دیدہ ام
شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں!

(حجاز کے صحرا سے ایک عظیم راہنما نمودار ہوگا جو کارواں کو گہری وادی سے باہر نکالے گا۔ مجھے غلاموں کی پیشانیوں پر شاہی جلوہ نظر آ رہا ہے۔ جو خاکِ ایاز سے شعلہ محمود بن کے نکلے گا)

جس راہنما کا علامہ اقبالؒ نے تصور کیا اور پھر نشان دہی بھی کر دی، وہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ تھا۔ یہ صرف حالات کا ہی تقاضا نہ تھا بلکہ اس میں علامہ اقبالؒ کی روحانی بصیرت بھی شامل تھی کہ انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے مسلمانوں کی قیادت کو کلی طور پر سنبھالنے پر ان الفاظ میں اصرار کیا۔ ''مسلم انڈیا امید رکھتا ہے کہ اس

نازک موڑ پر آپ کی طبعی ذہانت موجودہ مشکل صورت حال کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈ نکالے گی''۔ ایک دوسرے خط میں علامہ اقبالؒ نے لکھا: ''آپ وہ واحد مسلمان ہیں جس پر ہماری مسلم آبادی یہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس طوفان سے بحفاظت گزر جانے کے لیے آپ کی راہنمائی پر انحصار کرے جو شمال مغربی ہندوستان پر نازل ہونے والا ہے''۔

(تخلیق پاکستان پر مہر ربانی کی چھاپ از طارق مجید)

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی واحد تمنا!

دہلی میں 22 اکتوبر 1939ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے خطاب کرتے ہوئے جناحؒ صاحب نے ایک یادگار بیان دیا۔ یہ ایک انتہائی پر تاثیر بیان تھا جو اسلام کے ساتھ ان کی روحانی وابستگی اور مسلمانوں کی خاطر جس مشن کا بیڑہ انہوں نے اٹھایا تھا، اس کا مظہر تھا۔ بقول ان کے یہ ان کی زندگی کی اکلوتی تمنا تھی! ان کا یہ بیان اُردو میں شائع ہوا۔ عامۃ المسلمین کو عمومی طور پر خطاب کرتے ہوئے جناح صاحب نے فرمایا:

- ''مسلمانو! میں نے دنیا بہت دیکھی ہے۔ بہت شہرت و دولت حاصل کی۔ اب مجھے زندگی میں ایک ہی تمنا ہے کہ میں مسلمانوں کو آزاد اور خودمختار دیکھوں۔ میری خواہش ہے کہ جب میں مروں تو مجھے یہ تسلی اور ایمان حاصل ہو کہ میرا ضمیر اور میرا خدا اس بات کے گواہ ہوں کہ جناحؒ نے اسلام سے بے وفائی اور غداری نہیں کی۔ اس نے مسلمانوں کو آزادی دلانے، ان کا دفاع کرنے اور منظّم کرنے میں اپنا فرض پورا پورا ادا کیا۔ مجھے آپ سے کسی تعریف وتوصیف اور گواہی کی ضرورت نہیں۔ میری خواہش ہے کہ دم واپسیں میرا دل، میرا ایمان اور میرا ضمیر یہ گواہی دے کہ جناح! تم نے اسلام کے دفاع کا حق ادا کر دیا۔ جناح! تم نے مسلمانوں کے دفاع، تنظیم اور اتحاد پیدا کرنے کا فرض ادا کر دیا۔ میرا خدا یہ کہے کہ: بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور مسلمان ہی مرے۔ تم نے کفر کی طاقتوں کے مقابلے میں اسلام کا پرچم سربلند رکھا''۔

(روزنامہ انقلاب لاہور 22 اکتوبر 1939ء)

اس چونکا دینے والے اور دلپذیر بیان کے بارے میں جو سوال اٹھتے ہیں، ان کا مختصراً بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ بیان 1999ء میں پہلی مرتبہ ملک حبیب اللہ کی متذکرہ بالا کتاب میں میری نظر سے گزرا۔ اس میں بطور حوالہ روزنامہ انقلاب لاہور کے 22 اکتوبر 1939ء کے شمارہ کا ذکر تھا۔ قائداعظمؒ کے بارے میں ان کی پیدائش اور وفات کی برسی پر کئی دہائیوں سے نہایت باقاعدگی کے ساتھ لگاتار شائع ہونے والے مضامین اور خصوصی اخباری فیچروں میں اس نہایت اہم بیان کا موجود نہ ہونا بہت حیران کن تھا۔ شروع شروع میں اس بیان کے انگلش متن اور اُردو اخبار میں اس کے اصل متن کی تلاش بے ثمر رہی۔ میں نے کچھ متعلقہ دانشوروں اور اداروں سے تحریری رابطہ کیا۔ ان میں سے چند حضرات نے مفید اشارے دیئے لیکن حتمی جواب کسی سے بھی موصول نہ ہوا۔ کچھ نے تو یہ شک بھی ظاہر کیا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اس طرح کا بیان نہیں دے سکتے۔

اس زمانے کے انگریزی روزناموں میں اس بیان کا شائع نہ ہونا تو سمجھ میں آ جاتا ہے کیونکہ یہ روزنامے زیادہ تر ہندو کانگریس کی ملکیت تھے یا برطانوی انڈیا کی سامراجی انتظامیہ کی۔ مسلمانوں کا کوئی انگریزی اخبار نہیں تھا۔ میرے لیے بہر حال اس بیان کی صحت تسلیم کرنے کے لیے اس کے اصلی اُردو متن کا مشاہدہ لازمی تھا۔ خوش قسمتی سے قائداعظمؒ لائبریری لاہور میں روزنامہ انقلاب کی متعلقہ فائلیں مائیکروفلم پر دستیاب تھیں۔ ان میں مجھے قائداعظمؒ کا یہ مسلمہ بیان مل گیا۔ بعد ازاں نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کی وساطت سے مجھے روزنامہ انقلاب کے اس صفحے کی فوٹو کاپی بھی مل گئی جس میں یہ بیان شائع ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اگر ایک ہمہ گیر تحقیقی مہم بروئے کار لائی جائے تو کچھ دوسرے جرائد، روزنامے یا پھر کوئی مخصوص دستاویز یا دوسری یادداشتیں ضرور دریافت ہو سکتی ہیں جن میں یہ بیان درج ہو۔ علاوہ ازیں ایسی تحقیق سے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ کب اور کس طرح روزنامہ ''انقلاب'' کی یہ کہانی آشکارا ہوئی؟ اور پاکستانی عوام کو پچاس برس تک اس سے لاعلم کیوں رکھا گیا؟

مجلس عاملہ کی یہ میٹنگ دراصل وائسرائے کے ایک تازہ ترین بیان پر مسلم

لیگ کے ردعمل کا فیصلہ کرنے کے بارے میں بلائی گئی تھی۔ قائداعظم صاحب نے اپنے بیان کے آخر میں ان ولولہ خیز جذبات کا اظہار کیا۔ اس سے نہ صرف ان کے اس پختہ عزم اور جوشیلے جذبے کا اظہار مقصود تھا جو انہوں نے اس اہم مشن کی ذمہ داری خود اٹھا کر کیا تھا بلکہ اس بیان نے ان لوگوں کے منہ بھی بند کر دیئے جو کہتے تھے جناحؒ صاحب کو بھلا مذہب سے کیا سروکار؟ وہ تو سیکولر ذہن رکھتے ہیں وغیرہ۔

اخبار کی خبر کے متن میں یہ بھی ہے کہ ''عینی شاہدین کے بیان کے مطابق قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے منہ سے ان پرتاثیر الفاظ کو سن کر اکثر حاضرین آبدیدہ ہو گئے تھے''۔

(تخلیق پاکستان پر مہر ربانی کی چھاپ از طارق مجید)

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

آوازِ دوست

''اِن واقعات کو دہراتے ہوئے ہم مینار کی پہلی دو منزلوں سے آگے نکل آئے۔ مینار کی دوسری اور تیسری منزل کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ ساتھی تھک گئے اور تھوڑی دیر کے لیے گفتگو بھی بند ہوگئی۔ ہر سیڑھی پر یہ سوال دل میں اُٹھتا تھا کہ کب تک یونہی چڑھتے جائیں گے، کیوں نہ اسی جگہ ٹھہر کر دم لے لیں۔ اتنے میں ایک ساتھی نے سیڑھیوں کی چھت سے لٹکے ہوئے دو چار پرندے دیکھ لیے، کہنے لگے یہ کیا ہے، عرض کیا: یہ پرندا ہر مینار میں بسیرا کرتا ہے۔ انہیں دن میں کچھ نظر نہیں آتا اور ویسے بھی اُلٹا لٹکا رہنے کی وجہ سے انہیں ہر چیز اُلٹی نظر آتی ہے۔ ساتھی کہنے لگے ان کا قصہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ خود مسلمانوں نے اس تحریک کی کتنی مخالفت کی تھی۔ میں نے کہا یہ مخالفت کا تیسرا رخ ہے۔ مندر اور کلیسا کے بعد کچھ مخالفت ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے بھی ہوئی تھی۔ ان مسجدوں میں قوم پرست اذان تو دیتے تھے مگر وہاں جماعت اور نماز کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ایک قوم پرست مسلمان وزیراعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو جتنا ایمان گاندھی پر تھا، اگر اسی قدر اللہ پر ہوتا تو ولی ہوتے۔ ایک اور صوبے میں وہاں کے

مسلمان وزیراعظم کے بارے میں یہی بات انگریزوں کے حوالے سے کہی جاتی تھی۔علما کا ایک قافلہ بھی راہ میں بھٹک گیا۔شور ناقوس میں وہ بانگ درا سے ناآشنا رہے۔آزادی سے چار ماہ قبل لاہور میں کل ہند مسلم مجلس نے اینٹی پاکستان کانفرنس منعقد کی۔پاکستان کے قیام سے تین ماہ پہلے جمعیۃ العلما ہند کے صدر نے قائداعظم کو لکھا کہ تمام مسلمان جماعتوں کا ایک جلسہ ہونا چاہیے تاکہ یہ طے کیا جاسکے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے۔قائداعظم نے کہا کہ آپ لیگ میں شامل ہوجائیں، مطالبہ خودبخود آپ کی سمجھ میں آجائے گا''۔

....

''جب تحریک کو طلبا کی وجہ سے تقویت پہنچی تو بہت سے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان طلبا کا معیار تعلیم گرگیا ہے اور ان کی اہم درس گاہیں تباہ ہوگئی ہیں۔پنجاب کے وزیر تعلیم نے ایک اپیل شائع کی کہ اسلامیہ کالج لاہور کو تباہی سے بچایا جائے کیونکہ 1944ء میں ایم اے اور بی اے کا نتیجہ 75 اور 65 فیصد تھا اور 1946ء میں گرکر 45 اور 30 فیصد رہ گیا ہے۔اس بیان میں صاحب موصوف نے یہ نہ بتایا کہ مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں لیگ کا نتیجہ 100 فیصد رہا ہے اور ان کے اپنے صوبے میں 86 میں سے 75 نشستیں لیگ نے حاصل کی ہیں۔مجھے یہ سابق وزیر تعلیم وزارت سے علیحدہ ہونے کے پندرہ سال بعد پنجند کے ریسٹ ہاؤس میں ملے۔انہیں دیکھ کر مجھے خواجہ ناظم الدین کا ایک خط یاد آگیا جو میں نے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا۔خواجہ صاحب نے اپنے لڑکے کو جو علی گڑھ میں پڑھتا تھا لکھا کہ تم کو چاہیے کہ تحریک پاکستان کے کام میں کوئی غفلت نہ ہو، تو تم اگلے سال بھی امتحان میں بیٹھ سکتے ہو۔مگر قوم کا ایسا امتحان ہر سال نہیں آیا کرتا''۔

....

''اس تقریر کا سب سے موثر حصہ وہ اعلان ہے جو مسلم لیگ کی کونسل آف ایکشن کو اپنی خدمات پیش کرنے کے متعلق ہے۔تقریر کا ایک عامیانہ انداز یہ ہے کہ مقرر اپنے مقصد کے حصول کے لیے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کی تلقین یا وعدہ کرتا

ہے۔ چند نعرے اس موقع پر سامعین کی طرف سے بھی لگ جاتے ہیں اور بات رفت و گذشت ہو جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ پہلے ہی مال و جاہ کی قربانی دے چکے تھے اور زبان بندی کی پابندی بھی سہہ چکے تھے۔ ہر شخص ان کی ان قربانیوں کا قائل تھا مگر وہ خود انہیں ناکافی سمجھتے تھے، اس لیے ہزاروں گواہ بنا کر اجلاس میں ایک نیا عہد کرتے ہیں۔ اس کے گواہوں میں قائداعظم سامعین، سورج، ہوا اور کرو بیاں کو شامل کیا مگر اس پر اکتفا نہ کی اور خدائے قادر و قیوم کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ملتِ محمدی کے راستے میں جس دن ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور جسم زخموں سے چور ہوگا، وہ ان کے لیے عید کا دن ہوگا۔ سامعین گرما گئے، زندہ باد کے نعرے لگے، سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں آئیں، پھر سب نے بیک آواز کہا کہ وہ بھی اس راہ میں مقرر کے ساتھ قربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ایک ایسی تقریر جس پر مقرر غور و فکر کر چکا تھا اور سامعین اس کے ایک نقطہ عروج پر پہنچ کر مقرر کو اپنی خدمات پیش کر رہے تھے، یکایک مقرر اور سامعین کے ایک فی البدیہہ مکالمے سے تاثر اور کامیابی کی انتہائی منزل پر جا پہنچی۔ تقریر کے اس حصے کا اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے مگر بہادر یار جنگ کی ذات اور ان کے فن خطابت کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور اقتباس نہیں ہوسکتا۔ جونہی مجمع سے آوازیں آئیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ قربانی دینے میں دوش بدوش ہوں گے، بہادر یار جنگ نے کہا: ''اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجیے۔ میں نے اپنے جس عزم کا آج اظہار کیا ہے، وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی تیاری اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا، جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو، مسلمانو! جو تصفیے جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں، بسا اوقات آنی اور اس لیے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت میں پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں، ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین

پھول پیدا کرتے ہیں۔ جو خود فنا ہوتے ہیں اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتے ہیں۔ ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں''۔

....

''یہ سعادت قائداعظم کے حصے آئی کہ وہ جمہوری سیاست کے آغاز پر برعظیم کے مسلمانوں کے قطعی اور دوامی فیصلے کو مرتب کریں۔ اس فیصلے کو نظریہ پاکستان کہتے ہیں۔ نظریہ پاکستان کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب برعظیم میں پہلا شخص مسلمان ہوا، اس روز پاکستان وجود میں آ گیا تھا اور جب تک اس سرزمین پر ایک مسلمان بھی موجود ہے پاکستان قائم رہے گا۔ نظریہ پاکستان اور مملکت پاکستان دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق نہیں کرتے وہ ایک حادثے کے بعد یہ کہنے لگے کہ ایک خطِ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ یہ نظریہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ قائداعظم اور ان کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت کی نقشے پر۔ سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے مگر یہ نظریہ تو ایک بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لیے بھری جا چکی ہے۔ اس پر آنے والے لوگ حسب توفیق عمارتیں بناتے رہیں گے۔ کبھی چھوٹی کبھی بڑی، کبھی بہت بڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک نصف ہو گیا تو اس نظریے کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

مسلم ہند کی تاریخ میں قائداعظم کا مقام کیا ہو گا۔ یہ سوال ان کے ذہن میں بار بار اٹھتا ہے جن کے دل اس عظیم شخصیت کی یاد سے پر ہیں۔ ایک دوست نے یہ کہا کہ وہ برعظیم میں ٹیپو سلطان کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت ہیں۔ دوسرا کہنے لگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد کارزارِ کفر و دیں میں کامیاب ہونے والے پہلے مسلمان سیاست دان ہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک بقول اقبال ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا اور دوسرا دور حاضر میں ہمارے ترکش کا پہلا تیر ہے۔ تیسرے دوست نے ان دونوں سے اختلاف کیا اور کہا کہ تاریخی حیثیت رکھنے والی

شخصیات کا باہم مقابلہ محض خیال آرائی ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ تحریک اور نظریہ پاکستان کا موازنہ تاریخ کے ان واقعات سے کیا جائے جو مسلم ہند کے لیے اسی قدر اہم اور عہد آفریں تھے۔ اس طریقہ سے قائد اعظم کی جگہ تاریخ میں خود بخود متعین ہو جائے گی۔

تاریخ پر نظر دوڑائی تو کتنی ہی فتوحات اور کتنے ہی فاتح یاد آئے۔ ہم نے پہلی نظر میں تین واقعات کو منتخب کیا۔ محمود کا سومنات، شہاب الدین کا تھانیسر اور ابدالی کا پانی پت۔ سومنات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر وہ تاریخ کی رومانی شرح ہو جائے گی جسے قائد اعظم کی حقیقت پسندی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے نظر انداز کر دیا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کا مسلم ہند پر خوشگوار اثر پڑا، مگر وہ نا کافی تھا۔ کیونکہ اس کا جیتنے والا کسی اور طرف نکل گیا۔ شہاب الدین غوری کے مقصد اور حاصل سے ہم نے قائد اعظم کے نظریے اور مملکت کا موازنہ کیا تو ان دونوں میں بڑی مناسبت اور یگانگت نظر آئی۔

برعظیم کے مسلمانوں میں ملت کے وجود کا احساس اور اس کے اظہار کے لیے ایک ریاست کی اساس رکھنا بارہویں صدی میں سلطان شہاب الدین غوری اور بیسویں صدی میں قائد اعظم محمد علی جناح کے حصے میں آیا۔ شہاب الدین غوری نے برعظیم میں مسلمانوں کی جو حکومت قائم کی وہ خاندانوں اور علاقوں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ساڑھے چھ سو سال قائم رہی۔ اس عرصے میں حکومت کی استواری اور محکمی کا کام بڑے بڑے سلاطین کے حصے میں آیا۔ مگر وہ سب ایک سلسلے سے منسلک تھے جس کا بانی شہاب الدین غوری تھا۔ پھر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انگریز آئے، جمہوریت آئی، نیشنلزم آیا۔ ایک طرف ایجاد و دریافت کا ڈھیر لگ گیا اور دوسری طرف نظریات اور تعصّبات کا انبار لگ گیا۔ دنیا یکسر بدل گئی یہ نئی دنیا سیاسی تنظیم، جلسہ، جلوس، تقریر، بیان، قرارداد، مطالبہ، بحث، مذاکرات، انتخاب، قانون، آئین اور راست اقدام کی دنیا تھی۔ اس نئی دنیا میں مسلم ہند کو ایک نئے شہاب الدین غوری کی تلاش تھی، جو ایسی نئی فتوحات کرے جن کا اثر صدیوں تک محسوس ہو۔ یہ کام قائد اعظم نے کیا۔ تن تنہا اور صرف سات برس میں۔

....

''بڑے آدمیوں کے بارے میں ایک غلط فہمی مجھے یہ بھی تھی کہ قدرت نے

ان کے لیے اوصاف اور خوبیوں کی ایک علیحدہ فہرست بنا رکھی ہے جسے عام آدمی کی دسترس سے بہت دور رکھا جاتا ہے۔ قائداعظم کی ذات کا تجزیہ کیا تو یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی۔ بڑے آدمی میں وہی عام، سادہ اور چھوٹی چھوٹی خوبیاں ہوتی ہیں جن پر ہر شخص کا اختیار ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عام آدمی میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں اور خاص آدمی میں ان خوبیوں کی روح اور ان کا جوہر ہوتا ہے۔ قائداعظم کی جانی پہچانی ذات میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں نہ آئے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کی خاص خاص خوبیوں کی فہرست کچھ یوں بنے گی۔ عزم، عمل، دیانت، خطابت اور خودداری۔ ان کا عزم وہ تھا جسے یقین محکم کہتے ہیں۔ ان کے عمل کا نام عمل پیہم تھا۔ ان کی دیانت کو شاعر نے مشرب ناب اور ان کی خطابت کو سخن دلنواز کہا ہے۔ ان کی خودداری نظریہ خودی کا نمونہ تھی۔ قائداعظم کے اسلحہ میں وہ تینوں شمشیریں شامل تھیں جو جہاد زندگانی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے توشہ میں وہ تینوں خوبیاں بھی موجود تھیں جو میر کارواں کا رخت سفر کہلاتی ہیں۔ ان کے سرد اور نحیف جسم میں ہر دم دل گرم اور جان بے تاب کا لاوا ابلتا رہتا تھا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے شخص کو غیروں نے سمجھا مگر مان کر نہ دیا اور اپنوں نے مانا مگر سمجھ کر نہ دیا۔ اور یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس شخص کی تحریک کو بھی بہت سے لوگوں نے بالکل غلط جانا۔ کہنے والوں نے کہا کہ اس مطالبے کے صرف دو عناصر تھے۔ ایک شخص کی ہٹ دھرمی اور ایک انبوہ کی فرقہ پرستی۔ کہنے والے یہ بات کہتے آئے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ اس راہنما کو بھول جائیں جس نے نظریہ پاکستان کے بارے میں یہ کہا تھا:

''یہ زندگی اور موت کا معرکہ ہے اور ہماری کوشش صرف اس لیے نہیں کہ ہمیں مادی فوائد حاصل ہوں بلکہ یہ تو مسلمانوں کی بقائے روح کے لیے حیات و ممات کا مسئلہ ہے اور اسے سودے بازی سے کوئی واسطہ نہیں۔ مسلمانوں کو اس حقیت کا پورا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ہم شکست کھائیں گے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ آیئے اس دلند یزی ضرب المثل کو اپنا دستورالعمل بنائیں:

جب انسان دولت کھو دے تو کچھ نہیں کھوتا۔
اگر حوصلہ کھو دے تو بہت کچھ کھو جاتا ہے۔
آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے۔
لیکن روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

میں نے یہ اقتباس بار بار پڑھا، یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جو انتقال کے پچیس برس بعد بھی 'زندہ باد' کہلاتا ہے۔ کیونہ ہو ؎

خاکِ قبرش از من د تو زندہ تو''

(آوازِ دوست از مختار مسعود)

پختونستان کے سوال پر قائداعظمؒ کا جواب

روزنامہ ''خیبر میل'' نے 4 جولائی اور روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور نے 10 جولائی 1947ء کو خان برادران، گاندھی اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کی طرف سے پختونستان کے سٹنٹ پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے جو کچھ کہا، اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''قائداعظم محمد علی جناحؒ نے صوبہ سرحد کے کانگریسی لیڈروں کی طرف سے پیش کردہ پٹھانستان کے مطالبہ پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے سرحد کے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ آپ پہلے مسلمان ہیں پھر پٹھان اور اگر صوبہ سرحد پاکستان میں شامل نہ ہوا تو وہ تباہ ہو جائے گا۔

قائداعظم نے فرمایا کہ کانگریس 3 جون کی برطانوی سکیم قبول کر چکی ہے لیکن اب صوبہ سرحد کی کانگریس نے پٹھانستان کا شرانگیز مطالبہ کر کے آل انڈیا کانگریس کے فیصلے کی خلاف ورزی کی ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے برطانوی سکیم کی منظوری کے بعد سرحد کانگریس کے لیے اس فیصلہ کی منظوری، پابندی اور احترام ضروری ہے کیونکہ وہ آل انڈیا کانگریس کی ایک شاخ ہے۔ جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے

برطانوی سکیم کومنظور کیا تو سرحد کانگریس کے نمائندے بھی ان جلسوں میں موجود تھے لہٰذا اب کانگریس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ برطانوی سکیم کے مندرجات کا احترام کرے اور اس پر دیانتداری سے عمل پیرا ہو لیکن اس کے برعکس مسٹر گاندھی اپنی پرارتھناؤں میں جن نظریات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ خان برادران برطانوی سکیم کو ناکام بنانے کے لیے شہ پائیں۔ سرحدی مسلمانوں کو بھڑکائیں اور اس طرح سرحدی مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کریں۔

قائد اعظمؒ نے فرمایا کہ خان برادران یا کسی دوسرے شخص نے اس سے پہلے آزاد پٹھانستان کا شر انگیز مطالبہ کبھی پیش نہیں کیا تھا۔ حال ہی میں جو نیا سٹنٹ کھڑا کیا گیا ہے اور جو نئے نعرے ایجاد کیے ہیں، ان کا مقصد پٹھانوں کو گمراہ کرنا ہے۔ پٹھانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ مجوزہ پٹھانستان جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی نظریات کی اساس پر بنایا جائے گا۔ حالانکہ ابھی کل تک تو وہ متحدہ قومیت اور کانگریس کی طرف سے ہندوستان بھر کے لیے مضبوط فیڈرل حکومت کے مطالبے کے علمبردار تھے۔ اب ان میں اچانک جو نئی تبدیلی آئی ہے، وہ ایک سیاسی فراڈ ہے۔

قائد اعظمؒ نے کہا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی (جیسا کہ میں بار بار واضح کر چکا ہوں) ایسا آئین مرتب کرسکتی ہے، جس کے مطابق سرحدی عوام خود اپنی قسمت کے مالک ہوں گے اور وہ خود بھی دوسرے صوبوں کی طرح پاکستان کی وحدت یا پاکستان کی وفاقی حکومت میں ایک یونٹ کی حیثیت سے صوبہ کے عام نظم ونسق کے علاوہ اپنے سماجی، ثقافتی اور تعلیمی مسائل طے کرنے کے مجاز ہوں گے۔

انہوں نے خان برادران کے اس زہریلے پروپیگنڈا کی پرزور تردید کی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت اور قرآنی اصولوں کو نظر انداز کر دے گی۔ قائد اعظمؒ نے فرمایا کہ تیرہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں مسلمانوں کو ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود ہم قرآن کریم پر عمل کرتے رہے۔ اب دفعتاً ہم پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ خان برادران اپنے تئیں اسلام اور قرآن کے علمبردار بننے لگے ہیں، لیکن میں ان سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ جس طرح ہندو دستور ساز اسمبلی میں بلاحیل و حجت جا شامل ہوئے تھے اور جہاں ہندوؤں کی وحشیانہ اکثریت ہے، اب وہاں ان کا کیا حشر ہوگا؟

قائداعظمؒ نے کہا، خان برادران نے گزشتہ دس سالوں سے سرحد کے مسلمانوں سے جو فراڈ روا رکھا ہے، ہم اس کا پول کھولنا چاہتے ہیں۔ ماضی میں وہ کانگریس کے اشاروں پر پٹھانوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوتے رہے ہیں، مگر اب وہ زیادہ دیر پٹھانوں کو دھوکا نہیں دے سکیں گے۔

قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے اس وقت ہی محسوس کر لیا تھا کہ کہاں تو خان برادران کو ہنادو اکثریت کے ساتھ مل کر رہنا منظور تھا، لیکن جونہی مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ شروع کیا، تو باچا خان نے رنگ بدلا کہ ہم تو الگ پختونستان چاہتے ہیں کیونکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ہمارے لیے اسلامی اصولوں کے تحت زندگی مشکل کر دے گی۔ تعجب ہے کہ ایسی باتیں وہ شخص کہہ رہا تھا، جو گیتا کو نعوذ باللہ قرآن پاک کے مترادف، گاندھی کو پیغمبر کے برابر، روزے کو ہندو برت کے مماثل اور ہندومت کو آسمانی مذہب قرار دینے کے ساتھ ساتھ گاندھی کے ساتھ ''عبادت'' کرتا اور اس کے پاؤں دھونے پر اصرار کرتا تھا اور وہ شخص تھا، ولی خان صاحب کا والد خان عبدالغفار خان۔

(گاندھی کے چیلے از ضیا شاہد ص 169 تا 171)

تم اُس کے فن کی داد دو جو بیچ کر اپنا ضمیر
دربار کی زینت بھی ہے، بازار میں رسوا بھی ہے

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا قیام

آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی اپریل 1936ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء پر غور کرنے کے بعد اس کی صوبائی اسکیم کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگرچہ اس میں بڑے قابل اعتراض پہلو ہیں لیکن حالات اس کے مقتضی

ہیں کہ وہ جیسی بھی ہے اس کو اس طرح برتا جائے کہ اس سے جو فوائد حاصل ہوسکیں وہ کیے جائیں۔ دستور کی مرکزی یعنی وفاقی اسکیم کے متعلق اجلاس نے یہ رائے دی کہ وہ بنیاد ہی سے بڑی ہے، برطانوی ہند اور دیہی ریاستوں دونوں کے لیے مضر ہے۔ اور اس لیے وضع کی گئی ہے کہ ہندوستان کو کبھی ذمہ دار حکومت نہ ملے۔ لہٰذا اس قابل نہیں ہے کہ وہ منظور کی جائے۔ ایک دوسرے رزولیوشن میں یہ طے کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرے جس کے اہتمام سے یہ الیکشن لڑے جائیں جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ہونے والے ہیں اور اس کے صدر مسٹر جناح ہوں۔

اس سے قبل آل انڈیا مسلم لیگ عملی اور عوامی انجمن نہ تھی اور اس کا دستور بھی کچھ ایسا کسا بندھا تھا کہ صرف خواص ہی اس میں داخل ہوسکتے تھے۔ اب یہ مدنظر تھا کہ مسلم لیگ کو عوامی اور فعال انجمن بنایا جائے۔ ابتدائی مشورے دہلی میں ہوئے۔ اس کے بعد قائداعظم نے تمام ملک کے دورے کیے۔ بالآخر پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوگیا۔ جو چون (54) ارکان پر مشتمل تھا۔ اس میں یونٹی بورڈ، جمعیت العلما ہند، احرار اور نیشنلسٹ مسلمان، سب ہی کی قیادت تھی۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید اس میں شریک تھے۔ 8 تا 10 جون 1936ء بورڈ کا پہلا اجلاس لاہور میں منعقد رہا۔ مسلم لیگ کا انتخابی منشور (مینیفیسٹو) اس اجلاس میں پیش، اور غور و بحث کے بعد متفقہ طور پر منظور ہوا۔ علما نے یہ دعویٰ کیا کہ مجالس واضعان قانون میں جو معاملات پیش ہوں ان میں علما کی رائے فیصلہ کن ہو لیکن یہ کسی نے منظور نہیں کیا۔ ایک تو یہ کہ جمعیت العلما ہند، صرف ایک گروہ کے عالموں کی تابندہ تھی۔ اس لیے اس کو ایسے دعوے کا کوئی حق نہ تھا، پھر اگر وہ تمام ہندوستان کے علما کی بھی تابندہ ہوتی تب بھی، ایسی عمومیت کے ساتھ یہ حق ان کو نہیں دیا جاسکتا تھا۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوگئے کہ جمعیت العلمائے ہند کی رائے کو واجبی اہمیت دی جائے گی۔ (پاکستان ناگزیر تھا از سیّد حسن ریاض ص 183، 184)

قائداعظمؒ کا خطاب

''محمد علی جناح کو قائداعظمؒ کا خطاب کس نے دیا؟ اس بارے میں بھی

اختلاف ہے۔ ایم سی چھا گلہ نے اپنی سوانح میں قائداعظم کے بارے میں کئی غیر مستند اور خلاف حقیقت واقعات تحریر کیے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائداعظم کا خطاب دیا تھا۔ مسٹر چھا گلہ ایک بڑے وکیل تھے اور بھارت کے وزیر خارجہ بھی رہے۔ شاید اس لیے ان کے بیان کو لائق یقین سمجھا گیا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک مستند تاریخی حقیقت ہے کہ دہلی کے روزنامہ ''الامان'' کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین شیرکوٹی نے پہلی مرتبہ 1938ء میں مسٹر جناح کو ''قائد اعظم'' کے خطاب سے یاد کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی لیڈر جن میں مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیت علمائے دہلی بھی شامل ہیں، اپنی تقریر میں مسٹر جناح کو ''قائد اعظم'' کہہ چکے تھے۔ 1938ء ہی میں اجلاس پٹنہ میں پنجاب کے سیاسی کارکن میاں فیروز الدین نے جلسے سے خطاب کرنے سے پہلے ''قائد اعظم محمد علی جناح'' کا نعرہ لگوایا تھا جس پر حاضرین نے زندہ باد کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس اجلاس پٹنہ میں استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مسٹر عبدالعزیز نے بھی مسٹر جناح کے لیے ''قائداعظم'' کا لقب استعمال کیا تھا جس کی سب حاضرین نے پرزور تائید کی تھی۔ جہاں تک گاندھی جی کا تعلق ہے، اس بارے میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہے کہ جنوری 1940ء میں مہاتما گاندھی نے مسٹر جناح کو ایک خط میں لکھا تھا: ''آپ کو مسلم لیگی حلقوں میں قائداعظم کے نام سے پکارا جاتا ہے، کیا میں بھی آپ کو اسی لقب سے مخاطب کروں؟'' اس کے جواب میں قائد اعظم نے تحریر فرمایا: ''یہ بہت چھوٹی اور معمولی باتیں ہیں کہ آپ مجھے کس طرح خطاب کریں۔ گلاب کے پھول کو آپ چاہے کسی بھی نام سے یاد کریں، اس کی خوشبو ویسی ہی رہے گی۔'' اس سے ظاہر ہے کہ قائداعظم کے خطاب کے لیے مسٹر جناح مہاتما گاندھی کے محتاج کرم نہ تھے''۔ (علی سفیان آفاقی کا مضمون ''قائداعظم سے منسوب سیاہ جھوٹ'' مطبوعہ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، لاہور دسمبر 2017ء)

ایک عظیم لقب جو مقدر نے عطا کیا

اس بات میں بھی ایک روحانی پہلو کی جھلک ہے کہ ''قائد اعظم'' (عظیم

راہنما) کا خطاب آپ کے نام محمد علی جناحؒ کا صرف لاحقہ ہی نہیں بلکہ ہم معنی بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لقب سب سے پہلے ایک مذہبی شخصیت مولانا احمد سعید نے جامع مسجد مراد آباد، انڈیا میں 7 دسمبر 1936ء کو اپنی تقریر میں استعمال کیا۔ احمد سعید کے الفاظ تھے: ''آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا ان (محمد علی جناحؒ) سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے قائد اعظمؒ کہلانے کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں''۔

یہ خطاب ہندوستان کے مسلمانوں میں فوراً مقبول ہوگیا۔ عجیب بات ہے کہ اس کے کچھ ہی دیر اس مذہبی، سیاسی پارٹی یعنی جمعیۃ العلما ہند نے جس کا سیکرٹری مولانا احمد سعید تھا، اپنے آپ کو ہندو کانگریس کے ہمرکاب کر لیا۔ لیکن یہ خطاب قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے حصہ میں ہمیشہ کے لیے آگیا۔ تقدیر نے اپنا کام کروا لیا تھا۔ 11 اگست 1947ء کو نواب زادہ لیاقت علی خاں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی کہ 15 اگست 1947ء سے مجلس آئین ساز پاکستان کے صدر اور پاکستان کے نامزد گورنر جنرل محمد علی جناحؒ کو تمام سرکاری قوانین، دستاویزات، مکاتیب اور مراسلت میں ''قائد اعظم محمد علی جناحؒ'' کے نام مخاطب کیا جائے۔

جدید تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی کہ کسی راہنما کو اس کے اصلی نام سے بھی زیادہ اس کے تعظیمی لقب سے شناخت حاصل ہو۔

(تخلیق پاکستان پر مہربانی کی چھاپ از طارق مجید)

قائداعظم کا لقب

اس اجلاس کے دوران میں لاہور کے میاں فیروزالدین نے بڑی زوردار آواز میں ''قائداعظم'' محمد علی جناح کا نعرہ بلند کیا اور سامعین سے بھی درخواست کی کہ وہ اس کی پذیرائی کریں اور پھر اس دن سے یہی عوامی خطاب ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اس خطاب کے سلسلہ میں ایک بحث تو یہ چھڑی ہے کہ یہ خطاب سب سے پہلے کس نے دیا اور کب؟ اور پھر یہ قائداعظم نے یہ خطاب کیوں قبول کیا جبکہ اس سے پہلے وائسرائے اور گورنر انہیں ''سر'' کا خطاب دینے کی بہ اصرار پیشکش کرتے رہے اور ان کا

جواب یہی تھا کہ میں صرف مسٹر جناح کہلوانا پسند کروں گا‘‘۔ 3 جون 1947ء کے منصوبہ پر غور کرنے کے لیے جب مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس نئی دہلی کے امپیریل ہوٹل میں 9، 10 جون کو ہو رہا تھا تو والپرٹ کے مطابق ’’ہال کے اندر انہیں ’’شہنشاہ پاکستان‘‘ کہہ کر نوازا گیا مگر جناح نے فوراً اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اس خطاب کو دہرایا نہ جائے۔ میں پاکستان کا ایک سپاہی ہوں، شہنشاہ نہیں۔تو آیئے پہلے سوال کا جواب تلاش کریں۔ اس موضوع پر خواجہ رضی حیدر صاحب نے جنگ مورخہ 11 ستمبر 1991ء کے میگزین میں ’’قائداعظم کے خطاب کا ایک جائزہ‘‘ کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ان کے مطابق برصغیر میں یہ خطاب سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ ایک انفرادی رائے تھی جو مولانا آزاد کی 10 جنوری 1913ء کی ایک تقریر کی کتابی صورت میں اس کے پبلشر مشتاق احمد نے 1921ء میں ظاہر کی۔ پھر لاہور کے اخبار ’’انقلاب‘‘ نے اپنی اشاعت 6 اپریل 1938ء میں یہی خطاب ڈاکٹر مختار احمد انصاری پر چسپاں کرنے کی کوشش کی۔ یہی خطاب مولانا محمد علی کی رحلت پر دہلی کے اخبار ’’ملت‘‘ نے ان کے لیے استعمال کیا۔لیکن اس سب انفرادی اور لمحاتی خطابات کو پذیرائی حاصل نہ ہوسکی اور وہ امتداد زمانہ کی گرد میں بیٹھ گئے۔

اب رہا محمد علی جناح کے لیے اس خطاب کا معاملہ تو حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے قائداعظم کے خطاب کی سب سے پہلی تجویز جمعیت علمائے ہند کے سیکرٹری مولانا احمد سعید دہلوی نے 7 دسمبر 1936ء کو مرادآباد کی جامع مسجد میں پیش کی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا ’’آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا اس سے بہتر کوئی شخص نہیں۔لہٰذا مسلمانوں کے لیے قائداعظم ہونے کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں‘‘۔

والپرٹ کے مطابق دہلی کے اخبار ’’الامان‘‘ کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین احمد نے اخبار مورخہ 10 دسمبر 1938ء میں یہ تجویز پیش کی کہ مسٹر محمد علی جناح کو اب ’’قائداعظم کہہ کر پکارا جائے‘‘۔ پروفیسر شریف المجاہد نے مطلوب الحسن کے حوالہ سے

لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ اکتوبر 1937ء میں محمد علی جناح کو قائداعظم کے خطاب سے مخاطب کیا۔

قائداعظم دسمبر 1937ء میں بنگال و بہار کے دورے پر گئے تو کلکتہ کے اخبار ''عصر جدید'' نے اپنی 3 جنوری کی اشاعت میں ایک خبر کی سرخی میں لکھا ''گیا'' میں مسلمانانِ ہند کا قائداعظم''...... یہ سب صحیح مگر یہ حقیقت ہے کہ اس ''خطاب نوازی'' نے عوامی رخ اس وقت اختیار کیا جب پٹنہ اجلاس میں میاں فیروزالدین نے 26 دسمبر کے جلسہ میں بڑی زوردار آواز میں ''قائداعظم زندہ باد'' کا نعرہ لگایا اور پنڈال میں موجود تقریباً ایک لاکھ افراد نے اسے باآواز بلند دہرایا اور اس کی بازگشت اور گونج تمام ملک میں پھیلی۔

اب رہی بات کہ قائداعظم نے اس خطاب کی خاموش منظوری کیوں دی جبکہ اس سے پہلے انہوں نے کسی خطاب کو قبول نہیں کیا تھا؟

جہاں تک ''سر'' کے خطاب کو قبول نہ کرنے کا معاملہ ہے، وہ تو ظاہر ہے کہ یہ ایک شہنشاہی عطیہ تھا جسے جناح جیسا جمہوریت پسند قبول نہیں کرسکتا تھا۔ ''مولانا'' کے خطاب کو قبول اس لیے نہیں کیا کہ وہ نہ تو مولانا تھے اور نہ مذہبی اسکالر۔ ''ڈاکٹر آف لاٗ'' کے خطاب کو پذیرائی اس لیے نہیں بخشی کہ گو وہ ایک تعلیمی ادارہ کا بخشا ہوا خطاب ہوتا اور وہ حقیقتاً ماہر قانون بھی تھے، مگر ایک لحاظ سے اس میں ''سرکاریت'' کی بو آتی تھی۔ ''شہنشاہ پاکستان'' کا خطاب تو صریحی طور پر لغو اور ناقابل قبول تھا۔ ''قائداعظم'' کا خطاب، یہ نہ تو انگریز سرکار کی عنایت خسروانہ کا نتیجہ تھا اور نہ کوئی مذہبی عبا تھی جو حقیقتاً ان پر فٹ نہ آتی تھی اور نہ یہ چند افراد کا فیصلہ تھا بلکہ اس کی پشت پر کروڑوں مسلمانوں کی پسندیدگی اور رضا شامل تھی اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت بھی تھی کہ وہ اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔

(میر کارواں محمد علی جناح از قاضی سیّد عبدالحنان)

جریدۂ عالم پر نقش دوام

قائداعظم محمد علی جناح کا کارنامہ تخلیق پاکستان، ایک سیاسی معجزہ تھا۔ جس

نے انہیں امر بنا دیا۔ یہ درحقیقت صنم کدہ ہند میں عصائے موسوی کی ضرب خارا شگافی کی ایک جھلک تھی۔ بیسویں صدی کے اس سیاسی ''معجزۂ فن'' کی بدولت وہ جریدۂ دہر پر ایک تابندہ لکیر چھوڑ گئے اور اس کوکب کی تابانی سے برصغیر کا سیاسی افق اب بھی ضیا تاب ہے! بلاشبہ تاریخ کے شوالہ میں، انگریزی محاورہ کے مطابق انہیں میز و نمایاں طاق میسر آ گیا۔ جہاں ان کے نام کا چراغ ان شاء اللہ تا ابد جگمگاتا رہے گا۔

قائد اعظم ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ محض **Eventful** نہیں بلکہ **Event-makers** پرسنلٹی، کیونکہ انہوں نے اپنے تدبر، فراست، سیاسی بالغ نظری اور اپنے عزم آہنی سے تاریخ کے منہ زور دھارے کو موڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے بہت سے سیاسی ''بت کدہ تصورات'' کو ''ضرب ابراہیمی'' سے پاش پاش کر دیا۔ پروفیسر شریف المجاہد کے مطابق جو چیز حقیقتاً معاصر تاریخ کے طاق میں انہیں مستقل جگہ کا حقدار بناتی ہے، وہ ان کا کارنامہ حصول پاکستان ہے۔ جس نے ہندی نظام کائنات کی ہیئت ہی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا!

1940ء تک پاکستان کا قیام تو درکنار اس کا تصور ہی احمقانہ اور خندہ تحقیر کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اس کا حصول آسمان کے تارے توڑ کر لانے سے بھی زیادہ مستبعد اور بعد الامکان خیال کیا جاتا تھا۔ گاندھی جی اور تمام چھوٹے بڑے ہندو ایک زبان ہو کر وحدت ہند کا راگ الاپ رہے تھے۔ اور انگریز حکمراں بھی بشمول نویول، ایمری، ایٹلی اور ماؤنٹ بیٹن سب ان کے ہم نوا تھے مگر ع توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری کے بموجب ایک مرد راہ دان ایک بطل مجاہد اٹھتا ہے اور اپنے کرشمہ جراحی سے مادر ہند کا پیٹ چاک کر کے پاکستان کے طفل جمیل کو زندہ و سلامت نکال لے آتا ہے۔ ایسا محیر العقول کارنامہ بیسویں صدی عیسوی میں کوئی اور راہنما نہ دکھا سکا۔ اس لیے خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے تاریخ کے صفحات میں ان کا یہ کارنامہ اپنی جگہ بنا چکا۔

یہ تو عوامی سطح کی بات ہوئی لیکن مورخوں اور معاصر مصنفین اور صحافیوں کے درمیان یہ بحث اُٹھائی گئی ہے کہ کیا جناح نے ان عوامل کو پیدا کیا جو بالآخر قیام پاکستان

پر منتج ہوئے یا انہوں نے ان عوامل کو جو پہلے ہی سے ایک خاص رفتار سے بہہ رہے تھے، محض اپنے مقصد بر آری کے لیے استعمال کیا؟ یعنی کسی تاریخ ساز واقعہ کے پیدا کرنے میں کون سا عامل زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ حالات جو اس عصر آفریں کردار کو جنم دیتے ہیں یا خود وہ کردار۔ پہلا نکتہ تاریخی جبر کا فلسفہ ہے۔

عام طور پر تو یہ صحیح ہے کہ حالات کے منہ زور دھارے اور واقعات کی تند رو موجیں ہی شخصیت کے بنانے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ کوئی عہد آفریں کردار جب منظر عام پر آتا ہے تو وہ موقع کی نزاکت کے مطابق اپنی سیاسی و حربی حکمت عملی متعین کرتا ہے۔ وہ اگر ضرورت سمجھے تو ع زمانہ با تو نسازد، تو بازمانہ بساز کے کلیہ سے ہٹ کر ''تو بازمانہ ستیز کے اصول پر عمل کرنے سے بھی نہیں چوکتا، جیسا کہ جناح نے کیا۔ ایسے عصر آفریں عبقری کے جوہر، اس کی ہمت مردانہ، اس کی ''قائدانہ صلاحیتیں، اس کی شمشیر تدبیر کی آبداری، خطرات کے طوفانوں ہی میں چمکتی اور نکھرتی ہیں۔ ایسے خطر پسند انسان کو ضرب کاری، میدان جنگاہ ہی میں اپنے جوہر دکھاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت، حالات کو جو اسے وراثت میں ملتے ہیں، موڑنے، ان کی صورت گری کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی حد سے زیادہ کاوش کر کے انہیں اپنے مقاصد کے لیے سازگار و ہموار کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی ماحول میں اسی فضا میں اور اسی آب و گل میں کبھی کوئی مرد میدان ادب کوئی روحی، کوئی خیام اور کوئی مرد مجاہد اور صف شکن...... کوئی صلاح الدین ایوبی، کوئی غزنوی سامنے آتا ہے اور دنیا کو ''رعشہ سیماب'' دے جاتا ہے۔ کوئی قبلہ اوّل پر اپنا جھنڈا بلند کر جاتا ہے اور کوئی سومنات کے لات و جبل کو منہدم کر دیتا ہے مگر پھر وہی سرزمین بنجر اور بانجھ بنی رہتی ہے اور اقبال گلہ گزار ہو کر کہتا ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران، وہی تبریز ہے ساقی

اس سے معلوم ہوا کہ محض حالات کسی اہم واقعہ کو جنم نہیں دے سکتے، تاوقتیکہ

کوئی تاریخ ساز شخصیت پردہ غیب سے نکل کر تاریخی عوامل کو باہم ملا اور جوڑ کر بلوری شیشہ میں نہ ڈھال دے۔

تاریخ کی کن فیکونی کا شگوفہ اس طرح بھی چھیڑا گیا ہے کہ پاکستان کا گوہر وجود گویا تاریخ ہند کے صدف میں تھا جو مناسب وقت میں ظہور کا منتظر تھا۔ یعنی یہ کہ اس میں جناح کی کوئی خاص پرکھارت...... کوئی فیصلہ کن رول نہ تھا۔ کوئی بھی سیاست داں ہوتا تو دیر یا سویر وضع حمل ہو ہی جاتا۔

یہ نظریہ بہت حد تک غلط ہے۔ تاریخی عوامل خواہ کتنے ہی پر زور ہوں، ان کی قوت رفتار خواہ کتنی ہی تیز ہو، ان حالات سے نبرد آزمائی کے لیے اگر جناح کی شخصیت بالمقابل نہ ہوتی تو یہ معجزہ نہ اس طرح اور نہ اس وقت ظہور پذیر ہو سکتا تھا جیسا کہ ہوا۔ پنڈرل مون کا کہنا ہے کہ اگر مسٹر جناح نہ ہوتے تو پاکستان بھی معرض وجود میں نہ آتا، میرے خیال میں تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ہے کہ ایک فرد واحد نے ایسا سیاسی انقلاب برپا کیا ہو اور ان کا یہ کارنامہ دراصل اس نظریہ کی بھرپور تردید ہے کہ تاریخ سازی میں فرد کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ محض جناح تھے جنہوں نے پاکستان کو جنم دیا اور ایک نئی تاریخ بنائی۔

یہ جناح ہی کی فقید المثال قیادت تھی جس نے مسلم لیگ کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ انہوں نے اسی مردہ گھوڑے میں جان ڈالی۔ ایک جھنڈا، ایک پلیٹ فارم اور ایک نصب العین کا صور پھونکا اور پھر ''اتحاد، تنظیم اور یقین محکم'' کا نعرۂ رستاخیز بلند کیا اور بہت جلد مسلمانوں کی بکھری ہوئی ٹولیوں کی شیرازہ بندی، صف بندی کی اور اسے منظّم، مربوط اور متحد کر کے بنیان مرصوص میں ڈھال دیا۔ یہی نہیں انہوں نے اکھنڈ بھارت کے جغرافیائی اور تاریخی مفروضات کے بتوں کو جنہیں تقدیس کا درجہ حاصل تھا، منہدم کر دیا۔ پھر اس سیاسی سٹنٹ (شعبدہ گری) پر ضرب کاری لگائی کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے۔ بعد ازاں انہوں نے یہ زلزلہ افگن اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور بین الاقوامی سیاسی آئین کے ہر معیار پر وہ الگ قوم ہیں۔ اب تک یہ بات ایک

حقیقت ثابتہ بن گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان محض ایک اقلیت ہیں۔ سکھوں، پارسیوں وغیرہ کی طرح اور ایک اقلیت کی حیثیت سے وہ صرف تحفظات کا مطالبہ کر سکتے اور بس۔

حیرت کی بات ہے کہ کسی مسلمان زعما نے قائداعظم سے پہلے اس بات کو چیلنج ہی نہیں کیا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم ہیں۔ وہ سب ہندوؤں اور انگریزوں کے اس مغالطہ آمیز سیاسی شعبدہ گری کو پتھر کی لکیر کی طرح بے چون و چرا تسلیم کرتے رہے، اس پر آمنا وصدقناً کہتے رہے۔ ایسا کارنامہ کوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا عامل رجل عظیم ہی انجام دے سکتا تھا۔ (میر کارواں قائداعظم محمد علی جناح از سیّد عبدالحنان)

تحریک پاکستان

تحریک پاکستان دراصل ان تمام سابقہ تحریکوں کا نچوڑ اور تکملہ تھی۔ مذہبیت کی نشوونما دلی الہٰی تحریک نے بخشی۔ سرفروشی کی غذا مجاہدین کی عزیمت سے ملی۔ سیاست کے اسرار و رموز سے آگاہی علی گڑھ تحریک کے ذریعہ آئی اور حکمرانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ اور عوامی رابطوں کا طریقہ تحریک خلافت نے سکھایا اور پھر ان سب عناصر کو بہم آمیز کر کے ایک زبردست متحرک اور سریع الاثر تحریک برپا کرنے کا سہرا مسیحائے قوم محمد علی جناح کے سر ہے۔

وہ فی الحقیقت اس تحریک کے سرخیل ہی نہیں اس کا ''دیدۂ بینا'' ''گوش شنوا''، ''زبان گویا'' دھڑکنے والا دل، ذہنی وفکری کمپیوٹر اور فولادی دست و بازو تھے۔ یہ جناح ہی کی سیاسی کیمیا گری تھی جس نے مسلمانوں کے مس خام کو کندن بنایا، اس غول بیابانی کو ایک کارواں بنایا۔ اس کو ایک پلیٹ فارم اور جھنڈے تلے جمع کیا۔ اس کے اندر عزم وعمل کی روح پھونکی اور پھر وحدت فکر وعمل سے آشنا کر کے ایک مہر زدہ اقلیت کو آزاد و خود مختار قوم کا تاج زریں پہنایا۔ بہتر فرقوں میں بٹی ہوئی جماعت کو ایک ملت واحدہ بنایا۔ تحفظات کی بند گلی میں محصور جماعت کو آزادی کا آسمان بیکرانہ عطا کیا۔ غلامی پر رضا مند، افرنگ کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑنے پر خورسند، کوکنار کے خوگر اور زنار پوشی پر آمادہ، کرگسوں میں پلے ہوئے فریب خوردہ شاہین کو رہ و رسم شاہ بازی سے آشنا کیا اور

''قلب گوسفند'' میں چیتے کا تہور پیدا کرنے کی کوشش کی اور یاد رہے کہ اس شخص نے یہ کارنامہ اس وقت انجام دیا جب اس کا شباب شیب میں ڈھل چکا تھا۔ جب اس کی عمر کا آفتاب لب بام پر آ گیا تھا۔ جب اس کا ہمیشہ سے کاہیدہ جسم، کاہیدہ تر ہو گیا تھا اور یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ میدان وغا میں آنے سے پہلے وہ خانقاہی (خلوت پسند) ہی تھا۔

مگر یہی آرام طلب اور نحیف و ناتواں جناح جب مسلمانوں کی مسیحائی کے لیے اٹھا تو اس نے تحریک پاکستان کو چند سالوں میں اپنی اعلیٰ تنظیمی اور قائدانہ صلاحیتوں، سیاسی راہنمائی اور حقیقت پسندانہ، موقع شناسانہ، پرعزم و اعتماد رہبری سے متحرک، آتش بداماں بلکہ آتش فشاں بنا دیا اور پھر پانچ سال کی مدت میں دس کروڑ مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان پر چٹان بنا کر کھڑا کیا۔ ان کی حقیقت پسندی اور گہری سیاسی بصیرت نے انہیں اعلیٰ درجہ کا شعور وقت عطا کیا جو کسی دوسرے ہندوستانی راہنما میں مفقود تھا۔

(میر کارواں قائداعظم محمد علی جناح از سیّد عبدالحنان)

قرآن مجید اور قائداعظم

معروف دانشور اور کالم نگار جناب شاہ نواز فاروقی اپنے مضمون ''قرآن کی تعلیم اور سیکولر عناصر'' میں لکھتے ہیں:۔

''قرآن کے ساتھ قائداعظم کے گہرے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے ہم مذہبی اسکالروں کی سند بھی لا سکتے ہیں، مگر بہتر ہے کہ اس سلسلے میں برطانوی نژاد محقق خاتون سلینا کریم سے رجوع کیا جائے، جنھوں نے قائداعظم پر ایک ضخیم کتاب Secular Jinnah And Pakistan: What The Nation Doesn't Know لکھی ہوئی ہے۔ چودہ ابواب پر مشتمل اس کتاب کے ایک پورے باب کا عنوان ہے: The Quran and Jinnah's Speeches، یعنی قرآن اور جناح کی تقاریر۔ اس باب میں سلینا کریم صاحبہ نے سات موضوعات پر قائداعظم کی تقاریر کے اقتباسات پیش کیے ہیں اور پھر وہ قرآنی آیات درج کی ہیں، جن سے قائداعظم کے سات بیانات برآمد ہوئے ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: Secular

Jinnah And Pakistan (235 تا 252) اس باب کے اختتام پر سلینا کریم اس نتیجے پر پہنچتی ہیں:

ترجمہ: یہ مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ جناح کس پرجوش طریقے سے قرآنی اصولوں کی لفظی اور معنوی اعتبار سے پاس داری کرتے تھے۔ وہ خاص طور پر قرآن کے اصول توحید کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے''۔

(ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن اگست 2020ء)

کف صبا پہ مہکتا ہوا گلاب تھا وہ

نماز اور قائد اعظمؒ

میرے والد صاحب ابوبکر بیگ مرحوم کے پاس مسلم لیگ کا کچھ پریس فنڈ تھا۔ پاکستان قائم ہوا، تو انہوں نے اس سلسلہ میں قائد اعظمؒ سے ملاقات کرنا چاہی۔ میں نے قائدؒ کے اے ڈی سی سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے اگلے روز سات بجے شام کا وقت دیا۔ ہم مقررہ وقت پر پہنچ گئے، لیکن قائد اعظمؒ آدھ گھنٹہ لیٹ آئے۔ یہ بالکل نئی بات تھی، لیکن قائد اعظمؒ نے آتے ہی کہا:

''معاف کرنا، اے ڈی سی نے غلطی سے آپ کو نماز کے ٹائم پر مدعو کرلیا''۔

گویا قائد اعظمؒ مغرب کی نماز پڑھ کر ہمارے پاس تشریف لائے تھے۔

دراصل قائد اعظمؒ کوئی کام دکھاوے یا واہ واہ کروانے کے لیے نہیں کیا کرتے تھے۔

(حسین بیگ محمد) آل انڈیا مسلم لیگ ممبئی کے راہنما

(قائد اعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص 11)

شوق اگر ترا نہ ہو، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

ہندو مسلم اتحاد، ناممکن

''یہ 9 مارچ 1944ء کا ذکر ہے۔ اسٹریچی ہال کے اندر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے جتنے اضافی حاضرین باہر جمع تھے، اتنے اس سے پہلے اور اس کے بعد دیکھنے میں

نہیں آئے۔ وہ بھیڑ لگی تھی کہ اُردو کہاوت کے مطابق سایہ پیا جاتا تھا۔ فارسی میں over Flow کو سرشار شدن کہتے ہیں۔ ہجوم سرشاری کی کیفیت سے دوچار ہے۔ یہ جولائی 1943ء کے قاتلانہ حملے کے بعد قائداعظم کا پہلا دورہ ہے۔ علی گڑھ ان کی تقریر کا بڑی توقعات اور شدت کے ساتھ انتظار کر رہا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی زوردار اور طویل تقریر کے درمیان میں پہنچ کر قائداعظم نے آواز بلند کی، شہادت کی انگلی کو استقلال اور تاکید کے لیے دو ایک بار حرکت دی اور کہا:

Division of India is inevitable, Blending two nations-Hindus and Musalmans-is an impossibility and Pakistan is a certainty.

ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے۔ دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کا ایک ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ پاکستان کا وجود میں آنا یقینی ہے۔

میں نے یہ اعلان ایک عالم سرشاری میں سنا۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس اعلان کے ساتھ ہی پاکستان وجود میں آ گیا ہے۔ میں اس وقت اسٹریچی ہال کی پست اور مختصر سی اسٹیج کے نیچے قائداعظم کے قدموں میں بیٹھے ہوئے طلبہ میں شامل ہوں''۔

(حرف شوق از مختار مسعود)

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں

''(ابوالکلام آزاد کے) قلعہ احمد نگر میں لکھے ہوئے اکیس خطوط میں سے نو کا تعلق ایام اسیری کے معمولات، محسوسات اور کیفیات سے ہے۔ گرفتاری کی تفصیل، اسیری اور تنہائی، عدم مشاغل کی سرگردانی، احمد نگر کا موسم، سحر خیزی، جام صبح گاہی، گل یاسمن کی خوشبو والے سبز قہوہ کی تیاری جیسے کوئی سردیوں کی صبح آہستہ آہستہ وضو کرے اور پھر اس کی جرعہ کشی جیسے کوئی شکرانے کے نوافل ادا کر رہا ہو۔ ایک عام سے عمل کو مولانا کی انشا نے عبادت کے درجہ تک پہنچا دیا۔

دس خطوط کا تعلق فلسفہ مذہب، ادب اور تاریخ سے ہے۔ خدا کا وجود، انسان کی ہستی، زندگی اور وقت کی تقسیم، تقلیدی ایمان کی چشم بندیاں اور انانیتی ادب۔ دو خط

باقی رہ گئے۔ ایک خط خانگی نوعیت کا ہے۔ یہ خاموش طبع اور تنہائی کی ماری ہوئی بیوی کی علالت اور انتقال کے بارے میں ہے۔

موضوع اور متن کے اعتبار سے خطوط کی اس تقسیم کے بعد صرف ایک خط بچتا ہے۔ آخری خط جس کا شمار چھبیس ہے اور جو اس مجموعہ کا طویل ترین خط ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا ہیرہ سترہ سالہ نوجوان ابوالکلام ہے۔ ایک دینی گھرانے کا مرشد زادہ جس کے دل میں موسیقی سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ سکھانے والا اس کے گھر نہیں آ سکتا تھا اور وہ سکھانے والے کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے مسیتا خاں کو استاد منتخب کیا اور ایک رازدار کا گھر چنا گیا جہاں وہ دو چار سال تک موسیقی کا مطالعہ اور اس کی مشق کرتا رہا۔ مسیتا خاں کلکتہ کی طوائفوں کا معلم تھا۔ ابوالکلام کے والد کا مرید ہوا تو پرانا پیشہ چھوڑ کر کسی زمیندار کی نوکری کر لی۔ مولانا آزاد نے تین سال کی نظر بندی میں جو خط لکھے، ان میں سے آخری خط کے پہلے حصے میں موسیقی سے اپنے شغف اور لڑکپن میں اس کو خفیہ رکھتے ہوئے سیکھنے کا ذکر کیا ہے۔ خط کے دوسرے حصے میں انہوں نے اورنگ زیب عالم کو ایک اینٹی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ زین آبادی سے عالم گیری شیفتگی کے واقعات انہوں نے شاہ نواز خاں کی کتاب مآثر الامرا سے لیے ہیں۔ اس آخری خط میں اور بھی کئی لوگوں کا ذکر ہے مگر وہ سارے کے سارے معاون اداکار ہیں۔

احمد نگر سے رہائی کے وقت جب مولانا آزاد نے غبار خاطر کی اشاعت کا فیصلہ کیا، اس وقت دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ جرمنی ہتھیار ڈال چکا تھا۔ جاپان ڈالنے والا تھا۔ برعظیم کی جدوجہد آزادی گفت وشنید کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات اور سیاسی تنہائیوں میں بے حد اضافہ ہو چکا تھا۔ شملہ کانفرنس، کابینہ مشن، عارضی حکومت، مرکزی الیکشن، صوبائی الیکشن۔ جولائی 1945ء میں شملہ کانفرنس کے موقع پر مسلم لیگ نے مولانا آزاد کو مسلمانوں کا نمائندہ ماننے سے انکار کر دیا۔ وائسرائے ویول کی رپورٹ کے مطابق ستمبر 1945ء میں کانگریس کے اجلاس میں پچیس ہزار حاضرین نے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لعل کا والہانہ استقبال کیا۔ مولانا

آزاد اجلاس میں شامل ہونے کے لیے آئے تو ان کی آمد بمشکل چند وفادار متعلقین کو متوجہ کر سکی۔ انہی دنوں وائسرائے نے برطانوی کابینہ کو خفیہ اطلاع دی تھی کہ جناح تقریباً 99 فیصد مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وائسرائے نے یہ بھی لکھا تھا کہ مولانا آزاد پرانی وضع کے دانشور ہیں اور میرے خیال میں کانگریس کی سیاسی پالیسی بنانے میں ان کا نمایاں عمل دخل نظر نہیں آتا۔ ان کی سب سے بڑی خواہش جناح اور مسلم لیگ سے بدلہ لینا ہے جو انہیں حقارت سے کانگریس کا وظیفہ خوار ملازم قرار دیتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس زمانے کے خفیہ محرمانہ (Top Secret) دستاویزات میں درج تھیں اور آج کل ہر پڑھنے والے کی دسترس میں ہیں۔ مولانا آزاد ان دنوں بہت تنہا اور بہت پریشان تھے۔ وہ لڑکا جسے عنفوانِ شباب میں نابغہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور ہر وقت مداحین میں گھرا رہتا تھا، اس کے لیے وہ پختہ عمر کتنی تکلیف دہ ہوگی جب انہوں نے اسے نابکار قرار دے کر اس سے قطع تعلق کر لیا ہو۔ مولانا آزاد نے سوچا ہوگا کہ ایسے خراب، نازک اور سنجیدہ سیاسی ماحول میں موسیقی والے خط کا شائع کرنا ایک بے موقع اور بے حکمت بات ہوگی۔

غبارِ خاطر شائع ہوئی۔ اردو ادب میں ہل چل مچ گئی۔ اس کتاب کی ایسی شاندار پذیرائی ہوئی جو اس سے پہلے اُردو نثر کی کسی غیر افسانوی کتاب کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ ادب کے قاری نے مولانا کی سیاست سے قطع نظر کرتے ہوئے ادب عالیہ کے اس شاہکار کو بہت سراہا۔ پڑھنے والوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ مصنف بڑی شان سے اس پل کو پار کر کے چھاپے خانے پہنچا اور روکا ہوا خط اشاعت کے لیے دے دیا۔

یہاں رک کر ہم دو معاون اداکاروں کا ذکر کر لیں، پھر آگے بڑھیں گے۔ پہلے کا نام فیلکس منڈل سان (Felix Mendelssohn) ہے۔ یہ جرمن موسیقار دنیا کے عظیم ترین آہنگ سازوں (Composers) میں شمار کیا جاتا ہے۔ نو سال کی عمر میں وہ اسٹیج پر پہلی بار پیانو بجانے والے کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ پندرہ سال کی عمر سے پہلے ہی وہ کتنے ہی آہنگ ترتیب دے چکا تھا اور کتنے ہی نغمے

تصنیف کر چکا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے وہ نغمے تصنیف کرنے شروع کر دیئے جو اس کی دائمی شہرت کے ضامن ہیں۔ اس نے سب سے پہلے شیکسپیئر کے ڈرامے A Midsummer Night's Dream کی افتتاحی موسیقی ترتیب دینا شروع کی جسے سننے والوں نے غیر فانی اور فراموش نشد نی قرار دیا۔ اس کے کامیاب اور قابل رشک نغمات میں سے دو کے عنوانات ایسے ہیں کہ کارشناس حضرات ان ناموں کو سن کر ہی جھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک نغمے کا نام ہے سرزمین خواب و خیال کی موسیقی، دوسرے کا نام ہے، بے الفاظ نغمے۔ اس کے مشہور نغموں میں اطالوی سمفنی، اسکاتلندی سمفنی، آغازِ عمل کی موسیقی، قطعہ موسیقی و آواز ہمراہ بگفتار (Oratorio) اور وایولن (ولایتی سارنگی) کے کنسرت شامل ہیں۔ اس کا انتقال 1847ء میں اڑتیس سال کی عمر میں ہوا تھا۔ غبار خاطر کے آخری خط کی اشاعت قارئین کے لیے بڑی حیرت کی بات تھی۔ کسی کو پتا بھی نہ تھا کہ مولانا آزاد مغربی اور مشرقی علم موسیقی کے اتنے بڑے عالم ہیں۔ مولانا نے اسی خط میں طنطا کی عالمہ طاہرہ کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی ہے کہ مصر میں مغنیہ کو عالمہ یعنی موسیقی کا علم جاننے والی کہا جاتا ہے''۔

(حرف شوق از مختار مسعود)

قائداعظم: ایک اسلامی سکالر

بمبئی میں قائداعظمؒ کے پڑوسی اور ان کے ذاتی دوست اے بی۔ اکرم کہتے ہیں:

''بعض لوگ ہمارے قائداعظمؒ کی عظمت گھٹانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔ وہ کچھ یوں بات کریں گے: ''جی وہ آدمی تو بہت اچھے ہیں۔ بس ذرا اسلامی تعلیمات سے نابلد تھے''۔ میرے نزدیک قائداعظمؒ پر اس سے بڑا کوئی الزام نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ان کے ساتھ دوستانہ نوعیت کے تعلقات تھے اور دوست، دوست کا محرم راز ہوتا ہے۔ جب ان سے اسلام پر گفتگو ہوتی، تو وہ اپنی معلومات اور حاصل مطالعہ کے دریا بہا دیتے۔ درحقیقت وہ تو اسلامی سکالر تھے۔ جتنا اسلامی تعلیمات کا مطالعہ اور علم ان کا تھا، شاید ہی اس دور کے کسی سیاسی لیڈر کا ہوگا۔ بات صرف مطالعہ ہی

تک محدود نہ تھی، وہ ایک عملی مسلمان تھے اور اس بات پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ دوقومی نظریہ کے بارے میں جہاں بڑے بڑے عالم پھسل گئے، قائداعظمؒ اس پر چٹان کی طرح ڈٹ گئے اور دنیا میں نظریہ کی بنیاد پر ایک عظیم مملکت کی بنیاد رکھنے کی تاریخی مثال قائم کی۔ وہ نظریہ قرآن وحدیث کا فیصلہ تھا جس کے ذریعے قائداعظمؒ نے مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اسلامی تعلیمات سے نابلد کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ جس چیز کا انسان کو علم ہی نہ ہو، اس پر اپنی جان جیسی عزیز، انمول چیز کیسے قربان کرسکتا ہے؟

اے۔ بی۔ اکرم صاحب بتاتے ہیں کہ ایک اور واقعہ میرے ذہن میں آتا ہے۔ 1935ء میں ہم عیدالفطر کی نماز ادا کرنے گئے۔ ہمارے ساتھ ہندوستان میں افغانستان کے سفیر مارشل ولی خان بھی تھے۔ ہم دونوں نے قائداعظمؒ سے کہا کہ آج وہ نمازِ عید کی امامت کروائیں، لیکن وہ اس خیال سے امامت کروانے پر تیار نہ ہوئے کہ مہمان (مارشل ولی خان) کے ہوتے ہوئے وہ امامت کیسے کرواسکتے ہیں؟ چنانچہ عید کی نماز مارشل ولی خان نے پڑھائی۔ ہمیں بخوبی طور پر معلوم تھا کہ قائداعظمؒ ہر لحاظ سے امامت کے اہل تھے، اسی لیے ہم نے ان سے درخواست کی تھی۔ اگر وہاں مارشل ولی خان نہ ہوتے تو قائداعظمؒ یقیناً امامت کے لیے آمادہ ہوجاتے۔

(قائداعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص12، 13)

انگریز کا ٹوڈی یا باغی؟

کانگریس کے شاطر بنیئے، قائداعظمؒ کی شخصیت کو دبانے اور عوام کی نظروں سے گرانے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت باقاعدہ مہم چلاتے رہے۔ نام نہاد قوم پرست مسلمان تو کانگریس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اخلاقی حدود تک پار کر جاتے تھے۔ قائداعظمؒ نے ایک پارسی خاتون کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان سے شادی کا ''گناہ'' کیا تو کانگریس اور اس کی ہم نوا مسلم تنظیموں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

1- کیا صوبہ سرحد کے ڈاکٹر خان صاحب کی انگریز بیوی مسلمان تھی؟

2- ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی صاحبزادی کی شادی خود ایک سکھ نوجوان سے کروائی، کیا سکھ مسلمان ہو گیا تھا؟

3- دہلی کے کانگریسی راہنما بیرسٹر آصف علی نے ہندو لڑکی ارونا سے شادی کی تو کسی کانگریسی مولوی نے ان سے ارونا کے اسلام قبول کرنے اور نکاح نامے کے بارے میں زبان نہ کھولی۔

رتی بائی کے اسلام لانے اور قائداعظمؒ سے باقاعدہ نکاح پڑھانے کے معتبر گواہ اور دستاویزی ثبوت موجود ہونے کے باوجود تنخواہ دار مولویوں نے ان کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کرنے میں شرم محسوس نہ کی۔ کردار کشی کی اس مذموم مہم کے پیچھے جس ''انگریز دشمن'' کانگریس کا ہاتھ کام کر رہا تھا، اس کی اپنی حالت یہ تھی کہ ایک گروپ ''انقلاب زندہ باد'' اور ''ہندوستان چھوڑ دو'' کے نعرے لگاتا تھا، تو دوسرا گروپ خفیہ طور پر انگریز کے ساتھ مضبوط روابط قائم کیے ہوئے تھا۔ ''ٹوڈی'' جناح نے تو کرپس اور ماؤنٹ بیٹن جیسے بااثر اور مقتدر انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور انگریز دشمن کانگریس نے اصولوں کے بجائے مفادات کی سیاست کرتے ہوئے آزادی کے بعد بھی ایک انگریز ہی کو آزاد بھارت کا پہلا گورنر جنرل بخوشی قبول کر لیا جبکہ ''ٹوڈی'' جناح نے اس انگریز کو ہندو پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل قبول کرنے سے دوٹوک جواب دے دیا۔

لارڈ ولنگڈن بمبئی کا گورنر تھا۔ اس متکبر اور بدمزاج گورنر سے بمبئی کے عوام الناس خوش نہیں تھے۔ جب وہ اپنے عہدے کی مدت پوری کر کے واپس انگلستان جانے والا تھا، تو بمبئی کے شیرف نے دیگر سرکار پرست افراد کی مدد سے ٹاؤن ہال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس کا مقصد جانے والے گورنر کو خراج تحسین پیش کرنا تھا۔ اگرچہ یہ پروگرام بڑی رازداری سے طے پایا تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح اس کی اطلاع بمبئی کے عوام کو بھی ہو گئی۔ قائداعظمؒ کے دوست کانجی دوارکاداس کا بیان ہے کہ ہم تین سو آدمی جناح کی راہنمائی میں ایک رات پہلے ٹاؤن ہال پہنچ گئے تاکہ صبح جونہی ہال کے دروازے کھلیں، سب سے پہلے اندر گھس جائیں۔ اگلے روز ہم صبح آٹھ بجے ہال کے

اندر تھے۔ شیرف اور اس کے آدمیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح تقریب شروع کی جا سکے، مگر ٹاؤن ہال کے اندر اور باہر تو عوام کا اتنا ہجوم جمع ہو چکا تھا کہ تقریب کے منتظمین پریشان ہو کر رہ گئے۔ عوام نے جناح اور بیگم جناح کی قیادت میں لارڈ ولنگڈن کے خلاف مظاہرہ شروع کر دیا۔ شیرف نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس طلب کر لی۔ پولیس نے پوری شدت سے لاٹھی چارج کر کے صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی، عوام نے اپنے قائد کو پولیس کی لاٹھیوں کی زد میں پایا، تو وہ مزید بپھر گئے اور بالآخر انتظامیہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ جس جگہ یہ ہنگامہ ہوا تھا، بعد ازاں جناح کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسی جگہ عوامی چندہ سے ایک ہال تعمیر کیا گیا جسے جناح ہال کا نام دیا گیا اور سڑک کا نام جناح روڈ رکھ دیا گیا۔

قائداعظمؒ کے سیکرٹری سید مطلوب الحسن اپنی کتاب ''ہمارے قائداعظمؒ'' میں لکھتے ہیں:

اب ذرا ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون کی رائے قائداعظمؒ کے بارے میں سنیے:

❑ ''مجھے ہندوستان میں کسی لیڈر سے خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو محمد علی جناح سے، کیونکہ یہی وہ شخص ہے جو ملک کی آزادی دل و جان سے چاہتا ہے۔ کسی اور لیڈر کو آزادی کی پروا نہیں۔ ان سب کو کچھ نہ کچھ لے دے کے راضی کیا جا سکتا ہے، مگر جناح نے اپنی بات اگر ہندوستانیوں سے منوا لی، جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ منوا لے گا، تو پھر برطانیہ کے لیے ہندوستان میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار ختم ہو جائے گا''۔

سید مطلوب الحسن اپنی مذکورہ کتاب میں انگریز سے قائدؒ کی نفرت کو واضح کرنے کے لیے رقمطراز ہیں:

❑ ''قائداعظمؒ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ان کے ذاتی معالجوں اور عقیدت مندوں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کی کہ قائداعظمؒ اپنے علاج کے لیے انگلستان جانے

کے لیے رضا مند ہو جائیں، مگر اس مردِ مجاہد نے موت قبول کر لی، مگر علاج کے لیے بھی انگریز کا مرہونِ منت ہونا منظور نہ کیا۔ جب وہ بیماری کی وجہ سے بے حد نحیف ونزار ہو چکے تھے، تو آپ نے اپنے ذاتی عملے کو حکم دیا کہ انہیں اس حالت میں کوئی نہ دیکھے۔ بالخصوص یہ حکم تھا کہ ان پر کسی انگریز کی نظر ہرگز نہ پڑے۔ چنانچہ جب آپ نے کوئٹہ سے واپس کراچی جانا تھا، تو کوئٹہ کے انگریز ایس پی مسٹر سکاٹ کو کسی بہانہ سے کوئٹہ سے میلوں دور بھیج دیا گیا تھا''۔

(قائداعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص 66 تا 68)

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

فلسطین

24، 25 ستمبر 1937ء کو کلکتہ میں ایک فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر قائداعظم نے 21 ستمبر 1937ء کو مولانا شوکت علی کو ایک پیغام بھیجا جس میں کہا گیا کہ:

مجھے امید ہے کہ مسلمانانِ بنگال اپنے فلسطینی بھائیوں کا ساتھ دیں گے جن پر بے جا پر تکلیف دہ اور مہلک بالفور اعلان تھونپ دیا گیا ہے اور فلسطین کی تقسیم سے متعلق شاہی اعلان نے انھیں مکمل تباہی سے دوچار کر دیا ہے۔ ہم فلسطینی عربوں کی اس جرأت مندانہ جدوجہد میں جو وہ اپنے وطن کی آزادی کی خاطر کر رہے ہیں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ اپنے دشمنوں کے خلاف عربوں کی اس مزاحمت میں ہم سے جو کچھ بھی بن پڑا ہم کریں گے۔ ان کے دشمن ان کی اپنے وطن کی آزادی کی جائز خواہشات اور تمناؤں کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ ایم اے ایچ اصفہانی نے 25 ستمبر 1937ء کو اس بارے میں قائداعظم کو لکھا تھا کہ ''کانفرنس میں آپ کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا جس پر لوگوں نے بے حد داد دی''۔

1937ء میں قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین کا بالخصوص ذکر کیا جس نے تمام برعظیم کے مسلمانوں کو دلگداز کر رکھا تھا۔ آپ نے فلسطینی عربوں سے متعلق برطانوی پالیسی کو دھوکہ دہی پر مبنی قرار دیا ''جس نے بار بار اپنے اعلانات میں فلسطینی عربوں کو مکمل آزادی دینے کی ضمانت دی تھی۔ انھیں استعمال کرنے کے بعد ان سے جھوٹے وعدے کیے گئے۔ پہلے اس نے انتدابی طاقت (Mandatory Power) کے طور پر اپنے آپ کو فلسطین میں نصب کیا اور پھر قابل نفرت اور رسوائے زمانہ بالفور اعلان کیا۔ اب برطانوی شاہی کمیشن کی سفارشات اس المیے کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہیں اور اس پر عمل درآمد کی صورت میں فلسطینیوں کی ہر جائز خواہش مکمل تباہی سے دوچار ہوگی۔ میں نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر وہ جنگ عظیم سے قبل کیے گئے اعلانات کو پس پشت ڈالے گا تو وہ خود اپنی قبر آپ کھودنے کا مرتکب ہوگا''۔

30، 31 جولائی 1938ء کو قائد اعظم کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ایک قرارداد پیش کی جسے تین گھنٹے کی گرما گرم بحث کے بعد منظور کیا گیا۔ اس قرارداد کے تحت 26 اگست 1938ء کو تمام برعظیم میں یوم فلسطین منانے کا فیصلہ ہوا۔ لیگ کی تمام شاخوں سے کہا گیا کہ وہ اس روز جلسے منعقد کریں جن میں برطانیہ کی فلسطین کے ضمن میں ناانصافی پر مبنی جابرانہ اور غیر انسانی حکمت عملیوں کی مذمت کی جائے اور فلسطینی عربوں کی اپنے وطن کی آزادی کی جنگ میں کامیابی کی دعائیں مانگی جائیں۔

8 اکتوبر 1938ء کو کراچی میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں قائد اعظم نے ایک بار پھر اپنے فلسطینی بھائیوں کو یقین دلایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ فلسطینی عربوں کی امداد میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی اور اسے جو کچھ بن پڑا کرے گی۔ انھوں نے برطانوی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ فلسطین میں اپنے ملک کی آزادی کی خاطر جنگ کرنے والوں پر جو سنگ دلانہ جبر وتشدد ہو رہا ہے

اس کے سبب ہندوستانی مسلمانوں کے دل سخت مجروح ہیں اور انھیں شدید ایذا پہنچ رہی ہے۔ مسلمانانِ ہند کے دل فلسطینی عربوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں جو نہتے ہونے کے باوجود بہادری کے ساتھ اس عظیم الشان جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے ہیں''۔

اقبال کی مانند قائداعظم بھی فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کے سخت مخالف تھے۔ 1938ء میں آپ نے لیگ کے پٹنہ اجلاس میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فلسطین میں یہودیوں کے داخلے کی شدید مذمت کی تھی۔

غرض کہ دونوں زعما آخر وقت تک فلسطینی عربوں کی حمایت کرتے رہے۔

(اقبال اور قائداعظمؒ از احمد سعید صفحہ 47 تا 50)

بلاعنوان

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے بھی 1946ء میں ایک ایسا خواب دیکھا تھا جس میں ان کو قیام پاکستان کی بشارت دی گئی تھی۔ جب یہ مضمون چھپا تو مجھے عزیزم خواجہ محمد طارق ڈی ایم جی افسر نے فون کیا اور اس خواب کی تفصیل بیان کی، چنانچہ میں نے ان سے اس کا ثبوت مانگا۔ مشکل یہ تھی کہ انہوں نے جس کتاب کا حوالہ دیا، وہ آسانی سے پاکستان میں دستیاب نہیں تھی۔ چنانچہ انہیں یہ کتاب حاصل کرنے میں تین ماہ کا عرصہ لگ گیا اور میں سند کے بغیر وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب چونکہ سند مل گئی ہے، اس لیے میں اصل واقعہ من وعن پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے احساس ہے کہ کئی حضرات اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور مجھ پر تبرا بھیجیں گے لیکن ریکارڈ کی تصحیح میرا فرض ہے اور یہ قارئین کا مجھ پر فرض ہے۔ اس وقت ایک کتاب میرے سامنے پڑی ہے جس کا نام ہے ''شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، واقعات وکرامات کی روشنی میں'' اس کتاب کے مرتب مولانا سید رشید الدین حمیدی ہیں اور یہ مراد آباد سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر 94 پر درج ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے ''اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا''۔ مولانا رشید احمد صدیقی کلکتہ نے اسے یوں بیان کیا ہے۔ ''1946ء جنرل الیکشن کی ہنگامہ خیزیوں کا

زمانہ تھا۔ حضرت مدنیؒ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لیے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ صوبہ بنگال میں تمام صوبوں کے بعد الیکشن ہونا تھا، اس لیے حضرت اواخر فروری میں نواکھالی تشریف لے گئے تھے۔ قافلہ میں مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا نافع گل اور دیگر چند پشاوری طالب علم تھے۔ 3 مارچ کو گوپال پور تھانہ بیگم گنج پہنچے۔ چوہدری رزاق الحید ر کے دولت کدہ پر قیام ہوا۔ دوسرے دن ایک عظیم الشان انتخابی جلسہ میں تقریر کا پروگرام تھا۔ رات گیارہ بجے کھانا تناول فرما کر 12 بجے کے قریب آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے۔ میں پاؤں دباتا رہا۔ کچھ دیر بعد نیند آ گئی۔ ہم لوگ دوسرے کمرے میں جا کر کچھ ضروری کام کرنے لگے۔ تقریباً دو بجے رات میں مجھ کو اور چوہدری مصطفیٰ کو طلب فرمایا۔ ہم دونوں حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ لو بھئی! اصحاب باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ دے دیا اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں، کیا کریں گے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں جس بات کو حق سمجھتے ہیں، اس کے لیے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد جاری رکھیں گے۔ دوسرے دن گوپال پور کے عظیم الشان جلسہ میں تقسیم پر معرکتہ الآرا تقریر فرمائی۔ بالآخر 3 جون 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے غیر متوقع اعلان سے اس واقعہ کی حرف بحرف تصدیق ہوگئی''۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر 136 پر مولانا افضال الحق اعظمی کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے جو قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ ''پاکستان بن جانے کے بعد ایک صاحب نے مجلس میں سوال کیا کہ حضرت پاکستان کے لیے اب آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت کے ساتھ فرمایا کہ مسجد جب تک نہ بنے، اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب بن گئی تو وہ مسجد ہے''۔ غور کیجیے پاکستان کے لیے مسجد کا لفظ استعمال کیا گیا۔

(قرض اور فرض از ڈاکٹر صفدر محمود مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 4 جنوری 2004ء)

پاکستان بن گیا یہی مشیت الٰہی کو منظور تھا

جمعیت علما ہند کے سربراہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ 1946ء کے عام

انتخابات میں پاکستان کے خلاف مہم میں سلہٹ پہنچے، رات جس مرید کے گھر قیام تھا، اسے تہجد کے وقت بتایا کہ:

- ''آج رات عالم بالا میں ہند کی تقسیم ہو کر پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کا فیصلہ ہو چکا''۔ مرید نے عرض کیا کہ جب یہی کچھ ہے تو اب پاکستان کے خلاف مہم میں حصہ لینے سے کیا فائدہ؟ حضرت مرحوم کا جواب تھا کہ ''یہ فیصلہ تقدیر کا ہے ہم اپنی تدبیر میں مسلسل لگے رہیں گے''۔

(نقش دوام سوانح مولانا محمد انور شاہ کاشمیریؒ از نظر شاہ مسعودی ص 243)

پاکستان ایک مسجد ہے

مولانا حسین احمد مدنیؒ سے کسی نے ایک مجلس میں پوچھا کہ حضرت پاکستان کے لیے اب آپ کا کیا خیال ہے؟ تو حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت سے فرمایا کہ ''مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے''۔

(از شیخ الاسلام نمبر روزنامہ الجمیعہ دہلی صفحہ 71 خصوصی شاہ نمبر 41 مطبوعہ دہلی 15 فروری 1958ء)

مولانا حسین احمد مدنیؒ وفات سے ایک رات پہلے یہ شعر مترنم آواز میں گنگناتے رہے۔

الٰہی! مری زندگی ہے یہ کیسی
نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

(اقبال اور علمائے پاک و ہند از اعجاز الحق قدوسی صفحہ 388)

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

''اسے محض قیام پاکستان کی تحریک یا مسلم لیگ سے سیاسی اختلاف کہہ کر گزرنا اصلاً حد درجہ ملت گریز رجحان کا حامل ہوگا۔ بارہ صدیوں بعد اس برعظیم جنوبی ایشیا کی ملت اسلامیہ کے مستقبل پر اس کے مستقل اور آزاد وجود پر مولانا آزاد اپنے اظہار و ابلاغ بلکہ ''الہلال'' سے لے کر ''حزب اللہ'' کی جماعت تک جس فکر مایوس اور رخ معکوس کا توشہ تاریخ ہیں، اس پر تاریخ خود دم بخود ہے۔ ان کے علمی، ادبی اور فکری

شعار اور بعد ازاں آخری عمر کے متحدہ قومیت کے اصرار میں جو بعد کیا بلکہ رجعت اور پسپائی ہے، وہ بذات خود ایک المیہ ہے۔ برعظیم میں اسلام کے ممتاز مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک بار ٹھنڈی آہ کے بعد اس سوال کا جواب اپنی نجی محفل میں دیا کہ ''مولانا آزاد 1920ء کے بعد کن وادیوں میں گم ہو گئے، کہاں یہ عالم اسلام کے اتحاد اور اسلام کے نفاذ اور ترجمان القرآن کا ابوالکلامؒ اور کہاں انڈین نیشنل کانگریس کا ترجمان ابوالکلام۔ تاہم انہوں نے شرعی زبان میں شرعی تفہیم سے بتایا کہ اس سلسلے میں ''مولانا ابوالکلام آزاد کا معاملہ اس موذن کا سا ہے جو نماز کے لیے اذان دے کر خود سو گیا''۔ لیکن یہ تو ان کے مذہبی مزاج کا استدراک تھا کہ وہ اپنے فکر و عمل کی کس منزل پر جا کر رک گئے۔ اپنے لیے امام الہند کے منصب کی عدم پذیرائی پر کہ اپنے لیے بیعت حاصل کرنے میں ممکنہ اور مجوزہ مہم کی رسوائی پر۔ مگر یہاں شخصی ملی سانحہ یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد خود تو نام اور تخلص کے آزاد مگر مسلم قوم انگریزوں کے بعد ہندوؤں کے مستقل غلام ٹھہرے، کیوں؟'' (زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر پروفیسر محمد جہانگیر تمیمی ص 58)

ہوئے مر کے ہم جو رسوا

''افسوس کہ نیشنلسٹ راہنما اب دنیا میں نہیں اور جو ہیں وہ جناحؒ کے پاکستان کے معزز اور معتبر شہری اور بعض قومی سطح پر سیاستدان بھی تھے۔ جن کی اولادیں یہاں پر سیاسی تفوق و برتری کے ساتھ مزے میں ہیں۔ ہندوستان سے متحدہ قومیت کا مزہ چکھنے کے بعد پھر پاکستان آ بسنے والے کانگریسی مسلمان اپنے نظریات و معتقدات کی ہم جلیسی اور فکری مفلسی میں ہو کر اب بھی پاکستان اور اس کے قیام و استحکام کے بارے میں 1947ء سے پہلے کے سن و سال میں زندگی بسر کرتے ہیں، حالانکہ وہ جس ملک میں سیاست کرتے اور اس کا مال کھاتے ہیں اور جس جگہ بس جاتے ہیں، سامنے دفاتر میں ایک تصویر لگی ہوتی ہے جسے بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کا مقام اور نام حاصل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی جیبوں میں ہر وقت اسی نام محترم کی تصویر بھی ہوتی ہے، جو ایسے لوگوں کی مالی حیثیت پر قائد اعظمؒ کی شخصیت کا اعجاز ہی تو ہے۔ کسی کمزور نظر

کو کائنات اور اس میں کارفرما قوت (رب تعالیٰ) کا احساس و اندازہ نہیں، تو اپنے مقصد حیات (مادہ پرستی) کی دولت کی کرنسی نوٹ پر جناحؒ کی تصویر ایسے لوگوں کی تقدیر پر مسکراتی ہے۔ بلکہ پاکستان ایسے لوگوں کا ہی کیا، تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کا قلعہ بھی ہے اور اپنا گھر بھی! یہی جناحؒ، سردار پٹیل کی ''مت'' کو چھو کر نہیں ذرا چھیڑ گیا تھا کہ ہندومت کی تدبیر سے اسلام کی تقدیر کا یہ نتیجہ ہی تھا کہ برعظیم کے تمام مسلمانوں کی پناہ گاہ اور تہذیبی عافیت کا نام پاکستان جہاں بالآخر حضرت مولانا لدھیانوی کے خاندان اور اعزہ کو آنا تھا اور وہ آئے۔ وہ خود بھی پاکستان چلے آئے تھے مگر پاکستان ان کی طبیعت کو راس نہ آیا اور وہ واپس ہندوستان چلے گئے جہاں پر وہ 1956ء میں دہلی میں انتقال کر گئے۔ جامع مسجد دہلی کے شمالی دروازہ میں امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ایک ذاتی شہادت اور روایت پروفیسر محمد اسلم سابق صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جنہیں خود مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ایک ملاقات میں بتایا تھا۔اپنے معروف ''سفرنامہ'' ہند میں پروفیسر اسلم رقمطراز ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے صدر تھے اور پاکستان کی مخالف میں پیش پیش تھے۔ قیام پاکستان کے بعد موصوف مہاجروں کے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے لیکن یہاں ان کا جی نہ لگا۔ اور وہ دسمبر 1947ء کے آواخر میں دوبارہ بھارت چلے گئے۔ 3 جنوری 1948ء کو وہ گاندھی جی سے ملے۔ گاندھی جی نے ان سے کہا۔

''مولانا کیا آپ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟ کیا آپ نے لدھیانہ کی سکونت اس بنا پر ترک کی کہ وہاں ہندو اور سکھ آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے؟ اگر یہی آپ کا جرم تھا تو آپ اپنے دین کے لیے جان کا نذرانہ پیش نہ کر سکے؟''

یہ بات خود مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے راقم الحروف (پروفیسر اسلم مرحوم) کو بتائی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ''گاندھی جی کی باتیں سن کر اس قدر شرمندہ ہوئے کہ انہیں کوئی جواب نہ دے سکے''۔ (سفرنامہ ہند از پروفیسر محمد اسلم ص 83)

پنڈت جواہر لعل نہرو کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی گاندھی سے ملنے گئے۔شورش رقمطراز ہیں:

''گاندھی جی مسکرائے، آ گئے مولوی صاحب؟ لڑائی باندھنے آئے ہیں آپ؟ کیسے آئے؟ مہاتما جی یہ ہے وہ سوراج جس کے لیے آپ نے اٹھائیس، انتیس برس لڑائی کی اور ہم اس دن کے لیے سال ہا سال جیل میں رہے

ے دن گنے جاتے تھے، اس دن کے لیے

ہم نے مسلمانوں کی اجتماعی خواہش کو ٹھکرا دیا۔ کانگریس کے ہو گئے، اس کے لیے قید و بند کی مصیبتوں کو لبیک کہا، گھر بار لٹایا، بچوں کے مستقبل کو تباہ کیا، آزادی آئی تو سب سے پہلے ہمارے گھر لوٹے گئے، گاندھی بھگتوں نے قاتلوں کی سرپرستی کی۔ عام مسلمانوں کو اس لیے سزا ملی کہ وہ لیگ کے ساتھ تھے۔ ہمیں اس لیے سزا دی گئی کہ لیگ میں نہیں تھے اور کانگریس کے ساتھ تھے۔ عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں، انہیں اس طرح ڈھایا گیا جیسے مسجدیں نہیں، مذبح تھے''۔

گاندھی جی نے سنا، تو انہیں ملال ہوا۔ لیکن مسکرائے، پھر قہقہہ لگایا۔ ''مولوی صاحب! مجھے افسوس ہے میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ آپ نے ہمارے لیے قید کاٹی؟ غلط ہے۔ قید تو آپ نے دیش کی سوتنترتا (آزادی) کے لیے کاٹی ہے۔ اور اپنا گھر آپ نے موت کے خوف سے چھوڑا ہے۔ مسجدوں کی توہین کے ذمہ دار آپ ہیں۔ ان کے لیے مٹ جاتے، آپ کی عزت مسجدوں سے ہے۔ اگر آپ وطن کے لیے قید کاٹ سکتے تھے، تو کیا خانہ خدا کے لیے مر نہیں سکتے تھے۔ آپ نے مذہب کی روح کو نہیں سمجھا، آپ کو مر جانا چاہیے تھا، لیکن خدا کا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا''۔

(بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل از آغا شورش کاشمیری ص 492 تا 493)

مسکراہٹ اور پھر گاندھی جی کے قہقہے میں جو کچھ ہے، یہ خیالات ہیں کہ ملفوظات، بہرحال ایک بڑے شخص کا ارشاد تو ہے ہی۔ اسے ایک آئینہ سمجھ کر، صرف گاندھی جی کی شخصیت کا اظہار و ابلاغ، نوعیت مسئلہ، اور امر واقع پر جس طرح کی

کیفیات کا غماز ہے اس کے بعد یہ حقیقت مان لینی پڑے گی کہ گاندھی اگر نہ ہوتے تو آج ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت کا یہ اور چھور قطعاً نہ ہوتا۔ انہیں تو جناحؒ کی ٹکر نے بے سدھ کیے رکھا وگرنہ وہ سارا برعظیم پاک و ہند، بمع مسلمان اور اسلام کے، لے اڑے تھے۔ ان کی طلسماتی شخصیت میں وہ بلا کا جادو تھا اور جادو کی بلائیں اور ادائیں مضمر تھی کہ مولوی اس کی نگاہ انداز سے سپر انداز تھے۔ گاندھی ہی کا تجزیہ و تجربہ کس قدر بلیغ ہے۔ اس میں صاف بات یہ ہے کہ مولوی روئے مذہب تو ہے، روح مذہب ہرگز نہیں، البتہ فقیر روح مذہب ہے اور یہ فقر نصاب و کتاب نہیں یہ انتساب ہے، جو اپنی مرضی سے نہیں اللہ کی رضا کا نام اور کام ہے۔ یہ اہتمام نہیں اتفاق ہے۔ یہ وہ فقر ہے جو حضور سرکار دوعالم ﷺ کا فخر ہے۔ حتمی بات یہ کہ فقر درس نظامی سے نہیں، درگاہ نظامیؒ سے ملتا ہے۔ یہ بارگاہ صمدیت کی عطا ہے، جسے فقر و دین کے ترجمان حضرت علامہ اقبالؒ کے فرمان میں

ے کمال عشق و مستی بے نیازی

کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے، کہ بے نیاز الصمد، صفت رب ہے اور اسی کے اعلان واعتراف پر فرمایا گیا ہے کہ

ے کشادہ دست کرم، جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند، نہ کیوں عاجزی پہ نیاز کرے
(اقبالؒ)

ایک ادیب کا یہ تبصرہ کس قدر سادہ مگر بلیغ ہے کہ

''ایک علم وہ ہے جو ابوالکلام آزادؒ کے پاس تھا اور ایک علم وہ ہے جو اقبالؒ کو خدا نے ودیعت کیا تھا۔ ایک علم، عالم کو کانگریس کا شو بوائے بنا دیتا ہے اور ایک علم برعظیم کے مسلمانوں کو بیک وقت انگریز اور ہندو کے چنگل سے نجات دلاتا ہے''۔

(جوش اور ہوش از عطاالحق قاسمی مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت 13 نومبر 1993ء)

(زوال سے اقبال تک از پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی ص 102 تا 103)

اک فقیہہ شہر کی ریش حنائی بک گئی
منبر و محراب کی شعلہ نوائی بک گئی
بک گئی بکنے کی شے تھی پارسائی بک گئی
(آغا شورش کاشمیری)

قائداعظم اور پاکستان

دوسرے مداحین کا حوالہ کیا دینا خود مولانا ابوالکلام آزاد 1940ء جیسے اہم سیاسی سال میں اپنے صدارتی خطبہ کانگریس رام گڑھ میں متحدہ قومیت کا جوالاؤ روشن کرتے نظر آتے ہیں، وہ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی چتا نہیں تو اور کیا ہے جبکہ لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجتماع میں قائداعظم محمد علی جناحؒ قرار داد لاہور اور پھر دوسرے دن کی پریس کانفرنس میں مسلم قومیت کی جو سیج سجاتے ہیں، وہ اسلامی قومیت کا پیغام تھا کہ ہر ہر دلیل اور شواہد سے مسلمان اس خطے میں ہندوؤں سے علیحدہ اور الگ قوم ہے۔ مسلمانان برعظیم نے اس استدلال اور اس آواز پر جس طرح لبیک کہی، اس کا ایک تاثر ایک تبصرہ خود مولانا ابوالکلام آزاد کے قلمی مرید آغا شورش کاشمیری کا حسن اعتراف ہے، لکھتے ہیں:

- ''لیگ (مسلم لیگ) میں ایک ہی شخصیت تھی اور وہ قائداعظمؒ تھے، مایوسیوں کا طوفان، ایک زلزلہ اور ایک سیلاب، چاروں طرف سے اُمڈ آیا تھا۔ لیکن اس قدر مضبوط اعصاب کے انسان تھے کہ وہ ہر معرکے، ہر مورچے، ہر موڑ اور ہر محاذ پر ایک ہی نعرہ دے رہے تھے، پاکستان اور صرف پاکستان۔ انہوں نے نہ صرف اپنے اعصاب کے غیر متزلزل ہونے کا معجزانہ ثبوت دیا بلکہ مسلمانوں کی عصبیت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کے دل، دماغ اور زبان پر صرف دو لفظ تھے۔ قائداعظم اور پاکستان!۔

(بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل از شورش کاشمیریؒ ص)

حقیقتاً قائداعظم اور پاکستان دونوں ہی تو دوقومی نظریہ کا وجود وشہود ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں اس دوقومی نظریہ کی تاریخ کیا ہے، تحریک کیا ہے؟ اس کا ایک نظر مورخانہ اور محققانہ تجزیہ، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق صدر، مرحوم پروفیسر

محمد اسلم کی فکر رسا ہے جس میں دینی غیرت، ملی مفاد اور مسلم قومیت کے مدمقابل متحدہ قومیت کے موقف اور مراحل سیاست اور کانگریس کے ہمنوا بعض علما پر ایک علمی، قلمی اور منطقی استدلال کا نمونہ یہ ہے، لکھتے ہیں:

ارشاد خداوندی ہے۔ اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں سے دوستی نہ رکھو۔ (النساء:144) یہ آیت پاک حقیقتاً دو قومی نظریہ کی اساس ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م 1624ء) نے دو قومی نظریہ کو ہر دے رام نامی ہندو کے نام اپنے مکتوب میں بصراحت بیان کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م1763ء) نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے احمد شاہ ابدالی سے مدد لی۔ ان کے بعد ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز (1823ء) نے مسلمانوں کو پیتل کے برتن استعمال کرنے سے روکا کہ ہندو پیتل کے برتن استعمال کرتے ہیں اور اس طرح شبہ یعنی کافروں کے ساتھ مشابہت تک نہ ہو۔ سر سید احمد خانؒ (1898ء) نے بنارس کے تب ڈپٹی کمشنر کو کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ ہندو اور مسلمان مل کر نہیں رہ سکتے۔ جواہر لعل نہرو کے باپ پنڈت موتی لعل نہرو نے 1928ء میں جو رپورٹ پیش کی، وہ ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری کا کھلا ثبوت تھی۔ اسے دیکھ کر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اب ہمارا راستہ ان سے الگ ہوگیا"۔ (زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی ص 127 تا 128)

کشف ہنود

"مجھے اس پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ جمعیت العلما ہند کے راہنماؤں کو کشفِ قلوب اور کشفِ قبور تو ہوتا تھا لیکن انہیں کشفِ ہنود کبھی نہیں ہوا۔ وہ تاریخ کی روشنی میں ہندوؤں کی گھٹیا ذہنیت، اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے"۔
(تحریک پاکستان از پروفیسر محمد اسلم ص 57)

قائداعظم کی طاقت

"پاکستان کے مطالبے نے کانگریس پر ہندو جماعت ہونے کی چھاپ لگا دی، نیشنلسٹ مسلمانوں کو متروکات سخن بنا دیا۔ جمعیت علما، احرار، خاکسار، سب لیگ

کے جلال کی تاب نہ لا کر ماند پڑ گئے۔ قائد اعظمؒ نے مسلمان عوام کی عصبیت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ ان کے سامنے ابوالکلام کا تبحر، حسین احمد کا تقویٰ، عطا اللہ شاہ کی خطابت اور علامہ مشرقی کی عسکریت کا ٹھہرنا، ناممکن ہوگیا۔ ان سب کے چراغ کجلا گئے۔ پاکستان کے مطالبے میں اتنا سحر تھا کہ قربانی و ایثار، جرأت و استقامت کا جادو بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ قائد اعظمؒ نے ان سب کو ہرا دیا''۔

(بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل از شورش کاشمیری ص 257)

وہ جس کی گفتار سے عیاں تھی، سدا سے کردار کی صداقت
وہ مرد بینا تھا، خوب سیرت تھا، پاک طینت تھا، پارسا تھا
رہ سیاست پر جس نے چھوڑے نقوش پا اپنی راستی کے
وہ مردِ حق گو تھا، صاف باطن تھا، نیک داماں تھا، بے ریا تھا
وہ ملک و ملت کا باغباں تھا، یقین محکم کا اک نشاں تھا
جو دشتِ پیما یہ کارواں تھا، وہ اس کی منزل کا راہنما تھا

قدرت کا انتخاب

برعظیم کی ملت اسلامیہ کے مستقبل کے معمار اولین اگر فکر میں اقبالؒ ہیں تو عصری قیادت اور سیادت قائد اعظم محمد علی جناحؒ ہیں۔ یہ کسی فقہی مسلک یا مدرسے کی پیداوار نہیں، دین کی دین ہے، یہ اللہ پاک کا اصطفیٰ (Selection) ہے۔ وہ اپنے جس بندے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے، لے لیتا ہے۔ کسی پارٹی کی قرارداد، کسی مدرسے کی شوریٰ یا کسی مذہبی جماعت، مسلک کی مجلس عاملہ سے نہیں پوچھتا۔ یہ قائد اعظمؒ تا قیامت تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں جو برعظیم کی ملت اسلامیہ کا جلی نام ہے۔ برعظیم کے مسلمانوں نے اس کی آواز پر تن، من، دھن جس طرح نچھاور کیا، اس میں مقلب القلوب، ذات باری الہ کا کرم اور کرشمہ کارفرما ہے۔ نہیں تو خانقاہ امدادیہ صابریہ، تھانہ بھون سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی گواہی سن لیں تو کلین شیو جناح کا روحانی وجودان کے رویا صادقہ کا منظر ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا

ارشاد ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا:

❑ ''میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے۔ گویا کہ میدان حشر سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس مجمع میں اولیا، علما اور حکمران کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بھی اسی مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی جناحؒ آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں، اس واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا''۔

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی از منشی عبدالرحمٰن خاں ص 93)

❑ ''میرے ایک معتبر دوست نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ ان سے مولانا حسرت موہانی صاحب نے بیان کیا کہ میں ایک دن جناح صاحب کی کوٹھی پر صبح ہی صبح ایک نہایت ضروری کام سے پہنچا اور ملازم سے میں نے اطلاع کرنے کو کہا۔ ملازم نے کہا، ہم کو اس وقت اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ تشریف رکھیے، تھوڑی دیر میں جناح صاحب خود تشریف لے آئیں گے۔ چونکہ مجھے نہایت ہی ضروری کام تھا، اور میں اس کو جلد سے جلد جناح صاحب سے کہنا چاہتا تھا، اس لیے مجھے ملازم پر غصہ آیا، اور میں خود کمرے میں چلا گیا۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، پھر تیسرے کمرے میں پہنچا تو برابر کے کمرے سے مجھے کسی کے بہت ہی بلکہ بلک بلک کر رونے اور کچھ کہنے کی آواز آئی۔ آواز چونکہ جناح صاحب کی تھی، اس لیے میں گھبرایا اور آہستہ سے پردہ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناح صاحب سجدے میں پڑے ہیں اور بہت بیقراری کے ساتھ کچھ دعا مانگ رہے ہیں۔ میں دبے پاؤں وہیں سے واپس آ گیا اور اب تو بھائی! جب جاتا ہوں اور ملازم کہتا ہے کہ ''اندر ہیں'' تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ سجدہ میں پڑے دعا کر رہے ہیں، مگر تصور میں ہر وقت وہی تصور اور وہی آواز رہتی ہے''۔ (ایضاً ص 85، 86)

خود مولانا حسرت موہانی کا روحانی مشاہدہ بھی یہی ہے۔ ادریس صدیقی، تحریک آزادی کے قافلہ سالار، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ 1990 رقمطراز ہیں:

❑ ''مولانا حسرت موہانیؒ، روحانی اعتبار سے بھی نہایت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کے خواب اکثر سچے ہوتے تھے اور وہ انہیں اشارہ غیبی تصور کرتے تھے۔ جولائی 1942ء میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے زمانے میں انہوں نے انکشاف کیا کہ اب قیام پاکستان مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ البتہ پاکستان کے بعد اس کی تعمیر اور ترقی کے بارے سوچنا چاہیے۔ واضح رہے کہ 3 جون 1940ء سے پہلے کوئی بھی قیام پاکستان سے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن مولانا حسرت موہانیؒ کا ارشاد یہ تھا کہ ''میں نے خواب میں حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت کی ہے اور دیوان حافظ سے فال نکالی ہے۔ اس شعر پر میں نے تضمین بھی کر دی ہے جو یہ ہے:

جب کہے خواب میں خود آ کے وہ شاہِ خوباں ﷺ
جبکہ حافظ بھی مصدق ہو یہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرت یہ مبارک سند مہر و نشاں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کند جملہ جہاں
طاق آبروئے تو محراب جہاں خواہد بود''

خود حضرت قائد اعظمؒ آخری وقت میں فرماتے تھے کہ:

''یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس ہند سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ آج وہ قوم آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کا اپنا ایک ملک ہے، اپنا جھنڈا ہے، اپنی حکومت اور اپنا سکہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی ''انعام'' ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت ہر پاکستان مرد و زن، بچے بوڑھے اور جوان پر فرض ہے۔ جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے، تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لانے کے

لیے فرط انبساط سے جھک جاتا ہے''۔ (قائداعظمؒ اور اسلام از محمد حنیف شاہد ص 43)

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پاکستان کا مطلب کیا؟

آغا شورش کاشمیری نے احرار کے جنرل سیکرٹری کے طور پر یوپی، بہار، یہاں تک کہ نیپال کی سرحد تک سفر کیا۔ مسلم عوام کی سیاسی بیداری کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

- ''میں اپنی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا کہ ان دور افتاد سے مسلمانوں کو پاکستان کا نشہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے مستقبل سے غافل ہو گئے تھے۔ انہیں آئندہ حادثات وسانحات کا قطعی احساس نہ تھا، وہ جذبات کے نشے میں بہہ رہے تھے۔ انہیں قطعی احساس نہ تھا کہ وہ من حیث المجموع ہندوؤں کے چنگل میں ہیں۔ ان کے پاس تعلیم نہیں، روپیہ نہیں، ذہن نہیں، ان کے مکانوں سے پاکستان کا راستہ بہت دور، بہت کٹھن ہے لیکن ہزار کی ہندو آبادی میں ایک مسلمان کے لیے بھی یہ نعرہ بہت پرکشش تھا کہ ''جیسے لیا تھا ہندوستان ویسے ہی لیں گے پاکستان'' یا ''بولو بھیا ایک زبان...... بن کے رہے گا پاکستان''۔

ان لوگوں کے ذہین میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ لیگ ان کا جوابی حملہ اور پاکستان ان کی عافیت کا حصار ہے۔ ان علاقوں کے مسلمان عوام، بالخصوص مسلمان کسان اندوہناک غربت کا شکار تھے۔ ان کی وضع قطع یکساں تھی، لباس بھی تقریباً ایک سا تھا۔ کوئی بنیان تھی بھی تو ایک خاص قسم کی، دو پلی یا گٹھے پر سجدوں کی رگڑ۔ نیپال کی سرحد سے ذرا اِدھر میں نے ایک مسلمان کسان کو روک کر ''السلام علیکم'' کہا تو وہ رک گیا اور وعلیکم السلام'' کہا، فرمایئے، اُس نے پوچھا،

''کہو بھائی طبیعت کیسی ہے؟''

وہ تاڑ گیا الیکشن کے شکاری ہیں۔

''اللہ کا شکر ہے'' اس نے جواب دیا۔

اللہ کا شکر ہے، ایک پاکیزہ کلمہ جو مراکش سے چین تک کا مسلمان زبان کے

اختلاف لیکن معنی کی ہم آہنگی کے ساتھ بولتا ہے۔

''ووٹ کسے دوگے'' میں نے سوال کیا۔

اس نے غور سے دیکھا اور لاٹھی بڑھا کر چل پڑا۔ میں نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا،

''بھائی کچھ تو کہہ جاؤ''

''میاں! ہمارا ووٹ کلمہ کے ساتھ ہے''

''کلمہ کے ساتھ''

''جی ہاں''

''کلمہ سے تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''مسلم لیگ''

یہ تھا پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ

اُردو کے نامور نعت گو، حفیظ تائب نے اس ارضِ لا الہ کو حقیقت کی زبان میں

؎ ارض پاک ہے کہ مملکت عشق رسول ﷺ

کہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے فکر اور فقر دونوں کا اعجاز ہے۔ جبکہ بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ ان کا چناؤ ہے، اصطفیٰ ہے (Selection) ہے۔ نظریہ پاکستان اور بانی پاکستان دونوں اقبالؒ ہی کی دریافتیں ہیں۔ اقبالؒ کے لیے قائداعظمؒ کی معنوی زبان سے بات کریں تو پاکستان کے ترانے کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری کا یہ شعر، قائداعظمؒ کا اقبالؒ کے لیے خراج عقیدت معلوم ہوتا ہے، قیام پاکستان پر وہ جیسے کہہ رہے ہوں:

جرم ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ

اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ، جس نے یہ گل کھلا دیا

(حفیظ جالندھری)

(زوال سے اقبال تک از ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی ص 319 تا 321)

میں الزام اس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

آغا شورش کاشمیری اپنی کتاب میں چندوں کی بندر بانٹ کے بارے ہوش ربا انکشافات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- ''میں ایک ہی دن قبل سہارنپور سے لاہور آیا اور مظہر علی سے میری عقیدت کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ میرے دل و دماغ کے سامنے بالکل ایک عام انسان کی طرح کھڑے تھے اور میں ان کے چہرے سے بیسیوں تلخ حقیقتیں اُبھرتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

واقعات کا ایک انبار تھا جس نے میرے شیشہ دل کو مکدر کر دیا تھا، ایک چیز جس نے میری عقیدت کو نفرت میں بدل دیا، وہ ان کے حلقہ انتخاب میں جنڈیالہ گورو کے پولنگ اسٹیشن کا ہنگامہ تھا، میں وہاں قتل ہوتے ہوتے بچا، مظہر علی کو معلوم تھا کہ وہاں خون خرابہ ہوگا، اپنے بیٹے خاقان بابر کو اسی باعث میرے ساتھ جانے سے روک دیا، ورنہ ہر جگہ کرتا دھرتا ان کے بیٹے تھے، کانگریس اور یونینسٹ پارٹی سے روپے کی بڑی بڑی قسطیں بھی انہیں کی معرفت وصول کی تھیں، آج بھی اس ہوشربا تصور سے مجھ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

دوسری چیز جو میرے نزدیک جماعت احرار کی ویرانی کا باعث ہوئی اور جس کا علم سب سے پہلے مجھی کو ہوا، وہ روپیہ تھا جو مظہر علی نے کانگریس اور یونینسٹ پارٹی سے وصول کیا اور اپنے گھر میں رکھا تھا۔

مولانا داؤد غزنوی اولاً دس ہزار روپے کی پہلی قسط لے کر دفتر احرار میں آئے تو اس وقت مظہر علی کے پاس صرف میں تھا، مجھے کہا، ذرا نیچے چائے کے لیے کہہ آؤ، میں نیچے گیا، مولانا نے دس ہزار کے نوٹ غڑپ سے جیب میں ڈال لیے، میں ابھی لوٹا نہیں تھا کہ مولانا داؤد غزنوی مسکراتے ہوئے نیچے آ گئے، میں نے کہا مولانا چائے آ رہی ہے، کہنے لگے: ''چائے پی اور پلا آیا ہوں''۔ پچاس ہزار کی دوسری قسط مولانا نے لالہ بھیم سین سچر کی معرفت وصول کی، یونینسٹ پارٹی کا روپیہ اس کے علاوہ تھا۔

مظہر علی وزارت میں چلے جاتے تو احرار پر ایک ایسی تباہی آتی کہ اس کا تصور

بھی نہیں کیا جا سکتا، مظہر علی کا اقتدار احرار کی کاملاً تباہی پر منتج ہوتا۔ میں نے ذہناً فیصلہ کر لیا کہ یہ تمام راز شاہ جی اور مجلس عاملہ کے نوٹس میں لاؤں تا کہ مظہر علی کی متوقع وزارت کا پتہ کٹ جائے۔ صوبہ کانگریس کے زعما سے میرے آبرومندانہ تعلقات تھے، وہ میرے ساتھ جیل میں رہے تھے اور میری طبیعت کی بے نیازی و حوصلہ مندی کے باعث میری قدر کرتے تھے، میں نے ان سے پخت و پز کر کے مظہر علی کا وزارتی خواب پراگندہ کر دیا:

............شیخ صاحب بولے...... ''بہر حال اس کا فعل احرار کی رسوائی کا باعث ہوا ہے'' اس کو دو سال کے لیے جماعت سے خارج کر دینے کی تجویز آئی ہے، مظہر علی بھڑک اٹھے، ڈنڈا اٹھا کر جانے لگے، شاہ جی نے روکا...... مولوی صاحب، کہاں جا رہے ہیں آپ؟ تشریف رکھیں آپ کے خلاف شورش نے کچھ الزام لگائے ہیں، مولوی صاحب ٹھٹھک کر ٹھہر گئے۔

مظہر علی نے جہاں سے جو کچھ لیا تھا، میں نے اس کی تفصیلات پہلے ہی قاضی احسان احمد کو بتا دی تھیں، وہ پھوٹ پھوٹ کے روتے رہے، پھر مولانا غلام غوث کو آگاہ کیا، انہیں تعجب ہوا، کہنے لگے مگر ثابت کر سکو گے؟ میں نے کہا ضرور...... فرمایا، نہ ہو سکا تو؟ میں نے کہا تو مجھے جماعت سے نکال دیجیے گا، مولانا حبیب الرحمٰن کانگریس کی رقم کے راز دار اور حصہ دار تھے، انہوں نے ٹالنا چاہا مگر شورش برپا ہو چکی تھی۔

میں نے استغاثہ شروع کیا، ''کانگریس سے مولانا نے ساٹھ ہزار روپیہ لیا، دس ہزار کی پہلی قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط، پہلی قسط مولانا داؤد غزنوی نے دفتر احرار میں دی تھی، دوسری قسط لالہ بھیم سین سچر کی معرفت آئی، صاحبزادہ فیض الحسن اس رقم میں سے اپنا حصہ لے چکے تھے، اس لیے معاملہ ٹھپ کرنا چاہتے تھے، اجلاس اگلی صبح پر ملتوی ہو گیا۔ صاحبزادہ مجھے رات بھر مولانا کے مکان پر لے جا کر سمجھاتے رہے۔ میں دوسرے دن اجلاس میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو معلوم ہوا، صاحبزادہ صاحب نے کہا ہے کہ شورش اپنا الزام واپس لیتا ہے، مجھ سے پوچھا گیا، میں نے انکار کیا۔ قصہ کوتاہ مظہر علی مان گئے کہ انہوں نے کانگریس سے ساٹھ ہزار روپے وصول کیے ہیں، یونینسٹ

پارٹی کے روپیہ کا ذکر چھڑا تو مولانا غلام غوث نے مجھ سے کہا، آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟ میں نے کہا، ایک سرکاری ملازم دستخطی رسیدیں دکھانے کے لیے تیار ہے لیکن وہ آپ کے اور شاہ جی کے سوا کسی اور کو دکھانے پر آمادہ نہیں، مظہر علی نے تیس ہزار روپے کی یہ رقم بھی مان لی، اس کے علاوہ تین ہزار روپے احرار کی مختلف شاخوں سے اکٹھا ہو کر آئے تھے، مظہر علی نے کل پچانوے ہزار روپیہ کی رقم تسلیم کی، لیکن کہا یہ کہ نصر اللہ خان کے سوا ہر امیدوار کو حصہ رسد پہنچا ہے...... امیدواروں نے کہا، ہمیں الیکشن لڑنے کے لیے رقم ضرور ملی ہے لیکن یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ کانگریس یا یونینسٹ پارٹی سے آئی ہے، ہمیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ جماعت کا اپنا روپیہ ہے، مظہر علی نے کل رقم کا نصف جماعتی اخراجات پر ڈالا، تقریباً تیس ہزار احرار امیدواروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ باقی بیس ہزار میں سے دس ہزار اپنے الیکشن کا خرچ، بتایا، دس ہزار روپے کے بارے میں کہا کہ وہ روزنامہ آزاد کے لیے محفوظ کر رکھا ہے''۔

(بوئے گل، نالہ دل، درو چراغ محفل از شورش کاشمیری ص 337، 338، 343، 344)

نسخۂ آزمودہ اک اور بھی ہے گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے، رسوائی تدبیر دیکھ

دیانتداری کا سرٹیفکیٹ

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقسیم کے بعد دہلی میں آباد ہو گئے اور وہیں مر کے دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مولوی عزیز الرحمٰن نے جنوری 1961ء میں والد کے سوانح حیات شائع کیے اور کانگریس ہی کے ذہن کو ملحوظ رکھا۔ لیکن ان سوانح کے مشمولہ خطوط میں ایک خط پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ہے۔ یہ خط مولانا نے 2 فروری 1937ء کو تحریر کیا۔ اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ درج ہے کہ:

''آپ کی ایک تقریر کا خلاصہ جو آپ نے بمبئی میں مسٹر جناح کے خلاف کی ہے، میری نظر سے گزرا۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان اخباروں نے آپ کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ ہمیں خود

مسٹر جناح سے بیسیوں باتوں میں سخت اختلاف ہے لیکن ان کا ہندوستان میں کوئی مخالف ہو یا موافق؟ ہر شخص انہیں دیانتدار سمجھتا ہے۔ گورنمنٹ مسٹر جناح کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی‘‘۔ (سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ از شورش کاشمیری ص 270)

قیام پاکستان کی بشارت

مولانا اشرف علی تھانوی بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی اور دین کی بہتر حفاظت کے لیے اپنی مجالس میں اکثر یہ تجویز کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو کر اتحاد و استحکام پیدا کرنا چاہیے۔ پھر ایک جگہ پر انہوں نے مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بارے میں یوں آرزو فرمائی۔ میری دلی تمنا اور دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرما دے اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں‘‘۔

بیان کیا جاتا ہے کہ 1938ء میں ہی اپنے برادر نسبتی سعید احمد عثمانی سے قیام پاکستان کے بارے میں ایک بڑی واضح پیشین گوئی کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ ’’مجھے بہت سے مجذوبوں نے بتلایا ہے کہ اسلامی سلطنت 1947ء میں قائم ہو جائے گی‘‘۔ الحمدللہ! سچ مچ یہ اسلامی سلطنت پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آ گئی۔

(اکابرین تحریک پاکستان از محمد علی چراغ ص 346، 347)

گم شدہ ٹکٹ

قائداعظم محمد علی جناح ارادے کے بڑے پکے تھے۔ وہ جس بات کا فیصلہ کر لیتے، اس پر پہاڑ کی طرح ڈٹ جاتے۔ اس لیے خدا نے ان کی کوششوں میں برکت دی اور وہ ہر طرح کی مشکلات اور تمام مخالفتوں کے باوجود پاکستان بنوا کر رہے۔ ان کا شروع ہی سے یہ اصول تھا کہ انسان کو محنت اور دیانت داری سے کام کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ وہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایسا ہوا کہ اُن کا ٹکٹ کہیں گم ہو گیا۔ اتنے میں ٹکٹ چیکر آ گیا اور مسافروں کی ٹکٹوں کی پڑتال کرنے لگا۔ سب مسافروں نے اپنے اپنے ٹکٹ نکال لیے۔ قائداعظم نے جیب ٹٹولی تو اس میں ٹکٹ موجود نہ تھا۔ وہ پہلے تو گھبرائے پھر جب ٹکٹ چیکر ان کے پاس آیا تو انھوں نے جیب

سے پیسے نکال کر اس سے کہا ''میرا ٹکٹ گم ہو گیا ہے، آپ مجھے نیا ٹکٹ بنا دیجیے''۔
ٹکٹ چیکر نے پوچھا آپ کہاں اتریں گے؟ قائداعظم نے جواب دیا: ''اگلے اسٹیشن پر''۔ اس پر ٹکٹ چیکر نے کہا تو پھر ٹکٹ بنوانے کی کیا ضرورت ہے، ٹکٹ کی رقم میں سے کچھ پیسے مجھے دے دیجیے، میں آپ کو اسٹیشن کے باہر پہنچوا دوں گا۔ چیکر کا یہ کہنا تھا کہ قائد غصے میں آ گئے اور بولے: ''تمھیں شرم نہیں آتی، تم مجھے دھوکے اور بے ایمانی کا سبق دے رہے ہو، میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا''۔
یہ سن کر ٹکٹ چیکر گھبرا گیا اور لگا معافی مانگنے۔ قائد نے کہا۔ ''معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ پیسے لو اور ٹکٹ بناؤ۔ ٹکٹ چیکر نے پیسے لے کر خاموشی سے ٹکٹ بنا دیا۔
(گم شدہ ٹکٹ از جنید الحق مطبوعہ مجلّہ علم و آ گہی)

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے

لاکھوں میں ایک

''وہ بھی ایک رات تھی، جس کی یاد محمد علی جناح کے ہونٹوں پہ ایک افسردہ سی تلخ مسکراہٹ بکھیر دیتی تھی، جب اس خاتون کی بیٹی، جس کے ہاں وہ پے اینگ گیسٹ کے طور پر مقیم تھے، انھیں اپنا دل دے بیٹھی۔ وہ ریجھ گئی تھی نوجوان جناح پر۔ اور اپنے جلتے تپتے وجود کو ان کے سپرد کر دینا چاہتی تھی، لیکن ''بے حس'' اور ''سنگ دل'' جناح کے دل تک محبت کی وہ گرمی پہنچ کر نہ دیتی تھی۔ نوجوان لڑکی سے رہا نہ گیا اور اسی رات، جس کا ذکر ہے، وہ محمد علی جناح کو اندر آتے پا کر راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔ اپنے محبوب کو نزدیک پا کر اس نے عجب بیتابی سے اپنی آنکھیں موند لیں اور عالم بیخودی میں جناح کے بہت قریب آ کر سرگوشی کی، ''مجھے چھو لو۔'' ایسا کوئی موقع محمد علی جناح کی نوجوان زندگی میں آیا ہی نہیں تھا، لیکن وہ کمزور لوگوں میں سے نہ تھے، جن کے اوسان کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال میں خطا ہو جاتے ہیں۔ انھیں ابتدا ہی سے اپنے اعصاب پر کمال گرفت حاصل تھی، انھوں نے آہستگی اور کسی قدر نرمی سے نوجوان برانگیختہ جذبات سے چور حسینہ کو پرے کیا اور فقط اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے، ''بھلا میں یہ

کیسے کر سکتا ہوں۔ میری تہذیب، میرا مذہب، میری روایات مجھے اس کی اجازت ہی کب دیتے ہیں۔'' کوئی کیسے اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ رات اس حسینہ کی کس بے چینی، نارسائی کے احساس کے ساتھ گزری ہوگی کہ ''جناح نے ایسا کیوں کیا؟'' لندن، جہاں سے ہندوستان میں بھی جدید تہذیب کی روشنی پھیلی تھی، وہاں سے آئے ایک نوجوان نے اسی تہذیب کی جیتی جاگتی، زندہ احساسات اور دھڑکتے مضطرب جذبات سے مجبور لڑکی کو جو یوں ٹھکرا دیا تھا، تو یہ جرأت کہاں سے آئی، کس نے دی اسے یہ ہمت۔ وہ اپنے ہی اٹھائے سوالات اور اپنی ہی خواہشات کی برہمی پر سوچتی رہی ہوگی ساری رات۔ رہے محمد علی جناح، تو وہ ان میں سے نہ تھے، جو معمولی یا غیر معمولی ہر قسم کے واقعے کا گہرا اثر قبول کرتے اور سوچتے رہتے ہیں۔ کسی بھی صورتِ حال سے خواہ وہ کیسی ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو، ایک لمحے میں نمٹ کر، نچنت ہو جاتے تھے، آگے بڑھ جاتے تھے۔ پھر پلٹ کر نہ دیکھتے، نہ سوچتے تھے...... اگلا واقعہ بھی ایسا ہی، مگر اپنی تفصیل میں کچھ مختلف ہے۔ بمبئی کے کلب میں پیش آنے والے اس واقعے میں محمد علی جناح شرط ہار گئے تھے۔ کھیل کے قواعد میں یہ شامل تھا کہ شرط ہارنے والے کو کوئی بھی ناپسندیدہ یا مزاج کے خلاف کام کرنا پڑے گا۔ کلب کے کھلاڑی اُن کی طبیعت کی نفاست، رکھ رکھاؤ سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات کو برداشت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن سے کہا گیا کہ بطور ہرجانہ فلاں خاتون سے اظہارِ محبت کریں اور اگر ایسا کرنا اُن کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر مقررہ رقم جرمانے میں ادا کر دیں۔ محمد علی جناح کو یہاں بھی لمحہ بھر سوچنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ انھوں نے بلا تامل اپنا سفید لمبا ہاتھ جیب میں ڈال کر پرس نکالا، جرمانے کی رقم گنی اور یہ کہتے ہوئے نہایت اطمینان سے نوٹ میز پر ڈال دیے کہ ''جس خاتون کے ساتھ میں زندگی نہیں گزارنا چاہتا، اس سے اظہارِ محبت کیسے کر سکتا ہوں؟'' اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ ایک واضح اور دوٹوک فیصلہ۔ کچھ ایسے، جیسے جناح جب کلب کے لیے گھر سے روانہ ہوئے تو انہیں معلوم تھا کہ کیا کچھ وقوع پذیر ہوگا اور تبھی وہ فیصلہ کر چکے

تھے کہ جواب میں انہیں کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔ اتنا نپا تلا فیصلہ، نہ ایک انچ آگے، نہ ایک قدم پیچھے۔ اسے محمد علی جناح کے کردار کی مضبوطی کے سوا کیا نام دیا جائے؟''

(رتی کے جناح از ڈاکٹر طاہر مسعود مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور سنڈے میگزین یکم نومبر 2020ء، 8 نومبر 2020ء)

فانوس بن کے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

صرف ایک جناح

پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی نے قائداعظم کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا: ''اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی اور دو سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور ان کے مقابلے میں کانگریس میں صرف ایک جناح ہوتے تو ملک کبھی تقسیم نہ ہوتا''۔

(قائداعظم: بے مثال شخصیت، درخشاں کردار کی جھلکیاں از سلیم چودھری ص 258)

علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں؟

''ایک مرتبہ کسی تقریب میں ہندو طلبا کے ایک گروپ نے قائداعظم کو روک لیا اور ان سے سوال جواب کرنے لگے۔ قائداعظم روایتی خندہ روئی کے ساتھ ان نوجوانوں کے تیز و تند سوالات کا بھی مسکرا کر جواب دیتے رہے۔ اسی دوران ایک ہندو لڑکے نے سوال پوچھا: ''آپ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں؟ آخر ہم صدیوں سے اکٹھے رہ رہے ہیں''۔ اس پر قائداعظم چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئے تو لڑکوں نے سمجھا کہ قائداعظم لاجواب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے تالیاں بجا کر مسرت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے بعد قائداعظم نے پانی کا ایک گلاس طلب کیا جو ایک مسلمان لڑکے نے لا کر دیا تو قائداعظم نے دو گھونٹ نہایت آرام سے پانی پی کر گلاس ہندو لڑکوں کی طرف بڑھایا کہ وہ یہ پانی پی لیں تو سب لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سانپ سونگھ گیا اور انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس پر قائداعظم نے وہی گلاس اس مسلمان لڑکے کی طرف بڑھایا تو اس نے ایک ہی سانس میں غٹا غٹ وہ پانی پی لیا۔ اس پر قائداعظم نے مسکراتے ہوئے ان شریر لڑکوں سے کہا کہ یہی وجہ

ہے کہ میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ کیونکہ ہم میں اور آپ میں یہی وہ بنیادی فرق ہے جو آج آپ نے دیکھا۔ یہ سن کر وہ ہندو طالب علم شرمندہ ہو گئے اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے‘‘۔ (جی این بھٹ کا مضمون ’انداز دلنشیں‘، مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور 25 دسمبر 2014ء)

؎ صدیوں کے اُلجھے ہوئے راز کو چند باتوں کی حکمت سے وا کر دیا

قائداعظم محمد علی جناحؒ اور ہندو ذہنیت

کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ اپنی خودنوشت ’’آتش چنار‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’میں نے جناح صاحب کے سامنے تحریک کشمیر کی تفصیل بیان کی اور عرض کی کہ ’’ریاست جموں و کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے، جس میں 85 فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ بنابریں معاملات کے متعلق اُن کا نظریہ ایک اکثریت کا ہی ہو سکتا ہے، اقلیت کا نہیں‘‘۔

دوسری بات میں نے یہ کہی کہ ’’تجربے نے ہم پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ بنیادی مسئلہ مختلف مذاہب کی ٹکر کا نہیں ہے بلکہ سماج میں مختلف طبقوں کی اقتصادی نابرابری ہے۔ ایک طرف استحصال کرنے والے ہیں اور دوسری طرف وہ جن کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہماری لڑائی شخصیات سے نہیں بلکہ ایک نظام سے ہے۔ اس میں ہندو اور مسلمان کی تمیز کرنا کوتاہ اندیشی ہوگی۔ جن اصلاحات کا ہم کشمیر میں مطالبہ کر رہے ہیں، اُن سے سب مذاہب کے پیرو مستفید ہوں گے۔ اس لیے یہ مقاصد ایک مشترکہ جدوجہد سے ہی پورے ہو سکتے ہیں‘‘۔

میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ ’’اگر صرف مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں مملکتوں کی بنیاد ڈالنا قبول کیا جائے گا تو ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا‘‘ اور عرض کی: ’’ہندوستان کی مسلم اقلیت کم از کم تین حصوں میں بٹ جائے گی اور اس کی آواز کی تاثیر گم ہو کر رہ جائے گی‘‘۔

جناح صاحب میری باتیں سنتے رہے۔ ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ ان باتوں سے خوش نہیں ہوئے، لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے کمال صبر سے

میری ساری گفتگو سنی اور آخر کار ایک مرد بزرگ کی طرح فہمائش کے انداز میں کہنے لگے:

میں نے اپنے بال سفید کیے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کبھی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر اُن کو اپنانے کی کوشش کی لیکن مجھے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ وقت آئے گا، جب آپ کو میری بات یاد آئے گی اور آپ افسوس کریں گے۔

جناح صاحب نے مزید کہا:

آپ ایک ایسی قوم پر کیسے اعتبار کر سکتے ہیں، جو آپ کے ہاتھوں سے پانی پینا تک پاپ سمجھتی رہی ہے۔ ان کے سماج میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں، وہ آپ کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ''ایک بار بمبئی میں مَیں اپنی بیوی کے ساتھ میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ نوکر ایک ملاقاتی کا کارڈ اندر لایا۔ یہ مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی کا تھا۔ میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ جب وہ میز پر بیٹھ گئے تو میں نے انھیں کھانے کی شمولیت کی دعوت دی۔ مالوی جی نے یہ کہہ کر انکار کیا ''آپ جانتے ہیں کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر آپ کے ساتھ ایک میز پر کھانا نہیں کھا سکتا''۔ جناح صاحب بولے کہ میں نے جواب دیا: ''آپ ساتھ ہی دوسری میز لگا کر کچھ کھایئے''۔ مگر مالوی جی نے کہا: ''یہ بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ نیچے مشترکہ قالین بچھی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے چھوت آ سکتی ہے''۔ جناح صاحب نے کہا کہ اس پر میں نے قالین ہٹوا دیا اور مالوی جی کی خدمت میں میوے اور دودھ پیش کیا''۔ جناح صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ ''جس قوم کے برگزیدہ لیڈروں کا یہ حال ہو، وہ آپ کو کیسے جینے دیں گے؟'' (آتش چنار از شیخ عبداللہ ص 304 تا 310)

ملت کا خضر راہ محمد علی جناح
بے تاج بادشاہ محمد علی جناح
جو رک سکا نہ کفر کے کوہ مہیب سے
وہ سیل بے پناہ، محمد علی جناح

پاکستان زندہ باد

''یہ درست ہے کہ بھارت نے پچھلے 30 برسوں میں معاشی ترقی کی، آج وہاں 138 ارب پتی ہیں، یہ دنیا کی پانچویں بڑی معاشی طاقت بھی ہے لیکن یہ سماجی، انسانی اور مذہبی سطح پر انسانیت سے جتنا نیچے گیا، ہم وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مسلمان، سکھ اور دلت آج بھی کسی برہمن کے گلاس میں پانی اور پلیٹ میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ یہ ان کے سائے پر بھی پاؤں نہیں رکھ سکتے، چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھارت جس تیزی سے معاشی ترقی کر رہا ہے، یہ اس سے ہزار گنا تیزی سے شرف انسانیت سے نیچے جا رہا ہے اور یہ تیزی ثابت کر رہی ہے، یہ اب زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ مجھے آج قائد اعظم محمد علی جناح کے الفاظ بار بار یاد آ رہے ہیں۔ قائد نے کشمیری راہنماؤں سے کہا تھا 'تم نے اگر پاکستان سے الحاق نہ کیا تو تمہاری نسلیں پچھتائیں گی، آج ہندوستان میں موجود ہر اقلیتی خاندان کی نسلیں پچھتا رہی ہیں۔

مجھے کل دہلی کے ایک مسلمان نے فون کر کے کہا ''بھائی صاحب آپ لوگ یہاں سے نکل گئے، آپ پر اللہ نے بڑا کرم کیا، ہم لوگ جو یہاں رہ گئے، وہ اب جان بچانے کے لیے ماتھے پر تلک لگاتے ہیں، اپنے ناموں کے ساتھ رام لکھتے ہیں اور اپنے بچوں کے ختنے نہیں کرتے۔'' میں سکتے میں آ گیا، وہ بولے ''جناب ہم اپنے بچوں کو بچپن میں تربیت دیتے ہیں، وہ باہر کسی جگہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام نہ لیں، ٹھڈا لگ جائے تو زبان سے ہائے رام اور دل میں یا اللہ کہیں لیکن ہم اس منافقت کے باوجود بھی یہاں محفوظ نہیں ہیں''۔ اس کا کہنا تھا: ''پاکستان کے ہر شخص کو میرا پیغام دے دیں، اسے کہیں دہلی کا محمد خالد کہہ رہا ہے تم ایک بار دہلی آ کر دیکھ لو، تم مان جاؤ گے، پاکستان کتنی بڑی نعمت، اللہ کا کتنا بڑا انعام ہے، لہٰذا اس کی قدر کرو، اللہ کا شکر ادا کرو، تم کم از کم اپنے بچوں کے کانوں میں اذان تو دے لیتے ہو، تم ان کے ختنے تو کر رہے ہو، ہم تو جان بچانے کے لیے ان سے بھی تائب ہو رہے ہیں، میں کانپ گیا، میں نے اللہ

کا شکر ادا کیا اور اُٹھ کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا''۔

(پاکستان زندہ باد از جاوید چودھری روزنامہ ایکسپریس لاہور 6 مارچ 2020ء)

سنو اے بستگانِ زلف گیتی ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے؟

کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

تازہ بہ تازہ مطالعہ پاکستان

انگریز شاعر الیگزینڈر پوپ نے کہا تھا: ''محدود علم خطرناک ہوتا ہے۔ یا تو خوب سیراب ہو جاؤ یا چشمہ عرفان کو منہ ہی نہ لگاؤ''۔ برصغیر کی آدھی ادھوری تاریخ پڑھنے والے بعض لوگ ہر سال یوم آزادی یعنی چودہ اگست کے آس پاس نظریہ پاکستان پر سوال اُٹھاتے ہیں۔ وطن عزیز میں ایک محدود طبقے کا دعویٰ رہا ہے کہ نظریہ پاکستان یا دو قومی نظریہ نام کی چیز صرف مطالعہ پاکستان کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو صرف درسی کتب میں ہی دو الگ الگ قومیں قرار دیا گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسے دعوؤں سے کئی نوعمر طالب علم الجھ جاتے ہیں۔ کیونکہ مطالعہ پاکستان میں ہندوؤں کے انتہا درجے کے تعصب کا جو ذکر ملتا ہے، اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اس پر یقین کرنا مشکل محسوس ہوتا تھا کہ آخر کوئی اتنا متعصب کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن اب نئی نسل کے لیے یہ معمہ حل ہو رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انٹرنیٹ کی بدولت اب پاکستانی اپنے مشرقی پڑوسی کو زیادہ صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ٹویٹر، فیس بک اور دیگر پلیٹ فارمز پر ہونے والی بحثیں سب پردے کھول رہی ہیں۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ آر ایس ایس کے لگائے پودے نریندر مودی اور ان کی جماعت بی جے پی نے ہر شرم ولحاظ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ بھارت میں انتہا پسندی اب نئی سمتوں میں پھیل رہی ہے۔ پہلے ہندو انتہا پسندی کا زور شمالی اور وسطی ریاستوں میں تھا جہاں ہندی بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ 1947ء کے ہنگاموں میں بھارت کی جنوبی ریاستیں کافی حد تک پرامن رہیں اور وہاں کے مسلمان محفوظ پائے گئے۔ اب انتہا پسندی نے ان جنوبی ریاستوں کا بھی رُخ کر لیا ہے۔ پہلے انتہا پسندی آر ایس ایس تک محدود تھی جسے بی جے

پی نے گلے لگایا اور اب کانگریس بھی کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ تازہ ترین ثبوت بھارتی ریاست کرناٹک کے دارالحکومت بنگلورو سے ملا جہاں صوبائی قانون ساز اسمبلی کے کانگریس سے تعلق رکھنے والے رکن کے بھانجے نے توہین شان رسالت ﷺ کی۔ علاقے کے مسلمان پولیس کے پاس پہنچے تو پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ جب مسلمانوں نے رکن اسمبلی کے گھر کے باہر احتجاج شروع کیا تو تشدد اور فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چار مسلمان شہید ہوئے۔ اب بی جے پی، کانگریس اور بھارتی میڈیا پورا زور اس پراپیگنڈے پر صرف کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے ''منصوبہ بندی کے تحت'' یہ سارا 'فساد' پھیلایا۔ نہ تو یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کیوں کی اور نہ ہی کوئی یہ پوچھنے کی زحمت کر رہا ہے کہ پولیس نے رکن اسمبلی کے بھانجے ملعون نوین کے خلاف مقدمہ درج کرنے سے انکار کیوں کیا؟ ہنگامے اور جانی نقصان کے بعد اب اسے گرفتار کرنے کی اطلاعات ہیں۔ لیکن یہی کام احتجاج کرنے والوں پر گولیاں چلائے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب انتظامیہ نے یہ اشتعال انگیز فیصلہ بھی سنایا ہے کہ جو بھی نقصان ہوا، اس کا ازالہ مسلمانوں کی نجی املاک ضبط کر کے کیا جائے گا۔ اس ظلم و ستم کے خلاف جب کرناٹک کے سابق وزیر اعلیٰ سدھارمیا نے اپنے تئیں متوازن قسم کا بیان دیا تو انہیں ہندو دشمن قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمان راہنما تشدد روکیں اور ہندو راہنما نفرت انگیز بیانات۔ ادھر جمعیت علمائے کرناٹک نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اگر مقامی مساجد کے ذمہ داران کی شکایت پر پولیس گستاخ رسول کے خلاف کارروائی کرتی تو آج یہ حالات نہ دیکھنے کو ملتے۔ فساد کا یہ پورا واقعہ پولیس کی لاپرواہی کی وجہ سے پیش آیا ہے کیونکہ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، لیکن اپنے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں ذرا برابر بھی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ بنگلورو میں ہی گزشتہ برس ہندو انتہا پسند ''کراچی بیکری'' نامی ایک کاروبار پر محض اس لیے حملہ کر چکے ہیں کہ بورڈ پر کراچی کیوں لکھا ہے۔ اب تک اعتدال پسند سمجھے جانے والے جنوبی بھارت میں یہ انتہا پسندی

اور دہشت گردی اس کے علاوہ ہے جو کشمیری مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہے یا جس کا نشانہ شمالی بھارت میں مسلمان بن رہے ہیں۔ یہی وہ انتہا پسندی تھی جس سے برصغیر کے مسلمانوں کو بچانے کے لیے پاکستان بنایا گیا۔ بھارتی مسلمانوں کی پرانی نسلیں خوب سمجھتی تھیں کہ مضبوط پاکستان ان کے لیے بھی تحفظ کی ضمانت ہے۔ پچھلے دو عشروں میں پاکستان کمزور ہوا تو بھارت اور پاکستان کی نئی نسلوں کی کنفیوژن بڑھ گئی۔ اب سرحد کے دونوں جانب مسلمان نوجوان دو قومی نظریہ اور نظریہ پاکستان کا سبق دوبارہ پڑھ رہے ہیں۔ یہ سبق انہیں آج کی تاریخ پڑھا رہی ہے۔ دو قومی نظریہ اب علم الیقین کی بات نہیں رہا بلکہ عین الیقین کے طور پر سامنے آ چکا ہے۔ اس سے زیادہ مستند تاریخ کیا ہوگی جو آپ کی آنکھوں کے سامنے گزر رہی ہو۔ پچھلے ایک برس میں جو کچھ ہوا، اس نے مقبوضہ کشمیر میں فاروق عبداللہ سے لے کر حیدر آباد دکن میں اسد اللہ اویسی تک سب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ مودی حکومت کے اقدامات محمد علی جناح کو درست ثابت کر رہے ہیں۔ اگر 70 برس بعد بھی سیکولر ہونے کے دعوے دار بھارت میں مسلمانوں کو مساوی قانونی و سیاسی حقوق حاصل نہیں، ان کے مذہبی، عقائد، املاک اور آزادی کو تحفظ نہیں دیا جا رہا تو ان کے ''دوسری قوم'' ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ دو قومی نظریہ اسی کا نام ہے۔ (اداریہ روزنامہ امت کراچی 14 اگست 2020ء)

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

تاریخ کے ساتھ مذاق

''قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو بددیانتی اور دیدہ دلیری سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ قرار دادِ مقاصد کے خلاف جو فکری جنگ برپا ہے، اس کا بھرپور مقابلہ کیا جائے اور قائداعظم کے بیان کو آج جس طرح اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے، اس کا پردہ چاک کیا جائے۔ اس لیے کہ قائداعظم نے قیام پاکستان کی ساری جنگ دو قومی نظریے، مسلمانوں کی نظریاتی قومیت، دین پر مبنی ان کی

شناخت اور اسلامی نظریے کے لیے پاکستان کو تجربہ گاہ بنانے کے مسلسل وعدوں پر لڑی تھی۔ آج سیکولر لابی اس عظیم تاریخی تحریک کو جس کے دوران ملت اسلامیہ ہند نے بیش بہا قربانیاں دی ہیں، ہائی جیک کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اسے محض معاشی مفادات کا کھیل بنا کر پیش کیا جا رہا ہے جو تاریخ کے ساتھ مذاق، قائداعظم سے بے وفائی اور امت مسلمہ اور پاکستان کے لیے قربانی دینے والوں کے خون سے غداری کے مترادف ہے''۔ (تحفظ ناموس رسالت ﷺ اور ہماری ذمہ داری از ڈاکٹر انیس احمد مطبوعہ ماہنامہ ترجمان القرآن دسمبر 2010ء)

بیٹی کی شادی سکھ اور بیٹے کی شادی پارسی سے!

1942ء کا ذکر ہے کہ ولی خان کے تایا ڈاکٹر خان صاحب کی بیٹی مریم نے ایک سکھ سردار جسونت سنگھ سے شادی کر لی۔ مفتی مدرار اللہ مدرار (جو جمعیت علمائے اسلام صوبہ سرحد کے سابق سیکرٹری تھے اور جنہوں نے بعد ازاں سرحد مسلم لیگ میں شرکت کر لی تھی) نے اپنی کتاب ''خان عبدالغفار خان، سیاست اور عقائد'' میں تفصیل سے خان عبدالغفار خان کے مذہبی افکار اور نظریات پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''اخبار نویسوں نے ڈاکٹر خان صاحب کا ردعمل معلوم کرنا چاہا تو انہوں نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا: میری بیٹی نے اپنی پسند کی شادی کی ہے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، میرا اشیرباد اس کے ساتھ ہے''۔

مفتی صاحب نے اس پر 16 مئی 1942ء کے روزنامہ زمیندار لاہور میں یہ بیان شائع کرایا کہ ڈاکٹر خان صاحب کی صاحبزادی کی شادی ایک غیر مسلم سے ٹھہرنے پر ہمیں از حد افسوس ہے اور ڈاکٹر صاحب کو چاہیے کہ اشیرباد دینے کے بجائے بیٹی سے قطع تعلق کا اعلان کریں۔ اس موقع پر 13 مئی 1942ء کو اخبار ''اصلاح سرحد'' میں ایک ادارتی شذرہ بھی شائع ہوا تھا۔ جس میں اس حرکت کو غیر اسلامی اور پٹھانوں کی روایات کے خلاف قرار دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر خان صاحب کی بیٹی نے تو سکھ سے شادی کی، ان کے بیٹے نے ایک

پارسی لڑکی صوفیہ کو اپنی بیوی بنایا۔ خان عبدالغفار خان خود اپنی کتاب ''زماژ و نداو، جدوجہد'' میں لکھتے ہیں:

❑ ''صوفیہ سوم جی میری ملاقات کے لیے آتی تھیں۔ یہ اس وقت ہندوستان کی زنانہ رضا کاروں کی کمانڈر تھیں۔ پھر بعد میں اس کی شادی سعد اللہ خان (فرزند ڈاکٹر خان صاحب) سے ہوگئی''۔ (گاندھی کے چیلے از ضیا شاہد ص 35، 36)

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگ دین، ننگ ملت و ننگ وطن

دینی غیرت وحمیت

سر ڈنشا پیٹٹ اور لیڈی پیٹٹ پارسیوں کے انتہائی معزز ارکان میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا خاندان بہت آزاد خیال اور جدت پسند واقع ہوا تھا۔ دینا آہستہ آہستہ اس ماحول کے رنگ میں رنگتی چلی گئیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ رفتہ رفتہ اسلام اور اس کی رسوم و رواج حتیٰ کہ اپنے والد کے اصولوں سے دور ہٹتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک پارسی نژاد عیسائی شخص نیول واڈیا سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

جب قائداعظم کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انھیں سخت فکر لاحق ہوئی۔ انھوں نے پہلے تو خود دینا کو اس روش پر چلنے سے روکنا چاہا۔ انھیں سمجھایا بجھایا، افہام و تفہیم سے کام لے کر اسے اپنے خیالات پر نظرثانی کرنے کی ترغیب دی۔ اس کے بعد انھوں نے مشہور مسلمان رہنما مولانا شوکت علی کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ دینا کو اسلام کے اصولوں اور ان کی اہمیت سے روشناس کروائیں۔ مگر وہ بھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود دینا کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے میں ناکام رہے۔

قائداعظم کے ایک دوست جسٹس ایم سی چھاگلہ نے اپنی سوانح حیات ''روز زان دسمبر'' میں لکھا:

'جناح نے حسب معمول اپنے نادر شاہی انداز میں دینا سے کہا، ہندوستان میں لاکھوں مسلمان لڑکے موجود ہیں اور وہ جسے پسند کرے، اسی کے ساتھ اس کی شادی

کردی جائے گی۔' اس پر دینا نے جو حاضر جوابی میں اپنے باپ سے بڑھ کر تھی، برجستہ کہا 'ابا جان! ہندوستان میں لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں، آپ نے ان میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کیوں نہیں کی تھی؟'

دینا نے اپنی شادی کے ایک طویل عرصے بعد اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ 'پاپا نے میری بات سکون سے سننے کے بعد انتہائی متانت سے جواب دیا 'میری پیاری بیٹی، تمھاری ممی نے بھی مجھ کو منتخب کرنے کے بعد اپنے ڈیڈی سے شادی کی اجازت طلب کی تھی جو انھوں نے بطیب خاطر دے دی تھی۔ میں بھی تمھیں اس کی خوشی کے ساتھ اجازت دوں گا لیکن شرط ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ تمھارا ہونے والا شوہر اسلام قبول کرلے تاکہ تمھارا نکاح اسلام کی شرط کے مطابق ہوسکے۔' پھر پاپا نے نہایت شفقت سے مجھے ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ مذہبی عقائد میں ہم آہنگی سے ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے میں بہت مدد ملتی ہے۔'

'پاپا نے یہ سب باتیں کسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر نہایت پرسکون لہجے میں کہیں۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ پاپا کا ایک ایک لفظ معنی رکھتا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ میری زندگی کا پہلا فیصلہ کن مرحلہ ہے، میں نے پاپا سے وعدہ کیا کہ میں اپنے شوہر کے اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گی اور اگر ضرورت پڑی تو اس سلسلے میں پاپا کی راہنمائی بھی حاصل کروں گی۔'

'جب میں نے مسٹر واڈیا سے شادی سے پہلے اسلام قبول کرنے کے متعلق کہا تو انھوں نے ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کردیا۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو میں اپنے باپ کی خواہشات کے مطابق مسٹر واڈیا سے شادی کرنے سے انکار کردوں یا مسٹر واڈیا سے شادی کرکے باپ کی ناراضی مول لے لوں۔ میں نے دل میں کہا، واڈیا سے شادی کرلینی چاہیے، باپ آخر باپ ہے چند دن، مہینے، ہفتے یا زیادہ سے زیادہ چند ماہ ناراض رہنے کے بعد خود بخود مان جائیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک دن پاپا کو اپنے اس ارادے سے مطلع کردیا۔'

’میری باتیں سننے کے بعد پاپا نے برف کی سی ٹھنڈک کے ساتھ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ’بیٹی، تم جانتی ہو کہ تمھارے سوا میری اور کوئی اولاد نہیں۔ مجھے تم سے جتنی محبت ہے، اس کا اندازہ لگانا تمھارے لیے ممکن نہیں۔ میرا بیٹا بھی کوئی نہیں، اس لیے لے دے کے زندگی میں تم ہی میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہو لیکن اب تم بالغ ہو۔ میں تمھارے فیصلے میں دیوار بننا پسند نہیں کرتا۔ اب تم میرا فیصلہ بھی سن لو! اگر تم نے جان بوجھ کر برضا ورغبت ایک غیر مسلم سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تم شرع محمدی کے مطابق مسلمان نہیں رہ سکتیں۔ تم مرتد قرار پاؤ گی۔ اسلام خون کے رشتوں کو قبول نہیں کرتا، اس لیے اس کے بعد تم میری اصطلاحی بیٹی تو شاید کہلا سکو۔ لیکن درحقیقت تم میری بیٹی اور میں تمہارا باپ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس فیصلے کے بعد جونھی تم میرے گھر کی چار دیواری سے باہر پاؤں رکھو گی، تمھارے اور میرے درمیان تمام تعلقات منقطع متصور ہوں گے۔‘

’تھوڑی دیر توقف کے بعد پاپا نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا ’کاش میں تمھیں تمھارے فیصلے سے باز رکھ سکتا۔ کاش، تمھیں معلوم ہوتا کہ میرے سینے میں باپ کے دل کی جس کی ایک ہی بیٹی ہو کیفیت کیا ہے، لیکن میں اسلامی احکام کے آگے اپنے آپ کو بےبس اور لاچار پاتا ہوں۔‘ یہ کہہ کر پاپا گردن جھکائے ہوئے میری سسکیوں کے درمیان اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔‘

’جب میرے پاپا مجھ سے یہ گفتگو کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں، ان کا چہرہ کسی اور ہی دنیا کے نظر آتے تھے۔‘

(کیا پاکستان کے بانی محمد علی جناح نے اپنی اکلوتی بیٹی کو عاق کر دیا تھا؟ ازعقیل عباس جعفری، مطبوعہ بی بی سی اُردو **15** نومبر **2020**ء)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

پاکستان ایک اسلامی ریاست

14 اگست 1948ء کو کراچی میں پہلی سالگرہ کے موقع پر قوم کے نام الوداعی پیغام دیتے ہوئے بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا:

''یاد رکھیے! پاکستان کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاستوں میں سے ایک ہے اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھیں گے، سال بہ سال ایک شاندار کردار ادا کرنا اس کا مقدر ہے، بشرطیکہ ہم دیانتداری، تندہی اور بے غرضی کے ساتھ پاکستان کی خدمت کریں۔ مجھے اپنے عوام پر پورا بھروسا ہے کہ وہ ہر موقع پر اسلام کی گزشتہ تاریخ، شان و شوکت اور روایات کے شایانِ شان مستعد رہیں گے''۔

(قائداعظم: تقاریر و بیانات جلد چہارم از اقبال احمد صدیقی ص 503)

''جوتوں کی کمی''

یوم آزادی یعنی 14 اگست والے دِن گاڑی لے کر گھر سے نکلا تو کالونی کے سامنے والی مارکیٹ میں برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے جوتے مرمت کرنے والے اکرم چاچا نے ایک بڑا سا بورڈ لگایا ہوا تھا ''14اگست کی خوشی میں جوتے مفت مرمت کروائیں''۔ میں نے گاڑی ایک طرف لگالی اور دیکھنے لگا کہ ایک شخص نے جوتا مرمت کروا کے اکرم چاچا کو پیسے دینا چاہے تو چاچا نے مسکراتے ہوئے اس بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور پیسے لینے سے انکار کردیا۔ میں گاڑی میں بیٹھا حیران سا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وطن سے عشق کا یہ کیسا عالم ہے جو ہمیں ہماری ضرورتوں سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔ میں بے اختیار گاڑی سے اترا اور جا کر اکرم چاچا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اکرم چاچا نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں نے ادب سے جھک کر اکرم چاچا کو سلام کیا تو اکرم چاچا میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے ''پتر سب سے پہلے تو سوہنے وطن کا جشن آزادی مبارک اور اب حکم کر میرے لائق کوئی خدمت ہے تو'' میں نے بے اختیار کہا ''چاچا جی خیر مبارک اور مجھے گناہگار مت کریں، یہ حکم والی بات کر کے۔ ویسے

ہی آپ کو ملنے کا دل چاہا تو آ گیا''۔ میں سامنے تھڑے پر بچھی چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا ''چاچا ایک بات پوچھنی تھی اگر آپ ناراض نہ ہوں''۔ اکرم چاچا مسکرا کر بولے ''بسم اللہ پتر ایک نہیں دس باتیں پوچھ لے''۔

میں نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا ''چاچا میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں کہ آپ ہر جشن آزادی، 23 مارچ، 6 ستمبر عید وغیرہ پر پورا دن جوتے مفت مرمت کرتے ہیں۔ آج یہ سوال پوچھنے کی جرأت کر رہا ہوں ورنہ کب سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا''۔

اکرم چاچا نے مسکرا کر کہا ''پتر میں پڑھا لکھا نہیں ہوں ورنہ بارڈر پر کھڑا ہو کر اپنے وطن کی حفاظت کرتا۔ موچی کا بیٹا تھا، شروع سے شوق تھا وطن کی خدمت کرنے کا لیکن کچھ بن نہیں پایا اور جب آج سے چالیس برس قبل یہاں اپنے والد کی جگہ سنبھالی تو سوچا چلو ایسے سہی لیکن اپنے ہم وطن لوگوں کی کچھ تو خدمت کر لوں''۔

میں نے فوراً کہا ''لیکن چاچا کافی لوگ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی پاکستان میں خامیاں ہی نکالتے رہتے ہیں اور آپ تو بمشکل اتنا کماتے ہیں جس سے دو وقت کی روٹی کمائی جا سکے''۔ چاچا نے حسب عادت مسکراتے ہوئے جواب دیا ''پتر وطن سے محبت ہونے کے لیے سب کچھ حاصل ہونا ضروری نہیں بلکہ غیرت کا ہونا ضروری ہے۔ میں سارا دن جوتے مرمت کرتا ہوں لیکن آزاد ہوں، میری مٹی میری پہچان ہے، تو کیا یہ سب میرے لیے کم ہے؟'' اکرم چاچا نے سانس لیتے ہوئے آخر میں بہت خوبصورت بات کی ''پتر ضروری نہیں کہ یہ وطن پیسہ دے تو اس سے محبت ہو۔ میں جوتے مرمت کرنے والا بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور اگر کوئی پاکستان میں رہ کر پاکستان کے وجود پر سوال اٹھاتا ہے تو یقیناً اس کو جوتوں کی کمی ہے''۔ (خالد چودھری کی وال سے)

قائداعظم اور علامہ اقبال

پاکستان کے قیام کا تصور علامہ اقبال نے پیش کیا اور قائداعظم محمد علی جناح نے اس تصور کو حقیقت کا روپ دیا۔ ایک مفکر پاکستان کہلایا اور دوسرے کو بانی پاکستان ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ دونوں شخصیتیں اپنی جگہ عظیم ہیں اور دونوں ہی پاکستان کے

کروڑوں عوام کو بے حد عزیز ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے پر بہت اعتماد کرتی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا راہنما تصور کرتے تھے اور یہی بات دونوں کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی راہنما بھی تھے۔ اس حیثیت سے ان کی خدمات برصغیر بالخصوص مسلمانان ہند کی تاریخ میں بہت نمایاں ہیں۔ گول میز کانفرنس کے بعد قائداعظم تو انگلستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر وفات پا چکے تھے۔ اس وقت برصغیر میں خالص اسلامی طرزِ فکر کی حامل شخصیت اقبال کی تھی جن کی طرف مسلمانان ہند رجوع کر سکتے تھے۔ جب اقبال نے بڑھاپے، کمزوری اور خرابی صحت کی بنا پر مسلم لیگ کی قیادت کو سنبھالنا مشکل سمجھا تو قائد اعظم محمد علی جناح کو لندن سے خط لکھ کر بلایا اور قوم کی قیادت ان کے حوالے کر دی۔ وہ قائد اعظم کو ہندوستان کے مسلمانوں کا واحد قابل اعتماد راہنما سمجھتے تھے جو انہیں مصیبتوں سے نجات دلا سکتا تھا۔ انہوں نے قائداعظم سے مسلسل رابطہ قائم رکھا۔ قائد اعظم سے ان کی باقاعدہ خط و کتابت رہی اور مختلف موقعوں پر انہیں اہم مشورے بھی دیئے۔ اقبال اور جناح کے خطوط اس کا بین ثبوت ہیں۔

1936ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے تمام ملک کا دورہ کیا اور مسلمانان ہند کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے کی تلقین کی۔ اسی سلسلے میں قائد اعظم 29 اپریل 1936ء کو لاہور تشریف لائے اور پنجاب کے اہم سیاسی راہنماؤں سے تعاون کی اپیل کی، مگر یہ اپیل بے اثر ثابت ہوئی۔ اس پر انہوں نے علامہ اقبال سے درخواست کی جنہوں نے بیماری کے باوجود تعاون کا یقین دلایا، لیکن ساتھ ہی اقبال نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ اودھ کے تعلق داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔ یہ بات سن کر قائداعظم کرسی سے تھوڑا سا اُٹھے اور بڑے جوش سے بولے کہ مجھے صرف عوام کی مدد کی ہی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال نے قائداعظم کے ایک سپاہی کی حیثیت سے پنجاب میں مسلم لیگ کو نئے سرے سے منظّم کرنے کا کام شروع کیا۔ وہ فوقتاً فوقتاً قائداعظم کو سیاسی حالات اور واقعات سے مطلع کرتے رہتے تھے اور پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے رہتے تھے۔ اقبال نے اپنے متعدد خطوط میں قائداعظم کو مفید مشورے دیے اور اہم پالیسیاں اپنانے کی تلقین بھی کی۔ ایک خط میں انہوں نے قائداعظم کو یوں لکھا:

❑ ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمان آپ اور صرف آپ ہی کی طرف دیکھیں گے اور آپ ہی ان کی کشتی کو ساحل مراد تک لے جائیں گے''۔

اقبال کی یہ پیشگوئی بہت جلد حرف بحرف پوری ہوئی۔ اقبال نے اپنے خطوط میں سیاسی مسائل کے حل پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی غربت کے علاج کے لیے قائداعظم کو مشورہ دیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی اپنی جداگانہ ریاست ہو اور اس میں اسلامی نظام نافذ ہو تو اس سے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی زندگی درست ہو سکے گی۔ اقبال نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم کے نام اپنے خط میں تحریر کیا:

❑ ''اسلامی قانون کے طویل وعمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر شخص کے لیے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقا ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر ناممکن ہے''۔

21 جون 1937ء کو اقبال نے جو خط قائداعظم کو لکھا، وہ اپنے مباحث کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ اس میں برصغیر کے سیاسی مسائل کا تجزیہ اور ان کے لیے تجاویز پیش کیں اور برصغیر کی تقسیم کی تجویز بھی پیش کی ہیں۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں:

❑ ''میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر خیال نہ کریں گے۔ اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے، اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ راہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے''۔

اس خط میں آگے چل کر اقبال قائداعظم کو مشورہ دیتے ہیں:

- ''میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبے میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اختیار کرنا پڑے گا''۔

قائداعظم کے نام 28 مئی 1937ء کو ایک خط میں علامہ اقبال برصغیر کے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

- ''اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فطانت و فراست ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی''۔

(علامہ اقبال اور قائداعظم کے سیاسی نظریات از محمد حنیف شاہد ص 237)

(''قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے'' از پروفیسر ڈاکٹر حمید رضا صدیقی، ص 90)

کامل مرد محمد بخشؒ لعل بنان پتھر دا

دنیا سے نفرت

مردِ مومن جب اپنے صحیح مقام پر پہنچ جاتا ہے تو مخبر صادق ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ اس دنیا کو اپنے لیے ایک قید خانہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے جلد رہائی حاصل کرنے اور اپنے آقا و مولا کے حضور پہنچنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ وہ موت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے رحمت تصور کر کے اس کا منتظر رہتا ہے، اسے دوسروں کی طرح دنیا و مافیہا کی محبت نہیں ستاتی، دنیا کو چھوڑنے کا اسے کوئی رنج و غم نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ اس فانی دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی حالت قائداعظمؒ کی تھی۔

کوئٹہ میں علاج معالجہ سے جب کچھ افاقہ ہوا تو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش صاحب نے باتوں باتوں میں قائداعظمؒ سے کہا: ''ہماری انتہائی کوشش ہے کہ آپ کی صحت اتنی اچھی ہو جائے کہ جتنی آپ کی صحت سات آٹھ برس پہلے تھی''۔ قائداعظم یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا: ''چند سال قبل یقیناً میری یہ آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں اس لیے نہیں کہ میں موت سے ڈرتا تھا بلکہ اس لیے زندہ رہنا چاہتا تھا کہ قوم نے جو کام میرے سپرد

کیا ہے اور قدرت نے جس کام کے لیے مجھے مقرر کیا ہے، میں اسے اپنی زندگی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ اب وہ کام پورا ہو چکا ہے، میں اپنے فرض کو ادا کر چکا ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے، اس کی بنیادیں مضبوط ہیں، اب چند ماہ سے مجھے ایسے خیال آتے رہتے ہیں کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں، قوم کو جس چیز کی ضرورت تھی، وہ قوم کو مل گئی ہے، اب یہ قوم کا کام ہے کہ وہ اس کی تعمیر کر کے اسے نا قابل تسخیر اور ترقی یافتہ ملک بنا دے اور حکومت کا نظم ونسق چلائے۔ میں طویل سفر کے بعد تھک گیا ہوں، آٹھ سال تک مجھے قوم کے اعتماد پر دو عیار مضبوط دشمنوں سے لڑنا پڑا ہے۔ میں نے خدا کے بھروسا پر انتھک محنت کی ہے اور اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ تک حصول پاکستان کے لیے صرف کر دیا ہے۔ میں تھک گیا ہوں، آرام چاہتا ہوں، اب مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں اپنا کام کر چکا۔ اب مجھے مرنے کا رنج نہیں ہوگا، لیکن میں زیارت میں مرنا نہیں چاہتا''۔ (آخری لمحات)

چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی یہ آخری خواہش بھی پوری فرمائی اور آپ کو قبل از رحلت زیارت سے کراچی لایا گیا۔

آخرت کی سرفرازیوں کی پہلی منزل حسن خاتمہ ہے جو ایک مؤمن کی آخری نشانی ہے۔ زندگی کے بالکل آخری لمحات میں جب قائداعظم پر بیہوشی طاری ہو گئی، کمزوری انتہا کو پہنچ گئی، نبض کی دھڑکنیں غیر مسلسل ہو گئیں، آنکھیں پتھرا گئیں، سانس رُک رُک کر آنے لگا تو اس بیہوشی کے عالم میں قائداعظمؒ کے منہ سے جو دو آخری لفظ نکلے، وہ...... ''اللہ...... پاکستان'' تھے۔

حالانکہ ان کے پاس کوئی تلقین کرنے والا موجود نہ تھا۔ زندگی کی اس آخری نازک ترین گھڑی میں............ اللہ............ کا لفظ نوک زبان پر ہونا اور انتقال کے بعد تمام عالم اسلام میں ایصال ثواب کے لیے لاکھوں مسلمانوں کا بلا تحریک وتحریص یا ترغیب وترہیب ختم قرآن کریم کرنا ایک قابل رشک سعادت ہے جو آج تک کسی عوامی راہنما کو حاصل نہیں ہوئی۔ (آیئے! پاکستان کی قدر کریں از محمد اسحاق ملتانی)

وفات

اس سانحہ عظیم کی خبر رات ہی میں بازاروں سے نکل کر سارے شہر میں پھیل گئی۔ کچھ لوگ آہ و بکا کر رہے تھے اور کچھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گورنمنٹ ہاؤس کی اونچی دیواروں کے قریب ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ شام کو جو ہوا چل رہی تھی، وہ اب بند ہو چکی تھی اور رات بہت گرم تھی۔ ہجوم میں جو لوگ دیوار سے سب سے زیادہ قریب تھے، انھوں نے اسے ہاتھ لگایا اور دعائیں پڑھتے رہے۔

ذرا دیر بعد ایک شخص آہستہ آہستہ بھیڑ کر چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کفن اور ایک چھوٹی سی بوتل تھی۔ کفن کو آبِ زمزم میں ڈبویا گیا تھا اور بوتل میں عطر تھا۔ یہ شخص کچھ عرصے قبل رسول اکرم ﷺ کے مزارِ مبارک کی زیارت کرنے مدینے گیا تھا۔ وہاں اس موقعے پر جو عطر حضور نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر پر چھڑکا گیا تھا، اس میں سے تھوڑا سا وہ تبرکاً بوتل میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ قائداعظم کو کفن پہنا دیا گیا اور پھر یہی عطر اس پر چھڑکا گیا۔

لڑکپن کے دنوں میں محمد علی جناح نے ہمیشہ مٹی میں کھیلنے سے پرہیز کیا تھا اور اپنے ہاتھوں اور دامن کو گرد و غبار سے بچایا تھا۔ لڑکپن کا یہ حوصلہ اور غرور تمام عمر ان میں باقی رہا اور موت کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ بارہ ستمبر کی صبح کو آخر اسی خاک میں مل گئے جس سے ساری عمر دور رہے تھے''۔

(محمد علی جناح، بانی پاکستان از ہیکٹر بولائتھو Henry Hector Bolitho مترجم زہیر صدیقی ص 344)

قائداعظم کے آخری لمحات اور فیضان نبوی ﷺ

قائداعظمؒ کے شخصی معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ قائداعظم کے آخری لمحات کے بارے میں فرماتے ہیں:

- ''ایک روز آپ (قائداعظم) باتوں باتوں میں فرمانے لگے: ''پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کا دوست اور دشمن، سب ہی اعتراف کرنے پر مجبور ہیں...... پاکستان بن چکا ہے۔ پاکستان کا مستقبل درخشندہ ہے۔ میری روح کو

تسکین ہے۔ میرے دل کو اطمینان ہے کہ برعظیم ہند میں مسلمان غلام نہیں بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد مملکت کے مالک ہیں۔ آج وہ ایک ایسی مملکت کے مالک ہیں جس کے وسائل و ذرائع لامحدود ہیں۔ آج اُن کا اپنا وطن ہے۔ آزاد اور خود مختار وطن جس کی ترقی کی شاہراہیں وسیع ہیں جس کا مستقبل روشن ہے۔ ان شاء اللہ۔ مستقبل قریب میں پاکستان دنیا کا ایک عظیم ترین ملک بن جائے گا''۔

کسی قدر توقف کے بعد فرمانے لگے:

''جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے تو میرا سر عجز و نیاز کے جذبات کی فراوانی سے بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لانے کے لیے فرط انبساط سے جھک جاتا ہے''۔

قائداعظم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ آواز بلند ہوتی گئی۔

''یہ مشیت ایزدی ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ جس قوم کو برطانوی سامراج اور ہندو سرمایہ دار نے قرطاس ہند سے حرف غلط کی طرح مٹانے کی سازش کر رکھی تھی، آج وہ قوم آزاد ہے اس کا اپنا ملک ہے۔ اپنا جھنڈا ہے۔ اپنی حکومت اور اپنا سکہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے۔ یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خداوند تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ سے کیا تھا کہ اگر تیری امت نے صراط مستقیم کو اپنے لیے منتخب کر لیا تو ہم اسے زمین کی بادشاہت دیں گے۔ خدا کے اس انعام عظیم کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔ پاکستان خداوندی تحفہ ہے اور اس تحفہ کی حفاظت ہر پاکستانی مرد و زن، بچے، بوڑھے اور جوان کا فرض ہے۔ اگر مسلمان نیک نیتی، دیانت داری، خلوص، نظم وضبط اور اعمال و افعال صالح سے دن رات کام کرتے رہے، ان میں بدی، نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد کا جذبہ پیدا نہ ہوا تو ان شاء اللہ وہ چند سالوں میں ہی دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدن، ثقافت و شرافت کا مرکز ہو گا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر سارے ایشیا کی رہبری کریں گی اور

ایشیا کو امن آشتی اور ترقی کا راستہ دکھائیں گی‘‘۔

قائداعظم بڑی تیزی سے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو اور پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہو، فرما رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ پہلا دن تھا کہ انہوں نے پاکستان کے متعلق اس قدر تفصیل کے ساتھ بات چیت کی۔ دیر تک بولتے رہنے کی وجہ سے وہ تھک گئے تھے، اس لیے لیٹ گئے اور ہم کمرے سے باہر نکل آئے‘‘۔ (قائداعظم کے آخری لمحات از ڈاکٹر ریاض علی شاہ)

قائداعظمؒ کے وقت وصال کے لمحات کو بیان کرتے ہوئے مادر ملت فرماتی ہیں:

He slept for about two hours, undistrubed, and then he opened his eyes, saw me, and signalled with his head and eyes for me to come near him. He made one last attempt and whispered, "Fati, Khuda Hafiz. ...... La ilaha illallahu ...... Muhammadur ...... Rasu ...... lullah." His head dropped slightly to his right, his eyes closed. (My Brother by Fatima Jinnah Edited by Sharif al Mujahid)

آپ تقریبا دو گھنٹوں کے لیے پرسکون طور پر سو گئے۔ پھر آپ نے اپنی آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور اپنے سر اور آنکھوں سے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ آپ نے اپنی آخری کوشش کی اور سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا:

فاطی! خدا حافظ!

لا اله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه

آپ کا سر آہستگی سے سیدھی جانب ڈھلک گیا۔ آپ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

جو شخص وقت وصال کلمہ طیبہ پڑھ کر دنیا سے رخصت ہو، نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے جنت کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من کان آخر کلامه لا اله الا اللّٰه دخل الجنة“ (سنن ابی داؤد)

''جس کا آخری کلام ''لا الہ الا اللہ'' ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا''

گھٹائیں ابر رحمت کی تیری تربت پہ چھا جائیں
صدا حوریں فرشتے آ کے تجھ پہ پھول برسائیں

عارف کی تدفین

اکتیس توپوں کی گھن گرج والی سلامی میں زیر لحد اتارا گیا۔ زیر لحد اتارنے کا عزو شرف جناب غازی صاحب کو حاصل ہوا۔ ''غازی'' صاحب جو بظاہر تاجر اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مجلس عاملہ کے رکن تھے، ان کا بغداد میں سونے کا کاروبار تھا۔ ایک رولز رائس ان کے پاس تھی مگر جب ''دربار جیلان'' سے ابدال کے منصب پر فائز کیے گئے تو سب کچھ تقسیم کر کے امرتسر آ گئے اور تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ بقول منشی عبدالرحمٰن خان، غازی صاحب قائداعظم کے بڑے معتمد اور مقرب تھے اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے منظور نظر تھے۔ منشی عبدالرحمٰن خان کہتے ہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی اور حضرت ''غازی'' کی دینی اور روحانی تربیت نے قائداعظم کو عارف باللہ بنا دیا تھا۔ عارف کی تدفین ابدال کے ذمہ ہوتی ہے مگر جب قائداعظم کی وفات ہوئی اس وقت غازی صاحب قائداعظم کی نمائندہ کی حیثیت سے دربار نبوی ﷺ میں حاضری دینے مدینہ منورہ، بحری جہاز ''محمدی'' سے جا رہے تھے۔ ان کا جہاز کراچی سے 12 میل کے فاصلہ پر ہی تھا کہ انہیں اس المناک سانحہ کی خبر ملی۔ غازی صاحب نے خبر وفات ملتے ہی جہاز کے کپتان کو اپنی نمائندگی کے کاغذات دکھلا کر کراچی واپس جانے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس پر غازی صاحب اپنے کیبن میں چلے گئے۔ اب خدا کی شان دیکھیے کہ نیچے سے جہاز میں ایسا نقص پڑ گیا کہ کپتان کو جہاز کراچی پورٹ پر واپس لانا پڑا۔ غازی صاحب کراچی پورٹ پر تو آ گئے مگر مشکل یہ تھی کہ قائداعظم کے سوگ میں شہر میں مکمل ہڑتال تھی مگر معاً ایک ملٹری ٹرک وہاں پہنچا جس نے انہیں جنازگاہ تک پہنچایا۔ آگے ملٹری کا پہرہ تھا، اس نے انہیں تابوت قائداعظم تک جانے سے روکا۔ سامنے خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر اور علامہ شبیر احمد عثمانی بیٹھے تھے۔ غازی صاحب کو دیکھتے

ہی مولانا شبیر احمد عثمانی نے پہرہ داروں کو کہا: ''ان کو آنے دو۔ قائد کے اصلی وارث تو اب آئے ہیں۔ علامہ عثمانی نے غازی صاحب سے فرمایا: ''لو بھائی! اپنی امانت سنبھالو!''

غازی صاحب نے طویل القامت قائداعظم کو اکیلے اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھا کر قبر میں اتارا۔ واپس جا کر ''محمدی'' جہاز سے مجھے لکھا: خدا کا شکر ہے کہ کندھا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے قائداعظم کو قبر میں اتارا۔ ان کا وزن بمشکل پندرہ سیر ہوگا۔ جب میں نے سر کا بند کھولا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت میٹھی نیند سو رہا ہے۔ سکرات موت کے اثرات نہ تھے۔ (میر کارواں محمد علی جناح از قاضی سیّد عبدالحنان)

دنیا سے بلاخوف گزرنے والے
جز حق کے کسی سے بھی نہ ڈرنے والے
تو زندۂ جاوید ہے اے رشکِ مسیح
مرنا کیسا کبھی نہ مرنے والے

کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

منظومات

اگر سیاستدانوں نے قوم کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر ان کے ذہنوں میں آزادی کی شمع روشن کی تو فوجی جنرلوں نے شمع آزادی کے پروانوں کو میدان کارزار میں قیادت فراہم کی جبکہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنی شاعری اور ادب سے نہ صرف بچوں، بوڑھوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں کے اندر آزادی اور حریت کے جذبات کو زندہ رکھا بلکہ میدان کارزار میں دادِ شجاعت دینے والے سرفروشانِ آزادی اور مجاہدین حریت کے دلوں کو بھی اس طرح گرمایا کہ انہوں نے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کو صفحہ ہستی سے نابود کر کے اپنی قوم کو فتح و نصرت سے ہمکنار کیا۔ شاعروں کے گیتوں اور قومی نغموں کی لے پر شجاعت، بہادری، اولوالعزمی، بلند حوصلگی، حریت پسندی، جذبہ جہاد اور قربانیوں کی انمٹ داستانیں رقم کر دیں۔

شاعر اور ادیب قوم میں وہ جذبہ جہاد پیدا کرتے ہیں جس سے سرشار ہو کر مردہ قوم میں زندگی اور حریت پسندی کی ایسی لہر دوڑ جاتی ہے کہ تخت و تاج سرنگوں ہو جاتے ہیں، آمریت گھٹنے ٹیک دیتی ہے، توپ و تفنگ کے رُخ بدل جاتے ہیں، جبر و تشدد دم توڑ دیتا ہے اور بالآخر غلامی کی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ صبح آزادی کا سورج طلوع ہوتا ہے اور غلامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا آزادی کی تابانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

دنیا کی دیگر تحاریک آزادی کے مانند تحریک پاکستان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ علامہ اقبال کے تصور پاکستان نے جب قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں نظریاتی حدود سے نکل کر جغرافیائی خدوخال اختیار کرنا شروع کیے تو برصغیر کے مسلمان سیاستدانوں، تاجروں، وکیلوں، طلبہ و طالبات، بچوں اور ادیبوں کے ہمراہ مسلمان شعرا نے بھی تحریک پاکستان کو مقبول عام بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پاکستان مخالف پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان شعرا کرام کا اگر پاکستان پر مکمل ایقان تھا تو قائداعظم محمد علی جناح کی ذات

اور قیادت پر بھرپور اعتماد بھی تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قائداعظم کی ذات اور قیادت پر اپنے مکمل اعتماد اور بھروسا کا برملا اظہار بھی کیا۔ ان شعرائے کرام نے قائداعظم کی قیادت کو کچھ ایسے بے مثال جذبہ سے سرشار ہو کر منظوم خراج تحسین پیش کیا کہ ان کے دلوں کی آواز پورے اسلامیان ہند کی آواز بن گئی اور بچہ بچہ پکار اُٹھا۔

''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح''

بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کی مقناطیسی شخصیت اور تحریک پاکستان کی تکمیل کا عہد آفریں کارنامہ بین الاقوامی اسلامی تحریک کا ایک اہم واقعہ ہے۔ بیسویں صدی کے سائنسی اور صنعتی عہد میں بین الاقوامی سطح پر اسلامی قومیت اور ثقافت کے احیا کی مجموعی تحریکات میں قائداعظم کا نام سرفہرست رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ عالم نے عموماً اور اہل پاکستان نے خصوصاً ہر موڑ پر بابائے قوم کو کسی نہ کسی وسیلے سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اس تحسین آفرینی میں قائداعظم کے کردار اور اُن کے عملی مزاج کی ان صورتوں کو اجاگر کیا ہے جو قوموں کی تقدیر بدلنے والی قوت رکھتی ہیں۔ اقبالؔ نے ایک مدبر اور عظیم راہنما کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

قائداعظم کی پوری شخصیت اسی تعریف کے منطقہ (Zone) میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ فدایانِ ملت نے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جو مختلف زاویے اپنائے، ان میں شعری آرٹ کا وسیلہ بھی شامل ہے۔ قائداعظم کی حق گوئی و بے باکی، یقین محکم، عمل پیہم، بالغ نگہی اور سیاسی حکمت و تدبیر ایسے عناصر ہیں جو اُردو شعر و ادب کا موضوع رہے ہیں۔ آیئے ملاحظہ کیجیے۔

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے تری داستاں کے ہیں

علامہ محمد اقبالؒ

مردمومن (محمد علی جناح)

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تُو ڈھونڈ رہا ہے سَمِ افرنگ کا تریاق!
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
بُرّندہ و صیقل زدہ و روشن و بَرّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اُس میں ہیں آفاق!

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کُہستانی!
دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی!
یہ حُسن و لطافت کیوں وہ قوت و شوکت کیوں؟
بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی!
ہے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی!
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی!

ابوالاثر حفیظ جالندھریؒ

یاد کر وہ دن

یاد کر وہ دن کہ اپنے قائداعظم کے ساتھ
منزل مقصود پر ملّت نے رکھا تھا قدم

گونج اٹھا تھا نعرۂ توحید شرق و غرب سے
چھا گیا تھا آسماں پر چاند تارے کا علَم

یاد کر وہ دن کہ اُبھرے تھے ستارے ڈوب کر
اور آزادی کے ساحل پر کھڑے تھے کامیاب

ناخدا نامِ خدا تھا سربلند و سرخرو
اس نے پیدا کر لیا تھا ظلمتوں سے آفتاب

یاد کر وہ دن کہ استقلال پاکستان پر
ہم نے مٹی کے گھروندے کی سُنی تھیں پھبتیاں

وہ گھروندا آج ایوانِ رفیع الشان ہے
قائم و پائندہ ہے سیلابِ خوں کے درمیاں

علامہ سید سلیمان ندویؒ

محمد علی جناحؒ

اک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے
کوہ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا

جب کہ داروئے وفا ہر درد کا درماں رہی
جب کہ ہر ناداں عطائی بوعلی سینا رہا

جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا

بادۂ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یونہی اگر یہ ساغر و مینا رہا

ملت دیریں کے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں
گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا

ہر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید
ڈاکٹر اس کا اگر 'مسٹر علی جینا' رہا

عظیم سیرت نگار، برصغیر پاک و ہند کے معروف سیاستدان اور صحافی علامہ سید سلیمان ندوی نے 1916ء میں مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں قائداعظم کی شان میں یہ نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

مولانا ظفر علی خانؒ

قائداعظم

جینا کی صدا اور ہے گاندھی کی کتھا اور
بطحا کی فضا اور ہے وردھا کی ہوا اور

اس کا ہے یہ نقشہ کہ ہیں دل اور زباں ایک
اس کی یہ علامت کہ کہا اور کیا اور

زیبا ہے اسے ملت بیضا کی قیادت
اسلام اسے کیا مرتبہ دے اس کے سوا اور

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ملت ہے وطن سے
حالانکہ یہ فرمودۂ شاہ دوسرا ﷺ اور

ملت کا تقاضا ہے کہ اے قائداعظم
اسلامیوں کی شان میں کچھ چاند لگا اور

باتوں سے نہ مانیں گے کہ لاتوں کے یہ ہیں بھوت
ان سے جو نبٹنا ہے تو حربہ کوئی لا اور

مولانا ظفر علی خانؒ

ذلت ہر اک وثن کی محمد علی سے تھی

دلکش فضا وطن کی محمد علی سے تھی
رنگینی اس چمن کی محمد علی سے تھی

ذوق سلیم جس کے مزے بھولتا نہیں
شیرینی اُس سخن کی محمد علی سے تھی

ہیں زندہ جس سے عہد کہن کی روائتیں
رونق اُس انجمن کی محمد علی سے تھی

اب تک لگی ہوئی جو کروڑوں دلوں میں ہے
بے تابی اُس لگن کی محمد علی سے تھی

توحید کی رسن نے بتوں کو جکڑ لیا
اور تافت اُس رسن کی محمد علی سے تھی

زنداں کو جس نے مطلع الانوار کر دیا
تابانی اُس کرن کی محمد علی سے تھی

سر پر لپیٹ لیتے ہیں جس کو غزا کے وقت
آرائش اُس کفن کی محمد علی سے تھی

اعتبار کی گرفت سے اُمید مخلصی
شیخ اور برہمن کی محمد علی سے تھی

توحید کے اصول کی حرمت کے ساتھ ساتھ
ذلت ہر اک وثن کی محمد علی سے تھی
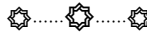
آغا شورش کاشمیری

گونجا، خروشِ نعرۂ ایماں لیے ہوئے

ہندوستان، میں نقد دل و جاں لیے ہوئے
اُٹھا، نوائے قلب پریشاں لیے ہوئے
برسا، مثالِ اَبر در افشاں سر چمن
لہکا، ادائے سنبل و ریحاں لیے ہوئے
الجھا، شہنشہوں کی قباؤں سے بے دریغ
لپکا، متاع چاک گریباں لیے ہوئے
بھڑکا، مثالِ شعلۂ شمشیر اصفہاں!
گونجا، خروشِ نعرۂ ایماں لے ہوئے
آگے بڑھا، تو گردش دوراں ٹھہر گئی
کوندا، جلال برق فروزاں لیے ہوئے
اُبھرا، تو آفتاب گہن میں چلا گیا
اُٹھا، صدائے ضربت طوفاں لیے ہوئے
اس کا خیال، بامِ ثریا سے ماورئیٰ
اس کا کمال، عظمتِ دوراں لیے ہوئے
تاریخ روزگار میں، آوازِ ذوالفقار
آہنگِ انقلاب کے عنواں لیے ہوئے
وہ، اس چمن میں باد صبا کی مثال تھا
اپنی نظیر آپ تھا اور باکمال تھا
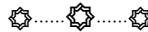
میاں بشیر احمد

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

صد شکر پھر ہے گرم سفر اپنا کارواں
اور میرِ کارواں ہے محمد علی جناح

بیدار مغز ناظم اسلامیان ہند
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

تصویر عزم، جان وفا، روح حریت
ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناح

رکھتا ہے دل میں تاب و تواں نو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمد علی جناح

رگ رگ میں اس کی ولولہ ہے حب قوم کا
پیری میں بھی جواں ہے محمد علی جناح

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح

اے قوم! اپنے قائداعظم کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

لاہور اپنے بخت پہ نازاں ہے کیوں نہ ہو
کہ آج اپنا مہماں ہے محمد علی جناح

عمر دراز پائے، مسلماں کی ہے دعا
ملت کا ترجماں ہے محمد علی جناح

(آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس منعقدہ لاہور میں بتاریخ 22 مارچ 1940ء پڑھی گئی)

میاں بشیر احمد

اسلامیوں کے ہاتھ میں تلوار ہے جناح

ملت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح
اسلامیوں کے ہاتھ میں تلوار ہے جناح

ملت تھی بے زبان، زباں مل گئی اُسے
شوقِ جہاد قوم کا اظہار ہے جناح

مولانا وقفِ دیر ہیں علامہ رہن غیر
یہ سب غبارِ راہ ہیں کہسار ہے جناح

دشمن ہزار اُدھر، تن تنہا ہے یہ ادھر
بے باک ہے، غیور ہے، خوددار ہے جناح

باطل سے جنگ، حق کا تحفظ فلاحِ عام
گر دین حق یہی ہے تو دیندار ہے جناح

اب دیکھ آنکھ کھول کے اور دور دور دیکھ
اے قوم! تیرا دیدۂ بیدار ہے جناح

ہر سو صدا بلند ہوئی زندہ باد کی!
اسلامیانِ ہند کا سردار ہے جناح

فیاض ہاشمی

اے قائداعظمؒ تیرا احسان ہے احسان

یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان
ہر سمت مسلمانوں پہ چھائی تھی تباہی
ملک اپنا تھا اور غیروں کے ہاتھوں میں تھی شاہی
ایسے میں اٹھا دین محمد ﷺ کا سپاہی
اور نعرہ تکبیر سے دی تو نے گواہی
اسلام کا جھنڈا لیے آیا سر میدان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

دیکھا تھا جو اقبال نے اک خواب سہانا
اس خواب کو اک روز حقیقت ہے بنانا
یہ سوچا جو تو نے ہنسا تجھ پہ زمانہ
ہر چال سے چاہا تجھے دشمن نے ہرانا
مارا وہ تو نے داؤ کہ دشمن بھی گئے مان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

لڑنے کا دشمنوں سے عجب ڈھنگ نکالا
نہ توپ نہ بندوق نہ تلوار نہ پھالا
سچائی کے انمول اصولوں کو سنبھالا
پنہاں تیرے پیغام میں جادو تھا نرالا
ایمان والے چل پڑے سن کر تیرا فرمان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

پنجاب سے بنگال سے جوان چل پڑے
سندھی، بلوچی، سرحدی پٹھان چل پڑے
گھر بار چھوڑ بے سر و سامان چل پڑے
ساتھ اپنے مہاجر لیے قرآن چل پڑے
اور قائد ملت بھی چلے ہونے کو قربان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

نقشہ بدل کے رکھ دیا اس ملک کا تو نے
سایہ تھا محمد کا، علی کا تیرے سر پہ
دنیا سے کہا تو نے کوئی ہم سے نہ الجھے
لکھا ہے اس زمیں پہ شہیدوں نے لہو سے
آزاد ہیں آزاد رہیں گے یہ مسلمان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

ہے آج تک ہمیں وہ قیامت کی گھڑی یاد
میت پہ تیری چیخ کے ہم نے جو کی فریاد
بولی یہ تیری روح نہ سمجھو اسے بیداد
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
گر وقت پڑے ملک پہ ہو جایئے قربان
اے قائد اعظمؒ تیرا احسان ہے احسان
تیرا احسان ہے، تیرا احسان

الحاج میاں غلام رسول خلیق قریشی

دیتا ہے دشمنوں کو ہر اک چال میں وہ مات

ملت کا خضر راہ، محمد علی جناح
بے تاج بادشاہ، محمد علی جناح
جو رُک سکا نہ کفر کے کوہ مہیب سے
وہ سیل بے پناہ، محمد علی جناح
گرداب سے وہ قوم کی کشتی نکال کر
لایا لب مراد پہ ہے دیکھ بھال کر
ملت کی آرزو کا ستارا وہی تو ہے
اسلامیوں کی آنکھ کا تارا وہی تو ہے
جس کے اک اک اشارے پہ سو جان ہے نثار
محبوب دل نوازِ دل آرا وہی تو ہے
اسلامیوں کو جس نے دیا زندگی کا درس
جرأت کا اور تہور و مردانگی کا درس
دانش میں بے نظیر، فراست میں باکمال
بینش میں بیمثال، سیاست میں باکمال
وہ راہبر، وہ قائد اعظم وہ راہنما
وہ قائد جہاں، وہ قیادت میں باکمال
لاریب وہ ہے فضل خدا سے ادا شناس
وہ ماسوا شناس بھی ہے اور خدا شناس

وہ حق پرست، قوت و کثرت کا بت شکن
لرزاں ہے اس کے سامنے وردھا کا اہرمن
دیتا ہے دشمنوں کو ہر اک چال میں وہ مات
اَعدا کی ہر طراز پہ بے باک خندہ زن
اللہ کرے ہمیشہ وہ سایہ فشاں رہے
اے کاش! تا ابد رہے اور جاوداں رہے
کہتا ہے اس کو ملک کا دشمن؟ غلط غلط
اس کو نہیں عزیز یہ گلشن؟ غلط غلط
ابر بہار بن کے جو برسا ہے آج تک
اس سے ہے برق گیر یہ خرمن؟ غلط غلط
وہ ہے وطن کا دوست مگر ہے خدا پرست
اللہ کا غلام ہو کیوں ماسوا پرست
اے دوست جنت الحمقا سے نکل کر دیکھ
ہاں دشمنی کی تیرہ گھٹا سے نکل کے دیکھ
ارزاں اگر ہے چشم بصیرت تو ایک بار
اندھے تعصبوں کی فضا سے نکل کے دیکھ
گر ہو سکے تو مشعل حق لے جناح سے
آزادی وطن کا سبق لے جناح سے

خالد اختر افغانی

تیری صورت میں ہے رقصاں عزم خالدؓ کا وقار

ناخدائے کشتی ملت زعیم نامدار
ضیغم اسلام، غازی، قائد والا تبار
اے امیر ملک و ملت، راہبر مخلص اسلام
بطل حریت، مجاہد، شیر دل عالی وقار
اے حکیم وقت، اے نباض فطرت زندہ باد
راہنمائے ملت اسلامیاں پائندہ باد
اے خدائے عزم اے تاریخ ماضی کے امیں
سینۂ کہسار تک کو چیر دے تیرا یقیں
تیرے استقلال میں رقصاں ہ شانِ خالدی
عزم کو تیرے بڑھائے اور رب العالمیں
تجھ سے وابستہ ہیں امیدیں ہمارے دیس کی
اُٹھ اڑا دے دھجیاں ان راہزنوں کے بھیس کی
تیری ہستی سے ہے قائم آج ملت کا وقار
تیری ہستی باعث سرمایۂ صد افتخار
تو کہے تو چیر دیں گے ہم دل کہسار کو!
تیرے ہر ادنےٰ اشارے پر ہمارے دل نثار
آج بھی اسلامیوں میں ہیں ہزاروں سرفروش
سینکڑوں ٹیپو ہیں اب بھی ہیں جنہیں سربارِ دوش

اے علمبردار حریت، امیر کارواں!
تک رہا ہے تیری صورت آج ہر مسلم جواں
اُٹھ اتر میدان میں اے قائد قوم و وطن
قوم کی بگڑی تیرے ہاتھوں بنے گی بے گماں
خوف کھاتے ہیں تجھی سے راہبرانِ خرقہ پوش
دیکھ، لے ڈوبیں نہ پاکستان کو یہ ملت فروش
تیری عقل و فہم کے قرباں، فراست کے نثار
زیست کا تیری فلاح قوم پر دار و مدار
درحقیقت تو مسیح ملک و ملت ہے جناح
ملت مرحوم کو بیشک ہے تجھ پر اعتبار
اٹھ اتر میدان میں اے مرد میدان وغا
طاقتیں جو منتشر ہیں ان کو اک مرکز پہ لا
تیری صورت میں ہے رقصاں عزم خالدؓ کا وقار
تیرے ارشادات میں عہد گزشتہ کی بہار
تو نے زندہ کر دیا پھر قاسم و ٹیپو کا دور
کانپتا ہے تیری ہیبت سے دل برق و شرار
کانپ اٹھتا ہے تیری ہیبت سے دل اشرار کا
واہ کیا کہنا تیری تنظیم کی رفتار کا
شخصیت تیری نرالی فہم تیری بے نظیر
تیری علمیت کے قائل ہند کے برناد پیر
تیری تقریروں کے پیچ وخم میں پھنس جاتا ہے دل
لیگ کی ہر ایک صف میں ہیں کھڑے میر و فقیر
السلام اے ناخدائے امت خیر البشر!
تو وہ ہے جس کو نہیں فرعونیوں کا کوئی ڈر

آج کل گونجا ہوا ہے نعرہ پاکستان کا
اور پاکستان ہی سے حل ہے ہندوستان کا
اس کو کوئی کیا کرے سمجھے اگر ہندو نہ یہ
کام پاکستان دے گا ہند کے دربان کا
ہند پر حملہ نہ ہو گا پھر کبھی جاپان کا
راستہ مسدود ہوگا ترکی و ایران کا
تجھ میں سب اوصاف قائد خالدؓ و ضرارؓ کے
عکرمہؓ کے ولولے اور حوصلے کرارؓ کے
تجھ میں رقصاں روح ابوبکرؓ و عمرؓ حمزہؓ و عاصؓ
تیرے دل میں ہیں عزائم ٹیپوئے جرارؒ کے
تو نے زندہ کر دیا ہے فلسفہ اقبالؒ کا
تو نے پورا کر دیا اقبال کا ہر مدعا

حفیظ تائبؒ

بیادِ قائداعظمؒ

سراپا عزم بن جاؤ بیادِ قائداعظم
دلوں میں آگ سلگاؤ بیادِ قائداعظم

وفا کے جام چھلکاؤ بنامِ رہبرِ ملت
خودی کے زمزمے گاؤ بیادِ قائداعظم

وطن کی زُلف سلجھاؤ بپاسِ خاطرِ بانی
نقوشِ زیست چمکاؤ بیادِ قائداعظم

جو خوشبوئے محبت عام کر دیں سارے گلشن میں
وہ غنچے پھر سے چمکاؤ بیادِ قائداعظم

بکھیرو حریت کے نغمہ ہائے آتشیں ہر سُو
ہراک محفل کو گرماؤ بیادِ قائداعظم

جو آغازِ سفر کرتے ہوئے ہر اک نے باندھا تھا
وہ پیماں پھر سے دہراؤ بیادِ قائداعظم

فسردہ قوم کے سینے میں پھر سے بجلیاں بھر دو
دلِ ملت کو دھڑکاؤ بیادِ قائداعظم

زاہدالحسن زاہد

اے قائداعظم

دنیا میں کہاں ہو گا ترا عزمِ مصمّم
اے قائداعظم!

تھا تیرا ہر اک فیصلہ مستحسن و محکم
اے قائداعظم!

روندی ہوئی ملّت کو دیا تو نے سہارا
اور پار اُتارا

کیوں سامنے عظمت کے تری سر نہ کریں خم
اے قائداعظم!

سچ مچ ترا کردار تھا اسلام کا کردار
اے رہبر خوددار

لاریب تری زیست تھی ایثار مجسّم
اے قائداعظم!

تُو نے ہمیں مایوسی کے محبس سے نکالا
جذبوں کو اُجالا

لہرا دیے ہر سمت ترے عزم نے پرچم
اے قائداعظم!

محسن فارانی

قائداعظم: محسنِ ملت

قائد اعظم، ہمارے محسن والا تبار
ان سے قائد کا ہمیں تھا مدتوں سے انتظار
جانب عرش بریں اٹھتی نگاہیں بار بار
دل حزیں اور جامۂ عقل و خرد تھا تار تار
تھی غلامی اور ہر فرد و بشر رنجور تھا
ہر مسلماں بے کس و بے بس تھا اور مجبور تھا
تھا یہاں برطانیہ کی حکمرانی کا چلن!
اور ہندو کا ہمیں گھیرے ہوئے تھا مکر و فن
چھیدتی تھی رُوح کو دُہری غلامی کی چبھن
نہ کسی رہبر میں تھی سچی قیادت کی لگن
کشتی ملّت کا کھیون ہار نہ پتوار تھی
قوم رہبر کو ترستی تھی، بڑی لاچار تھی
تھی صدی اُنیسویں اور سن چھہتر کا عمل
رحمت حق جوش میں آئی، گئی قسمت بدل
پونجا جناح کو دیا بیٹا خدا نے برمحل
اس کا قانون و سیاست میں بجا ایسا طبل
اک طرف انگریز شاطر ہو رہا تھا شرمسار
اور برہمن پیٹتا تھا دانت اپنے بار بار

وہ محمد علی جناح قوم کے رہبر ہوئے
ہو گئے جب منتخب وہ صدر مسلم لیگ کے
قائداعظم ہوئے، اندوہ کے بادل چھٹے
قوم نے لوٹے بہت ان کی قیادت کے مزے
ان کی کوشش سے ہمیں آزاد پاکستان ملا
قوم نے قربانیوں کا خوب پایا ہے صلہ
قائداعظم! تری محنت پہ ہم ممنون ہیں
تیرے پاکستان میں آزاد ہیں، مصئون ہیں
ہم تری خدمات ملّی پہ ترے مرہون ہیں
ہر زباں پر تیری تعریفوں کے سو مضمون ہیں
دے نہیں سکتے صلہ تیری حسیں خدمات کا
تیرے فرق ناز پہ سہرا عُلُوِّ ذات کا
قائداعظم! ترا فکر و عمل ہے راہبر
ہے ترے کردار کی لَو تیز تر، تابندہ تر!
تیرے ارشادات کی ضَو سُرخی خبر و نظر
تیری نسبت سے ہوئے ہم اس جہاں میں معتبر
"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

۞......۞......۞

منیر قصوری

بابائے قوم

وہ نگہبانِ وطن، سالارِ قوم
ذہن ملت، دیدۂ بیدارِ قوم
راز دار و محرم اسرار قوم
دردمند و واقف آزارِ قوم
امت مرحوم کا شیرازہ بند
قلعۂ مضبوط و دیوارِ بلند
وہ اُٹھا اس خاک سے دیوانہ وار
جان دے دی شمع پر پروانہ وار
گرچہ اکثر قوم تھی بیگانہ وار
وہ فرنگی سے لڑا مردانہ وار
امن قائم ہو گیا اس جنگ سے
اپنا چھٹکارا ہوا افرنگ سے
اس کے پہلو میں دل بے باک تھا
وہ کہ شاہین شہِ لولاک تھا
اس کی زد میں گنبدِ افلاک تھا
اس کا روشن دیدۂ ادراک تھا
اس کی تربت پر خدا رحمت کرے
راحت پیہم اسے حاصل رہے

❁……❁……❁
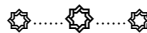
افتخار عارف

بھول بیٹھے ترے نقش کف پا تیرے بعد

بے اثر ہو گئے سب حرف و نوا تیرے بعد
کیا کہیں دل کا جو احوال ہوا تیرے بعد

تو بھی دیکھے تو ذرا دیر کو پہچان نہ پائے
ایسی بدلی ترے کوچے کی فضا تیرے بعد

اور تو کیا کسی پیماں کی حفاظت ہوتی
ہم سے اک خواب سنبھالا نہ گیا تیرے بعد

کیا عجب دان تھے کہ مقتل کی طرح شہر بہ شہر
بین کرتی ہوئی پھرتی تھی ہوا تیرے بعد

ترے قدموں کو جو منزل کا نشان جانتے تھے
بھول بیٹھے ترے نقش کف پا تیرے بعد

مہر و مہتاب دو نیم ایک طرف خواب دو نیم
جو نہ ہونا تھا وہ سب ہو کے رہا تیرے بعد
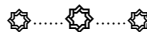
وحشت امرتسری غلام نبی

ہے عقیدت میں وہ کامل بانیٔ اسلام سے

لرزہ کھاتے ہیں عدو مسٹر جناح کے نام سے
مفسدوں کا قول ہے خارج ہے وہ اسلام سے

ہے عقیدت میں وہ کامل بانیٔ اسلام سے
ہے شرف اس کو محمد ﷺ اور علیؓ کے نام سے

سندھ میں پہنچا وہ جب فارغ ہوا آسام سے
کلفتوں کو ہے مقدم جانتا آرام سے

مولوی قاضی و مفتی وہ جو تھے جنس گراں
بک چکے ہیں کانگریس کے ہاتھ سستے دام سے

کیوں نہ مسلم لیگ ہوگی سرخرو دنیا میں جب
پاک ہے سردار اس کا ہر کسی الزام سے
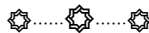
انور غازی آبادی، شیخ انور علی قریشی

اک مرد باخدا ہے محمد علی جناحؒ

ہر آنکھ کی ضیا ہے محمد علی جناح
ہر دل کا آسرا ہے محمد علی جناح
بھٹکے ہوؤں کو راہ پہ لایا خدا کی شان
ہم سب کا راہنما ہے محمد علی جناح
بیڑے کو پار کر دیا طوفانِ موج سے
دنیا کا ناخدا ہے محمد علی جناح
ہم کو کیا ہے رازِ حقیقت سے آشنا
اک مرد باخدا ہے محمد علی جناح۔
جو کہہ دیا زبان سے اس کو کیا ادا
وعدہ کی اک وفا ہے محمد علی جناح
انسان کاش دیکھے جو گہری نگاہ سے
ہر درد کی دوا ہے محمد علی جناح
آزاد ہوگی آپ کے دم سے ہماری قوم
وہ وقت آگیا ہے محمد علی جناح
اللہ ہم پر آپ کو قائم یونہی رکھے
اپنی یہی دعا ہے محمد علی جناح
اپنا تو یہ خیال ہے انور خدا گواہ
ہم سب سے ماسوا ہے محمد علی جناح
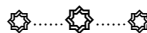
محمد حارث

سرچشمہ بقا ہے محمد علی جناحؒ

حق پر فریفتہ ہے محمد علی جناح
باطل سے بھاگتا ہے محمد علی جناح

بن کر مکین قلب مسلمان سرفروش
کعبہ میں جا بسا ہے محمد علی جناح

دوڑے رگوں میں کیوں نہ بھلا خون زندگی
سرچشمہ بقا ہے محمد علی جناح

انبار زد، شکوہ ظفر، تاب اقتدار
ان سب سے ماورا ہے محمد علی جناح

آساں نہ کیوں ہوں قطع منازل کی مشکلات
سالار قافلہ ہے محمد علی جناح

باوصف سال خوری و ضعف قویٰ جسم
صد انقلاب زا ہے محمد علی جناح

حارث وطن کی بحر سیاست میں آج کل
اک دُرِ بے بہا ہے محمد علی جناح
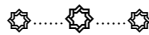
امجد اسلام امجد

سورج

نیند بھری آنکھوں کے دن میں
وہ خود سورج بن کر اُبھرا
ڈھلتی شب میں پورے چاند کی صورت نکلا
صبح کے پہلے دروازے پر دستک بن کر گونج اُٹھا
آج میں جس منزل پہ کھڑا ہوں
اس پر پیچھے مڑ کر دیکھوں
تو اک روشن موڑ پہ اب بھی...... وہ ہاتھوں میں......آنے والے دن کی جلتی مشعل تھامے
میری جانب دیکھ رہا ہے
جانے کیا وہ سوچ رہا ہے

جاذب قریشی

قائد فتح مندی

میرے آباؤ اجداد نے
اپنی آزادیوں کے سفر میں
تجھے قائد فتح مندی کہا تھا
کہ تو اپنی آواز میں بولتا تھا
قفس میں پرندوں کے پر کھولتا تھا
تری سوچ میں روح عصر رواں تھی
جو نقارہ جسم و جاں تھی
قیادت تری
جذبہ و عقل کی لوح پر نقش آزردگاں تھی
ترے قافلے میں وہ لوگ آ گئے تھے
جو پچھلی صدی کا نمائندہ کردار بن کر جیے
ان کی نسلیں
تجھے اپنے خوابوں میں آباد دیکھنا چاہتی تھی
ہماری نئی زندگی کی حدوں میں
جو تاریخ چہرہ گری کر رہی ہے
وہاں سب سے اونچائی پر
تیری تصویر رکھی ہوئی ہے
دھول اُڑاتے ہوئے روز و شب میں

ترا حوصلہ

عزم و ہمت کے سورج اُگاتا رہا
لشکرِ دشمناں کے مقابل بھی تو
اپنی مشعل جلاتا رہا
اپنی تہذیب کی منفرد اہمیت
جس کی پہچان خود آگہی ہے
برف گرتی رہی
اور تیرا ارادہ نئی دھوپ کا استعارہ بنا
ہر سیہ پوش موسم میں تو ہی ستارہ بنا
جو زمیں میں مدتوں سے غلامی کو پہنے ہوئے تھی
اسے تو نے چاہا
تو وہ پاک ارضِ وطن بن گئی
وہ جو اپنے پرانے حصاروں میں
بوڑھی حویلی میں زخموں سے لبریز تھے
جشن آزادیوں کا منانے لگے
جبر کے خوف سے جل رہے تھے جو لوگ
اپنی خوش رنگ بارش میں آکر نہانے لگے
تازہ خوشیوں کے پرچم اُڑانے لگے
میرے آباؤ اجداد نے تجھے کو قائد کہا تھا
کہ تو اپنی آواز میں بولتا تھا
قفس میں پرندوں کے پر کھولتا تھا

۞……۞……۞
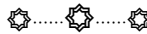
اصغر سودائی

پاکستان کا مطلب کیا؟

قرآں سے ہے اس کی بنا
ایماں سے ہے نشو و نما
پاکستان ہے ملکِ خدا
پوچھے اگر دنیا تو بتا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

شب ظلمت میں گزاری ہے
اٹھ وقت بیداری ہے
جنگ شجاعت جاری ہے
مرد بن میدان میں آ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

تجھ میں ہے خالد کا لہو
تجھ میں ہے طارق کی نمو
شیر کے بیٹے شیر ہے تو
شیر بن میدان میں آ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

ہادی و رہبر سرور دیں
صاحب علم و عزم و یقیں
قرآن کی مانند حسیں
احمد مرسل صلی علی
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللّٰہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ
اٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللّٰہ سے رشتہ جوڑ
غیر اللّٰہ کا نام مٹا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللّٰہ

جرأت کی تصویر ہے تو
ہمت عالمگیر ہے تو
دنیا کی تقدیر ہے تو
آپ اپنی تقدیر بنا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللّٰہ

نغموں کا اعجاز یہی
دل کا سوز و ساز یہی
وقت کی ہے آواز یہی
وقت کی یہ آواز سنا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

مذہب ہو تہذیب کہ فن
تیرا جداگانہ ہے چلن
اپنا وطن ہے اپنا وطن
غیر کی باتوں میں مت آ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

پنجابی ہو یا افغان
مل جانا شرط ایمان
ایک ہی جسم ہیں ایک ہی جان
ایک رسولؐ اور ایک خدا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

مرد و زن اور پیر و جواں
لے کے اٹھے ہیں عزمِ گراں
بن کے رہے گا پاکستان
ہر اک کے لب پر ہے یہ صدا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

اے اصغر! اللہ کرے
ننھی کلی پروان چڑھے
پھول بنے خوشبو مہکے
وقت دعا ہے ہاتھ اٹھا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ

جناب اصغر سودائی شاعر، ماہر تعلیم، تحریک پاکستان کے سرگرم رکن اور سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ آپ نے یہ ترانہ **1944**ء میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں لکھا تھا جو بالآخر تحریک پاکستان کا نعرہ بن گیا۔ آپ علامہ اقبالؒ کالج سیالکوٹ کے پرنسپل بھی رہے۔

ترتیب وتحقیق

محمد متین خالد

- ایک ایسے بطلِ جلیل کی ہمت وعزیمت کی حیرت انگیز کہانی جس کے غیر متزلزل استقلال اور عہد طراز جدوجہد نے قیام پاکستان کے ناممکن کو ممکن بنا کر چشم اربابِ عالم کو خیرہ کر دیا۔
- ایک ایسے مجاہد کا اعجاز آفریں بیانیہ جس نے ہزار رکاوٹوں اور جانگسل مشکلات کے باوجود ایک عظیم اسلامی ونظریاتی مملکت کے خدوخال کو اجاگر کیا۔
- ایک ایسے مردِ میدان کی ولولہ انگیز داستان شجاعت جس کا زادِ سفر بے سروسامانی تھا لیکن اس نے محض اپنے بے پایاں ایمان وایقان کی بدولت مجبور ومحکوم اسلامیان برصغیر کو انگریز کے دوسوسالہ جبر اور مہا سبھا ہندوؤں کے طوقِ مکر وسازش سے نجات دلا کر آزادی کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز کیا۔
- ایک ایسے سچے اور پاکباز قائد کی خوبصورت سرگذشت حیات جس کا سرمایہ متحدہ ہندوستان کے تمام جید علما ومشائخ کی مکمل تائید وحمایت، سرپرستی واعتماد، آہ صبح گاہی کا نیاز اور نالہ نیم شبی کا گداز تھا۔
- ایک ایسی برگزیدہ ہستی کا ایمان افروز احوال جس کے راست باز دل کی دھرتی کو اللہ تعالیٰ اور حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نگاہ لطف وعنایت کی نورانی بارش اور خصوصی توجہات کے ترشح نے ہمیشہ سرسبز وشاداب رکھا۔

آسمان صحافت کے ماہتاب بابائے پاکستان جناب مجید نظامی، ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، معروف دانشور جناب پروفیسر یوسف عرفان کی گرانقدر اور ایمان افروز تقاریظ کے ساتھ جس نے کتاب کو چار چاند اور پانچ سورج لگا دیے۔

تحریک قیام پاکستان کی مخالفت اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی کردار کشی کرنے والوں کے لیے یہ کتاب آئینہ حقیقت نما ثابت ہو گی۔

ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
37223584'37232336'37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers1@gmail.com
www.facebook.com/Ilmoirfanpublishers

95-Y Block Commercial, Basement Phase-3 DHA Lahore
0333-4067757 | 0333-4359445
7thskybooks@gmail.com
7thskybooks